

کلیاتِ پریم چند

18

آزاد کتھا

مرتبہ
مدن گوپال



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110 066

Kulliyat-e-Premchand-18

Edited by : Madan Gopal

Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui

© قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت	:	جولائی، ستمبر 2003ء تک
پہلا ایڈیشن	:	1100
قیمت	:	222/-
سلسلہ مطبوعات	:	1096
کیوزنگ	:	پرنس گراؤنڈ، نئی دہلی

ISBN. 81-7587-009-5

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈر، 1397 پہاڑی اہل، بازار ضیاعلی، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن مطبوعہ عام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو ”کلیات پریم چند“ کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سیٹ کی صورت میں شائع کر رہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور ادارے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جا رہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،

ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،

تراجم : جلد 18 و جلد 19، متفرقات (مضامین اور ادارے) :

جلد 20 سے جلد 22 تک

”کلیات پریم چند“ میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسب ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کر کے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

”کلیات پریم چند“ کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقص اڈل ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید

مشوروں کا غیر مقدم ہے۔

آئندہ اگر پریم چند کی کوئی تحریر/تحریریں دریافت ہوتی ہیں، آئندہ ایڈیشنوں میں ان کو شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی میٹل نے پروفیسر محسن الرحمن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی میٹل نے اس پروجیکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کر کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی میٹل کے تمام امکانات کی شکرگزار ہے۔ ”کلیات پریم چند“ کے مرتبہ مدن گوپال اور پروجیکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ”کلیات پریم چند“ کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند،

نئی دہلی

پیش گفتار

”آزاد کھا“ فسانہ آزاد کی تلخیص اور ہندی روپ ہے۔ فسانہ آزاد کو اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب کے مصنف پنڈت رتن ناتھ سرشار کی پیدائش لکھنؤ کے ایک کشمیری پنڈت خاندان میں 1845 میں ہوئی۔ عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ادب میں وہ صحافت کے راستے سے داخل ہوئے۔ ان کی صلاحیت کو دیکھ کر منشی نول کشور نے انھیں اودھ اخبار کا مدیر مقرر کیا۔ اسی اخبار میں ان کی مشہور زمانہ تصنیف ”فسانہ آزاد“ قسط وار شائع ہوئی۔ یہ ایک سال دسمبر 1878 سے دسمبر 1879 تک مسلسل اودھ اخبار میں طبعیے کے طور پر نکلا۔ کتابی شکل 1880 میں مطبعہ عام پر آیا۔

پریم چند کی پیدائش اسی سال ہوئی جس سال فسانہ آزاد کتابی شکل میں شائع ہوا۔ بچپن سے پریم چند ناول اور افسانوں کے پریمی تھے۔ انھوں نے کم عمری ہی میں سرشار کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور فسانہ آزاد سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کتاب کی تلخیص ہندی میں آزاد کھا کے عنوان سے پیش کی۔

یہاں اس ہندی تلخیص (آزاد کھا) کو اردو رسم خط میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مدن گوپال

(1)

میاں آزاد کے بارے میں ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ آزاد تھے۔ ان کے خاندان کا پتہ نہیں، گاؤں گھر کا پتہ نہیں، خیال آزاد، رنگ ڈھنگ آزاد، لباس آزاد، دل آزاد اور مذہب بھی آزاد۔ دن بھر زمین کے گز بنے ہوئے ادھر ادھر گھومنا، جہاں بیٹھنا وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لینا اور ایک بار اٹھ کھڑے ہوئے تو دن بھر مزہشتی کرتے رہنا ان کا کام تھا۔ نہ گھر نہ دوار، کبھی کسی دوست کے یہاں ڈٹ گئے، کبھی کسی حلوئی کی دکان پر اڑا بجایا اور کوئی ٹھکانا نہ ملا تو فاقہ کر گئے۔ سب گمن پورے تھے، کشتی میں۔ لکڑی بنٹ میں، گد کے پھری میں، پٹے بانک میں استاد، غرض عالموں میں عالم، شاعروں میں شاعر، رنگیلوں میں رنگیل، ہر فن مولا آدی تھے۔

ایک دن میاں آزاد بازار میں سیر سپانا کر رہے تھے کہ ایک بڑھے نے ایک بانک سے کہا کہ میاں بیدھے آئے ہو، یا جان بھاری ہے، یا چھینکتے گھر سے چلے تھے؟ یہ اکڑتے کیوں چلتے ہو؟ یہاں گردن جھکا کر چلا کیجیے، نہیں تو کوئی پہلوان گردن ناچے گا، ساری شچی کر کری ہو جائے گی، ایڑنا بھول جائیے گا۔ اس سے کیا واسطہ؟ یہ شہر کشتی، پٹے بانک اور لکڑی کی ٹک سال ہے۔ بہت سے لڑیچے آئے مگر پکٹی کھا گئے۔ ہاتھ ملاتے ہی پہلوانوں نے مارا چاروں شانے چت۔ یہ سنتے ہی وہ میاں بانک آگ بھوکا ہو گئے۔ بولے۔ جی، تو کہیں اس بھر دے میں نہ رہیے گا، یہاں پکٹی کھانے والے آدی نہیں ہیں، بچ کھیت پچھاڑیں تو سہی، بنے رہیں ہمارے استاد، جنھوں نے ہمیں لکڑی سکھائی۔ نالوں کی لکڑی پھینکنا تو سہی جانتے ہیں۔ میدان میں ٹھہرنا مردوں ہی کا کام ہے۔ ہمارے استاد تیس تیس آدمیوں سے گوبار لڑتے تھے اور کون لوگ؟ گنوار کھانڑ نہیں۔ پلے ہوئے پٹھے، جن پر ان کو غرور تھا۔ پھر یہ خیال کیجیے کہ تیس گد کے برابر پڑتے تھے، مگر تیسوں کی خالی جاتی تھی۔ کبھی آڑے ہو گئے، کبھی گد کے سے چوٹ کاٹ دی، کبھی بن کو سمیٹ لیا، کبھی چیترا بدل دیا۔ شاگردوں کو للکارے جاتے تھے کہ لگا دے بڑھ کے ہاتھ، آگھوم کے۔ اور وہ جھلا جھلا کر چوٹیں لگاتے تھے۔ مگر منہ کی کھاتے تھے۔ اور جب سب کے دم نوٹ گئے اور لگے ہانپنے، تو گد کے ہاتھ سے چوٹ چوٹ پڑے۔ مگر

واہ رے استاد! ان کے وہی خم دم، وہی تاؤ بھاؤ، پہرہوں لکڑی پھینکیں مگر دم نہ پھولے اور جو کہیں بھڑ پڑے تو بات کی بات میں پرے صاف تھے۔ کس پر پالت کا ہاتھ جمایا، کسی کو چاکی کا ہاتھ لگایا، پھر یہی معلوم ہوتا تھا کہ پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے یا آتش بازی کی چھمچھوند رائج رہی ہے یا چرخی چکر میں ہے۔ جینوا کا ہاتھ تو آج تک کوئی روک ہی نہ سکا۔ وہ تلا ہوا ہاتھ پڑتا تھا کہ ادھر اشارہ کیا ادھر تڑ سے پڑ گیا۔ بس موت کا تیر تھا۔ گدکا ہاتھ میں آیا اور معلوم ہوا کہ بجلی لوکنے لگی۔ ممکن نہیں کہ آدمی کی آنکھ جھپکنے پائے۔ لکار دیا کہ روک چاکی، پھر لاکھ جتن کیجیے بھلا روک تو لیجیے۔ نشانہ تو کبھی خالی جانے ہی نہیں پاتا تھا۔ بھری عمر بھر نہ چھوٹی۔ ایک انگ ہی لڑا کیے۔ چہرہ بدن، سیدھے سادھے آدمی، صورت دیکھے تو یقین نہ آئے کہ استاد ہیں، مگر ایک ذرا سی بانس کی کھپاچ ڈسے دیجیے، پھر دل لگی دیکھیے، کیسے جوہر دکھاتے ہیں۔ ہم جیسے استادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں کسی سے دینے والے نہیں۔

میاں آزاد تو ایسے آدمیوں کی ٹوہ میں رہتے ہی تھے، بانکے کے ساتھ ہولیے اور دونوں شہر میں چکر لگانے لگے۔ چوک میں پہنچے تو جس پر نظر پڑتی ہے، بانکا ترچھا، چٹ دار، انگرکھے پہنے، نلے دار ٹوپیاں سر پر جمائے، چست گھٹنے ڈانٹے ٹھاٹھے باندھے ہوئے تھے چلے جاتے ہیں۔ ٹمچے کی جوڑی کمر سے لگی ہوئی دو دو دلائتیاں پڑی ہوئی، بازو جڑھی ہوئی، پیش قبض، کناریں سرو ہی، شیر بچہ سب سے لیں۔ بانکے کو دیکھ کر ایک دکاندار کی شامت آئی، ہنس پڑا بانکے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دن سے طنچہ داغ دیا۔ سینوگ تھا خالی گیا۔ لوگوں نے پوچھا، کیوں بھائی بگڑ گئے؟ تیکھے ہو کر بولے۔ ہم کو دیکھ کر بچا جی میکرائے تھے ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر پڑے اور ان کے دانت کھٹے ہو جائے۔ مگر زندگی تھی بچ نکلے، میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا یہ بانکے تو عافت کے پرکالے ہیں ان کو بچا نہ کیا تو کچھ بات نہیں۔ ایک تبولی سے پوچھا، کیوں بھائی یہاں بانکے بہت ہیں؟ اس نے کہاں، میاں بانکا ہوتا تو دل لگی نہیں۔ ہاں بے فکرے بہت ہیں اور ان سب کے گرد گھنٹال وہ حضرت ہیں۔ جنھیں لوگ ایک رنگ کہتے ہیں۔ وہ سندلی رنگا ہوا جوڑا پہن کر نکلتے ہیں مگر مجال کیا کہ شہر بھر میں کوئی سندلی جوڑا پہن تو لے۔ ایک رنگ سندلی جوڑا کوئی پہن نہیں سکتا۔ کوئی پہنے تو گولی بھی سر کر دیں، اس کے ساتھ یہ بھی ہے۔

میاں آزاد نے سوچا کہ اس ایک رنگ کا ٹیڑا نہ لیا تو کھانا حرام، دوسرے دن آپ بھی سندلی بوٹ، سندلی گھٹا، سندلی انگرکھا اور ٹوپی ڈاٹ کر نکلے۔ اب جس گلی کوچے سے نکلتے ہیں اگھیاں اٹھتی ہیں کہ یہ آج اس ڈھپ سے کون نکلے ہیں بھائی۔ ہوتے ہوتے ایک رنگ کے چیلے، چاڑوں نے ان کے کان میں بھی بھنک ڈال دی۔ سنتے ہی منہ لال چقدر ہو گیا۔ کپڑے پہن، ہتھیار لگا، چل کھڑے ہوئے۔ آزاد تبولی کی دکان پر تک گئے۔ ان کا بھیس دیکھتے ہی ہوش اس کے اڑ گئے۔ لگا ہاتھ جوڑنے کہ بھگوان کے لیے میری ہی ٹوپی دے لیجیے، یا جوتا بدل ڈالیے، نہیں تو وہ آتا ہی ہوگا۔ مفت کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا واسطہ؟ ان کو تو کچے گھڑے کی چڑھی تھی، کب مانتے تھے کہ گیلوری لی اور اکڑ کر کھڑے ہوئے۔ شہر میں دھوم ہو گئی کہ آج آزاد اور ایک رنگ میں تلوار چلے گی۔ تماشا دیکھنے والے جمع ہو گئے۔ اتنے میں میاں ایک رنگ بھی دکھائی دیے۔ ان کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی۔ کوئی ادھر کترا گیا۔ کوئی گلی میں گھسا، کوئی کوٹھے پر چڑھ گیا۔ ایک رنگ نے جوان کو دیکھا، تو جل مرا۔ بولا ابے وہ خبطی، اتار ٹوپی، بدل جوتا، ہمارے ہوتے تو سندلی جوتا پہن کر نکلے۔ اتار، اتار، نہیں تو میں بڑھ کر کام تمام کر دوں گا۔ میاں آزاد پینترا بدل کر تیر کی طرح جھپٹ پڑے اور بڑی بھرتی سے ایک رنگ کی توند میں طنپنے رکھ دیا۔ بس ہلے اور دھواں اس پار۔ بولے اور لاش پھڑکنے لگی۔ بے ایمان، بڑا بانکا بنا ہے۔ سیکڑوں بھلے آدمیوں کو بے عزت کیا۔ اتنے چابک ماروں گا کہ یاد کرے گا۔ ابھی اتار ٹوپی اتار، اتار، نہیں تو دھواں اس پار۔ سنیوگ سے ایک درزی ادھر سے نکلا۔ اس نے ایک رنگ کی ٹوپی اتار جیب میں رکھی۔ ایک رنگ کی ایک نہ چلی۔ آزاد نے لکارا، حوصلہ ہو تو آؤ، دو دو ہاتھ بھی ہو جائیں۔ خبردار جو آج سے سندلی جوتا پہنا۔

شہر بھر میں دھوم ہو گئی۔ میاں آزاد نے ایک رنگ کے چھکے چھڑا دیے۔ چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدلی۔ سچ ہے دسے پر بلی چوہے سے کان کٹاتی ہے۔ میاں آزاد کی دھاک بندھ گئی۔ ایک دن انھوں نے منادی کر دی کہ آج میاں آزاد چھ بجے سے آٹھ بجے تک اپنے کرتب دکھائیں گے، جنھیں شوق ہو آئیں۔ ایک بڑے لمبے چوڑے میدان میں آزاد اپنے جوہر دکھانے لگے۔ لاکھوں آدمی جمع تھے۔ میاں آزاد نے نیبوں پر نشان بنایا اور تلوار سے اڑایا تو نشان کے پاس کھٹ سے دو ٹکڑے۔ کسیر و اچھالا اور پانچ چھ بار میں چھیل ڈالا۔ تلوار کی

باڑ سے دس بارہ کی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ چراغ جلایا اور کھانزا پھینکتے پھینکتے گل کاٹ ڈالا۔ لو الگ، بتی الگ، ایک پیالے میں دس کوزیاں رکھی اور دو پر نشان بنا دیا۔ دونوں کو تلواریں سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوزیاں بلوہ بچ نکلی۔ لکڑی نیکی اور میں ہاتھ جھٹ پر ہو رہے۔ گد کے کا ذرا اشارہ کیا اور میں ہاتھ اڑ گئے۔ چالیس چالیس آدمیوں نے گھبرا اور صاف یہ نکل بھاگے۔ پتنگ کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے اس کو نظنے نہ دیا۔ ایک مہکیت نے یہ کرتب دیکھے تو بولا اچی یہ سب نٹ دیا ہے، میدان میں آئیں تو معلوم ہوں۔ آزاد۔ اچھا! اب تمہیں بھی میدان میں آنے کا دعویٰ ہوا! تمہارے ایک رنگ کا تو رنگ پیکا ہو گیا اب تم منہ چڑتے ہو، تمہیں بھی دیکھوں گا۔ مہکیت۔ چونچ سنبالو۔

آزاد۔ تمہاری شامت آ ہی گئی ہے تو میں کیا کروں، آج کل میں تمہاری بھی قلمی کھل جاتی ہے۔ تم لوگ بانگے نہیں، بد معاش ہو، جدھر سے نکل جاؤ۔ ادھر آدمی کانپ اٹھے کہ بھیڑیا آیا۔ کوئی ہنسا اور تم نے بندوق چھتیائی۔ کسی نے بات کی اور تم نے چوٹ لگائی۔ بھائی واہ اچھا بانگین ہے! تو بات کیا، جہاں دس دن ڈنڈ پیلے اور اہل پڑے۔ دو چار دن لکڑی پھینکی اور محلے والوں پر شیر ہو گئے۔ مٹی لوگ سر جھکا ہی کے چلتے ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے ایک پہلوان ایڑتے ہوئے نکلے، لنگوٹ باندھے، ملل کی چادر اوڑھے، دو تین پٹے ساتھ۔ ایک کسرو والے کے پاس کھڑے ہو گئے اور اس کے سر پر ایک دھوپ لگا دی۔ وہ پیچھے پھر کر دیکھتا ہے تو ایک دیو کھڑے ہیں۔ بولے تو پتھا جائے۔ کان دبا کر، دھپ کھا کر، دل ہی دل میں کوستا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں میاں پہلوان نے ایک خونچے والی کا خونچہ اُلٹ دیا۔ تین چار روپے کی منٹائی دھول میں مل گئی۔ جب اس نے غل غپاڑا پچایا تو پٹوں نے دو تین گدے، گھونے کے لگا دیے۔ دو چار تپڑ جما دیے۔ وہ ہچارہ روتا چلاتا، دہائی دیتا چلا گیا۔

آزاد سوچنے لگے کہ یہ تو کوئی بڑا ہی شیطان ہے کسی کے تپو کسی کے حمزہ، اچھی پہلوانی ہے! سارے شہر میں تھلکے مچا دیا۔ اس کی خبر نہ لی۔ تو کچھ نہ کیا۔ یہ سوچتے ہی میرا شیر جھپٹ پڑا اور پہلوان کے پاس جا کر گھٹنے سے ایسا دھکا دیا کہ میاں پہلوان نے اتنا بڑا ذیل ڈول رکھنے پر بھی جیس لڑھکنیاں کھائیں! مگر پہلوان سنبھلتے ہی ان کی طرف جھپٹ پڑا۔ تماشائی تو

کبھے کہ پہلوان آزاد کو چر مر کر ڈالے گا۔ لیکن آزاد نے پہلے ہی سے وہ داؤ بیچ کیے کہ پہلوان کے جھٹلے جھوٹ گئے۔ ایسا دہایا کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ اس نے جیسے ہی آزاد کا بایاں ہاتھ گھسیٹا انھوں نے داہنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ باندھا اور اپنا چہرہ، چنگیوں میں کو لے پر لا، گھٹنا ٹک کر مارا، چاروں شانے چت۔ پہلوان اب تک کورا تھا۔ کسی دنگل میں آسمان دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ آزاد نے جواتے آدمیوں کے سامنے پکٹی بتائی۔ تو بڑی کرکری ہوئی اور تمام عمر کے لیے داغ لگ گیا۔

اب تو میاں آزاد جگت گرد ہو گئے۔ ایک رنگ کا رنگ پیکا پڑ گیا۔ پہلوان نے پکٹی کھائی۔ شہر بھر میں دھوم ہو گئی۔ جدر سے نکل جاتے لوگ ادب کرتے تھے، جس سے آنکھیں چار ہوئیں اس نے زمین چوم کر سلام کیا۔ اچھے اچھے بانکوں کی کور دے بنے گی۔ جہاں کسی شہ زور نے کزور کو دبایا اور اس نے غل بچایا، دہائی میاں آزاد کی اور یہ بانوی لے کر آئی۔ کسی بد معاش نے کزور کو دبایا اور اس نے ڈانٹ بتائی؟ نہیں مانتے بلاؤں میاں آزاد کو، شہدے لٹے ان سے ایسے قمراتے تھے جیسے چوہے تلی سے یا مریض تلی سے۔ نام سنا اور بغلیں جھانکنے لگے۔ صورت دیکھی اور گلی کوچوں میں دبک رہے۔ شہر بھر میں ان کا ڈنکا بج گیا۔

ایک دن آزاد سروہی لیے ایزتے جارہے تھے کہ ایک درزی کی دکان کے پاس سے نکلے۔ دیکھتے کیا ہیں، رنگیلے پھیلے، بانکے جوان جھوٹے بیچ کا عملی جوتا پہنے، زلفیں لٹکائے، چھری کمر سے لگائے درزی سے تکرار کر رہے ہیں واہ میاں خلیفہ! تم نے تو ہمیں الٹے چھرے موٹا، خدا جانے، کس کتر بیوت میں رہتے ہو۔ سینا پروتا تو نام کا ہے ہاں زبان البتہ کترنی کی طرح چلا کرتی ہے تم سے کپڑے سلوانا اپنی مٹی خراب کرتا ہے۔ دم دھاگا دینا خوب جانتے ہو۔ ٹوپی ایسی بھوڑی بتائی کہ پھبتیاں سننے سننے ناکوں دم آگیا۔

درزی۔ اے تو حضور میں اس کو کیا کروں؟ میرا بھلا اس میں کیا قصور ہے؟ آپ کا سر ہی ٹیڑھا ہے۔ میں ٹوپی بتاتا ہوں سر بتانا نہیں جانتا۔

بانکے۔ چونچ سنجال، بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنا۔ بانکوں کے منہ لگتا ہے اور سینے ہلدا سر ٹیڑھا ہے۔ اے تیرا سر ساچے کا ڈھلا ہے۔ تیرے ایسے درزی میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ منہ بند کر، نہیں دوں گا الٹا ہاتھ۔ منہ ٹیڑھا ہو جائے گا اور قمارش دیکھیے، ہمارا سر گویا کدو ہو گیا۔

درزی۔ آپ مالک ہیں مل میری خطا نہیں۔ جیسا سرویس ٹوپی۔ ایسا سرو تو میں نے دیکھا ہی نہیں یہ نئی گرنٹ کا سر ہے آپ پھرے لیں بس میں سی چکا۔ جب دام دینے کا وقت آیا تو یہ جھپٹا لیا۔

یہ سنتے ہی ہانکے نے درزی کو اتار دیا کہ وہ بچا رہے دم ہو گیا۔ آخر کفن پھاڑ کر چھٹا ڈھائی میاں آزاد کی، ڈھائی میرے استاد کی۔ آزاد تو دور سے کھڑے دیکھ ہی رہے تھے۔ جھٹ نکوار سینٹ دکان پر پہنچ گئے۔ ہانکے نے پیچھے پھر کر دیکھا تو میاں آزاد۔

آزاد! واہ بھائی ہانکے تم بچ بچ رسم ہو بچارے درزی پر ساری چوٹیں صاف کر دی۔ کبھی کسی کڑے خاں سے بھی پالا پڑا ہے کہیں گوبار بھی لڑا ہے۔ یا غریبوں ہی پر شیر ہو۔ بڑے دلیر ہو تو آؤ۔ ہم سے بھی دو دو ہاتھ ہو جائیں تم ڈھیر ہو جاؤ یا ہم چکا کھائیں، آئیے۔ پھر پینٹر بدلے لگا بڑھ کر ہاتھ، ادھر یا ادھر۔

ہانکے۔ ہیں ہیں استاد ہمیں پر ہاتھ صاف کرو گے۔ ہم نو سکیمے تم گرد گھنٹال۔ مگر آپ اس کینے درزی کی طرف سے بولتے ہیں اور شریفوں پر نکوار بولتے ہیں۔ سبحان اللہ آئیے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

آزاد۔ اچھا، تو بہ کرو کہ اب کسی غریب کو نہ دھمکاؤ گے۔

ہانکے۔ حضرت دھمکا کر کیا، ہم تو خود ہی بلا میں پھنسنے ہیں۔ خدا ہی بچائے تو بچے۔ یہاں ایک مہلکیہ ہے اس سے ہم سے لاگ ڈاٹ ہو گئی ہے۔ کل نوچندی کے میلے میں ہمیں گھیرے گا۔ کوئی دو سو ہانکوں کے جتنے سے ہم حربہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ درگاہ نہ جائیں تو بائگین میں بد لگتا ہے اور جائیں تو کس برتے پر؟ یا تم ساتھ چلو تو جان بچے نہیں، تو بے موت مرے۔

آزاد۔ اچھا تم بھی کیا کہو گے! لو بیڑا اٹھا لیا کہ کل تم کو لے چلیں گے اور سب سے بڑے پڑیں گے۔ دو سو ہو چاہے ہزار۔ ہم ہیں اور ہماری کٹار، اتنی کٹاریں بھوکوں کے دم بند ہو جائے۔ مگر یہ بتا دو کہ قصور تمہارا تو نہیں ہے؟

ہانکے۔ نہیں استاد قسم لے لو، جو میری طرف سے پہل ہوئی ہو۔ مجھ سے انھوں نے ایک دن اکڑ کر کہا کہ تو نکوار نہ باندھا کر۔ میں بھی آپ جیسے انسان ہوں پتہ تو مچھلی کے بھی ہوتا ہے۔ مجھے بھی ہضم آگیا، میں نے کہا دھت، تو اور ہم سے تھمیار رکھو لے؟ بس بگڑ

ی تو گیا اور پندرہ بیس آدمی اس کی طرف سے بولنے لگے۔ میں نے بھی جواب دیا، دبا نہیں مگر لڑ پڑنا مصلحت نہ تھی۔ بانکا ہوں تو کیا ہوا، بنا سمجھے بوجھے بات نہیں کرتا۔ خیر اس نے لٹکار کر کہا۔ اچھا بچہ درگاہ میں سمجھ لیں گے۔ اب کی نوچندی میں ہمیں نہ ہوں گے یا تمہیں نہ ہوں گے۔

آزاد۔ اچھا تم لیس رہنا میں دو گھڑی دن رہے آؤں گا، گھبراؤ نہیں تمہارا بال بانکا ہو، تو مونچھ مونڈوا دوں۔ یہ دو سو آدمی دیکھنے ہی بھر کے ہوں گے، سچے دلیران میں دو ہی چار ہوں گے۔ جو آزاد کی تلواریں سامنا کریں۔ موت سے لڑنا دل لگی نہیں ہے، کیجیو چاہیے۔ دوسرے دن آزاد ہتھیار باندھ کر چلے تو راستے میں بانکے مل گئے اور دونوں ساتھ ساتھ ٹہکتے ہوئے درگاہ پہنچے۔

نوچندی جمعرات، بنارس کا بڑھوا منگل مات، چاروں طرف چہل پہل کہیں 'تماشا نیوں' کا ہجوم، ہٹو بچوں کی دھوم، آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں، کوسوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ میوے والے آواز لگا رہے ہیں۔ تنبولی بیڑے بنا رہے ہیں گڈیریاں ہیں کیڑے کی، ریڑیاں ہیں گلاب کی۔ آزاد گھورتے گھارتے پھانک پر داخل ہوئے تو دیکھا سامنے تیس چالیس آدمیوں کا غول ہے۔ بانکے نے کان میں کہا کہ یہی حضرت ہیں دیکھ لیجیے، دنگے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔

آزاد۔ بھلا یہاں تمہاری بھی کوئی جان پہچان ہے؟ ہو تو دس پانچ کو تم بھی بلا لو بھیڑ بھڑکا تو ہو جائے۔ لڑنے والے ہم کیا کم ہے مگر دو چار جمالی خربوزے بھی چاہیے۔ ڈالی کی رونق ہو جائے۔

بانکے۔ ابھی لایا آپ ٹھہریں مگر باہر ٹہلے تو اچھا ہے، یہاں جو کھم ہے۔ آزاد پھانک کے باہر ٹہلنے لگے۔ مہلکیٹ نے جو دیکھا کہ دونوں کھسکے تو آپس میں ہانڈیاں پکے لگیں۔ وہ بھگایا، وہ ہٹایا! بھاگا ہے! ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ آجی وہ بھاگا نہیں ہے ایک ہی کانیاں ہے کسی ٹوہ میں گیا ہے۔ ایک بگڑے دل باہر گئے تو دیکھا، بانکے پچھم کی طرف گردن اٹھائے چلے جاتے ہیں اور میاں آزاد پھانک سے دس قدم پر ٹھل رہے ہیں۔ اٹنے پاؤں آکر خبر دی۔ استاد بس یہی موقع ہے، چلیے مار لیا ہے۔ بانکیں پھانک سے چڑھ دوڑیں۔ ٹھہر بے، ٹھہر۔ بس رک جا آگے قدم بڑھایا اور ڈھیر ہوئے۔ ہلے اور دیا ٹٹا ہوا ہاتھ۔ یاد ہے کہ نہیں آج نوچندی ہے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بانکے کا رنگ

فق کہ غضب ہی ہو گیا۔ اب کتے کی موت مرے، کس کس سے لڑوں گا۔ ایک کی دوا دو، دو کہ سو، میاں آزاد کو کوئی خبر کر دیتا، تو وہ جھپٹ ہی پڑتے مگر جب تک کوئی جائے جائے ہمارا کام تمام ہو جائے گا۔ ایک یار نے بڑھ کر پچارے مصیبت کے مارے بانگے کے ایک لٹھ لگا دیا۔ بانس ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ غل غپاڑے کی آواز آزاد نے بھی سنی۔ بھیڑ کاٹ کر پہنچے۔ تو دیکھا بانگے پھنسے ہوئے ہیں۔ تلوار کو نیکا اور دن سے اس پار ہوئے۔ خبردار کھلاڑی! ہاتھ اٹھایا اور میں نے ٹیٹا لیا۔ بانگے کے دل میں ڈھارس ہوا جان بچی غنی زندگی ہوئی۔ اتنے میں میاں آزاد نے تلوار میان سے نکالی اور ہل پڑے۔ تلوار کا چمکنا تھا کہ بھکیٹ کے سب ساتھی ہر ہو گئے۔ میدان خالی، میاں آزاد اور بانگے ایک طرف بھکیٹ اور دو ساتھی دوسری طرف۔ باقی رفوجا۔ ایک نے آزاد پر طنز چلایا مگر خالی گیا۔ آزاد نے جھپٹ کر اس کو ایسا چمک دیا کہ تھلا کر گر پڑا۔ دوسرے جوان دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بانگے بھی کھسک گئے اب آزاد اور بھکیٹ آمنے سامنے رہ گئے۔ وہ کڑک کر جھکا۔ انھوں نے چوٹ روک کر سر پر ہاتھ لگانا چاہا۔ اس نے روکا اور چاکی کا ہاتھ دیا۔ آدھ گھنٹے تک شاپ تلوار چلائی۔ آخر آزاد نے بڑھ کر جینو کا ہاتھ لگایا کہ 'بھنڈاڑ' تک کھل گیا۔ مگر بھکیٹ بھی گرتے گرتے 'باہرا' دے ہی گیا۔ ادھر یہ، ادھر وہ دم سے گرے۔ تب بانگے دوڑے اور آزاد کو اٹھا کر گھر لے گئے۔

(2)

آزاد کی دھاک ایسی بندوقی کہ نوابوں اور رئیسوں میں بھی ان کا ذکر ہونے لگا۔ رئیسوں کو مرض ہوتا ہے کہ پہلوان، بھکیٹ، دن دپے کو ساتھ رکھیں، کبھی پر لے کر ہوا کھانے نکلے۔ ایک نواب صاحب نے ان کو بھی بلوایا۔ یہ چمپلا بنے ہوئے، دوہری تلوار کمر میں لگائے جا پہنچے۔ دیکھا، نواب صاحب، اپنی ماں کے لاڈلے، بھولے بھالے، اندھیرے گھر کے اجالے، مسند پر بیٹھے چچان کر گڑا رہے ہیں۔ ساری عمر محل کے اندر ہی گزری تھی، کبھی گھر کے باہر جانے تک کی بھی نوبت نہ آئی تھی، گویا باہر قدم رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ دن بھر کمرے میں بیٹھنا، یاروں دوستوں سے کہیں اڑانا، کبھی چوسر رنگ جمایا، کبھی بازی لڑی، کبھی پو پر گوٹ پڑی، پھر شرنج بھی، مہرے کھٹ کھٹ پننے لگے۔ کشت! وہ گھوڑا پیٹ لیا، وہ پیادہ مار لیا۔ جب دل گھبرایا، جب دمک کا دم لگایا، چندو کے چمپنے اڑائے، انیم کی چسکی لی۔ آزاد نے جھک

کر سلام کیا۔ نواب صاحب خوش ہو کر گلے ملے، اپنے قریب بٹھایا اور بولے — میں نے سنا ہے، آپ نے سارے شہر کے بانکوں کے پچکے چھڑا دیے۔
آزاد۔ یہ حضور کا اقبال ہے، ورنہ میں کیا ہوں۔

نواب : میرے مصاحبوں میں آپ ہی جیسے آدمی کی کمی تھی، وہ پوری ہوگئی، اب خوب چھنے کی۔

اتنے میں میرا آغا بیڑ کو موٹھ کرتے ہوئے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ذرا دیر کے بعد اچھے مرزا آگیا چھیلتے ہوئے آئے اور ایک کونے میں جا ڈٹے۔ میاں تھمن انگریجے کے بند کھولے، گدڑی پر ٹوپی رکھے کھٹ سے موجود۔ پھر کیا تھا، تو آ، میں آ۔ دس پندرہ آدمی جمع ہو گئے، مگر سب جھنڈے تلے کے شہدے، چھنے ہوئے گر گئے تھے، کوئی چینی کے پیالے میں انیم گھول رہا ہے، کوئی چندو کا قوام بنا رہا ہے، کسی نے گڑیاں بنائی، کسی نے امیر حمزہ کا قصہ چھیڑا، سب اپنے اپنے دھندے میں لگے۔ نواب صاحب نے میرا آغا سے پوچھا : میرا صاحب، آپ نے خفکے کا درخت بھی دیکھا ہے؟

میرا آغا : حضور، قسم ہے جناب امیر کی، ستر اور دو بہتر برس کی عمر ہونے کو آئی، غلام نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا، لیکن ہوگا بڑا درخت۔ ساری دنیا کی اس سے پرورش ہوتی ہے، جسے دیکھو، خفکے پر ہتھے لگاتا ہے۔

اچھے مرزا : قربان جاؤں، درخت کے بڑے ہونے میں کیا شک ہے۔ کشمیر سے لے کر، قربان جاؤں، بڑے گاؤں تک اور لندن سے لے کر ولایت تک، سب کا اسی پر دار و مدار ہے۔

نواب : میرا بھی خیال یہی ہے کہ درخت ہوگا بہت بڑا، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آخر کس درخت سے زیادہ ملتا ہے۔ اگر یہ بات معلوم ہو جائے، تو پھر جانے کہ ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ اور بھائی، سچ پوچھو، تو چھان بین کرنے ہی میں زندگی کا مزہ ہے۔

اچھے مرزا : سنا، برگد کا درخت بہت بڑا ہوتا ہے۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانے، نیم کا بیڑ تو ہم نے بھی دیکھا ہے، لیکن کسی شاعر نے نیم کے درخت کی بڑائی کی تعریف نہیں کی۔
چھٹن : ہم نے کیلے کا بیڑ، امرود کا بیڑ، خربوزے کا بیڑ، سب انھیں آنکھوں دیکھ ڈالے۔

آزاد: بھلا یہاں کسی نے واہ واہ کی پھلیوں کا بیڑ بھی دیکھا ہے؟
 چمن: جی ہاں، ایک دفعے نیپال کی ترائی میں دیکھا تھا، مگر شیر جو ڈکارا، تو میں جھپ
 سے گیندے کے درخت پر چڑھ گیا۔ کچھ یاد نہیں کہ پتی کیسی ہوتی ہے۔
 نواب: خشکے کے درخت کا کچھ حال دریافت کرنا چاہیے۔
 اچھے مرزا: قربان جاؤں، ان لوگوں کا اعتبار کیا؟ سب سنی سنائی کہتے ہیں! قربان
 جاؤں، غلام نے وہ بات سوچی ہے کہ سنتے ہی پھڑک جائیے۔
 نواب: کہیے، کہیے! ضرور کہیے! آپ کو قسم ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ دور کی کوڑی
 لائے ہوں گے۔

اچھے مرزا: (کتارے کو کھڑا کر کے) قربان جاؤں، اگر خشکے کا درخت ہوگا، تو اس
 کتارے کے برابر ہی ہوگا، نہ ہو بھر بڑا، نہ تل بھر چھوٹا۔
 نواب: واہ میر صاحب، واہ، کیا بات نکالی!

مصاحب: سبحان اللہ میر صاحب، کیا سوچھ بوجھ ہے!
 آزاد: آپ تو اپنے وقت کے لال بھٹکر نکلے! معلوم ہوتا ہے، سفر بہت کیا ہے۔
 اچھے مرزا: کون، میں نے سفر! قسم لو، جو نخاس سے باہر گیا ہوں۔ مگر قربان جاؤں،
 لڑکپن ہی سے ذہین تھا۔ ابا جان تو بالکل بیوقوف تھے، مگر اتنا جان تو بلا کی عورت تھیں،
 بات میں بات پیدا کرتی تھیں۔

اتنے غل غپاڑے کے آواز آئی۔ اندر سے مبارک قدم لونڈی سر چٹکتی ہوئی آئی —
 حضور، میں صدقے، جلدی چلیے، یہ ہنگامہ کہاں ہو رہا ہے؟ بڑی بیگم صلابہ کھڑی رو رہی ہے کہ
 میرے بچے پر آج نہ آجائے۔

نواب صاحب جوتیاں چھوڑ کر اندر بھاگے۔ دروازے سب بند! اب کسی کو حکم نہیں کہ
 زور سے بولے۔ اتنے میں ایک مصاحب نے ڈیوڑھی پر سے پکارا — حضور، پھر آخر میاں
 آزاد کس مرض کی دوا ہے؟ گزیری پھیلنے کے کام کے نہیں، قوام بنانا نہیں جانتے، ٹیر منٹیا
 نہیں آتا، ان کو بھیج کر دریافت کرائیے کہ دنگ کہاں ہو رہا ہے۔

مبارک قدم: ہاں ہاں۔ بھیج دیجیے۔ کہیے کتے کی چال جائیں اور بلی کی چال آئیں۔
 میاں آزاد نے کتار سنبھالی اور باہر نکلے۔ راہ میں لوگوں سے پوچھتے جاتے رہے کہ

بھائی یہ فساد کیا ہے؟ ایک نے کہا۔ جی چک منڈی میں چھری چلی۔ پانچ چار قدم آگے بڑھے تو دو آدمی باتیں کرتے جاتے تھے کہ پنساری نے پٹریاں میں کدو کے بیجوں کی جگہ جمال گوتا باندھ دیا۔ گاہک نے مجبوز کر پنساری کی گردن تاپی اور دس قدم چلے تو ایک آدمی نے کہا۔ وہ تو کیسے خیریت گزری کہ جاگ ہو گئی نہیں تو بھیڑیا گھر بھر کو اٹھالے جاتا۔ یہ بھیڑیا کیسا جی؟ حضور ایک منیہار کے گھر سے بھیڑیا تین بکریاں، دو مینڈے، ایک خرہا اور ایک خالی پنجرا اڑالے گیا۔ اس کی عورت کو پیٹھ پر لاد چکا تھا کہ منیہار جاگ اٹھا اب آزاد پکرائے کہ بھائی عجب بات ہے جو ہے نئی سنانا ہے۔ قریب پہنچے تو دیکھا، پندرہ بیس آدمی مل کر چھپر اٹھاتے ہیں اور غل مچا رہے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں اور ہنسی تو یہ آتی ہے کہ نواب صاحب بدحواس ہو کر گھر کے اندر ہو رہے۔ وہاں سے لوٹ کر یہ قصہ بیان کیا، تو لوگوں کی جان میں جان آئی، دروازے کھلے، پھر نواب صاحب باہر آئے۔

نواب : میاں آزاد تمہاری دلیری سے آج جی خوش ہو گیا۔ آج میرے یہاں کھانا کھانا۔ آپ ڈھال نہیں باندھتے؟

آزاد : حضور، ڈھال تو زمانوں کے لیے ہے۔ ہم عمر بھر ایک انگ لڑا کیے، تلوار سے چوٹ لگائی اور اسی پر روکی، یا خالی دی، یا کاٹ گئے، ایک دن آپ کو تلوار کا کچھ ہنر دکھاؤں گا۔ آپ کی آنکھوں میں تلوار کی باڑھ سے سرمہ لگاؤں گا۔

نواب : نا صاحب یہ کھیل اجڑپن کے ہے۔ میری روح کا نپتی ہے۔ تلوار کی صورت دیکھتے ہی جوڑی چڑھ آتی۔ ہاں مرزا صاحب جیوٹ کے آدمی ہے ان کی آنکھوں میں سرمہ لگائیے۔ یہ اف کرنے والے نہیں۔

ابھے مرزا : قربان جاؤں حضور اب بال پک گئے ہیں۔ دانت چوہوں کی نظر ہوئے۔ کمر میز می ہوئی۔ آنکھوں میں لکا سا جواب دیا ہوش حواس چیت ہوئے۔ کیا کہوں حضور جب لوگوں کو گٹھڑیاں چوستے دیکھتا ہوں تو منہ دیکھ کر رہ جاتا ہوں۔

اسنے میں میاں کمالی میاں مھمن اور میاں دنی بھی آئیے۔

کمالی : خداوند، آج تو عجب خبر سنی۔ حواس جاتے رہے۔ شہر بھر میں کھلبلی مچی ہے اللہ بچائے۔ اب کی گرمی فصل خیریت سے گزرتی نہیں نظر آتی۔ آثار برے ہیں۔

نواب کیوں کیوں؟ خیر تو ہے کیا قیامت آنے والی ہے یا آفتاب سوانیزے پر ہو رہا۔

آخر ماجرا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔

اچھے مرزا: اے حضور، یہ جب آتے ہیں ایک نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں۔ خدا جانے کون ان کے کان میں پھونک جاتا ہے ایسی سنائی کہ نشہ ہرن ہو گیا، جمائیاں آنے لگیں۔ کمالی: اچی، آپ کس کھیت کی مولیٰ ہے، ہم سے تو بڑے بڑوں کے نشے ہرن ہوئے ہیں۔ جب پہلی تاریخ آئے گی تو آنکھیں کھل جائے گی۔ آٹے دال کا بھاء معلوم ہو جائے گا اور دو چار دن بیٹھے نکلے اڑا لو۔ واہ صاحب ہم تو ڈھونڈ دھانڈ کر خبر لائیں۔ آپ دن بھر پینک میں اوجھسا کریں اور ہمیں کو آلو بنائیں۔ پہلی کو قلعی کھل جائے گی۔ بچا صورت بگڑ جائے تو سہی۔

نواب: کیا! کیا! پہلی تاریخ کیسی؟ ارے میاں تم تو پہیلیاں بھجاتے ہو۔ آخر پہلی کو کیا ہونے والا ہے؟

کمالی: اے حضور یہ نہ پوچھیے بس کچھ کہا نہیں جاتا۔ ایک حلوائن ابھی جوان جہان ہے۔ مارے ہو کے کے اوتا دودھ جو پی گئی تو پیٹ پھول کر ٹپا ہو گیا۔ کسی نے کچھ بتایا۔ کسی نے کچھ نسخہ پلایا۔ مگر وہ انڈا غفیل ہو گئی۔ اب سینے کہ جب چتا پر جانے لگی۔ کلبلا کر اٹھ بیٹھی۔ ارے رام۔ ارے باپ رے باپ۔ یو کا بھوا؟ حلوائیوں نے ۵۰ بم جج پچائی کہ کچھ نہ پوچھیے یو دیکھو لہاس بلیٹ ہے۔ ارے یو کیا اندھیر بھوا؟ آخر کار دو چار حلوائیوں نے جی کڑا کر کے لاش کو تھپٹ لیا اور جھپٹ کنن پھاڑ کر اسے نکالا۔ تو نیاں سی اٹھ بیٹھی۔ حضور قسم ہے خدا کی اس نے وہ باتیں بیان کی کہ کہیں نہیں جاتیں۔ جب مری تو جراج کے دو توں نے مجھے اٹھا کر بھگوان کے پاس پہنچایا سیتا جی بیٹھی پوری بلیٹ رہیں ہم کا دیکھ کے بھگوان بولے کہ اس کو لے جاؤ۔ مجھے اس کی بولی تو یاد نہیں مگر مطلب یہ تھا کہ پہلی کو بڑا اندھیر گھپ چھا جائے گا اور طوفان آئے گا جتنے گنہگار بندے ہے سب جلائے جائیں گے اور اچھی جس گھر میں ہوں گے اس کو فرشتے جلا کر خاک سیاہ کر دے گے۔

نواب: مرزا صاحب یہ بوریہ بندنا اٹھائیے آپ کا یہاں ٹھکانا نہیں۔ ناحق کہیں فرشتے میری کوشی پھونک دیں تو کہیں کا نہ رہو۔ بس قچا سنبھالے کہیں اور بستر جمائیے۔

اچھے مرزا: قربان جاؤں حضور یہ بڑا بے ایمان آدمی ہے حضور تو بھولے بھالے رئیس ہیں جس نے جو کہا مان لیا۔ بھلا کہیں فرشتے گھر پھونکا کرتے ہیں؟ مجھ بڑھے کو نہ نکالے کئی

پشتیں اسی دربار میں گزر گئیں۔ اب کس کا دامن پکڑوں؟ ارے واہ رے جھوٹے۔ اچھی بے پر کی اڑائی۔ حلوائی مری بھی اور جی بھی اٹھی۔ بے سر پیر کی بات۔

نواب: خیر کچھ بھی ہو۔ آپ اپنا سچا کریں۔ میرے باپ دادا کی ملکیت کہیں فرشتے پھونک دیں تو بس! آپ ہیں کس مرض کی دوا، چار پائیاں توڑا کرتے ہیں،

اچھے مرزا!

واہ ری قسمت یہاں جان لڑادی۔ بکرے کی جان گئی۔ کھانے والے کو مزا نہ آیا، اس شیطان سے خدا سمجھے جس نے میرے حق میں کانٹے بوئے۔ خدا کرے اس کا آج کے ساتویں ہی دن جنازہ نکلے۔ جیسے ہی آکر بیٹھا میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ سو یہ گل کھلا۔

نواب صاحب مصاحبوں کو یہ نادری حکم دے کر زمان خانے میں چلے گئے کہ مرزا کو نکلوا دو ان کو جاتے ہی مرزا کی لے دے شروع ہو گئی۔

کمالی۔ مرزا صاحب انیم کا ڈبہ بغل میں دبائیے اور چلتے پھرتے نظر آئیے۔ سرکار کا نادری حکم ہے اور چھوٹی بیگم صاحبہ مہنا متھ پجاری ہے اس بڑھے کو کھڑے نکال دو۔ سواب۔ کھکے نہیں بری ہوگی۔

جھمن۔ واجبی بات ہے سرکار چلتے چلتے حکم دے گئے تھے۔ ہم لوگ مجبور ہیں۔ اب آپ اپنا سیتا کیجیے ابھی سویرا ہے نہیں ہم پر پنس پڑے گی اور بھائی جب فرشتوں کے آنے کا ڈر ہے تو کوئی تم کو کیوں کر اپنے گھر میں رہنے دے؟ کہیں ایک ذرا سی چنگاری رکھ دے تو کیسے مکان جل کر خاک سیاہ ہو گیا کہ نہیں پھر کیسی ہوگی۔

اچھے مرزا: ابے تو فرشتے کہیں گاؤں جلایا کرتے ہیں وہ اونٹ پناگ باتیں بکتا ہے لو صاحب ہمارے رہنے میں جو حکم ہے جو آٹھوں دیوڑھی پر بنے رہتے ہیں۔ اچھا اڑنگا دیا۔

جھمن: اڑنگا بڑنگا میں نہیں جانتا۔ اب آپ کھسکت کی ٹھہرائیے۔ بہت دن بیٹھے ٹکڑے اڑائے۔ چنلیاں کھا کھا کر رئیس کا مزاج بگاڑ دیا۔ کسی سے ذرا سی خطا ہوئی اور آپ نے جزدی۔ مہمس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی۔ پچاسو بھلے مانسوں کی روٹی لی۔ انسان سے غلطی ہوئی جاتی ہے یہ چنلی کھانا کیا معنی۔ اوغفور مرزا نے تمہیں بھی تو اکھاڑنا چاہا تھا؟

غفور: ارے یہ تو اپنے باپ کی جڑ کھودنے والے آدمی ہیں۔ بھیترے سے باہر تک کوئی تو

ان سے خوش نہیں۔

دینی: مرزا اگر کچھ حیا ہے تو اس مصاحبی پر لات مارو جس اللہ نے منہ چیرا ہے وہ روزی بھی دے گا۔

مبارک قدم: غفور۔ غفور۔ غفور چھوٹی بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ اس موے انہی کو شہر سے نکال دو۔ کہتی ہے جب تک یہ نہ ٹلے گا ذہن ہاتھ کا کھانا حرام ہے۔

اچھے مرزا: شہر سے نکال دو تمام شہر پر بیگم صاحبہ کا کیا اجارہ ہے؟ وہ ابھی کل آئی۔ یہاں اس گھر میں عمر بیت گئی۔

کمالی: ابے اونٹنک حرام۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بیگم صاحبہ کے کہنے کو ڈلکھتا ہے۔ اتنی پڑے گی بے بھاد کی، کہ یاد کرو گے۔ چاند کنجی کر دی جائے گی۔

اچھے مرزا: اب جو یہاں پانی پئے اس پر لعنت۔

یہ کہہ کر مرزا نے افیم کی ڈیبا اٹھائی اور چلے۔ مصاحبوں نے ان کے جلانے کے لیے کہنا شروع کیا۔ مرزا جی کبھی کبھی آجایا کیجیے گا۔ ایک بولا لائیے ڈیبا میں پچا دوں۔ دوسرا بولا کیسے تو گھوڑا کسوادوں۔ مرزا نے کسی کو کچھ جواب نہ دیا۔ چپکے سے چلے ہی گئے۔

ادھر پہلی تاریخ آئی تو میاں کمالی چکرائے کہ اب میں جھوٹا بنا اور ساکھ گئی لوگوں نے نواب کو چنگ پر چڑھایا کہ حضور جو ہم کہیں وہ کیجیے۔ تو آج کی بلائیں جائے۔ نواب نے مصاحبوں کو سارا اختیار دے دیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک طرف برہمن دیوتا بیٹھے منتر دے کا جپ کر رہے ہیں ہون ہو رہا ہے اور سواہا سواہا کی آواز آرہی ہے دوسری طرف حافظ جی قرآن پڑھ رہے ہیں اور دیوان خانہ میں محفل جمی ہوئی ہے کہ فرشتوں کو جھنجھوٹی کی دھن سنا کر خوش کر لیا جائے۔

جھمن: مرزا جی نہ سدھارتے تو خدا جانے اس وقت کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔

نواب: ہوتا کیا، کوشی کی کوشی بھک سے اڑ جاتی۔ اب کسی انہی کو آنے تک نہ دوں گا۔

(3)

نواب صاحب کے دربار میں دنوں دن آزاد کو ستان بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اکثر کھانا بھی نواب کے ساتھ ہی کھاتے۔ نوکروں کو تاکید کر دی گئی کہ آزاد کا جو حکم ہو، فوراً بجا

لائیں۔ ذرا بھی میخ نہ کریں۔ جوں جوں آزاد کے گن نواب پر کھلتے جاتے تھے، اور مصاحبوں کی کرکری ہوتی جاتی تھی۔ ابھی لوگوں نے اچھے مرزا کو دربار سے نکلوایا تھا، اب آزاد کے پیچھے پڑے۔ یہ صرف پہلوانی ہی جانتے ہیں، گد کے اور بوٹ کی دو چار ہاتھ کچھ سیکہ لیے ہیں، بس اسی پر اکڑتے پھرتے ہیں کہ جو کچھ ہوں، بس میں ہی ہوں۔ پڑھے لکھے واجبی ہی واجبی ہیں۔ شاعری انہیں نہیں آتی۔ مذہبی معاملوں میں بالکل کورے ہیں۔

ایک دن نواب صاحب کے سامنے ایک صاحب بول اٹھے۔ حضور اس شہر میں ایک عالم آیا ہے۔ جو منطق کے زور سے جھوٹ کو جک کر دکھاتا ہے مگر خدا کو نہیں مانتا۔ پکا منکر (ناسک) ہے میاں آزاد کو منطقی بننے کا دعویٰ ہے۔ کہیے اس عالم کو نیچا دکھائیں۔

آزاد: ہاں! ہاں! — جب کہیے تب، مجھے تو ایسے منکروں کی تلاش رہتی ہے۔ لائیے منطقی صاحب کو، خدا کا وہ پکا ثبوت دوں کہ وہ خود پھڑک جائے، ذرا یہاں تک لائیے تو سہی، بھاگے راہ نہ ملے۔ جو پھر اس شہر میں منہ دکھائے، تو آدمی نہ کہنا۔

نواب: ہاں! ہاں! میر صاحب، ذرا ان کو پھانس پھونس کر لائیے، تو میاں آزاد کے جوہر تو کھلیں۔

میر صاحب نے زور سے حق کے دو چار دم لگائے اور جھپ سے اس عالم کو بلا لائے۔ ہزاروں آدمی بحث سننے کے لیے جمع ہو گئے، گویا بیروں کی پالی ہے۔ اتنی بھیڑ تھی کہ تعالیٰ اچھا لیے تو سر ہی سر جائے۔ عالم نے آتے ہی پوچھا کہ کون صاحب بحث کریں گے؟ میاں آزاد بولے — ہم ہیں۔ اب سب لوگ بے قرار ہو رہے ہیں کہ دیکھیں، کیا سوال جواب ہوتے ہیں، چاروں طرف کھجڑی پک رہی ہے۔

عالم: جناب، آپ تو کسی اکھاڑے کے پٹھے معلوم ہوتے ہیں، صورت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو منطق چھو بھی نہیں گئی۔

آزاد: جی، صورت پر نہ جائے گا، کوئی سوال کیجیے، تو ہم جواب دیں۔

عالم: اچھا، پہلے ان تین سوالوں کا جواب دیجیے۔

(1) خدا ہے، تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟

(2) شیطان دوزخ میں جلایا جائے گا۔ بھلا ناری (آگ سے بنے ہوئے) کو آگ کا

کیا ڈر؟ آگ آگ میں نہیں جل سکتی۔

(3) جو کرتا ہے، خدا کرتا ہے، پھر انسان کا قصور کیا؟

چاروں طرف سنا پڑ گیا کہ وہاں، کیا عالم ہے، کیسے کڑے سوال کیے ہیں کہ کچھ جواب ہی نہیں سوجھتا۔ مجھے دل لوگ دانتوں میں رہے ہیں کہ باہر نکلے تو گردن بھی ٹاپے۔ میاں آزاد کچھ دیر تک تو چپ چاپ کھڑے رہے، پھر ایک ڈھیلا اٹھا کر اس عالم کی کھوپڑی پر مارا، بچارہ ہائے کر کے بیٹھ گیا۔ اچھا جنگلی سے پالا بڑا، میں بحث کرنے آیا تھا، یا لپٹا ڈنگی۔ جب کچھ جواب نہ سوجھا، تو پھر مارنے لگے۔ جو میں بھی ایک پتھر کھینچ ماروں، تو کیسی ہو؟ نواب صاحب، آپ ہی انصاف کیجیے۔

نواب: بھائی آزاد، ہمیں یہ تمہاری حرکت پسند نہیں آتی۔ یہ ڈھیلے بازی کے کیا معنی؟ مانا کہ منکر گردن مارنے لائق ہوتا ہے، مگر بحث کر کے قائل کیجیے، یہ نہیں کہ جوتا کھینچ مارا یا ڈھیلا تان کر مارا۔

کمالی: حضور، عالم کا جواب دینا کارے دارد ہے۔ ڈھیلے بازی کرنا دوسری بات ہے۔
جھمن: امی، اس نے بڑے بڑے عالموں کو سر کر دیا، بھلا آزاد کیا اس کے منہ آئیں گے۔

نواب: یہ پتھر کیوں پھینکا جی، بولتے کیوں نہیں؟
آزاد: حضور، میں نے تو ان کے تینوں سوالوں کا وہ جواب دیا کہ اگر کوئی قدرداں ہوتا تو گلے سے لگا لیتے اور کرڈڑوں روپے انعام بھی دیتا، سنیے۔

(1) خدا ہے سو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟
جواب: اگر اس ڈھیلے سے ان کے چوٹ لگی، تو چوٹ نظر کیوں نہیں آتی؟
سبحان اللہ کا ڈھنگڑا برس گیا۔ واہ استاد! کیا جواب دیا ہے کہ دانت کھسے کر دیئے۔
(2) شیطان کو جہنم میں جلاتا بیکار ہے، وہ تو خود ناری (اگنی سے) ہے۔
جواب — ان سے پوچھئے کہ یہ مٹی کے ہی پتلے ہیں یا نہیں؟ ان کی کھوپڑی مٹی کی بنی ہے یا بڑکی؟ پھر مٹی کا ڈھیلا لگا، تو سر کیوں بھٹا گیا؟

تماشاویوں نے غل جھایا۔ سبحان اللہ! واہ میاں آزاد! کیا منہ توڑ جواب دیا ہے!
(3) جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔

جواب: پھر ڈھیلے مارنے کا الزام ہم پر کیوں ہے؟

چاروں طرف ٹوپیاں اچھٹنے لگیں۔ واہ میرے شیر! کیا کہنا ہے! کیجیے، اب تو آپ خدا کے قائل ہوئے، یا اب بھی کچھ مین بیخ ہے؟ لاکھ باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ جب آپ کا سر مٹی کا ہے اور مٹی ہی کا ڈھلا مارا، تب آپ کی کھوپڑی کیوں بھٹائی؟ میاں مگر بہت چھپے، سمجھ گیا کہ یہاں شہدوں کا تھمکھٹ ہے، چپکے سے اپنے گھر کی راہ لی۔ آزاد کی اور بھی دھاک بندھی۔ اب تک تو پہلوان اور مہکیت ہی مشہور تھے، اب عالم بھی مشہور ہوئے۔ نواب نے پیٹھ ٹھوکی، واہ کیوں نہ ہو! پہلے تو میں جھلایا کہ ڈھیلے بازی کیسی، مگر پھر تو پھڑک گیا۔

مصاحبوں کا یہ وار بھی خالی گیا، تو پھر ہنڈیا پکنے لگی کہ آزاد کو اکھاڑنے کی کوئی دوسری تدبیر کرنی چاہیے۔ اگر یہ یہاں جم گیا تو ہم سبھی کو نکلوا کر چھوڑے گا، یہ رائے ہوئی کہ نواب صاحب سے کہا جائے، حضور، آزاد کو حکم دیں کہ بیروں کو مٹھیاں، بیروں کو لڑائیں۔ پھر دیکھیں بچہ کیا کرتے ہیں بغلیں نہ جھانکنے لگیں، تو سہی۔ یہ ہنر ہی دوسرا ہے۔

آپس میں یہ صلاح کر ایک دن میاں کمالی بولے۔ حضور، اگر میاں آزاد بیروں لڑائیں تو سارے شہر میں حضور کی دھوم ہو جائے۔

نواب: کیوں میاں آزاد، کبھی بیروں بھی لڑائے ہیں؟

تھمن: آزاد ہماری سرکار میں جتنی بیروں ہیں، اتنے تو میاں برج کے چڑیاں خانے میں بھی نہ ہوں گے۔ ایک ایک بیروں ہزار ہزار کی خرید کا، نوک دم کے بنانے میں توڑے کے توڑے اڑ گئے، سیروں موتی تو پیس کر میں نے اپنے ہاتھوں کھلا دیئے ہیں، کچھ دنوں روز کھل چلتا تھا۔ مگر آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ اس دیوڑی پر اتنے دنوں سے ہو، اب تک بیروں خانہ بھی نہ دیکھا؟ لو آؤ، چلو، تم کو سیر کرائیں۔

یہ کہ کر آزاد کو بیروں خانے لے گئے۔ میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف کابکس ہی کابکس نظر آتی ہیں، اور کابکس بھی کیسی، ہاتھی دانت کی تیلیاں، ان پر گنگا جمنی۔ کلس، کار چوٹی چھتیں، کامدار مٹلی غلافیں رنگ رنگی سونے چاندی کی نضی نضی کٹوریاں، جن میں بیروں اپنی پیاری پیاری چونچوں سے پانی میٹیں، پانچ پانچ چھ چھ سولا گت کی کابکس تھیں، کھونیاں بھی رنگ رنگی۔ دنی میاں ایک ایک کابکس اتار کر بیروں کی تعریف کرنے لگے، تو پل باندھ دیئے۔ ایک بیروں کو دکھا کر کہا۔ اللہ رکھے، کیا مھولا جانور ہے! صف شکن (دل سنہار) جو آپ نے سنا ہو تو یہی ہے۔ لندن تک خبر کے کاغذ میں ان کا نام چھپ گیا۔ میری جان کی قسم، ذرا

اس کی آن بان تو دیکھیے گا۔ ہائے کیا باکا بنیر ہے! یہ نواب صاحب کے دادا جان کے وقت کا ہے۔ ایسے رئیس پیدا کہاں ہوتے ہیں دم کے دم میں لاکھوں پھونک دیئے، روپے کو ٹھیکڑا سمجھ لیا۔ چنگ بازی کا شوق ہوا تو شہر بھر کے چنگ بازوں کو نہال کر دیا، کنکڑے والے بن گئے۔ امی، اور تو اور لوٹے، جو گلی کوچوں میں ننگر اور لٹے لے لے کر ڈور لٹا کرتے ہیں، روز ڈور چچ چچ کر چکھوتیاں کرتے تھے۔ افیم کا شوق ہوا، تو اتنی خریدی کہ ٹکے سیر سے سولہ روپے سیر بکنے لگی۔ مالوا خالی، چین کھل! بسہی تک کے منے آتے تھے۔

آزاد: ایسے ہی کتنے رئیس بڑ گئے۔

کمالی: رئیسوں کے بننے بگڑنے کی کیا فکر۔ یہاں تو جو شوق کیا، ایسا ہی کیا، پھر بھلا بنیر بازی میں ان کے سامنے کون ٹھہرتا۔ ان کے وقت کا اب یہ ایک صف شکن باقی رہ گیا ہے۔ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بس یہ سمجھیے کہ محمد علی شاہ کے وقت میں خریدا گیا تھا۔ اب کوئی سو برس کا ہوگا، دو کم یا دو اوپر، مگر بڑھاپے میں بھی وہ دم خم ہے کہ مرنے کو لپک کر لات دے تو وہ بھی جیس بول جائے۔ پارساں کی دل لگی سنئے، نواب صاحب کے ماموں تشریف لائے۔ ان میں بھی ریاست کی بو ہے، کنکڑا تو ایسا لڑاتے ہیں کہ میاں ولایت ان کے آگے پانی بھریں۔ دو دو تولے افیم پی جائیں اور وہی دم خم۔ بنیر بازی کا بھی پرے سرے کا شوق ہے۔ ان کا ظفر پیکر تو بلا کا بنیر ہے، بنیر کیا ہے، شیر ہے، میرے منہ سے نکل گیا کہ حضور کو تو بنیروں کا بہت شوق ہے، کروڑوں ہی بنیر دیکھ ڈالے ہوں گے، مگر صف شکن سا بنیر تو حضور نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ بولے، اس کی حقیقت کیا ہے، ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں، بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا، آپ کو نوک دم پالی باہر کر دے۔ حوصلہ ہو، تو منگواؤں۔

دوسرے دن پالی ہوئی، ہزاروں آدمی اپنے شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکہ کا جوڑ ہے۔ ظفر پیکر اس ٹھاٹ سے آیا کہ زمین مل گئی، اور میرا تو کلیجہ دہلنے لگا۔ مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی۔ جیسی تو نواب صاحب اس کو بچوں سے بھی زیادہ پیار کر لیتے ہیں۔ پہلے اس کو دانہ کھلوا لیتے ہیں، پھر کہیں آپ کھاتے ہیں۔ ایک دن خدا جانے جلی دیکھی یا کیا ہوا کہ اپنے آپ پھڑکنے لگا۔ نواب سمجھے کہ بوندا ہو گیا، پھر تو ایسے دھار دھار روئے کہ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ میں نے نواب صاحب کو کبھی روتے نہیں دیکھا۔ محرم کی مجلسوں میں

ایک آنسو نہیں دلا۔ جب بڑے نواب صاحب سدھارے تو آنسو کی ایک بوند نہ گری، یہ شیر ہی ایسا اہول ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس دن نواب کی سات لڑکیوں پر احسان کیا۔ واللہ جو کہیں گھٹ جاتا، تو میں تو جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جگ میں آمدی آمد تو ہے، اور کیا، خیر صاحب، جیسے ہی دونوں ہلکی کھاچے، ظفر پیکر ہلکی کی طرح صف شکن کی طرف چلا۔ آتے ہی دبوچ بیٹھا، چوٹی کو چومنے سے پکڑ کر ایسا جھینٹا کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھر سے بھاگ دلا۔ نواب کا چہرہ فح ہو گیا، منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں کہ اتنے میں صف شکن لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیر! خوب پھر!!! پالی بھر میں آواز کو نہ سنے گی کہ وہ مارا ہے۔ ایک لات ایسی بجائی کہ ظفر پیکر نے منہ پھیر لیا۔ منہ کا پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اچک کر ایک جھنجھوٹی بتلائی۔ واہ بھٹے، اور لگا! آخر ظفر پیکر نوک دام پالی باہر بھاگا۔ چاروں طرف ٹوپیاں اچھل گئیں۔ آج یہ شیر اپنا مانی نہیں رکھتا! میاں آزاد، اب آپ شیر خانہ اپنے ہاتھ میں لیجیے۔

نواب: واللہ، یہی میں بھی کہنے والا تھا۔

جھمن: کام ذرا مشکل ہے۔

دانی: شیروں کا لڑانا دل لگی نہیں، بڑے تجربے کی ضرورت ہے۔

آزاد: حضور فرماتے ہیں تو شیر خانے کی نگرانی میں ہی کروں گا۔

کہنے کو تو آزاد نے کہہ دیا، مگر نہ کبھی شیر لڑائے تھے، نہ جانتے تھے کہ ان کو کیسے لڑایا جاتا ہے۔ گھبرائے، اگر کہیں نواب کے شیر ہارے تو ساری بلا میرے سر پڑے گی۔ کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہئے کہ یہ بلا ٹل جائے۔ جب شام ہوئی تو وہ سب کی نظریں بچا کر شیر کھانے میں گئے اور کایکوں کی کھڑیاں کھول دیں۔ شیر سب پھر سے بھاگ گئے۔ پنجڑے خالی ہو گئے۔ کسی پھوں کی بسائی ہوئی ہستی اجڑ گئی۔ شیروں کو اڑا کر آزاد نے گھر کی راہ کی۔

دوسرے دن میاں آزاد سویرے منہ اندھیرے بازار میں منگھٹ کرتے ہوئے نواب صاحب کی طرف چلے۔ بازار بھر میں سناٹا! حلوائی بھٹی میں سو رہا ہے، نان بائی برتن دھو رہا ہے، بجاجا بند۔ کچوروں کی دوکان پر اردوئی نہ شکر قد، جوہریوں کی دوکان میں تالا پڑا ہوا ہے، مگر تمباکو والا جگا ہوا ہے۔ مہتر سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ میدے والا پسنداریوں سے آٹا لے رہا ہے۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک آدمی لنگی باندھے، ہاتھ میں چلم لیے، بوکھلایا ہوا گھوم رہا ہے کہ کہیں سے ایک چنگاری ٹل جائے تو دم لگے۔ دھواں دھارھ اڑے۔ جہاں جاتے

ہیں پھر، بھاگ کی آواز آتی ہے۔ بھائی ایسا شہر نہیں دیکھا جہاں آگ مانگنے نہ ملے، جانو اس میں بھی چھین گئے خرچ ہوتے ہیں۔ محلے والوں کو گالیاں دیتے ہوئے نانہائی کی دوکان پر پہنچے اور بولے بڑے بھائی ایک ذری آگ تو جھپ سے دے دینا، میرا یار ہو، لا تو جھٹ پٹ۔

نانہائی : اچھا اچھا، تو دوکان سے الگ رہو، چھاتی پر کیوں چڑھے بیٹھتے ہو؟ یہاں سو دھندے کرنے ہیں، آپ کی طرح کوئی بے فکر تو ہوں نہیں کہ تڑکا ہوا۔ چلم لی اور گلے کوڑی دوکان مانگئے۔ مل گئی تو خیر، نہیں تو گالیاں دینی شروع کیں۔ سویرے سویرے اللہ کا نام نہ رام رام! چلم لیے دوکان پر ڈٹ گئے۔ واہ، اچھی دل لگی ہے! ایسی ہی طلب ہے تو ایک کنڈی کیوں نہیں گاڑ رکھتے کہ رات بھر آگ ہی آگ رہے۔ ایسے ہی اچکے تو چوری کرتے ہیں۔ آگھ چوکی اور مال غائب! کیاں سہل لٹکا ہے کہ چلم لے کر آگ مانگنے آئے ہیں۔ کسی دن میں چلم وطم نہ توڑناڑ کر پھینک دوں۔ تم تڑکے تڑکے دوکان پر نہ آیا کرو جی، نہیں تو کسی دن ٹھائیں ٹھائیں ہو جائے گی۔

حضور کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا، دانت چیں کر رہ گئے۔ یہاں سے چلے تو حلوائی کی دکان پر پہنچے اور بولے— میاں ایک ذرا سی آگ دینا، بھائی ہوتا۔ حلوائی کا دودھ بلی پی گئی تھی، جھلایا بیٹھا تھا، سمجھا کہ کوئی فقیر بھیک مانگنے آیا ہے۔ جھڑک کر بولا کہ اور دوکان دیکھو۔ سویرے سویرے یہاں کی پڑ گئی۔ جاتا ہے کہ دوں دھکا۔ رہے کہیں، مرے کہیں، کوڑی مانگنے یہاں موجود۔ دنیا بھر کے مردے، نانا منو گھاٹ۔ اب کھڑا گھورتا کیا ہے؟

چلم باز— کچھ داعی ہوا ہے بے۔ ابے ہم کوئی فقیر ہیں، کہیں میں آکر ایک ڈھنسا دوں نا۔ لو صاحب۔ ہم تو آگ مانگنے آئے ہیں، یہ ہم کو بھیک منگا بناتا ہے۔ اندھا ہے کیا؟ حلوائی : بھیک منگا نہیں، تو ہے کون، لنگوٹی باندھ لی اور چلے آگ مانگنے۔ تمہارے بابا کا قرض کھایا ہے کیا؟

بھارے یہاں سے بھی تراش ہوئے، چپکے سے کان دبائے چل کھڑے ہوئے۔ آج تڑکے تڑکے کس کا منہ دیکھا تھا کہ جہاں جاتے ہیں، جھوڑ ہو جاتی ہے، اتنے میں دیکھا کہ ایک سار کی دوکان پر آگ دھک رہی ہے۔ ادھر لپکے۔ سار دوکان پر نہ تھا۔ یہ تو حق کی فکر میں چوندھمپائے ہوئے تھے ہی، جھپ سے دوکان پر چڑھ گئے۔ سار بھی اسی وقت آگیا اور ان کو دیکھ کر آگ بھسوکا ہو گیا۔ تو کون ہے بے؟ واہ، خالی دوکان پر کیا مرے سے چڑھ

آئے۔ (ایک دھپ بھرا کر) اور جو کوئی عدد جاتا رہتا؟ اتنے میں دس پانچ آدمی جما ہو گئے۔
 کیا ہے، کیا ہے میاں؟ کیوں بھلے آدمی کی آبرو بگاڑے دیتے ہو۔
 سار: ہے کیا۔ یہ ہماری دکان پر چوری کرنے آئے تھے۔
 چلم باز: میں چور ہوں، چور کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے؟
 ایک آدمی: کون! تم! تم! تو ہمیں کچے چور معلوم ہوتے ہو۔ اچھا، تم پھر ان کی دکان
 پر گئے کیوں؟ دوکاندار نہیں تھا، تو وہاں تمہارا کیا کام؟ جو کوئی گہنا لے بھاگتے، تو یہ تمہیں
 کہاں ڈھونڈتے پھرتے؟

سار: صاحب، ان کا پھر پتہ کہاں ملتا، جاتے جتنا اس پار۔ چلو تھانے پر۔
 لوگوں نے سار کو سمجھایا، بھائی، اب جانے دو۔ دیکھو جو خبردار، اب کسی کی دکان پر نہ
 چڑھنا نہیں پتے جاؤ گے۔ سار نے چھوڑ دیا۔ جب آپ چلنے لگے، تو اسے ان پر ترس آ گیا۔
 بولا، اچھا آگ لیتے جاؤ۔ حضرت نے آگ پائی اور گھر کی راہ لی۔ تڑکے تڑکے اچھا بوئی
 ہوئی۔ چور بنے، مار کھائی تھوڑے گئے، تھانے جاتے جاتے بچے تب کہیں آگ ملی۔
 میاں آزاد یہ دل لگی دیکھ کر آگے بڑھے اور نواب کی دیوڑی پر آئے۔
 نواب: آج اتنا دن چڑھ گیا، کہاں تھے؟
 آزاد: حضور، آج بڑی دل لگی دیکھنے میں آئی، ہنستے ہنستے لوٹ جایئے گا۔ طلب بھی کیا
 بری چیز ہے۔

یہ کہہ کر آزاد نے ساری داستان سنائی۔
 نواب: خوب دل لگی ہوئی، آگ کے بدلے چھپتے پڑی۔ ارے میاں ذرا خوبی کو بلاتا۔
 ہاں، ذرا خوبی کے سامنے سنا۔ کسی دن یہ بھی نہ پئے۔
 خوبی نواب کے دروازے کے مسخرے تھے۔ ٹھگنا قد، کالے کتے کا سارنگ، بدن پر
 ماس نہیں، پر آنکھوں میں سرما لگائے ہوئے۔ لڑھکتے ہوئے آئے اور بولے۔ غلام کو حضور
 نے یاد کیا ہے؟

نواب: ہاں، اس وقت کسی فکر میں تھے؟
 خوبی: خداوند، اہم گھول رہا تھا اور کوئی فکر تو حضور کی بدولت قریب نہیں پہنچنے پاتی۔
 میں فکر کیا جاتوں، جو رو نہ جاتا، اللہ میاں سے نانا۔

نواب: اچھا خوجی اس حوض میں نہاؤ تو ایک اشرفی دیتا ہوں۔

خوجی: حضور، اشرفیاں تو آپ کی جوتیوں کے صدقے سے بہت سی مل جائیں گی۔ مگر پھر جینا کھن ہو جائے گا۔ نہ مرے سہی لیکن، کلکا جیا برے 'حوال' نہ صاحب، مجھے تو کوئی ایک غوطے پر ایک اشرفی دے تو بھی پانی میں نہ مٹھوں، پانی کی صورت دیکھتے بدن کانپ اٹھتا ہے۔

دنی: کیسے مرد ہو کہ نہانے سے ڈرتے ہو۔

خوجی: ہم نہیں نہاتے تو آپ کوئی قاضی ہیں؟

آزاد: اجی، سرکار کا حکم ہے۔

خوجی: چلیے، آپ کی بلا سے۔ کہنے لگے سرکار کا حکم ہے۔ پھر کوئی اپنی جان دے؟

آزاد: حضور، جو اس وقت یہ حوض میں دم سے نہ کود پڑیں، تو افیم انھیں نہ ملے۔

خوجی: آپ کون کچ میں بولنے والے ہوتے ہیں؟ اڑسٹھ برس سے تو میں افیم کھاتا

ہوں۔ اب آپ کے کہنے سے چھوڑ دوں، تو کیسے مرا یا جیا۔

نواب: اچھا بھائی، جانے دو، دودھ کھاؤ گے،

خوجی: واہ خداوند، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لیکن ذری متاس خوب ہو۔ شاہجہاں پور کی

سفید شکر یا کالپی کی مسری گھولے گا۔ اگر تھوڑا سا کیڑا بھی گمزدیجیے تو پیٹے ہی آنکھیں کھل جائیں۔

اتنے میں ایک چوہدار گھبرایا ہوا آیا اور بولا۔ خداوند، غصب ہو گیا جاں بخشی ہو تو عرض

کروں سب بغیر اڑ گئے۔

نواب: ارے؟ سب اڑ گئے؟

چوہدار: کیا کہوں حضور، ایک کا بھی پتا نہیں۔

مصاحبوں نے ہائے ہائے کرنی شروع کی، کوئی سر پٹنے لگا، کوئی چھاتی کوٹنے لگا۔

نواب نے روتے ہوئے کہا، بھائی اور جو گئے سو گئے، میرے صفِ حکم کو جو کوئی ڈھونڈ

لائے۔ ہزار روپے نقد دوں اس وقت میں جیتے جی مرٹا۔ ابھی ساڑھی سواروں کا حکم دو کہ

ہنگامی دورہ کریں۔ جہاں صفِ حکم ملے سمجھا بھا کر لے ہی آئیں۔

محتمن: ان کو سمجھانا حضور، مشکل ہے۔ وہ تو عربی میں باتیں کرتے ہیں۔ سارا قرآن

انہیں یاد ہے۔ ان سے کون بحث کرے گا؟

نواب : مجھے تو اس سے عشق ہو گیا تھا جی، وہ اکڑ اکڑ کر کان چننا۔
سیکڑوں پالیاں لڑیں، مگر کورا آیا۔ کس باکین سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پالی بھر تھرا اٹھتی
تھی اس کی بات ہی کیا تھی۔ بھولہ جانور، لیکن میدان کا شیر۔ یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا
کہ یہ بئیر کی صورت میں کسی فقریر روح ہے۔ اب سنا کہ نماز بھی پڑھتا تھا۔

تھمن : حضور کو یاد ہوگا کہ رمضان کے مہینے میں اس نے دن کے وقت دانہ تک نہ
چھوا، حضور سمجھے تھے کہ بوندا ہو گیا مگر تاڑ گیا کہ روزے سے ہیں۔

خونی : خداوند، اب میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے انیم بھی پلا دی،
مگر واللہ، جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔

کمالی : حضور، یقین جانے پچھلے پہر سے صبح تک کابک سے حق حق کی آواز آیا کرتی
تھی۔ غور تم کو بھی تو ہم نے کئی بار جگا کر سنایا تھا کہ صف تھمن خدا کو یاد کر رہے ہیں۔
نواب : افسوس، ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ دل ڈوبا جاتا ہے، کوئی پنکھا جھلنا۔
مصاحب : جلدی پنکھا لاؤ۔

نواب : پریم جو میں جانتی کہ پریت کیے دکھ ہوے
مگر ڈھنڈوڑا بیٹتی کہ پریت کرے جنی کوے۔

خونی : (پینک سے چونک کر) ہاں استاد، چھیڑے جا۔ اس وقت تو میاں شوری کی
روح پھڑک گئی ہوگی۔

نواب : چپ، نامعقول۔ کوئی ہے؟ ان کو یہاں سے شہلاؤ۔ یہ رئیسوں کی محبت کے
قابل نہیں۔ جھکو بھی کوئی گویا سمجھا ہے۔ یہاں تو جی جلتا ہے ان کے نزدیک قوالی ہو رہی
ہے۔

خونی : خداوند غلام تو اس دم اپنے آپے میں نہیں۔ ہائے، صف تھمن کی کابک خالی ہو
اور میں اپنے آپے میں رہوں۔ حضور نے اس وقت مجھ پر بڑا ظلم کیا۔

نواب : شاہاش خونی، شاہاش! معاف کرنا، میں کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ کیوں جی، ساڈنی
سوار دوڑایا گیا کہ نہیں؟

سوار : حضور، جاتا تو ہوں مگر وہ میری کیا سنیں گے، کوئی مولوی بھی تو ساتھ بھیجئے۔ میں

تو کچھ اونٹ ہی چڑھنا جانتا ہوں۔ ان سے دلیل کون کرے گا بھلا۔
آزار: کسی اچھے مولوی کو بلوانا چاہیے۔

مصاحبوں نے ایک مولانا صاحب کو تجویز کیا۔ مگر یاروں نے ان سے کل داستان نہیں بیان کی۔ چوب دار نے مکان پر جا کر صرف اتنا کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ مولوی صاحب اس کے ساتھ ہو لیے اور دربار میں آکر نواب صاحب کو سلام کیا۔
نواب: آپ کو اس لیے تکلیف دی کہ میری آنکھوں کا نور، میرے کلیجے کا ٹکڑا ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ بڑا عالم اور دیندار ہے، بحث کرنے میں کوئی اس سے پیش نہیں پاتا، آپ جانیے اور اس کو معقول کر کے لے آئیے۔

مولانا: ماں باپ کو کڑا حق ہوتا ہے، وہ کیسے نادان آدمی ہیں؟
خوجی: مولانا صاحب، وہ آدمی نہیں ہیں، بشر ہیں۔ مگر علم میں اور عقل میں آدمیوں کے بھی کان کاٹتے ہیں۔

کمالی: صف شکن کا نام تو مولانا صاحب آپ نے سنا ہوگا۔ وہ تو دور دور تک مشہور تھے۔ جناب، بات یہ ہے کہ سرکار کا بشر صف شکن کل کا بک سے اڑ گیا۔ اب یہ تجویز ہوئی ہے کہ ایک ایک سائڈنی سوار جائے اور اسے سمجھا بجھا کر لے آئے۔ مگر اونٹ وان تو پھر اونٹ وان، وہ دلیل کرنا کیا جانے، اس لیے آپ بلائے گئے ہیں کہ سائڈنی پر سوار ہوں اور ان کو کسی تدبیر سے لے آئیں۔

مولانا: ٹھیک، آپ سب کے سب نشے میں تو نہیں ہیں۔ ہوش کی باتیں کرو۔ خود مسخرے بنتے ہو، بشر بھی عالم ہوتا ہے، وہ بھی کوئی مولوی ہے، لاجول! اچھے اچھے گاؤ دی جمع ہیں، بندہ جاتا ہے۔

نواب: یہ کسی کوڑھ مغز کو لائے تھے جی؟ خاصا جاگلو ہے۔
آزار: اچھا، حضور بھی کیا یاد کریں گے کہ اتنے بڑے دربار میں ایک بھی منطقی نہ نکلا۔ اب غلام نے بیڑا اٹھا لیا کہ جاؤں گا اور صف شکن کو لاؤں گا۔ مجھے ایک سائڈنی دیجیے، میں اسے خود ہی چلا لوں گا۔ خرچ کے لیے کچھ روپے بھی دلوائیے، نہ جانے کتنے دن لگ جائیں۔
نواب: اچھا، آپ گھر جانیے اور لیس ہو کر آئیے۔

میاں آزاد گھر مئے تو اور مصاحبوں میں کچڑی پکے لگی، یار یہ تو بازی جیت لے گیا۔

کہیں سے ایک آدھ بیڑ چلائے گا اور کہے گا، یہی صف شکن ہے۔ پھر تو ہم سب پر شیر ہو جائے گا۔ ہم کو آپ کو کوئی نہ پوچھے گا۔ خوبی جا کر نواب صاحب سے بولے۔ حضور، ابھی میاں آزاد دو دن سے اس دربار میں آئے ہیں، ان کا اعتبار کیا۔ جو ساٹنی ہی لے کر فوج پر ہوں، تو پھر کوئی کہاں ان کا ہاتھ لگاتا پھرے گا۔

کمالی: ہاں خداوند، کہتے تو سچ ہیں۔

جھٹمن: خوبی، صورت ہی سے اسحق معلوم ہوتے ہیں مگر بات ٹھکانے کی کہتے ہیں۔

ایسے آدمی کا ٹھکانا کیا۔

دنی: ہم تو حضور کو صلاح نہ دیں گے کہ میاں آزاد کو ساٹنی اور سفر خرچ دیجیے۔ جو حکم

کی بات ہے۔

نواب: چلو، بس بہت نہ بکو۔ تم خود جیسے ہو، ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہو۔ آزاد کی صورت کہہ دیتی ہے کہ کوئی شریف آدمی ہے اور مان لیا کہ ساٹنی جاتی ہی رہے، تو میرا کیا بگڑ جائے گا؟ صف شکن پر سے لاکھوں صدقے ہیں۔ ساٹنی کی حقیقت ہی کیا۔

اتنے میں میاں آزاد گھر سے تیار ہو کر آگئے۔ اشرفیوں کی ایک تھیلی خرچ کے لیے ملی۔

نواب نے گلے لگا کر رخصت کیا۔ مصاحب بھی سلام بجالائے۔ آزاد ساٹنی پر بیٹھے اور ساٹنی ہوا ہو گئی۔

(4)

آزاد یہ تو جانتے ہی تھے کہ نواب کے مصاحبوں میں سے کوئی چوک کے باہر جانے والا نہیں، اس لیے انھوں نے ساٹنی تو ایک سرائے میں باندھ دی اور آپ اپنے گھر آئے۔ روپے ہاتھ میں تھے ہی، سویرے گھر سے اٹھ کھڑے ہوتے، کبھی ساٹنی پر کبھی پیدل، شہر اور شہر کے آس پاس کے حصوں میں چکر لگاتے، شام کو پھر ساندنی سرائے میں باندھ دیتے اور گھر چلے آتے۔ ایک روز صبح کے وقت گھر سے نکلے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب کچھ لٹ کا دھانی رنگ ہوا کرتہ، اس پر روپے گز والی مینٹی شریقی کا تین کروتی کا چست انگرکھا، گل بدن کا چوڑی دار گھوٹا پہنے مانگ نکالے عطر لگائے، ماشے بھر کی ننھی سی نوہی آل پن سے نکائے، ہاتھوں میں مہندی، پور پور چھلے، آنکھوں میں سرمہ چھوئے پنچے کا مٹلی جوتا

پہنے ایک عجب لوچ سے کمر لپکائے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے چلے آتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوب زور سے گھورا۔ چھیلے میاں نے مسکراتے ہوئے آواز دی، اے ذری ادھر تو دیکھو، ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ میرا کلیجہ بلیوں اچھلتا ہے۔ بھری برسات کے دن، کہیں پھسل نہ پڑو۔ تو قہقہہ اڑے۔

آزاد: آپ اپنا مطلب کہیے میرے پھسلنے کی فکر نہ کیجیے گا۔

چھیلا: گرے گا، تو مجھ سے ضرور پوچھ لیجیے گا۔

آزاد: بہت خوب، ضرور پوچھوں گا، بلکہ آپ کو ساتھ لے کر گردن تو سہی۔

چھیلا: خدا کی قسم، آپ کے کالے کپڑوں سے میں سمجھا کہ بنولا کسم کے کھیت سے نکل

پڑا۔

آزاد: اور میں آپ کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ کوئی زنانہ ملکتا جاتا ہے۔

چھیلا: واللہ، آپ کی دجج ہی زناں ہے۔ یہ ڈبل کوٹ اور لکڑ توڑ بوٹ جانگو معلوم ہوتے

ہو۔ اس وقت ایسے بدحواس کہاں بگ ٹ بھاگے جاتے ہو؟ سچ کہیے گا، آپ کو ہماری جان کی قسم۔

آزاد: آج پروفیسر لاک شکرٹ پر ایک پیکچر دینے والے ہیں، بڑے مشہور عالم ہیں،

یورپ میں ان کی بڑی شہرت ہے۔

چھیلا: بھائی، قسم خدا کی، کتنے بھونڈے ہو، پروفیسر کے مشہور ہونے کی ایک ہی کہی۔

ہم اتنے بڑے ہوئے، قسم لے لو، جو آج تک نام بھی سنا ہو۔ کیا دنی خان سے زیادہ مشہور

ہیں؟ بھائی، جو کہیں، تمہارے گھونگر والے بال، ایک دفعہ بھی اس کی جان سے سن لو، تو عمر بھر

نہ بھولو۔ واللہ، کیا ٹیپ دار آواز ہے، مگر تم ایسے کوڑھ مغزوں کو گلے بازی سے کیا واسطہ، تم تو

پروفیسر صاحب کے پھیر میں ہو۔

آزاد: تمہاری زندگی راگ اور لے ہی میں گزرے گی۔ اس ناچ اور رنگ نے آپ کی

یہ گنتی بنائی کہ مونچھ اور داڑھی کٹروائی، مہندی لگوائی اور مرد سے عورت بن گئے ارے، اب تو

مرد بنو، ان باتوں سے باز آؤ۔

چھیلا: جی، تو آپ کے پروفیسر لاک کے پاس چلا جاؤں؟ اپنے کو آپ کی طرح

مکڈامی بناؤں! کسی گلی کوچے میں نکل جاؤں تو تالیاں پڑنے لگیں۔

آزاد: اب یہ فرمائیے کہ اس وقت آپ کہاں کے ارادے سے نکلے ہیں؟
 جھیلا: کل رات کو تین بجے تک ایک رنگیلے کے دوست کے یہاں ناچ دیکھتا رہا۔ وہ
 پیاری پیاری صورتیں دیکھنے میں آئی کہ واہ جی واہ۔ کس کافر کا اٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ جلسہ
 برخاست ہوا تو بس، کلیجے کو دونوں ہاتھوں سے قحط کر نکلے، لیکن رات بھر کانوں میں چھا چھم
 کی آواز آیا کی۔ پریوں کی پیاری پیاری صورت آنکھوں سے بھرا کی۔ اب اس وقت بھر
 جاتے ہیں، ذرا سینک آئیں، بھیردی اڑ رہی ہوگی۔

ریلے نینوں نے پھندا مارا.....

آزاد: کل فرصت ہو ہم سے ملے گا۔
 جھیلا: کل تک تو میری نیند کا خمار ہی رہے گا۔
 آزاد: اچھا پرسوں سکی۔

جھیلا: پرسوں؟ پرسوں تو خدا بھی بلائے تو بندہ نہ جانے گا۔ پرسوں نواب صاحب کے
 یہاں بیٹروں کی پالی ہے، مہینوں سے بیڑ تیار ہو رہے ہیں۔
 آزاد: اچھا صاحب، پرسوں نہ سکی، منگل کو سکی۔

جھیلا: منگل کو تر کے سے ہانے کی کنکیاں لڑیں گی، ابھی بتارس سے بانا منگایا ہے، مائی
 جال کی کنکیاں ایسی سدھی ہے کہ ہر دم قابو میں، موڑو، غوطہ دو، کچھو، جو چاہے سو کر دو، جیسے
 کھیت کا گھوڑا۔

آزاد: اچھا بدھ کو فرصت ہے۔

جھیلا: واہ واہ، بدھ کو تو بڑے ٹھاٹ سے بھٹیاریوں کی لڑائی ہوگی۔ دیکھیے تو کیسی کیسی
 بھٹیاریاں کس بانگی ادا ہاتھ چکا کر، انگلیاں منکا کر لڑتی ہیں اور کیسی کیسی گالیاں سناتی ہیں کہ
 کان کے کیزے مرجائیں۔

آزاد: برہسٹ کو ضرور ملے گا؟

جھیلا: جناب آپ تو پیچھے پڑ گئے، ملوں تو سب کچھ، جب فرصت بھی ہو۔ یہاں مرنے
 تک کی تو فرصت نہیں، اب کی نوچندی جعرات ہے، برسوں سے فٹیں مانی ہیں، آپ کو دین
 دنیا کی خبر تو ہے، نہیں۔

آزاد: تو معلوم ہوا، آپ سے ملاقات نہیں ہوگی۔ آج مرغ لڑائیے گا، کل پتنگ

لڑائیے گا، کہیں گانا ہوگا، کہیں ناچ ہوگا، آپ نہ ہو تو رنگ کیوں کر جسے۔ میلا ٹھیلنا تو آپ سے کوئی کا ہے کو چھوٹا ہوگا، پھر بھلا ملنے کی کہاں فرصت؟ رخصت۔

چھیلا: یہ تو اب روٹھے کیوں جاتے ہو؟

آزاد: اب مجھے جانے دیجیے، آپ کا اور ہمارا میل جیسے مکتا اور مدار کا ساتھ۔ جائیے دیکھیے، بھیروی کا لطف جاتا ہے۔

چھیلا: جناب، اب ناچ گانے کا لطف کہاں، وہ چمک دمک کہاں، دل ہی بجم گیا۔ جو لطف ہم نے دیکھے ہیں، وہ بادشاہوں کو خواب میں نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ قصر باغ عدن کو مات کرنا تھا۔ پریوں کے جھوٹے، حسینوں کے جھکٹ، رات کو دن کا سماں رہتا تھا۔ اب یہاں کیا رہ گیا۔ گلی کو چوں میں کتے لوتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ساکنوں کے مزاج نہ ملے تھے۔ بائکے ترجمے رئیس زادے ایک ایک دم کی دو دو اشرفیاں پھینک دیتے تھے۔ اب تو شہر بھر میں اس سرے سے اس سرے تک چراغ لے کر ڈھونڈیے تو میدان خالی ہے۔ کل غنی سڑک کی طرف جا نکلا، تو ٹکڑ پر ایک ہاتھی بندھا دیکھا۔ پوچھا، تو معلوم ہوا کہ بی حیدر جان کا ہاتھی ہے۔ قسم خدا کی، ایسا خوش ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گیا۔

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو، پھر غنیمت ہے،

نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آئی جاتی ہے۔

آزاد: اچھا، یہ سب جلے آپ نے دیکھے اور اب بھی آنکھوں سینکا ہی کرتے ہیں، مگر سچ کہیے گا، بنے یا بگڑے، بے یا اجڑے، نیک نام ہوئے یا بدنام؟ یہاں تو نتیجہ دیکھتے ہیں۔

چھیلا: جناب، یہ تو بڑا کڑا سوال ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ عمر بھر اس ناچ رنگ ہی کے پھندے میں پھنس رہے، دن رات طبلہ، سارنگی، باباں، ڈھول، ستار کی دھن میں مست رہے۔ خدا کی یاد طاق پر، علم چھپر پر، چھپے ہوئے شہدے بن بیٹھے، لیکن اب تو پانی میں ڈوب گئے، اوپر ایک انگل ہو تو، اور ایک ہاتھ ہو تو، برابر ہے۔ آپ لوگ اس بھروسے میں ہوں کہ ہمیں آدمی بنائیے تو یہ خیر صلاح ہے۔ بوڑھے طوطے بھی کہیں رام رام پڑھتے ہیں؟

آزاد: خیر، شکر ہے کہ آپ اپنے کو بگڑا ہوا سمجھتے تو ہیں، کڑوے نہ ہوئیے تو کہوں کہ اس زمانے ہمیں پر لعنت سمجھیے، یہ لوچ، یہ لپک، یہ مہندی، یہ مسی، کچھ عورتوں ہی کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ذرا تو اس واڈھی مونچھ کا خیال کرو۔

جھیلا : یہ مہزے کسی ایسے ویسے کو دیجیے، یہاں بڑے بڑے کی آنکھیں دیکھی ہیں۔
 آپ کے جھانے میں کوئی اناڑی آئے، ہم پر چکمانہ چلے گا۔
 آزاد : آپ کو ڈوم ڈاریوں ہی کی محبت پسند آئی یا کسی اور کی بھی؟ لکھنؤ میں تو ہر فن
 کے آدمی موجود ہیں۔

جھیلا : ہم تو ہمیشہ ایسی ہی کلزی میں رہے، مگر پھوک تماشہ دیکھا۔ لکھنؤ میں پھاگ
 کھیلا۔ میاں شوری کے بچے، قدر پیاں کی ٹھریاں، تھمیت خاں ٹیپ دار آواز، پیارے خاں کا
 خیال چھوڑ کر جائیں کہاں؟ سارنگی، منجیرے کی آواز سنی تو چھپ سے گھس پڑے، مسجد میں
 اذان ہوا کرے، سنتا کون ہے۔ بہت گزر گئی تھوڑی باقی ہے۔

آزاد : لکھنؤ میں ایسے ایسے عالم پڑے ہیں کہ جن کا نام آفتاب کی طرح ساری خدائی
 میں روشن ہے۔ کربلا اور مدینہ تک کے سمجھدار لوگ ان بزرگوں کا کلام شوق سے پڑھتے ہیں۔
 مفتی سعد اللہ صاحب، سید محمد صاحب وغیرہ علماء کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اب شاعروں کو
 دیکھیے، خواجہ حیدر علی آتش، شیخ تاج اپنے فن کے خدا تھے۔ مرثیہ کہتا تو لکھنؤ والوں کا حصہ
 ہے۔ میر انیس صاحب کو خدا بخشے، زبان کی صفائی تو یہاں ختم ہو گئی۔ مرزا دبیر تو گویا اپنے
 فن کے موجد تھے۔ نسیم اور صبا نے آتش کو بھڑکا دیا۔ گویا تو گویا شاعری کے چمن کا بلبل
 تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے وہ نثر لکھی کہ قلم توڑ دیے۔ یہاں کے کاریگروں کے بھی
 جھنڈے گڑے ہیں۔ کہہاں تو ایسے دنیا کے پردے پر نہ ہوں گے۔ مٹی کی مورتیں ایسی بنائیں
 کہ مصوروں کی کرکری ہو گئی۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ مورت بولا ہی جاتی ہے۔ جس
 عجائب گھر میں جائیے گا، لکھنؤ کے کہہاں کی کاریگری ضرور پائیے گا۔ خوش نصیبوں نے وہ
 کلام پیدا کیا کہ ایک ایک حرف کی پانچ پانچ اشرفیاں لیں۔ ہانکے ایسے کی شیر کا پنجہ توڑ
 ڈالے۔ ہاتھی کو ڈپٹیں تو چنگھاز کر منزلوں بھاگے۔ رستم اور اسفندیار کو چنگیوں میں لڑا دیں۔
 استاد محمد علی خاں مہکیت، چہریرا بدن، لیکن گدکا ہاتھ میں آنے کی دیر تھی۔ پرے کے پرے دم
 میں صاف کر دیے۔ کڑک کر طمانچے کا تلا ہاتھ لگایا، تو دشمن کا منہ پھر گیا۔ اکھاڑے میں گدکا
 لے کر کھڑے ہوئے تو معلوم ہوا، بجلی چمک گئی۔ ایک دفعہ لٹکار دیا کہ روک، بیٹھ گئی! دیکھ
 سنبھل۔ خبردار یہ آئی، وہ آئی، وہ پڑ گئی! واہ واہ کی آواز ساتویں آسمان جا پہنچی۔ بلا کی صفائی،
 غضب کی صفائی تھی۔ جو منہ چڑھا، اس نے منہ کی کھائی۔ سامنے گیا اور شامت آئی کا مدانی وہ

ایجاد کی کہ اڑیہ اور کوچین تک دھوم ہو گئی۔ لیکن آپ کو تو نہ علم سے سرور کار، نہ فن سے مطلب، آپ تو تال سر کے پھیر میں پڑے ہیں۔

چھیلا : حضرت، اس وقت بھیرودی سننے جاتا تھا اور 'جاگے بھاگے پیارا نظر آیا' سننے کا شوق چرایا تھا، لیکن آپ نے پادریوں کی طرح بکواس کر کے کایا پلٹ دی۔ آپ جو ہمیں راہ پر لاتے ہوں، تو اتنا مان جاؤ کہ ذرا قدم بڑھائے ہوئے، ہمارے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے، پائے نالے تک چلے چلو، دیکھوں تو پرستان سے کیوں کر بھاگ آتے ہو؟ انھیں حسیناؤں کا سجدہ نہ کرو، تو کچھ جرمانہ دوں، اس اندر کے اکھاڑے سے کورے نکل آؤ، تو ناگ کی راہ نکل جاؤں۔

آزاد : (گھڑی جیب سے نکال کر) ایں! آٹھ پر آکیں منٹ! اس خوش گئی نے آج بڑا ستم ڈھایا، لیکچر سننے میں نہ آیا۔ مفت کی بک بک جھک جھک! لیکچر سننے قابل تھا۔

چھیلا : اللہ جانتا ہے، اس وقت کلیجے پر سانپ لوٹ رہے ہیں! نہ جانے تڑکے تڑکے کس منحوس کا منہ دیکھا ہے کہ بھیرودی کے مزے ہاتھ سے گئے۔

آزاد : آپ بھی مزے چونچ ہی رہے۔ اتنی دیر تک سمجھایا سر مغزن کی، مگر واہ رے کتنے کی دم، بارہ برس بعد بھی وہ میڑھی ہی نکلی۔

چھیلا : تو میرے ساتھ آئیے نا، بغلیں کیوں جھانکتے ہو؟ جب جانیں کہ بلوہ نکل آؤ۔

آزاد : اچھا چلیے۔ دیکھیں کون سا حسین اپنی نگاہوں کے تیر سے ہمیں گھائل کرتا ہے۔ برسوں کے خیالوں کو کوئی کیا معا دے گا؟ ہم، اور کسی کے تھرکنے پر فدا ہو جائیں! تو بہ! کوئی ایسا معشوق تو دکھائیے، جسے ہم پیار کریں۔ ہمارا معشوق وہ ہے جس میں کمال ہو۔ زلف اور چوٹی پر کوئی اور سر دھنتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ آزاد چھیلے میاں کے ساتھ حافظ جی کے مکان میں جا پہنچے۔ محفل بھی ہوئی تھی۔ تین چار حسنینیں مل کر مبارک باد گاتی تھیں۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ جسے دیکھو، گردن ہلاتا ہے۔ پازیب کی چھما چھم دل کو روندتی ہے، کوئی ادھر سے ادھر چمک جاتی ہے، کوئی اونچے سروں میں تان لگاتی ہے، کوئی سینے پر ہاتھ رکھ کر 'مہری ندیاں' بتاتی ہے، کوئی نشیلی آنکھوں کے اشارے سے 'نینا ریلے' کی چھوی دکھاتی ہے، دھما چوکھڑی مچی ہوئی ہے۔ چھیلے میاں نے ایک حسینہ سے فرمائش کی کہ حضرت میر کی یہ غزل گاؤ۔

فیر کے کہنے سے مارا اس نے ہم کو بے گناہ
یہ نہ سمجھا وہ کہ واقعہ میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا
یاد ایام کی اپنی روز شب کی جائے باش
تھا درے باز بیاباں، یا در میٹانہ تھا
اس غزل نے وہ لطف دکھایا اور ایسا رنگ جمایا کہ میاں آزاد تک 'او ہوا' کہہ اٹھتے
تھے، اس کے بعد ایک پری نے یہ غزل گھٹی۔

حال کھلے تو کس طرح یار کی بزم ناز کا
جو ہے یہاں وہ مست ہے اپنی ہی سوز ساز میں
اس غزل پر جیسے میں کہرام مچ گیا۔ ایک تو غزل ہٹانی، دوسرے حسینہ کی اُشتی جوانی،
تیسرے اس کی نازک بیانی۔ لوگ اتنے مست ہوئے کہ جھوم جھوم کر بھی شعر پڑھتے تھے۔
حال کھلے تو کس طرح یار کی بزم ناز کا
جو ہے یہاں وہ مست ہے اپنی ہی سوز ساز میں

اب سب کو شک کی جگہ یقین ہو گیا کہ اب کسی کا رنگ نہ جھے گا۔ ہر طرف سے ہٹانی
غزلوں کی فرمائش ہے، نہ دھڑکا خیال، نہ پتے کی فکر، نہ بھیرودی کی دھن، نہ کپکے گانے کا
ذکر، بس ہٹانی غزلوں کی دھوم ہے۔

اب دل لگی دیکھیے کہ بڑھے جوان سب کے سب بے دھڑک اس موٹی کو گھور رہے
ہیں۔ کوئی اس سے آنکھیں لڑاتا ہے، کوئی سر دھتا ہے، کوئی ٹھنڈی آہیں کھینچتا ہے۔ دو چار
منچلے رئیسوں نے حسینوں کو بلا کر بڑے شوق سے پاس بٹھایا۔ نوک جھونک ہنسی مذاق چہل، دل
لگی، دھول دھنپ، ہونے لگا۔ حافظ جی بھی بے سینگ کے چھڑے بنے ہوئے مزے سے
چوکھی لڑ رہے ہیں۔

بوڑھے میاں: آج کل کے لڑکوں کو بھی ہوا لگی ہے۔

ایک جوان: جناب، اب تو ہوا ہی ایسی چلی ہے کہ جوان تو جوان، بڑھوں تک کو بڑھ
بھس لگا ہے۔ سو برس کا سن، چار کے کندھوں پر لدنے کے دن، مگر جوانی ہی کے دم بھرتے
ہیں۔

بوڑھے میاں: اچی، ہم تو زمانے بھر کے نیاریے ہیں، ہمیں کوئی کیا چنگ پر چڑھائے

گی، مگر تم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، ایسا نہ ہو، ان کے پیر میں آ جاؤ، پھر دین دنیا دونوں کو رو بیٹھو۔

جوان : واہ جناب، آپ کی صحبت میں ہم بھی پتے ہو گئے ہیں۔ ایسے کچے نہیں کہ ہم پر کسی کے داد بیچ چلے۔

بوڑھے ماں : کچے پتے کے بھروسے نہ رہیے گا، ان حسینوں کا بڑے بڑے زاہدوں نے سجدہ کیا ہے، تم کس کمیت کی مولیٰ ہو۔

جوان : ان بتوں کو ہم فقیروں سے بھلا کیا کام ہے یہ تو طالب زر کے ہیں اور یا خدا کا نام ہے۔

حسین : ان بڑے ماں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ بال بال گل کر برف ساسفید ہو گیا اور اب تک سیاہ کاری نہ چھوڑی، یہ سمجھاتے کس منہ سے ہیں؟ ان کی سنتا کون ہے! ذرا شیخ جی، بہت بڑھ بڑھ کر باتوں نہ بنایا کیجیے، شاہ چمڑے والی گلی میں روز بیس بیس چکر ہوتے ہیں، اے تم تھکتے بھی نہیں؟

حافظ جی : شیخ جی جہاں بیٹھتے ہیں، جھگڑا ضرور خریدتے ہیں۔ آپ ہیں کون؟ آئے کہاں سے ناصر بن کے! اچھا، بی صاحب اپنا کلام سنائیے، مگر شرط یہ ہے کہ جب ہم تعریف کریں تو جھک کر سلام کیجیے۔

حسین : آپ ہیں تو اسی لائق کی دوری سے جھک کر سلام کر لیں۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر دوسری ٹکری میں گالی اور پھلڑ کا ٹھہرا چلتا تھا، تیسرے میں دھول دھپہ ہوتا تھا۔ لڑکے، جوان، بوڑھے، بے دھڑک ایک دوسرے پر پھبتیاں کہتے تھے۔ اتنے میں دوپہر کی توپ دغی، جلسہ برخاست، ٹیلیوں نے بوریا بندھنا اٹھایا، چلیے، سناٹا ہو گیا۔

(5)

میاں آزاد کی ساٹھنی تو سرائے میں بندھی تھی۔ دوسرے دن آپ اس پر سوار ہو کر گھر سے نکل پڑے۔ دوپہر ڈھلے ایک قصبے میں پہنچے۔ ہتھیل کے بیڑ کے سائے میں بستر بجایا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہوا کے جھوکوں سے ذرا دل کو ڈھارس ہوئی، پاؤں پھیلا کر لمبی تانی، تو

دین دنیا کی خبر نہیں۔ جب خوب نیند بھر کر سو چکے، تو ایک آدمی نے جگا دیا۔ اٹھے، مگر پیاس کے مارے طلق میں کانٹے پڑ گئے۔ سامنے اندارے پر ایک حسین عورت پانی بھر رہی تھی۔ حضرت بھی پیچھے۔

آزاد : کیوں ٹیک بخت، ہمیں ایک ذرا سا پانی نہیں پلاتیں۔ بھرتے نہ بنتا ہو، تو لاؤ ہم بھریں۔ تم بھی پیو، ہم بھی پیئیں، احسان ہوگا۔

عورت نے کوئی جواب نہ دیا، تنکھی چٹون سے دیکھ کر پانی بھرتی رہی۔

آزاد : بھئی، سے سوم بھلا، جو دیوے غرنت جواب۔ پانی نہ پلاؤ، جواب تو دے دو۔ یہ قصبہ تو اپنے حق میں کر بلا کا میدان ہو گیا۔ ایک بوند پانی کو ترش گئے۔ عورت نے پھر بھی جواب نہ دیا۔ پانی بھر کر چلی۔

آزاد : بھئی، اچھا گاؤں ہے! جو بات ہے، زبانی! ایک لٹیا پانی نہ ملا، واہ ری قسمت! لوگ تو اس بھادوں کی جلتی جلتی دھوپ میں پوسرے بیٹھاتے ہیں، کیڑا پڑا ہوا پانی پلاتے ہیں، یہاں کوئی بات تک نہیں سنتا۔

میاں آزاد کو حیرت تھی کہ اس کسن مازنین کا یہاں اس دیرانے میں کیاں کام۔ سائے کی طرح ساتھ ہو لیے۔ وہ تنکیوں سے دیکھتی جاتی تھی، مگر منہ نہیں لگاتی تھی۔ بارے، سڑک سے دائیں ہاتھ پر ایک پھانک کے سامنے وہ بیٹھ گئی اور پیڑ کے سائے میں سستانے لگی۔ آزاد نے کہا۔ اگر یہ برتن بھاری ہو، تو لاؤ، میں لے چلوں، اشارے کی دیر ہے۔ قسم لو، جو ایک بوند بھی پیوں، گو پیاس کے مارے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دم نکلا جاتا ہے، لیکن تمہارا دل دکھانا منظور نہیں۔

حسینہ نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ پھر ہمت کر کے اس برتن کو اٹھایا اور پھانک کے اندر ہو رہی۔ میاں آزاد بھی چپکے چپکے دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ حسینہ ایک کھلے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جا بیٹھی اور آزاد درختوں کی آڑ میں دبک رہے کہ دیکھیں، یہاں کیا گل کھلتا ہے۔ اس بنگلے کے چاروں طرف کھائی کھدی ہوئی تھی۔ ارد گرد سرپت ہوئی تھی، ایسی گھنی کہ چڑیاں تک کا گزر نہ ہو، اور وہ تیز کہ تلوار مات۔ بڑا اونچا محراب دار پھانک لگا ہوا تھا۔ وہ جو ہر دار شیشم کی لکڑی تھی کہ باید و شاید۔ کیا ریاں روز سینی جاتی تھیں۔ روشوں پر سرفنی کئی تھی، ہرے بھرے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ کہیں اتار کی قطار،

کہیں لکھوٹ کی بہار، ادھر آم کے باغ، امرود اور چکوتروں سے ٹھنپیاں پھٹی پڑتی تھیں۔ نارنگیاں شاخوں پر لدی ہوئی تھیں، پھولوں کی بو باس، کہیں گل مہندی، کہیں گل عباس، نوازی پھولی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، اودی اودی گھٹا، کلیوں کی چنگ، جوی کی بھینی مہک، کھیل کی دک۔ باغ کے پتوں نیچ میں ایک تین فٹ کا اونچا پتہ چبوترہ بنا تھا۔ یہ تو سب کچھ تھا، مگر رہنے والے کا پتہ نہیں۔ اس حینہ کی چال ڈھال سے بھی بیگانہ پن برستا تھا۔ یکا یک اس نے برتن زمین پر رکھ دیا اور ایک نواز کی ہلکری پر سو رہی۔ ان کو داؤ ملا، تو خوب جھٹکر میوے کھائے اور برتن کو منہ سے لگایا، تو ایک بوند بھی نہ چھوڑا۔ اتنے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ آزاد جٹ انگو کی مٹی میں چھپ رہے، مگر تاک لگائے بیٹھے تھے کہ دیکھیں، ہے کون! دیکھا کہ پھانک کی طرف سے کوئی آہستہ آہستہ آرہا تھا۔ بڑا لمبا بڑنگا، موٹا تازہ آدمی تھا۔ لنگوٹ باندھے، اکڑتا اس بنگے کی طرح جارہا تھا۔ سمجھے کہ کوئی بیوان اپنے اکھاڑے سے آیا ہے۔ نزدیک آیا تو یہ گمان دور ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی شاہ جی ہے۔ وہ لنگوٹ، جس سے پہلوان کا دھوکا ہوا تھا، تہہ لٹکا۔ شاہ صاحب سیدھے بنگے میں داخل ہوئے۔ عورت کو پتنگ پر سوتا پایا، تو پتنگ پر ہاتھ مار کر چلا اٹھے۔ اٹھ۔ حینہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور شاہ جی کے قدم چومے۔ شاہ جی ایک تریپائی پر بیٹھ گئے اور اس سے یوں باتیں کرنے لگے۔ بیٹی، آج تم کو ہمارے سبب سے بہت راہ دیکھنی پڑی۔ یہاں سے دس کوس پر ایک گاؤں میں ایک راجا رہتا ہے۔ اسی برس کا ہو گیا، مگر اللہ نے نہ لڑکا دیا، نہ لڑکی۔ ایک دن مجھے بلوایا۔ میں کہیں آتا جاتا تو ہوں نہیں۔ صاف کہلا بھیجا کہ تمہیں غرض ہو تو آؤ، خدا کے بندے خدا کے سوا اور کسی کے دوار پر نہیں جاتے۔ آخر رانی کو لے کر وہ آپ آیا اور میرے قدموں پر گر پڑا۔ میں نے رانی کے سر پر ایک بنا سوگھا گلاب کا پھول دے مارا۔ پانچویں مہینے اللہ نے لڑکا دیا اور راجا میرے پاس دوڑا آتا تھا کہ میں راہ میں ملا۔ دیکھتے ہی مجھے رتھ پر بیٹھا لیا۔ اب کہتا ہے، روپیہ لو، جاگیر لو، گاؤں لو، ہاتھی، گھوڑے لو، مگر میں کب مانگتا ہوں۔ فقیروں کو دنیا سے کیا کام۔ اس وقت جا کر پیچھا چھوٹا، تم پانی تو لائی ہوگی؟

حینہ: میں آپ کی لونڈی ہوں، یہ کیاں کم ہے کہ آپ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ وہ پانی رکھا ہوا ہے۔ آپ پھونک ڈال دیں، تو چلی جاؤں۔

یہ کہہ کر وہ اٹھی، مگر برتن دیکھا، تو پانی ندارد۔ ایں! یہ پانی کیاں ہوا! زمین پی گئی، یا

آسمان! ابھی پانی بھر کر رکھا تھا، دیکھتے دیکھتے اڑ گیا۔ غضب خدا کا، ایک بوند تک نہیں! لبالب بھرا ہوا تھا!

شاہ جی: اچھا، تو بتا دوں، مجھے جوگ مل سے معلوم ہو گیا کہ تم آتی ہو۔ جب تم سو رہیں تو میں نے آنکھ بند کی، اور یہاں پہنچ گیا۔ پانی پیا، تو پھر آنکھ بند کی اور پھر رجبہ صاحب کے پاس ہو رہا۔ پھوٹ ڈالنے کی ساعت اسی وقت تھی۔ نل جاتی تو پھر ایک مہینے بعد آتی۔ اب تم یہ الاچھی لو اور کل آدمی رات کو مرگٹ میں گاڑ دو۔ تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔

یونی نے الاچھی لے لی۔ میاں آزاد چپکے چپکے سب سن رہے تھے۔ اب انھیں خوب ہی معلوم ہو گیا کہ شاہ جی رنگے ستار ہیں۔ لوٹے کا پانی تو میں نے پیا اور آپ نے یہ گڑھا کہ آنکھ بند کرتے ہی یہاں آئے اور پانی پی کر پھر کسی ترکیب سے چل دیے۔ خوب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ واہ رے مکار! جالیے! اتنا بڑا جھوٹا نہ دیکھا نہ سنا۔ ایسے بڑے ولی ہو گئے کہ ان کی دعا سے ایک رانی پانچویں ہی مہینے بچہ جن پڑی۔ جھوٹ بھی تو کتنا! حد تو یوں ہے کہ جھوٹوں کے سردار ہیں۔ پٹے بڑھالیے، تہہ باندھ کر شاہ جی بن گئے۔ لگے جتنے۔ کوئی بیٹا مانگتا ہے کوئی تعویذ مانگتا ہے، کوئی کہتا ہے، میرا مقدمہ جتوا دو، تو نیاز چڑھاؤں، کوئی کہتا ہے نوکری دلوا دیجیے تو مٹھائی کھلاؤں۔ سنیوگ سے کہیں اس کی مراد پوری ہو گئی، تو شاہ صاحب کی چاندی ہے۔ ورنہ کس کی مجال کہ شکایت کا ایک حرف منہ سے نکالے۔ ڈر ہے کہ کہیں زبان نہ سڑ جائے۔ اللہ ری دھاک، بہت سے عقل کے دشمن ان بنے ہوئے فقیروں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ آزاد ایسے بنے ہوئے سدھ اور رنگے ستار فقیروں کی قبر تک سے واقف تھے۔ سوچا، ان کی مرمت کر دینی چاہئے۔

شاہ صاحب نے چپوترے پر لنگی بچھائی اور اس پر لیٹ کر دعا پڑھنے لگے، مگر پڑھے لکھے تو تھے نہیں، شین قاف تک درست نہیں، اناپ ثناپ کہتے لگے۔ اب میاں آزاد سے نہ رہا گیا، بول اٹھے۔ کیا کہنا ہے شاہ جی، واللہ، آپ نے تو کمال کر دیا۔ اب تو شاہ جی چکرائے کہ یہ آواز کس نے کہی۔ یہ دشمن کون پیدا ہوا۔ ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مگر نہ آدمی، نہ آدم زاد، نہ انسان، نہ انسان کا سایا۔ یا خدا، یہ کون بولا؟ یہ کس نے ٹوکا؟ سمجھے کہ یہ آسانی ڈھیلا ہے۔ کسی جن کی آواز ہے۔ ڈر پوک تو تھے ہی، بدن تھر تھرانے لگا، ہاتھ پاؤں پھول گئے، کراماتیں سب بھول گئے، حواس غائب، ہوش قلابازی کھانے لگے۔

قرآن کی آیتیں غلط سلط پڑھنے لگے۔ آخر چلا اٹھے۔ مظہر العجاوب۔ تو ادھر یہ بول اٹھے۔ لٹکی مع شاہ جی غائب۔ اب شاہ جی کی گھبراہٹ کا حال پوچھیے چہرہ فقی، کاٹو تو لبو نہیں بدن میں۔ میاں آزاد نے بھانپ لیا کہ شاہ صاحب پر رعب چھا گیا۔ جھٹ نکل کر پتوں کو خوب کھڑ کھڑایا۔ شاہ جی کانپ اٹھے کہ پرتوں کا لشکر کا لشکر آ کھڑا ہوا۔ اب جان سے گئے۔ تب آزاد نے ایک فارسی غزل خوب لے کے ساتھ پڑھی۔ جیسے کوئی ایرانی پڑھ رہا ہو۔ شاہ جی مت ہو گئے، سمجھے کہ یہ تو کوئی فقیر ہے۔ اب تو جان میں جان آئی۔ میاں آزاد کے قدم لیے۔ انھوں نے پیٹھ ٹھوکی۔ شاہ جی اس وقت نشے کی ترنگ میں تھے، خیال بندھ گیا کہ کوئی آسمان سے اترتا ہے۔

آزاد: کیستی اواز کپائی و دمانت چہ کار است

(کون ہے، کہاں سے آتا ہے اور مجھ سے کیا کام ہے؟)

شاہ جی کے رہے سہے حواس اور غائب ہو گئے۔ زبان سمجھ میں نہ آئی۔ سمجھے کہ ضرور آسمان کا فرشتہ ہے۔ ہماری جان لینے کو آیا ہے۔ دے دانتوں بولے۔ سمجھتا نہیں ہوں گا کہ آپ کیا حکم دیں گے۔ ہم نے بہت گناہ کیے، اب معاف فرماؤ۔ کچھ دن اور جینے دو تو یہ ٹھگ وڈیا چھوڑ دوں۔ میں سمجھ گیا کہ آپ میری جان لینے آئے ہیں۔

آزاد: یہ بڑھاپا اور اتنی بدکاری، یہ سن اور سال اور یہ چال ڈھال۔ یاد رکھ کہ جہنم کے گڈھے میں گرے گا اور دوزخ کی آگ میں جلایا جائے گا۔ سن میں نہ آسمان کا فرشتہ ہوں، نہ کوئی جن ہوں، میں حکیم ولی ناس کی پاک روح ہوں، حکیم ہوں، خدا سے ڈرتا ہوں، میرے قبضے میں بہت سے طلسم ہیں۔ میرا مزار اسی جگہ پر تھا، جہاں تیرا چبوترہ ہے اور جہاں تو تاپاک رہتا ہے اور شور بہ لڑھکاتا ہے۔ خیر تیری جہالت کے سبب سے میں نے تجھے چھوڑ دیا، لیکن اب تو نے یہ نیا پھر پھند سیکھا کہ حسناؤں کو پھانسا ہے اور ان سے کچھ اینٹھتا ہے۔ اس زمانے میں یہ عورت میری بی بی تھی۔ لے اب یہ ہتھکنڈے چھوڑ، مکر اور دغا سے منہ موڑ، نہیں تو تو ہے اور ہم۔ ابھی ٹھیک بناؤں گا اور تاج نچاؤں گا۔ تیری بھلائی اسی میں ہے کہ اپنا کچھ حال کہہ چل، نہیں تو جانے گا۔ میرا کچھ نہ جائے گا۔

شاہ جی نے شراب کی ترنگ میں مارے ڈر کے اپنی جتنی کہانی شروع کی۔ چودہ برس کے سن سے مجھے چوری کرنے کی لت پڑی اور اتنا پکا ہو گیا کہ آنکھ پٹو کی اور گٹھری اڑائی،

غافل ہوا اور ٹوپی کھسائی۔ پہلے کچھ دن تو لٹیا چور رہے۔ مگر یہ تو کرتی دتیا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہم چوروں کے گرد گھنٹال ہو گئے۔ سیند لگانا کوئی ہم سے سیکھے، چھت کی کڑیوں میں یوں چھت رہوں، جیسے کوئی چھچکل، اچک پھاند میں بندر میرے مقابلہ میں مات ہے، دبے پاؤں کوسوں نکل جادیں کیا مجال کسی کو آہٹ ہو، شہر بھر کے بد معاش، لٹے، لچے، شہدے، ہماری ٹکڑی میں شامل ہوئے۔ جس نے ہیکڑی کی۔ اس کو نیچا دکھایا، جو نیچا ہوا، اس کو سیدھا بنایا، خوب چوریاں کرنے لگے۔ آج اس کا مال مارا، کل اس کی چھت کاٹی، پرسوں کسی نواب کے گھر میں سیند دی۔ یہاں تک کہ ڈاکے مارنے لگے، سڑکوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ گول میں دنیا بھر کے بے فکرے، جمع ہیں، کوئی چندہ اڑاتا ہے، کوئی چرس کے دم لگاتا ہے، گانجے بھاگتے ٹھڑے سب کا شوق ہے، تانے اڑ رہی ہے۔ بوتلیں چنی ہوئی ہے، گنڈیریوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کھیاں بھن بھن کرتی ہیں، سب کو یہی فکر ہے کہ کسی کا مال تائیں۔ ایک دن شامت آئی ایک نواب صاحب کے یہاں چوری کرنے کا شوق چڑایا۔ ان کے خدمت گار کو ملایا، نوکرانیوں کو بھی کچھ چنایا اور ایک بجے کے وقت گھر سے نکلے۔ اسی محلے میں ایک مہینے پہلے ہی ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ پہلے اسی مکان میں بیٹھے۔ نواب کا مکان کوئی پچاس ہی قدم ہوگا۔ تین آدمی دس قدم پر اور پانچ بیس قدم پر کھڑے ہوئے۔ ہم، خدمت گار اور ایک چور ساتھ چلے کہ گھر میں دھنس پڑے۔ قریب گئے تو دیوڑھی پر چوکیدار نے پکارا کون؟ سن سے جان نکل گئی۔ عمر بھر میں یہی خطا ہوئی کہ چوکیدار کو پہلے سے نہ ملا لیا۔ اب کیا کریں! 'پچھلی بڑھی گنوار کی' پھر چوکیدار نے لکارا کون آتا ہے؟ ہم نے کہا ہم ہیں بھائی۔ چوکیدار بولا ہم کی ایک ہی کہی ہم کا کچھ نام بھی ہے؟ آخر ہم نے چوکیدار کو اسی دم کچھ چنا کر سیند دی۔ گھر میں گھسے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پٹنگ پر نواب صاحب سوتے ہیں اور دوسری پٹنگ پر ان کی بیگم صاحبہ میٹھی نیند میں مست ہیں۔ مگر شمع روشن ہے۔ اپنے ساتھی سے اشارہ کیا کہ شمع کو گل کر دے۔ وہ ایسا گھبرایا کہ بڑے زور سے پھونک ماری۔ میں نے کہا خدا ہی خیر کرے، ایسا نہ ہو کہ نواب جاگ اٹھیں، تو لینے کے دینے پڑیں۔ آگے بڑھ کر میں نے جتی کوتیل میں کھسکا دیا، چلیے چراغ گل پگڑی غائب۔ بیگم صاحبہ کے سر ہانے زیور کا صندوق رکھا تھا، مگر آڑ میں۔ ہم تو مہری کی زبانی کچا چھٹا سن چکے تھے، گھر کا بھیدی لٹکا ڈھانے فوراً صندوق اٹھایا اور دوسرے ساتھی کو دیا کہ باہر پہنچائے۔ وہ کچھ ایسا گھبرایا کہ

مارے بوکھلاہٹ کے کانپنے لگا اور دم سے گر پڑا۔ دھماکے کی آواز سننے ہی نواب چوہک پڑے۔ شیرچہ سرہانے سے اٹھا، ہینترے بدل بدل کر پھٹکتی کے ہاتھ دکھانے لگے۔ میں نے ایک چاکی کا ہاتھ دیا اور جھٹ کمرے سے نکل، دیوار پر چڑھ، پھجھوڑے کودا اور چور چور چلاتا ہوا ناکے باہر۔ وہ دونوں سر بوجھے نوکیچے تھے، پکڑ لیے گئے مگر واہ رے نواب! بڑا ہی دلیر آدمی ہے۔ دونوں کو گھیر لیا۔ وے تو جیل خانے گئے اور میں بے داغ بیچ گیا۔ اب میں نے یہ پیشہ چھوڑا اور خون پر کمر باندھی۔ ایک مہینے میں کئی خون کیے۔ پہلے ایک سوداگر کے گھر میں گھس کر اسے چارپائی پر ڈھیر کر دیا۔ جمع جتنا ہمارے باپ کی ہوگئی۔ پھر ریل پر ایک مالدار جوہری کا گلا گھونٹ ڈالا اور جواہرات صاف اڑا لیے۔ تیسری دفعہ دو بخارے سرائے میں اترے تھے۔ ہمیں خبر ملی کہ ان کے پاس سونے کی اینٹیں ہیں۔ ان کو سرائے ہی میں انٹا غنفل کرنا چاہا۔ بھٹیاری نے دیکھ لیا پکڑے گئے اور قید خانے گئے۔ وہاں آٹھ دن رہے تھے نوے دن رات کو موقع پا کر کال کوٹھری کا دروازہ توڑا ایک برقداز کا سر اینٹ سے پھوڑا، پہرے کے چوکیدار کو اسی کی بندوق سے شہید کیا اور صاف نکل بھاگے۔ اب سوچا کوئی نیا پیشہ اختیار کریں، سوچتے سوچتے سوجھی کہ شاہ جی بن جاؤ۔ چٹ فقیروں کا بھیس بدل کر ایک بیڑ کے نیچے بستر بچا دیا۔ مجھے لگے۔ ایک دن اس گاؤں کے ٹھاکر کا لڑکا بیمار ہوا۔ یہاں حکیم نہ ڈاکٹر! کسی نے کہہ دیا کہ ایک فقیر پکڑیا کے نیچے بیٹھے خدا کو یاد کیا کرتے ہیں، چہرے سے نور برستا ہے، کسی سے چلتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ٹھاکر نے سنتے ہی اپنے بھائی کو بھیجا۔ ہم ساتھ گئے۔ خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے کہ آج پالا ہمارے ہاتھ رہا، تو عمر بھر چین سے گزرے گی۔ ہمارا پہنچنا تھا کہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم کسی سے بولے نہ چالے، جا کر لڑکے کے پاس بیٹھ گئے اور کچھ بد بد اکراٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھا، لڑکے کا برا حال ہے، بچتا محال ہے۔ ٹھاکر قدموں پر گر پڑا۔ ہم نے پیٹھ ٹھوکی اور لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے چل دیے۔ سنیوگ سے ایک یورپن ڈاکٹر دورہ کرتا ہوا اس گاؤں میں آیا اور اس کی دوا سے مریض چنگا ہو گیا۔ اب مزہ دیکھیے، ڈاکٹر کا کوئی نام بھی نہیں لیتا، سب ہماری تعریف کرتے ہیں۔ ٹھاکر نے ہمیں ایک ہاتھی اور ہزار روپے دیے۔ یہ ہم نے قبول نہ کیا۔ سبحان اللہ پھر تو ہوا بندھ گئی۔ اب چاروں طرف ہم ہی ہم ہیں، کوئی بیمار ہو، تو ہم پوچھے جائیں، کوئی مرے تو ہم بلانے جائیں، میاں بیوی کے جھگڑوں میں ہم قاضی بننے ہیں، باپ بیٹے کا جھگڑا ہم فیصلہ کرتے ہیں۔ صبح سے

شام تک ڈالیوں پر ڈالیاں آتی رہتی ہیں۔

آزاد نے یہ قصہ سن کر شاہ جی کو خوب ڈانٹا، تو کافر ہے، ملعون ہے، تو اپنی مکاری سے خدا کے بندوں کو ٹھکتا ہے، اب ہماری بات سن، ہمارا چیلہ بن جا، تو تجھے چھوڑ دیں۔ کل تڑکے گجہرم گاؤں بھر میں کہہ دے کہ ہمارے پیر آئے ہوئے ہیں۔ دو سو گیارہ برس کی عمر بتانا۔ جسے زیارت کرنی ہو آئے، شاہ جی کی ہانچیں کل گئیں کہ چلو، کسی طرح جان تو بچی۔ نور کے تڑکے گاؤں بھر میں پکار آئے کہ ہمارے پیر آئے ہیں، جسے دیکھنا ہو، دیکھ لے، شاہ جی کی تو وہاں دھاک بندھی ہی تھی، جب لوگوں نے سنا کہ ان کے بھی ولی کھنکڑ آئے ہیں تو شوق چرایا کہ زیارت کو چلیں۔ دو دن اور دو رات میاں آزاد اپنے گھر پر آرام کرتے رہے۔ تیسرے دن فقیرانہ بھیس بدلے ہوئے ہرے ہرے پیڑوں کے سائے میں آ بیٹھے۔ دیکھتے کیا ہیں پو پھٹتے ہی عورت مرد، ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے۔ ہندو اور مسلمان، جوان عورتیں، گہنوں سے لدی ہوئی آکر بیٹھی ہوئی ہیں۔ تب آزاد نے کھڑے ہو کر قرآن کی آیتیں پڑھنی شروع کیں اور بولے، اے خدا کے بندو، میں کوئی ولی نہیں ہوں، تمہاری ہی طرح خدا کا ایک ناجیز بندہ ہوں، اگر تم سمجھتے ہو کہ کوئی انسان چاہے کتنا ہی بڑا فقیر کیوں نہ ہو خدا کی مرضی میں دخل دے سکتا ہے، تو تمہاری غلطی ہے۔ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہی ہے کہ تمہیں خدا کی یاد دلائیں۔ اگر کوئی فقیر، کوئی کرامات دکھا کر، اپنا سکہ جمانا چاہتا ہو تو سمجھ لو کہ وہ مکار ہے، جاؤ اپنا اپنا دھندا دیکھو۔

(6)

میاں آزاد منہ اندھیرے تاروں کی چھاہ میں بستر سے اٹھے تو سوچے، سانڈنی کے گھاس چارے کو فکر کر کے ذرا عدالت اور کچہری کی بھی دو گھڑی سیر کر آئیں۔ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں ایک گھنا باغ ہے اور پیڑوں کی چھاہ میں میلہ سا لگا ہے۔ کوئی حلوئی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے کوئی مداربوں کو تازہ کر رہا ہے۔ کھجڑے پھلوں کی ڈالیاں لگائے بیٹھے ہیں۔ پان دالے کی دکان پر وہ بھیڑ ہے کہ کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ملتی۔ چورن والا چورن بچ رہا ہے۔ ایک طرف ایک حکیم صاحب دواؤں کی پڑیا پھیلائے جریان کی دوا بچ رہے ہیں۔ بیسوں منشی مصدق چٹائیوں پر بیٹھے عرضیاں لکھ رہے ہیں۔ مستغنی ہیں کہ ایک ایک کے پاس دس دس

بیٹے قانون چھانٹ رہے ہیں، ارے فٹشی جی، یوں کائنات سب کچھ ایسا ہی کھپائے ہو؟ ہم تو اپنا مضمون بتاوت ہیں، تم اپنے اڑھائی چادر الگ چراوت ہو۔ لے مور فٹشی جی، شک اس سوچ دیا کے لکھو کہ فریق ثانی کیا مقدمہ ڈھسائے جائے۔ لے تو ہار گوڑ دھرت ہے دوئی کچا آؤر لے لیو۔ آزاد نے جو گواہ گھر کی اور رخ کیا تو سبحان اللہ، کالے کالے چوغوں کی بہار نظر آئی۔ کوئی ادھر سے ادھر بھاگا جاتا ہے، کوئی مسند لگائے بیٹھا گنواروں سے ڈینگ مار رہا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھے تھے کہ چہرہ اسی نے کڑک کر آواز لگائی، ستار خاں حاضر ہے! ایک اینٹی کے پاؤں لڑکھڑائے، بیڑیوں سے لڑھکتے ہوئے دم سے نیچے۔ ایک ٹھنڈول نے کہا واہ جناب گرے تو مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا؟ آزاد ذرا اور آگے بڑھے تو ایک آدمی نے ڈانٹ بتائی، کون ہو؟ کیا کام ہے؟

آزاد: اسی شہر میں رہتا ہوں، ذرا سیر کرنے چلا آیا۔
 آدمی: کچہری میں کھڑے رہنے کا حکم نہیں ہے، یہاں سے جائے، ورنہ چہرہ اسی کو آواز دیتا ہوں۔

آزاد: مجھے نہیں، بس اتنا بتا دیجیے کہ آپ کا عہدہ کیا ہے؟
 آدمی: ہم امیدواری کرتے ہیں۔ تین مہینے سے روز یہاں کام سیکھتے ہیں۔ اب فراٹے اڑاتے ہوں، ڈاکٹ تڑے لکھ لوں، نقشہ چٹکیوں میں بناؤں۔ کسی کام میں بند نہیں۔ پندرہ روپے کی نوکری ہمیں ملائی چاہتی ہے۔ مگر پہلے تو گھاس چھیلنا مشکل معلوم ہوتا تھا اب لقمان بن گیا۔

آزاد: کیوں میاں، تمہارے والد کہاں نوکر ہیں؟
 امیدوار: جناب، وہ نوکر نہیں ہیں دس گاؤں کے زمیندار ہیں۔
 آزاد: کیا تم کو گھر سے نکال دیا، یا کچھ کھٹ پٹ ہے؟
 امیدوار: تو جناب ہم پڑھے لکھے ہیں کہ نہیں!

آزاد: حضرت جسے کھانے کو روٹیاں نہ ہوں وہ ستو ہاندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے تو مضائقہ نہیں۔ تم خدا کے کرم سے زمین دار ہو، روپے والے ہو، تم کو یہ کیا سوچیں کہ دس پانچ کی نوکری کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہو؟ اسی سے تو ہندستان خراب ہے، جسے دیکھو نوکری پر عاشق۔ میاں کہا ملو اپنے گھر جاؤ گھر کا کام دیکھو، اس پھیر میں نہ پڑو۔ یہ نہیں کہ عمامہ

باندھا اور کچہری میں جوتیاں چٹکاتے پھرتے ہیں۔ محرر پر لوٹ، امانت پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

دوسرے امیدوار کی نسبت معلوم ہوا کہ ایک لکھ پتی مہاجن کا لڑکا ہے۔ باپ کی کوٹھی چلتی ہے۔ لاکھوں کا دارائیاں ہوتا ہے۔ بیٹا بارہ روپے کی نوکری کے لیے سو سو چکر لگاتا ہے۔ چوتھے درجے سے مدرسہ چھوڑا اور اپریٹس ہوئے۔ کام خاک نہیں جانتے۔ باہر جاتے ہیں تو منصرم صاحب سے پوچھ کر۔ اس وقت جب دفتر والے اپنے اپنے گھر جانے لگے تو حضرت پوچھتے کیا ہیں کیوں جی یہ سب چلے جاتے ہیں اور ابھی چھٹی کی گھنٹی تو بجی ہی نہیں۔ اسکول کی گھنٹی یاد آگئی۔

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ یہ کم سن لڑکے، پندرہ سولہ برس کا سن، پڑھنے لکھنے کے دن مدرسہ چھوڑا کالج سے منہ موڑا اور امیدواروں کے غول میں شامل ہو گئے۔ 'الف ب' نگار، علم کو چنے کے کھیت میں پچھاڑا، محنت سے جان نکلتی ہے، کتاب کو دیکھ کر بخار چڑھ آتا ہے۔ جس سے پوچھو کہ بھائی مدرسہ کیوں چھوڑ بیٹھے تو یہی جواب پایا کہ اقلیدس کی عقل سے نفرت ہے۔ تواریخ کسے یاد رہے، یہاں تو گھر کے بچوں کا نام نہیں یاد آتا۔ ہم بھی سوچے، کہاں کا جنیمٹ، الگ بھی کرو چلا دھندا کرو، جسے دیکھیے نوکری کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ زمیندار کے لڑکے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچہری میں گھسوں، سوداگر کے لڑکے کو جی سے لگی ہے کہ کالج سے چھٹ ہوں اور کچہری کی کرسی پر جا ڈنوں۔ اور محرر، فشی عملہ تو نوکری کے ہاتھوں بک ہی گئے ہیں۔ ان کی تو گھنٹی ہی میں نوکری ہے۔ بابو بننے کا شوق ایسا چراتا ہے کہ عقل کو طاق پر رکھ کر غلامی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

یہ سوچتے ہوئے میاں آزاد اور آگے چلے، تو چوک میں آنکلیے۔ دیکھتے کیا ہیں پندرہ بیس کم سن لڑکے بستے لٹکائے، سلیٹیں دبائے، پرے جمائے، لپکے چلے آتے ہیں۔ پندرہ پندرہ برس کا سن اٹھتی جوانی کے دن مگر کمر بہتر جگہ سے جھکی ہوئی، گالوں پر جھریاں، آنکھیں گڈھے میں دھنسی ہوئی۔ یہ جھکا ہوا سینہ، نئی جوانی میں یہ حال! بڑھاپے میں تو شاید اٹھ کر پانی بھی نہ پیا جائے گا۔ ایک لڑکے سے پوچھا، کیوں میاں تم سب کے سب اتنے کمزور کیوں دکھلائی دیتے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا جناب طاقت کس کے گھر سے لائیں؟ دوا تو ہے نہیں کہ عطار کی دکان پر جائیں، دعا نہیں کہ کسی شاہ جی سے سوال کریں، ہم تو بتا موت ہی مرے۔ دس

برس کے سن میں تو بیوی چم چم کرتی ہوئی گھر میں آئی۔ چلیے اسی دن سے پڑھنا لکھنا چھپر پر رکھا۔ نئی دھن سوار ہوئی۔ تیرہویں برس ایک بچے کے اباجان ہو گئے۔ روٹیوں کی فکر نے ستایا۔ ہم دبے پتلے نہ ہوں تو کون ہو؟ پھر اچھی غذا بھی میسر نہیں۔ آج تک کبھی دودھ کی صورت نہ دیکھی، گھی کا صرف نام سنتے ہیں۔

میاں آزاد دل میں سوچنے لگے، ان غریبوں کی جوانی کیسی برباد ہو رہی ہے۔ اسی دھن میں ٹپلتے ہوئے حضرت گنج کی طرف نکل گئے، تو دیکھا ایک میدان میں دس پندرہ برس کے انگریزوں کے لڑکے اور لڑکیاں کھیل رہے ہیں۔ کوئی پیڑ کی ٹنہی پر جھولتا ہے کوئی دیوار پر دوڑتا ہے، دو چار گیند کھیلنے پر لٹو ہیں۔ ایک جگہ دیکھا دو لڑکوں نے ایک رسی پکڑ کر تانی اور ایک پیاری لڑکی بدن تول کر زمین سے اس پار اچک گئی۔ سب کے سب خوش اور تندرست ہیں۔ آزاد نے ان ہونہار لڑکوں اور لڑکیوں کو دل سے دعا دی اور ہندستان کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے گھر آئے۔

(7)

میاں آزاد سانڈنی پر بیٹھے ہوئے ایک دن سیر کرنے نکلے، تو ایک سرائے میں جا پہنچے۔ دیکھا ایک برآمدے میں چار پانچ آدمی فرش پر بیٹھے دھواں دھار حقے اڑا رہے ہیں، گلوری چبا رہے ہیں اور غزلیں پڑھ رہے ہیں۔ ایک کوئی نے کہا، ہم تینوں کے تخلص کا قافیہ ایک ہے۔ علّامی، فہامی، اور حامی، مگر تم دو ہی ہو وقاد اور جواد، ایک شاعر اور آجائے تو دونوں طرف سے تین تین ہو جائیں۔ اتنے میں میاں آزاد تڑپے پہنچ گئے۔

ایک نے پوچھا: آپ کون؟

آزاد: میں شاعر ہوں۔

آپ تخلص کیا کرتے ہیں؟

آزاد نے کہا: آزاد۔ تب تو ان سب کی بانجھیں کھل گئیں۔ جواد، وقاد اور آزاد کا تک

مل گیا۔ اب لوگ غزلیں پڑھنے لگے۔ ایک آدمی شعر پڑھتا ہے باقی تعریف کرتے ہیں۔ سبحان اللہ، کیا طبیعت پائی ہے واہ واہ! پھر فرمائیے گا، قلم توڑ دیے، کتنی صاف زبان ہے۔ اس بول چال پر قربان، کوئی جھومتا ہے، کوئی ٹوپیاں اچھالتا ہے۔

آزاد : میاں سنو ہم شاعری کے قائل نہیں۔ آپ لوگ تو زبان پر مرتے ہیں اور ہم خیالوں پر جان دیتے ہیں۔ ہمیں تو نچر کی شاعری پسند ہے۔

نہامی : اقا، آپ نچر پر ہیں! اسیبہ اور دبیر پر تو سنتے تھے اب نچر پر پیدا ہوئے۔ غضب خدا کا! آپ کو ان استادوں کا کلام پسند نہیں آتا، جو اپنا مانی نہیں رکھتے تھے؟ آزاد : میں تو صاف کہتا ہوں یہ شاعری نہیں خط ہے، بے لکاپن ہے، اس کا بھی کچھ ٹھکانا ہے، جھوٹ کے چمچر اڑا دیے۔ اب کان کھول کر نچری شاعری سنو۔

یہ کہہ کر آزاد نے انگریزی کی ایک کوتا سنائی تو وہ قہقہہ پڑا کہ سرائے بھر گونج اٹھی۔

نہامی : واہ جناب واہ، اچھی گت پٹ ہے۔ اسی کو آپ شاعری کہتے ہیں؟ آزاد : شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگورائے۔

آزاد تو نچرل شاعری کی تعریف کرنے لگے ادھر دے پانچوں اردو کی شاعری پر لوٹ پوٹ تھے۔ متش اور تیر کی زبان، تاج، انیس، ذوق، غالب، مومن جیسے استادوں کے کلام پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ اب بتائیے فیصلہ کون کرے؟ بھیران جھکڑا چکانے سے رہی، بھیرا گھاس ہی چھیلنا جانے، آخر یہ رائے طے پائی کہ شہر چلیے۔ جو پڑھا لکھا آدمی پہلے طے اسی کا فیصلہ سب کو منظور۔ سب نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ چلنے ہی کو تھے کہ بھیران نے ان کو لٹکارا اور چمک کر میاں جواد کا دامن پکڑا۔ میاں، یہ بٹے کسی اور کو بتانا، ہم بھی اسی شہر میں بڑھ کر اتنے بڑے ہوئے ہیں۔ ہوں تو ابھی آپ کی لڑکی کے برابر مل سینکڑوں ہی کنوؤں کا پانی پی ڈالا۔ پہلے کوزی کوزی بائیں ہاتھ سے رکھ جائیے پھر اسباب اٹھائیے۔

علامی : نیک بخت، ہم شریف بھلے مانس ہیں، شریف لوگ کہیں دو پیسے کے لیے ایمان بیچا کرتے ہیں؟ چلو دامن چھوڑ دو ابھی دم کے دم میں آئے۔

بھیران : اس دام میں بندی نہ آئے گی۔ ایسے بڑے ساہوکار کھرے اسامی ہو تو ایک کنڈا چپکے سے نکال دو؟

وقاد : یہ مڑچری ہے یا بھیران؟ صاحب اس سے پیچھا چھڑاؤ، ایسی بھیران تو کہیں دیکھی نہ سی۔

بھیران : میاں کچھ بیدھے تو نہیں ہوئے ہو یا ملی ناندھ کر گھر سے چلے تھے؟ چپکے

سے پیسے رکھ کر تب قدم اٹھائیے۔

میاں جواد سیدھے سادے آدمی تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مفت میں گھیرے گئے تو کہا بھائی تم پانچوں جاؤ، ہم یہاں بی بھاریان کی خاطر سے بیٹھے ہیں۔ تم لوگ پٹ آؤ۔ وہ سب تو ادھر چلے اور جواد سرائے ہی میں بھاریان کی حراست میں بیٹھے مگر ایک آنے پیسے نہ دے سکے۔ دو چار منٹ کے بعد پکارا، بھاری بھاری، میں لیٹا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے پیٹ میں چوہے دوڑیں کہ رفو چکر ہوئے۔ پھر تین منٹ کے بعد گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے، بھاریان ہم بھاگنے والے اسامی نہیں ہیں تم مزے سے اپنی دال بگھاڑو۔ جب انھوں نے بار بار چھیڑنا شروع کیا تو وہ آگ بھڑکا ہو گئی اور بولی میاں ایسے دو پیسے سے درگزی تم نے تو گل چاچا کر میرا کلیجہ پکا دیا۔ آپ جائیں بلکہ کھٹیا سیت دفن ہوں، تو میں خوش میرا اللہ خوش۔ اے واہ دیکھی تیری کالپی اور بادن پورے اجازت میاں ہوں تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی ٹل ناک پر تو کبھی بیٹھے نہیں دیتی۔

ادھر میاں جواد بھاریان سے چہل کر رہے تھے ادھر وہ پانچوں آدمی سرائے سے چلے تو راستے میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔

حامی نے کہا: یا مولانا، ایک مسئلہ حل کیجیے تو احسان ہوگا۔

بزرگ: میاں، میں ایک جاہل، بے وقوف، بے سمجھ، گمراہ آدمی ہوں، مولانا نہیں۔ مولانا ہونا دشوار بات ہے۔ مجھے مولانا کہنا اس لفظ کو بدنام کرنا ہے۔

حامی: اچھا صاحب، آپ مولانا نہ سہی، فٹنی سہی، میاں سہی، آپ ایک جھگڑے کا فیصلہ کر دیجیے، اور گھر کا راستہ لیجیے۔ آپ کا ہمارے بزرگوں پر احسان ہوگا۔ جھگڑا یہ ہے کہ یہ صاحب (آزادی کی طرف اشارہ کر کے) نیچری شاعری کے طرف دار ہیں، اور ہم چاروں اردو شاعری پر جان دیتے ہیں، اب بتلائیے ہم میں سے کون ٹھیک کہتا ہے اور کون غلط؟

بزرگ: یہ تو بہت غور کرنے کی بات نہیں۔ آپ چاروں مفت میں جھگڑا کرتے ہیں۔ آپ سیدھے ہسپتال جائیے اور فصد کھلوائیے، شاعری پر جان دینا سمجھداروں کا کام نہیں۔ جان خدا کی دی ہوئی ہے اسی کی یاد میں لگانی چاہیے۔ باقی ربی دوسرے قسم کی شاعری، میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا، اس کے بارے میں کیا عرض کروں؟

پانچوں آدمی یہاں سے نراش ہو کر آگے بڑھے تو ایک کتب خانہ نظر سے گزرا۔ ٹوٹا پھوٹا

مکان، پرانی دھرائی دالان، دیواریں بابا آدم کے وقت کی۔ ایک مولوی صاحب لمبی داڑھی لٹکائے ہاتھ میں چھری لیے مل مل کر پڑھا رہے ہیں اور میں پچیس لڑکے جدل قافیہ اڑا رہے ہیں۔ ایک لڑکے نے دوسرے کی چاند پر تڑ سے دھپ جمائی۔ مولوی صاحب پوچھتے ہیں ابے یہ کیا ہوا؟ لڑکے کہتے ہیں جی کچھ نہیں، سختی مگر پڑی۔ ابے یہ سختی کی آواز تھی؟ جی ہاں، اور نہیں تو کیا؟ اتنے میں دو چار شریر لڑکوں نے منہ چڑھانا شروع کیا۔ دیکھیے مولوی صاحب، یہ منہ چڑھاتا ہے۔ نہیں مولوی صاحب یہ جھک مارتا ہے، میں تو باہر گیا تھا۔ غل غپاڑے کی آواز ایسی بلند ہے کہ آسمان کی خبر لاتی ہے، کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ جودھر دیکھو چل پوں، جوتی چیز، مگر سب کے سب مل مل کر بڑبڑاتے ہیں۔ کتاب تو دو ہی چار پڑھ رہے ہیں، مگر وہی تاجی، انپ شنپ بہتوں کی زبان پر ہے۔

ایک: آج شام کو میں بانے کی کن کیا ضرور لڑاؤں گا۔

دوسرا: آغاقتی کے باغ میں کوا حلال ہے۔

تیسرا: ارے، مالی، تجھے گل بوٹنے کی پہچان رہے۔

چوتھا: مولوی صاحب، گو پیر ہوئے، نادان رہے۔

پانچواں: پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے خراب۔ کھیلو گے کودو گے، ہو گے نواب

مگر سب کی آوازیں ایسی مل جل گئی ہیں کہ خاصی سمجھ میں نہیں آتیں، کیا خرافات کہتے

ہیں۔ لونڈے تو جدل قافیہ اڑا رہے ہیں ادھر مولوی صاحب مزے سے اونگھتے ہیں۔ جب نیند

کھلی تو ایک لڑکے کو بلایا آؤ، کتاب لاؤ، سبق پڑھ لو۔ وہ سر کھلاتا ہوا مولوی صاحب کے

قریب جا بیٹھا، اور سبق شروع ہوا۔ مگر نہ تو لڑکے نہ کچھ سمجھا کہ میں نے کیا پڑھا اور نہ مولوی

صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے کیا پڑھایا۔ دوپہر کے وقت لڑکے سختی لے کر بیٹھے، کوئی

گیندے کی پتی سختی پر ملتا ہے کوئی کوڑی سے سختی کو چٹناتا ہے۔ آدھے گھنٹے تک یہی ہوا کیا۔

پھر لڑکے لکھتے بیٹھے، مولوی صاحب کٹھری سے کھینوں کو نکال اور دروازہ بند کر کے سو رہے۔

یہاں خوب لپٹاؤ گی ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد مولوی صاحب چونکے۔ کٹھری کھولتے ہیں تو یہاں

دو لڑکوں میں چٹ پٹ ہو رہی ہے۔ دونوں گھنٹے پڑے ہیں۔ ٹٹکتے ہی ایک کے ہمارے لگانے

شروع کیے۔ جو امیر کا لڑکا تھا اور مولوی صاحب کو تہواری اور جمعراتی خوب دیا کرتا تھا، اس

نے تو نہ بولے، پچارے غریب پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ آزاد نے دل میں کہا:

گر ہی کتب است و این ملا
کار مظلایں تمام خواهد شد
(اگر یہی کتب ہے اور یہی مولوی تو لڑکے پڑھ چکے)

(8)

ایک دن میاں آزاد سرائے میں بیٹھے سوچ رہے تھے کدھر جاؤں کہ ایک بوڑھے میاں لٹھیا چمکتے آکھڑے ہوئے اور بولے، میاں ذری یہ خط تو پڑھ دیجیے، اور اس کا جواب بھی لکھ دیجیے۔ آزاد نے خط لیا اور پڑھ کر سنانے لگے۔

میرے کھوسٹ شوہر، خداتم سے کبھے!

آزاد: واہ! یہ تو زالا خط ہے، نہ سلام نہ بندگی، شروع ہی سے کوسنا شروع کیا۔
بوڑھا: جناب، آپ خط پڑھتے ہیں کہ میرے گھر کا قرضہ چکاتے ہیں؟ پرانے جھگڑے سے آپ کا واسطہ؟ جب میاں بیوی راضی ہیں تو آپ کوئی قاضی ہیں!

آزاد: اچھا، تو یہ کیسے کہ آپ کی بیوی جان کا خط ہے۔ لیجیے سنائے دیتا ہوں:

’میرے کھوسٹ شوہر، خداتم سے کبھے، سکندر پاتال سے پیاسا آیا، مگر تم نے امرت کی دو چار بوندیں ضرور پی لی ہیں جیسی مرنے کا نام نہیں لیتے۔ کچھ اوپر سو برس کے تو ہوئے اب آخر کیا عاقبت کے بورے بنو گئے؟ ذرا دل میں شرماء، ہزاروں نوجوان اٹھتے جاتے ہیں، اور تم نیاں سے موجود ہو۔ ڈگوفور بھی آیا، مگر تم مونچھوں پر تاؤ ہی دیتے رہے۔ پیسے نے لاکھوں آدمی چٹ کیے مگر آپ تو پیسے کو بھی چٹ کر جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ بخار میں ہزاروں حیا دار چل بے مگر تم اور بھی مونے ہو گئے۔ تمہیں لقوہ بھی نہیں مارتا، لو کے جھونکے بھی تمہیں نہیں جھلساتے، دریا میں بھی تم نہیں پھسل جاتے اور سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اگر حیا دار ہوتے تو ایک چلو کافی تھا، مگر تم وہ چکنے گھڑے ہو کہ تم پر چاہے ہزاروں ہی گھڑے پڑیں لیکن ایک بوند نہ تھم سکے۔ واہ پنٹے کیوں نہ ہو! کس بری ساعت میں تمہارے پالے پڑی۔ کس بری گھڑی میں تمہارے ساتھ بیاہ ہوا۔ ماں باپ کو کیا کہوں مگر میری گردن تو کند جھری سے ریت ڈالی۔ اس سے تو کسی کنویں ہی میں ڈھکیل دیتے، قصائی ہی کے حوالے کر دیتے، تو یہ روز روز کا کڑھنا تو نہ ہوتا۔ تم خود انصاف کرو۔ تمہارے بوڑھ بھس سے مجھ پر کیا گاج

پڑی۔ ہاتھ تو آپ کے کانپتے ہیں، پاؤں میں سکت نہیں، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، کمر کمان کی طرح جھکی ہوئی، آنکھوں کی یہ کیفیت کہ دن کو اونٹ نہیں سوجھتا۔ لاشی ٹیک کر دس قدم چلے بھی تو سانس پھول گئی، دم ٹوٹ گیا۔ سستانے بیٹھے تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ صبح کو ننھی ننھی دو چپائیاں کھالیں تو شام تک کھٹی ڈکاریں آ رہی ہیں، تولہ بھر سکھین کا ستیاناش کیا۔ مگر ہاضمہ ٹھیک نہ ہوا۔ حافطے کا یہ حال ہے کہ اپنے باپ کا بھی نام یاد نہیں۔ بھر سوچو تو کہ بیاہ کرنے کا شوق کیوں چرایا۔ ایک پاؤں تو قبر میں لٹکایا ہے اور خیال یہ گدگدایا ہے کہ دلہا بنیں، دلہن لائیں۔ خدا قسم جس وقت تمہارا پوپلا منہ، سفید بھوں، گالوں کی جھریاں، دوہری کمر، گھنجی چاند اور منخوس صورت یاد آتی ہے تو کھانا حرام ہو جاتا ہے۔ واہ بڑے میاں واہ! خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہمارے ابا جان سے پچاس ساٹھ برس بڑے ہوں گے اور اماں جان کو تم نے گود میں کھلایا ہو، تو تعجب نہیں، خدا گواہ ہے تم میرے دادا کے باپ سے بھی بڑے ہو، مگر واہ ری قسمت، کہ آپ میرے شوہر ہوئے، زمین پھٹ جائے، تو میں دھنس جاؤں۔

تمہاری جوان بیوی

آزاد: جناب، اس کا جواب کسی بڑے فحشی سے دلوایئے۔

بوڑھا: بڑھاپے میں اب کبھی شادی نہ کریں گے۔

آزاد: واہ کیا ابھی شادی کرنے کی ہوس باقی ہے؟ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔

بوڑھا: اب اس کا ایسا جواب لکھیے کہ دانت بکھنے ہو جائیں۔

آزاد: آپ عورت کے منہ ناحق لگتے ہیں۔

بوڑھا: جناب اس نے تو میری ناک میں دم کر دیا اور سچ پوچھو تو جس دن اس کو بیاہ

لائے ناک ہی کٹ گئی۔ ایسی چنچل عورت دیکھی نہ سنی، مجال کیا کہ ناک پر کبھی بیٹھ جائے۔

آخر آزاد نے پتر کا جواب لکھا۔

’میری البیلی، جمیل جمیلی، نادان بیوی کو اس کے بوڑھے شوہر کی اٹھتی جوانی دیکھنی

نصیب ہو۔ وہ جگ جگ جیے اور تم پوتوں پھلو، دودھوں نہاؤ، اٹھارہ لڑکے ہوں اور اٹھارہ دنی

چھتیں جھوکریاں۔ جب میں دالان میں قدم رکھوں نہ سب بچے لپٹا آئے، ابا جان آئے،

کھلونے لائے، پٹاخے لائے، کہہ کر دوڑیں۔ مگر ذرا یہ ہے کہ تم بھی ابھی کم سن ہو، ان کی

دیکھا دیکھی کہیں مجھے امان کہہ اٹھنا کہ پاس پڑوس کی عورتیں مجھے اٹھلیوں پر پٹائیں۔ مجھے تم

سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی کو اپنی بیٹی سے ہوتی ہے۔ اپنی نانی کو میں ایسا پیارا نہ تھا جتنی تم مجھے پیاری ہو، اور کیوں نہ ہو تمہاری پردادی کو میں نے گودیوں میں کھلایا ہے اور میری بہن نے اسے دودھ پلایا ہے۔ مجھے تمہاری دادی کا گڑیا کھیلنا اس طرح یاد ہے جیسے کسی کو صبح کا کھانا یاد ہو۔ تمہارے خط نے میرے دل کے ساتھ وہ کیا جو بجلی کھلیان کے ساتھ کرتی ہے لیکن مجھ میں ایک بڑی صفت یہ ہے کہ پرلے سرے کا بے حیا ہوں، اور کیوں نہ ہو شرم عورتوں کو چاہیے میں تو چکنا گھڑا ہوں۔ مانا کہ آنکھوں میں نور نہیں مگر نگاہ بڑی باریک رکھتا ہوں، بہرا سہی لیکن مطلب کی بات خوب سنتا ہوں، بڑھا ہوں کمزور ہوں، مگر تمہاری محبت کا دم بھرتا ہوں۔ تمہارا پیارا پیارا کھڑا ریلی آنکھیاں، گوری گوری بہیاں جس وقت یاد آتی ہیں کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ تمہارا چاندنی رات میں نکھر کر نکلتا، کبھی مسکراتا کبھی کھلکھلاتا، کتنا بھانسا؟ کیسا لجانا؟ اور تو اور تمہاری پھرتی سے دل لوٹ پوٹ ہے، کلیجے پر چوٹ ہے۔ تمہارا پھرتی کی طرح چاروں اور گھومنا، سوروں کی طرح جھومنا، کبھی کھیلے کھیلے میری چپت گاہ پر نیپ بھائی، کبھی شوخی سے وہ ڈانٹ بتائی کہ کلیجہ کانپ اٹھا، کبھی آپ ہی آپ رونا، کبھی دن دن بھر سونا، المیزین کے دن، بارہ برس کا سن، بیوی جان تم پر قربان، لے کہا مانو ہمیں غیبت جانو، میں صبح کا چراغ ہوں، ہوا چلے یا نہ چلے اب گل ہوا، اب گل ہوا۔ ڈوبتا ہوا آفتاب ہوں، اب ڈوبا اب ڈوبا۔ مجھے ستانا، موئے پر سو ڈرے۔ تم خوب جانتی ہو کہ میری باتیں کتنی میٹھی ہوتی ہیں۔ ستر برس ہو گئے کہ دانت چوہے لے گئے، تب سے حلوے پر بسر ہے، پھر جو روز حلوہ کھائے گا، اس کی باتیں میٹھی کیوں نہ ہوں گی۔ تم لاکھ روٹھو، پھر بھی ہماری ہو، بیوی ہو، وہ ٹھہر گھڑی یاد کرو جب ہم دلہا بنے، پرانے سر پر نئی پگڑی جمائے، سہرا لٹکائے، مہندی لگائے، مرغی کے برابر گھوڑیا پر سوار، میٹھی پوٹی، جاتے تھے۔ اور تم دلہن بنی، سولہ سنگار کیے پاکی میں سے جھانک رہی تھیں۔ ہمارے گالوں کی جھریاں، ہمارا پوپلا منہ، ہماری نیزھی کمر دیکھ کر خوش تو نہ ہوئی ہوگی؟ اور کیا لکھوں ایک نصیحت یاد رکھو ایک تو میلے ٹھیلے نہ جانا، دوسرے آس پاس کی چھو کر یوں کو گویاں نہ بنانا۔ خدا کرے جب تک زمین اور آسمان قائم ہے تم جوان رہو، اور نادان رہو، ہمارے سفید بال تمہیں بھائیں، حاسد کھار کھائیں۔

تمہارا بوڑھا شوہر

بوڑھا: ماشاء اللہ! آپ نے خوب لکھا، مگر اس خط کو لے کون جائے؟ اگر ڈاک سے

بھیجتا ہوں تو گم ہونے کا ڈر، اس پر تین دن کی دیر، اگر آپ اتنا احسان کریں کہ اسے وہاں پہنچا دیں تو کیا پوچھنا۔

آزاد سیلانی تو تھے ہی کبھے کیا، ج ہے، ساٹھنی موجود ہے، اسی بہانے ذرا دل لگی دیکھ آؤں۔ کچھ بہت دور بھی نہیں ساٹھرا پر مشکل سے دو گھنٹے کی راہ ہے۔ بولے آپ بزرگ آدمی ہیں آپ کا حکم بجالانا میرا فرض ہے، لیجیے جاتا ہوں۔

یہ کہہ کر ساٹھنی پر بیٹھے اور چھن چھن کرتے جا پہنچے۔ دروازے پر آواز دی، تو ایک کہارن نے باہر نکل کر پوچھا، میاں کون ہو، کہاں سے آنا ہوا، کس کی تلاش ہے؟

آزاد: بی مہری صلبہ، سلام، ہم مسافر پردیسی ہیں۔

کہارن: واہ! اچھے آئے میاں، یہ کیا کچھ سرائے ہے؟

آزاد: خدا کے لیے بیگم صلبہ سے کہہ دو کہ بڑے میاں نے خط بھیجا ہے۔

مہری نے ایک چوڑی بھری تو گھر کے اندر تھی۔ جاکر بولی بی بی میاں کے پاس سے ایک صاحب آئے ہیں خط لائے ہیں۔

وہ چونک اٹھی: چل جھوٹی، کسی اور کو جاکر اڑانا، یہاں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میاں کسی قبرستان میں میٹھی نیند سو رہے ہوں گے کہ خط بھیجیں گے؟

مہری: ذرا جھروکھے سے جھانکے تو، وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔

بیگم صلبہ جھروکھے کی طرف چلیں تو اپنی بوڑھی اماں کو آئینہ سامنے رکھے بال سنوارتے دیکھا۔ چھیز کر بولیں اے اماں، آج تو بے طور چوٹی کنگھی کی فکر ہے۔ کوئی گھورے تو انسان نکھار کرے۔ کوئی مرے تو آدمی شکار کرے۔ تم دو اوپر اسی برس کی ہوئیں مگر جوانی کی ہوس نہ گئی۔ خدا ہی خیر کرے۔

اماں: مجھ نصیبوں جلی کی قسمت میں یہی بدا تھا کہ بیٹی کی زبان سے ایسی ایسی باتیں سنوں۔ کوئی اور کہتی تو اس کی زبان نکال لیتی، لیکن تم تو میری آنکھوں کی پتلی ہو، ہائے متا بری چیز ہے! مینا تم یہ باتیں کیا جانو ابھی جوان ہو نادان ہو، بناوٹ سجاوٹ تو میری گھٹی میں پڑی تھی، اور میں نہ بنی ٹھنٹی تو تمھاری آنکھوں کو ترچھی چتون کون سکھاتا؟ باہر جاؤ، تمھارے میاں کا آدمی آیا ہے۔

بیوی نے جھروکھے سے جو دیکھا ایک آدمی سچ کھڑا ہے، اور ہے بھی البیلا، چھیلا،

جوان، تو ترنت مہری کو بھیجا کہ جا کر انھیں بیٹھنے کے لیے کرسی نکال دے۔ آزاد تو کرسی پر بیٹھے اور چمک کے ادھر آپ جا بیٹھیں۔ آزاد کی ان پر نگاہ پڑی تو حیر سا لگ گیا۔ کمر ایسی پتلی کہ سائے کے بوجھ سے بل کھائے، کھڑا بن گئے چاند کو لجائے، اس پر سیاہ ریشمی لباس اور حنا کی بوباس۔ جو بن پٹنا پڑتا تھا، نگاہ پھسل جاتی تھی۔

مہری نے آزاد سے پوچھا، بڑے میاں تو آرام سے ہیں؟
 آزاد: ہاں، میں ان کا خط لایا ہوں، اپنی بیگم صاحبہ سے میرا سلام کہو اور یہ خط ان کو

دو۔

مہری: بیگم صاحبہ کہتی ہیں آپ خط لائے ہیں تو پڑھ کر سنا بھی دیجیے۔

آزاد نے خط پڑھ کر سنایا تو اس نازنین کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ بنا کچھ کہے سنے جھمک کر وہاں سے انھیں اور اپنی ماں کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ امی جان اس وقت چاندنی کی بہار دیکھنے میں مصروف تھیں۔ بولیں بیٹی، دیکھ تو کیا نور کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ چاند اس وقت لہن بنا ہوا ہے؟

بیٹی: امی جان، تمھاری بھی انوکھی باتیں ہیں۔ سردی کی چاندنی جیسے بوڑھے کی نصیبوں جلی بیوی کی جوانی۔ آج تو آسمان یوں ہی جھک جھک کر رہا ہے آج نکلا تو کیا، جب جانیں کہ اندھیرے گھپ میں شکل دکھائے۔ بوڑھیا تاڑ گئی۔ بولی۔ بیٹی ذری صبر کرو، اپنی جوانی کی قسم بڑھا تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے، آج مواکل دوسرا دن، پھر ہم تم کو کسی اچھے گھر بیاہیں گے۔ اب کی خدائی بھر کی خاک چھان کر وہ ڈھونڈھ نکالوں، جو لاکھوں میں ایک ہو، صبح شام خبر آتا ہی چاہتی ہے کہ بڑھا چل بسا۔

یہ سن کر بیٹی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی اماں جب تم اپنی جوانی کی قسم کھاتی ہو تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ تم تو اپنے کو بالکل ننھی ہی سمجھتی ہو۔ کروڑوں تو آپ کے گالوں پر جھریاں، لچکے کے پر کا سا سفید جھوڑا، سر گھڑی کا کھٹکا بنا ہوا، کمر ٹیڑھی، مگر مہندی کا لگانا نہ چھوٹا نہ چھوٹا۔ رنگین دوپٹہ ہی عمر بھر اوڑھا، جب دیکھو کنگھی چوٹی سے لیس، خدا قسم ایسی ان گڑھ بوڑھی دیکھی نہ سنی۔

بوڑھیا نے ٹوئیاں طوطے کی طرح پوپلے منہ سے کہا۔ پیاری تمھاری باتوں سے مجھے ہول ہوتا ہے، اللہ میری بچی پر رحم کھائے، بوڑھے کے مرنے کی خبر سنائے۔

مہری: بڑی بیگم، آپ کے تنک کی قسم، صاحب زادی کو آپ کا دل و جان سے پیار ہے، مگر بھولی نادان ہیں، جو انپ شاپ منہ میں آیا کہہ سنایا۔ اَلُوہ پن کے تو ان کے دن ہی ہیں، جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، نیک بد اونچ نیچ کیا جانیں۔ جب سیانی ہوں گی تو شعور آپ ہی آپ سیکھ جائیں گی۔ بڑھیا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا جو مجھے ان کی باتوں میں رنج ہوا ہو تو خدا مجھے جنت نہ دے۔ مگر کروں کیا برا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ کو یہ آئے دن طعنہ دیتی ہے کہ تم بڑھیا ہو، بڑھاپے میں نکھرتی کیوں ہو؟ میں کس سے کہوں کہ اس کے غم نے میری کمر توڑ ڈالی، اس کو کڑھتے دیکھ کر کھلی جاتی ہوں، نہیں میرا ابھی سن ہی کیا ہے! اچھا تو ہی ایمان سے کہہ کوئی اور بھی مجھے بوڑھی کہتا ہے؟

مہری دل میں تو ہنستی تھی کہ انھیں، جو ان بننے کا شوق چرایا ہے، حاکم کے ساتھ کھیلی ہوں گی مگر ابھی ننھی ہی بنی جاتی ہیں لیکن چھٹی ہوئی عورت تھی بات بنا کر بولی اے تو بے بڑھاپے کی آپ میں تو چہا بھی نہیں۔ میرا اللہ جانتا ہے جب آپ اور بیٹا کو کوئی ساتھ دیکھ لیتا ہے تو پہلے آپ پر نظر پڑتی ہے پیچھے ان پر۔ بلکہ ایک موٹی دل جلی نے پرسوں چنگلی لی تھی کہ 'چھوٹی بی تو چھوٹی بی، بڑی بی سجان اللہ لڑکی تو خیر اس کی ماں نے تو خوب کاٹھی پائی ہے۔ آپ کا چہرہ کدن کی طرح دیکتا ہے، جو دیکھتا ہے ترستا ہے۔

بڑھیا تو کھل گئی لیکن بیٹی جل اٹھی۔ کڑک کر بولی چل چپ خوشامدن، اللہ کرے تیرا میاں بھی میرے میاں کا سا بوڑھا ہو جائے۔ اور تم خوشامد نہ کرو تو کھاؤ کیا؟ اماں پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے! جھوٹے پر شیطان کی پھنکار۔ بوڑھی عورت کچھ اوپر سو برس کا سن، لٹھیا ٹیک کر دس قدم چلتی ہیں تو گھٹنوں ہانپا کرتی ہیں۔ دن کو اونٹ اور سارس نہیں سو جھتا، ان کے بوڑھے نخرے دیکھ کر ہم کو ہنسی آتی ہے۔ جی جلتا ہے کہ یہ کس برتے پر اتارتی ہیں، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، بھلا کمر تو میرے سب سے جھک گئی اور دانت کیا ہوئے؟

آخر، مہری نے اسے سمجھا بھاکر بات ٹال دی، اور بولی وہ میاں باہر بیٹھے ہیں ان کے لیے آپ کیا کہتی ہیں۔ اس نے مہری کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہاں سے اٹھ کر بیچے میں آئی اور اٹھلا اٹھلا کر ٹھٹھنے لگی۔ بال بکھرے ہوئے، یہی معلوم ہوتا تھا کہ سانپ لہرا رہا ہے۔ کمر لاکھوں بل کھا رہی ہے۔ میاں آزاد نے جتن کی درازوں سے جو اسے بے نقاب دیکھا تو تن سے جان نکل گئی۔ کیچے پر سانپ لوٹنے لگا۔ سنیوگ سے اس رمنی نے ان کو کہیں دیکھ لیا

کہ آنکھیں سینک رہے ہیں اور دور ہی سے جو بن لوٹ رہے ہیں تو بدن کو چھپائے، آنکھیں
چرائے، بجلی کی طرح لوٹ کر نظر سے غائب ہوگئی۔ آزاد حیران کہ اب کیا کروں۔ آخر دل کی
بے قراری نے ایسا مجبور کیا کہ آٹھ آٹھ آنسو رو کر یہ غزل گانے لگے۔

کیا جاوے کہ وصل میں کیا بات ہوگئی
آنکھیں نہیں ملاتے ہیں شرمائے جاتے ہیں
دل میرا لے کے کیا کہیں بھول آئے ہیں حضور؟
کھوئے ہوئے سے آپ جو کچھ پائے جاتے ہیں
کالے ڈیس جو زلف تمھاری کبھی چھوئیں
لو اب تمھارے سر کی قسم کھائے جاتے ہیں

تمکنت کو نہ کام فرماؤ
ایک نظر مڑ کے دیکھتی جاؤ
عاشقوں سے نہ اس قدر شرما
ایک نگاہ کے لیے نہ آنکھ چرا
جانِ جاں، کچھ ترس نہ کھاؤ گی؟
یوں تڑپتا ہی چھوڑ جاؤ گی؟

وہ ان ایسوں کی کب سننے والی تھی، مڑ کر دیکھنا گالی تھی، آزاد نے جب دیکھا کہ یہاں
دال گلنے کی نہیں۔ کوئی یوں ٹہلتے ہوئے دیکھ لے تو لینے کے دینے پڑیں تو بیچارے روتے
ہوئے گھر سے باہر آئے۔

اُدھر اس نازنین نے جوانی کی اسنگ میں یہ غمیری بھیرودی کی دھن میں لہرا لہرا کر گائی :

پیا کے آدن کی بھٹی بریاں، دروزوا ٹھاڑھی رہوں

مورے پیا کو بیگی لے آؤ ری، نکست جیرا جائے

پیا دروزوا ٹھاڑھی رہوں

اس کے جواب میں ان کی اماں جان ٹیپ دار آواز میں کیا کہتی ہیں :

جو بنواں ہو چار دنا دہنوں ساتھ

جو بن رتو جات سبھی کھ مورت، قدر نہ پوچھے بات رے
 جو خواں ہو چار دینا نہوں ساتھ
 میاں آزاد نے چلتے چلاتے باہر سے یہ تان لگائی
 تیرے نیوں نے مجھے مارا ربیلی متواریوں نے جادو ڈارا۔
 مہری نے دیکھا کہ سب نے اپنے اپنے حال کے مطابق ہانک لگائی ایک میں ہی
 پھنڈی رہ گئی تو وہ بھی کفن پھاڑ کر چیخ اٹھی۔
 جاؤ جاؤ، کاہے ٹھاڑھے ڈارے گل باہیں رے؟
 گھیرے رتے میرے جیسے چھائی رے
 جانت ہوں جو ہم سے چھوٹ ہو
 ناحق اتنی دقتی کرت ہو
 'قدر' کرت ہو ارے نایں نایں رے
 جاؤ چلو کاہے ٹھاڑھے ڈارے گل باہیں رے

(9)

آزاد کو نواب صاحب کے دربار سے چلے مہینوں گزر گئے، یہاں تک کہ محرم آگیا۔ گھر
 سے نکلے تو دیکھتے کیا ہیں، گھر گھر کہرام مچا ہوا ہے، سارا شہر حسین کا ماتم منا رہا ہے۔ جدھر
 دیکھیے تماشائیوں کی بھیڑ، مجلسوں کی دھوم، تعزیه خانوں میں چہل پہل اور امام بازوں میں بھیڑ
 بھاڑ ہے۔ لکھنؤ کی مجلسوں کا کیا کہنا! یہاں کے مرثیے پڑھنے والے روم اور شام تک مشہور
 ہیں۔ حسین آباد کا امام باڑہ چودھویں رات کا چاند بنا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک دوست بھی
 ہو لیے تھے۔ ان کی بے قراری کا حال نہ پوچھیے۔ وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے، لوٹے جاتے
 تھے کہ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو، مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک آدمی نے ٹھنڈی سانس کھینچ
 کر کہا میاں اب وہ لکھنؤ کہاں ہے، وے لوگ کہاں؟ وے دن کہاں؟ لکھنؤ کا محرم رینگیلے پیا
 جان عالم کے وقت میں البتہ دیکھنے قابل تھا۔ جب دیکھو باغیوں کی تلوار میاں سے دو انگل
 باہر۔ کسی نے ذرا شکیلی چتون کی، اور انھوں نے کھٹ سے سروبی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا، بھنڈارا
 کھل گیا۔ ایک ایک گھٹنے میں بیس بیس وارداتوں کی خبر آتی تھی، دکاندار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر

سک جاتے تھے۔ وہ دھکم دھکا، وہ بھیڑ بھڑا کا ہوتا تھا کہ واہ! انتظام کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا، تب چھوٹے چھوٹے آدمی ہزاروں لٹاتے تھے، اب کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا۔ اب نہ انیس ہیں نہ دہر، نہ خمیر ہیں، نہ دگیہر۔

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا باغ، جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کٹے جو مرجھا نہ گئے

دیر کا کیا کہنا تھا، ایک بند پڑھا اور سننے والے لوٹ گئے۔ انیس کو خدا بخشے، کیا کمال تھا، گویا جواہرات کے ٹکڑے ہوں۔ لیکن ہاتھی لوٹے گا بھی تو کہاں تک! اب بھی اس شہر کی ایسی تعزیہ داری دنیا بھر میں کہیں نہیں ہوتی۔

آزاد اور ان کے دوست چلے جاتے تھے۔ راہ میں وہ بھیڑ تھی کہ کندھے سے کندھا جھلکتا تھا۔ ہوا بھی مشکل سے جگہ پاتی تھی۔ غریب امیر، بوڑھے جوان اڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو، زالی ہی ج ج دج۔ کوئی حسین کے ماتم میں نیچے ہی سر چلا جاتا ہے کوئی ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔ حسینوں کی ماتمی پوشاک، بکھرے ہوئے بال، کبھی لجانا، کبھی مسکرانا، شہدوں کا سو سو چک پھیریاں لگانا، تماشاویوں کی باتیں، دیہاتیں بندی لگائے، پھر یا پھڑکائے، گوند سے پٹیا جمائے باتیں کر رہی ہیں۔ لیجیے آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل۔ واہ میاں باقر، کیوں نہ ہو نام کر گئے۔ چکا چوندھ کا عالم ہے۔ لیکن گلی تنگ، تماشاویوں کی عقل دنگ۔ مگر لوگ گھس پینٹ کر دیکھ ہی آتے ہیں۔ ناک ٹوٹنے یا سر پھوٹنے آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے۔

دونوں آدمی وہاں سے آگے بڑھے تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں، ایک جہا آدم کے زمانے کے بوڑھے اگلے وقتوں کے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واہ واہ! لکھنؤ کے کہہا، کیا کمال ہیں؟ بوڑھا ایسا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے پوپے منھ سے اب بولا، اور اب بولا۔ وہی سن کے سے بال، وہی سفید بھونیں، وہی چتون، وہی ماتھے کی شکن، وہی ہاتھوں کی جھریاں، وہی ٹیڑھی کمر، وہی جھکا ہوا سینہ۔ واہ رے کارگیر، تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے۔ وہاں سے جو چلے تو داردغہ واجد علی کے امام باڑے میں آئے۔ یہاں سورج کھسی پر وہ جو بن تھا کہ آفتاب اگر ایک نظر

مہمپ کر دیکھ پاتا تو شرم کے مارے منہ چھپا لیتا۔ بے ہرزک جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
 الاپچی پچھی ڈلی پیش کی گئی۔ وہاں سے حسین آباد پہنچے۔ سبحان اللہ یہ امام بازہ ہے یا جنت کا
 مکان! کیا سہولت تھی، برجوں پر قدیلیں روشن تھیں، عیناروں پر شمع جلتی ہوئی، چراغوں کی
 قطار، ہوا کے جمگوٹوں سے لہرا لہرا کر عجب ساں دکھائی تھی۔ نہر جو دیکھی تو آنکھیں ٹھنڈی
 ہو گئیں۔

اب ان کے دوست کو شوق چرایا کہ طوائفوں کے امام بازوں کی زیارت کریں۔ پہلے
 میاں آزاد سمجھکے اور بولے بندہ ایسی جگہ نہیں جانے کا، اپنی شان کے خلاف ہے۔ دوست نے
 کہا، بھائی، تم بڑے روکھے پھیکے آدمی ہو، حیدر، مشتری، گوہر اور آبادی کے مرچے نہ سنے، تو
 کسی سے کیا کہیں گے کہ لکھنؤ کا محرم دیکھا۔ آج کل وہاں جانا حلال ہے۔ ان دس دنوں میں
 مزے سے جہاں چاہے جائے، رنگین کروں میں دو گال ہنس بول آئیے، کوئی کچھ نہیں کہہ
 سکتا۔

آزاد: یہ کیسے تو خیر، بندہ بھی لبو لگا کر شہیدوں میں داخل ہو جائے۔ پہلے گوہر کے
 یہاں پہنچے۔ اچھے اچھے رئیس زادے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک بڑے مالدار جوہری صاحب بگلتے
 ہوئے آئے۔ دس روپے کی کار چوٹی ٹوپی سر پر، پیازی اٹلس کی بھڑکیلی اچکن پہنے ہوئے،
 خدمت گار کے کندھے پر قیمتی دو شالہ، یہ ٹھاٹ باٹ، مگر بیٹھے ہی ٹوکے گئے۔ بیٹھے تو ضریح
 (تعزیے) کی طرف پیٹھ کر کے! گوہر نے ایک عجیب ادا سے جھڑک دیا، اسے واہ، بڑے
 تیز دار ہو، ضریح کی طرف پیٹھ کر لی۔ سیدھے بیٹھو، آدمیت کے ساتھ۔

میاں آزاد نے چپکے سے دوست کے کان میں کہا میاں اس نیم نام سے تو آئے، مگر
 گھڑکی کھا کر مکے تک نہیں۔

دوست: بھائی جان، گوہر لکھنؤ کی جان ہے لکھنؤ کی شان ہے۔ ایسا خوش نصیب کوئی ہو
 تو لے کہ اس کی گھڑکیاں ہے۔

لوگ ادب سے گردن جھکائے بیٹھے کھنکھویں سے آنکھوں کو سینک رہے تھے لیکن کسی
 کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ یہاں سے اٹھے تو فرنگی محل میں حیدر جان کے یہاں پہنچے۔
 وہاں مرثیہ ہو رہا تھا:

لکے خیمے سے جو ہتھیار لگائے عباس
 چڑھ کے رہ بار پر میدان میں آئے عباس
 اس شعر کو ایسی پیاری آواز سے ادا کیا کہ سننے والے لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔
 راگ اور راگنی تو اس کی لوثیاں تھیں۔ سب کے سب سر دھنتے تھے، کیا پیارا گلا پایا ہے!
 میاں آزاد کی بانجھیں کھلی جاتی تھیں اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہوگئی تھی۔
 یہاں سے اٹھے تو مشتری کے کمرے میں پہنچے۔ دیکھنے والوں کا وہ ہجوم تھا کہ تل رکھنے
 کی جگہ نہیں۔
 'خنجر جو بوسہ گاؤ پیہر پہ چل گیا' اس کو جھنوٹی کی دھن میں اس لطف سے پڑھا کہ
 لوگ پھڑک اٹھے۔

دوست : کیوں یار، کیا لکھنؤ میں زیور پہننے کی قسم ہے؟
 آزاد : بھائی، تم بالکل ہی گنوار ہو! ماتم میں زیور کا کیا ذکر؟ گورے گورے کانوں میں
 کالے کالے کرن پھول، ہاتھوں میں سیاہ چوڑیاں، بس یہی کافی ہے، لیکن یہ سادگی بھی عجیب
 لطف دکھاتی ہے۔

یہاں سے اٹھ کر دونوں آدمی ماتم کی مجلسوں میں پہنچے۔ جدھر جاتے ہیں، رونے پہننے
 کی آواز آتی ہے، جسے دیکھیے، آنکھوں سے آنسو بہا رہا ہے۔ ساری رات مجلسوں میں گھومتے
 رہے، صبح اپنے گھر پہنچے۔

(10)

بست کے دن آئے۔ آزاد کو کوئی فکر تھی ہی نہیں، سوپے آج بست کی بہار دیکھنی
 چاہیے۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، تو دیکھا کہ ہر چیز زرد ہے، پڑ پڑے زرد، در و دیوار زرد،
 رنگین کمرے زرد، لباس زرد، کپڑے زرد۔ شاہ مینا کی درگاہ میں دھوم ہے، تماشاخیوں کا ہجوم
 ہے۔ حسینوں کے جھم کرے، رتیلیے جوانوں کی ریل چل، اندر کے اکھاڑے کی پروں کا دنگل
 ہے، جنگل میں منگل ہے۔ بست کی بہار امنگ پر ہے، زعفرانی دوپٹوں اور کیسریا پاجاموں پر
 عجب جوہن ہے۔ وہاں سے چوک پہنچے۔ جوہریوں کی دوکان پر ایسے سندر بکھراج ہیں کہ
 بکھراج پری دیکھتی تو مارے شرم کے ہیرا کھاتی اور اندر کا اکھاڑا بھول جاتی۔ میوہ بیچنے والی

زرد آلو، نارنگی امروہ، چکوترا، مہتابی کی بہار دکھلاتی ہے، چٹھئی دوپے پر اتراتی ہے، مالکن گیند، ہزار، زرد گلاب کی بو باس سے دل خوش کرتی ہے۔ اور پکار پکار کر لبھاتی ہے گیندے کا بار ہے، گلے کی بہار ہے۔ حلوائی کھوپڑے کی زرد برنی، پستے کی برنی، نان ختائی، بیسن کے لڈو، پننے کے لڈو، دوکان پر سجائے بیٹھا ہے۔ خونچے والے پاڑ، دال موٹھ، سیو، وغیرہ بیچتے پھرتے ہیں۔ آزاد یہی بہار دیکھتے دل بہلاتے چلے جاتے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں، لالہ وسنت رائے کے مکان میں کئی رنگیلے جوان باگی ٹوپیاں جمائے، ہنستی۔ پکیا باندھے، کسیرے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے چند رکھی عورتیں بیٹھی نو بہار کی دھن میں ہنست گا رہی ہیں۔ قابیلن زرد ہے، چھت پوش زرد، کبمل زرد، زرد جھار سے مکان سجایا ہے، ہنست چٹھی نے درو دیوار تک کو ہنستی لباس پہنایا ہے۔ کوئی یہ گیت گاتی ہے :

رتو آئی ہنست عجب بہار
 کھلے زرد پھول بروں کی ڈار
 چکیو کسم پھولے لاگی سروسوں
 جمومت چلت گیہوں کی بار
 ہر کے دوارے مالی کا چھوہرا
 گرودا ڈارت گیندوں کے ہار
 ٹیسو پھولے، انبا بورے
 چپا کے رخ کلین کی بہار
 گرودا ڈارے استاد کے دوارے
 چلو سب سکھیاں کر کر سنگار

کوئی میاں امانت کی طرح یہ غزل گاتی ہے :

ہے جلوہ تن سے درو دیوار ہنستی
 پوشاک جو پہنے ہے میرا یار ہنستی
 کیا فصل بہاری میں ٹھونے ہیں کھلائے
 معشوق ہیں پھرتے سرے بازار ہنستی
 گیندا ہے کھلا باغ میں، میدان میں سروسوں

صحرا وہ بنسنتی ہے، یہ گلزار بنسنتی

منہ زرد دوپٹے کے نہ آجھل سے چھپاؤ

ہو جائے نہ رنگ گل رخسار بنسنتی

آزاد چلے جاتے تھے کہ ایک نئی جگہ کے بزرگ سے مذہبھڑ ہوئی۔ بڑے تجربے کار، خراث آدمی تھے۔ آزاد کو دیکھتے ہی بولے۔ آئیے آئیے خوب ملے۔ واللہ شریف کی صورت پر عاشق ہوں۔ چین، ماسچین، ہند اور سندھ، روم اور شام، الغرض ساری خدائی کی بندے نے خاک چھانی ہے۔ اور تو یار جانی ہے۔ سفر کا حال سن، گھنگھرو بولے مٹھن مٹھن ایسی بات بتاؤں۔ پری کو لبھاؤں، جن کو رجبھاؤں، مصر کی داستان سناؤں۔

یہ تقریر سن کر آزاد کے ہوش پیتڑے ہو گئے، سمجھ میں نہ آیا، کوئی پاگل ہے، یا پہنچا ہوا فقیر۔ مگر آثار تو دیوانے پن کے ہی ہیں۔

خراث نے پھر بڑبڑانا شروع کیا۔ سنو یار، کہتا ہے خاکسار، ہم سو رہیں تم جاگو، پھر ہم اٹھ بیٹھیں، تم سو رہو، سفر دور کا ہے، سوتے سوتے راہ کاٹیں، سفر کا اندھا کنواں انھیں اینٹوں سے پائیں۔

یہ کہہ کر خراث نے ایک کھونچے والے کو بلایا اور پوچھا، کھیاں کتنے سیر؟ برنی کا کیا بھاؤ؟ لڈو پیسے کے کسے؟ بولو جھٹ پٹ نہیں ہم جاتے ہیں۔ کھونچے والے نے سمجھا کوئی دیوانہ ہے۔ بولا پیسے بھی ہیں یا بھاؤ ہی سے پیٹ بھرو گے؟

خراث: پیسے نہیں ہیں تو کیا مفت مانگتے ہیں؟ تول دے سیر بھر مٹھائی۔

مٹھائی لے کر آزاد کو ضد کر کے کھلائی، ٹھنڈا پانی پلویا اور بولے۔ شام ہوئی اب سو رہو ہم اسباب تاکتے ہیں۔ میاں آزاد ایک درخت کے نیچے لیٹے، خراث نے ایسی میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ انھیں اس پر یقین آ گیا۔ دن بھر کے تھکے تھے ہی، لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ سوئے تو گھوڑے سچ کر، سر پیر کی خبر نہیں، گویا مردوں سے شرط لگائی ہے۔ وہ ایک کائیاں، دنیا بھر کا نیاریا، ان کو غافل پایا تو گھڑی، سونے کی چین، چاندی کی مٹھ والی گھڑی، چاندی کا گھوری دان لے کر چلتا ہوا۔ آدھ گھنٹے میں آزاد کی نیند کھلی تو دیکھا کہ خراث غائب ہے، گھڑی اور چین، ڈبا اور چھڑی بھی غائب۔ چلانے لگے، لوٹ لیا، ظالم نے لوٹ لیا۔ جھانسا دے گیا! ایسا جکنا کبھی نہ کھایا تھا۔ دوڑ کر تھانے میں اطلاع کی۔ مگر خراث کہاں وہ تو یہاں سے دس کوس پر

تھا۔ بھارے رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ چوراہے پر ایک جوان کو مٹکی گھوڑے پر سوار آتے دیکھا۔ گھوڑا ایسا سر پیٹ جا رہا تھا کہ ہوا اس کی گردن تک کو نہ پہنچتی تھی۔ اندھیرا ہو ہی گیا تھا ایک کونے میں دبک رہے کہ ایسا نہ ہو کہیں چھپٹ میں آجائیں۔ اتنے میں سوار ان کے سر پر آکھڑا ہوا۔ جھٹ گھوڑے کی باگ روکی اور ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنے لگا۔ یہ پکڑائے ماجرا کیا ہے؟ یہ تو بے طرح گھور رہا ہے، کہیں ہنر تو نہ دے گا۔

جوان : کیوں حضرت، آپ کسی کو پہچانتے بھی ہیں؟ خدا کی شان، آپ اور ہم کو بھول جائیں۔

آزاد : میاں تم کو دھوکا ہوا ہوگا، میں نے تو کبھی تمہاری صورت بھی نہیں دیکھی۔

جوان : لیکن میں نے تو آپ کی صورت دیکھی ہے، اور آپ کو پہچانتا ہوں۔ کیا اتنی جلدی بھول گئے؟ یہ کہہ کر وہ جوان گھوڑے سے اتر پڑا اور آزاد سے چٹ گیا۔

آزاد : آپ کو بچ بچ دھوکا ہوا۔

جوان : بھئی، بڑے بھلکھو ہوا یاد کرو، کالج میں ہم تم دونوں ایک ہی درجے میں پڑھتے تھے۔ وہ کشی پر ہوا کھانے جانا اور دریا کے مڑے اڑانا۔ وہ مداری خونچے والا، وہ اقلیدس کے وقت اڑ بھاگنا، سب بھول گئے؟ اب میاں آزاد کو یاد آئی۔ دوست کے گلے سے لپٹ گئے اور مارے خوشی کے رو دیے۔

جوان : تمہیں یاد ہوگا جب میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے کو تھا۔ تو میرے پاس فیس کا بھی ٹھکانا نہ تھا۔ روپیے کی تلاش میں ادھر ادھر بھرتا تھا کہ راہ میں اسپتال کے پاس تالاب پر تم سے ملاقات ہوئی اور تم نے میرے حال پر رحم کر کے مجھے روپیے دیے۔ تمہاری مدد سے میں نے بی۔ اے۔ تک پڑھا۔ لیکن اس وقت تم بڑے اداس نظر آتے ہو، اس کا کیا سبب ہے؟

آزاد : یار، کچھ نہ پوچھو، ایک خراث کے چکے میں آگیا۔ یہیں گھاس پر لیٹ رہا، اور وہ میری گھڑی چین وغیرہ لے کر چلتا ہوا۔

جوان : بھئی واہ! اتنے گھاگھ بنتے ہو، اور ایک خراث کے بھرے میں آگئے! آپ کے بٹن تک اتار لے گیا اور آپ کو خبر نہیں! لے اب کان پکڑیے کہ اب پھر کسی مسافر کی دوستی کا اعتبار نہ کریں گے۔ منجائی تو آپ کھا ہی چکے ہیں، چلیے کہیں بیٹھ کر بستی گانا سنیں۔

ایک دن آزادشہر کی سیر کرتے ہوئے کتب خانے میں جا پہنچے۔ دیکھا ایک مولوی صاحب کھٹیا پر اکڑوں بیٹھے ہوئے لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں۔ آپ کی رنگی ہوئی داڑھی پیٹ پر لہرا رہی ہے۔ گول گول آنکھیں، کھوپڑی گھٹی گھٹائی، اس پر چوگوشیا نوپلی جبی جمائی۔ ہاتھ میں تسبیح لیے کھٹکنا رہے ہیں۔ لونڈے ارد گرد غل بچا رہے ہیں۔ ہو حق پچی ہوئی ہے، گویا کوئی منڈی لگی ہوئی ہے۔ تہذیب کوسوں دور، ادب کافور، مگر مولوی صاحب سے اس طرح سے ڈرتے ہیں جیسے چوہا بلی سے، یا ایتھنی ناؤ سے۔ ذرا چتون تیکھی ہوئی اور کھلبلی مچ گئی۔ سب کتابیں کھولے جھوم جھوم کر مولوی صاحب کو پھسلا رہے ہیں۔ ایک شعر جو رننا شروع کیا تو بلا کی طرح اس کو چٹ گئے۔ مطلب تو یہ کہ مولوی صاحب منہ کا کھٹنا اور زبان کا بلنا اور ان کا جھومنا دیکھیں، کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، اس سے مطلب نہیں۔ مولوی صاحب بھی واجبی ہی واجبی پڑھے لکھے تھے، کچھ شدید جانتے تھے۔ پڑھانے کے فن سے کورے۔ ایک شاعر سے چلم بھردائی، دوسرے سے حقہ تازہ کرایا، دم جھانے میں کام لیا، حقہ گزرایا اور دھواں اڑایا۔ شامت یہ تھی کہ آپ افیم کے بھی عادی تھے۔ چینی کی پیالی آئی، افیم گھولی اور اڑائی۔ ایک مہاجن کے لڑکے نے برنی منگوائی آپ نے خوب ڈٹ کر چکھی، تو پینک نے آدبوچا۔ اوتکھے، حقہ ٹیڑھا ہو گیا، گردن اب زمین پر آئی، اور اب زمین پر آئی۔ حقہ گرا اور چکناچور ہو گیا۔ دو ایک لڑکوں کی کتابوں پر چنگاریاں گریں اب پینک سے چونکے تو ایسے جھلائے کہ کسی لڑکے کے چپٹ لگائی کسی کی کھوپڑی پر دھپ جمائی، ایک کے کان گرمائے۔ پینک میں آکر خود تو حقہ گرایا اور شاگردوں کو بے تصور پیننا شروع کیا۔ خیر اتنے میں ایک لڑکا کتاب لے کر پڑھنے آیا۔ اس نے پڑھا:

دل کشود کشادم چو نامہ ات گوئی

کلید باب گلستان دل کسائی بود

(جب میں نے تیرا خط کھولا، تو میرا دل کھل گیا، گویا وہ خط خوشی کے باغ کے

دروازے کی کئی تھی)

اب مولوی صاحب کا ترجمہ سنئے:

ترجمہ: دل تیرا کھلا، کھولا میں نے جو خط تیرا، کہے تو کنجی دروازے باغ دل کھولنے کی تھی۔

ماشاء اللہ، کیا ترجمہ تھا! نہ مولوی صاحب نے خود سمجھا نہ لڑکے نے۔ اور دل لگی سننے کہ مولوی صاحب بھی شاگرد کے ساتھ پڑھتے جاتے ہیں اور دونوں ملتے جاتے ہیں۔ جب یہ پڑھ چکے تو دوسرے صاحب کتاب بغل میں دبائے آ بیٹھے۔

مولوی صاحب: ارے گاودی، نئی کتاب شروع کی، اور چراغی ندارد، ہلکا نہ، چمپر پر! جا دوڑ کر دو آنے گھر سے لے آ۔

لڑکا: مولوی صاحب کل لیتا آؤں گا۔ آپ تو مجھے ہی پرٹوک دیتے ہیں۔ آپ کو اپنی مٹائی ہی سے مطلب ہے کہ مفت کے جھگڑے سے؟

مولوی: یہ جھانے کسی اور کو دینا۔ اچھا اپنے باپ کی قسم کھا کہ کل ضرور لاؤں گا۔

لڑکا: مولوی صاحب کے بڑے سر کی قسم، چڑھتے چاند تک ضرور لاؤں گا۔

اس پر سب لڑکے ہنس پڑے کہ کتنا ڈھیٹ لڑکا ہے! قسم بھی کھائی تو مولوی صاحب کے سر کی اور سر بھی چھوٹا نہیں بڑا۔

مولوی: چپ گدھے، میرا سر کیا کدو ہے؟ اچھا پڑھ۔

لڑکا تو اوٹ پٹانگ پڑھنے لگا مگر مولوی صاحب چوں بھی نہیں کرتے۔ انھیں مٹائی کی فکر سوار ہے۔ سوچ رہے ہیں جو کل دو آنے نہ لایا تو خوب کوزے پھنکاروں گا، تمہ تک تو باقی رکھوں گا نہیں۔

دس پانچ لڑکے ایک دوسرے کو گدگدا رہے ہیں اور مولوی صاحب کو دکھانے کے لیے زور زور سے چلا کر کوئی شعر پڑھ رہے ہیں۔

آزاد کو کتب کی یہ حالت اور لونڈوں کی یہ چل پڑیں دیکھ سن کر ایسا غصہ آیا کہ اگر پاتے تو مولوی صاحب کو کچا ہی کھا جاتے۔ دل میں سوچے یہ کتب خانہ ہے یا پاگل خانہ؟ جدھر دیکھیے غل غباڑا، ڈھول ڈھپا ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بھری برسات میں میڈک گاؤں گاؤں یا پچھلے پہر کبوتے کاؤں کاؤں کر رہے ہیں۔ گھر پر آتے ہی کتبوں کی حالت پر یہ کیفیت لکھ ڈالی۔

۱۔ نور کے تڑکے جھٹ پٹے تک لڑکوں کو کتب خانے میں قید رکھنا بیہودگی ہے۔ لڑکے

دس بجے آئیں، چار بجے چھٹی پائیں، یہ نہیں کہ دن بھر دانٹا رگل رگل پڑھنا بھی اجیرن ہو جائے اور یہی جی چاہے کہ پڑھنے لکھنے کی دم میں مونا سا رسا بانڈھیں، مولوی صاحب کو ہوا بتائیں اور دل کھول کر گل چھرے اڑائیں۔

2- یہ کیا حماقت ہے کہ جتنے لڑکے ہیں سب کا سبق الگ۔ دو دو چار چار دس دس کا ایک درجہ بنا لیجیے، محنت کی محنت سچے گی اور کام زیادہ ہوگا۔

3- ہمدرد دیکھتا ہوں، ادب (ساتھیہ) کی تعلیم ہو رہی ہے۔ تعلیم میں صرف ادب ہی شامل نہیں، حساب ہے، تواریخ ہے، جغرافیہ ہے، اقلیدس ہے، مگر پڑھائے کون؟ مولوی صاحب کو تو سوئیک گنتی نہیں آتی۔

4- سب لڑکوں کا گل چا چاکر آواز لگانا محض فضول ہے۔ کوئی کھونچے والے، گنڈیری والا، پنے پرل والا، اس طرح چلائے تو مضائقہ نہیں، منسٹر، گول چتے، مسالے دار بیکن، مولی، ترٹی، لو ترکاری، یہ تو پھیری دینے والوں کی صدا ہے، کتب کو منڈی بنانا حماقت ہے۔

5- ترجمے پر خدا کی مار اور شیطان کی پونکار۔ 'جاتا ہوں بیچ ایک باغ کے، واسطے لانے اچھی چیزوں کے، میں نے دیکھا میں نے، تو جاتا ہے تو'۔ واہ کیا تو تو میں میں ہے! ترجمہ صحیح ہونا چاہیے، یہ تو نہ کوئی آواز کسے کہ لڑکے بنگلہ بول رہے ہیں۔

6- پڑھتے وقت لڑکوں کا ہلنا عیب ہے۔ مگر کہیں کس سے؟ مولوی صاحب تو خود جھومتے ہیں۔

7- مطلب ضرور سمجھانا چاہیے۔ لڑکا مطلب ہی نہ سمجھے گا تو اس کو فائدہ کیا خاک ہوگا؟

8- سبق کو بر زبان رشنا بری بات ہے۔ کتاب بند کی اور فر فر دس صفحے سنا دیے۔ حافظہ کچھ مضبوط ہوا صحیح مگر ستم یہ ہے کہ پھر طوطے کی طرح بات کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔

9- چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو بڑی بڑی کتابیں پڑھانا ان کی زندگی خراب کرتا ہے۔ ذرا سے ٹٹو پر جب دو ہاتھیوں کا بوجھ لادو گے تو ٹٹو بچارا آنکھیں ماتکتے لگے گا یا نہیں؟ ذرا سا بچہ اور پڑھے 'مینا بازار'

10- لڑکے کو شروع ہی سے فارسی پڑھانا اس کا گھٹا گھونٹنا ہے۔ پہلے اردو پڑھائیے، اس کے بعد فارسی، شروع ہی سے کریرہ مقیمہ پڑھانا اس کی منی خراب کرتا ہے۔

11- مولوی صاحب لڑکوں سے چلم بھردانا، حقہ تازہ کردانا چھوڑ دیں۔ اس کی جگہ ان کو

بات چیت کرنے اور ملنے جلنے کا آداب سکھائیں۔

12۔ اچھی مولوی بچہ پر رکھے جائیں۔ مولوی نے اہم کھائی اور لڑکوں کی شامت آئی۔

وہ پینک میں جموا کریں گے۔

یہ اشتہار موئے قلم سے لکھ کر میاں آزاد راتوں رات کتب کے دوازے پر چپکا آئے۔

جھٹ سے نکل کر کے شہر میں بھی دو چار جگہ چپکا دیا۔ دوسرے دن اشتہار کے پاس لوگ

ٹھاٹ کے ٹھاٹ جمع ہوئے۔ کسی نے کہا، سمن چپکایا گیا ہے، کوئی بولا، ٹھنڈا کا اشتہار ہے۔

بارے ایک پڑھے لکھے صاحب نے کہا۔ یہ کچھ نہیں ہے، مولوی صاحب کے کسی دشمن کا کام

ہے۔ اب جسے دیکھتے تھپتھپا اڑاتا ہے، بھائی واللہ، کسی بڑے ہی فقرے باز کا کام ہے۔ مولوی

بچارے کو لے ہی ڈالا، ہڑا کر دیا۔ کتب خانے میں لڑکوں کے چہرے گھبرا ہو گئے۔ دھت

تیرے کی! بچا روز فحشیاں جھمکتے تھے، چہتیں لگاتے تھے، اہم گھولی اور سر پر شیخ سد سوار۔

اب آنے وال کا بھاد معلوم ہوگا۔ مولوی صاحب تشریف کا کچھا لائے تو لڑکے ان کا کہنا ہی

نہیں مانتے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کتاب کھولو، شاگرد جواب دیتے ہیں بس منہ بند کرو۔

فرمایا کہ اب بولا تو ہم بگڑ جائیں گے۔ شاگردوں نے کہا، ہم خوب بتائیں گے۔ تب تو

ٹھٹھائے اور ڈپٹ کر کہا میں بڑا گرم مزاج ہوں۔ ایک گستاخ نے مسکرا کر کہا، پھر ہم ٹھنڈا

بتائیں گے۔ دوسرا بولا، کسی ٹھنڈے ملک میں جانیے۔ تیسرا بولا داغ میں گرمی چڑھ گئی ہے۔

مولوی صاحب گھبرائے کہ ماجرا کیا ہے۔ باہر کی طرف نظر ڈالی تو دیکھا غول کے غول تماشائی

کھڑے تھپتھپے لگا رہے ہیں۔ باہر گئے تو اشتہار نظر آیا۔ پڑھا تو کٹ گئے۔ دل ہی دل سے

لکھنے والے کو گالیاں دینے لگے۔ پاؤں تو کچھا ہی کھا جاؤں۔ اتنے ڈنڈے لگاؤں کہ چھٹی کا

دودھ یاد آجائے۔ بد معاش نے کیسا خاکہ اڑایا ہے۔ جیسی تو لڑکے اتنے ڈھٹ ہو گئے ہیں۔

میں کہتا ہوں آم وہ کہتے ہیں املی۔ اب عزت ڈوبی، کتب خانے میں جاتا ہوں تو خوف ہے

کہیں لوٹنے روز کی کسر نہ نکالیں اور انجر پنجر ڈھیلے کر دیں۔ بھاگ جاؤں تو روٹیوں کے

لالے پڑیں۔ کھاؤں کیا انکارے؟ آخر ٹھان لی کہ بوریا بندھنا چھوڑ ملا گیری سے منہ موڑو،

بھاگے تو گھر پر دم لیا۔ لڑکوں نے جو دیکھا کہ مولوی صاحب پتا توڑ بھاگے جاتے ہیں تو

جوتیاں بغل میں دبا، تھتھیاں اور بے سنبال دم کے پیچھے چلے۔ تماشائیوں میں باتیں ہونے

لگیں۔

ایک: ارے میاں یہ بھاگا کون جاتا ہے بگ ٹٹ؟
 دو: شیطان ہے، شیطان، آج لڑکوں کے داؤں پر چڑھ گیا ہے، کیسا دم دبائے بھاگا جاتا ہے۔

اب سنے کہ محلے بھر میں کھلیٹی مچ گئی۔ اجی ایسے کتب کی ایسی تھیں۔ برسوں سے لوٹے پڑتے ہیں ایک حرف نہ آیا۔ لڑکوں کی منی پلید کی۔ پڑھانا لکھانا خیر صلی اللہ، چلیں بھروایا کیے۔ سب نے مل کر کیشی کی، کہ مولوی صاحب کا عام جلسے میں امتحان لیا جائے اور منادی ہو کہ جن صاحب نے یہ اشتہار لکھا ہے وہ ضرور آئیں۔ ڈھنڈھو ریا محلے بھر میں کہتا پھرا کہ خلق خدا کا، ملک سرکار کا، حکم کیشی کا کہ آج ایک جلسہ ہوگا اور مولوی صاحب کا امتحان لیا جائے گا۔ جس نے اشتہار لکھا ہے وہ بھی حاضر ہو۔

میاں آزاد بہت خوش ہوئے، شام کو جلسے میں جا پہنچے۔ جب دو تین سو آدمی، اہالی مولوی، ڈوم ڈفالی، ایرے غیرے تھو خیرے سب جمع ہوئے تو ایک ممبر نے کہا حضرت یہ تو سب کچھ ہے، مگر مولوی صاحب اس وقت ندارد ہیں۔ ایک طرفہ ڈگری نہ دیجیے۔ انھیں بلوایئے تب امتحان لیجیے۔ یوں تو وہ آئیں گے نہیں ہم ایک تدبیر بتائیں جو دوڑے نہ آئیں تو مونچھ مڈا ڈالیں، ہاتھ قلم کرا ڈالیں۔ کہلا بھیجئے کہ کسی کے یہاں شادی ہے، نکاح پڑھنے کے لیے ابھی بلا تے ہیں، لوگوں نے کہا خوب سوچھی، دور کی سوچھی۔ آدمی مولوی صاحب کے دروازے پر گیا اور آواز دی، مولوی صاحب اجی مولوی صاحب، کیا مر گئے؟ اس گھر میں کوئی ہے، یا سب کو سانپ سوگھ گیا؟ دروازہ دھم دھمایا، کنڈی کھٹکھٹائی، مگر جواب ندارد۔ تب تو آدمی نے تھلا کر پتھر پھینکنے شروع کیے۔ دو ایک مولوی صاحب کے گھٹے ہوئے سر پر بھی پڑے۔ مولوی صاحب بولے کون ہے؟ آدمی نے کہا بارے آپ زندہ تو ہوئے۔ میں نے تو سمجھا تھا کفن کی ضرورت پڑی۔ چلیے عیدو خاں کے یہاں شادی ہے نکاح پڑھا دیجیے۔ نکاح کا نام سنتے ہی مولانا خیریری روٹی کی طرح پھول گئے، انگر کھے کا بند تر سے ٹوٹ گیا۔ کفن پھاڑ کر چلا اٹھے، آیا آیا، ٹھہرے رہو، ابھی آیا۔ شملہ کھوپڑی پر جما، عقیق کا کنٹھا ہاتھ میں لے، سرمہ لگا گھر سے چلے۔ آدمی ساتھ ہے دل میں کہتے جاتے ہیں آج پو بارہ ہیں بڑھ کر ہاتھ مارا ہے، چھن کر روڑ کی تہائی، ہاتھی کے ہودے میں گھٹے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے آدمی سے پوچھتے جاتے ہیں کیوں میاں اب کتنی دور مکان ہے؟ پاس ہی ہے نہ، دیکھیں نکاح پڑھائی کیا ملتی ہے؟ سوا

روپے تو معمولی ہے مگر خدا نے چاہا تو بہت کچھ لے مردوں گا۔ آدمی پیچھے پیچھے ہنستا جاتا ہے کہ میاں ہیں کس خیال میں۔ ہارے خدا خدا کر کے وہ منزل طے ہوئی، مکان میں آئے تو ہوش اڑ گئے۔ یہ کیسا بیاہ ہے بھائی، نہ دھول، نہ شہنائی، ہماری شامت آئی۔ نکلیوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں، محل دنگ ہے کہ یہ سب کے سب ہمیں کو کیوں گھور رہے ہیں۔ اتنے میں میر مجلس نے کہا جن صاحب نے اشتہار لکھا تھا وہ اگر آئے ہوں تو کچھ فرمائیں۔

آزاد نے کھڑے ہو کر کہا: یہ جو مولوی صاحب آپ لوگوں کے سامنے کھڑے ہیں، ان سے پوچھیے کہ کتب خانے میں الیم کیوں پیتے ہیں؟ جب دیکھیے پینک میں اوگھ رہے ہیں، یا مضائقہ ٹونگ رہے ہیں۔ لڑکوں کا پڑھانا خالہ جی کا گھر نہیں بلکہ سرگھٹیا اور ملا بن گئے، چوڑی نگلی اور جیری بن گئے۔

مولوی صاحب تازہ گئے کہ یہاں میری درگتی ہونے والی ہے۔ بھانجے ہی کو تھے کہ ایک آدمی نے ٹانگ پکڑ کر آئی بتائی، تو پھٹ سے زمین پر آ رہے۔ اچھے پھنسنے خوب نکاح پڑھایا۔ مفت میں آو بنے، خیر میاں آزاد نے بھر کہا۔

مولوی صاحب کو کسی مزار کا مجاور یا کہیں کا نکلیے دار بنادیتے، تو خوب بیٹھے کھڑے اڑائیں اور ڈنڈ پھلیں۔ یہ کتب خانے میں لٹو کا دسمہ ان کو کیوں بنا دیا؟ لڑکوں کی کیفیت سنئے کہ دن بھر گلی ڈنڈا کھیلا کرتے ہیں، چیختے ہیں چلاتے ہیں اور دن بھر میں اٹھارہ مرتبہ پیشاب کرنے اور پانی پینے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے مولوی صاحب دیکھیے، یہ ہماری ناک پکڑتا ہے کوئی کہتا ہے یہ ہم سے لڑتا ہے، مولوی صاحب کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ لڑکے پڑھتے ہیں یا نہیں، وہاں تو بھٹے جاؤ اور ایسا گل مچاؤ کہ کان پڑے آواز نہ سنائی دے، اس میں چاہے جو کچھ اول جلول بکو۔

مولوی صاحب پھر رتی تڑا کر بھاگنے لگے۔ لوگ لینا لینا کر کے دوڑے۔ گئے تھے روزے بخشوانے نماز گلے پڑی۔ چلا کر بولے، تم کون ہوتے ہو جی ہمارا عیب نکالنے والے، ہم پڑھائیں یا نہ پڑھائیں، تم سے مطلب؟

آزاد: حضرت آج ہی تو چنچے میں پھنسنے ہو روز تو ند نکالے بیٹھے رہا کرتے تھے، یہ تو ند ہے یا بے ایمانی کی قبر؟ یا ہوا کا کلیہ؟ اب پچک جائے، تو سکی۔ خدا جانے کہاں کا گنوار بننا دیا ہے۔ کل صبح کو ان کا امتحان لیا جائے۔

مولوی صاحب : آپ بڑے شیطان ہیں۔

آزاد : آپ نگور ہیں، مگر حیرت ہے کہ یہ غنڈی سے ذم کی کونٹل کیوں کر پھوٹی۔

اس طرح جلسہ ختم ہوا۔ لوگوں نے دل میں غمان لی کہ کل چاہے اولے پڑیں چاہے کڑکڑاتی دھوپ ہو، چاہے بھونچال آئے، مگر ہم آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ مولوی صاحب سے تاکید کی گئی کہ حضرت کل نہ آئیے گا تو یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ مولوی صاحب کا چہرہ اتر گیا تھا، مگر کڑک کر بولے، ہم اور نہ آئیں، آئیں اور سچ کھیت آئیں۔ ہم کیا کوئی چور ہیں، یا کسی کا مال مارا ہے؟

مولوی صاحب گھر پہنچے تو آزاد کو گلے پانی پی پی کر کوسنے۔ اس کی زبان سڑے، منہ پھول جائے، ساری چوڑی بھول جائے، آسمان سے انکارے برسیں، ایسی جگہ مرے، جہاں پانی نہ ملے، ڈنگو فیور چٹ کرے، انجن کے نیچے دب کر مرے۔ مگر ان گالیوں سے کیا ہوتا تھا، رات کسی طرح کٹی، دوسرے روز نور کے تڑکے لوگ پھر جلسے میں آ پہنچے۔ مگر مولانا ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینک، بارے یاروں نے تو تھنھو کر کے سر سہلائے، ہبز باغ دکھلاتے تھمٹ ہی لیا۔ میاں آزاد نے پوچھا۔ کیوں مولوی صاحب کس منصوبے میں ہو؟

مولوی صاحب : سوچتا ہوں کہ اب کون چال چلوں؟ سوچ لیا ہے کہ اب ملا گیری جھوڑ پیادوں میں نوکری کریں گے۔ بس وطن سے جائیں گے تو پھر لوٹ کر گھر نہ آئیں گے۔ امیر غریب سب پر مصیبت پڑتی ہے۔ پھر ہماری بساط کیا؟ چار خانے کا انگرکھا نہ سہی گاڑھے کی بر زئی سہی۔ مگر آپ ایک غریب کے پیچھے ناحق کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کہاں راج بھوج کہاں گنگو اتلی؟

آزاد : یہ جھانے رہنے دیجیے، یہ چکے کسی اور کو دیجیے۔

مولوی صاحب : خدا کی پناہ، میں آپ کا غلام اور آپ کو چکے دوں گا؟ آپ سے کیا عرض کروں کہ کتنا جی توڑ کر لڑکوں کو پڑھاتا ہوں، ادھر سورج نکلا اور میں نے کتب کا راستہ لیا۔ دن بھر لڑکوں کو پڑھایا، کیا مجال کہ کوئی لڑکا گردن تک اٹھا لے۔ کوئی بولا، اور میں نے ٹیپ جمائی، کھلیا، اور شامت آئی۔ سمجھ بوجھ کر چلتا تھا، اگر کوئی لڑکا کتب میں کھلونا لاتا تو اسے تر ت اگیٹھی میں ڈلوا دیتا۔ مگر آپ نے ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ آپ کے سامنے میری کون سنتا ہے۔

نیر مجلس نے کہا: میاں آزاد، انہیں کہئے دیجئے، آپ ان کا امتحان لیجئے۔
 میاں آزاد تو سوال پوچھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور مولوی صاحب کا برا حال ہوا۔
 رنگ فق، کلیجہ شق، آنکھوں میں آنسو، منہ پر ہوائیاں جھوٹ رہی ہیں، کلیجہ دھک دھک کرتا
 ہے، ہاتھ پاؤں کا پھنسنے لگے۔ کسی طرح کھڑے تو ہوئے مگر قدم نہ جما۔ پاؤں ڈنگائے اور
 لڑکھڑا کر گرے۔ لوگوں نے انہیں اٹھا کر پھر کھڑا کیا۔

آزاد: یہ شعر کس بحر میں ہے۔
 میں نے کہا جو اس سے ٹھکرا کے چل نہ ظالم
 حیرت میں آکے بولا کیا آپ جی رہے ہیں؟
 مولوی صاحب: بحر (دریا) میں آپ ہی غوطے لگائیے اور خدا کرے، ڈوب جائیے،
 جسے دیکھو ہمیں پر شیر ہے۔ نامستول اتنا نہیں سمجھتے کہ ہم مولوی آدی لوطے پڑھانا جانے یا
 شاعری کرنا۔ ہمیں شعر سے مطلب؟ آئے وہاں سے بحر پوچھئے۔

آزاد: بشنوا ز نے چوں شکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

اس شعر کا مطلب بتائیے!

مولوی صاحب: اس کا بتانا کیا مشکل ہے؟ نے کہتے ہیں چنڈو کی نے کو، بس اس
 زمانے میں لوگ چنڈو پیتے تھے اور شکایت کرتے تھے۔
 آزاد: بکری کی پچھلی ٹانگوں کو فارسی میں کیا کہتے ہیں؟
 مولوی صاحب: یہ کسی اپنے بھائی بند، بوچڑ قصاب سے پوچھیے، بندہ نہ سمجھڑے کھائے
 نہ جانے۔ واہ اچھا سوال ہے، اب ملاؤں کو بوچڑوں کی شاگردی بھی کرنی چاہیے۔

آزاد: ہندستان کے آخر میں کون ملک ہے؟

مولوی: خدا جانے، میں کیا دیکھنے گیا تھا کہ آپ کی طرح میں بھی سیلانی ہوں؟

آزاد: سب سے بڑا دریا ہندستان میں کون ہے؟

مولوی: فرات، نہیں وہ دیکھیے بھولا جاتا ہوں اچی وہی دجلہ، دجلہ، خوب یاد آیا۔

حاضرین: واہ رے گاودی، اچھی الٹی گنگا بہائی، فرات اور دجلہ ہند میں ہیں؟ اتنا بھی

نہیں جانتا۔

آزاد: چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب بتاؤ۔

مولوی: واہ کیا خوب خدائی کارخانوں میں دخل دوں؟ اتنا تو کسی کی سمجھ میں آتا نہیں کہ فری مشن کیا ہے، پھر بھلا یہ کون جانے کہ چاند کیسے گھٹتا بڑھتا ہے، خدا کا حکم ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

آزاد: پانی کیوں کر برستا ہے؟

مولوی: یہ تو دادی جان تک کو معلوم تھا۔ بادل تالاہوں، ندیوں، کنوؤں، گڈھوں، حوضوں سے گھس پیٹھ کر دو تین روز خوب پانی پیتا ہے، جب پی چکا تب آسمان پر اڑ گیا، منہ کھولا تو پانی دم جھم برسنے لگا۔ سیدھی سی تو بات ہے۔

حاضرین: واللہ، کیا بے پر کی اڑائی ہے! آدی ہو یا چونچ؟ کہنے لگے، بادل پانی پیتا

ہے۔

آزاد: گنتی آپ کو کہاں تک یاد ہے اور پہاڑے کہاں تک؟

مولوی: جوانی میں روپے کے کلے گن لیتا تھا، اب بھی آٹھ آٹھ آنے ایک دفعہ میں گن سکتا ہوں۔ مگر پہاڑے کسی طوائی کے لڑکے سے پوچھیے۔

آزاد: ایک آدی نے تین سو پچتر من غلہ خریدا، رات کو چوروں نے موقع تاک کر

ایک سو پچیس من اڑا لیا تو بتاؤ اس آدی کو کتنا گھانا ہوا؟

مولوی: یہ جھگڑا جون پور کے قاضی چکائیں گے۔ میں کسی کے پھنے میں پاؤں نہیں ڈالتا۔ مجھے کسی کے ٹوٹے گھائے سے مطلب؟ چوری چکاری کا حال تھانے داروں سے پوچھیے۔ بندہ مولوی ہے ملا کی دوز مسجد تک۔

آزاد: شاہ جہاں کے وقت میں ہندستان کی کیا حالت تھی اور اکبر کے وقت میں کیا؟

مولوی: اچی، آپ تو گڑے مردے اکھاڑتے ہیں، اکبر اور شاہ جہاں دلوں کی ہڈیاں

گل کر خاک ہو گئی ہوں گی اب اس بچوے سے مطلب؟

آزاد نے حاضرین سے کہا: آپ لوگوں نے مولوی صاحب کے جواب سن لیے، اب

چاہے جو فیصلہ کیجیے۔

حاضرین: فیصلہ بھی ہے کہ یہ اسی دم اپنا پوریا بستر سنبھالے۔ یہ چرکتا ہے۔ اسے بھی

نہیں معلوم کہ بحر کس چڑیا کا نام ہے، بادل کسے کہتے ہیں، دو تک کا پہاڑا نہیں یاد، گنتی جانتا

ہی نہیں، دجلہ اور فرات ہندستان میں تھاتا ہے۔ اور چلا ہے مولوی بنے۔ لڑکوں کی مفت میں مٹی خراب کرتا ہے۔

(12)

آزاد تو ادھر ساڈنی کو سرائے میں باندھے ہوئے حڑے سے سیر پائے کر رہے تھے، ادھر نواب صاحب کے یہاں روز ان کا انتظار رہتا تھا کہ آج آزاد آتے ہوں گے اور صف شکن کو اپنے ساتھ لاتے ہوں گے۔ روز قال دیکھی جاتی تھی، سگون پوچھے جاتے تھے۔ مصاحب لوگ نواب کو بھڑکاتے تھے کہ اب آزاد نہیں لونے کے، لیکن نواب صاحب کو ان کے لوٹنے کا پورا یقین تھا۔

ایک دن بیگم صاحبہ نے نواب صاحب سے کہا، کیوں جی تمہارا آزاد کس کھوہ میں دھنس گیا؟ دو مہینے سے تو کم نہ ہوئے ہوں گے۔

مہری: اے وہ چیپٹ ہوا، مواچور۔

بیگم: زبان سنجال، تیری انھیں باتوں پر تو میں حملہ اٹھتی ہوں۔ پھر کہتی ہے کہ چھوٹی بیگم مجھ سے جیکھی رہتی ہیں۔

نواب: ہاں، آزاد کا کچھ حال تو نہیں معلوم ہوا مگر آتا ہی ہوگا۔

بیگم: آچکا۔

نواب: چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میرا آزاد صف شکن کو لایا چھوڑے گا۔ دونوں میں علمی بحث ہو رہی ہوگی۔ پھر تم جانو، علم تو وہ سمندر ہے، جس کا اور نہ چھوڑ۔

بیگم: (تہقہہ لگا کر) علمی بحث ہو رہی ہوگی؟ کیوں صاحب، میاں صف شکن علم بھی جانتے ہیں؟ میں کہتی ہوں آخر اللہ نے تم کو کچھ بھلی تولد، ماشہ عقل بھی دی ہے؟ مواثیر، ذرا سی جانور، کالٹن کے تین دانوں میں پیٹ بھر جائے، اسے آپ عالم کہتے ہیں۔ میرے میکہ پڑوس میں ایک سڑھی سودائی دن رات داعی جاہی بکا کرتا ہے۔ اس کی اور تمہاری باتیں ایک سی ہیں۔

مہری: کیا کہتی ہو بی بی، اس سودائی غوڑے کو ان پر سے صدقے کر دوں۔

نواب: تم کبھی نہیں مہری، ابھی تو اللہ اپنے ہی کے نہ دن ہیں ان کے۔ خدا کی قسم،

مجھے ان کی بھی باتیں تو بھاتی ہیں۔ یہ کم سنی کا سبب ہے اور دو تین برس، مگر یہ شوخی اور چلبلا پن کہاں؟ یہ جب تھڑکی یا گھڑکی ہیں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔

مہری: ہاں، ہاں، جوانی تو پھر بادل ہوتی ہی ہے۔

یتیم: اچھا، مہری تجھے اپنے بڑھاپے کی قسم جو جھوٹ بولے، بھلا بیڑ بھی پڑے لکھے ہوا کرتے ہیں؟ منہ دیکھی نہ کہنا، اللہ لگتی کہنا۔

مہری: بڑھاپا، بڑھاپا کیسا؟ بی بی بس بھی باتیں تو اچھی نہیں لگتیں جب دیکھو تب آپ بوڑھی کہہ دیتی ہیں۔ میں بوڑھی کا ہے سے ہو گئی؟ برا نہ مانجیے تو کہوں آپ سے بھی ناٹھی ہوں۔

اتنے میں غفور خدمت گار نے پکارا: حضور، پیچوان بھرا رکھا ہے، وہاں بھیج دوں یا نیچے میں رکھ دوں؟

نواب: یہ چاندی والی چھوٹی گڑگری یتیم صاحبہ کے واسطے بھر لاؤ۔ کل بسواں تہا کو آیا ہے وہی بھرنا، اور پیچوان باہر لگا دو، ہم ابھی آئے۔

یہ کہہ کر نواب نے یتیم صاحبہ کے ہنسی ہنسی میں ایک چنگی لی اور باہر آئے۔ مصاحبوں نے کھڑے ہو ہو کر سلام کیے۔ آداب بجا لاتا ہوں حضور، تسلیمات عرض کرتا ہوں، خداوند، نواب صاحب جا کر مند پر بیٹھے۔

خوجی: اف، موت کا سامنا ہوا، ایسا دھکا لگا کہ کلیجہ بیٹھا جاتا ہے، ہت تیرے گیدی چور کی۔

نواب: کیوں، کیوں خیر تو ہے؟

خوجی: حضور، اس وقت بیڑ خانے کی آؤر گیا تھا۔

نواب: اف، بھی دل بے قرار ہے، خوجی میاں تم کو تو ہماری تسلی کرنی چاہیے تھی، نہ کہ اٹے خود ہی روتے ہو، جس میں ہمارے ہاتھ پاؤں اور پھول جائیں۔ اب صف شکن سے ہاتھ دھونا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ خدا کے یہاں پہنچ گئے۔

مصاحب: خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔

خوجی: (پیک سے چونک کر) اسی بات پر پھر کچھ مٹائی نہیں کھلاتے۔

نواب: کوئی ہے، اس مردک کی گردن تو ناپا۔ ہم تو اپنی قسمتوں کو رو رہے ہیں، یہ

مٹائی مانگتا ہے۔ بے ٹکا، نمک حرام۔

غومی: دیکھیے، دیکھیے، پھر میری گردن کند چھری سے رچی جاتی ہے۔ میں مٹائی کچھ کمانے کے واسطے تھوڑے ہی منگواتا ہوں۔ اس لیے منگواتا ہوں کہ صف شکن کا فاتحہ پڑھوں۔

نواب: شاباش، جی خوش ہو گیا۔ محاف کرنا، بے اختیار نمک حرام کا لفظ منہ سے نکل گیا، تم بڑے.....

مصاحب: تم بڑے حلال خور ہو۔

اس پر وہ قہقہہ پڑا کہ نواب صاحب بھی لوٹنے لگے، اور بیگم نے گھر سے لوٹری کو بھیجا کہ دیکھنا تو یہ کیا ہنسی ہو رہی ہے۔

نواب: بھئی، کیا آدمی ہو واللہ روتے کو ہنسانا اسی کا نام ہے۔ خوجی بھارے کو حلال خور بنا دیا۔

غومی: حضور، اب میں یہاں نہ رہوں گا۔ کیا بے وقت کی شہنائی سب کے سب بجانے لگے! افسوس، صف شکن کا کسی کو خیال تک نہیں۔

نواب صاحب مارے رنج کے منہ ڈھانک کر لیٹ رہے۔ مصاحبوں میں سے کوئی چنڈو خانے پہنچا، کوئی انیم کھولنے لگا۔

(13)

ادھر شوالے کا مہنتہ بجا لٹاٹھن، ادھر دو ناکوں سے صبح کی توپ دغی دنادن۔ میاں آزاد اپنے ایک دوست کے ساتھ سیر کرتے ہوئے بستی کے باہر جا پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں، ایک بتل پلوں سے سجا ہوا بنگلہ ہے۔ احاطہ صاف، کہیں گندگی کا نام نہیں۔ پھولوں پھولوں سے لدے ہوئے درخت کھڑے جمجم رہے ہیں۔ دروازوں پر چھتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ برآمدے میں ایک صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور ان کے قریب دوسری کرسی پر ان کی میم صاحبہ براجم رہی ہیں۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ کہیں شور، نہ کہیں غل، آزاد نے کہا: زندگی کا حرہ تو یہ لوگ اٹھاتے ہیں۔

دوست: پشک، دیکھ کر رشک آتا ہے۔

دونوں آدمی آگے بڑھے، کئی چھوٹے چھوٹے ٹن تیزی سے دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ ان پر خوبصورت کالٹیاں کسی ہوئی تھیں اور کئی لڑکے بیٹھے ہوئے ہنستے بولتے چلے جاتے تھے۔ کپڑے سفید، جیسے بگلے کے پر، چہرے سرخ جیسے گلاب کا پھول۔ میاں آزاد کئی منٹ تک ان انگریز لڑکوں کا اچھلنا کودنا دیکھتے رہے۔ پھر اپنے دوست سے بولے، دیکھا آپ نے اس طرح بچوں کی پرورش ہوتی ہے، کچھ اور آگے بڑھے تو سوداگروں کی بڑی بڑی کولٹیاں دکھائی دیں۔ اتنی اونچی گویا آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ دونوں آدمی اندر گئے، تو چیزوں کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ سبحان اللہ یہ کونسی ہے یا شیش محل، دنیا بھر کی چیزیں موجود۔ آزاد نے کہا: یہ تجارت کی برکت ہے۔ واہ ری تجارت! تیرے قدم دھو دھو کر پیچے۔ اتنے میں سامنے سے کئی گیمیاں آئیں۔ سب پر انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی ہندستانی کا کوسوں تک پتہ ہی نہیں۔ گویا ان کے لیے گھر سے نکلتا ہی منع ہے۔ اور آگے بڑھے تو ایک کتب خانہ نظر آیا۔ لاکھوں کتابیں چنی ہوئی، صاف ستھری سنہری جلدیں چڑھی ہوئیں۔ آدمی اگر سال بھر جم کر بیٹھے تو عالم ہو جائے۔ صبح سے آٹھ بجے تک لوگ آتے ہیں اخبار اور کتابیں پڑھتے ہیں اور دنیا کے حالات معلوم کرتے ہیں مگر ہندستانوں کو ان باتوں سے کیا سروکار؟

دس بجے کا وقت آگیا۔ اب گھر کی سوچھی، بستی میں داخل ہوئے۔ راہ میں ایک امیر آدمی کے مکان کے دروازے پر دو لڑکوں کو دیکھا۔ ٹکھ سکھ سے تو درست ہے، مگر کانوں میں بالے، ہمدے ہمدے کڑے پڑے ہیں، انگرکھا، میلا کھیلا، پاجامہ گندا، ہاتھوں پر گرد، منہ پر خاک، دروازے پر ننگے پاؤں کھڑے ہیں۔ مولوی صاحب ڈیوڑھی میں بیٹھے دو اور لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں۔ مگر ڈیوڑھی اور پاخانہ ملا ہوا ہے۔

میاں آزاد: کہیے جناب دے تھوؤں پر دوڑنے والے انگریزوں کے بچے بھی یاد ہیں؟ ان کو دیکھیے میلے گندے، دن بھر پاخانے کا پڑوس۔ بھلا یہ کیسے مضبوط اور تندرست ہو سکتے ہیں؟ ہاں، زیور سے البتہ لے ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چاہے لڑکا جتنے زیور پہنے ہو، اس کو وہ بچی خوشی نہیں حاصل ہو سکتی، جو ان پیارے بچوں کو ہوا کے جھونکوں اور ٹاپوں کی کھٹکھٹ سے ملتی تھی۔ لڑکا بڑکے مجرّم اٹھا، حمام میں گیا، صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ یہ اچھا، یا یہ اچھا کہ لکچے، پٹے اور بنٹ کے کپڑوں میں جکڑ دیا جائے، زیور سر سے پاؤں تک لا دیا جائے اور گڑھیا پر بٹھا دیا جائے کہ کوڑے کے ٹوکے گنا کرے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سات آٹھ جوان سامنے سے گزرے۔ ابھی انیس ہی برس کا سن ہے، مگر گالوں پر جھڑیاں کسی کی کمر جھکی ہوئی، کسی کا چہرہ زرد۔ سرخ اور سفید رنگ دھواں بن کر اڑ گیا۔ اور طرہ یہ کہ الف کے نام ب نہیں جانتے۔ ایک نمبر اول کے چند و باز ہیں، دوسرے بلا کے باتونی، وہ فرامیں بھریں کہ بھلا چنگا آدمی دھن چکر ہو جائے۔ ایک صاحب کالج میں تعلیم پاتے تھے، مگر پروفیسر سے ٹکرا ہو گئی، جھٹ مدرسہ چھوڑا۔ دوسرے صاحب اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے بائیں ہاتھ پر تال بجا رہے ہیں۔ دھن تا دھن تا۔ دو صاحب بہادر نامی شیر کے گھٹ جانے کا افسوس کر رہے ہیں۔ کسی کو ناز ہے کہ میں بانے کی کتکیا خوب لڑاتا ہوں، تھکل خوب بڑھاتا ہوں۔

میاں آزاد نے کہا: ان لوگوں کو دیکھیے، اپنی زندگی کسی طرح خراب کر رہے ہیں۔ شریفوں کے لڑکے ہیں مگر بری صحبت ہے۔ پڑھنا لکھنا چھوڑ بیٹھے۔ اب مڑگشتی سے کام ہے۔ کسی کو قلم پکڑنے کا شعور نہیں۔

اتنے میں دو صاحب اور ملے۔ توند نکالے ہوئے، موٹے تھل تھل۔ آزاد نے کہا ان دونوں کو پہچان رکھیے۔ ان عقل کے دشمنوں نے روپے کو دفن کر رکھا ہے۔ ایک کے پاس دو لاکھ سے زیادہ ہیں اور دوسرے کے پاس اس سے بھی زیادہ، مگر زمین کے نیچے۔ بیوی اور لڑکوں کو کچھ زیور تو بخود دیئے ہیں باقی اللہ اللہ خیر صلی اللہ۔ اگر تجارت کریں تو اپنا بھی فائدہ ہو اور دوسروں کا بھی۔ مگر یہ سیکھا ہی نہیں۔ بنگال بنک اور دہلی بنک تو پہلے بنا کرتے تھے یہ زمین کا بنک آج بنانا۔

دونوں آدمی گھر پہنچے۔ کھانا کھا کر لیٹے۔ شام کو پھر سیر کرنے کی سوچھی۔ ایک باغ میں جا پہنچے۔ کئی آدمی بیٹھے حد اڑاتے تھے اور کسی بات پر بحث کرتے تھے۔ بحث سے ٹکرا شروع ہوئی۔ مرزا سعید نے کہا۔ بھئی کل جگ ہے، کل جگ۔ اس میں جو نہ ہو وہ تھوڑا۔ اب پرانے رسوں کو لوگ دقیانوسی بتاتے ہیں، شادی بیاہ کے خرچ کو فضول کہتے ہیں۔ بچوں کو زیور پہنانا گالی ہے۔ اب کوئی ان لوگوں سے اتنا تو پوچھے کہ جو رسم باپ دادوں کے وقت سے چلی آتی ہے اس کو کوئی کیوں کر مٹائے؟

ایک ایک پورب کی طرف سے شور و گل کی آواز سنائی دی۔ کسی نے کہا چور آیا، لینا جانے نہ پائے۔ کوئی بولا سانپ ہے۔ کوئی بھیڑیا بھیڑیا چلا اٹھا۔ کسی کو شک ہوا کہ آگ لگی۔ سب

کے سب بھڑبھڑا کر کھڑے ہوئے۔ تو چور نہ چکار، بھیلڑیا نہ سیار۔ ایک مہاں صاحب لنگوٹ کے لٹھ ہاتھ میں لیے اکڑے کھڑے ہیں، اور ان سے دپ قدم کے قاصطے پر کوئی لالہ جی بانس کی کھپاچ لیے ڈٹے کھڑے ہیں۔ ارد گرد تماشاخیوں کی بھیل ہے۔ ادھر مہاں صاحب جینترے بدل رہے ہیں، ادھر لالہ اگلیاں مٹکا مٹکا کر ٹٹل چا رہے ہیں۔ مرزا سعید نے پوچھا مہاں صاحب، خیر تو ہے؟ مہاں کیا عرض کروں مرزا صاحب، آپ کو دل لگی سو جیتی ہے اور یہاں جان پر بن گئی ہے۔ یہ لالہ میرے پڑوسی ہیں۔ ان کا قاعدہ ہے کہ ٹھڑائی کر ہزاروں گالیاں مجھے دیا کرتے ہیں۔ آج کوٹھے پر چڑھ کر خدا کے واسطے لاکھوں باتیں سنائیں۔ اب فرمائیے آدی کہاں تک ضبط کرے؟ لاکھ سمجھایا کہ بھائی آدی سے اونٹ اور انسان سے بے دم کے گدھے بنہ بن جاؤ، مگر یہ بادشاہ کی نہیں سنتے، میں کس کشتی میں ہوں۔ تال ٹھوک کر لڑنے کو تیار ہو گئے۔ خدا نہ کرے کسی بھلے مانس کو ان پڑھ سے سابقہ پڑے۔

لالہ : اور سینے گا، ہم چار پانچ برس لکھنؤ میں رہے، ان پڑھ ہی رہے۔
 مہاں : بارہ برس دلی میں رہ کر تم نے کیا سیکھ لیا جو اب چار سال لکھنؤ میں رہنے سے فاضل ہو گئے۔

لالہ : یہ ساٹھ برس سے ہمارے پڑوسی ہیں، خوب جانتے ہیں کہ برس دن کا تہوار ہے، ہم شراب ضرور پیمیں گے، چسکی لگائیں گے، نشے میں گالیاں ضرور سنائیں گے۔ اب اگر کوئی کہے شراب کھیا چھوڑ دو، تو ہم اپنی پرانی رسم کو کیوں کر چھوڑیں؟

مرزا سعید : اچی لالہ صاحب، بہت بہکی بہکی باتیں نہ کیجیے، ہم نے مانا کہ پرانی رسم ہے، مگر ایسی رسم پر تین حرف! آپ دیکھیں تو کہ اس وقت آپ کی کیا حالت ہے۔ کچھڑ میں لپ پت، سر پیر کی خبر نہیں، بھلے مانسوں کو گالیاں دیتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ تو ہماری رسم ہے۔

آزاد : مرزا سعید، ذرا مجھ سے تو آنکھیں ملائیے۔ شرمائے تو نہ ہوں گے؟ ابھی تو آپ کہتے تھے کہ پرانی رسم کو کوئی کیوں کر مٹائے۔ یہ بھی تو لالہ جی کی پرانی رسم ہے، جس طرح ہوتی آئی ہے، اسی طرح اب بھی ہوگا۔ یہ دھوپ چھاؤں کی رنگت آپ نے کہاں پائی؟ گرگٹ کی طرح رنگ کیوں بدلنے لگے؟ جناب بری رسم کا ماننا حماقت کی نشانی ہے۔

مرزا سعید بظلمیں جھانکنے لگے۔ آزاد اور ان کے دوست اور آگے بڑھے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک گنوار عورت روتی چلی جاتی ہے، اور ایک مرد چپکے چپکے سمجھا رہا ہے۔ چپائی مار، چپائی

مار۔ میاں آزاد کبھی کوئی بد معاش ہے۔ لکارا، کون ہے بے تو، اس عورت کو کہاں بھگائے لیے جاتا ہے؟ اس گنوار نے کہا صاحب بھگائے نہیں لیے جاتے، یو ہماری مہریا آے، ہمرے ایہاں رسم ہے کہ جب مہریا میکہ سے سرار جات ہے تو دوئی تین کوس لوں روت ہے۔

سعید: واللہ، میں کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ خدا کی پناہ، رسم کی مٹی خراب کردی۔

آزاد: بجا ہے، ابھی آپ اس بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟ بات یہ ہے کہ پڑھے لکھے آدمیوں کو بری رسوں کا ماننا مناسب نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ عقل کی آنکھوں کو پاٹ میں بند کر کے پرانی رسوں کے ڈھڑے پر چلنا شروع کریں۔ اور اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ قدم پر منہ کے بل گریں۔ خدا نے عقل اس لیے نہیں دی کہ پرانی رسوں میں سدھار نہ کریں، بلکہ اس لیے کہ زمانے کے مطابق ادل بدل کرتے رہیں۔ اگر پرانی باتوں کی پوری پوری پیروی کی جاتی تو یہ جام دامنہ کے کرتے اور شربتی کے انگر کے نظر نہ آتے۔ لوگ ننگے پھرتے ہوتے۔ گلاب اور کباب کے بدلے ہم پاڑھے اور ہرن کا کچا گوشت کھاتے ہوتے۔ خدا نے آنکھیں دی ہیں، مگر افسوس کہ ہم نے بند کر لیں۔

مرزا سعید: تو آپ ناچ رنگ جلسوں کے بھی دشمن ہوں گے؟ آپ کہیں گے کہ یہ بھی

بری رسم ہے؟

آزاد: بے شک بری رسم ہے۔ میں اس کا دشمن تو نہیں ہوں، مگر خدا نے چاہا تو بہت جلد ہو جاؤں گا۔ یہ کتنی بے ہودہ بات ہے کہ ہم لوگ عورتوں کو روپے کا لالچ دے کر اس طرح ذلیل کرتے ہیں۔

مرزا سعید: تو یہ کہیے کہ آپ کورے ملا ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ ان حسینوں کا دم غنیمت ہے۔ دنیا کے چہل پہل ان کے دم سے، محفل کی رونق ان کے قدم سے۔ یہاں تو جب تک طبلے کی ٹمک نہ ہو، چاند سے کھڑے کی جھلک نہ ہو، کڑوں کی جھنکار نہ ہو، چھڑوں کی چھنکار نہ ہو، چھماچھم کی آواز نہ آئے کرہ نہ سج، تال نہ بجے، دھماچوکڑی نہ بچے، مہندی نہ رچے، رنگ رلیاں نہ منائیں، شادیانے نہ بجائیں، آوازیں نہ کریں، عطر میں نہ بیس، طعنے نہ سنیں، سر نہ دھیں، گلے بازی نہ ہو، آنکھوں میں لال ڈورے نہ ہوں، شراب کباب نہ ہوں، پریاں بلبل کی طرح چبکتی نہ ہوں، سیوتی کے پھول اور حتا کی ٹٹیاں مہکتی نہ ہوں، تھپتھپ نہ ہوں، چپچپ نہ ہوں تو کس گوکے کا دم بھر جینے کو جی چاہے؟ واللہ، محفل باولے سنے کی طرح کاٹ کھائے

محفل میں گدگداتی ہو، شوخی نگاہ کی
شیشوں سے آ رہی ہو صدا واہ واہ کی

ادھر جام ٹل (شراب) ہو، ادھر صراحی کی کل کل ہو، ادھر گل ہو، ادھر بلبل ہو، محفل کا
رنگ خوب جما ہو، سال بندھا ہو، پھر جو آپ کی گردن بھی نہ مل جائے، تو جھک کر سلام
کریں۔ اب غور فرمائیے کہ ایسے طائفے کو جو ڈیہا میں بند کر رکھتے قابل ہے، آپ ایک قلم منا
دینا چاہتے ہیں؟

آزاد: جناب آپ کو اپنی طوائفیں مبارک ہو۔ یہاں اس پھیر میں نہیں پڑتے، یہ باتیں
کرتے ہوئے لوگ اور آگے بڑھے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ مسرت ہاتھی پر ایک مہنت جی سوار
گھروئے کپڑے پہنے، بمبھوت رمائے، پاتھی مارے بڑے ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں۔ چیلے چا پڑ
ساتھ ہیں۔ کوئی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار، کوئی پیدل، کوئی پیچھے بیٹھا مرحل ہلاتا ہے، کوئی زرسنگھا
بجاتا ہے۔ آزاد بولے۔ کوئی ان مہنت جی سے پوچھے کہ آپ خدا کی عبادت کرتے ہیں، یا
دنیا کے مزے اڑاتے ہیں؟ آپ کو اس نیم نام سے کیا مطلب؟

مرزا سعید: کچھ باپ کی کمائی تو ہے نہیں، حقوق نے جاگیریں دے دیں، مہنت بتا
دیا۔ اب یہ موہیں کرتے ہیں۔

آزاد: جاگیر دینے والوں کو کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد مہنت لوگ یوں گلجھڑے
اڑائیں گے؟ یہ تو ہمارا کام ہے کہ ان مہنتوں کی گردن پکڑیں اور کہیں اتر ہاتھی سے، لے ہاتھ
میں کنڈل۔

یہ ایک کسی نے چھینک دیا۔ سعید بولے۔ ہت تیرے جھینکنے والے کی ناک کاٹوں۔ یار
ذرا ٹھہر جاؤ، جھینکنے چلنا بدگھوٹی ہے۔

آزاد: تو جناب، ہمارا اور آپ کا ساتھ ہو چکا۔ یہاں چھینک کی پروا نہیں کرتے۔ آپ
پر کوئی آفت آئے تو ہمارا ذمہ۔

ابھی دس قدم بھی نہ گئے تھے کہ نئی راستہ کاٹ گئی۔ سعید نے آزاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی
طرف کھینچ لیا۔ ابھی عجب بے نیلے آدمی ہو، ملی راہ کاٹ گئی اور تم سیدھے چلے جاتے ہو؟ ذرا
ٹھہرو، پہلے کوئی اور جائے تب ہم بھی چلیں۔

اب سنے کہ آدھ گھنٹے تک منہ کھولے کھڑے ہیں۔ یا خدا کوئی ادھر سے آئے۔ آزاد نے جھلا کر کہا: بھی ہم کو آپ کا ساتھ اجیرن ہو گیا۔ یہاں ان باتوں کے قائل نہیں۔ خیر وہاں خدا خدا کر کے چلے تو تھوڑی دیر کے بعد سعید نے پھر آزاد کو روکا۔ ہائیں ہائیں، خدا کے واسطے ادھر سے نہ جانا۔ میاں! اندھے ہو، دیکھتے نہیں، گدھے کھڑے ہیں۔ آزاد نے کہا۔ گدھے تو آپ خود ہیں۔ ڈنڈا اٹھایا تو دونوں گدھے بھاگے۔ پھر جو آگے بڑھے تو سعید کی ہائیں آنکھ پھڑکی۔ غضب ہی ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے، ساری چوڑی پھول گئے۔ بولے۔ یار کوئی تدبیر بتاؤ، ہائیں آنکھ بے طرح پھڑک رہی ہے۔ مرد کی ہائیں اور عورت کی وہی آنکھ کا پھڑکنا برا فتن ہے۔ آزاد کلک کلک کر ہنس پڑے کہ عجیب آدمی ہیں آپ! جھینک ہوئی اور حواس غائب، لمبی نے راستہ کاٹا اور ہوش پیٹنے لگے، گدھے دیکھے اور اوسان خطا، اور جو ہائیں آنکھ پھڑکی تو ستم ہی ہوا! میاں کہنا مانو ان خرافات باتوں میں نہ جاؤ۔ یہ وہم ہے، جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں، میرا اور آپ کا ساتھ ہو چکا۔ آپ اپنا راستہ لیجیے، بندہ رخصت ہوتا ہے۔

(14)

میاں آزاد ٹھوکریں کھاتے، ڈنڈا ہلاتے، مارنے مارنے پھرتے تھے کہ یکا یک سڑک پر ایک خوبصورت جوان سے ملاقات ہوئی۔ اس نے انھیں نظر بھر کر دیکھا پر یہ پہچان نہ سکے۔ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ جوان نے کہا:

ہم بھی تسلیم کی خوں ڈالیں گے

بے نیازی تیری عادت ہی سہی

آزاد نے پیچھے پھر کر دیکھا تو جوان نے پھر کہا:

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج

ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

کیسے جناب، پہچانا یا نہیں؟ یہ اڑن گھائیاں، گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ میاں آزاد چکرائے کہ یہ کون صاحب ہیں۔ بولے۔ حضرت میں بھی اس اٹھتی ہی جوانی میں آنکھیں کھو بیٹھا۔ واللہ، کس مردود نے آپ کو پہچانا ہو۔

جوان: ایں کمال کیا! واللہ اب تک نہ پہچانا! میاں ہم تمہارے لٹکویے یار ہیں انور۔
آزاد: اٹھا، انور! ارے یار تمہاری تو صورت ہی بدل گئی۔

یہ کہہ کر دونوں گلے ملے اور ایسے خوش ہوئے کہ دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ آزاد نے کہا: ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم تم دونوں ایک جگہ رہے، ساتھ ساتھ مزہشتی کی، کبھی باغ میں سیر کر رہے ہیں، کبھی چاندنی رات میں دھاگ اڑا رہے ہیں، کبھی جنگل میں شغل گا رہے ہیں، کبھی علمی بحث کر رہے ہیں، کبھی بانک کا شوق ہے، کبھی لکڑی کی دھن، وہ دن اب کہاں!

انور نے کہا: بھئی، چلو اب ساتھ ساتھ رہیں، جھیں یا مریں، مگر چار دن کی زندگی میں ساتھ نہ چھوڑیں۔ چلو ذرا بازار کی سیر کر آئیں۔ مجھے کچھ سودا لینا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں چوک چلے۔ پہلے بزازے میں دھننے۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں، آئیے، آئیے، اچی میاں صاحب، کیا خریداری منظور ہے؟ خاں صاحب، کپڑا خریدیے گا؟ آئیے وہ وہ کپڑے دکھاؤں کہ بازار بھر میں کسی کے پاس نہ نکلیں۔ دونوں ایک دکان میں جا کر بیٹھ گئے۔ دکان میں ٹاٹ بچھا ہے، اس پر سفید چاندی، اور لالہ نین سکھ یا ڈوریے کا انگرکھا ڈالے بڑی شان سے بیٹھے ہیں۔ توند وہ فرمائشی جیسے روپے کے دو والے تریوز، ایک طرف تن زیب، شربتی اڈھی کے تھانوں کی قطار ہے، دوسری طرف موی چینٹ اور فلائین کی بہار ہے۔ اگنی پر رومال قرینے سے لٹکے ہوئے، لالہ بھسوکا یا سفید جیسے بگے کے پر، یا ہرے ہرے دھانی، جیسے لہر، دروازہ لال رنگا ہوا، جتنی سے مزہا ہوا۔ دیوار پر سیکڑوں چڑیاں لٹکی ہوئیں۔
انور: بھئی، سیاہ مخمل دکھانا۔

بزاز: بدلو بدلو، ذری خاں صاحب کو کالی مخمل کا تھان دکھاؤ، بڑھیا۔
لالہ بدلو کئی تھان تر سے اٹھا لائے، سوتی، بوٹی دار، انور نے کئی تھان دیکھے اور جب دام پوچھے۔

لالہ: گزروں کے حساب سے بتاؤں یا تھان کے دام۔
انور: بھئی، گزروں کے حساب سے بتاؤ، مگر لالہ جھوٹ کم بولنا۔
لالہ نے قہقہہ اڑایا، حضور ہماری دکان میں ایک بات کے سوا دوسری نہیں کہتے۔ کون میل پسند ہے؟ انور نے ایک تھان پسند کیا اس کی قیمت پوچھی۔

لالہ : سنیے خداوند، جی چاہے لیجیے، جی چاہے نہ لیجیے، مول دس روپے گز سے کم نہ ہوگی۔

انور : ایں، دس روپے گز یار خدا سے تو ڈرو، اتنا جھوٹ۔

لالہ : اچھا، تو آپ بھی کچھ فرماؤ۔

انور : ہم چار روپے گز سے لگا زیادہ نہ دیں گے۔

آزاد نے انور سے کہا : چار روپے گز میں نہ دے گا۔

انور : آپ چیکے بیٹھے رہیں، آپ کو ان باتوں میں ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ؟

لالہ : چار روپے گز تو بازار بھر میں نہ ملے گی۔ اچھا آپ سات کے دام دے دیجیے۔

بولیے کتنی خریداری منظور ہے؟ دس گز اتاروں؟

انور : کیا خوب، دام چکائے ہی نہیں اور گزوں کی فکر پڑ گئی۔ واجبی متاؤ، واجبی، ہمیں

چکنا نہ دو، ہم ایک گھاگھ ہیں۔

لالہ : اچھا صاحب، پانچ روپے گز لیجیے گا؟ یا اب بھی چکمہ ہے؟

انور : اب بھی بھیگی ہے، تمہاری خاطر سے سوا چار سہی۔ بس پانچ گز اتار دو۔

لالہ نے ٹاک بھوں چڑھا کر پانچ گز تحمل اتار دی، اور کہا آپ بڑے کڑے خریدار

ہیں۔ ہمیں گھانا ہوا، ان داسوں شہر بھر میں نہ پائیے گا۔

آزاد : بھئی، قسم ہے خدا کی، میرا ایسا اتاری تو پھنس ہی جائے اور وہ نچا کھائے کہ عمر

بھر نہ بھولے۔

انور : جی ہاں، یہاں کا یہی حال ہے۔ ایک کے تین مانگتے ہیں۔

یہاں سے دونوں آدمی انور کے گھر چلے۔ چلتے چلتے انور نے کہا لو خوب یاد آیا۔ اس

پھانک میں ایک بانگے رہتے ہیں۔ ذری میں ان سے مل لوں۔ میاں آزاد اور انور

دونوں پھانک میں ہو رہے، تو کیا دیکھتے ہیں ایک ادھیڑ عمر کا کزیل آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔

گھٹنہ چوڑی دار، چست، ذرا شکن نہیں۔ چنٹ دار انگر کھا ایزی تک، چھاتا گول کٹا ہوا۔

چڑی اونچی، نکتے دار ماشے بھر کی کٹی ہوئی ٹوپی۔ سروی سانسے رکھی ہے اور جگہ جگہ کرولی

کنار، کھاڑا، کنواریں جتی ہوئی ہیں۔ سلام کلام کے بعد انور نے کہا، جناب وہ بندوق آپ

نے پچاس روپے کی خریدی تھی، دو دن کا وعدہ تھا، جس کے چھ مہینے ہو گئے مگر آپ سانس ڈکار تک نہیں لیتے۔ بندوق مہم کرنے کا ارادہ ہو تو صاف صاف کہہ دیجیے روز کی ٹھائیں ٹھائیں بے کیا فائدہ؟

بانکے: کیسی بندوق، کس کی بندوق؟ اپنا کام کرو، میرے منہ نہ چڑھنا میاں ہم بانکے لوگ ہیں سیکڑوں کے غٹے، ہزاروں کو جھانے دیے، آپ بیچارے کس کھیت کی مولیٰ ہیں؟ یہاں سو پشت سے سپہ گری ہوتی آئی ہے۔ ہم اور دام دیں؟

انور: واہ، اچھا بانکن ہے کہ آکھ چوکی اور کپڑا غائب، کبل ڈالا اور لوٹ لیا۔ کیا بانکن اسی کا نام ہے؟ ایسا تو لکے لپے کیا کرتے ہیں۔ آج کے ساتویں دن بانکیں ہاتھ سے روپے گن دیجیے گا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

بانکے نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا: معلوم ہوتا ہے تمہاری موت ہمارے ہاتھ بدی ہے۔ بہت بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ بانکوں سے نکرانا اچھا نہیں۔

اس تکرار اور توتو میں میں کے بعد دونوں آدمی گھر چلے۔ ادھر ان بانکے کا بھانجہ، جو اکھاڑے سے آیا اور گھر میں گیا، تو کیا دیکھتا ہے کہ سب عورتیں ناک بھوں چڑھائے، منہ، غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔ اے خیر تو ہے؟ یہ آج سب چپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں؟ کوئی منگتا ہی نہیں، اتنے میں اس کی ممانی کڑک کر بولی، اب چوڑیاں پہنو چوڑیاں، اور بہو بنیوں میں دب کر بیٹھ رہو۔ وہ موا کروڑوں باتیں سنا گیا، کپے پہر بھر تک اول جلول بکا کیا اور تمہارے مامو بیٹھے سب سنا کیے۔ پھیری منہ پر لوٹی، تو کیا کرے گا کوئی؟ جب شرم ٹکڑی بھون کھائی تو پھر کیا۔ یہ نہ ہوا کہ موئے کل جھٹھے کی زبان تالو سے کھینچ لے۔

بھانجے کو جوانی کا جوش تھا، شیر کی طرح بھرتا ہوا باہر آیا۔ بولا: مامو جان، یہ آج آپ سے کس سے تکرار ہو گئی؟ عورتیں تک جھلا اٹھیں اور آپ چپکے بیٹھے سنا کیے؟ واللہ عزت و دہ گئی۔ لو اب جلدی اس کا نام بتائیے، ابھی آنتوں کا ڈھیر کیے دیتا ہوں۔

مامو: ارے، وہی انور تو ہے۔ اس کا قرض دار ہوں۔ دو باتیں سنائے بھی تو کیا؟ اور وہ ہے ہی بیچارہ کیا کہ اس سے بھڑتا! وہ پڑی میں باز، وہ دبلا پتلا آدمی میں پرانا استاد۔ بولنے کا موقع ہوتا تو اس وقت اس کی لاش نہ پھڑکتی ہوتی؟ لے غصہ تھوک دو، جاؤ کھانا کھاؤ، آج بیٹھے کھڑے کپے ہیں۔

بھانجہ: قسم خدا کی، جب تک اس مردود کا خون نہ پی لوں، تب تک کھانا حرام ہے۔
 بیٹھے کھڑوں پر آپ ہی ہتھے لگائیے۔ یہ کہہ کر گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ ماموں نے لاکھ
 سمجھایا مگر ایک نہ مانی۔

ادھر انور جب گھر پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں ان کا لڑکا تڑپ رہا ہے۔ گھبرائے، وہ کیا
 خیریت تو ہے؟ لوٹری نے کہا، بھیا یہاں کھیل رہے تھے کہ بچھو نے کاٹ لیا۔ تبھی سے بچا
 تڑپ کر لوٹ رہا ہے۔ انور نے آزاد کو وہیں چھوڑا اور خود اسپتال چلے کہ جھٹ پٹ ڈاکٹر کو
 بلا لائیں۔ مگر ابھی پچاس قدم بھی نہ گئے ہوں گے کہ سامنے سے اس بانکے کا بھانجہ آ نکلا۔
 آنکھیں چار ہوئیں، دیکھتے ہی شیر کی طرح گرج کر بولا، لے سنبل جا ابھی سرخون میں لوٹ
 رہا ہوگا۔ ہلا اور میں نے ہاتھ دیا۔ بانکوں کے منہ چڑھنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ بچارے انور
 بہت پریشان ہوئے۔ ادھر لڑکے کی وہ حالت ادھر اپنی یہ گت۔ جسم میں طاقت نہیں، دل میں
 ہمت نہیں۔ بھائیں تو قدم نہیں اٹھتے۔ ٹھہریں تو پاؤں نہیں جتے۔ سیکڑوں آدمی ارد گرد جمع
 ہو گئے اور بانکے کو سمجھانے لگے۔ جانے دیجیے، ان کے مقابلے میں کھڑے ہونا آپ کے لیے
 شرم کی بات ہے۔ انور کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لوگوں سے بولے۔ بھائی اس وقت میرا بچہ
 گھر پر تڑپ رہا ہے، ڈاکٹر کو بلانے جاتا تھا کہ راہ میں انھوں نے گھیرا۔ اب کسی صورت سے
 مجھے بچاؤ۔ مگر اس بانکے نے ایک نہ مانی۔ پینترا بدل کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ اتنے میں کسی نے
 انور کے گھر خبر پہنچائی کہ میاں سے ایک بانکے سے تلواریں چل گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کسی نے
 کہہ دیا کہ چمکا کھایا اور گردن کھٹ سے الگ ہو گئی۔ یہ سنتے ہی انور کی بیوی سر پیٹ پیٹ کر
 رونے لگی۔ لوگو دوڑو، ہائے مجھ پر بجلی گری۔ ہائے میں جیسے جی مر مٹی۔ پھر بچے سے چٹ کر
 دلاپ کرنے لگی۔ میرے بچے، اب تو اتنا تھ ہو گیا، تیرا باپ دعا دے گیا۔ ہائے میرا سہاگ
 لٹ گیا۔

میاں آزاد یہ خبر پاتے ہی تیر کی طرح گھر سے نکل کر اس مقام پر جا پہنچے۔ دیکھا تو وہ
 ظالم تلواریں ہاتھ میں لیے مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہا ہے۔ آزاد نے جھٹ سے جھٹ کر
 انور کو ہٹایا اور پینترا بدل کر بانکے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ وہ تو جوانی کے نشے میں
 مست تھا پہلے تھکڑی کا ہاتھ لگانا چاہا مگر آزاد نے خالی دیا۔ وہ پھر جھپٹا اور چاہا کہ چاکی کا
 ہاتھ بجائے مگر یہ آڑے ہو گئے۔

آزاد : بچا، یہ اڑن گھائیاں کسی گنوار کو بتانا۔ میرے سامنے چٹکے چھوٹ جائیں تو سہی، آؤ چوٹ پر۔ وہ بانکا حملہ کر چھپنا اور گھٹنا ٹیک کر پالٹ کا ہاتھ لگانے ہی کو تھا کہ آزاد نے بینٹرا بدلا اور توڑ کیا، موڈھا، موڈھا تو اس نے بچایا مگر آزاد نے ساتھ ہی جینوے کا وہ تالا ہوا ہاتھ جمایا کہ اس کا جھنڈا رات تک کھل گیا۔ دھم سے زمین پر آگرا۔ میاں آزاد کو سب نے گھیر لیا، کوئی پیٹھ ٹھوکنے لگا کوئی ڈنڈ ملنے لگا۔ انور لپکے ہوئے گھر گئے۔ بیوی کی بانٹھیں کھل گئیں گویا مردہ جی اٹھا۔

دوسرے دن انور اور آزاد کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ڈاکیہ ہری ہری وردی پھڑکائے لال لال پکیہ جمائے خاصائیاں بنا ہوا آیا اور ایک اخبار دے کر لہبا ہوا۔ انور نے جھٹ پٹ اخبار کھولا، عینک لگائی، اور اخبار پڑھنے لگے۔ پڑھتے پڑھتے آخری صفحہ پر نظر پڑی تو چہرہ کھل گیا۔

آزاد : یہ کیوں خوش ہو گئے بھی؟ کیا خبر ہے؟
انور : دیکھتا ہوں کہ یہ اشتہار یہاں کیسے آپہنچا؟ اخباروں میں ان باتوں کا کیا ذکر؟ دیکھیے۔

’ضرورت ہے ایک عربی پروفیسر کی نظیر پور کالج کے لیے۔ تجواہ دو سو روپے مہینہ۔‘
آزاد : اخباروں میں کبھی باتیں ہوتی ہیں، یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ اخبار لڑکوں کا استاد، جوانوں کو سیدھی راہ بتانے والا، بڑھوں کے تجربے کی کسوٹی، سوداگروں کا دوست، کاریگروں کا ہمدرد، رعایا کا وکیل سب کچھ ہے۔ کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ، کہیں نوٹس اور اشتہار، انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں، اور دیسی اخبار بھی ان کی نقل کرتے ہیں۔ شطرنج کے نقشے، قومی تمسکوں کا زرخ، گھڑوڑ کی چرچا، کبھی کچھ ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی عہدہ خالی ہوا اور اچھا آدمی نہ ملا، تو حکام اس کا اشتہار دیتے ہیں۔ لوگوں نے پڑھا اور درخواست لگا دی، لگا تو حیر نہیں تھا۔

انور : تب تو نئے نئے اشتہار چھپنے لگیں گے۔ کوئی نئے سنج آباد کرے، تو اس کو چھوٹا پڑے گا، ایک نوجوان ساکن کی ضرورت ہے، نئے منج میں دکان جمانے کے لیے، کیوں کہ جب تک دھواں دھار چلیں گے اڑیں، چرس کی لو آسمان کی خبر نہ لائے، جب تک سنج کی رونق نہیں۔ انہی اشتہار دیں گے کہ ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو افیم گھولنے میں تاک ہو،

دن رات پینک میں رہے، مگر انہیں گھولنے کے وقت چوہک اٹھے۔ آرام طلب لوگ چھپوائیں گے کہ ایک ایسے قصہ کہنے والے کی ضرورت ہے، جس کی زبان کترنی کی طرح چلی جائے، جس کے امیر حمزہ کی داستان زبان پر ہو، زمین اور آسمان کے کلابے ملائے، جھوٹ کے چھپر اڑائے، شام سے جو بکنا شروع کرے، تو تڑکا کر دے۔ خوشامد پسند لوگ چھپوائیں گے کہ ایک ایسے مصاحب کی ضرورت ہے، جو آنکھوں گانٹھ کھیت ہو، ہاں میں ہاں ملائے، ہم کو سخاوت میں حاتم، دلیری میں رستم، عقل میں ارسطو بنائے، منہ پر کہے کہ حضور ایسے اور حضور کے باپ ایسے، مگر پیٹھ پیچھے گالیاں دے کہ اس گدھے کو میں نے خوب بنایا۔ بے فکرے چھپوائیں گے کہ ایک بئیر کی ضرورت ہے جو بڑھ بڑھ کر لات لگاتا ہو، ایک مرغ کی، جو سوائے ڈیوڑھے کو مارے، ایک میڈھے کی جو پہاڑ میں نکل لینے سے بند نہ ہو۔

اتنے میں مرزا سعید بھی آ بیٹھے۔ بولے بھی ہماری بھی ایک ضرورت چھپوا دو۔ ایک ایسی جو رو چاہیے جو چالاک اور چست ہو، نکل سکھ سے درست ہو، شوخ اور چنچل ہو، کبھی کبھی ہنسی میں ٹوپی جھین کر چپت بھی جمائے، کبھی روٹھ جائے، کبھی گدگدائے، خرچ کرنا نہ جانتی ہو، ورنہ ہم سے میزان نہ پٹے گی، لال منہ ہو، سفید ہاتھ پاؤں ہوں، لیکن اونچے قد کی نہ ہو، کیوں کہ میں نانا آدمی ہوں، کھانا پکانے میں استاد ہو، لیکن ہاضمہ خراب ہو، ہلکی پھلکی دو چپائیاں کھائے تو تین دن میں ہضم ہو، سادا مزاج ایسی ہو کہ گھنے پاتے سے مطلب ہی نہ رکھے، ہنس کھو، روتے کو ہنسائے، مگر یہ نہیں کہ پیٹی جوتی کی طرح بے موقع دانت نکال دے، درخواست کھٹاکٹ آئیں، ہاں یہ بھی یاد رہے کہ بی بی صلابہ کے منہ پر داڑھی نہ ہو۔ آزاد: اور تو خیر، مگر یہ داڑھی کی بڑی کڑی شرط ہے۔ بھلا کیوں صاحب، عورتیں بھی ہچکھو ہوا کرتی ہیں؟

سعید: کون جانے بھی، دنیا میں سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ جب بے مونچھ کے مرد ہوتے ہیں، تو مونچھ والی عورتوں کا ہونا بھی ممکن ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہماری مونچھ اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی ہمارے ہاتھ میں ہو۔

آزاد: اجی، چاہئے بھی، عورت کے بھی کہیں داڑھی ہوتی ہے؟

سعید: ہو یا نہ ہو، مگر یہ ہم ضرور لگائیں گے۔

آپس میں بھی مذاق ہو رہا تھا کہ پڑوس سے رونے پینے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کوئی

بوڑھا آدمی مر گیا۔ آزاد بھی وہاں جا پہنچے۔ لوگوں نے پوچھا، انہیں کیا بیماری تھی؟ ایک بوڑھے نے کہا، یہ نہ پوچھیے تمہن کی بیماری تھی۔

آزاد: یہ کون بیماری ہے؟ یہ تو کوئی نیا مرض معلوم ہوتا ہے۔ اس کی علامتیں تو بتائیے۔
 بوڑھا: کیا بتاؤں، عقل کی مار اس کا خاص سبب ہے۔ اتنی برس کے تھے، مگر عقل کے پورے، تمیز چھو نہیں گئی۔ خدا جانے دھوپ میں بال سفید کیے تھے یا نزلہ ہو گیا تھا۔ حضرت کی پیٹھ پر ایک پھوڑا نکلا۔ دس دن تک علاج ندارد۔ دسویں دن کسی گنوار نے کہہ دیا کہ گل عباس کے پتے اور سرکہ باندھو۔ جھٹ سے راضی ہو گئے۔ سرکہ بازار سے خریدا، پتے باغ سے توڑ لائے، اور سرکہ میں پتوں کو خوب تر کر کے پیٹھ پر باندھا۔ دوسرے روز پھوڑا آدھ انگل بڑھ گیا۔ کسی اور کوکھے نے کہہ دیا کہ بھٹ کنیا باندھو، یہ نوٹکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درد اور بڑھ گیا۔ کسی نہ بتایا کہ اہلی کی پتی، دھتورا، اور گوہر باندھو۔ وہاں کیا تھا، فوراً منظور۔ اب تڑپنے لگے۔ آگ لگ گئی۔ محلے کی ایک عورت نے کہا، میں بتاؤں، مجھ سے کیوں نہ پوچھا سرل ترکیب ہے، مولیٰ کے اچار کے تین کتلے لے کر زمین میں گاڑ دو۔ تین دن کے بعد نکالو، اور کوئیں میں ڈال دو۔ پھر اسی کوئیں کا پانی اپنے ہاتھ بھر کر پی جاؤ۔ اسی دم چنگے نہ ہو جاؤ تو ناک کنا ڈالوں۔ سوچے، بھی اسی نے شرط بڑی کڑی کی ہے۔ کچھ تو ہے کہ ناک بدل لی۔ جھٹ مولیٰ کے کتلے گاڑے، اور کوئیں میں ڈال پانی بھرنے لگے۔ اس پر طرہ یہ کہ مارے درد کے تڑپ رہے تھے۔ ڈول تھا بھاری، اس پر طرہ یہ کہ مارے درد کے تڑپ رہے تھے۔ رسی ہاتھ سے چھوٹ گئی، دھم سے گرے، پھوڑے میں نہیں لگی، تمللانے لگے، یہاں تک کہ جان نکل گئی۔

آزاد: افسوس، بیچارے کی جان مفت میں گئی۔ ان عقل کے دشمنوں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ ہر ایرے غیرے کی رائے پر کیوں علاج کر بیٹھتے ہو؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے یا تو مرض بڑھ جاتا ہے، یا جان نکل جاتی ہے۔

(15)

میاں آزاد ایک دن چلے جاتے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک پرانی دھرائی گڑھیا کے کنارے ایک دڑھیل بیٹھے کافی کی کیفیت دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ڈھیلا اٹھا کر پھیکا چھپ۔

بوڑھے آدمی اور لونڈے بنے جاتے ہیں۔ داڑھی کا بھی خیال نہیں۔ لطف یہ کہ محلے بھر کے
 لونڈے ارد گرد تالیاں بجا رہے ہیں، لیکن آپ گڑھیا کی لہروں ہی پر لٹو ہیں۔ کمر جھکائے
 چاروں طرف ڈھیلے اور ٹھیکرے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ کئی ڈھیلے اٹھا کر پھینکے۔ آزاد
 نے سوچا کوئی پاگل ہے کیا۔ صاف سترے کپڑے پہنے، یہ عمر یہ وضع، اور کس مزے سے
 گڑھیا پر بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ یہ خبر ہی نہیں کہ گاؤں بھر کے لونڈے پیچھے سے
 تالیاں بجا رہے ہیں۔ ایک لونڈے نے چپت جمانے کے لیے ہاتھ اٹھایا، مگر ہاتھ کھینچ لیا۔
 دوسرے نے پیڑ کی آڑ سے کنکوی لگائی۔ تیسرے نے داڑھی پر گھاس پھینکی۔ چوتھے نے کہا
 میاں تمہاری داڑھی میں تنکا، مگر میرا شیر ذرا نہ منکا۔ گڑھیا سے اٹھے تو دور کی سوچی۔ جھپ
 سے ایک پیڑ پر چڑھ گئے، پھٹکی پر جا بیٹھے اور بندر کی طرح لگے اچکنے۔ اس نہی پر اچکے تو
 دوسری ڈال پر جا بیٹھے۔ اس پر لڑکوں کو بھی بلاتے جاتے ہیں کہ آؤ اوپر آؤ۔ اہلی کا درخت
 تھا، اتنا اونچا کہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ حضرت مزے سے بیٹھے اہلی کھاتے اور جھپ
 لڑکوں پر پھینکتے جاتے ہیں۔ لونڈے گل چا رہے ہیں کہ میاں میاں ایک چیاں ہم کو ادھر پھینکو،
 ادھر، ہاتھ ہی ٹوٹے، جو ادھر پھینکے۔ کیا مزہ سے گہر گہر کر کے کھاتے جاتے ہیں، ادھر ایک
 چیاں بھی نہیں پھینکتے۔ اوکھوس، اوکھی چوس، او بندر، ارے مجھنر، ایک ادھر بھی تھوڑی دیر میں
 کھٹ کھٹ کرتے پیڑ سے اترے۔ اتنے میں کسریت کے تین چار ہاتھی چارے اور گنے سے
 لدے جھومتے ہوئے نکلے۔ آپ نے لڑکوں کو سکھایا کہ غل مچا کر کہو۔ ہاتھی ہاتھی کٹا دے۔
 لونڈوں نے جو اتنی شہ پائی تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سب چیخنے لگے، ہاتھی ہاتھی گٹا دے۔
 ایک ایک ایک ریچھ والا آ نکلا۔ آپ نے جھٹ ریچھ کی گردن پکڑی اور پیٹھ پر ہو رہے نکل نکل
 نک، کیا ٹٹو ہے ریچھ والا چل پون چلایا ہی کیا، آپ نے دو تین لڑکوں کو آگے پیچھے اگل بغل
 بٹھا ہی لیا۔ مزے سے تے بیٹھے ہیں گویا اپنے وقت کے بادشاہ ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد
 لڑکوں کو زمین پر پٹکا، خود بھی دم سے زمین پر کود پڑے، اور جھٹ لنگوٹ کس، تال ٹھوک،
 ریچھ سے کشتی لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ تب تو ریچھ والا چلایا، میاں کیوں جان کے دشمن ہوئے
 ہوا! چبا ہی ڈالے گا۔ یہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے، آؤ دیکھا نہ تاؤ چٹ ہی تو گئے اور
 ایک انٹی بتائی، تو ریچھ چاروں شانے چٹ۔ لونڈوں نے وہ غل چلایا کہ ریچھ پورب بھاگا، اور
 ریچھ والا پتھم۔ محلے بھر میں قہقہہ اڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک بھڑی آ نکلا۔ دھوتی

باندھے، پتھی بغل میں دبائے، زوراکش کی مالا پہنے، آواز لگاتا جاتا ہے، سائت بچاریں، سکن بچاریں۔ دڑھیل کے قریب سے گزرا، تو شکار ان کے ہاتھ آیا۔ بولے بھی ادھر آتا۔ اس کی بانٹھیں کھل گئیں کہ پو بارہ ہے۔ اچھی بوئی ہوئی۔ دڑھیل نے ہاتھ دکھایا اور پوچھا۔ ہماری کتنی شادیاں ہوں گی؟ اس نے کنیا، سکر، سنگھ، ورچک کر کے بہت سوچ کے کہا، پانچ۔ آپ نے اس کی پگڑی اچھال دی۔ لڑکوں کو دل لگی سوچھی، کسی نے سر سہلایا تو کسی نے چپٹ لگایا۔ اچھی طرح بوئی ہوئی۔ دڑھیل نے کہا سچ کہنا، آج سائت دیکھ کر چلے تھے، یا یوں ہی؟ اپنی سائت بھی دیکھ لیتے ہو یا اوروں ہی کو راہ بتاتے ہو؟ اچھا، خیر، بتاؤ ہمارے یہاں لڑکا کب تک ہوگا؟ بھڈری نے کہا بس بس آپ اور کسی سے پوچھیے گا۔ بھر پایا۔ یہ کہہ کر چلے ہی کو تھا کہ دڑھیل نے لڑکوں کو اشارہ کیا۔ وہ تو ان کو اپنا گرو ہی سمجھتے تھے۔ ایک نے پتھی لی، دوسرے نے مالا چھپائی، تیسرے نے پکیا ٹھلا دی۔ دس پانچ چٹ گئے۔ بیچارہ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگا اور قسم کھائی کہ اب اس محلے میں قدم نہ رکھوں گا۔ اتنے میں کھونچے والے نے آواز دی، گلابی ریوڑیاں، کراری کنٹھیاں، دال موٹھ، سلونے، مٹر تھونے۔ لونڈے اپنے اپنے دل میں خوش ہو گئے کہ دڑھیل کے حکم سے خوانچہ لوٹ لیں گے اور خوب مٹھائیاں چکھیں گے۔ مگر انھوں نے منع کر دیا، خبردار ہاتھ مت بڑھانا۔ جب خوانچے والا پاس آیا تب انھوں نے مول تول کر کے دو روپے میں سارا خوانچہ مول لے لیا اور لڑکوں کو خوب چھکا کر کھلایا۔ ایک دس منٹ کے بعد آواز آئی کھیرے لو کھیرے، آپ نے اپک کر نوکرا الٹ دیا۔ کھیرے زمین پر گر پڑے۔ جیسے ہی لڑکوں نے چابا، کھیرے بنوئیں کہ انھوں نے ڈانٹ بتائی۔ کھیرے والے کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور لڑکوں سے کہا کھیرے اٹھا اٹھا کر اسی گڑھیا میں پھینکتے جاؤ۔ پچاس ساٹھ کھیرے آنا فانا گڑھیا میں پہنچ گئے۔ ابھی یہ تماشا ہو ہی رہا تھا کہ ایک چڑی مار کپا جال لیے ہوئے آ نکلا۔ ہاتھ میں تین چار جانور، کچھ جھولے کے اندر۔ سب پھر بھڑا رہے ہیں۔ کہتا جاتا ہے کالا بھجنگ منگل کے روز۔ دڑھیل نے پکارا، آؤ میاں، ادھر آؤ۔ ایک بھجنگ لے کر اپنے اوپر سے اتار کر چھوڑ دیا۔ چڑی مار نے کہا نکلا ہوا۔ دوسرا جانور ایک لڑکے پر سے اتار کر چھوڑا۔ اسی طرح دس پندرہ چڑیاں چھوڑ کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ گویا کچھ مطلب ہی نہیں۔ چڑی مار نے کہا حضور، دام، آپ نے فرمایا تمھارا نام؟ تب تو وہ چکرایا کہ ایتھے ملے۔ بولا حضور دھیلی کے جانور تھے۔ آپ بولے، کیسی دھیلے اور کیسا دھیلا۔ کچھ گھاس تو نہیں کھا

گیا؟ بنگ پی گیا ہے یا شراب کا نشہ ہے؟ ادھر لڑکوں نے جال کپا سب شہلا دیا۔ تھوڑی دیر روپیٹ کر اس نے بھی اپنی راہ لی۔

دڑمیل نے لڑکوں کو چھوڑا اور وہاں سے کسی طرف جانا ہی چاہتے تھے کہ آزاد نے قریب آکر پوچھا۔ حضرت، میں بڑی دیر سے آپ کا تماشا دیکھ رہا ہوں، کبھی کھیرے گڑھیا میں پھینکے، کبھی اٹلی پر اچک رہے، کبھی چڑی مار کی خبر لی، کبھی بھڑی کو آڑے ہاتھوں لیا۔ مجھے خوف ہے کہ آپ کہیں پاگل نہ ہو جائیں، جلدی سے فصد کھلوائے۔

دھڑیل : مجھے تو آپ ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ ان باتوں کے سمجھنے کے لیے بڑی عقل چاہیے۔ سنیے، آپ کو سمجھاؤں۔ گڑھیا پر بستر جما کر ڈھیلے پھینکے اور چڑ پر اچک کر اٹلی کھانے اور ہاتھی سے گٹنے مانگنے کا سبب یہ ہے کہ لونڈے بھی ہماری دیکھا دیکھی اچک بھاند میں برق ہو جائیں، یہ نہیں کہ مریل ٹٹو کی طرح جہاں بیٹھے وہیں جم گئے۔ لڑکوں کو کم سے کم دو گھنٹے روز کھیلنا کودنا چاہیے، ورنہ بیماری ستائے گی۔ ریچھ والے کے ریچھ پر اچک بیٹھے، ریچھ کو بھگا دینے اور چڑی مار کے جانوروں کو مفت بے کوڑی بے دام چھڑا دینے کا سبب یہ ہے کہ جب ہم جانوروں کو تکلیف میں دیکھتے ہیں تو کیچے پر سانپ لٹنے لگتا ہے اور ان چڑی ماروں کا تو میں جانی دشمن ہوں۔ بس چلے تو کالے پانی بھجوا دوں۔ جہاں دیکھا کہ دوچار بھلے مانس کھڑے ہیں لگے جانوروں کو زور سے دبانے، جس میں وہ چیخیں، اور لوگ ان کی حالت پر کچھ دے نکلیں، ان کی ہڈیاں چڑھ جائے۔ کھیرے اس لیے گڑھیا میں پھنکوا دیے کہ آج کل ہوا خراب ہے، کھیرے کھانے سے بھلا چنگا آدمی بیمار ہو جائے۔ مگر ان کجروں کباڑیوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟ انھیں تو اپنے نگوں سے مطلب۔ میں نے سمجھا ایک کباڑیے کے نقصان سے پچاسوں آدمیوں کی جان بچ جائے، تو کیا برا؟ دیکھ لو کھونچے والے کو ہم نے اپنے پاس سے دو روپے کھنا کھن گن دیے۔ اب سمجھ اس تماشے کا حال؟

یہ کہہ کر انھوں نے اپنی راہ لی اور آزاد نے بھی دل میں ان کی نیک نیتی کی تعریف کرتے ہوئے دوسری طرف کا راستہ لیا۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ سامنے سے ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ انھوں نے آزاد سے پوچھا، کیوں صاحب، آپ افیم تو نہیں کھاتے؟ آزاد : افیم خدا کی مار! قسم لے لیجیے، جو آج تک ہاتھ سے بھی چھوئی ہو، اس کے نام سے نفرت ہے۔

یہ کہہ کر آزاد ندی کے کنارے جا بیٹھے۔ وہاں سے پلٹ کر جو آئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی حضرت زمین پر پڑے آنکھیں مانگ رہے ہیں۔ چہرے پر مردنی چھائی ہے، ہونٹ سوکھ رہے ہیں، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ نہ سر کی فکر ہے، نہ پاؤں کی۔ آزاد چکرائے، کیا ماجرا ہے، پوچھا کیوں بھی، خیر تو ہے؟ ابھی تو بھلے چنگے تھے، اتنی جلد کا یا پلٹ کیسے ہو گئی؟

انجی: بھی، میں تو مر مٹا۔ کہیں سے انیم لے آؤ، پیڑوں، تو آنکھیں کھلیں، جان میں جان آئے۔ جھٹ پن ہی سے انیم کا عادی ہوں۔ وقت پر نہ ملے تو جان نکل جائے۔ آزاد: ارے یار، انیم چھوڑو، نہیں، اسی طرح ایک دن دم نکل جائے گا۔ انجی: تو کیا آپ امرت پی کر آئے ہیں؟ مرنا تو ایک دن سبھی کو ہے۔ آزاد: میاں، ہو بڑے جیسے، رسی جل گئی مگر بل نہ گیا، پڑے سک رہے ہو، مگر جواب ترکی بہ ترکی ضرور دو گے۔

انجی: جناب، انیم لانی ہو تو لائیے، ورنہ یہاں بک بک سننے کا دماغ نہیں۔ آزاد: انیم لانے والے کوئی اور ہی ہوں گے، ہم تو اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ آپ مریں تو ماتم کریں۔ ہاں ایک بات مانو ابھی لپک جاؤں، ذرا لکڑی کے سہارے سے اس ہرے بھرے پیڑ کے تلے چلو، وہاں ہری ہری گھاس پر لوٹ مارو، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ، تب تک میں آتا ہوں۔

انجی: ارے میاں، یہاں جان بھاری ہے۔ چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا کیسا! آخر آزاد نے انھیں پیٹھ پر لا دا اور لے چلے۔ ان کی یہ حالت کہ آنکھیں بند، منہ کھلا ہوا، معلوم ہی نہیں کہ جاتے کہاں ہیں۔ آزاد نے ان کو ندی میں لے جا کر غوطہ دیا۔ بس قیامت آگئی۔ انجی آدی پانی کی صورت سے نفرت، لگے چلانے، بڑا مچا دے گیا۔ مارا پڑا کر دیا۔ عمر بھر میں آج ہی ندی میں قدم رکھا، خدا تجھ سے کبھے سن سے جان نکل گئی۔ ٹھنڈی گھاس اے عالم اب تو رحم کر۔ آزاد نے ایک غوطہ اور دیا۔ پھر تابتوڑ کئی غوطے دیے۔ اب ان کی کیفیت کچھ نہ پوچھیے۔ کرڈوں گالیاں دیں۔ آزاد نے ان کو ریتی میں چھوڑ دیا اور لمبے ہوئے۔ چلتے چلتے ایک برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچے جس کی ٹہنیاں آسمان سے باتیں کرتی تھیں اور جٹا میں پاتال کی خبر لیتی تھیں۔ دیکھا ایک حضرت نشے میں چور ایک دہلی پتلی ٹٹو کی پر سوار

ٹک ٹک کرتے جا رہے ہیں۔

آزاد: اس ٹٹو کی پرکون لدا ہے؟

شرابی: اچھا جی، کون لدا ہے! ایسا نہ ہو کہ کہیں میں اتر کر انجر پنجر ڈھیلے کر دوں۔ یوں نہیں پوچھتا کہ اس ہوائی گھوڑے پر آسن جمائے باگ اٹھائے کون سوار جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے ناک، سوجھے کیا خاک۔ ٹٹو ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟

آزاد: جناب، قصور ہوا، معاف کیجیے۔ سچ بچ یہ تو ترکی نسل کا پورا گھوڑا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، جتنا پار کی بکری اس سے کچھ ہی بڑی ہوگی۔

شرابی: ہاں، اب آپ آئے راہ پر۔ اس گھوڑے کی کچھ نہ پوچھیے۔ ماں کے پیٹ سے پھدکتا نکلا تھا۔

آزاد: جی ہاں، وہ تو اس کی آنکھیں ہی کہے دیتی ہیں۔ گھوڑا کیا اڑن کھنولا ہے۔

شرابی: اس کی قیمت بھی آپ کو معلوم ہے؟

آزاد: نہ صاحب! بھلا میں کیا جانوں۔ آپ تو خیر گدھے پر سوار ہوئے ہیں، یہاں تو ناگوں کی سواری کے سوا اور کوئی سواری میسر ہی نہ ہوئی۔ مگر استاد، کتنی ہی تعریف کرو، میری نگاہ میں تو نہیں بچتا۔

شرابی: اچھا، تو اسی بات پر کڑکڑائے دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر ایز لگائی مگر ٹٹو نے جنبش تک نہ کی۔ وہ اور اچل ہو گیا۔ اب چابک پر چابک مارتے ہیں، ایز لگاتے ہیں اور وہ ٹٹو کے کا نام تک نہیں لیتا۔ آزاد نے کہا۔ بس، زیادہ شفی میں نہ آئیے، ٹٹو ٹٹو ہوا کھائیے۔

یہ کہہ کر آزاد تو چلے مگر شرابی کے پاؤں ڈمک گئے۔ باگ اب چھوٹی اور اب چھوٹی۔ دس قدم چلے اور باگ روک لی۔ پوچھا، میاں مسافر میں نشے میں تو نہیں ہوں؟ آزاد: جی نہیں، نشہ کیسا؟ آپ ہوش کی باتیں کر رہے ہیں۔

شرابی اسی طرح بار بار آزاد سے پوچھتا تھا۔ آخر جب آزاد نے دیکھا کہ یہ اب گھڑیا پر سے لڑکا ہی چاہتے ہیں تو جھٹ گھڑیا کو ایک کھیت میں ہانک دیا اور غل چھایا کہ او کسان، دیکھ، یہ تو کھیت چرائے لیتا ہے۔ کسان کے کان میں بھنک پڑی، تو لٹھ کاندھے پر رکھ، لاکھوں گالیاں دیتا ہوا جھٹا۔ آج چچا بنا کے چھوڑ دوں گا۔ روز سو ریا چرائے جاتے تھے، آج بہت دن

کے بعد ہتھے چڑھے ہو۔ نزدیک گیا، تو دیکھتا ہے کہ ٹٹوئی ہے اور ایک آدمی اس پر لدا ہے۔ کسان چالاک تھا، بولا آپ ہیں بابو صاحب! چلیے آپ کو گھر لے چلوں۔ وہیں کھانا کھائیے اور آرام سے سوئیے۔ یہ کہہ کر گھوڑیا کی راس تھامے ہوئے، کانچی ہاؤس پہنچا اور ٹٹوئی کو کانچی ہاؤس میں ڈھکیل کر چیت ہوا۔ یہ بیچارے رات بھر کانچی ہاؤس میں رہے صبح کو کسی طرح گھر پہنچے۔

(16)

میاں آزاد کے پاؤں میں تو آندھی روگ تھا۔ ادھر ادھر چکر لگائے، راستہ ٹاپا اور پڑ کر سو رہے۔ ایک دن سائنٹی کی خبر لینے کے لیے سرائے کی طرف گئے، تو دیکھا، بڑی چہل پہل ہے۔ ایک طرف روٹیاں پک رہی ہیں، دوسری طرف دال بگھاری جاتی ہے۔ بھٹیاریاں مسافروں کو گھیر گھار لا رہی ہیں، صاف ستھری کوٹھریاں دکھلا رہی ہیں۔ ایک کوٹھری کے پاس ایک موٹا تازہ آدمی جیسے ہی چارپائی پر بیٹھا، پٹی ٹوٹ گئی۔ آپ گڑاپ سے جھلٹکے میں ہو رہے۔ اب بار بار اچکتے ہیں، مگر اٹھا نہیں جاتا۔ چلا رہے ہیں کہ بھی مجھے کوئی اٹھاؤ۔ آخر بھٹیاریوں نے داہنا ہاتھ پکڑا، بائیں طرف میاں آزاد نے ہاتھ دیا اور آپ کو بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کے نکالا۔ جھلٹکے سے باہر آئے تو صورت بگڑی ہوئی تھی۔ کپڑے کئی جگہ مسک گئے تھے۔ جھلا کر بھٹیاری سے بولے، واہ اچھی چارپائی دی! جو میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے یا سر پھوٹ جاتا تو کیسی ہوتی؟

بھٹیاری: اسے واہ میاں، الٹا چور کو توال کو ڈانٹے۔ ایک تو چھپر کھٹ کو چکنا چور کر ڈالا، پٹی کے بہتر ٹکڑے ہو گئے، دیں گے نکا اور چھ روپے پر پانی پھیر دیا، دوسرے ہمیں کو لٹکارتے ہیں۔

آزاد: جناب، ان بھٹیاریوں کے منہ نہ لگتے کہیں کچھ کہہ بیٹھیں تو مفت کی جینپ ہو۔
 دیکھ بھال کر بیٹھا کیجیے۔ کہاں سے آرہے ہیں؟
 حکیم: یہیں تک آیا ہوں۔
 آزاد: آپ آئے کہاں سے ہیں؟
 حکیم: جی گوپامو مکان ہے۔

آزاد: یہاں کس فرض آتا ہوا؟

حکیم: حکیم ہوں۔

آزاد: یہ کیسے کہ آپ طبیب ہیں۔

حکیم: طبیب آپ خود ہوں گے ہم حکیم ہیں۔

آزاد: اچھا صاحب، آپ حکیم ہی سہی، کیا یہاں حکمت کیجیے گا؟

حکیم: اور نہیں تو کیا، بھاڑ جھونکنے آیا ہوں؟ یا سنجر بیروں پر سوار تھا؟ بھلا یہ تو فرمائیے

کہ یہ کیسی جگہ ہے؟ لوگ کس فیض کے ہیں؟ آب و ہوا کیسی ہے؟

آزاد: یہ نہ پوچھیے جناب، یہاں کے باشندے پورے گھٹے ہوئے، آٹھوں کا منہ کیت

ہیں۔ اور آب و ہوا تو ایسی ہے کہ برسوں ریسے پر سر میں درد تک نہ ہو۔ پاؤ بھر کی خوراک ہو

تو تین پاؤ کھائیے۔ ڈکار تک آئے تو مجھے سزا دیجیے۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے منہ بنایا اور بولے: تب تو برے پھنسنے!

آزاد: کیوں برے کیوں پھنسنے؟ شوق سے حکمت کیجیے۔ آب و ہوا اچھی ہے، بیماری کا

نام نہیں۔

حکیم: حضرت، آپ نرے بڑھ ہیں۔ ایک تو آپ نے یہ گولا مارا کہ آب و ہوا اچھی

ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ آب و ہوا اچھی ہے تو ہم سے کیا واسطہ، ہمیں کون پوچھے گا؟ بس ہاتھ

پر ہاتھ رکھے مکھنیاں مارا کریں گے۔ ہم تو ایسے شہر جانا چاہتے ہیں جہاں پیسے کا گھر ہو، بخار

بیچھا نہ چھوڑتا ہو، دست، اور پچیش کی سب کو شکایت ہو، چھچک کی وہ زور ہو کہ خدا کی پناہ۔

تب البتہ ہماری ہنڈیا چڑھے۔ آپ نے تو واللہ آتے ہی گولا مارا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہاں

پاؤ بھر کے بدلے تین پاؤ غذا ہضم ہوتی ہے۔ آمدنی نکا نہیں اور کھائیں چوگنا۔ تو کیسے خرے

یا بیجے؟ بندہ سویرے ہی بوریاں بندھنا اٹھا کر چلتا ہوگا۔ ایسی جگہ میری بلا رہے جہاں سب

بٹے کئے ہی نظر آتے ہیں۔ بھلا کوئی خاص مرض بھی ہے یہاں؟ یہاں مرض کا اس طرف گزر

ہی نہیں ہوا؟

آزاد: حضرت، یہاں کے پانی میں یہ اثر ہے کہ برسوں کا مریض آئے اور ایک قطرہ

پی لے تو بس خاصا ہٹا کٹا ہو جائے۔

حکیم: پانی کیا امرت ہے! تو سہی جو پانی میں زہر نہ ملا دیا.....!

آزاد: جناب، ہزاروں کوئیں اور پچاسوں بادلیاں ہیں، کس کس میں زہر ملائے پھرے

کا؟

حکیم: خیر، بھائی سمجھا جائے گا، مگر برسے بھنے۔ اس وقت ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، او بھیری، ذری ہم کو پنساری کی دکان سے تولہ بھر بھین تولادینا۔

بھیری: اے میاں، پنساری یہاں کہاں؟ کسی فقیر کی دعا ایسی ہے کہ یہاں حکیم اور پنساری جتنے ہی نہیں پاتا۔ کئی حکیم آئے مگر قبر میں ہیں۔ کئی پنساریوں نے دکان جمائی مگر چتا میں پھونک دیے گئے۔ یہاں تو بیماری نے آنے کی قسم کھائی ہے۔

حکیم: بھئی، بڑا مکتا شہر ہے۔ خدا کے لپٹے ہمیں ٹٹو کراپے پر کر دو، تو رفو چکر ہو جائیں۔ ایسے شہر کی ایسی تھیں۔

انھیں دھتا تا کر آزاد سرائے کے دوسرے حصے میں جا پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک بزرگ آدمی بستر جمائے بیٹھے ہیں۔ آزاد بے کلف تو تھے ہی، سلام علیک کہہ کر پاس جا بیٹھے۔ وہ بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ ہاتھ ملایا، نگلے ملے، حراج پوچھا۔

آزاد: آپ یہاں کس غرض سے تشریف لائے ہیں؟

انھوں نے جواب دیا: جناب، میں وکیل ہوں یہاں وکالت کرنے کا ارادہ ہے، کہیے یہاں کی عدالت کا کیا حال ہے؟

آزاد: یہ نہ پوچھیے۔ یہاں کے لوگ بھٹکی بلی ہیں، لڑنا بھڑنا جانتے ہی نہیں۔ سال بھر میں دو چار مقدمے شاید ہوتے ہوں۔ چوری چکاری یہاں کبھی سننے ہی میں نہیں آتی۔ زمین اراضی، لگان، پٹی داری، کے مقدمے کبھی سنے ہی نہیں۔ قرض کوئی لے نہ دے۔

وکیل صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ مگر حکیم جی کی طرح جھلے تو تھے نہیں، آہستہ سے بولے، سبحان اللہ یہاں کے لوگ بڑے بھلے آدمی ہیں۔ خدا ان کو ہمیشہ نیک راستے پر لے جائے۔ مگر دل میں انھوں ہوا کہ اس ٹیم ٹیم دھوم دھام سے آئے اور یہاں بھی وہی ڈھاک کے تین پات۔ جب مقدمے ہی نہ ہوں گے تو کھاؤں گا کیا، دشمن کا سر۔ انھیں بھی جھانسا دے کر آزاد آگے بڑھے تو دیکھا چار پائی بچائے شہوت کے بیڑ کے نیچے ایک صاحب بیٹھے حد ازار ہے۔

ہیں۔ آزاد نے پوچھا آپ کا نام؟

وہ بولے: گم نام ہوں۔

آزاد: وطن کہاں ہے؟

وہ: فقیر جہاں پڑ رہے وہیں اس کا گھر

آزاد: آپ کا پیشہ کیا ہے؟

وہ: خون جگر کھانا۔

آزاد: تو آپ شاعر ہیں، یہ کیسے۔

آزاد چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئے اور بے تکلف ہو کر بولے، جناب حقہ تو میرے حوالے کیجیے اور آپ اپنا کلام سنائیے۔ شاعر صاحب نے بہت کچھ چنا چنی کے بعد دوبرے کا کلام اپنا کہہ کر سنایا:

کیا حال ہو گیا ہے دل بے قرار کا
آزار ہو کسی کو الٹی نہ پیار کا
مشہور ہے جو روز قیامت جہان میں
پہلا پھر ہے میری شب انتظار کا
امتاس دیکھنا میری وہشت کے بلبلے
آیا ہے دھوم دھام سے موسم بہار کا
راہ ان کی تکتے تکتے جو مدت گزر گئی
آنکھوں کو حوصلہ نہ رہا انتظار کا

آزاد: سبحان اللہ، آپ کا کلام بہت ہی پاکیزہ ہے۔ کچھ اور استادوں کے کلام سنائیے:
شاعر: بہت خوب سنئے:

داغ دے جاتے ہیں جب آتے ہیں
یہ گھونڈ نیا وہ لاتے ہیں

آزاد: سبحان اللہ! داغ کے لیے گھونڈ کیا خوب!

شاعر:

یار تک وار کہاں پاتے ہیں
راستہ ٹاپ کے رہ جاتے ہیں

آزاد: واہ کیا بول چال ہے۔

شاعر:

پھر جنوں دست نہ دکھلائے ہمیں۔
آج تلوے میرے کھلاتے ہیں
آزاد: واہ واہ، کیا زبان ہے۔

شاعر:

پھول کا جام پلاؤ ساقی
کانٹے تالو میں پڑے جاتے ہیں
آزاد: پھول کے لیے کانٹے، کیا خوب!
شاعر:

کنگھی کے نام سے ہوتے ہیں خفا
بات سلجی ہوئی ابھاتے ہیں
آزاد: بہت خوب!

شاعر: اچھا جناب، یہ تو فرمائیے یہاں کے رئیسوں میں کوئی شاعری کا قدردان بھی ہے؟
آزاد: قبلہ، یہ نہ پوچھیے۔ یہاں مارواڑی البتہ رہتے ہیں۔ شاعر یا فنشی کی صورت سے
نفرت ہے۔ یہاں کے رئیسوں سے کچھ بھی بھروسہ نہ رکھیے۔
شاعر: جب تو یہاں آنا ہی بیکار ہوا۔ آخر کیا ایک بھی رکنیں مزاج رکھیں نہیں ہے؟
آزاد: اب آپ تو مانتے ہی ہی نہیں یہاں قدردان خدا کا نام ہے۔

(17)

آزاد کے دل میں ایک دن سالی کہ آج کسی مسجد میں نماز پڑھیں، جمعہ کا دن ہے،
جامع مسجد میں خوب جماد ہوگا۔ فوراً مسجد میں آ پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں بڑے بڑے زاہد اور
مولوی، قاضی اور مفتی بڑے بڑے عمامے سر پر باندھے نماز پڑھنے چلے آ رہے ہیں، ابھی نماز
شروع ہونے میں دیر ہے، اس لیے ادھر ادھر کی نماز پڑھنے چلے آ رہے ہیں۔ دو آدمی ایک
درخت کے نیچے بیٹھے جن اور چڑیل کی باتیں کر کے وقت کاٹ رہے ہیں۔ ایک صاحب
نوجوان ہیں، مونٹے تازے دوسرے صاحب بڑھے ہیں، دبلے پتلے۔

بڑھے : تم تو دماغ کے کیڑے چاٹ گئے۔ بڑے کبی ہو۔ لاکھوں دفعہ سمجھایا کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے، مگر تمہیں تو کچے گھڑے کی چڑھی ہے تم کب سننے والے ہو۔

جوان : آپ بڑھے ہو گئے مگر بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ ارے صاحب بڑے بڑے عالم بڑے بڑے ماہر بھوتوں کے فائل ہیں۔ بڑھاپے میں آپ کی عقل بھی سٹھیا گئی! بڑھے : اگر آپ بھوت پریت لھا دیں تو ٹانگ کے راستے نکل جاؤں۔ میری اتنی عمر ہوئی کبھی کسی بھوت کی صورت نہ دیکھی۔ آپ ابھی کل کے لوٹے ہیں، آپ نے کہاں دیکھ لیا؟

جوان : روز ہی دیکھتے ہیں جناب! کون سا ایسا محلہ ہے جہاں بھوت اور چڑیل نہ ہوں؟ ابھی پرسوں کی بات ہے، میرے ایک دوست نے آدمی رات کے وقت دیوار پر ایک چڑیل دیکھی۔ بال بال موتی پرویے ہوئے، چوٹی کمر تک لٹکی ہوئی، ایسی حسین کہ پریاں جھک ماریں۔ وہ سناٹا مارے پڑے رہے منکے تک نہیں۔ مگر آپ کہتے ہیں جھوٹ ہے۔

بڑھے : جی ہاں، جھوٹ ہے، سراسر جھوٹ۔ ہمارا خیال وہ بلا ہے جو صورت بنا دے، چلا پھرا دے، باتیں کرتے سنا دے۔ آپ کیا جانیں ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش ہے۔ اور میاں کروڑ باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ میں بنا دیکھے نہ پتاؤں گا۔ لوگ بات کا جتنور اور سوئی کا بھالا بنا دیتے ہیں۔ ایک صحیح تو ننانوے جھوٹ، اور آپ ایسے ڈھمل یقین آدمیوں کا تو ٹھکانہ ہی نہیں۔ جو سنا، فوراً مان لیا۔ رات کو درخت کی پھنگی پر بندر دیکھا اور تھر تھرانے لگے کہ پریت جھانک رہا ہے۔ بولے اور گلا دوچا۔ ہلے اور شامت آتی۔ اندھرے گھپ میں تو یوں ہی انسان کا جی گھبراتا ہے۔ جو بھوت پریت کا خیال جم گیا تو ساری چوڑی بھول گئے۔ ہاتھ پاؤں سب پھول گئے۔ بلی نے میاؤں کیا اور جان نکل گئی۔ چوہے کی کھڑ بڑ سنی اور بل ٹھوٹنے لگے۔ اب جو چیز سامنے آئے گی پریت بن جائے گی۔ یہاں سب پا پڑ تیل چکے ہیں۔ کئی جن ہم نے اتارے، کئی چڑیلوں سے ہم نے محلے خالی کرائے۔ جہاں دس جوتے کھوپڑی پر جمائے اور پریت نے بغیر سنبھالا۔ یوں گپ اڑانے کو کہیے تو ہم بھی گپ بے پر کی اڑانے لگیں۔ یاد رکھو، یہ ادھے سیانے سب رنگے سیار ہیں۔ سب روٹی کما کھانے کے لٹکے ہیں۔ بندر نہ نچائے، مرغ نہ لڑائے، چنگ نہ اڑائے، بھوت پریت ہی جھاڑنے لگے۔

جوان: خیر اس تو تو میں میں سے کیا واسطہ؟ چلیے ہمارے ساتھ۔ کوئی دو تین کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے، وہاں ایک صاحب رہتے ہیں۔ اگر آپ کی کھوپڑی پر ان کے عمل سے بھوت نہ چڑھ بیٹھے تو مونجھ منڈوا ڈالوں۔ کہیے گا شریف نہیں چمار ہے۔ بس اب چلیے۔ آپ نے تو جہاں ذرا سی چڑھائی اور کہنے لگے کہ بھیر بیبر، دیوی دیوتا، بھوت پریت سب ڈھکوسلا ہے۔ لیکن آج ٹھیک بنائے جائیے گا۔

یہ کہہ کر دونوں اس گاؤں کی طرف چلے۔ میاں آزاد تو دنیا بھر کے بے فکرے تھے ہی شوق چرایا کہ چلو سیر دیکھ آؤ۔ یہ بھی پرانے خیالوں کے جانی دشمن تھے۔ کہاں تو نماز پڑھنے مسجد آئے تھے کہاں چھو چھکا دیکھنے کا شوق ہوا۔ مسجد کو دور ہی سے سلام کیا اور سیدھے سرائے چلے۔ ارے کوئی انکا کرایے کا ہوگا؟ ارے میاں کوئی بھیرا انکا بھاڑے کرے گا؟

بھیرا: جی ہاں، کہاں جائیے گا؟

آزاد: سک جلدی پور۔

بھیرا: کیا دیجیے گا؟

آزاد: پہلے گھوڑا انکا تو دیکھیں گھر گھوڑا نکاس مول؟

بھیرا: وہ کیا کمائی دار انکا کھڑا ہے اور یہ سرگ گھوڑی ہے ہوا سے باتیں کرتی جاتی ہے بیٹھے اور دن سے پہنچے۔

انکا تیار ہوا، آزاد چلے تو راستے میں ایک صاحب سے پوچھا۔ کیوں صاحب اس گاؤں کو سک جلدی پور کیوں کہتے ہیں؟ کچھ عجیب بے ڈھنگ سا نام ہے۔ اس نے کہا اس کا بڑا قصہ ہے۔ ایک صاحب شیخ جمال الدین تھے۔ انھوں نے گاؤں بسایا اور اس کا نام رکھا شیخ جمال الدین پورہ۔ منوار آدمی کیا جانیں انھوں نے شیخ کا سک، جمال کا جمل اور الدین کا دی بنا دیا۔

اچھے والے سے باتیں ہونے لگیں۔ اچھے والا بولا، حضور اب روزگار کہاں! صبح سے شام تک جو ملا کھاپی برابر۔ ایک روپیہ چالور کھا گیا، دس بارہ آنے گھر کے خرچ میں آئے، آنے دو آنے سلفے تماخو نہیں اڑ گئے۔ پھر موچی کے موچی۔ مہاجن کے بچیس روپے چھ مہینے سے بیباک نہ ہوئے۔ جو کہیں کچی میں چار پانچ کوس لے گئے تو پٹیاں حنسن گئیں، چھچی ہال، دھرا سب نکل گیا۔ دو چار روپے کے تھے گئی۔ روزگار تو تمھاری سلامتی سے تب ہو جب یہ ریل اڑ

جائے۔ دیکھیے آپ ہی نے سات گنڈے سک جلدی پور کے دیے مگر تین چکر لگا کر۔ کوئی پونے دو گھنٹے میں آزاد سک جلدی پور پہنچے۔ پتہ وہ تو ان کو معلوم تھا ہی۔ سیدھے شاہ صاحب کے مکان پر جا پہنچے۔ ٹھٹ کے ٹھٹ آدمی جمع تھے۔ عورت مرد ٹوٹے پڑتے تھے۔ ایک آدمی سے انھوں نے پوچھا، کیا آج یہاں کوئی میلہ ہے؟ اس نے کہا میلہ ویلہ نہیں، ایک مٹھی کے موڑ پر دیوی آئی ہیں، تون مہارو، من سیز و سب دیکھے آؤت ہیں۔ اسی جمنڈ میں آزاد کو وہ بوڑھے میاں بھی مل گئے، جو بھوت چڑیل کو ڈھکوسلا کہا کرتے تھے۔ اکیلے ایک طرف لے جا کر کہا جناب میں نے مسجد میں آپ کی باتیں سنی تھیں۔ قسم کھاتا ہوں، جو کبھی بھوت پریت کا قائل ہوا ہوں۔ اب ایسی کچھ تدبیر کرنی چاہیے کہ ان شاہ صاحب کی قلعی کھل جائے۔

اتنے میں شاہ صاحب نیلے رنگ کا تہہ باندھے، لمبے لمبے بالوں میں حنا کا تیل ڈالے، مانگ نکالے، کھڑاؤں پہنے تشریف لائے۔ آنکھوں میں تاج بھرا ہوا تھا۔ جس کی طرف نظر بھر کر دیکھا وہی کانپ اٹھا۔ کسی نے قدم لیے کسی نے جھک کر سلام کیا۔ شاہ صاحب نے غل چانا شروع کیا۔ دھونی میری جلتی ہے، جلتی ہے اور بلتی ہے، دھونی میری جلتی ہے۔ کھڑی مونچھوں والا ہے، لمبے گیسو والا ہے، میرا درجہ اعلیٰ ہے۔ جھوم جھوم کر جب انھوں نے یہ آواز لگائی تو سب لوگ سنائے میں آگئے۔ ایک ایک آپ نے اکڑ کر کہا کسی کو دعویٰ ہو تو آکر مجھ سے کشتی لڑے۔ ہاتھی کو ٹکر دوں، تو چنگھاڑ کر بھاگے، کون آتا ہے؟

اب نیٹے، پہلے سے ایک آدمی کو سکھا پڑھا رکھا تھا۔ وہ تو سدھا ہوا تھا یہی جھٹ سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور بولا ہم لڑیں گے۔ بڑا کڑیل جوان تھا، گینڈے کی سی گردن، شیر کا سینہ، مگر شاہ صاحب کی تو ہوا بندھی ہوئی تھی۔ لوگ اس پہلوان کی حالت پر افسوس کرتے تھے کہ بیدھا ہے، شاہ صاحب چٹکیوں میں چرمر کر ڈالیں گے۔

خیر دونوں آمنے سامنے آئے اور شاہ صاحب نے گردن پکڑتے ہی اتنی زور سے پٹکا کر وہ بے ہوش ہو گیا۔ آزاد نے بوڑھے میاں سے کہا جناب، یہ ملی بھگت ہے۔ اسی طرح گنوار لوگ موڑھے جاتے ہیں۔ میں ایسے مکاروں کی قبر تک سے واقف ہوں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شاہ صاحب نے پھر اکڑتے ہوئے آواز لگائی۔ کوئی اور زور لگائے گا؟ میاں آزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ لنگوٹ باندھ، چٹ سے کود پڑے۔ آؤ استاد، ایک پکڑ ہم سے بھی

ہو جائے۔ تب تو شاہ صاحب چکرائے کہ یہ اچھے بگڑے دل لے۔ پوچھا آپ انگریزی پڑھے ہیں؟ آزاد نے کڑک کر کہا انگریزی نہیں انگریزی کا باپ پڑھا ہوں۔ بس اب سنبھلیے، میں آگیا۔ یہ کہہ کر گھٹنا ٹیک کھاجنگ کے بیچ پر مارا تو شاہ صاحب چاروں خانے چت زمین پر دھم سے گرے۔ ان کا گرنا تھا کہ میاں آزاد چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اب بتاؤ بچہ، کات لوں ناک، کتر لوں کان، باندھوں دم میں مندا! بد معاش کہیں کا، بوڑھے میاں نے جھپٹ کر آزاد کو گود میں اٹھا لیا۔ واہ استاد، کیوں نہ ہو، شاہ صاحب اسی دن گاؤں چھوڑ کر بھاگے۔

شاہ صاحب کو بچگی دے کر اور گاؤں کے ذحل مل یقین گنواروں کو سمجھا بھا کر آزاد بوڑھے میاں کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں انھیں شاہ صاحب کی باتیں ہونے لگیں۔

آزاد: کیوں سچ کہیے گا کیسا اڑنگا دیا؟ بہت بلبلا رہے تھے۔ یہاں استادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ پورپور میں چھٹی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک پیچ کے دو سو توڑ یاد ہیں۔ میں تو اسے دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ یہ بنا ہوا ہے۔ لڑیتے کا تو کینڈا ہی اس کا نہ تھا۔ گردن موٹی نہیں چھاتی چوڑی نہیں بدن کٹا پٹا نہیں، کان ٹوٹے نہیں، تار گیا کہ گھامڑ ہے۔ گردن پکڑتے ہی دبا بیٹھا۔

بوڑھے میاں: اب اس گاؤں میں بھول کر بھی نہ آئے گا۔ ایک مرتبہ کا ذکر سنئے، ایک بنے ہوئے سدھ پاتھی مار کر بیٹھے اور گلے اکڑنے کہ کوئی چھپا کر ہاتھ میں پھول لے، ہم چٹکیوں میں بتا دیں گے۔ میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا اچھا میں نے پھول لیا، آپ بتلائیے تو سہی۔ پہلے تو آنکھیں نیلی پیلی کر کے مجھے ڈرانے لگے۔ میں نے کہا حضرت میں ان گیڈر بھمکوں میں نہیں آنے کا۔ یہ پتلیوں کا تماشا کسی نادان کو دکھاؤ۔ بس بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تھوڑی دیر تک سوچ ساچ کر بولے پیلا پھول ہے۔ میں نے کہا بالکل جھوٹ، تب تو گھبرائے اور کہنے لگے مجھے دھوکہ ہوا۔ پیلا نہیں ہرا پھول ہے۔ میں نے کہا واہ بھئی لال بھگو، کیوں نہ ہو۔ ہرا پھول آج تک دیکھا نہ سنا، یہ نیا گل کھلا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ ان کا گلاب سے چہرہ کھلا گیا۔ کوئی اس وقت ان کی بے کلی دیکھتا۔ میں جاے میں پھولا نہ سامتا تھا۔ آخر اتنے شرمندہ ہوئے کہ وہاں سے پتہ توڑ بھاگے۔ ہم یہ سب کھیل کھیلے ہوئے ہیں۔

آزاد: ایسے ہی ایک شاہ صاحب کو میں نے بھی ٹھیک کیا تھا۔ ایک دوست کے گھر گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فقیر صاحب شان سے بیٹھے ہوئے ہیں اور اچھے اچھے پڑھے لکھے آدمی انھیں گھیرے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا: آپ کی تعریف کیجیے، تو ایک صاحب نے جو اس پر ایمان لائے تھے، دبے دانتوں کہا شاہ صاحب غیب بندہ (تری کال درشی) ہیں۔ آپ کے کمالوں کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ دس پانچ نے تو انھیں آسمان ہی پر چڑھا دیا۔ میں نے دل میں کہا بچا تمھاری خبر نہ لی، تو کچھ نہ کیا۔ پوچھا کیوں شاہ جی یہ تو بتائیے ہمارے گھر میں لڑکا کب تک ہوگا؟ شاہ جی سمجھے یہ بھی زے چونکا ہی ہیں۔ چلو، انپ سناپ بتا کر الو بناؤ اور کچھ لے مرو۔ میرے باپ دادے اور ان کے باپ کے پردادے کا نام پوچھا۔ یہاں یاد کا یہ حال ہے کہ باپ کا نام تو یاد رہتا ہے، دادا جان کا نام کس گدھے کو یاد ہو۔ مگر خیر، جو زبان پر آیا اول جلول بتا دیا۔ تب فرماتے کیا ہیں، بچہ دو مہینے کے اندر ہی اندر بیٹا لے۔ میں نے کہا۔ جیسے شاہ صاحب ذرا سنہلے ہوئے۔ اب تو کہا اب نہ کہیے گا، پندرہ دن تو بندے کی شادی کو ہوئے اور آپ فرماتے ہیں کہ دو مہینے کے اندر ہی اندر لڑکا لے۔ واللہ، دوسرا کہتا تو خون پی لیتا۔ اس فقرے پر یار لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور شاہ جی کے ہواس غائب ہو گئے۔ دل میں کروڑوں ہی گالیاں دی ہوں گی۔ مگر میرے سامنے ایک نہ چلی۔ جناب اس دیار میں لوگ انھیں خدا سمجھتے تھے۔ شاہ جی کبھی روپے برساتے تھے، کبھی بے فصل کے میوے منگواتے تھے، کبھی گڑے کو چکنا چور کر کے پھر جوڑ دیتے تھے۔ سیکڑوں ہی السٹین یاد تھیں، میرا جواب سنا تو ہکا بکا ہو گئے۔ ایسے بھاگے کہ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔ جہاں میں ہوں بھلا کسی سدھ یا شاہ جی کا رنگ جم تو جائے۔

یہی باتیں کرتے ہوئے لوگ پھر اپنے اپنے گھر سدھارے۔

(18)

میاں آزاد ایک دن چلے جاتے تھے، تو دیکھتے کیا ہیں، ایک چوراہے کے کھڑ پر ہنگ والے کی دکان ہے اور اس پر ان کے ایک لنگوٹے یار بیٹھے ڈپک کی لے رہے ہیں۔ ہم نے جو خرچ کر ڈالا، وہ کسی کو پیدا کرنا بھی نصیب نہ ہوا ہوگا، لاکھوں کمائے، کروڑوں لٹائے، کسی کے دینے میں نہ لینے میں۔ آزاد نے جھک کر کان میں کہا واہ بھئی استاد کیوں نہ ہوا جھی لن

ترائیاں ہیں۔ بابا تو آپ کے عمر بھر برف بچا کیے اور دادا جوتے کی دکان رکھتے رکھتے بوڑھے ہوئے۔ آپ نے کمایا کیا، لٹایا کیا؟ یاد ہے، ایک دفعہ ساڑھے چھ روپے کی ٹھہری پانی مگر اس سے بھی ٹکالے گئے۔ اس نے کہا آپ بھی زبے گاودی ہیں۔ ارے میاں، اب گپ اڑانے سے بھی گئے؟ بھگ والے کی دکان پر گپ نہ ماروں تو اور کہاں جاؤں؟ پھر اتنا تو سمجھو کہ یہاں ہم کو جانتا کون ہے۔ میاں آزاد تو ایک سیلانی آدمی تھے ہی ایک تھائی پر تک گئے، دیکھتے کیا ہیں ایک درخت کے تلے سر کی کا جھنڈ پڑا ہے۔ ایک تخت بچا ہے، بھگ والا سل پر رگڑیں لگا رہا ہے۔ لگے رگڑا، منے جھڑا۔ دو چار بگڑے دل بیٹھے گل مچا رہے ہیں۔ داتا تیری دکان پر بن برے، ایسی چکا چک پلا جس میں جوتی کھڑی ہو۔ قصور سا دھتورا بھی رگڑ دو، جس میں خوب رنگ ہے۔ اتنے میں میاں آزاد کے دوست بول اٹھے، استاد آج تو دودھیا ڈلواد۔ پیتے ہی لے اڑیں۔ چلو میں آلو ہو جائیں۔ دکان والے نے انہیں ٹھنسی کیڑے سے بسی ہوئی بھگ پلائی۔ آپ بی چکے تو اپنے دوست ہرنج کو بھگ کا ایک گولا کھلایا اور پھر وہاں سے سیر کرنے چلے۔ انہیں مٹاپے کے سبب سے لوگ بھد بھد کہا کرتے تھے۔ چلتے چلتے ہرنج نے پوچھا، کیوں یار، یہ کون محلہ ہے؟

بھد بھد: چینی بازار۔

ہرنج: واہ، کہیں ہونہ، یہ چنیا بازار ہے۔

بھد بھد: چنیا بازار کیا، چینی بازار کیوں نہیں کہتے۔

ہرنج: ہم گلی گلی، کوپے کوپے سے واقف ہیں، آپ ہمیں راستہ بتاتے ہیں؟ چنیا بازار تو دنیا کہتی ہے، آپ کہنے لگے چینی بازار۔

بھد بھد: اچھا تو خبردار، میرے سامنے اب چنیا بازار نہ کہیے گا۔

ہرنج: اچھا کسی تیسرے آدمی سے پوچھو۔

آزاد نے دونوں کو سمجھایا، کیوں لڑے مرتے ہو؟ مگر سننا کون تھا۔ سامنے سے ایک آدمی چلا آتا تھا۔ آزاد نے بڑھ کر پوچھا، بھی یہ کون محلہ ہے؟ اس نے کہا چنیا بازار۔ اب ہرنج اور بھد بھد نے اسے دق کرنا شروع کیا۔ چینی بازار ہے یا چنیا بازار، یہی پوچھتے ہوئے آدھ کوس تک اس کے ساتھ گئے۔ اس بیچارے کو ان بھگڑوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ بار بار کہتا تھا کہ بھی دونوں صبح ہیں۔ مگر یہ ایک نہ سنتے تھے۔ جب سنتے سنتے اس کے کان

پک گئے تو وہ بچا رہ چکے سے ایک گلی میں چلا گیا۔
 تینوں آدمی پھر آگے چلے۔ مگر وہ مسئلہ حل نہ ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے
 تھے۔ پر دو میں سے ایک کو بھی یہ تسکین نہ ہوتی تھی کہ چٹا بازار اور چینی بازار میں کون سا بڑا
 فرق ہے۔

ہرنج: جانتے بھی ہو، اس کا نام چٹا بازار کیوں پڑا؟
 بھد بھد: جانتا کیوں نہیں، پہلے یہاں دساور سے چینی آکر بکا کرتی تھی۔
 ہرنج: تمہارا سر! یہاں چین کے لوگ آکر آباد ہو گئے تھے، جیسی سے یہ نام پڑا۔
 بھد بھد: گادوی ہو!

اس پر دونوں مکھ گئے۔ اس نے اس کو پنکا، اس نے اس کو پنکا۔ بھد بھد مونے تھے،
 خوب پٹے۔

آزاد نے ان دونوں کو یہیں چھوڑا اور خود گھومتے گھماتے جوہری بازار کی طرف جا
 نکلے۔ دیکھا ایک لڑکا جھکا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ آزاد نے لفافہ دور سے دیکھتے ہی خط کا مضمون
 بھانپ لیا۔ پوچھا۔ کیوں بھی اس گاؤں کا کیا نام ہے؟

لڑکا: دن کو تو ندھی تو نہیں ہوتی؟ یہ گاؤں ہے یا شہر؟
 آزاد: ہاں، ہاں وہی شہر۔ میں مسافر ہوں، سرائے کا پتہ بتا دیجیے۔
 لڑکا: سرائے کس لیے جانیے گا؟ کیا کسی بھٹیاری سے رشتہ داری ہے؟
 آزاد: کیوں صاحب، مسافروں سے بھی دل لگی۔ ہم ترجمہ کرتے ہیں، خط ہو عرضی ہو،
 درخواست ہو، اس کا وہ ترجمہ کر دیں کہ پڑھنے والا دنگ رہ جائے۔
 لڑکا: تب تو جناب آپ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ لو ہماری اس عرضی کا ترجمہ کر دو۔
 ایک چونی دوں گا۔

آزاد: خیر لائیے پٹنی کرلوں، عرضی پڑھیے۔
 لڑکا: آپ ہی پڑھ لیجیے۔
 آزاد: (عرضی پڑھ کر) سبحان اللہ، یہ عرضی ہے یا گھر کا دکھڑا۔ بھلا تمہارے کتنے
 لڑکے۔ لڑکیاں ہوں گی؟
 لڑکا: اجی، ابھی یہاں تو شادی ہی نہیں ہوئی۔

آزاد: تو پھر یہ کیا لکھ مارا کے سارے کنبے کا بھار میرے سر ہے۔ اور نوکری بھی کیا مانتے ہو کہ زمانے بھر کا کوڑا صاف کرنا پڑے۔ تڑکا ہوا اور پٹلس جھانکنے لگے، کبھی بنگیوں سے ٹھکرار ہو رہی ہے کبھی بنگیوں سے جھج رہی ہیں۔ ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے، پڑھو لکھو، جم کر محنت کرو، نوکری کی قصیں کیا فکر ہے؟

لڑکا: آپ عرضی لکھتے ہیں کہ صلاح بتاتے ہیں؟ میں تو آپ سے صلاح نہیں پوچھتا۔ آزاد: میاں، پڑھنے لکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نوکری ہی کر لے۔ اور نہیں تو پٹلس کا دارودہ ہی سہی۔ خاصے جوہری بنے ہو، ایسی کون سی مصیبت آپ ہی ہے کہ اس نوکری پر جان دیتے ہو؟

اتنے میں ایک لالہ صاحب قلم دان لیے عینک لگائے آکر بیٹھ گئے۔ آزاد: کہیے آپ کو بھی کچھ ترجمہ کرانا ہے؟ لالہ: جی ہاں، اس عرضی کا ترجمہ کر دیجیے۔ میرے بڑھاپے پر ترس کھائیے۔ آزاد: اچھا، اپنی عرضی پڑھیے۔

لالہ: سنئے

غریب پرور سلامت،

اپنا کیا حال کہوں، کوئی دو درجن تو بال بچے ہیں۔ آخر انھیں سیر سیر بھر آنا چاہیے یا نہیں۔ جوڑیے کتنا ہوا۔ اور جو یہ کہیے کہ سیر بھر کوئی لڑکا نہیں کھا سکتا تو جناب میرے لڑکے بچے نہیں ہیں، کئی کئی بچوں کے باپ ہیں۔ اس حساب سے 80 روپے کا تو آتا ہی ہوا۔ 10 روپے کی دال رکھیے بس میں اور کچھ نہیں چاہتا۔ مگر جو یہ کہیے کہ اس سے کم میں گزر کروں تو جناب یہ میرے کیے نہ ہوگا۔ روٹیوں میں خدا کا بھی سا جھانٹیں۔

میرے لیاقت کا آدمی اس دنیا میں تو آپ کو ملے گا نہیں، ہاں شاید اس دنیا میں مل جائے۔ بچے میں کھلا سکتا ہوں، بازار سے سودے لاسکتا ہوں، پیسے کے کان کٹر لوں تو سہی۔ قصے کہانیوں کا تو میں خزانہ ہوں۔ نت نئی کہانیاں کہوں۔ موقع آ پڑے تو جوتے صاف کر سکتا ہوں، میم صاحب اور بابا لوگوں کو گا کر خوش کر سکتا ہوں۔ غرض ہر فن مولا ہوں۔ پڑھا لکھا بھی ہوں۔ بد نصیبی سے ٹل پاس تو نہیں ہوں لیکن اپنے دستخط کر لیتا ہوں۔ جی چاہے امتحان لے لیجیے۔

’اب رسی خاندان کی بات، تو جناب کم ترین کے بزرگ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ میرے بڑے بھائی کی بیوی جسے پھوپھی کہتے ہیں اور جس سے مذاق کا بھی رشتہ ہے، اس کے باپ کے سر کے عجیرے بھائی نہر کے گلے میں 20 روپے سینے پر داروفہ تھے۔ میرے بابا جان میونسپلٹی میں صفائی کے جمع دار تھے اور 10 روپے مہینہ مشاہرہ پاتے تھے۔ چونکہ سرکار کا حکم ہے کہ اچھے خاندان کے لوگوں کی پرورش کی جائے اس لیے دو ایک بزرگوں کا ذکر کر دیا۔ ورنہ یہاں تو سبھی عہدہ دار تھے۔ کہاں تک گناؤں۔‘

’اب تو عرضی میں اور کچھ لکھنا نہیں باقی رہا۔ اپنی غرضی کا ذکر کر ہی دیا۔ لیاقت کی بھی کچھ تھوڑی سی چرچا کر دی اور اپنے خاندان کا بھی کچھ ذکر کر دیا۔

’اب عرض ہے کہ حضور جو ہمارے آقا ہیں میری پرورش کریں۔ اگر مجھ پر حضور کی نگاہ نہ ہوئی تو مجبور ہو کر مجھے اپنے بال بچوں کو مریچ کے ٹاپو میں بھرتی کر پڑے گا۔‘

میاں آزاد نے جو یہ عرضی سنی تو لونے لگے۔ اتنا ہنسے کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ جب ذرا ہنسی کم ہوئی تو پوچھا لالہ صاحب اتنا اور بتا دیجیے کہ آپ ہیں کون ٹھاکر؟

لالہ: جی، بندہ تو آگئی ہو تری ہے۔

آزاد: تو پھر آپ کے شریف خاندان ہونے میں کیا شک ہے۔ میاں آدمی بنو۔ جا کر باپ دادوں کا پیٹھ کرو۔ بھاڑ جھونکنے میں جو آرام ہے وہ غلامی کرنے میں نہیں۔ مجھ سے آپ کی عرضی کا ترجمہ نہ ہوگا۔

(19)

ایک دن میاں آزاد ساڑھی پر سوار ہو کر کھونٹے لٹکے تو ایک حمیڑ میں جا پہنچے۔ سیلانی آدمی تو تھے ہی حمیڑ دیکھنے لگے تو دقت کا خیال ہی نہ رہا حمیڑ بند ہوا تو بارہ بج گئے تھے مگر پہنچنا مشکل تھا۔ سوچا آج رات کو سرائے ہی میں پڑے رہیں۔ سوئے تو گھوڑے چل کر۔ بھیریاری نے آکر جگایا۔ امی اٹھو آج تو جیسے گھوڑے چل کر سوئے ہو، اے لودہ آٹھ کا گجر بجا، اگڑائیوں پر اگڑائیاں لے رہے ہیں مگر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔

ایک چنڈو باز بھی بیٹھے ہوئے تھے بولے۔ تو تم کو کیا پڑی ہے سونے نہیں دیتی۔ کیا جانے کس موج میں پڑے ہیں لہری آدمی تو ہی ہیں مگر بچ کہنا کیسا دعوات سیلانی ہے، دوسرا

اتنا گھوڑے تو بلکان ہو جائے اور جو جگانا ہی منظور ہے تو لوٹے کی ٹونٹی سے ذرا سا پانی کان میں چھوڑ دو۔ دیکھو کیسے کھل بلا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔

بھکاری نے چلو سے منہ پر چھینٹے دینے شروع کیے دس ہی پانچ بوندیں گری تھیں کہ آزاد ہائے ہائے کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے یہ کیا دل لگی ہے۔ کیسی میٹھی نیند سوراہا تھا لکے جگا دیا۔

بھکاری: اتنی رات تک کہاں گھومتے رہے کہ ابھی نیند ہی پوری نہیں ہوئی۔
آزاد: کہیں نہیں۔ ذرا تھمیز دیکھنے لگا تھا۔

چنڈو باز: سنا تماشا بہت اچھا ہوتا ہے آج ہمیں بھی دکھا دینا بھائی۔ تمھاری بدولت تو تھمیز تو دیکھ لیں۔ کئے بجے شروع ہوتا ہے۔
آزاد: یہی کوئی نو بجے۔

چنڈو باز: تو پھر میں چل چکا، نو بجے شروع ہو بارہ بجے ختم ہو کہیں ایک بجے گھر پہنچیں۔ محلے بھر میں آگ ڈھونڈیں حقہ بھریں تو اجمائیں، گھنٹہ بھر گزر گزائیں۔ چنگ پر پڑ جائیں تو نیند اچاٹ۔ کروٹوں پر کروٹیں لیں تب کہیں چار بجتے بجتے آنکھ لگے پھر بھٹے مانس جو چار بجے سوئے وہ دوپہر تک اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ لیجیے دن یوں گیا رات یوں گئی۔ اب انسان چنڈو کب سچے، داستان کب سنے، پینک حڑے کب اڑائے۔ کون جائے کیا گلابو، شتاہوں کے تماشے سے اچھا ہوتا ہوگا۔ ریتھ ہی والے ہی کا تماشا نہ دیکھیں؟ میاں اینٹھا سنگھ کے حڑے نہ اڑائے۔ بکری پر تنے بیٹھے ہیں چھینک پڑی اور کھٹ سے پھندی دار ٹوپی الگ۔ بھئی کوئی بیدھا ہو جو وہاں جائے اور پھر روپے کس کے گھر سے آئے؟ جب سے افیم سو روپے سیر ہوگئی تب سے تو غریبوں کا اور بھی دیوالہ نکل گیا اور چنڈو کے ٹھیکوں نے تو ستیاناس ہی کر دیا۔ سیانی تو شہر کا چوہا چوہا ہے مگر ٹکٹ کا نام نہ ہو اور بھی صاف تو یوں ہے کہ ہم لوگ مفت کے تماشے دیکھنے والوں میں سے ہیں۔ میلا ٹھیلا تو کوئی چھوٹے ہی نہیں پاتا۔ سادون بھر عیش باغ کے میلے نہ چھوڑیں کبھی ایلوں میں جھول رہے ہیں کبھی بندروں کی سیر دیکھ رہے ہیں۔ بہت کیا تو ایک گنڈے کے پوڑے لیے دو پیسے بڑھائے اور ساوک کی دکان پر دم لگایا۔ چلیے پانچ چھ پیسے میں میلا ہو گیا۔ سب سے بڑی معیبت تو یہ ہے کہ وہاں نادری حکم ہے کہ کوئی دھواں نہ اڑائے نہیں تو ہم سوچے تھے کہ چنڈو کا سامان لیتے چلیں گے

اور مرے سے کسی کو نے میں لیٹے ہوئے اڑاتے جائیں گے اس میں کسی کے باپ کا کیا
اجارہ۔

بھیران: بھئی۔ ٹکٹ معاف ہو جائے تو میں بھی چلوں۔
آزاد: ان کو کیا پڑی ہے بھلا جو بمبئی سے انگریز کھنگڑے لے کر اتنی دور بیگار بھگتتے آئیں۔
وہی بے ٹھکانہ بات کہتی ہو، اس کے سر نہ پیر۔
چنڈوباز: اچھا، تو تمہاری خاطر ہی سہی۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔ ایک دن ہم بھی چوٹی
گلائیں گے۔ تماشا ہوتا کہاں ہے؟

آزاد: یہی چھتر منزل میں، دس قدم پر۔
چنڈوباز: دس قدم کی ایک ہی کمی۔ تمہاری طرح یہاں کسی کے پاؤں میں سنچر تو ہے
نہیں۔ سات بجے سے چلنا شروع کریں، تو دس بجے پہنچیں۔ گھنٹی کرائے پر کریں، تو ایک
روپیہ آنے کا اور ایک روپیہ جانے کا اور ٹھک جائے۔ مفلسی میں آتا گیلا۔
آزاد: اجی، میری ساٹنی پر بیٹھ لینا۔

بھیران: مجھے بھی اسی پر بٹھا لینا۔ رات کا وقت ہے، کون دیکھتا ہے۔
شام ہوئی تو میاں آزاد نے ساٹنی کسی اور سرائے سے چلے۔ بھیران بھی پیچھے بیٹھ
گئی۔ مگر چنڈوباز نے ساٹنی کی صورت دیکھی، تو بیٹھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ جب ساٹنی نے
تیز چلنا شروع کیا، تو بھیران بولی، اس موٹی سواری پر خدا کی سنوار، اللہ کی قسم مارے ہچکولوں
کے ناک میں دم آگیا۔ آزاد کو شرارت سوجھی، تو ایک ایڑ لگائی۔ وہ اور بھی تیز ہو گئی۔ تب تو
بھیران آگ بھسوکا ہو گئی۔ یہ دل لگی رہنے دیجیے۔ مجھے بھی کوئی اور سمجھے ہو؟ میں لاکھوں
سناؤں گی۔ لو بس سیدھی طرح چلنا ہو تو چلو، نہیں میں جینتی ہوں۔ پیٹ کا پانی تک ہل گیا۔
ایسی سواری کو آگ لگے۔ میاں آزاد نے ذرا لگام کو کھینچا، تو ساٹنی بلبلائے لگی۔ بی بھیران
تو سمجھی کی اب جان گئی۔ دیکھو، یہ چمیز چھاڑ اچھی نہیں۔ ہمیں اتار دو، لو اور سنو، ذرا سے
ہچکولے میں منہ کے بل آ رہوں، تو چکنا چور ہی ہو جاؤں۔ تم مستندو کو اس کا کیا ڈر۔ روکو، روکو،
ہائے میرے اللہ، میں کس بلا میں پھنس گئی۔ میاں اپنے جدا سے ڈرو، بس ہمیں اتار ہی دو۔
اتفاق سے ساٹنی ایک درخت کی پر چھائیں دیکھ کر ایسی بھڑکی کہ دس قدم پیچھے ہٹ آئی۔
اس کا چکنا تھا کہ بی بھیران دم سے زمین پر گر پڑی۔ خدا کی مار۔ وہ تو کہو پکی سڑک نہ خشی

نہیں تو ہڈی پھلی چور چور ہو جاتی۔

چنڈو بازار: شاباش ہے تیری ماں کو، چکنی بھی کھائی، مگر وہی تیر۔ دوسری حیدار ہوتی تو لاکھ برس تک سوار ہونے کا نام نہ لیتی۔ سواری کیا ہے جنازہ ہے۔

بھیران: چیلے، آپ کی جوتی کی ٹوک سے۔ ہم بے حیا ہی سہی کیا جھانے دینے آئے ہیں۔ جس میں میں اتر پڑوں اور آپ مزے سے جم جائیں۔ منہ دھو رکھیے ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔

مگر اس جھیلے میں اتنی دیر ہو گئی کہ جب تھیز پہنچے تو تماشا ختم ہو گیا تھا۔ تماشائی لوگ باہر نکل رہے تھے۔

آزاد: لیجیے، سارا مزہ کر کر ا ہو گیا۔ اسی سے میں تم لوگوں کو ساتھ نہ لے آتا تھا۔ چنڈو بازار: عورتوں کو تو میلے ٹھیلے میں لے ہی نہ جانا چاہیے۔ ہمیشہ ایٹ ہوتی ہے۔ بھیران: جی ہاں، اور کیا میلے ٹھیلے تو آپ جیسے خراٹوں ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ آزاد تماشائیوں کی باتیں سننے لگے۔

ایک۔ یار، ان کے پاس سامان تو خوب لیس ہے۔

دوسرا۔ واہ کیا کہنا پردے تو ایسے کہ دیکھے نہ سنے۔ بس یہی یقین ہوتا ہے کہ بارہ دری کا پھانک ہے یا پری خانہ۔ جنگل کا سامان دکھایا تو وہی بتل بوٹے، وہی دوب، وہی پیڑ، وہی جھاڑیاں، بس، بالکل سندر بن معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا۔ اور سبز پری کی تعریف ہی نہ کرو گے؟

چوتھا۔ حضرت وہ کہیں لکھنؤ میں چھ مہینے بھی تعلیم پائے تو پھر آفت ہی ڈھائے۔ لاکھوں لوٹ لے جائے لاکھوں۔

دوسری طرف گئے تو دو آدمی اور ہی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

ایک۔ اجی دھوکہ ہے اور کچھ نہیں۔

دوسرا۔ ہاں، ٹن ٹن کی آواز تو آتی ہے باقی خیر صلاح۔

اب آزاد یہاں بیٹھ کر کیا کرتے۔ سوچا آؤ، ساڈنی پر بیٹھیں اور چل کر سرائے میں میٹھی نیند کے حرے لیں۔ مگر باہر آ کر دیکھتے ہیں تو ساڈنی غائب۔ تھیز کے احاطے میں ایک درخت سے باندھ دیا تھا۔ معلوم نہیں، تڑا کر بھاگی یا کوئی چرا لے گیا۔ بہت دیر تک ادھر ادھر

ڈھونڈا کیے۔ مگر ساٹھنی کا پتہ نہ لگا۔ ادھر اور سواریاں بھی تماشاویوں کو لے کر چلی گئیں۔ تب آزاد نے بھیارن سے کہا، اب تو پاؤں پاؤں چلنے کی ٹھہرے گی۔

بھیارن : نا صاحب، مجھ سے پاؤں پاؤں نہ چلا جائے گا۔
چنڈو باز : دیکھیے، کہیں کوئی سواری ملے تو لے آئیے۔ یہ بے چاری پاؤں پاؤں کہاں تک چلے گی؟

آزاد : تو تمہیں کیوں نہیں لپک جاتے؟
بھیارن (اللہ رکھی) اے ہاں اور کیا۔ چڑھنے کو تو سب سے پہلے تمہیں دوڑدے۔
تمہیں بات چیت کرنے کی بھی تمیز نہیں۔
آزاد : سواری نہ ملے گی ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لو، بات چیت کرتے کرتے چلے چلیں گے۔

دوسرے دن آزاد نے ساٹھنی کے کھونے کی تھانے میں رہٹ کر دی۔ مگر جس آدمی کو بھیجا تھا، اس نے آکر کہا حضور، تھانے دار نے رہٹ نہیں لکھی اور آپ کو بلایا ہے۔
آزاد : کون تھانے دار؟ ہم سے تھانے دار سے کیا واسطہ؟ ان سے کہو کہ آپ کو خود میاں آزاد نے یاد کیا ہے، ابھی حاضر ہوں۔

اللہ رکھی : لے، بس بیٹھے رہو۔ بہت ابڑہنا اچھا نہیں ہوتا۔ واہ، کہنے لگے ہم نہ جائیں گے۔ بڑے وہ بنے ہیں۔ آخر ساٹھنی کی رہٹ لکھوائی ہے کہ نہیں؟ پھر اب دوڑو دوپوگے نہیں تو بنے گی کیوں کر؟ اور وہاں تک جاتے کیا چوڑیاں ٹوٹتی ہیں، یا پاؤں کی مہندی گر جائے گی؟

آزاد : بھئی ہم سے تھانے دار سے ایک دن چچ چل گئی تھی۔ ایسا نہ ہو وہ کوتوالی کے چبوترے پر بیٹھ کر زعم میں آجائیں تو پھر میں لے ہی پڑوں گا۔ اتنا سمجھ لیتا، میں آدمی بات سننے کا روادار نہیں۔ ساٹھنی ملے یا جہنم میں جائے، اس کی پروا نہیں، مگر کوئی اینڈا بینڈا فقرہ سنایا اور میں نے کرسی کے نیچے پنکا۔ کیوں سنیں، چور نہیں کہ کوتوال سے ڈردوں، جواری نہیں کہ پیادے کی صورت دیکھتے ہی جان نکلے، بد معاش نہیں کہ منہ چھپاؤں، مریل نہیں کہ دو باتیں سہہ جاؤں۔ کوئی بولا اور میں نے تلواری نکالی۔ پھر وہ نہیں یا میں نہیں۔
اللہ رکھی : ارے، وہ بیچارہ تو ایک ہنس کھ آدمی ہے، لڑائی کیوں ہونے لگی۔

آزاد: خیر، تمہاری خوشی ہے تو چلتا ہوں، مگر چلو تم بھی ساتھ، راستے میں دو گھڑی دل لگی ہی ہوگی۔

آخر میاں آزاد اور اللہ رکھی دونوں تھانے چلے۔ ایک کانشیل بھی ساتھ تھا۔ راہ میں ایک آدمی اکڑتا ہوا جا رہا تھا۔ آزاد اس کا اکڑنا دیکھ کر آگ ہو گئے۔ قریب جا کر ایک دھنکا جو دیا تو اس نے پچاس لڑھکنیاں کھائیں۔ تھوڑی دور اور چلے تھے کہ ایک آدمی چادر بچھائے، اس پر جڑی بوٹی پھیلانے بیٹھا گپ اڑا رہا تھا۔ اس بوٹی سے اتنی برس کا بڑھا جوان ہو جائے، اس جڑی کو پانی میں گھس کر ایک تولا پیسے تو شیر کا پنجہ پھیر دے۔ آزاد اس کی طرف جھک پڑے، کیوں بھی کھلاڑی، یہ کیا سوانگ رچا ہے؟ آج کتنے عقل کے اندھے گانٹھ کے پورے جال میں پھنسے؟ یہ کہہ کر ایک ٹھوکر جو ماری تو ساری یونیاں، چٹیاں، جڑیں ایک میں مل گئیں۔ اور آگے چلے تو غل غپاڑے کی آواز آئی۔ ایک حلوائی گراہک سے تکرار کر رہا تھا۔

حلوائی: خالی بھجیا نا ہی بکت ہے ہماری دکان پر، کس کس دیتی بھلا۔

گراہک: ابے میں کہتا ہوں، کہیں ایک گدا نہ دوں۔

آزاد: گدا تو پیچھے دیجیے گا، میں ایک گدا کہیں آپ کی گدی پر نہ جماؤں۔

گراہک: آپ کون ہیں بولنے والے؟

آزاد: اس بیچارے حلوائی کو تم کیوں للکارتے ہو؟

اللہ رکھی: اے ہے، میاں تم کوئی خدائی فوج دار ہو؟ کسی کے پھٹے میں تم کون ہو پاؤں

ڈالنے والے؟

کانشیل: بھیا، یو بڑے لڑاکا، بس کاو کہوں۔

یہاں سے چلے، تو تھانے آپنچے۔

کانشیل: حضور، لے آیا وہ کھڑے ہیں۔

تھانے دار: اٹھا! اللہ رکھی بھی ہیں! میں تو چال ہی سے سمجھ گیا تھا۔ کچھ بیٹھنے کو دو

انھیں، کوئی ہے؟ سچ کہنا، تمہاری چال سے کیسے پہچان لیا۔

آزاد: اپنے اپنوں کو سبھی پہچان لیتے ہیں۔

تھانے دار: یہ کون بولا؟ کون ہے بھئی؟

اللہ رکھی: اے بس چلو، دیکھ لیا، منہ دیکھے کی محبت ہے۔ گھر کی تھانے داری اور اب

تک موتی ساٹنی نہ ملی۔ تم سے تو بڑی بڑی امیدیں تھیں۔

تھانے دار (آزاد سے) کہو جی، وہ ساٹنی تمہاری ہے نہ؟

آزاد: 'تم' کا جواب یہاں نہیں دیتے، 'آپ' کہیے، میں کوئی چرکتا ہوں۔

بھیارن: ہائے میرے اللہ، میں کیا کروں؟ یہ تو جہاں جاتے ہیں، دنگا بچاتے ہیں۔

تھانے دار: کیا کچھ ان سے ساٹھ گانٹھ ہے؟ سچ کہنا تمہیں قسم ہے اپنے شیخ صدو کی۔

اللہ رکھی: لو تمہیں معلوم ہی نہیں۔ اچھی تھانے داری کرتے ہو، میں تو ان کے گھر پڑ

گئی ہوں نہ۔

تھانے دار: تو یہ کہیے، لاؤ بھی، ساٹنی کا نجی ہاؤس سے نکلواؤ۔

ساٹنی آ موجود ہوئی۔ میاں آزاد سوار ہوئے۔ بھیارن بھی پیچھے بیٹھی۔

آزاد: آج تم کئی آدمیوں کے سامنے ہمیں اپنا میاں بنا چکی ہو مگر نہ جانا۔

اللہ رکھی: ذرا چونچ سنبالے ہوئے، کہیں ساٹنی پر سے ڈھکیل نہ دوں۔

اللہ رکھی کو یقین ہو گیا کہ آزاد مجھ پر رنجھ گئے۔ اب نکاح ہوا ہی چاہتا ہے۔ یوں ہی

بہت غرے کیا کرتی تھی، اب اور بھی غرے بگھارنے لگی۔ نو کا عمل ہو گیا تھا۔ چارپائی پر

دھوپ بھیلی ہوئی تھی، مگر مکر کیے پڑی ہوئی تھی۔ اتنے میں چندوباز آئے۔ آتے ہی پکارے۔

میاں آزاد، میاں آزاد!

اللہ رکھی: یہ آج کیا ہے یہاں خدا ہی خیر کرے۔ دس کا عمل اور ابھی تک کھنیا ہی پر

پڑے ہیں۔ کل رات کو تماشا بھی تو نہ تھا۔ (درخت کی طرف دیکھ کر اور ساٹنی بندھی ہوئی

پاکر) جیسی خوش خوش سو رہے ہیں۔ ارے میاں، کیا سانپ سونگھ گیا؟ یہ ماجرا کیا ہے؟ ہاں،

اللہ کہہ کر اٹھ تو بیٹھ میرے شیخ۔

آزاد: (انگھوائی لے کر) ارے کیا صبح ہو گئی؟

چندوباز: صبح گئی کھینے، آنکھ تو کھولو، اب کوئی دم میں بارہ کی توپ دعا چاہتی ہے دن

سے۔ دیکھنا، آج دن بھر سستی نہ رہے تو کہنا۔ وہ تو جہاں آدمی ذرا دیر کر کے اٹھا اور ہاتھ

پاؤں ٹوٹنے لگے۔ اب ایک کام کرو، سر سے نہا ڈالو۔

آزاد: کیا بک بک لگائی ہے سونے نہیں دیتا۔

اللہ رکھی چپکے چپکے سب سن رہی ہے، مگر اٹھتی نہیں۔ چندوباز اس کی چارپائی کی پٹی پر

جا بیٹھے اور بولے۔ اے اٹھ اللہ کی بندی، ایسا سونا بھی کیا؟ یہ کہہ کر آپ نے اس کے ہنکھرے ہوئے بال، جو زمین پر لٹک رہے تھے، سمیٹ کر چارپائی پر رکھے۔ ادھر میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی۔

چنڈوباز (گدگدا کر) اٹھو، میری جان کی قسم، وہ ہنسی آئی، وہ مسکرائی۔

آزاد: او گستاخ الگ ہٹ کر بیٹھ، ہمارے سامنے یہ بے ادبی۔

چنڈوباز: اوں ہوں، بڑے وارث علی خان بنے بیٹھے۔ بھی آخر تم کو بھی تو جگایا تھا،

اب ان کو جگانا شروع کیا، جھٹکتے کیوں ہو بھلا؟ میں تو سیدھا سادا بھولا بھالا آدمی ہوں۔

آزاد: جی ہاں، ہمیں تو کندھا پکڑ کر جگایا۔ یہ معلوم ہوا کہ چارپائی کو جوڑی جڑھی یا

بھونچال آگیا اور انھیں گدگدا کر جگاتے ہو، کیوں پچ؟

اللہ رکھی جاگی تو تھی ہی، کھلکھلا کر ہنس پڑی، اے ہٹ مردوے، یہ پلنگ پر آکر بیٹھ

جانا کیا مجھے کوئی وہ سمجھ رکھا ہے؟

چنڈوباز نے طیش کھا کر کہا۔ واہ واہ پلنگ کی اچھی کمی، رہیں جمونپڑوں میں اور خواب

دیکھیں مخلوں کا۔ کبھی بابا جان بھی پلنگ دیکھا تھا۔

اللہ رکھی: میاں مجھ سے یہ جلی کئی باتیں نہ کیجیے گا ذری۔ واہ ہم جمونپڑوں ہی میں رہتی

ہیں سہی اب تو ایک بھلے مانس کے گھر پڑنے والے ہیں۔ کیوں میاں آزاد، ہے نہ دیکھو مگر نہ

جانا۔

آزاد: واہ، مکر نے کی ایک ہی کمی، نیکی اور پوچھ پوچھ؟

اللہ رکھی: تس پر بھی تمہیں شرم نہیں آتی کہ اس اچکے نے مجھے ہاتھ لگایا اور تم منکر منکر

دیکھا کیے۔ دوسرا ہوتا تو مہنامتھ پچا دیتا۔

چنڈوباز: کیوں لڑوا تی ہو بھلا مفت میں؟ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہاں نکاح کی تیاریاں

ہو رہی ہیں۔

میاں آزاد ہاتھ منہ دھونے باہر گئے تو چنڈوباز اور اللہ رکھی میں یوں باتیں ہونے

لگیں۔

چنڈوباز: یار پھانسا تو بڑے مڈکو؟ اب جانے نہ دینا، ایسا نہ ہو نکل جائے۔ بھی قسم خدا

کی عورت کیا ویش کی گانٹھ ہے تو۔

اللہ رکھی : مگر تم بھی کتنے بے شعور ہو؟ اس کے سامنے آپ نے گدگدانا شروع کیا اب وہ کھٹکے کہ نہ کھٹکے؟ تمہاری جو بات ہے دنیا سے انوکھی، تاڑ سادہ بڑھایا مگر تمیز چھو نہیں گئی۔
چنڈوباز : اب تم سے جھگڑے کون؟ میں کسی کے دل کی بات تمھوڑے ہی پڑھا ہوں، مگر بھیجی پکی کر لو۔

اللہ رکھی : ہاں، پکی پوڑی ہونی چاہیے۔ کسی اچھے وکیل سے صلاح لو۔ وہ کون وکیل ہے جو کیت گھوڑے کی جوڑی پر نکتے ہیں، اجی دبی جو کھرو سے ہیں ابھی۔
چنڈوباز : وکیلوں کی نہ پوچھو، تیرہ سو ساٹھ ہیں۔ کسی کے پاس لے چلیں گے۔
اللہ رکھی : نہیں، واہ کسی بوڑھے وکیل کے یہاں تو میں نہ جاؤں گی۔ ایسی جگہ چلو جو جوان ہو، اچھی صلاح دے۔

چنڈوباز : اچھا، آج اتوار ہے، شام کو میاں آزاد سے کہنا کہ ہمیں اپنی بہن کے یہاں جانا ہے۔ بس ہم پھانک کے اس طرف دیکھے کھڑے رہیں گے، تم آنا، ہم تم چل کر سب معاملہ بھگتا دیں گے۔

اللہ رکھی : اچھا اچھا تمہیں خوب سوچھی۔
اتنے میں آزاد منہ ہاتھ دھو کر آئے تو اللہ رکھی نے کہا۔ ہمیں تو آج بہن کے یہاں نوتا ہے، کوئی کچی دو گھڑی میں آجاؤں گی۔
آزاد : ذرا سالی کی صورت ہمیں بھی تو دکھا دو۔ ایسا بھی کیا پردہ ہے، کہو تو ہم بھی ساتھ ساتھ چلے چلیں۔

اللہ رکھی : واہ میاں، تم تو انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے لگے۔ یہ کہہ کر اللہ رکھی کھڑی میں گئی اور سولہ سنگار کر کے نکلی، تو آزاد پھڑک گئے۔ پٹیاں جی ہوئی، گوری گوری ناک میں کالی کالی لوہنگ، پیارے پیارے کھڑے پر ہلکا سا گھونگھٹ، ہاتھوں میں کڑے، پاؤں میں چھڑے، چھم چھم کرتی چلی۔

چنڈوباز : ان کے سامنے چمک چمک کے باتیں کرنا، یہ نہیں کہہ جینے لگو۔
اللہ رکھی : مجھے اور آپ سکھائیں۔ چمکنا بھی کچھ سکھانے سے آتا ہے۔ میری تو بوٹی بوٹی یوں ہی پھڑکا کرتی ہے۔ تم چلو تو جو میری باتوں اور آنکھوں پر لٹو نہ ہو جائیں۔ تو اللہ رکھی نہیں۔ کچھ ایسا کروں کہ وہ بھی نکاح پر رضامند ہو جائیں، تو ان سے اور آزاد سے ذرا جوتی

چلے۔

دکیل صاحب اپنے باغ میں تخت پر بیٹھے دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ خدمت گار نے آکر کہا، حضور ایک عورت آئی ہے، کہتی ہے کچھ کہتا ہے۔

دوست: کیسی عورت ہے بھئی، جوان ہے یا کھٹ؟

خدمت گار: حضور، یہ تو دیکھنے سے معلوم ہوگا، مثل ہے ابھی جوان۔

دکیل: کبھی صبح آئے۔

دوست: واہ واہ، صبح کی ایک ہی کبھی، اچی بلاؤ بھی۔ ہمارے سر کی قسم، بلاؤ، کبھو ٹوپی تمہارے قدموں پر رکھ دیں۔

اللہ رکھی چمڑوں کو چم چم کرتی، عجب مستانی چال سے اٹھاتی بوٹی بوٹی پھڑکاتی ہوئی آئی۔ جس نے دیکھا پھڑک گیا۔ سب رتھیلے بگڑے دل بے فکرے جمع تھے۔ ایک صاحب نواب تھے، دوسرے صاحب فشی، آپس میں مذاق ہونے لگا۔

نواب: بندگی عرض ہے۔ خدا کی قسم آپ ایک ہی نیاریے ہیں۔

فشی: بھئی، صورت سے تو بھلے مانس معلوم ہوتے تھے، لیکن ایک ہی رسیا نکلے۔

دکیل: بھئی، اب ہم کچھ نہ کہیں گے، اور کہیں کیا، چھا گئی۔ بی صاحب آپ کس کے پاس آئی ہیں؟ کہاں سے آتا ہوا؟

اللہ رکھی: اب ایسی اجیرن ہو گئی۔

دکیل: نہیں نہیں، واہ بیٹھو، ادھر تخت پر آؤ۔

اللہ رکھی: ہاں، بنائیے، ہم تو سیدھے سادے ہیں صاحب

نواب: آپ بھولی ہیں بجا ہے۔

دکیل: عورت ہے یا پرستان کی پری۔

نواب: رتھکے رتھکے لو بی اب پو بارہ ہیں۔

اللہ رکھی: حضور، ہم یہ پو بارہ اور تین کانے تو جانتے نہیں، ہمارا مطلب نکل جائے، تو آپ سب صاحبوں کا منہ میٹھا کر دیں گے۔

دوست: آپ کی باتیں یہی کیا کم میٹھی ہیں۔

احسن میں چند و باز بھی آ پیچھے۔

چنڈوباز : حضور تو انھیں جانتے نہ ہوں گے، یہ اللہ رکھی ہیں۔ ان کا نام دور دور تک روشن ہے۔

وکیل : ان کا کیا، ان کے سارے خاندان کا نام روشن ہے۔

چنڈوباز : سرائے میں ایک آزا نامی جوان آکر ٹھہرے ہیں۔ وہ ان کے اوپر جان دیتے ہیں اور یہ ان پر مرتی ہیں۔ کئی آدمیوں کے سامنے وہ قبول چکے ہیں کہ ان کے ساتھ نکاح کریں گے۔ مگر آدمی ہیں رنگیلے، ایسا نہ ہو کہ انکار کر جائیں۔ بس، ان کی یہی عرض ہے کہ حضور کوئی ایسی تدبیر بتائیں کہ وہ نکل نہ سکیں۔

اللہ رکھی : مجھ غریبی سے کوئی چھپن نکلے تو آپ کو ملے نہیں ہیں۔ رہا، اتنا ثواب کیجیے جس میں یہ شکنجے میں جکڑ جائیں۔

منشی : اگر نکاح ہی کرنے کا شوق ہے تو ہم کیا برے ہیں؟

وکیل : ایک تھیں کیا، یہاں سب جھنڈے تلے کے شہدے چھنے ہوئے لپے جمع ہیں۔ جس کو یہ پسند کریں اسی کے ساتھ نکاح ہو جائے۔

اللہ رکھی : حضور لوگ تو مجھ سے دل لگی کرتے ہیں۔

وکیل : اچھا، کل آؤ تو ہم تھیں وہ ترکیب بتائیں کہ تم بھی یاد کرو۔

اللہ رکھی : مگر بندی نے کبھی سرکار دربار کی صورت دیکھی نہیں۔ آپ وکالت کیجیے گا؟
منشی : ہاں جی ہاں، اس میں منت ہی کیا ہے، مگر جانتی ہو یہ وکیل تو روپے کے آشنا ہیں۔

اللہ رکھی : واہ، روپیہ یہاں اللہ کا نام ہے، ہم ہیں چاہے بیچ لو۔

وکیل : اچھا، کل آؤ، پہلے دیکھو تو وہ کیا کہتے ہیں۔

اللہ رکھی اب یہاں سے اٹھنا چاہتی تھی مگر اٹھے کیسے۔ کنکلیوں سے چنڈوباز کی طرف دیکھا کہ اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ وہ بھی اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بولے اے حضور ذرا گھڑی کو تکلیف دیجیے گا دیکھیے تو کیسے بچے ہوں گے۔

اللہ رکھی : میں انکل سے کہتی ہوں، کوئی بارہ بجے ہوں گے۔

چنڈوباز : میں بھی کہوں، یہ جمائیوں پر جمائیاں کیوں آ رہی ہیں۔ نشے کا وقت ٹل گیا۔
طلوایوں کی دکانیں بھی بڑھ گئی ہوں گی۔ ملائی سے بھی گئے۔ حضور، اب تو رخصت کیجیے، اب

تو چندو کی لو لگی ہے، آج سویرے سویرے آزاد کی منہوں صورت دیکھی تھی، جیسی یہی حال ہوا۔
 اللہ رکھی : لے خبردار، اب کی کہا تو کہا اب آزاد کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں،
 زبان کھینچ لوں گی۔ ناحق کسی پر چھدا رکھنا اچھا نہیں۔

نواب : ارے بھئی کوئی ہے، دیکھو دوکانیں بڑھ نہ گئی ہوں تو ان کو یہیں چندو پلوا
 دیں۔ ذرا دو گھڑی اور بی اللہ رکھی سے صحبت گراموں۔

خدمت گار : جانے کو کہیے میں جاؤں، مل دکانیں کب کی بڑھ گئی ہیں۔ بازار بھر میں
 سناٹا پڑا ہے، چڑیاں جن گن تک سو رہی ہیں۔ اب کوئی دم میں چکیاں چلیں گی۔
 اللہ رکھی : اے کیا آدھی رات ڈھل گئی؟ لے اب تو بندی رخصت ہوتی ہے۔
 خشی : واہ اس اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتی کہاں جاؤ گی۔

اللہ رکھی : نہیں حضور، اب آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ بس اب رخصت حضور بھولے گا
 نہیں، اتنی دیر مزے سے باتیں کی ہیں یاد رکھیے گا لونڈی کو۔
 خشی :

وہ ہنستے آئے، یہاں سے ہمیں رلا کے چلے
 نہ بیٹھے آپ مگر درد دل اٹھا کے چلے

دکیل :

دکھا کے چاند سا مکھڑا چھپایا زلفوں میں
 دو جگی ہم کو زمانے کی وہ دکھا کے چلے

نواب :

نہ تھا جو کوپے میں اپنا قیام منظر
 تو میرے بعد میری خاک بھی اڑا کے چلے
 خدا کے لیے اتنا تو اقرار کرتی جاؤ کہ کل ضرور ملیں گے، ہاتھ پر ہاتھ مارو۔
 اللہ رکھی : آپ، لوگوں نے کیا جادو کر دیا، اب رخصت کیجیے۔

دکیل :

یہ بھی کوئی ہنسی ہے کہ رخصت کا لے کے نام
 سو بار بیٹھے بیٹھے ہمیں تم رلا چلے

نواب :

آنکھوں آنکھوں میں لے گئے وہ دل

کالوں کالوں ہمیں خبر نہ ہوئی۔

اللہ رکھی یہاں سے چلی تو راہ میں ڈیک مارنے لگی۔ کیوں سب کے سب ہماری چھوٹی پر لوٹ گئے نہ؟ یہاں تو فقیر کی دعا ہے کہ جس محفل میں بیٹھ جاؤں وہیں کٹاؤ ہونے لگے۔

دونوں سرائے میں پہنچے تو دیکھا آزاد جاگ رہے ہیں۔

اللہ رکھی : آج کیا ہے کہ پلک تک نہ جھپکی؟ یہ کس کی یاد میں غیند اچاٹ ہے؟

آزاد : ہاں ہاں جلاؤ دو دو بجے تک ہوا کھاؤ اور ہم سے آکر باتیں بناؤ۔

اللہ رکھی : اے واہ یہ شک تب تو میزان مٹ چکی۔ اب ان کے مارے کوئی بھائی بہن

چھوڑ دے۔ اب یہ بتاؤ کہ نکاح کو کون دن ٹھیک کرتے ہو؟ ہم آج سب سے کہہ آئے کہ میاں آزاد کے گھر پڑیں گے۔

آزاد : کیا جیج تم سب سے کہہ آئی؟ کہیں ایسا کرنا بھی نہیں۔ میں دل لگی کرتا تھا۔

خدا کی قسم فقط دل لگی ہی تھی۔ میں پردہ کی آدمی، شادی بیاہ کرتا پھروں گا اور بھٹیاریں سے؟ مانا کہ تم ہو پری مگر پھر بھٹیاریں ہی تو، چار دن کے لیے سرائے میں آکر کھکے، تو یہاں سے یہ بلا لے جائیں۔

اللہ رکھی : اے چونچ سنہال مردوئے! اور سینے گا ہم بلا ہیں جس پر سارے شہر کی نگاہ پڑتی ہے دوسرا کہتا تو خون خرابہ کر ڈالتی۔ مگر کروں کیا، قول ہار چکی ہوں۔ برادری بھر میں کلنک کا ٹیکہ لگے گا۔ بلا کی اچھی کہی تمہارے منہ سے میری ایڑی گوری ہے، چاہے ملا لو۔

آزاد : تو بی صاحبہ سینے کس کی شادی اور کس کا بیاہ۔

اللہ رکھی : ان باتوں سے نہ نکلنے پائیے گا۔ کل ہی تو میں نالش داغتی ہوں۔ اقرار

کر کے کر جانا کیا خالہ جی کا گھر ہے؟ میاں میں جو اپنی دالی پر آئی، تو بڑا گھر ہی دکھاؤں گی۔ کسی اور بھروسے نہ بھولنا، مجھ سے برا کوئی نہیں۔

آزاد : خدا کی پناہ، میں اب تک سمجھتا تھا کہ میں ہی بڑا گھماکھ ہوں، مگر اس عورت نے

میرے بھی کان کانٹے۔ بھلا دی ساری چوڑی، خدا تر کا جلدی سے ہو تو میں دوسری کٹھری لوں۔

اللہ رکھی (ناک پر انگلی رکھ کر) رو دے رو دے، اس سے چھوکری ہی ہوئے ہوتے، تو کسی بھلے مانس کا گھر بستا۔ بھلا مجال پڑی ہے کہ کوئی بھٹیاری نکائے؟
 آزاد: تو سارے شہر بھر میں آپ کا راج ہے کچھ؟
 اللہ رکھی: جی ہے جی ہے، کیا ہنسی ٹھٹھا ہے؟ کل پرسوں تک آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

آزاد: چلیے آپ کی بلا سے۔
 چنڈوباز: بلا دلا کے بھروسے نہ رہیے گا۔ دو چار دن تاتھیا مجھے گی۔
 آزاد: ذری آپ چپکے بیٹھے رہیے گا۔ یہ تو کاہنی ہیں، لیکن تمھاری مفت میں شامت آجائے گی۔

چنڈوباز: میرے منہ نہ لکھے گا، اتنا کہے دیتا ہوں۔
 آزاد نے اٹھ کر دو چار چائے جڑ دیے۔ اللہ رکھی نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اللہ کرے ہاتھ ٹوٹیں، لے کے غریب کو پیٹ ڈالا۔
 چنڈوباز: میری بھی تو دو ایک پڑ گئی جی۔
 اللہ رکھی: اے چپ بھی رہ، بولنے کو مرتا ہے۔
 اس طرح لڑ جھگڑ کرتیوں سوئے۔

(20)

دوسرے دن سویرے آزاد کی آنکھ کھلی تو دیکھا ایک شاہ جی ان کے سرہانے کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ شاہ جی کے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے، جو اللہ رکھی کو دعائیں دے رہا ہے۔ آزاد نے سمجھا کوئی فقیر ہے، جھٹ اٹھ کر ان کو سلام کیا۔ فقیر نے مسکرا کر کہا۔ حضور میرا انعام ہوا۔ سچ کہیے گا ایسے بہوروپے کم دیکھے ہوں گے، آزاد نے دیکھا غچا کھا گئے، اب بنا انعام دیے گلا نہ چھوٹے گا۔ بس اللہ رکھی کی بھڑکیلی دلائی اٹھا کر دے دی۔ بہوروپے نے دلائی لی جھک کر سلام کیا اور لہا ہوا۔ لوٹے نے دیکھا کہ میں ہی رہا جاتا ہوں۔ بڑھ کر آزاد کا دامن پکڑا۔ حضور ہمیں کچھ بھی نہیں؟ آزاد نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر پھینک دیا۔ تب اللہ رکھی چمک کر آگے بڑھی اور بولی ہمیں؟

آزاد: تمہارے لیے جان حاضر ہے۔

چنڈوباز: یہ سب زبانی داخل ہے۔ بی بی کو یہ خبر ہی نہیں کہ دلائی انعام میں چلی گئی۔
اٹنے چلی ہیں مانگتے۔ یہ تو نہ ہوا کہ چاندی کے چمڑے بنوا دیئے، یا کسی دن ہی کو دو چار
روپے دے ڈالتے۔ جاؤ میاں بس تم کو بھی دیکھ لیا، گو کے یار ہو، چمڑی جائے دمڑی نہ
جائے۔

اللہ رکھی: کہیں تیرے سرگرمی تو نہیں چڑھ گئی۔ ذرا چندیا کے پنے کتر وا ڈال۔ یہ چمڑی
اور دمڑی کا کون موقع تھا۔ یہ بتائیے اب نکاح کی کب تیاریاں ہیں؟
آزاد: ابھی نکاح کی امید آپ کو ہے؟ واللہ کتنی بھولی ہو۔
اللہ رکھی: تو کیا آپ نکل بھی جائیں گے؟ ایسے میں تو چڑھوں گی عدالت، کہہ کر مکر جانا
کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔

آزاد: تو کیا نالاش کیجیے گا؟

اللہ رکھی: کیوں، کیا کوئی شک بھی ہے؟ ہم کیا کسی کے دہل ہیں؟
چنڈوباز: اور گواہ کو دیکھ رکھے۔ دلائی کیا جھپ سے اٹھا دی۔ پرانی دلائی کے آپ کون
دینے والے تھے؟ ابی میں تو وہ وہ سوال جواب کروں گا کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔
آزاد: اچھی بات ہے، یہ شوق سے نالاش کریں اور آپ گواہی دیں۔ انھیں تو کیا کہوں
پر تمہیں سمجھوں گا۔

چنڈوباز: مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجیے گا نہیں تو پھر گدا ہی دوں گا۔

اللہ رکھی: چل ہٹ، بڑا آیا وہاں سے گدا دینے والا، ابھی میں چمٹ جاؤں تو چیخنے
لگے، اس پر گدا دیں گے۔

آزاد: تو پھر جائیے وکیل کے یہاں دیر ہو رہی ہے۔

اللہ رکھی: تو کیا سچ مچ تمہیں انکار ہے؟ میاں آنکھیں کھل جائیں گی۔ جب سرکار کا
پیادا آئے گا تو بھاگنے کو جگہ نہ ملے گی۔

چنڈوباز: یہ ہیں شہدے، یوں نہیں ماننے کے۔ چلوں چلیں، دن چڑھتا آتا ہے۔ ابھی
کٹکھی چوٹی میں تمہیں گھنٹوں لگیں گے اور وہ سرکاری درباری آدمی ٹھہرے۔ موکل صبح شام
گھیرے رہتے ہیں۔ جب دیکھو، گھیاں، غم، غم، فتن، جوڑی، گاڑی، ہاتھی، گھوڑے، پالکی، اکے،

تانگے، یاو، فنس، معانے دروازے پر موجود۔

آزاد: کیا اور کسی سواری کا نام یاد نہیں تھا؟ آج سرور خوب گھنٹے ہیں۔

چنڈوباز: اجی یہاں اللہ رکھی کی بدولت روز ہی سرور گھنٹے رہتے ہیں۔

اللہ رکھی نے کوٹھری میں جا کر سنگار کیا اور نکھر کر چلی تو آزاد کی نگاہ پڑ ہی گئی۔ چار آنکھیں ہوئیں تو دونوں مسکرا دیے۔ چنڈو نے یہ شعر پڑھا۔

ان کو دیکھا تو یہ ہنس دیتے ہیں

آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی

اللہ رکھی ایک ہری ہری چھتری لگائے چھم چھم کرتی چلی۔ بگڑے دل آوازیں کتے تھے، پر وہ کسی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی تھی۔ چنڈوباز 'ہنو پجو' کرتے چلے جاتے تھے۔ ذری ہٹ جانا سامنے سے۔ اس کیا پھکڑا آتا ہے، کیوں ہٹ جائیں؟ اخواہ، یہ کہیے آپ کی سواری آرہی ہے۔ لو صاحب ہٹ گئے۔ ایک رسیا نے پیچھا کیا۔ یہ لوگ آگے آگے چلے جا رہے ہیں اور میاں رسیا پیچھے پیچھے غزلیں پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ چنڈوباز نے دیکھا کہ یہ اچھے بگڑے دل ملے۔ ساتھ جو ہوا تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ آپ ہیں کون؟ یا آگے بڑھیے یا پیچھے چلیے۔ کسی بھلے مانس کو ستاتے کیوں ہیں؟ اس پر اللہ رکھی نے چنڈوباز کے کان میں چپکے سے کہا، یہ بھی تو شکل صورت سے بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے۔

چنڈوباز: آپ تو وکیل کے پاس چلتی تھیں، کہاں اس سڑی سودا کی سے سانٹھ گانٹھ کرنے کی سوچی۔ سچ ہے، حسینوں کے مزاج کا ٹھکانہ ہی کیا۔ بولے اجی صاحب ذری ادھر گلی میں آئیے گا، آپ سے کچھ کہنا ہے۔

رسیا: واہ، نیکی اور پوچھ پوچھ

تینوں گلی میں گئے، تو اللہ رکھی نے کہا، کہیں تمہارے مکان بھی ہیں؟ یہاں اس گھیارے میں کیا کہوں، کوئی آوے کوئی جاوے، کھڑے کھڑے باتیں ہوا کرتی ہیں۔

چنڈوباز نے سوچا کہ دوسرا گل کھلا چاہتا ہے۔ پوچھا میاں تمہارا مکان یہاں سے کتنی دور ہے؟ جو کالے کوسو ہو، تو میں لپک کر بٹھی کرائے کرلوں۔ ان سے اتنی دور نہ چلا جائے گا۔ ان کو تو مارے نزاکت کے چھتری ہی کا سنبھالنا بھاری ہے۔

رسیا: نہیں صاحب، دور نہیں ہے، بس کوئی دس قدم آئیے۔ رسیا نے چھتری لے لی اور

خدمت گار کی طرح چھتری لگا کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چنڈوباز نے دیکھا، اچھا گاودی ملا۔ خود بھی چھتری کے سائے میں رئیس بنے ہوئے چلنے لگے۔ تھوڑی دیر میں رسیا کے مکان پر آ پہنچے۔

رسیا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
یہاں تو سچے عاشق ہیں۔ جس کو دل دیا اس کو دیا۔ جان جائے، مال جائے، عزت جائے، سب منظور ہے۔

چنڈوباز: اچھا اب ان کا مطلب سنئے۔ یہ پیاری ابھی اٹھارہ انیس برس کی ہوں گی۔ ابھی کل تو پیدا ہوئی ہیں۔ اب سنئے کہ ان کے میاں ان سے لڑ جھگڑ کر حیدر آباد بھاگ گئے۔ وہاں کسی کو گھر میں ڈال لیا۔ اب یہ اکیلی ہیں، ان کا جی گھبراتا ہے اتنے میں ایک شوقین رئیس سرائے میں اترے، بڑے خوبصورت کلمے ٹھلے کے جوان ہیں۔
اللہ رکھی: میاں آنکھیں تو ایسی ریلی کہ دیکھی نہ سنی۔

چنڈوباز: اے تو مجھی کو اب کہنے دو۔ تم تو بات کاٹے دیتی ہو۔ ہاں تو میں کہتا تھا کہ ان کی ان کی آنکھیں چار ہوئیں تو ادھر یہ ادھر وہ، دونوں گھائل ہو گئے۔ پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوا کیں۔ پھر کل کے صاف کہہ دیا کہ ہم تم کو بیاہیں گے۔ پھر نہ جانے کیا سمجھ کر مکر گئے۔ اب ان کا ارادہ ہے کہ ان پر نالش ٹھونک دیں۔

رسیا: اجی ان کو بھاڑ میں جھونکیں، جو بیاہ ہی کرتا ہے تو ہم سے نکاح پڑھواؤ ان کو دھتا بتاؤ۔

اللہ رکھی: سچ کہوں تم مردوں کا ہمیں اعتبار دمری بھر بھی نہیں رہا۔ اب جی نہیں چاہتا کہ کسی سے دل ملائیں۔

رسیا: تم نے ہمیں ابھی پہچانا ہی نہیں۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہم شریف زادے ہیں۔

اللہ رکھی: لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اللہ رکھی بڑی خوش نصیب ہے۔ مگر میاں میں کس سے کہوں دل کا حال کوئی کیا جانے۔

چنڈوباز: یہی دیکھیے عرضی دعویٰ ہے۔

ریا: ارے یہ کس پاگل نے لکھا ہے جی؟ ایسا بھلا کہیں ہو سکتا ہے کہ سرکار آزاد سے تمہارا نکاح کروا ہی دے؟ ہاں اتنا ہو سکتا ہے کہ ہرجانہ دلوا دے۔ پر اس کا ثبوت بھی ذرا مشکل ہے۔

اللہ رکھی: اجی ہوگا بھی، مسودہ پھاڑ ڈالو۔ آزاد سے اب مطلب ہی کیا رہا؟
ریا: ہم بتائیں نالٹس تو داغ دو ہرجانہ ملا تو ہرج ہی کیا ہے۔ باقی بیاہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ ادھر تم نے مقدمہ جیتا ادھر ہم بارات لے کر آئے۔
اللہ رکھی: تو چلو تم وکیل کے یہاں تک چلے چلو نہ
ریا: ہاں، ہاں، چلو۔

تینوں آدمی وکیل کے یہاں پہنچے۔ لیکن بڑی دیر تک باہر ہی ٹاپا کیے۔ یہ نہیں آئے وہ امیر آئے۔ کبھی کوئی مہاجن آیا۔ بڑی دیر کے بعد ان کی طلبی ہوئی، مگر وکیل صاحب دیکھتے ہیں تو اللہ رکھی کا منہ اترا ہوا ہے، نہ وہ چمک دک ہے نہ وہ مسکرانا اور لہانا، پوچھا آخر ماجرا کیا ہے؟ آج اتنی ادس کیوں ہو؟ کہاں وہ چھوی تھی، کہاں یہ اداسی چھائی ہوئی ہے؟ اللہ رکھی نے اس کا تو جواب کچھ نہ دیا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسو کا تار بندھ گیا۔ وکیل سنانے میں۔ آج یہ کیا ماجرا ہے، ان کی آنکھوں میں آنسو۔

چنڈوباز: حضور، یہ بڑی پاک دامن ہیں۔ جتنی ہی چنچل ہیں اتنی ہی سمجھ دار۔ میرا خدا گواہ ہے بری راہ چلتے آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی پاک دامنی کی قسم کھانی چاہیے۔ اب یہ فرمائیے مقدمہ کیسے دائر کیا جائے۔

ریا: جی ہاں، کوئی اچھی تدبیر بتائیے زبردستی شادی تو ہو نہیں سکتی۔ اگر کچھ ہرجانہ ہی مل جائے، تو کیا برا؟ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، کچھ تو لے ہی مرے گی۔

چنڈوباز: مرے ان کے دشمن، آپ بھی کتنے پھوہڑ ہیں واہ۔
وکیل: اچھا یہ تو بتائیے کہ وہ رئیس کہاں سے آئیں گے، جو کہیں کہ ہم سے اور ان سے بیاہ کی ٹھہری تھی؟

ریا: اب بتائی دوں، بندہ ہی کہے گا کہ ہم سے مہینوں سے بات چیت ہے۔ آزاد بیچ میں کود پڑے، واللہ وہ وہ جواب دوں کہ آپ بھی خوش ہو جائیں۔

دکیل : واہ تو پھر کیا پوچھنا، ہم آپ کو دو ایک چکلے بتا دیں گے کہ آپ فرانے بھرنے لپکے گا۔ مگر دو ایک گواہ تو ٹھہرا لیجیے۔

چندوباز : ایک گواہ تو میں ہی بیٹھا ہوں فرانے باز۔

خیر، تینوں آدمی کچہری پہنچے۔ جس پہڑ کے نیچے جاکر بیٹھے وہاں میلا سا لگ گیا۔ کچہری بھر کے آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ دھکم دھکا ہو رہا ہے۔ چندوباز وارث علی خاں بنے بیٹھے حقہ گزرگزار رہے ہیں۔ جاؤ بھئی، اپنا کام کرو، آخر یہاں کیا میلا ہے، کیا بھیڑیا دھسان ہے۔ ایک۔ آپ لائے ہی ایسی ہیں۔

دوسرا۔ اچھا، ہم کھڑے ہیں، آپ کا کچھ اجارہ ہے؟ واہ اچھے آئے۔

تیسرا۔ بھائی ذرا ہنس بول لیں آخر مرنا تو ہے ہی

جب ایک بجا تو بی اللہ رکھی اٹھاتی ہوئی سوال دینے چلیں۔ چندوباز ایک ہاتھ میں حقہ لیے ہیں دوسرے میں چھتری۔ خدمت گار بنے چلے جاتے ہیں۔ لوگ ادھر ادھر جھنڈ کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ پر کوئی بتاتا نہیں کہ عرضی کہاں دی جاتی ہے۔ ایک کہتا ہے داسے ہاتھ جاؤ دوسرا کہتا ہے بائیں بائیں۔ بڑی مشکل سے اجلاس تک پہنچیں۔

ادھر آزاد پڑے پڑے سوچ رہے تھے کہ اس بے فکری کا کہیں ٹھکانا ہے؟ جو کہیں نواب کے آدمی چھوٹیں، تو چور چور بنیں اور الو کے الو بنائے جائیں۔ کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہیں۔ آبرو پر پانی پھر گیا۔ ابھی دیکھیے کیا کیا ہوتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

اتنے میں سرائے میں لینا لینا کا غل چا۔ یہ بھی بھڑبھڑا کر کوٹھری سے نکلے، تو دیکھتے ہیں کہ ساڈنی نے ری توڑناڑ کر پھینک دی ہے اور سرائے بھر میں اچکتی پھرتی ہے۔ پہلے ایک مسافر کے ٹٹو کی طرف جھکی اور اس کو مارے پستوں کے بوکھلا دیا۔ مسافر بیچارہ ایک لگا لیے کھٹا کھٹ ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ پھر جو وہاں سے اچھلی تو دو تین بیلوں کا کچومر ہی نکال ڈالا۔ گاڑی دان ہائیں ہائیں کر رہا ہے۔ لیکن اس ہائیں ہائیں سے بھلا اونٹ سمجھا کیے ہیں۔ یہاں سے جھپٹی تو تین چار اکوں کے انجر پنجر الگ کر دیے۔ آزاد تو بڑا دکھا رہے ہیں اور آوازیں کر رہے ہیں۔ لوگ تالیاں بجا دیتے ہیں تو وہ اور بھی بوکھلا جاتی ہے۔ بارے بڑی مشکل سے نکیل ان کے ہاتھ میں آئی۔ اسے باندھ کر کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اللہ رکھی اور چند و عدالت کے ایک مذکور کے ساتھ آپہنچے۔ آزاد نے منہ پھیر لیا اور بیٹھے سروں

میں گانے لگے۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
مذکور: حضور، سمن آیا ہے
آزاد:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
مذکور: سمن آیا ہے، گانے کو تو دن بھر پڑا ہے لیجیے دستخط تو کر دیجیے۔
آزاد:

دھو دیا اشکِ ندامت کو گناہوں نے میرے
تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا
مذکور: اجی صاحب، میری بھی سنیے گا؟
آزاد: کیا ہم سے کہتے ہو؟
مذکور: اور نہیں تو کس سے کہتے ہیں؟
آزاد: کیسا سمن، لاؤ، ذرا پڑھیں تو، لو سچ مچ ہی نالاش جزا دی۔

مذکور نے سمن پر دستخط کرائے اور اللہ رکھی کو گھیرا۔ آج تو ہاتھ گراماؤ، ایک چہرا شاہی
لاؤ، اللہ رکھی نے کہا لے تو ابھی سوت نہ کپاس، انعام و نام کیسا؟ مقدمہ جیت جائیں تو دیتے
اچھا لگے۔

مذکور: تم جیتی داخل ہو بی بی، اچھا کل آؤں گا۔
میاں آزاد کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے کہ یہ تو بے ڈھب ہوئی۔ میں نے ذرا دل
بہلاؤ کے لیے دل لگی کیا کردی کہ یہ مصیبت گلے آپڑی۔ اب تو خیریت اسی میں ہے کہ
یہاں سے منہ چھپا کر بھاگ کھڑے ہوں۔ بی اللہ رکھی چلا چلا کر کہنے لگیں۔ اب تو چاندی
ہے، جیتے تو گھی کے چراغ جلائیں گے۔ ایک نے کہا۔ یہ نہ کہا، منہ میٹھا کریں گے، گلے
کھلائیں گے، دوسرے نے کہا۔ نہ کھلائیں گے تو نکاح کے دن ڈھولک کون بجائے گا؟ آزاد
موقع کی تاک میں تھے ہی، اللہ رکھی کی آنکھ چوکتے ہی جھٹ سے کاٹھی کسی اور بھاگے۔ تاک

تک تو ان کو کسی نے نہ ٹوکا، مگر جب ناکے سے کوئی گولی بھر کے بچے پر باہر نکل گئے تو میاں چندو باز سے چار آنکھیں ہوئیں۔ ارے! غضب ہو گیا اب دھر لیے گئے۔

چندو باز: اے بڑے بھائی، کدھر کی تیاریاں ہیں؟ یہ بھاگ جانا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے کہ کاٹھی کسی اور چل کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں خاک جھونک کر آئے ہوں گے۔ لے بس، اتر پڑو، آؤ ذرا حقہ تو پی لو۔

آزاد: اس دم میں ہم نہ آئیں گے۔ یہ فقرے کسی گنوار کو دیجیے۔ آپ اپنا حقہ رہنے دیں۔ بس اب ہم خوب پی چکے۔ ناکوں دم کر دیا بد معاشوں۔ چلے تھے مقدمہ دائر کرنے۔ کس مزے سے کہتے ہیں کہ حقہ پیے جاؤ، ایسے ہی تو آپ بڑے دوست ہیں۔

چندو باز: نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔ ہم نے تو کہا اتنے دن ملاقات رہی ہے، آؤ بھائی، کچھ خاطر کر دیں، اب خدا جانے کب ملنا ہو۔

آزاد: خدا نہ کرے، تم جیسے منحوسوں کی صورت خواب میں بھی نظر آئے۔

چندو باز نے گل چٹانا شروع کیا، دوڑو، چور ہے، لینا، چور چور۔ میاں آزاد نے چندو باز پر سزاک سے کوڑا پھٹکارا اور ساڑنی کو ایک ایڑ لگائی۔ وہ ہوا ہو گئی۔ شہر سے باہر ہوئے تو راہ میں دو مسافروں کو یوں باتیں کرتے سنا۔

پہلا۔ ارے میاں، آج کل لکھنؤ میں ایک نیا گل کھلا ہے۔ کسی نیاریے نے کروڑوں روپے کے جعلی اسٹامپ بنائے اور لندن تک میں جا کر کوڑے کیے۔ سنا کابل میں دو بھیلے پکڑے گئے، مشکیں کس لی گئیں اور ریل میں بند کر کے یہاں بھیج دیے گئے۔ اللہ جانتا ہے ایسا جعل کیا ہے کہ جو بھر بھی فرق معلوم ہو، تو مونچھیں منڈوا لو۔ سنا ہے کوئی ڈیڑھ سو دو سو برس سے بیچتے تھے اور کچھ چوری چھپے نہیں کھلم کھلا۔

دوسرا۔ واہ دنیا میں بھی کیسے کیسے کائیاں پڑے ہیں۔ ایسوں کے تو ہاتھ کٹوا ڈالے۔

پہلا۔ واہ واہ کیا قدروانی کی ہے۔ انھوں نے تو وہ کام کیا کہ ہاتھ چوم لیں، جاگیریں دیں۔

آزاد کو پہلے مسافر کی گپوڑے بازی پر ہنسی آگئی۔ کیا جھپ سے بھلیوں کو کابل تک پہنچا دیا اور ہندوستان کے اسٹامپ لندن میں بکوائے۔ پوچھا، کیوں صاحب، کتنے جعلی اسٹامپ بیچے؟

مسافروں نے سمجھا، یہ کوئی پولس افسر ہیں، نوہ لینے چلے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم کو بھی گرفتار کر لیں۔ بظلمتیں جھانکنے لگے۔

آزاد: آپ ابھی کہتے نہ تھے کہ جیلے گرفتار کیے گئے ہیں؟

مسافر: کون؟ ہم؟ نہیں تو؟

آزاد: جی، آپ باتیں نہیں کر رہے تھے کہ اسامپ کسی نے بنائے اور ڈیڑھ دو سو برس

سے بیچتے چلے آئے؟

مسافر: حضور، ہم کو تو کچھ معلوم نہیں۔

آزاد: ابھی بتاؤ سور، نہیں ہم تم کو برا گھر دکھائے گا اور جیڑی پہنائے گا۔

میاں آزاد تو ان کی چوتوں سے تازہ گئے تھے کہ دونوں کے دونوں چونکا ہیں، مارے

ڈر کے اسامپ کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ جیسے ہی انھوں نے ڈانٹ بتائی ایک تو بگٹت چپختم کی طرف بھاگا اور دوسرا کھڑ بڑکرتا ہوا پورب کی طرف۔ میاں آزاد آگے بڑھے۔ راہ میں دیکھا، کئی مسافر ایک پڑ کے سائے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

ایک۔ کوئی ایسی تدبیر بتائیے کہ لو نہ لگے۔ آج کل کے دن بڑے برے ہیں۔

دوسرا۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ پیاز کی گھٹی پاس رکھے۔ یا دو چار کچے آم توڑ لو،

آمنوں کو پہلے بھون لو، جب پلپلے ہوں تو گودا نکال کر چھلکا پھینک دو اور ذرا سی شکر پانی میں گھول کر پی جاؤ۔

پہلا۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ پانی میں تو برف ڈالنی ہی نہ چاہیے۔ پانی کا گلاس

برف میں رکھ دو، جب ٹھنڈا ہو جائے تب پیو۔ برف کا پانی نقصان کرتا ہے۔

دوسرا۔ واہ لاکھوں آدمی پیتے ہیں۔

پہلا۔ اچی لاکھوں آدمی جبک مارتے ہیں۔ لاکھوں چوریاں بھی تو کرتے ہیں، پھر اس

سے مطلب؟ ہم نے لاکھوں آدمیوں کو دیکھا ہے کہ گڑھوں اور تالابوں کا پانی سر میں پیتے

ہیں۔ آپ چیخے گا؟ ہزاروں آدمی دھوپ میں چل کر کھڑے کھڑے تین چار لونے پانی پی

جاتے ہیں۔ مگر یہ کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔

اور آگے بڑھے تو ایک بھڑی آنکلا۔ وہ آزاد کو پہچانتا تھا۔ دیکھتے ہی بولا تمھاری نواب

صاحب کے یہاں بڑی تلاش ہے جی۔ تم غائب کہاں ہو گئے تھے اونٹ لے کر؟ اب میں

جا کر کہوں گا کہ میں نے پرش دیکھا، تو نکلا آزاد پانچ کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ جب تم لپ دینی پہنچ جاؤ گے تو پھر ہماری چڑھتی کلا ہوگی۔ تم کو بھی آدھو آدھ بانٹ دیں گے۔ مگر بھنڈا نہ پھوڑنا۔ چڑھ بازی ہے۔

آزاد: واللہ کیا سوچتی ہے، منظور ہے۔

بھڈری نے پوتھی سنبال اپنی راہ لی اور نواب کے یہاں دھر دھیکے۔

خوجی: اجی جاؤ، بھی تمہاری ایک بات بھی ٹھیک نہ نکلی۔

نواب: برسوں ہمارا نمک تم نے کھایا ہے، برسوں! ایک دو دن نہیں برسوں! اب اس وقت کچھ پرش و درش بھی دیکھو گے یا باتیں ہی بناؤ گے؟ ہم کو تو مسلمان بھائی تمہاری وجہ سے کافر کہنے لگے اور تم کوئی اچھا سا حکم نہیں لگاتے۔

بھڈری: وہ حکم لگاؤں گا کہ ہٹ ہی نہ پڑے۔

خوجی: اجی ڈٹکیے ہو خاصے۔ کہیں کسی روز میں کرو لی نہ بھونک دوں۔ سوا بے پر کی اڑانے کے، بات سیکھی ہی نہیں۔ بھلے آدمی، سال بھر میں ایک دفعہ تو بچ بولا کرو۔

جھمن: واہ، بچ بولتے تو قصائی کے کتے کی طرح پھول نہ جاتے۔

نواب: یہ کیا داہیات بات۔

بھڈری: حضور، ہم سے ان سے ہنسی ہوتی ہے۔ یہ ہمیں کہتے ہیں، ہم انہیں۔ اب آپ کوئی پھول من میں لیں۔

نواب: یہ ڈھکوسلے ہم کو اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ ہمیں صاف صاف بتا دو کہ میاں آزاد کب تک آئیں گے؟

بھڈری نے انگلیوں پر کچھ گن گنا کر کہا۔ پانی کے پاس ہیں۔

جھمن: واہ استاد! پانی کے پاس ایک ہی کبی۔ لڑکی نہ لڑکا، دونوں طرح اپنی ہی جیت۔

بھڈری: یہاں سے کوئی تین کوس کے اندر ہیں۔

دُنی: حضور، یہ بڑا مچھلیا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں، آزاد کب آئیں گے، یہ کہتا ہے، تین

کوس کے اندر ہی اندر ہیں، سوا جھوٹ، سوا جھوٹ۔

بھڈری: اچھا، جا کر دیکھ لو، جو نامے کے پاس آزاد آتے نہ ملیں، ناک کٹا ڈالوں، پوتھی

جلا دوں، کوئی دل لگی ہے؟

نواب: چابک سوار کو بلا کر حکم دو کہ ابھی سرپٹ جائے اور دیکھے، میاں آزاد آتے ہیں یا نہیں۔ آتے ہوں تو اس بھڑی کا آج گھر بھر دوں۔ بس آج سے اس کا کھر پڑنے لگوں۔

چابک سوار نے بالکا مڑا سا باندھا اور سرگ گھوڑی پر چڑھ چلا۔ مگر پچاس ہی قدم گیا ہوگا کہ گھوڑی بھڑکی اور تیزی میں دسرے ناکے کی راہ لی۔ چابک سوار بہت اگڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر روک نہ سکے، دم سے منہ کے بل نیچے آ رہے۔ خوجی نے نواب صاحب سے کہا، حضور گھوڑی نے ناظر علی کو دے پٹکا، اور کیا جانے کس طرف نکل گئی۔

نواب: چلو خیر سمجھا جائے گا۔ تم ٹانگھن کسواؤ اور دوڑ جاؤ۔

خوجی: حضور میں تو بوڑھا ہو گیا اور رہی سہی سکت اٹھنے لے لی۔ ٹانگھن ہے بلا کا شریر۔ کہیں پھینک پھانک دے، ہاتھ پاؤں ٹوٹیں تو دین دنیا دونوں سے جاؤں۔ آزاد خود بھی گئے اور ہم سب کو بھی بلا میں ڈال گئے۔

ادھر چابک سوار نے چلنی کھائی، ادھر لونڈوں نے تالیاں بجائیں۔ مگر شہ سوار نے گرد جھاڑی، ایک دوسرا کیت گھوڑا کسا اور کڑکڑا دیا۔ ہوا سے باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ بنیا میں پہنچے تو دیکھا، ساڈنی کی کار کچی جھول جھلک رہی ہے اور اونٹنی گردن جھکائے چو طرفہ منک رہی ہے۔ چاکر آزاد کے گلے سے لپٹ گئے۔

آزاد: کہیے، نواب کے یہاں تو خیریت ہے؟

سوار: جی ہاں، خیر صلی اللہ کے ڈھیر ہیں۔ مگر آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ اومیاں، کچھ اور بھی سنا؟ اس بیڑ کی قبر بنائی گئی ہے۔ سامنے جو نیل بوٹوں سے سجا ہوا مقبرہ دکھائی دیتا ہے وہ اسی کا ہے۔

آزاد: یہ کہیے، یار لوگوں نے قبر بھی بنوا دی۔ واللہ، کیا کیا فقرے باز ہیں۔

سوار: بس، تمھاری ہی کسر تھی، کہو ہم نے سنا خوب گل چمڑے اڑائے۔ چلو۔ پر اب نواب نے یاد کیا ہے۔

آزاد: ایس، انھیں ہمارے آنے کی کہاں سے خبر ہو گئی؟

سوار: اجی، اب یہ ساری داستان راہ میں سنا دیں گے۔

آزاد: اچھا، تو پہلے آپ ہمارا خط نواب کے پاس لے جائیں۔ پھر ہم شان کے ساتھ چلیں گے۔

یہ کہہ کر آزاد نے یہ خط لکھا:

’آج قلم کی باغچیں کھلی جاتی ہیں۔ کیونکہ میاں صفحہ کی سواری آتی ہے۔ حضور کے نمک کی قسم، ادھر پاتال تک اور ادھر ساتویں آسمان تک ہو آیا، تب جا کے کھوج پایا۔ شاہ جی صاحب روز ڈھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔ کل میں نے بڑی خوشامد کی اور آپ کی یاد دلائی، تو غنڈی آہ کھینچ کر رہ گئے۔ بڑی بڑی دلیلیں چمانٹتے تھے۔ پہلے فرمایا۔

دروں بزم رہ نیست بیگانه را

میں نے چھوٹے ہی جواب دیا

کہ پروا کی داد پروا نہ را

کھلکھلا کر ہنس پڑے، پیٹھ ٹھوکی اور فرمایا، شاہاش بیٹے، نواب صاحب کی صحبت میں تم بہت برق ہو گئے۔ پورے دو ہفتے تک مجھ سے روز بحث رہی۔ آخر میں نے کہا۔ آپ چلے نہیں میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ مجھے سمجھایا کہ زندگی بڑی نعمت ہے۔ خیر تمہاری خاطر سے چلتا ہوں۔ لیکن ایک شرط یہ ہے کہ جب میں وہاں پہنچوں، تو نواب کے سامنے خوبی پر میں جوتے پڑیں۔ میں نے قول دیا، تب کہیں آئے۔

سوار یہ خط لے کر ہوا کی طرح اڑتا ہوا نواب صاحب کے یہاں پہنچا۔

نواب: کہو، بیٹا کہ بیٹی؟ جلدی بولو، یہاں پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔

سوار: حضور، غلام نے راہ میں دم لیا ہو تو جرمانہ دوں۔

خوبی: کتنے بے شک ہو میاں، کہیں کمیت کی، سنس کھلیان کی۔ بھلا اپنی کارگزاری

جتانے کا یہ کون موقع ہے؟ مارے مشیت کے دبلے ہوئے جاتے ہیں۔

سوار نے آزاد کا خط دیا۔ خوشی جی پڑھنے کے لیے بلائے گئے۔ خوبی گھبرائے کہ آزاد

نے یہ کب کی کسری۔ بولے، حضور یہ میاں آزاد کی شرارت ہے۔ شاہ صاحب نے یہ شرط

کبھی نہ کی ہوگی۔ بندے سے تو کبھی گستاخی نہیں ہوئی۔

نواب: خیر، آنے تو دو۔ کیوں بھی میر صاحب، رمال نے تو بیان کیا تھا کہ صفحہ

کے دشمن جنت میں داخل ہوئے۔ یہ میاں آزاد کو کہاں سے مل گئے؟

میر صاحب: حضور، خدا کا بھید کون جان سکتا ہے؟

بھڑی: میرا پرشن کیسا ٹھیک لکھا جو ہے سو مانوں نشانے پر تیر کھٹ سے بیٹھ گیا۔

اتنے میں اندر چھوٹی بیگم کو خبر ہوئی۔ بولیں ان کا جیسا پونگا آدمی خدائی بھر میں نہ ہوگا۔
 ذری سا تو بئیر اور پاجیوں نے اسی کا مقبرہ بنوا دیا۔ روز کہاں تک بکوں۔
 لوٹتی: بی بی، برا مانو یا بھلا قسمیں وہ راہیں ہی نہیں معلوم کہ میاں قابو میں آجائیں۔
 بیگم: میری جوتی کی لوک کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان کے بیچ میں بولے۔ میں تو آپ
 ہی ڈرا کرتی ہوں کہ کوئی بھی پر طوفان نہ باندھ دے۔

ادھر نواب صاحب نے حکم دیا کہ صف عثمان کی سواری دھوم سے نکلے۔ اتنا اشارہ پاتا تھا
 کہ خوجی اور میر صاحب گلے جلوس کا انتظام کرنے۔ چھوٹی بیگم کوٹھے پر کھڑی کھڑی یہ
 تیاریاں دیکھ رہی تھیں اور دل میں ہنس رہی تھیں۔ اس وقت کوئی خوجی کو دیکھتا، دماغ نہیں
 ملتے تھے۔ اس کو ڈانٹ، اس کو ڈھٹ، کسی پر دھول جمائی، کسی کے چائٹا لگایا، اس کو پکڑ لاؤ،
 اس کو مارو۔ کبھی مسالچی کو گالیاں دیں، کبھی پنہانے والے پر بگڑ پڑے۔ آگے آگے نشان کا
 ہاتھی تھا۔ ہری ہری جھول پڑی ہوئی۔ مسک پرے سندور سے گل بوٹے بنے ہوئے۔ اس
 کے بعد ہندستانی باجا گڑجھتم۔ اس کے پیچھے پھولوں کے تخت، جمیلی کھلا ہی چاہتی ہے، کلیاں
 چٹکنے ہی کو ہیں۔ چنڈ بازوں کے تخت نے تو کمال کر دیا۔ دو چار پینک میں ہیں، دس پانچ
 اوندھے پڑے ہوئے۔ کوئی چنڈ باز ٹھاٹ سے پوٹھا جھیل رہا ہے۔ ایک گنڈیری چوس رہا
 ہے۔ شکار کا وہ ساں باندھا کی واہ جی واہ۔ ایک شکاری بندوق چھتھائے، گھٹنا ٹیکے آنکھ دبائے
 نشانہ لگا رہا ہے۔ بس دائیں کی آواز آیا ہی چاہتی ہے۔ ہرن چوڑیاں بھرتے جاتے ہیں۔
 اس کے بعد انگریزی باجا۔ اس کے بعد گھوڑوں کی قطار۔ کیت، کچھ سرنگ، ٹکرہ، سبزہ، عربی،
 ٹرکی، ویلر جم جم کرتے جا رہے ہیں۔ گھوڑے دہن بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پھر ارگن
 باجا، پھر تانہ، پانکی، ناکلی، سکھ پال۔ اس کے بعد پریوں کے تخت ایک سے ایک بڑھ کر۔
 سب کے پیچھے روشن چوکی والے تھے۔ روشنی کا انتظام بھی چوکس تھا۔ پنہانے اور لائٹنیں
 جھک جھک کر رہی تھیں۔ اس ٹھاٹ سے جلوس نکلا سارا شہر یہ بارات دیکھنے کو پھٹا پڑتا تھا۔
 لوگ جھک میں تھے کہ اچھی بارات ہے دلہے کا پتا ہی نہیں برات کیا گورکھ دھندہ ہے۔
 جب جلوس بنیا میں پہنچا تو آزاد ہاتھی پر سوار ہو کر صف شکن کو کابک میں بٹھائے ہوئے
 چلے۔

خوجی: مثل مشہور ہے، 'سو برس کے بعد گھورے کے بھی دن بہرتے ہیں' ہمارے

دن آج بھڑے کہ آپ آئے اور شاہ جی کو لائے۔ نواب کے یہاں سناٹا پڑا ہوا تھا۔ صف شکن کے غم میں سب پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ بس لوگ یہی کہتے تھے کہ آزاد ساڈنی لے کر لے ہوئے۔ ایک میں ہی تمہاری حمایت کیا کرتا تھا۔

میر صاحب : جی ہاں، ہم بھی آپ ہی کی طرف سے لڑتے تھے، ہم اور یہ دونوں۔ آزاد : بھئی، کچھ نہ پوچھو، خدا جانے، کن کن جنگلوں کی خاک چھائی، جب کہیں یہ لے۔

خوبی : یہاں لوگ گپ اڑا رہے تھے۔ کسی نے کہا بھاڈوں کے یہاں نوکری کر لی۔ کوئی طوفان باندھتا تھا کہ کسی بھٹیاری کے گھر پڑ گئے۔ مگر میں یہی کہے جاتا تھا کہ وہ شریف آدمی ہیں، اتنی بے حیائی کبھی نہ کریں گے۔

خوبی اور میر صاحب، دونوں آزاد کو ملانا چاہتے تھے۔ مگر وہ ایک ہی استاد۔ سمجھ گئے کہ اب نواب کے یہاں ہماری بھی طوطی بولے گی، تبھی یہ سب ہماری خوشامد کر رہے ہیں۔ بولے اجی رات جاتی ہے یا آتی ہے؟ اب دیر کیوں کر رہے ہو؟ پنشانے چڑھاؤ، گھوڑے چلاؤ، جب جلوس تیار ہوا، تو آزاد ایک ہاتھی پر جا ڈٹے۔ بیڑ کی کابک کو آگے رکھ لیا۔ خوبی اور میر صاحب کو پیچھے بٹھایا اور جلوس چلا۔ چوک میں تو پہلے ہی سے ہلڑ تھا کہ نواب والا بیڑ بڑی شان سے آرہا ہے۔ لاکھوں آدمی چوک میں تماشا دیکھنے کو ڈٹے ہوئے تھے، چھتیس پھی پڑی تھیں، باجے کی آواز جو کانوں میں پڑی، تو تماشائی لوگ اند پڑے۔ نشان کا ہاتھی جھنڈے کا پھریرا اڑاتا سامنے آیا۔ لیکن جیوں ہی چوک میں پہنچا دیے ہی دیوانی کے دو مذکور یوں نے ڈانٹ کر کہا ”ہاتھی روک لو، آزاد کے نام وارنٹ آیا ہے۔“

لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ فیل بان نے جو دیکھا کہ سرکاری آدمی لال لال پکیا باندھے، کالی کالی وردی ڈاٹے، خاکی پتلون پہنے، چراس لٹکائے ہاتھی روکے کھڑے ہیں، تو شٹا گیا اور ہاتھی کو جدر انھوں نے کہا ادھر ہی پھیر دیا۔ جلوس میں ہلڑ مچ گیا۔ کوئی تخت لیے بھاگا جاتا ہے کوئی جھنڈے لیے دبکا بھرتا ہے۔ گھوڑے تھان پر پہنچے۔ تادان اور پالکیوں کو چھوڑ کر کھار اڈے پر ہو رہے۔ باجے والے گلیوں میں کھس گئے۔

آزاد اور خوبی مذکور یوں کے ساتھ چلے، تو شہر کے باہر جا پہنچے۔ یکا یک ہاتھی جو گر جا، تو - خوبی اور میر صاحب پنک سے چونک پڑے۔

خوبی : ایں، پنھانے چڑھاؤ، پنھانے، ابے یہ کیا اندھیر مچا رکھا ہے۔ ذرا یوں ہی آنکھ جھپک گئی تو ساری کی کرائی محنت خاک میں ملا دی۔ اب میں اتر کر کوڑے پھٹکاروں گا، تب مانو گے۔ لاتوں کے آدی کہیں باتوں سے مانتے ہیں۔

میر صاحب : ہیں ہیں! او فیل بان! یہ ہاتھی کیا آتش بازی سے بھڑکتا ہے؟ بڑھا لے چلو، میل میل دھت دھت! ارے بھی خوبی یہ کس میدان میں آنکھ؟ آخر یہ ماجرا کیا ہے بھائی؟

خوبی : پنھانے چڑھاؤ پنھانے، اور ان بابے والوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟ ذرا زور زور چھیڑے جاؤ۔ اب تو بہاگ کا وقت ہے بہاگ کا۔

میر صاحب : اجی آنکھیں تو کھولے، روشنی کا چراغ گل ہو گیا۔ مصیبت میں آپھنے۔ آپ وہی بے وقت کی شہنائی بجا رہے ہیں۔ اس جھگے میں آپ کو بہاگ کی دھن سنائی ہے۔
خوبی : پنھانے چڑھاؤ، پنھانے۔ نہیں میں کچا پیسہ تو دوں گا نہیں۔ جھپ سے چڑھانا تو پنھانے۔ شاباش ہے بیٹا۔

میر صاحب تو جلے بھنے بیٹھے ہی تھے۔ خوبی نے جب کئی بار پنھانے کی رٹ لگائی تو وہ جھلا اٹھے۔ خوبی کو ہاتھی پر سے نیچے دھکیل ہی تو دیا۔ آرا رارا دھم، کون گرا؟ ذرا۔ نوہ تو لینا کون گرا؟

آزاد : تم گرے، تم، آپ ہی تو لڑکتے ہیں نوہ کیا لیں؟
خوبی : ارے میں! یہ تو کہیے، ہڈی پھلی بچ گئی؟ یارو، ذرا دیکھنا تو، ہمارا سر بچا یا نہیں؟
مذکوری : بچا ہے بچا تاہی پھوٹ پھر لیسن سٹھنا، او چلے فارسی چھانے ای بوجھ اٹھاؤ
خوبی : ہائیں ہائیں، کوئی مزدور سمجھا ہے شریف اور پاجی کو نہیں پہچانتا۔ لے، اب اتارتا ہے بوجھ، یا نالے میں پھینک دوں۔ او گیدی۔ لانا تو میری کروی۔ کیا میں گدھا ہوں؟
میر صاحب : گدھے نہیں، تو اور ہو کون؟

مذکوری : تمس کو ہس رے؟ ارے تمس کو ہس؟ اتر ہاتھی پر سے۔ اترت ہے کہ ہم آوں پھر، تمس اس منجے۔

میر صاحب : کہتا کس سے ہے؟ کچھ بیدھا تو نہیں ہے؟ کچھ نادر ہیں ہم لو آئے۔
مذکوری : اچھا نو یہ بوجھ اٹھا۔ تھریا لوٹیا رکھ موڑے پر اور اگوا۔ میر صاحب نے نیچے اتر

کر دیکھا تو سرکاری پیادا وردی ڈالے کھڑا ہے۔ لگے قمر قمر کا پنپنے۔ چپکے سے بوجھ اٹھایا اور پھل پھل کر چلے گئے۔ دونوں مذکورہ ہاتھی پر جا بیٹھے۔ خوبی اور میر صاحب، دونوں لدے پھندے کرتے پڑتے جانے لگے۔

خوبی: واہ ری قسمت، کیوں جی میر صاحب، ہم تو خدا کی یاد میں تھے تم کو کیا ہوا تھا؟
میر صاحب: جہاں آپ تھے وہیں میں بھی تھا۔ یہ ساری شرارت آزاد کی ہے۔
آزاد: ذری چونچ سنبھالے ہوئے، نہیں میں اترتا ہوں۔

چلتے چلتے ترکا ہو گیا۔ خوبی بولے۔ لو بھائی، ہمارا تو مجبور ہو ہی گیا۔ اب جو بوجھ اٹھا کر لے چلے اس کی ستر پشت پر لعنت۔ یہ کہہ کر بوجھ پھینک دیا۔ جب ذرا دن چڑھا تو گومتی کے کنارے پہنچے۔ ایک مذکورہ نے کہا او فیل بان ہاتھی روک دے نہائے لیں۔
فیل بان: ارے تو نہا لینا کیسے گنور دل ہو؟

آزاد: کہو خوبی نہاؤ گے؟

خوبی: یوں ہی نہ گلا گھونٹ ڈالو۔

ندی کے پار پہنچے تو چنڈوباز کی صورت نظر پڑی۔

چنڈوباز: بڑے بھائی، سلام! کہو خیر صلاح؟ آنکھیں تم کو ڈھونڈتی تھیں دیکھنے کو ترس گئے۔ اب کہو کیا ارادے ہیں؟ اللہ رکھی نے یہ خط دیا ہے، پڑھ کر چپکے سے جواب لکھ دو۔
آزاد نے خط کھولا اور پڑھا۔

’کیوں جی اسی منہ سے کہتے تھے کہ تم سے بیاہ کروں گا؟ تم تو چکمہ دے کر سدھارے اور یہاں دل کراہا کرتا ہے۔ نہا دھو کر قرآن شریف پر ہاتھ دھرو کہ بیاہ کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیوں ناحق انصاف کا گلا کند چھری سے ریتے ہو؟ اس خط کا جواب لکھنا، نہیں میں اپنی جان دے دوں گی۔‘

آزاد نے جواب لکھا۔

’منو بی بی، ہم کوئی اٹھائی کیرے نہیں ہیں۔ ہم ٹھہرے شریف، تم ہو بھٹیاری، بھلا پھر ہم سے کیوں کر بنے۔ اب اس خیال کو دل سے نکال دو۔ تمہارے کارن مذکورہ کی قید میں ہوں۔ حمیں منہ نہ لگاتا تو اتنا ذلیل کیوں ہوتا؟

چنڈوباز تو خط ملے کر روانہ ہوئے، ادھر کا قصہ سنئے۔ نواب جموم جموم کر بیچے میں شہل

رہے تھے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے کہ جلوس اب آیا اور اب آیا۔ یکا یک چوب دار نے آکر کہا خداوند، لٹ گئے! لٹ گئے! وہ دیکھو صاحب تمہارے لٹ گئے۔

نواب: ارے کچھ منہ سے کہو گے بھی کیا غضب ہو گیا؟

چوب دار: خداوند برات کو اٹھائی گیاروں نے لوٹ لیا۔

نواب: برات؟ برات؟ کس کی؟ کہیں شاہ جی کی سواری سے تو مطلب نہیں ہے؟ اف

ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

چوب دار: وہ دیکھو صاحب تمہارے، برات چلی آرہی تھی۔ تماشاخی اتنے جمع تھے کہ چھتیس پھٹی پڑتی تھیں۔ دیکھو صاحب تمہارے، جیسے بادشاہ کی سواری ہو۔ مدعا جیسے ہی چوک میں پہنچے تو دیکھو صاحب تمہارے، دو چہرہ سیوں نے ہاتھی کو پھیر دیا۔ بس صاحب تمہارے، ساری برات تتر بتر ہو گئی۔ کہاں تو باجے بج رہے تھے، کہاں صاحب تمہارے، سناٹا چھا گیا۔

نواب: بھلا شاہ جی کہاں ہیں؟

چوب دار: حضور شاہ جی کو لیے پھرتے ہیں۔ یہاں دیکھو صاحب تمہارے۔

نواب: کوئی ہے۔

ادھر آنا، اس کے کٹے پر کھڑے ہو، جتنی بار اس کے منہ سے 'وہ دیکھو صاحب تمہارے' نکلے اتنے جوتے اس پر پڑیں۔ گدھا ایک بات کہتا ہے تو تین سو ساٹھ دفعہ 'او دیکھو صاحب تمہارے'

چابک سوار: حضور اس وقت غصے کا موقع نہیں، کوئی ایسی فکر کیجیے کہ شاہ جی تو چھوٹ آئیں۔

نواب: اس کیا وہ بھی گرفتار ہو گئے؟

سوار: جی آزاد خوبی، ہاتھی، سب کے سب پکڑ لیے گئے؟

نواب: تو یہ کیسے بیڑے کا بیڑا گیا ہے۔ ہمیں یہ کیا معلوم تھا بھلا، نہیں تو ایک کارڈ ساتھ کر دیتے۔ آخر کچھ معلوم بھی ہوا کہ یہ دھر پکڑ کیسی تھی؟ سچ تو یوں ہے کہ اس وقت میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ روپے ہم سے لو اور دوڑ دھوپ تم لوگ کرو۔

مصاحبوں کی بن آئی۔ اب کیا پوچھنا ہے۔ آپس میں ہنڈیا پکنے لگی۔ واللہ، ایسا موقع پھر تو ہاتھ آئے گا نہیں۔ جو کچھ لینا ہو لے لو، اور عمر بھر چین کرو۔ اس وقت یہ بوکھلایا ہوا

ہے۔ جو کچھ کہو گے بے دھڑک دے نکلے گا۔ لیکن ایک کام کرو۔ دس پانچ آدمی مل جل کر باتیں بناؤ۔ ایک آدمی کے کیے کچھ نہ ہوگا۔ کہیں بھڑک گیا تو غضب ہو جائے گا۔ خدا کرے روز اسی طرح وارنٹ جاری رہے۔ مگر اتنا یاد رکھیے گا کہ کہیں اندر خبر ہوئی تو بیگم صاحبہ چھوہندہ کی طرح ناچیں گی۔ پھر کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گا۔

مبارک قدم دروازے کے پاس کھڑی سب سن رہی تھی۔ لپک کر گئی اور چھوٹی بیگم کو بلا لائی۔ ذرا جلدی جلدی قدم اٹھائیے، یہ سب جانے کیا واپسی تباہی بک رہے ہیں۔ منہ جھلس دے پکڑ کے۔ بیگم صاحبہ دبے پاؤں گئیں تو سن کر مارے غصے کے لال ہو گئیں اور نواب کو اندر بلایا۔

مبارک قدم : اے حضور کے مصاحب، اللہ جانتا ہے ایک ہی اڑی مار ہیں، جن کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ جو ہے وہ جھوٹوں کا سردار۔ مگر حضور ان کو کیا جانے کیا سمجھتے ہیں۔ پچھوا ہوا چلتی، تو ٹھنڈا پانی پیتے، اب دن بھر شورے کا جھلا پانی ملتا ہے پینے کو، اور خدا نے نعمت کھانے کو دی۔ پھر انھیں دور کی نہ سوچھے تو کسے سوچھے۔

بیگم : ایسے ہی جھوٹے خوشامدیوں نے تو لکھنؤ کا ستیاناش کر دیا۔

نواب : یہ آج کیا ہے کیا؟

بیگم : ہے کیا؟ تمہارے مصاحب منہ پر تو تمہاری جھوٹی تعریف کرتے ہیں اور بیٹھ بیچھے تھیں گالیاں سناتے ہیں۔ ان سب کو دھکار کیوں نہیں دیتے؟

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر مذکور یوں نے آزاد کو ایک باغ میں اتارا۔

خوبی : میاں فیل بان، ذرا زینہ لگا دینا۔

فیل بان : اب آپ کے لیے زینہ بنواؤں، ایسے تو خوبصورت بھی نہیں ہیں آپ؟

میر صاحب : زینہ کیا ڈھونڈتے ہو، ہاتھی پر سے کوہنا کون سی بڑی بات، ہے۔

یہ کہہ کر میر صاحب بہت ہی اکڑ کر دم کی طرف سے کودے، تو سر نیچے اور پاؤں اوپر۔ روک روک بہت تیرے فیل بان کی۔ سچ ہے گاڑی وان، شتر بان، کوچ بان جتنے وان ہیں سب شریر ہیں۔ لاکھ بچے، مگر اوندھے ہو گئے۔ ہمارا کلا ہی جانتا ہے۔ کھٹ سے بولا۔ وہ تو کہیے میں ہی ایسا بے حیا ہوں کہ باتیں کرتا ہوں، دوسرا تو پانی نہ مانگتا۔

خوبی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اب کہیے، ہم نے جو زینہ مانگا تو ہمیں بتانے لگے۔

میر صاحب : میاں اترتے ہو کہ دوں دھکا۔

خوجی بچارے جان پر کھیل کر جیسے ہی اترنے کو تھے کہ ہاتھی اٹھ کھڑا ہوا۔ یا علی، یا علی، بچائیے، خدا میں بڑا گنہگار ہوں۔

اتنا کہہ چکے تھے کہ اررر دھم، زمین پر آکر ڈھیر ہو گئے۔

میر صاحب نے کہا شاباش میرے بچے، لے چھپاکے سے اٹھ تو جا۔

خوجی : یہاں بڑی چلی کا پتا نہیں، آپ فرماتے ہیں اٹھ تو جا۔ کتنے بے درد ہو۔

دو آدمی وہیں بیٹھے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ خوجی اور میر صاحب تو لکڑیاں کھوجنے لگے کہ اور نہیں تو صلفا ہی اڑے اور آزادان دونوں اجنبیوں کی باتیں سننے لگے۔

ایک : بھئی، آخر منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟ کیا محرم کے دنوں میں پیدا ہوئے تھے؟

دوسرا : ہاں یار، کیوں نہ کہو گے۔ یہاں جان پر بنی ہے آپ محرم لیے پھرتے ہیں۔ ہم نے بی بی اللہ رکھی سے کئی روپے مینے بھر کے وعدے پر لیے تھے۔ اس کو دو سال ہونے آئے۔ اب وہ کہتی ہے یا تو ہمارے روپے دو یا ہمارے مقدمے میں گواہ ہو جاؤ۔ نہیں تو ہم داغ دیں گے اور بڑا گھر دکھائیں گے۔ وہاں چکی چینی ہوگی۔ سوچتے ہیں گواہی دیں تو کس برتے پر۔ میاں آزاد کی تو صورت ہی نہیں دیکھی۔ اور نہ دیں تو وہ ناش جز دیتی ہیں۔ بس، یہی ٹھان لی ہے کہ آج شام کو جھپ سے چل کھڑے ہوں، ریل کو خدا سلامت رکھے کہ بھاگوں تو پتہ بھی نہ ملے۔

دوسرا : ارے میاں، وہ ترکیب بتاؤں جس میں 'سانپ مرے نہ لٹھی ٹوٹے' تم میاں آزاد سے مل جاؤ، ادھر اللہ رکھی سے بھی ملے رہو۔ گواہی میں گول مول باتیں کہو اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے عدالت سے آؤ۔ بچہ تم ہو کس بھروسے پر۔ چار چار کٹرے میں تم کو گواہ ملتے ہیں، جوڑے جھوٹا قرآن یا جھوٹی گنگا اٹھالیں۔ ہم کو کوئی دو ہی روپے دے، قرآن اٹھوا لے۔ جو چاہے کروا لے۔ پھر واپسی۔ ہو خاصے، دس ملتے ہیں دس، تمہیں جھوٹ سچ سے مطلب؟ سچ وہی ہے جس میں کچھ ہاتھ لگے، بھائی یہ تو کل جنگ ہے۔ اس میں سچ بولنا حرام ہے۔ اور جو کہتے نے کاٹا ہو تو سچ ہی بولیے۔

پہلا : حضرت سنیے، سچ پھر سچ ہے، اور جھوٹ پھر جھوٹ، اتنا یاد رکھیے گا۔

دوسرا : ابے جا، لایا وہاں سے جھوٹ پھر جھوٹ ہے۔ ارے نادان، اس زمانے میں

جھوٹ ہی سچ ہے۔ ایک ذرا سا جھوٹ بولنے میں دس چہرے شامی آئے گئے ہوتے ہیں۔
ذرا زبان ہلا دی اور دس روپے ہضم۔ دس روپے کچھ تھوڑے نہیں ہوتے۔ ہمیں کسی سے تم دو
گنڈے ہی دلوا دو۔ دیکھو، حلق اٹھا لیتے ہیں یا نہیں۔

آزاد: کیوں بھی، اور جو اپنی بات سے پھر جائے تو پھر کیسی ہو؟ عورت کی بات کا
اعتبار کیا؟ بہتر ہے کہ اللہ رکھی سے اسٹامپ کے کاغذ پر لکھوا لو۔
پہلا: واللہ، کیا سوچھی ہے۔

دوسرا: کیسا اسٹامپ جی! ہم کیا جانے کیا چیز ہے۔ باتیں کر رہے ہیں آپ۔ آئے
وہاں سے اسٹامپ پر لکھوا لو۔ ہم کیا کوئی چور ہیں؟

دونوں مذکور یوں نے اگلے جلائے اور کھانا بنانے لگے۔ آزاد نے دیکھا بھاگنے کا اچھا
موقع ہے۔ دونوں کی آنکھ بچا کر چل دیے، چٹ سے اسٹیشن پر جا کر ٹکٹ لے لیا اور ایک
درجے میں جا بیٹھے۔ دو تین اسٹیشنوں کے بعد ریل ایک بڑے اسٹیشن پر ٹھہری۔ میاں آزاد
نے اسباب کو گتھی پر لا دا اور چل کھڑے ہوئے۔ کھٹ سے سرانے میں داخل۔ ایک کوفری
میں جا ڈٹے اور بچھونا بچھا، خوب لہرا لہرا کر گانے لگے۔

دھشت عیاں ہے خاک سے مجھ خاکسار کی
بھڑکے ہرن بھی سونگھ کے مٹی مزار کی

ایک ایک ایک شاہ صاحب فاسی تہ بندھ باندھے، شرتی کا کیسریا کرتا پہنے، مانگ نکالے،
آنکھوں میں سرمہ لگائے، ایک جوان، چنچل، حسین عورت کے ساتھ آکر آزاد کی چارپائی پر
ڈٹ گئے اور بولے بابا، ہمارا نام قدی شاہ ہے۔ حسینوں پر جان دینا ہمارا خاص کام ہے۔ اس
وقت آپ نے جو یہ شعر پڑھا تو طبیعت پھڑک گئی۔ مگر بنا شراب کے گانے کا لطف کہاں؟
شوق ہو تو نکالوں پیالا اور بول، خوب رنگ جے اور سرور گئے۔

آزاد: میں تو توبہ کر چکا ہوں۔

شاہ جی: بچہ توبہ کیسی؟ یاد رکھ، توبہ توڑنے کے لیے اور قسم کھانے کے لیے ہیں۔
یہ کہہ کر شاہ جی نے جھولی سے سونف کی دلائی میٹھی شراب نکالی اور بولے:

سبز بول میں لال لال شراب
خیر ایمان کا خدا حافظ

شاہ جی میکدے میں بیٹھے ہیں

اس مسلمان کا خدا حافظ

یہ کہہ کر اس جوان عورت کی طرف دیکھ کر شراب کو پیالے میں اڑھیلنے کا اشارہ کیا۔ نازنین ایک ادا سے آکر آزاد کی چارپائی پر ڈٹ گئی اور شراب کا پیالہ بھرنے لگی۔ بھیری نے جو یہ حال دیکھا تو کھلی کی طرح چمکتی ہوئی آئی اور کڑک کر بولی۔ اے واہ میاں اٹھارہ اٹھارہ سنڈول کو لے کر کھیا پر بیٹھے ہو، اور جو پائی کھٹ سے ٹوٹ جائے تو کس کے ماتھے؟ ایسے مسافر بھی نہیں دیکھے۔ ایک تو خود ہی دبے پتلے ہیں دوسرے دس دس کو لے کر بیٹھے ہیں۔ لے چارپائی خالی کیجیے، ہم ایسے کراے سے باز آئے۔ آزاد کی تو بھیریوں کے نام سے روح کا نپتی تھی، چپکے سے چارپائی خالی کر دی اور زمین پر درمی بچھا کر آ بیٹھے۔ نازنین نے پیالہ آزاد کی طرف بڑھایا۔ پہلے تو بہت نہیں نہیں کرتے رہے لیکن جب اس نے قسمیں کھلا دیں تو مجبور ہو کر پیالہ لیا اور چڑھا گئے۔ دور چلنے لگا۔ وہ بھر بھر کے جام پلاتی جاتی تھی اور آزاد کے جسم میں نئی جان آتی جاتی تھی۔ اب تو وہ مزے میں آکر کھل کھیلے اور خوب پی۔ 'مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال ہے' یہاں تک کہ آنکھیں جھپکنے لگیں زبان لڑکھڑانے لگی۔ ہنسی ہنسی باتیں کرنے لگے اور آخر نسنے میں چور ہو کر دھڑ سے گرے۔ شاہ جی تو اس گھات میں آئے ہی تھے جھپاک سے کپڑے باندھے، جمع جھتالی اور چٹا دھندا کیا۔ عورت بھی ان کے ساتھ ساتھ لمبی ہوئی۔ میاں آزاد رات بھر بے ہوش پڑے رہے۔ تڑکے آنکھیں کھولی تو حال پتلا۔ نہ وہ شاہ صاحب ہیں نہ وہ عورت نہ درمی۔ زمین پر پڑے لوٹ رہے ہیں۔ پیاس کے مارے گلے میں کانٹے پڑے جاتے ہیں۔ اٹھے تو لڑکھڑا کر گر پڑے، پھر اٹھے پھر منہ کے بل گرے۔ بارے بڑھی مشکل سے کھڑے ہوئے، پانی لاکر منہ ہاتھ دھوئے اور خوب پیٹ بھر کر پانی پیا، تو دل کو تسکین ہوئی، یکا یک چارپائی پر نگاہ پڑی۔ دیکھا سر ہانے ایک خط رکھا ہوا ہے کھول کر پڑھا۔

'کیوں بچو! اور پو! اب پیو گے تو جیو گے بھی نہیں، کتنے بڑے پیلو ہو۔ بوتل کی بوتل منہ سے لگالی۔ اب اپنی قسمت کو روؤ۔ دھت تیرے کی۔ کیا مزے سے معشوق کے پاس بیٹھے ہوئے غٹ غٹ اڑا رہے تھے۔ گھڑی گھوم گئی نا۔ بھئی ہماری خاطر سے ایک جام تو لو، کہو تو اُنسی کے ہاتھ بھیجوں، لے اب ہم بتائے دیتے ہیں، خبردار مسافر کا اعتبار نہ کرنا، اور

سفر میں تو کسی پر بھروسہ رکھنا ہی نہیں۔ دیکھو آخر ہم لے دے کر چل دیے۔ عمر بھر سفر کیا مگر آدمی نہ بنے۔

یہ خط پڑھ کر میاں آزاد پر سیکڑوں گھڑے پڑ گئے۔ بہت کچھ غل غپاڑا بچایا، سرائے بھر کو سر پر اٹھایا، بھٹیاریے کو دو چار چپتیں لگائیں، مگر مال نہ ملا نہ ملا۔ لوگوں نے صلاح دی کہ جاؤ تھانے پر رہت لکھاؤ۔ گرتے پڑتے تھانے میں پہنچے تو کیا دیکھے ہیں تھانے دار صاحب بیٹھے ہانک رہے ہیں۔ میں نے فلاں گاؤں میں اٹھارہ ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا اور چونتیس برس کی چوری برآمد کی۔ سپاہی ہاں میں ہاں ملاتے اور بھڑبھڑاتے جاتے تھے کہ آپ ایسے اور آپ دیے، اور آپ ڈبل پیسے۔ اتنے میں آزاد پہنچے سلام بندگی ہوئی۔

تھانے دار: کیسے مزاج کیسے ہیں؟

آزاد: مزاج پھر پوچھ لینا، اب گٹھری دلو! استاد جی
تھانے دار: استاد جی کس بھکوعے کا نام ہے اور گٹھری کیسی؟ آپ بھگ تو نہیں پی گئے ہیں؟

آزاد: ذرا زبان سنبھال کر باتیں کیجیے گا۔ میں ٹیڑھا آدمی ہوں۔
تھانے دار: اچھے اچھوں کو تو ہم نے سیدھا بنایا، آپ ہیں کس کھیت کی مولی؟ کوئی ہے؟ وہ حلیہ تو ملاؤ ہم تو انہیں دیکھتے ہی پہچان گئے۔
گیان سنگھ نے حلیہ جو ملایا تو بال کا بھی فرق نہیں۔ پکڑ لیے گئے حوالات میں ہو گئے۔
مگر ایک ہی چھٹے ہوئے آدمی تھے۔ کانسٹیبل کو وہ بھرے دیے باتوں باتوں میں دوستی پیدا کر لی کہ وہ بھی ان کا دم بھرنے لگا۔ اب اسے فکر ہوئی کہ ان کو حوالات سے ٹھلا دے۔ آخر رات کو پہرے دار کی آنکھ بچا کر حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ آزاد چپکے سے کھسک گئے۔ دائیں بائیں دیکھتے دے پاؤں جانے لگے۔ ذرا آہٹ ہوئی، اور ان کے کان کھڑے ہوئے۔
بارے خدا خدا کر کے راستہ کٹا۔ سرائے میں پہنچے اور بھٹیاری کو کراہیہ دے کر اسٹیشن پر جا پہنچے۔

(21)

میاں آزاد ریل پر بیٹھ کر ناول پڑ رہے تھے کہ ایک صاحب نے پوچھا۔ جناب دو ایک دم لگائیے تو بیچ وان حاضر ہے۔ واللہ وہ دھواں دھار پلاؤں کہ دل پکڑ اٹھے۔ مگر یاد رکھیے دو

دم سے زیادہ کی سند نہیں۔ ایسا نہ ہو آپ بھینسیا جو تک ہو جائیں۔
 آزاد نے پیچھے پھر کر دیکھا تو ایک بگڑے دل مزے سے بیٹھ کر حقہ پی رہے ہیں۔
 بولے، یہ کیا انداز ہے بھائی، آپ ریل ہی پر گزر گئے، اور حقہ بھی نہیں چھوٹا جو کہیں
 آگ لگ جائے تو؟
 بگڑے دل : اور جو ریل ہی نکرا جائے تو؟ آسمان ہی پھٹ پڑے تو؟ اس 'تو' کا تو
 جواب ہی نہیں ہے۔ لے پیچھے گایا باتیں بنائیے گا؟
 آزاد : جی، مجھے اس کا شوق نہیں ہے۔

یہ کہہ کر پھر ناول پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اسٹیشن پر ریل ٹھہری تو خربوزے
 اور آم پٹے ہوئے تھے۔ خبیایاں کی خبیایاں بھری رکھی تھیں۔ بولے کیوں بھی اسٹیشن ہے یا آم
 کی دوکان؟ یا خربوزے کی کھان؟ آم پور ہے یا خربوزہ مگر؟
 ایک مسافر بولا : اجی حضرت نظر نہ لگائیے اب کی فصل تو کھا لینے دیجیے۔ اسی پر تو
 زندگی کا دارو مدار ہے۔ کھیت میں تیل بڑھی اور یہاں کچے گھڑے کی چڑھی۔ آج بازار میں
 آئے اور اس جانب بورائے۔ آم اور خربوزے پر ادھار پر بیٹھے ہیں۔ کپڑے سچ کھائیں،
 برتن نحاس میں ٹیبل لائیں، بدن پر لتا نہ رہے، چولہے پر تونا نہ رہے، ادھار لیں، سٹھنا تک
 گروی رکھیں، بگڑا کریں، جھگڑا کریں، مگر خربوزے پر چھری ضرور چلے۔ تڑکا ہوا، چاقو ہاتھ
 میں لیا اور خربوزے کی ٹوہ میں چلا۔ بازار ہے کہ مہک رہا ہے، خریدار ہیں کہ ٹوٹے پڑتے
 ہیں۔ ریلی کھٹکن جوانی کی امنگ میں اچھے اچھوں کو ڈانٹ بتاتی ہیں۔ میاں الگ رہو، خبیائی پر
 نہ گرنے پڑو، بس دور ہی سے بھاؤ تاؤ کرو۔ لینا ایک نہ دینا دو، مفت کا جھنجھٹ۔ اس جانب
 نے ایک تراشا دوسرا تراشا تیسرا تراشا خوب چکھے۔ آدی کیا بندر ہو گئے۔ ادھر خربوزے گئے
 اور آم کی فصل آئی منہ مانگی مراد پائی۔ جدھر دیکھیے، ڈھیر کے ڈھیر چنے ہیں۔ یہاں سنگ سوار
 ہو گئی۔ دیکھا اور جھپ سے اٹھایا تراشا اور کھایا۔ مال اسباب کے کوڑے کیے اور بے گنتی
 لیے۔ کھانے بیٹھے، تو دو داڑھی کھا گئے، چار داڑھی کھا گئے۔

آزاد : یہ داڑھی کھانے کے کیا معنی؟
 مسافر : اجی حضرت، آم اتنے کھائے کی گتھلی اور چھلکے داڑھی تک پہنچے۔
 مسافر وہ ڈیک ہانک ہی رہے تھے کہ ریل ٹھہری اور ایک چپراسی نے آکر پوچھا۔

قلاں آدمی کہاں ہے؟

آزاد: اس کمرے میں اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے؟

مسافر نے چڑاسی کی صورت دیکھی، تو چادر سے منہ لپیٹ کر کھڑکی کی دوسری طرف جھانکنے لگے۔ چڑاسی دوسرے درجے میں چلا گیا۔

آزاد: استاد، تم نے منہ جو چھپایا تو مجھے شک ہوتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، بھی اور کسی سے نہ کہو یا روں سے تو نہ چھپاؤ۔

مسافر: منہ کیوں چھپاؤں جناب، کیا کسی کا قرض کھایا ہے یا مال مارا ہے یا کہیں خون کر کے آئے ہیں؟

آزاد: آپ بہت جیسے ہو جائیے گا تو دھروا ہی دوں گا۔ لے بس، کچا چٹا کہہ سناؤ ورنہ میں پکارتا ہوں پھر۔

مسافر: ارے نہیں نہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ صاف صاف بتا دیں؟ ہم نے اب کی فصل میں خربوزے اور آم خوب چمک کر چکے، مگر کاقم کو پاس نہیں۔ پوچھو لائیں کس کے گھر سے؟ یہاں پہلے تو قرض لیا پھر ایک دوست کا مکان اپنے نام سے ٹیبل ڈالا۔ اب نالش ہوئی ہے سو ہم بھاگے جاتے ہیں۔

آزاد: ایسے آم کھانے پر لعنت، کیسے نادان ہو؟

مسافر: دیکھیے نادان وادان نہ بنائیے گا، ورنہ بری ٹھہرے گی۔

آزاد: اچھا بلاؤں چڑاسی کو؟

مسافر: دس گالیاں دے لیجیے مگر جان تو چھوڑ دیجیے۔

اتنے میں ایک مسافر نے کئی درجے پھاندے، یہ اچکا، یہ آیا، یہ جھپٹا اور دم سے سماں آزاد کے پاس ہو رہا۔

مسافر: غریب پرور

آزاد: کس سے کہتے ہو؟ ہم غریب پرور نہیں امیر پرور ہیں۔ غریب پرور ہمارے دشمن

ہوں۔

مسافر: اچھا صاحب آپ امیر کے باپ پرور دادا پرور سہی ہمارا آپ سے ایک سوال

ہے۔

آزاد: سوال اسکول کے لڑکوں سے کیجیے، یا وکالت کے امیدواروں سے۔
مسافر: داتا، ذرا سنو تو۔

آزاد: داتا بھنڈاری کو کہتے ہیں، داتا کہیں اور رہتے ہوں گے۔

مسافر: ایک روپیہ دلو! تو ہزار دعائیں دوں۔

آزاد: دعا کے تو ہم قائل ہی نہیں۔

مسافر: تو پھر گالیاں سناؤں؟

آزاد: گالیاں دو، تو بتیسی پیٹ میں ہو۔

مسافر: ارے غضب، لو اسٹیشن قریب آگیا۔ اب بے عزت ہوں گے۔

آزاد: یہ کیوں؟

مسافر: کیوں کیا ٹکٹ پاس نہیں، مگر سے دو روپے لے کر چلے تھے راستے میں لنگڑے
آم دکھائی دیے۔ رال ٹپک پڑی آؤ۔ دیکھا نہ تاؤ دو روپے ٹینٹ سے نکالے اور آم پر چھری
تیز کی۔ اب گرہ میں کوڑی نہیں۔ پاس نہ لیا، پان کھائیں البتہ۔

آزاد: واہ رے پیٹو! بھلا یہاں تک آئے کیوں کر؟

مسافر: اس کی نہ پوچھیے، یہاں سیکڑوں ہی ایسے یاد ہیں۔

اسنے میں ریل اسٹیشن پر آ پہنچی۔ ٹکٹ بابو کی کالی کالی ٹوپی اور سفید چمکتی ہوئی کھوپڑی
نظر آئی۔ ٹکٹ ٹکٹ ٹکٹ نکالو! میاں آزاد تو ٹکٹ دے کر لمبے ہوئے، بابو نے ان سے ٹکٹ
مانگا تو لگے بظلمیں جھانکنے، ویل تمہارا ٹکٹ کہاں؟

مسافر: بابو جی ہم پر تو اب کی سال کس وکس نہیں بندھا۔

بابو: یو فول! تم بے ٹکٹ کے چلتا ہے الو۔

مسافر: کیا آدمی بھی الو ہوتے ہیں؟ ادھر تو دیکھنے میں نہیں آیا، شاید آپ کے بنگال

میں ہوتا ہو۔

ٹکٹ بابو نے کاسٹل کو بلا کر ان کو حالات بھجوا یا۔ آم کھانے کا حرہ ملا، مار اور گالیاں
کھائیں سو گھاتے میں۔

گھٹا ٹپ اندھیرا چھایا ہے۔ کالا متوالا بادل جھوم جھوم کر پورب کی طرف سے آیا ہے۔
وہ گھنیری گھٹا کی ہاتھ مارا نہ سوجھے۔ اندھیرے نے کچھ ایسی ہوا بانگی کہ چاند کا چراغ گل

ہو گیا۔ یہ رات ہے یا سیاہ کاریوں کا دل؟ ہر ایک آدمی جریب ٹیکتا چل رہا ہے، مگر کلچر دہل رہا ہے کہ کہیں ٹھوکر نہ کھائیں، کہیں منہ کے بل زمین پر نہ لڑھک جائیں۔ میاں آزاد اسٹیشن سے چلے تو سرائے کا پتہ پوچھنے لگے۔ یکا یک کسی آدمی سے سر ٹکرا گیا۔ وہ بولا اندھا ہوا ہے کیا؟ راستہ بچا کے چل، پتنگ رکھے ہوئے ہیں کہیں پھٹ نہ جائیں۔

آزاد: ایس راستے میں پتنگ کیسے؟ اچھی بے پر کی اڑائی۔

پتنگ باز: بھئی واللہ، کیا کیا بگڑے دلوں سے پالا پڑ جاتا ہے۔ ہم تو نرمی سے کہتے ہیں کہ میاں ذرا دبا کر جاؤ اور آپ تیکھے ہوئے جاتے ہیں۔

آزاد: ارے نادان یہاں ہاتھ مارا سو جھتا ہی نہیں، پتنگ کس بھکڑے کو سوجھیں گے۔

پتنگ باز: کیا رتو ندھی آتی ہے؟

آزاد: کیا پتنگ بیچنے جا رہے ہو؟

پتنگ باز: اچی پتنگ بیچیں ہمارے دشمن، ہم خود گھر کے امیر ہیں یہاں سے چار کوس پر ایک قصبہ ہے وہاں کے رئیس ہمارے لنگوٹے یار ہیں۔ ان سے ہم نے چنگوں کا میدان بنا تھا۔ ہم اپنے یاروں کے ساتھ ایک بارہ دری کے کوشے پر تھے اور وہ اپنے دیوان خانے کی چھت پر۔ کوئی سات بجے سے ادھر بھی کنکڑے چھپکے ادھر بھی بڑھے۔ خوب لمڈورے پڑے۔ پانچ روپے فی بیچ بدلتا تھا۔ یار ایک پتنگ خوب لڑا۔ ہمارا مانگ دار بڑھا تھا اور ادھر کا گول دوپٹا۔ دس بارہ منٹ داؤں گھات کے بعد بیچ پڑ گئے۔ پہلے تو ہمارے کتنے نہ گئے، ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سمجھے اب کئے اور کب کئے۔ مگر واہ رے استاد ایسے کئے چھڑائے کہ واہ جی واہ! پھر بیچ لڑ گئے۔ پیسریوں نے ڈور پلا دی، کنکڑا آسمان سے جا لگا۔ جو کوئی دم اور ٹھہرتا تو وہیں جل بھن کر خاک ہو جاتا۔ اتنے میں ہم نے غوثا دے کر ایک بھبکا جو دیا تو وہ کاٹا۔ اب کوئی کہتا ہے کہ منھے پر سے اکھڑ گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ منھے پر سے اکھڑ گیا، ڈور الجھ گئی تھی کہ ایک کنکڑے نے ہم نے کوئی نو دس کاٹے۔ مگر ان کی طرف کوئی استاد آ گیا۔ اس نے کھینچ کے وہ ہاتھ دکھائے کہ خدا کی پناہ۔ ہاتھ ہی ٹوٹیں مردود کے۔ چکے چھڑا دیے۔ کبھی سڑسڑ کرتا ہوا نیچے سے کھینچ گیا۔ کبھی اوپر سے پتنگ پر چھاپ بیٹھا۔ آخر میں نے حساب جو لگایا تو پچاس روپے کے پیٹے میں آ گیا۔ مگر یہاں ٹکا پاس نہیں ہم نے بھی ایک مال تک لیا ہے، مگر کے سونے کے کڑے کسی کے ہاتھ پٹیلیں گے۔ کوئی دس تولے کے ہوں گے چپکے سے

اڑا دوں گا، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔

آزاد: آپ کے والد کیا پیشہ کرتے ہیں؟

پتنگ باز: زمین دار ہیں۔ مگر مجھے زمین داری سے نفرت ہے۔ زمین کی صورت سے نفرت ہے، اس پیشے کے نام سے نفرت ہے۔ شریف آدمی اور لٹھ لیے ہوئے میڈہ میڈہ گھوم رہے ہیں۔ ہم سے یہ نہ ہوگا۔ ہم کوئی مزدور تو ہیں نہیں۔ یہ گنواروں ہی کو مبارک رہے۔

آزاد: حضور نے تعلیم کہاں تک پائی ہے؟ آپ تو لندن کے عجائب خانے میں رکھے لائق ہیں۔

پتنگ باز: یہیں کے تھیلی اسکول میں کچھ دن گھاس چھیلی ہے۔

آزاد: کیا گھسیرا بننے کا شوق چرایا تھا؟

پتنگ باز: جناب، کوئی چھ سات برس پڑھے مگر گڈے دار پڑھائی، ایک دن حاضر تو دس دن ناغہ۔ پہلے درجے کا امتحان دیا مگر لڑھک گئے۔ ابا جان نے کہا کہ اب ہم تمہیں نہیں پڑھائیں گے۔ خیر، اس جھنجھٹ سے چھٹی پائی، تو پیش کار صاحب کے لڑکے سے دوستی بڑھائی۔ تب تک ہم زے جنگلی ہی تھے۔ حد یہ کہ حقہ پینا تک نہیں جانتے تھے۔ تو وجہ کیا؟ اچھی صحبت میں کبھی بیٹھے ہی نہیں تھے۔ چھوٹے مرزا بیچارے نے ہمیں حقہ پینا سکھایا۔ پھر تو ان کے ساتھ چندو کے چھینٹیں اڑنے لگے۔ پہلے آپ مجھے دیکھتے تو کہتے قبر میں ایک پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ بدن میں گوشت کا نام نہیں، ہڈی ہڈی گن لیجیے۔ جب سے چھوٹے مرزا کی صحبت میں تازی پینے لگا تب سے ذرا ہرا ہوں۔ پہلے ہم زے گاودی ہی تھے۔ یہ پتنگ لڑانا تو اب آیا ہے۔ مگر اب کی پچاس کے پینے میں آگئے۔ چھوٹے مرزا سے ہم نے تدبیر پوچھی تو واللہ تر سے بتلایا کہ جب بہن یا بھادج یا بی بی کی آنکھ چوکے تو کوئی سونے کی عدد صاف اڑا دو۔ بھی ضلع اسکول میں پڑھتا تو ایسی اچھی صحبت نہ ملتی۔

آزاد: واللہ آپ تو خراد پر چڑھ گئے سب گن پورے تمہیں کون کہے لٹورے؟

پتنگ باز: آپ یہاں کہاں ٹھہریں گے؟ چلیے اس وقت غریب خانے ہی پر کھانا کھائیے، سرائے میں تو تکلیف ہوگی۔ ہاں جو کوئی اور بات ہو تو کیا مضائقہ (مسکرا کر) سچ کہنا استاد کچھ لسر کا ہے؟

آزاد: میاں یہاں دل ہی نہیں ہے پاس۔ محبت کریں گے کیا۔ چلیے آپ ہی کے یہاں

مہمان ہوں، یہاں تو بے فکری کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ مگر استاد اتنا یاد رہے کہ بہت تکلیف نہ کیجیے گا۔

پتنگ باز: واللہ، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بس ایک دس سیر کا پلاؤ تو بنوائیے گا مگر تکلف نہ کیجیے گا، ماننا ہوں آپ کو۔

آزاد اور پتنگ باز اٹے پر بیٹھے۔ اٹکا ہوا سے باتیں کرتا چلا، تو کھٹ سے مکان پر داخل۔ اندر سے باہر تک خبر ہو گئی کہ میٹھے میاں آگئے۔ میاں آزاد اور وہ دونوں اترے۔ اتنے میں ایک لوٹھی اندر سے آکر بولی، چلیے بڑے صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔

پتنگ باز: اے ہے ناک میں دم کر دیا، آتے دیر نہیں ہوئی اور بلانے لگے۔ چلو آتے ہیں۔ آپ کے لیے حقہ بھر لاؤ۔ حضرت کہیے تو ذرا والد سے مل آؤں؟ گانا دانا سنیے تو بلاؤں کسی کو؟ ادھر لوٹھی اندر پہنچی تو بڑے میاں سے بولی ان کے پاس تو ان کے کوئی دوست مند نکلیے لگائے بیٹھے ہیں۔

میاں: ان کے دوست کی نہ کہو۔ شہر بھر کے بد معاش، چور مکار، جموٹوں کے سردار ان کے لنگو پیے یار ہیں۔ بھلے مائس سے ملتے جلتے تو انھیں دیکھا ہی نہیں۔
لوٹھی: نہیں میاں شکل صورت سے تو شریف بھلے مائس معلوم ہوتے ہیں۔
خیر، رات کو آزاد اور میٹھے میاں نے میٹھی نیند کے مزے اڑائے، صبح کو ہوالی موالی جمع ہوئے۔

ایک: حضور، کل تو خوب خوب پیچ لڑے، اور ہوا بھی اچھی تھی۔
پتنگ باز: پیچ کیا لڑے پچاس کے ماتھے گئی۔ خیر، اس کا تو یہاں غم نہیں، مگر کرکری بڑی ہوئی۔

دوسرا: واہ حضور، کرکری کی ایک ہی کہی۔ قسم خدا کی، وہ لٹڈورا پیچ نکالا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ زمانہ بھر یہی کہتا تھا کہ بھی پیچ کیا کاٹا، کمال کیا۔ کچھ انعام دلوائیے، خداوند! آپ کے قدموں کی قسم، آج شہر بھر میں اس پیچ کی دھوم ہے۔ چالیس پچاس روپیوں کی بھی کوئی حقیقت ہے۔

شام کے وقت آزاد اور میاں پتنگ باز بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ ایک مولوی صاحب لٹھنی دستار کھوپڑی پر جمائے، کافی آنکھ کو اس کے نیچے چھپائے، دوسری میں بریلی کا

سرمہ لگائے کمرے میں آئے۔ انھوں نے علیک سلیم کے بعد جیب سے ایک اشتہار نکال کر آزاد کے ہاتھ میں دیا۔ آزاد نے اشتہار پڑھا تو پھڑک گئے۔ ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ دور دور سے شاعر بلائے گئے تھے۔ طرح کا مصرع تھا۔

”ہم سے اُس شوخ نے عیاری کی“

مولوی صاحب تو اُلٹے پاؤں لیے ہوئے، یہاں مشاعرے کی تاریخ جو دیکھتے ہیں تو اکتیس فروری لکھی ہوئی ہے۔ حیرت ہوئی کہ فروری کا تو اٹھائیس اور کبھی انتیس ہی دن کا مہینہ ہوتا ہے۔ یہ اکتیس فروری کون سی تاریخ ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ اسی وقت مشاعرہ تھا۔ خیر دونوں آدمی بڑے شوق سے پتا پوچھتے ہوئے گلابی بارہ دری میں داخل ہوئے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ نئی نئی وضع، نئے نئے فیشن کے لوگ جمع ہیں۔ کسی کا دماغ ہی نہیں ملتا، جسے دیکھو تانا شاہ بنا بیٹھا ہے، دنیا کی بادشاہت کو جوتی کی نوک پر مارتا ہے۔ شاعری کے شوقین امڑے چلے آتے ہیں۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ جب ذات بھیلگی اور چاندنی خوب نکھری تو مشاعرہ شروع ہوا۔ شاعروں نے چمکتا شروع کیا۔ مجلس کے لوگ ایک ایک شعر پر اتنا چیخے چلائے کہ ہونٹ اور گلے سوکھ کر کاٹنا ہو گئے۔ اوہو ہوہو آہا ہا ہا، واہ واہ سبحان اللہ کے دو گھرے برس رہے تھے۔ شاعر نے پورا شعر پڑھا بھی نہیں کہ یار لوگ لے اڑے۔ واہ حضرت، کیوں نہ ہو! قسم خدا کی! قلم توڑ دیا! واللہ، آج اس لکھنؤ میں آپ کا کوئی ثانی نہیں! ایک شاعر نے یہ غزل پڑھی:

ہم کو دیکھا تو وہ ہنس دیتے ہیں

آنکھ جھپتی ہی نہیں یاری کی

محفل کے لوگوں نے پورا شعر تو سنا نہیں، یاری کو گاڑی سن لیا۔ گاڑی کی، واہ واہ، کیا شعر فرمایا، گاڑی کی۔ اب جسے دیکھیے غل مچا رہا ہے۔ گاڑی کی، گاڑی کی، مگر غل غپاڑے میں سنتا کون ہے۔ شاعر بیچارہ چنتا ہے کہ حضرت گاڑی کی نہیں، یاری کی۔ پر یار لوگ اپنا ہی راگ الاپتے جاتے ہیں۔ تب تو میاں آزاد نے جھلا کر کہا، صاحبو گاڑی نہ پچھاڑی، چوپہیا نہ پاکی گاڑی، خدا کے واسطے پہلے شعر تو سن لو، پھر تعریف کے پل باندھو۔ گاڑی کی نہیں، یاری کی۔

آنکھ جھپتی ہی نہیں یاری کی۔

دوسرے شاعر نے یہ شعر پڑھا۔

امید روز وصل تھی کس بد نصیب کو
قسمت ال۔ گئی میرے روزِ سیاہ کی

حاضرین: نگاہ کی، سجان اللہ، نگاہ کی، حضرت، یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

شاعر: نگاہ نہیں روزِ سیاہ، نگاہ سے تو یہاں کچھ معنی ہی نہ نکلیں گے۔

یہ کہہ کر انھوں نے پھر اسی شعر کو پڑھا اور سیاہ کے لفظ پر خوب زور دیا کہ کوئی صاحب پھر نگاہ نہ کہہ انھیں۔

آدمی رات تک ہو حق چتا رہا۔ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پڑوسیوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ایک ایک شعر پڑھنے کی چار چار دفعہ فرمائش ہو رہی ہے اور میں مرتبہ اٹھا بیٹھی، سلام پر سلام اور آداب پر آداب، اچھی قواعد ہوئی۔ لالا خوش وقت رائے اور منشی خورشید رائے تین تین سو شعروں کی غزلیں کہہ لائے تھے، جن کا ایک شعر بھی درست نہیں۔ ایک بجے سے پڑھنے بیٹھے تو تین بجے دیے۔ لوگ کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں، مگر وہ کسی کی نہیں سنتے۔

وہاں سے میاں آزاد اور ان کے دوست گھر آئے۔ تڑکا ہو گیا تھا۔ آزاد تو تھوڑی دیر سو کر اٹھ گئے، مگر میاں پتنگ باز نے دس بجے تک کی خبر لی۔

آزاد: آج تو آپ بڑے سویرے اٹھے۔ ابھی تو دس ہی بجے ہیں۔ بھئی بڑے سونے والے ہو۔

پتنگ باز: جناب، تڑکا تو مشاعرے میں ہی ہو گیا تھا۔ جب آدمی صبح کو سوئے گا تو دس بجے سے پہلے کیا اٹھے گا۔ اور سچ تو یوں ہے کہ ابھی اور سونے کو جی چاہتا ہے، کچھ مشاعرے کے جھگڑے کا بھی حال سنا؟ آپ تو کوئی چار بجے سو رہے تھے۔ ہم نے ساری داستان سنی۔ بڑی سچ چل گئی۔ مولوی بدر اور منشی فشار میں تو لکڑی چلتے چلتے رہ گئی۔ جو میاں رنگین نہ ہوں تو دونوں میں جوتی چل جائے۔

آزاد: یہ کیوں، کس بات پر؟

پتنگ باز: کچھ نہیں یوں ہی۔ میں تو سمجھا اب لکڑی چلی۔

آزاد: تو مشاعرہ کیا پالی تھی؟ پوچھیے شاعری کو لکڑی اور بانک سے کیا واسطہ، قلم کا زور

دکھانا چاہیے کہ ہاتھ کا۔ کسی طرح بدر اور فشار میں ملاپ کرا دیجیے۔
 پتنگ باز: اے توبہ! ملاپ، ملاپ ہو چکا۔ بدر کا یہ حال ہے کہ بات کی اور غصہ آگیا۔
 اور میاں فشار ان کے بھی چچا ہیں۔ بات پیچھے کرتے ہیں، چائنا پہلے ہی جماتے ہیں۔
 آزاد: آخر بکھیرے کا سبب کیا؟

پتنگ باز: سوا حسد کے اور کیا کہوں، ہوا یہ کہ فشار نے پہلے پڑھا۔ اس پر مولوی بدر
 بگڑ کھڑے ہوئے کہ ہم سے پہلے انھیں کیوں پڑھنے دیا گیا۔ ان میں کیا بات ہے۔ ہم بھی تو
 استاد کے لڑکے ہیں۔ اس پر فشار بولے، ابھی بچے ہو، سچے کرنا تو جانتے نہیں، شاعری کیا
 جانو۔ کچھ دن استاد کی جوتیاں سیدھی کرد، تو آدمی بنو۔ بدر نے آستینیں الٹ لیں اور چڑھ
 دوڑے۔ فشار کے شاگردوں نے بھی ڈنڈا سیدھا کیا۔ اس پر لوگوں نے دوڑ کر بیچ بچاؤ کر
 دیا۔

شام کے وقت میاں آزاد نے کہا۔ بھئی، اب تو بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا ہے۔ چلیے، ذرا
 چار پانچ کوس سیر تو کر آئیں۔ پتنگ باز نے چار پانچ کوس کا نام سنا تو گھبرائے۔ یہ بیچارے
 مہین آدمی، آدھ کوس بھی چلنا کٹھن تھا، دس قدم چلے تو ہانپنے لگے۔ کہیں گئے بھی تو ہانکھن
 پر۔ بھلا دس میل کون جاتا؟ بولے حضرت، میں اس سیر سے باز آیا۔ آپ کو تو ڈاک کے
 ہر کاروں میں نوکری کرنی چاہیے۔ مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے کہ بے سبب بیچ کوئی چکر لگاؤں
 اور آدمی سے اونٹ بن جاؤں، آپ جاتے ہیں تو جائیے، مگر جلد آئیے گا۔ بیچ کہتے ہیں لمبا
 آدمی عقل کا دشمن ہوتا ہے۔ یہ گپ اڑانے کا وقت ہے یا جنگل میں گھومنے کا؟

ایک مصاحب: آپ بجا فرماتے ہیں، بھلے مانسوں کو کبھی جنگل کی دھن سہائی ہی نہیں
 اور حضور کے یہاں گھوڑا بگدھنی سواریاں موجود ہیں۔ جوتیاں چٹختے ہوئے آپ کے دشمن
 چلیں۔

آزاد: جناب یہ نزاکت نہیں ہے اس کو تپ دق کہتے ہیں۔ آپ پانچ کوس نہ چلیے دو
 ہی کوس چلیے، آدھ ہی کوس چلیے۔

پتنگ باز: نہیں جناب، معاف فرمائیے۔

آزاد لے لے ڈگ بڑھاتے چپچتم کی طرف روانہ ہوئے۔

میاں آزاد کے پاؤں میں تو سنچر تھا۔ دو دن کہیں تک جائیں تو تلوے کھلانے لگیں۔ پتنگ باز کے یہاں چار پانچ دن جو جم گئے تو طبیعت گھبرانے لگی۔ لکھنؤ کی یاد آئی۔ سوچے اب وہاں سب معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ بوریا بندھنا اٹھایا اور شکرم گاڑی کی طرف چلے۔ ریل پر بہت چڑھ چکے تھے، اب کی شکرم پر چڑھنے کا شوق ہوا۔ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچے۔ ڈیڑھ روپے کرایہ ملے ہوا، ایک روپیہ بیعانہ دیا۔ معلوم ہوا سات بجے گاڑی چھوٹ جائے گی، آپ ساڑھے چھ بجے آجائیے۔ آزاد نے اسباب تو وہیں رکھا، ابھی تین ہی بجے تھے، پتنگ باز کے یہاں آکر گپ شپ کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں پونے سات بج گئے۔ شکرم کی یاد آئی بچا کچھا اسباب مزدور کے سر پر لا کر لدے پھندے گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ راہ میں لمبے لمبے ڈگ دھرتے، مزدوروں کو لٹکارتے چلے آتے ہیں کہ تیز چلو، قدم جلد اٹھاؤ، جہاں سناٹا دیکھا، وہاں تھوڑی دور دوڑنے بھی لگے کہ وقت پر پہنچیں، ایسا نہ ہو کہ گاڑی چھوٹ جائے۔ وہاں ٹھیک سات بجے پہنچے تو سناٹا پڑا ہوا۔ آدمی نہ آدم زاد۔ پکارنے لگے، ارے میاں چپراسی، منشی جی، اجی منشی جی! کیا سانپ سوگھ گیا؟ بڑی دیر کے بعد ایک چپراسی نکلا، کہیے کیا ڈاک کیجیے گا؟

آزاد: اور سنیے ڈاک کیجیے گا کہ ایک ہی کمی۔ میاں بیعانہ کا روپیہ بھی دے چکے۔
چپراسی: اچھا تو اس گھاس پر بستر جمائیے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے یا ذرا بازار کی سیر کر آئیے۔

آزاد: ارے سیر کیسی؟ ڈاک چھوٹے گی آخر کس وقت؟
چپراسی: کیا معلوم، دیکھیے منشی جی سے پوچھوں۔
آزاد نے منشی جی کے پاس جا کر کہا۔ ارے صاحب سات بجے بلایا تھا جس کے ساڑھے سات ہو گئے اب اور کب تک بیٹھا رہوں؟
منشی جی: جناب، آج تو آپ ہی آپ ہیں اور کوئی مسافر ہی نہیں۔ ایک آدمی کے لیے چالان تھوڑے چھوڑیں گے۔

آزاد: کہیں اس بھروسے نہ رہیے گا، بیعانہ دے چکا ہوں۔

نشی: اچھا، تو ٹھہریے۔

آٹھ بج گئے، نو بجے گئے، دس بجے گئے، کوئی گیارہ بجے تین مسافر آئے۔ جب جاکر شکرم چلی۔ کوئی آدھ کوس تک تو دونوں گھوڑے تیزی کے ساتھ گئے، پھر سرنگ بول گیا۔ یہ گرا، وہ گرا، کوچ دان نے کوڑے پر کوڑے جمنا شروع کیا، پر گھوڑے نے بھی ٹھان لی کہ ٹلوں کا ہی نہیں۔ کوچ مین، گھسیارا، بارگیر، سب کے سب ٹھوک رہے تھے، مگر وہ کھڑا ہانپتا ہے۔ بارے بڑی مشکل سے پھونک پھونک کر قد رکھتا ہوا دوسری چوکی تک آیا۔

دوسری چوکی میں ایک ٹٹو دبلا پتلا، دوسرا گھوڑا مرا ہوا سا تھا، ہڈیاں ہڈیاں گن لیجیے۔ یہ پہلے ہی سے رنگ لائے۔ کوچ مین نے خوب کوڑے جمائے، جب کہیں چلے۔ مگر دس قدم چلے تھے کہ پھر دم لیا۔ سائیکس نے آنکھیں بند کر کے سی پھٹکارنی شروع کی۔ پھر دس بیس قدم آہستہ آہستہ بڑھے، پھر ٹھہر گئے۔ خدا خدا کر کے تیسری چوکی آئی۔

تیسری چوکی میں ایک دبلا پتلا مشکلی رنگ کا گھوڑا اور دوسرا ٹکڑا تھا۔ پہلے ذرا چیں چپٹ، پھر چلے۔ ایک آدھا کوس گئے تھے کہ کچھڑ ملی، پھر تو قیامت کا سامنا تھا۔ گھوڑے تھان کی طرف بھاگتے تھے، کوچ مین اس تھامے تک نک کرتا جاتا تھا، بارگیر پہیوں پر زور لگاتے تھے۔ مسافروں کو حکم ہوا کہ اتر آئیے، ذرا ہوا کھائیے۔ بیچارے اترے۔ آدھ کوس تک پیدل چلے۔ گھوڑے قدم قدم پر منہ موڑ دیتے تھے۔ وہ چل پوں پچی ہوئی تھی کہ خدا کی پناہ۔ آدھ کوس کے بعد حکم ہوا کہ اپنا اپنا بوجھ اٹھاؤ، گاڑی بھاری ہے۔ چلیے صاحب سب نے گھڑیاں سنبھالیں۔ سر پر اسباب لادے چلے آتے ہیں۔ تین گھنٹے میں کہیں چوکی طے ہوئی، مسافروں کا دم ٹوٹ گیا، کوچ مین اور سائیکس کے ہاتھ کوڑے مارتے مارتے اور پہیوں پر زور لگاتے لگاتے بے دم ہو گئے۔

چوتھی چوکی کی جوزی دیکھنے میں اچھی تھی۔ لوگوں نے سمجھا تھا، تیز جائے گی، مگر جمالی خربوزوں کی طرح دیکھنے ہی بھر کی تھی۔ کوچوان اور بارگیروں نے لاکھ لاکھ زور لگایا، مگر انھوں نے ذرا کان تک نہ ہلائے، کنوئی تک نہ بدلی۔ بت بنے کھڑے ہیں، میدان میں اڑے ہیں، کوئی تو گھاس کا منٹا لاتا ہے، کوئی دور سے تو بڑا دکھاتا ہے، کوئی پیسے پر زور لگاتا ہے، کوئی اوپر سے کوڑے جماتا ہے۔ آخر مسافروں نے بھی اتر کر زور لگایا، مگر ٹائیکس ٹائیکس پھس۔ آخر گھوڑوں کے عوض تیل جوتے گئے۔

پانچویں چوکی میں بابا آدم کے وقت کا ایک گھوڑا آیا۔ گھوڑا کیا فخر تھا۔ آنکھیں ماتم رہا تھا۔ کھیاں بھن بھن کرتی تھیں۔ رات کو بھی کھیں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔
 آزاد: ارے بھئی، اب چلو نہ! آخر یہاں کیا ہو رہا ہے؟ رات چلنے ہی سے کتا ہے۔
 کوچ مین: اے لو صاحب، گھوڑے کا تو بندوبست کر لیں۔ ایک ہی گھوڑا تو اس چوکی پر ہے۔

آزاد: اہی دوسری طرف بھینس جوت دینا۔

ایک مسافر: یا ہم ایک سہل تدبیر بتائیں۔ مسافروں سے کہیے اتر پڑیں بوجھ اپنا اپنا سر پر لادیں اور زور لگا کر بگدھی کو ایک چوکی تک ڈھکیل لے جائیں۔
 اتنے میں ایک بھیارا اپنے ٹٹو کو تک تک کرتا چلا آتا تھا۔ کوچوان نے پوچھا، کہو بھائی بھاڑا کرتے ہو؟ جو چاہے سو مانگوں، دیں گے۔ نقد دام لو اور بگدھی پر بیٹھ جاؤ۔ ایک چوکی تک تمہارے ٹٹو کو بگدھی میں جوتیں گے۔

بھیارا: واہ اچھے آئے! ٹٹو! کبھی گاڑی میں جوتا بھی گیا ہے؟ مرغی کے برابر ٹٹو، اور جوتے چلے ہیں شکر میں۔ یوں چاہے پیٹھ پر سوار ہو لو، مدا ڈاک گاڑی میں کیسے چل سکتا ہے؟

کوچ مین: ارے بھئی تم کو بھاڑے سے مطلب ہے، یا تقریر کرو گے؟ ہم تو اپنی ترکیب سے جوت لیں گے۔

آزاد نے بھیارا سے کہا: روپیہ ٹینٹ میں رکھو اور کہو، اچھا جوتو۔ کچھ تھک تھکا کر آپ ہی ہار جائیں گے۔ روپیہ تمہارے باپ کا ہو جائے گا۔ وہ بھی راضی ہو گیا۔ اب کوچ مین نے ٹٹو کو جوتا چاہا، مگر اس نے ٹیکڑوں ہی بار پشت اچھالی، دولتیاں جھاڑیں اور گاڑی کے پاس نہ پہنکا۔ اس پر کوچوان نے ٹٹو کو ایک کوڑا مارا۔ تب تو بھیارا آگ ہو گیا۔ اے واہ میاں اچھے ملے ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمارا جانور بگدھی میں نہ چلے گا۔ آپ نے زبردستی کی اب گدھے کی طرح گدگد پینے لگے۔

وہ تو ٹٹو کو بغل میں داب لہا ہوا، یہاں شکر میدان میں پڑی ہوئی ہے۔ مسافر جمائیاں لے رہے ہیں۔ سائیکس چلم پر چلم اڑاتے ہیں۔ سب مسافروں نے مل کر قسم کھائی کہ اب شکر پر نہ بیٹھیں گے۔ خدا جانے کیا گناہ کیا تھا کہ یہ معیبت سہی۔ پیدل آنا اس سے

کہیں اچھا۔

پانچویں چوکی کے آگے پہنچے تو ایک مسافر نے جس کا نام پلٹو تھا، ٹھہرے کی بوتل نکالی اور لگا لگائی پر کئی اڑانے۔ میاں آزاد کا دماغ مارے بدبو کے پریشان ہو گیا۔ ذہب سے تو انہیں کوئی واسطہ نہ تھا، کیونکہ خدا کے سوا اور کسی کو مانتے ہی نہ تھے، لیکن بدبو نے انہیں بے چین کر دیا۔ ایک دوسرے مسافر رسال دار تھے۔ ان کی جان بھی عذاب میں تھی۔ وہ شراب کے نام پر لاجول پڑھتے اور اس کی بو سے کوسوں بھاگتے تھے۔ جب بہت دق ہو گئے تو میاں آزاد سے بولے، حضرت یہ تو بے ذہب ہوئی۔ اب تو ان سے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ خدا کے واسطے اس وقت نہ پیچھے۔ تھوڑی دیر میں ہم کو اور آپ کو گالیاں نہ دینے لگیں، تو کچھ ہارتا ہوں۔ ذرا آنکھ دکھا دیجیے جس میں بہت بڑھنے نہ پائیں۔

آزاد: خدا کی قسم، دماغ پھٹا جاتا ہے۔ آپ ڈپٹ کر لٹا کر دیجیے۔ نہ مانیں تو میں کان گرما دوں گا۔

رسال دار: کہیں ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ پنجے جھڑ کر لڑنے کو تیار ہو جائے گا۔ شرابی کے منہ لگنا کوئی اچھی بات تھوڑے ہے۔

دونوں میں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ لالہ پلٹو نے ہانک لگائی۔ ہرے ہرے باغ میں گولا بولا، پگ آگے پگ پیچھے۔ یہ بے تکلی کہہ کر ہاتھ جو چھڑکا تو رسال دار کی دونوں ٹانگوں پر شراب کے چھینٹے پڑ گئے۔ ہائیں ہائیں، بد معاش الگ ہٹ، اٹھ جا یہاں سے، نہیں تو دوں گا ایک تپڑ۔

پلٹو: برسوا رام جھڑا کے سے، رسال دار کی بڑھیا مر گئی فالتے سے۔ ہمارا باپ گدھا تھا۔

رسال دار: چپ، کھوس دوں بانس منہ میں؟

پلٹو: اجی، تو ہنسی ہنسی میں روئے کیوں دیتے ہو؟ واہ ہم تو اپنے باپ کو برا کہتے ہیں۔

آزاد: کیا تمہارے باپ گدھے تھے؟

پلٹو: اور کون تھے؟ آپ ہی بتائیے۔ عمر بھر ڈولی اٹھائی مگر مرتے دم تک نہ اٹھاتا ائی۔

رسال دار: کیا کہتا تھا؟

پلٹو: اور نہیں تو کیا چہا تھا، یا بیلدار تھا؟ یا آپ کی طرح رسال دار تھا؟

آزاد: ہے نشے میں تو کیا۔ بات کچی کہتا ہے۔

پلٹو: اجی اس میں چوری کیا ہے؟ ہم کہاں، ہمارا باپ کہاں
 آزاد: کیجیے آپ کی مہری تو خیریت سے ہے۔
 پلٹو: چل شکرم، چل گھوڑے، ہگل بجے بھونپو بھونپو، سامنے کاٹا دکان میں آتا، کبڑیوں
 کے یہاں بھانٹا، رسال دار کے لگاؤں چائنا۔

رسال دار: ایسا نہ ہو کہ میں نشہ و شارب ہرن کر دوں۔ زبان کو لگام دے۔
 پلٹو: اچھا سائیکس ہے۔

آزاد: اے، سائیکسی علم دریاؤ ہے۔

پلٹو: تو سرناؤ ہے تو بن بلاؤ ہے۔

رسال دار: کوچ میں بکھی ٹھہراؤ!

پلٹو: کوچ میں بگدھی چلاؤ۔

میاں آزاد نے دیکھا رسال دار کا چہرہ مارے غصے کے لال ہو گیا تو انھوں نے بات
 ٹال دی اور پوچھا، کیوں پلٹو مہراج، سچ کہنا تم نے تو کبھی ڈولی نہیں اٹھائی؟ پلٹو بولے: نہیں
 کبھی نہیں۔ ہاں برتن مانجھے ہیں۔ مگر ہوش سنبھالتے ہی مدرے میں پڑھنے لگے اور اب تار
 گھر میں نوکر ہیں۔ رسال دار جی لو پیتے ہو؟ رسالدار کے منہ کے پاس کچی لے جا کر کہا، پیو
 پیو، اتنا کہنا تھا کہ رسال دار جل بھن کر خاک ہو گئے، تر سے ایک چائنا رسید کیا، دوسرا اور دیا،
 پھر تین چار اور لگائے۔ پلٹو مزے سے بیٹھے چپیتیں کھایا کیے۔ پھر قہقہہ لگا کر بولے، اے جا،
 بڑا رسالدار بنا ہے۔ نام بڑا، درشن تھوڑے۔ ایک جوں بھی نہ مری۔ رسال داری کیا خاک
 کرتے ہو؟ چلو، اب تو ایک کچی پیو دوں پھر؟

رسال دار: بھئی اس نے تو ناک میں دم کر دیا۔ پیٹتے پیٹتے ہاتھ تھک گئے۔

کوچ مین: رسال دار صاحب یہ کیا گل مچ رہا ہے؟

آزاد: بڑی بات کی تم جیتے تو بچے۔ ہم سمجھتے تھے کہ سانپ سونگھ گیا۔ یہاں مار دھار بھی
 ہو مکی حسیں خبر ہی نہیں۔

کوچ مین: مار دھار! یہاں مار دھار کیسی؟

رسال دار: دیکھو: یہ سور شراب پی رہا ہے اور سب کو گالیاں دیتا ہے۔ میں نے خوب

چینا، پھر بھی نہیں مانتا۔

پلٹو: جموئے ہو! کس نے چٹا! کب چٹا؟ یہاں تو ایک جوں بھی نہ مری۔
کوچ مین: لالہ، تھوڑی ہم کو بھی پلاؤ۔

پلٹو اور کوچ مین دونوں کوچ بکس پر جا بیٹھے اور کچیاں کا دور چلنے لگا۔ جب دونوں بدست ہوئے تو آپس میں دھول دھپا ہونے لگا۔ اس نے اس کے پڑ لگایا، اس نے اس کے ایک ٹیپ جڑی۔ کوچ مین نے پلٹو کو دھکیل دیا۔ پلٹو نے گرتے ہی پاؤں پکڑ کر گھینا، تو کوچ مین بھی دم سے گرے۔ دونوں چمٹ گئے۔ ایک نے کولے پر لادا، دوسرا بغلی ڈوبا۔ مکا چلنے لگا۔ کوچ مین نے جھپٹ کے پلٹو کی ٹنگوی لی، پلٹو نے اس کے پٹے پکڑے۔ رسال دار کو غصہ آیا تو پلٹو کے بے بھاؤ کی چمپتیں لگائیں۔ ایک دو تین کر کے کوئی پچاس تک گن گئے۔ آزاد نے دیکھا کہ میں خالی ہوں۔ انھوں نے کوچ مین کو چپتینا شروع کیا۔

آزاد: کیوں بچہ پیو گے شراب؟ سور، گاڑی چلاتا ہے کہ شراب پیتا ہے؟
رسال دار: توڑ دوں سر، چٹک دوں بوتل سر پر۔

پلٹو: تو آپ کیا اکثر رہے ہیں؟ آپ کی رسالدار کو تو ہم نے دیکھ لیا۔ دیکھو کوچ مین کے سر پر آدمے بال رہ گئے، یہاں بال بھی نہ بانکا ہوا۔
رسال دار: بس بھئی، اب ہم ہار گئے۔

اس جمعیت میں تڑکا ہو گیا۔ مسافر رات بھر کے جگے ہوئے تھے، جھپکیاں لینے لگے۔ معلوم نہیں کتنی چوکیاں آئیں اور گئیں۔ جب لکھنؤ پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔

(23)

مجاں آزاد حکرم پر سے اترے، تو شہر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ لکھنؤ میں گھومے تو بہت تھے پر اس صے کی طرف آنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ سڑکیں صاف، کوڑے کرکٹ سے کام نہیں، گندگی کا نام نہیں، وہاں ایک رنگین کوفھی نظر آئی تو آنکھوں نے وہ تراوٹ پائی کہ واہ جی واہ! اس کی بناوٹ اور سہاوت ایسی بھائی کی سبحان اللہ! بس دل میں کھب ہی تو گئی۔
روشیں دنیا سے نرالی، پودوں پر وہ جوین کہ آدمی برسوں گھورا کرے۔

مجاں آزاد نے ہرے بھرے درخت کے سائے میں آسن جمایا۔ ٹہنیاں ہوا کے جموئوں سے جموٹی تھیں، میوے کے بوجھ سے زمین کو بار بار چومتی تھیں۔ آزاد غنڈے غنڈے ہوا

کے جھوٹوں کا مزہ لے رہے تھے کہ ایک مسافر ادھر سے گزرا۔ آزاد نے پوچھا۔ کیوں صاحب اس کوٹھی میں کون رکھیں رہتا ہے؟

مسافر: رکھیں نہیں ایک ریشہ رہتی ہیں۔ بڑی مالدار ہیں، رات کو روز بجرے پر دریا کی سیر کو نکلتی ہیں۔ ان کی دونوں لڑکیاں بھی ساتھ ہوتی ہیں۔

آزاد: کیوں صاحب لڑکیوں کی عمر کیا ہوگی؟

مسافر: اب عمر کا حال مجھے کیا معلوم۔ مگر سیانی ہیں، بڑی تیزدار ہیں اور بڑھیا تو آفت کی پڑیا ہے۔

آزاد: شادی ابھی نہیں ہوئی؟

مسافر: ابھی شادی نہیں ہوئی، نہ کہیں بات چیت ہے۔ دونوں بہنوں کو پڑھنے لکھنے اور سیر کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ صفائی کا دونوں کو خیال ہے۔ خدا کرے ان کی شادی اچھے شہروں میں ہو۔

آزاد: آپ نے تو وہ خبر سنائی کہ مجھے ان لڑکیوں کو سیر کرتے ہوئے دیکھنے کا شوق ہو گیا۔

مسافر: تو پھر اسی جگہ بستر جما رکھیے۔

آزاد: آپ بھی آجائیں تو مزہ آجائے۔

مسافر: آجاؤں گا۔

آزاد: ایسا نہ ہو کہ آپ نہ آئیں اور مجھے بھیڑیا اٹھا لے جائے۔

مسافر: آپ بڑے دل لگی باز معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں اپنے وعدے کے سچے ہیں۔

بس شام ہوئی اور بندہ یہاں پہنچا۔

یہ کہہ کر وہ حضرت تو چلتے ہوئے اور آزاد درختوں سے میوے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

پھر چڑیوں کا گانا بنا۔ پھر دریا کی لہریں دیکھیں۔ کچھ دیر تک گاتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی اور وہ مسافر نہ آیا۔ آزاد دل میں سوچنے لگے شاید حضرت جھانسا دے گیا۔ اب شام میں کیا باقی ہے۔ آنا ہوتا تو آنے جاتے۔ شاید آج بیگم صاحبہ بجرے پر سیر بھی نہ کریں گی۔ سیر کرنے کا بھی تو وقت ہے۔ اتنے میں مہاں مسافر نے آکر پکارا۔

آزاد: خیر آپ آئے تو۔ میں تو آپ کے نام کو روچکا تھا۔

مسافر: خیر، اب بیسے۔ دیکھیے وہ ہاتھی آرہا ہے۔ دونوں پالکیاں بھی ساتھ ہیں۔

آزاد: کہاں کہاں؟ کدھر؟

مسافر: اینٹ کی عینک لگاؤ۔ اتنی بڑی پالکی نہیں دیکھ سکتے۔ ہاتھی بھی نہیں دکھائی دیتا۔ کیا رتوندی آتی ہے؟

آزاد: آہا ہا! وہ دیکھیے۔ اس تو درخت کے سائے میں رک رہا۔

مسافر: گھبرائیے نہیں، یہیں آ رہی ہے۔ اب کوئی اور ذکر چھیڑیے، جس میں معلوم ہو کہ دو مسافر تھک کر کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔

آزاد: یہ آپ کو خوب سوجھی! ہاں صاحب اب کی آم کی فصل خوب ہوئی۔ جدھر دیکھو، پٹے پڑے ہیں۔ منڈی جائیے، کھانچوں کی کھانچیاں۔ تربوز کو دیکھ آئیے، کوئی نکلے کو نہیں پوچھتا۔ اور آم کے سامنے تربوز کو کون ہاتھ لگائے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بجزا تیار ہوا۔ دونوں بہنیں اور بیگم صاحبہ اس میں بیٹھیں۔ یکایک پورب کی طرف سے کالی متوالی گھٹا جھومتی ہوئی انھی اور بجلی نے چکنا شروع کیا۔ ملاح نے بجزے کو کھونٹے میں باندھ دیا۔ دونوں لڑکیاں ہاتھی پر بیٹھیں اور گھر کی طرف چلیں۔ آزاد نے کہا۔ یہ برا ہوا! طوفان نے ہتھے ہی پر ٹوک دیا، نہیں تو اس وقت بجزے کی سیر دیکھ کر دل کی کلی کھل جاتی۔ آخر دونوں آدمی گھومتے گھامتے ایک باغ میں پہنچے، تو میاں مسافر بولے۔ حضرت اب کی آم اتنی کثرت سے پیدا ہوا کہ نکلے سیر نہیں، نکلے ہزار لگ گئے۔ لیکن بچے والے کا یہ حال ہے کہ جہاں کسی بھلے مانس نے راہ چلتے کوئی آم اٹھالیا اور بس چٹ پڑا۔ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے۔ یہاں سے کوئی چار کوس پر ایک مسافر میدان میں چلا جاتا تھا۔ ایک کانا کھڑا آم ٹپ سے زمین پر پٹک پڑا۔ مسافر کو کیا معلوم کہ کون ادھر ادھر تاک رہا ہے، چپکے سے آم اٹھالیا۔ اٹھانا تھا کہ دو گنوار دل لٹھ کندھے پر رکھے مار سارے کا مار سارے کا کر چے نکل آئے۔ مسافر نے آم جھٹ زمین پر پٹک دیا۔ لیکن ایک گنوار نے آتے ہی گالیاں دینی شروع کیں اور دوسرے نے گھونسا تانا۔ مسافر بھی چستریہ آدمی تھا، آگ ہو گیا۔ مارے غصے کے اس کا بدن قرقر کا پٹنے لگا۔ بڑھ کے جو ایک چائنا دیتا ہے تو ایک گنوار لڑکھڑا کے دھم سے زمین پر۔ دوسرے نے جو یہ حال دیکھا تو لٹھ تانا۔ راجپوت بغلی ڈوب کر جا پہنچا، ایک آنٹی جو دیتا ہے تو چاروں شانے چت۔ ہم بھی کل ایک باغ میں پھنس گئے تھے۔ شامت

جو آئی تو ایک درخت کے سائے میں دوپہر یا منانے بیٹھ گئے۔ بیٹھنا تھا کہ ایک نے تڑے گالی دی۔ اب سینے کہ گالی تو دی ہم کو لیکن ایک پہلوان بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ سنتے ہی چٹ گیا اور چمٹتے ہی کوہلے پر لادا۔ گرے منہ کے بل۔ پہلوان چھاپ بیٹھا، ہفتے گانٹھ لیے، ہلینگوا باندھ کر آسمان دکھا دیا، اور اپنے شاگردوں سے کہا: چڑھ جاؤ بیڑ پر، اور آم، پتے، بور، شبنی، جو پاؤ توڑ توڑ کر پھینک دو، بیڑ نوج ڈالو، لیکن لوگوں نے سمجھایا کہ استاد جانے دو، گالی دینا تو ان کا کام ہے۔ یہ تو ان کے سامنے کوئی بات ہی نہیں، یہ اسی غائقہ ہیں کہ خوب دھنیں۔

آزاد: کیوں صاحب، دھنیں کیوں جائیں؟ ایسا نہ کریں تو سارا باغ مسافروں ہی کے لیے ہو جائے۔ لوگ بیڑ کا بیڑ جڑ اور پھنگی تک چٹ کر جائیں۔ آپ تو سمجھے کہ یہ ایک آم کے لیے کٹ مرا، مگر اتنا نہیں سوچتے کہ ایک ہی ایک کر کے ہزار ہوتے ہیں۔ اس تاکید پر تو یہ حال ہے کہ لوگ باغ کے باغ لوٹ کھاتے ہیں اور جو کہیں اتنی تو قومی میں نہ ہو تو نہ جانے کیا ہو جائے۔

میاں مسافر کل آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ آزاد آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی اپنے لڑکے کو گودی میں لیے تھکی دے دے کر سلا رہا ہے۔ آجاری ننڈیا تو آ کیوں نہ جا، میرے بالے کو گود سلا کیوں نہ جا۔ آزاد ایک دل لگی باز آدمی، جا کر اس سے پوچھتے کیا ہیں۔ کس کا پلا ہے؟ وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا، بولا دور رہ کیوں پلا پڑتا ہے؟ آزاد یہ جواب سن کر خوش ہو گئے۔ بولے استاد ہم تو آج تمہارے مہمان ہوں گے۔ تمہاری حاضر جوابی سے جی خوش ہو گیا۔ اب رات ہو گئی ہے کہاں جائیں؟ اس ہنسوز آدمی نے ان کی بڑی خاطر کی، کھانا کھلایا اور دونوں نے دروازے پر ہی لمبی تانی۔ تڑکے میاں آزاد کی نیند کھلی۔ ہنسوز کو جگانے لگے۔ کیوں حضرت پڑے سویا ہی کیجیے گا یا اٹھیے گا بھی؟ واہو رے ماچا توڑ! بارے بہت ہلانے ڈلانے پر میاں ہنسوز اٹھے اور پھر لیٹ گئے۔ مگر پیتانے کی طرف سر کر کے۔ اتنے میں دو چار دوست اور آگئے۔ واہ بھی واہ، ہم دو کوس بے آئے اور یہاں ابھی کھاٹ ہی نہیں چھوڑی؟ بھی، بڑا سونے والا ہے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا، حقہ پیا، بالوں میں تیل ڈالا، دو چپاتیاں کھائیں، کپڑے پہنے اور ٹہلتے ہوئے یہاں تک آئے مگر یہ ابھی تک پڑے ہی ہوئے ہیں۔ آخر ایک آدمی نے ان کے کان میں پانی ڈال دیا۔ تب تو آپ

کلبائے۔ دیکھو دیکھو، ہیں ہیں، نہیں مانتے! واہ، اچھی دل لگی نکالی ہے۔

ایک دوست: ذرا آنکھیں تو کھولے۔

ہنسوڑ: نہیں کھولتے آپ کا اجارہ ہے؟

دوست: دیکھیے، یہ میاں آزاد تشریف لائے ہیں، ادھر مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ ان سے تو ملیے، سو سو کر نہبوست پھیلا رکھی ہے۔

مولوی: اجی حضرت۔

ہنسوڑ: بھی دق نہ کرو، ہمیں سونے دو۔ یہاں مارے نیند کے برا حال ہے، آپ کو دل لگی سو جیتی ہے۔

آزاد: بھائی صاحب۔

ہنسوڑ: اور سنئے۔ آپ بھی آئے وہاں سے جان کھانے۔ سویرے سویرے آپ کو بلایا کس گدھے نے تھا؟ بھلے مانس کے مکان پر جانے کا یہ وقت ہے بھلا؟ کچھ آپ کا قرض تو نہیں چاہتا؟ چلیے، بوریا بندھنا اٹھائیے۔ (آنکھیں کھول کر) اخوا آپ ہیں؟ معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کی آواز نہیں پہچانی۔

مولوی: کیسے، خاکسار کی آواز تو پہچانی؟ یا کچھ مین میخ ہے؟

ہنسوڑ: اٹھا آپ ہیں! معاف کیجیے گا میں اپنے آپے میں نہ تھا۔

مولوی: حضرت، اتنا بھی نیند کے ہاتھ بک جانا بھلا کچھ بات ہے۔ آٹھ بج چاہتے ہے اور آپ پڑے سو رہے ہیں۔ کیا کل رات جگا تھا؟ خیر، میں تو رخصت ہوتا ہوں آپ حکیم صاحب کے نام خط لکھ بھیجے گا۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے۔ کہیں پھر نہ لڑھک رہیے گا۔ آپ کی نیند سے ہم ہارے۔

ہنسوڑ: اچھا میاں آزاد، اور باتیں تو پیچھے ہوں گی پہلے یہ بتلائیے کہ کھانا کیا کھائیے گا؟ آج ماما بیمار ہو گئی ہے اور گھر میں بھی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے روزے کی نیت کی ہے۔ آپ بھی روزہ رکھ لیں۔ فائدے کا فائدہ اور ثواب کا ثواب۔

آزاد: روزہ آپ کو مبارک ہو، اللہ میاں ہمیں یوں ہی بخش دیں گے۔ یہ دل لگی کسی اور سے کیجیے گا۔

ہنسوڑ: دل لگی کے بھروسے نہ رہیے گا۔ میں کھرا آدمی ہوں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ مولوی

صاحب خط لکھنے کو کہہ گئے ہیں۔ دو پیسے کا خون اور ہوا۔ کل بھی روزہ رکھنا پڑا۔
 آزاد: دو پیسے کیوں خرچ کیجئے گا؟ اب تو ایک پیسے کے پوسٹ کارڈ چلے ہیں۔
 ہنسور: بچ؟ ایک ڈبل میں۔ بھئی انگریز بڑے حکمتی ہیں۔ کیوں صاحب وہ پوسٹ کارڈ
 کہاں بکتے ہیں؟

آزاد: اتنا بھی نہیں جانتے؟ ڈاک خانے میں آدی بھیجئے۔
 ہنسور: روشن علی، ڈاک خانے سے جا کر ایک آنے کا پوسٹ کارڈ لے آؤ۔
 روشن: میاں، میں دیہاتی آدی ہوں انگریزی نہیں پڑھا۔
 ہنسور: ارے بھئی تم کہنا کہ وہ لفافے دیتیجئے جو پیسے پیسے میں بکتے ہیں۔ جا جھٹ سے
 کتے کی چال جانا اور ملی کی چال آنا۔

روشن: اجی مجھ سے کہیے تو میں گدھے کی چال جاؤں اور بس کھوپڑے کی چال آؤں۔
 مل ڈاک والے مجھے پاگل بنائیں گے۔ بھلا آج تک کہیں پیسے میں لفافہ بکا ہے۔
 ہنسور: ابے تجھے اس حجت سے کیا واسطہ؟ ڈاک خانے تک جائے گا بھی یا یہیں بیٹھے
 بیٹھے دلیس کرے گا؟

روشن ڈاک خانے گیا اور پوسٹ کارڈ لے آیا۔ میاں ہنسور جھپٹ کر قلم دوات لے
 آئے اور خط لکھنے بیٹھے۔ مگر پرانے زمانے کے آدی تھے۔ تعریف کے اتنے لمبے لمبے جملے لکھنے
 شروع کیے کہ پوسٹ کارڈ بھر گیا اور مطلب خاک نہ نکلا۔ بولے اب کہاں لکھیں؟
 آزاد: دو ٹپی باتیں لکھیے۔ آپ تو لگے لیاقت بگھارنے۔ دوسرا لیجیے۔

ہنسور نے دوسرا پوسٹ کارڈ لکھنا شروع کیا۔ 'جناب اب ہم تھوڑے میں بہت سا حال
 لکھیں گے۔ دیکھئے برا نہ مانئے گا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ وہ بیگھے بھر کے آداب لکھے
 جائیں۔ وہ لمبی چوڑی دعائیں دی جائیں۔ وہ گھر کا کچا چٹھا کہہ سنا اب رواج کے خلاف
 ہے۔ اب تو ہم نے قسم کھائی ہے کہ جب قلم اٹھائیں گے دس سطروں سے زیادہ نہ لکھیں گے۔
 اس میں چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ اب آپ بھی اس فیشن کو چھوڑ دیجیے۔' ارے یہ خط
 بھی گیا۔ اب تو حمل رکھنے کی بھی جگہ نہیں۔ لیجیے، بات کرتے کرتے دو پیسے کا خون ہو گیا۔
 اس سے دو پیسے کا ٹکٹ لاتے تو کمرے کا کھرا لکھ ڈالتے۔

آزاد: میں دیکھوں تو آپ نے کیا لکھا ہے۔ واہ واہ اس پواڑے کا کچھ ٹھکانہ ہے۔

ارے صاحب مطلب سے مطلب رکھیے۔ بہت بیہودہ نہ کیے۔ خیر اب تیسرا کارڈ لیجئے۔ مگر قلم کو روکے ہوئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ پھر واپسی تباہی لکھنے لگیں۔

ہنسوڑ: اچھا صاحب یوں ہی سہی، بس، خاص خاص باتیں ہی لکھوں گا۔

یہ کہہ کر انھوں نے یہ خط لکھا۔ جناب فضیلت مآب مولانا صاحب آپ یہ ہیں لوچا لفافہ دیکھ کر گھبرائیں گے کہ یہ کیا حال ہے۔ ڈاک خانے والوں نے یہ نئی پھلجھڑی چھوڑی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں اس میں کتنی جگہ ہے۔ اگر مختصر نہ لکھوں تو کیا کروں۔ لکھنی تو بہت سی باتیں ہیں پر اس لفافے کو دیکھ کر سب آرزوئیں دل میں رہی جاتی ہیں۔ دیکھیے ابھی لکھا کچھ بھی نہیں، مگر کاغذ کو دیکھتا ہوں تو ایک طرف سب کا سب لکھ گیا۔ دوسری طرف لکھوں تو پکڑا جاؤں۔ لو صاحب یہ پوسٹ کارڈ بھی ختم ہوا۔ میاں آزاد یہ تینوں پیسے آپ کے نام لکھ گئے۔ آپ چاہے دیں نہ لکھیں، لیکن صلاح آپ ہی نے دی تھی۔

آزاد: میں نے یہ کب کہا تھا کہ آپ خط میں اپنی زندگی کی داستان لکھ بھیجیں؟ یہ خط ہے یا رات کا چرخ؟ اتنے بڑے ہوئے ہیں، خط لکھنے کی لیاقت نہیں۔ سمجھا دیا سکھلا دیا کہ بس، مطلب سے مطلب رکھو۔ مگر تم کب ماننے لگے۔ خدا کی قسم تمہاری صورت سے نفرت ہوگئی۔ بس بے سکتے پن کی حد ہوگئی۔

ہنسوڑ: واہ ری قسمت! تین پیسے گرہ سے گئے اور الو کے الو بنے۔ بھلا آپ ہی لکھیے تو جانیں۔ دیکھیں تو سہی آپ اس ذرا سے کاغذ پر کل مطلب کیوں کر لکھتے ہیں۔ اس کے لیے تو بڑا بھاری استاد چاہیے، جو پتے پر ہاتھی کی تصویر بنا دے۔

آزاد: آپ اپنا مطلب مجھ سے کہیے تو ابھی لکھ دوں۔

ہنسوڑ: اچھا سنئے مولوی ضامن علی آپ کی خدمت میں پہنچے ہوں گے ان کو وہ تیس روپے والا جگہ دلا دیجیے گا۔ آپ کا عمر بھرا احسان ہوگا۔ بس اسی کو خوب بڑھا دیجیے۔

آزاد: پھر وہی جھک! بڑھا کیوں دوں؟ یہ نہ کہا کہ بس یہی میرا مطلب ہے، اس کو بڑھا دیجیے، لاؤ پوسٹ کارڈ دیکھو یوں لکھتے ہیں۔

’حضرت سلامت، مولوی ضامن علی پہنچے ہوں گے۔ وہ تیس روپے والا عہدہ ان کو دلا دیجیے، تو احسان ہوگا۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔‘

لو دیکھو اتنی سی بات کو اتنا بڑھایا کہ تین تین خط لکھے اور پھاڑے۔

ہنسوڑ: خوب، یہ تو اچھا دم کٹا خط ہے۔ اچھا اب پتا بھی لکھئے۔
 آزاد نے سیدھا سادہ پتہ لکھ کر ہنسوڑ کو دکھلایا، تو آپ پوچھنے لگے۔ کیوں صاحب یہ تو
 شاید وہاں تک پہنچے ہی نہیں۔ کہیں اتنا ذرا سا پتہ لکھا جاتا ہے؟ اس میں میرا نام کہاں ہے؟
 تاریخ کہاں ہے؟

آزاد: آپ کا نام بے وقوفوں کی فہرست میں ہے اور تاریخ ڈاک خانے میں۔

ہنسوڑ: اچھا لائیے، دو چار سطریں میں بھی بڑھا دوں۔
 حضرت نے جو لکھنا شروع کیا تو پتے کی طرف بھی لکھ ڈالا۔ تھوڑے لکھنے کو بہت کچھ
 گا۔ آپ کا پرانا غلام ہوں، اب کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتی۔
 آزاد: ہیں ہیں! غارت کیا نہ اس کو بھی؟

ہنسوڑ: کیوں، جگہ باقی ہے پورا پیسہ تو وصول کرنے دو۔
 آزاد: جی پیسہ نہیں ایک آنہ وصول ہو گیا۔ ایک ہی طرف مطلب لکھا جاتا ہے، دوسری
 طرف صرف پتہ۔ آپ سے تو ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔
 یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کئی لڑکے اسکول سے نکلے۔ ان میں سے ایک بڑا شریر تھا۔
 کسی پر دھپ بجائی، کسی کے چپٹ لگائی، کسی کے کان گرما دیے۔ اپنے سے دیوڑے دوئے
 تک کو چیتا تا تھا۔ آزاد نے کہا۔ دیکھا یہ لوٹا کتنا بدمعاش ہے، اپنے سے دوئے تک کی خبر
 لیتا ہے۔

ہنسوڑ: بھئی، خدا کے لیے اس کے منہ نہ لگنا۔ اس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ یہ اسکول
 بھر میں مشہور ہے۔ حضرت دو دفعہ چوری کی علت میں دھرے گئے۔ ان کے مارے محلے بھر کا
 ناکوں دم ہے۔ ایک قصہ سنئے۔ ایک دفعہ حضرت کو شرارت کا شوق چرایا۔ پھر سوچنے کی
 ضرورت نہ تھی۔ فوراً سوچتی ہے۔ شرارت تو اس کی خیر میں داخل ہے۔ ایک پاؤں کا جوتا
 نکال کر حضرت نے ایک الماری پر رکھ دیا۔ جوتے کے نیچے ایک کتاب رکھ دی۔ تھوڑی دیر
 بعد ایک لڑکے سے بولے، یار ذرا وہ کتاب اتارو، تو کچھ دیکھ داکھ لوں۔ نہیں تو ماسٹر صاحب
 بے طرح ٹھوکیں گے۔ سیدھا سادا لڑکا چپکے سے وہ کتاب اٹھانے گیا۔ جیسے کتاب اٹھائی دیے
 ہی جوتی منہ پر آئی۔ سب لڑکے کلکھلا کر ہنس پڑے۔ ماسٹر صاحب انگریز تھے۔ بہت ہی
 جھلا کر پوچھا یہ کس کی جوتی کا پاؤں ہے؟ اب آپ بیٹھے چپ چاپ پڑھ رہے ہیں۔ گویا ان

سے کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ مگر ان کا تو درجہ بھر دشمن تھا۔ کسی لڑکے نے اشارے سے جڑ دی۔
ماسٹر نے آپ کو بلایا اور پوچھا دلیں دوسرا پاؤں کہاں تمہارا؟ دوسرا پاؤں کدھر؟

لڑکا: پاؤں دونوں یہ ہیں۔

ماسٹر: دلیں جوتی جوتی؟

لڑکا: جوتی کو کھادے جوتی۔

ماسٹر: بیچ پر کھڑا ہو۔

لڑکا: یہ سزا منظور نہیں، کوئی اور سزا دیجیے۔

ماسٹر: اچھا کل کے سبق کو سو بار لکھ لانا۔

لڑکا: واہ واہ اور سبق یاد کب کروں گا؟

ماسٹر: اچھا آٹھ آنا جرمانہ۔

دوسرے دن آپ آٹھ آنے لائے تو موٹے پیسے کھٹ کھٹ کر کے میز پر ڈال دیے۔

ماسٹر نے پوچھا اٹنی کیوں نہیں لایا؟ بولے یہ شرط نہیں تھی۔

اسی طرح ایک بار ایک بھلے مانس کے یہاں کہہ آئے کہ تمہارے لڑکے کو اسکول میں

ہیضہ ہوا ہے۔ ان کے گھر میں رونا بیٹنا مچ گیا۔ لڑکے کا باپ، چچا، بھائی، ماموں سب

دوڑتے ہوئے اسکول پہنچے۔ عورتوں نے آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا۔ وہ لوگ جو اسکول گئے

تو کیا دیکھتے ہیں لڑکا حڑے سے گیند کھیلتا ہے۔ اجی اور کیا کہیں، اس نے اپنے باپ کو ایک

بار نمک کے دھوکے میں پھنکری کھلا دی اور اس پر طرہ یہ کہ کہا کیوں ابا جان کیسا گھبرا چکا دیا۔

شام کے وقت بوڑھے میاں آزاد کے پاس آکر بولے۔ چلیے ادھر بجرا تیار ہے۔ آزاد تو

ان کی تاک میں بیٹھے ہی تھے، ہنسوڑ کو لے کر ان کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ ندی کے

کنارے پہنچے تو دیکھا بجرے لہروں پر فراٹے سے دوڑ رہے ہیں۔ ایک درخت کے سائے میں

چھپ کر یہ بہار دیکھنے لگے۔ ادھر ان دونوں حسینوں نے بجرے پر سے کنارے کی طرف

دیکھا، تو آزاد نظر پڑے۔ شرم سے دونوں نے منہ پھیر لیے۔ لیکن کھنکھنچوں سے تاک رہی

تھیں۔ یہاں تک کہ بجرا نگاہوں سے ادجھل ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آزاد انھیں بوڑھے میاں کے ساتھ اس گھٹی کی طرف چلے، جس

میں دونوں لڑکیاں رہتی تھیں۔ قدم قدم پر شعر پڑھتے تھے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے، اور سر

دھتے تھے۔ حالت ایسی خراب تھی کہ قدم قدم پر ان کے گر پڑنے کا خوف تھا۔ ہنسو نے جو یہ کیفیت دیکھی تو جھٹ کر میاں آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور سمجھانے لگے۔ اس رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ آخر یہ تو سوچو کہ کہاں جا رہے ہو؟ وہاں تمہیں کوئی پہچانتا بھی ہے؟ مفت میں شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت؟

آزاد: ابھی اب تو یہ سر ہے اور وہ در۔ بس آزاد ہے اور ان بتوں کا کوچہ۔
ہنسو: یہ محض نادانی ہے۔ یہی حماقت کی نشانی ہے۔ میری بات مانو بوڑھے میاں کو پھنساؤ کچھ چٹاؤ پھر ان کی صلاح کے مطابق کام کرو، بے سببے بوجھے جانا اور اپنا سامنہ لے کر واپس آنا حماقت ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی کوشی کے قریب پہنچے۔ دیکھا بوڑھے میاں ان کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ آزاد نے کہا حضرت اب تو آپ ہی راستہ دکھائیں، تو منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ ورنہ اپنا تو حال خراب ہے۔

بوڑھے میاں: ابھی ہم تمہارے بچے مددگار اور بچے طرف دار ہیں۔ اپنی طرف سے تمہارے لیے کوئی بات اٹھانہ رکھیں گے۔ لیکن یہاں کا بابا عالم ہی نرالا ہے۔ یہاں پرندوں کے پر جلتے ہیں۔ ہوا کا بھی گزر ہونا مشکل ہے۔ مگر دونوں میری گود کی کھلائی ہوئی ہیں، موقع پا کر آپ کا ذکر ضرور کروں گا۔ مشکل یہی ہے کہ ایک اونچے گھر سے پیغام آیا ہے ان کی ماں کو شوق چرایا ہے کہ وہیں بیاہ ہو۔

آزاد: یہ تو آپ نے بری خبر سنائی! قسم خدا کی میری جان پر بن جائے گی۔
بوڑھے میاں: صبر کیجیے، صبر! دل کو ڈھارس دیجیے۔ اب اس وقت جائے صبح آئے گا۔
آزاد رخصت ہونے ہی والے تھے تو کیا دیکھتے ہیں! دونوں بہنیں جھروکھوں سے جھانک رہی ہیں۔ آزاد نے یہ شعر پڑھا۔

ہم بھی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بگڑ جاتی ہے کیا کرتے ہیں
جھروکھوں میں سے آواز آئی۔

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچانے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

اتنا سنتا تھا کہ میاں آزاد کی آنکھیں مارے خوشی کے ڈبڈبا آئیں۔ جھروکے کی طرف
 بھر جوتا کا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ چکرائے کہ کس نے یہ شعر پڑھا۔ چھلاوا تھا، ٹوٹا تھا، جادو تھا،
 آخر تھا کیا؟ اتنے میں بوڑھے میاں نے اشارے سے کہا کہ بس اب جاؤ اور ترے آؤ۔
 دونوں دوست گھر کی طرف چلے، تو میاں ہسوز نے کہا: حضرت خدا کے واسطے میرے
 گھر پر کوہ پچاند نہ کیجیے گا، بہت شعر نہ پڑھیے گا، کہیں میری بیوی کو خبر ہوگئی تو جینا مشکل
 ہو جائے گا۔

آزاد: کیا بیوی سے آپ اتنا ڈرتے ہیں! آخر خوف کا ہے؟
 ہسوز: آپ کو اس جھگڑے سے کیا مطلب؟ وہاں ذرا بھلے آدمی کی طرح بیٹھے گا یہ نہیں
 کہ غل چانے لگے۔ جو سنے گا وہ سمجھے گا کہ کہاں سے شہدے جمع ہو گئے ہیں۔
 آزاد: سمجھ گیا آپ بیوی کے غلام ہیں۔ مگر ہمیں اس سے کیا واسطہ۔ آم کھانے سے
 مطلب کہ بیڑ مگننے سے؟

دونوں آدمی گھر پہنچے تو لوٹری نے اندر سے آکر کہا۔ بیگم صاحبہ آپ کو کوئی بیس بیر تو چھ
 چکی ہیں۔ چلیے بلاتی ہیں۔ میاں ہسوز نے دیوڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ان کی بیوی نے
 آڑے ہاتھوں ہی لیا۔ یہ دن دن بھر آپ کہاں غائب رہنے لگے؟ اب تو آپ بڑے سیلانی
 ہو گئے۔ صبح کو نکلے نکلے شام کو خبر لی۔ چلو میرے سامنے سے جاؤ آج کھانا دانا خیر صلاح
 ہے۔ حلوائی کی دکان پر دادا جی کا فاتحہ پڑھو، تندوری روٹیاں اڑاؤ۔ یہاں کسی کو کتے نے نہیں
 کاٹا کہ وقت بے وقت چولہے کا منہ کالا کیا جائے۔ بھلے آدمی دو ایک گھڑی کے لیے کہیں گے
 تو گئے یہ نہیں کہ دن دن بھر پتا ہی نہیں۔ اچھے ہتھکنڈے لکھے ہیں۔

ہسوز نے چپکے سے کہا: ذرا آہستہ آہستہ باتیں کرو باہر ایک بھلا مانس نکا ہوا ہے۔
 اتنی بھی کیا بے حیائی؟

اس پر وہ چمک کر بولی۔ بس بس زبان نہ کھلواؤ بہت۔ تمہیں جو دوست ملتا ہے وہی
 گ... سوار، جس کے گھر نہ دوار، جانے کہاں کے الفتی ان کو مل جاتے ہیں، کبھی کسی شریف
 آدمی سے دوستی کرتے نہیں دیکھا۔ چلیے اب دور ہو جائیے نہیں ہم بری طرح پیش آئیں گے۔
 مجھ سے برا کوئی نہیں۔

میاں ہسوز پچارے کی جان عذاب میں کہ گھر میں بیوی کو سننے سنا رہی ہے باہر میاں

آزاد آڑے ہاتھوں لیں گے کہ آپ کی بیوی نے تو خیر آپ کو جو کچھ کھا وہ کھا ہی تھا مجھے کیوں لے ڈالا؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ اپنا سامنہ لے کر باہر چلے آئے اور آزاد سے کہا یار آج روزے کی نیت کرلو۔ بیوی جان فوجداری پر آمادہ ہیں۔ بات ہوئی اور ٹھک گئیں۔ مہینوں ہی روٹی رہتی ہیں۔ مگر کیا کروں، امیر کی لڑکی ہے، نہیں تو میں ایک جھلا ہوں۔ مجھے یہ مزاج کہاں پسند۔ اس لیے بھی آج فاقہ ہے۔

آزاد : فاقہ کریں آپ کے دشمن چلیے کسی نان بائی حلوائی کی دکان پر حرے سے کھانا کھائیں۔

ہنسوڑ : ارے یار اتنے ہی ہوتے تو پھر بیوی کی کیوں سنتے، نکا پاس نہیں حلوائی کیا ہمارا مامو ہے؟

آزاد : اس کی فکر نہ کیجیے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیے اور حرے سے مٹھائی چکھیے۔ وہ تدبیر سوچھی ہے کہ کبھی پٹ کی ہی نہ پڑے۔

دونوں آدمی بازار پہنچے۔ آزاد نے راستے میں ہنسوڑ کو سمجھا بجا دیا۔ ہنسوڑ تو حلوائی کی دکان پر گئے اور آزاد ذرا پیچھے رہ گئے۔ ہنسوڑ نے جاتے ہی جاتے حلوائی سے کہا میاں آٹھ آنے کے پیسے دو اور آٹھ آنے کی بیچ میل مٹھائی۔ حلوائی نے تازی تازی مٹھائی تول دی اور آٹھ آنے پیسے بھی گمن دیے۔ ہنسوڑ نے پیسے تو گانٹھ میں باندھے اور مٹھائی اسی کی دکان پر چکھنے لگے۔ اتنے میں میاں آزاد بھی پہنچے اور بولے بھئی لالہ ذرا ہمیں بیسن کے لڈو تو ایک روپے کے تول دینا۔ اس نے ایک روپے کے بیسن لڈو تول کر چنگیر ان کے ہاتھ میں دی۔ اتنے میں میاں ہنسوڑ نے لکڑی اٹھائی اور اپنی راہ چلے۔ حلوائی نے لکارا میاں چلے کہاں؟ پہلے روپے تو دیتے جاؤ۔

ہنسوڑ! روپیہ اچھا مذاق ہے! ابے، کیا تو نے روپے نہیں پایا۔ یہاں پہلے روپیہ دیتے ہیں، پیچھے سودا لیتے ہیں۔ اچھے لے! کیا دو دو دفعہ روپے لوگے؟ کہیں میں تھانے میں رہٹ نہ لکھوا دوں! مجھے بھی کوئی گنتوار سمجھے ہو۔ ابھی چہرہ شامی دے چکا ہوں۔ اب کیا کسی کا گھر لے گا؟

اب حلوائی اور ہنسوڑ میں تکرار ہونے لگی۔ بہت سے آدمی جمع ہو گئے کوئی کہتا ہے، لالہ گھاس تو نہیں کھا گئے ہو کوئی کہتا ہے میاں ایک روپے کے لیے نیت ڈالو ڈول نہ کرو، ایمان

سلامت رہے گا تو بہت روپے ملیں گے۔

آزاد: لالہ، کہیں اسی طرح میرا بھی روپیہ نہ بھول جانا۔

طلوائی: کیا، آپ کا روپیہ؟ آپ نے روپے کس کو دیا؟

اب جو سنتا ہے، وہی طلوائی ہی کو الو بناتا ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ لعنت ملامت کی کہ شریف آدمی کو بے عزت کرتے ہو۔ اتنے میں اس طلوائی کا بڑھا باپ آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ دکان پر بھیڑ مگی ہوئی ہے۔ پوچھا، کیا ماجرا ہے؟ کیا دکان لٹ گئی؟ ایک مجڑے دل نے کہا اجی، لٹ تو نہیں گئی، مگر اب تمہاری دکان کی ساکھ جاتی رہی۔ ابھی ایک بھلے مانس نے کھن سے روپے پھینکا، اب کہتا ہے کہ ہم نے روپیہ پایا ہی نہیں۔ اس کو چھوڑ دو تو دوسرے شریف کا دامن پکڑ لیا کہ تم نے روپے نہیں دیا۔ حالانکہ وہ بے چارے سیکڑوں قسمیں کھاتے ہیں کہ میں دے چکا ہوں۔ طلوائی بڑا ٹٹیکا بڑھا تھا، سنتے ہی آگ ہو گیا۔ جھلا کر اپنے لڑکے کی کھوپڑی پر تان کے ایک چپت لگائی اور بولا۔ کہتا ہوں کہ بھنگ نہ کھایا کر، مانتا ہی نہیں جا کر بیٹھ دوکان پر۔

میاں آزاد اور ہنسوڑ نے مزے سے ڈیڑھ روپے کی مٹھائی باندھ لی، اور آٹھ آنے کے پیسے گھاتے میں۔ جب گھر پہنچے تو خوب مٹھائی چکھی۔ بچی بچائی اندر بھیج دی۔ ہنسوڑ نے کہا یار اسی طرح کہیں سے روپے دلاؤ تو جانیں۔ آزاد نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے؟ ابھی چلو، مگر کسی سے مانگ مومگ کر کچھ اشرفیاں باندھ لو۔ میاں ہنسوڑ نے اپنے ایک دوست سے شام کو لوٹا دینے کے وعدے پر کچھ اشرفیاں لیں۔ دونوں نے روشن علی کو ساتھ لیا اور بازار چلے۔ پہلے ایک مہاجن کو اشرفیاں دکھائیں اور پرکھوائیں۔ بیچتے ہیں، کھری کھوٹی دیکھ لیجیے۔ مہاجن نے ان کو خوب کسوٹی پر کسا اور کہا انہیں کے حساب سے لیں گے۔ جب ہنسوڑ دوسری دکان پر پہنچے۔ وہاں بھی اشرفیاں گنوائیں اور پرکھوائیں۔ اس کے بعد آزاد نے تو اشرفیاں لے کر گھر کی راہ لی اور میاں ہنسوڑ ایک گٹھی میں پھنپھن۔ وہاں کہا کہ ہم کو دو سو اشرفیاں خریدنی ہیں۔ مہاجن نے دیکھا آدمی شریف ہے، فوراً دو سو اشرفیاں ان کے سامنے ڈھیر کر دیں۔ میں روپے کی در پٹلی۔ ہنسوڑ نے مہاجن کے میم سے ایک پرنچے پر حساب لکھوایا اور اشرفیاں باندھ کر گٹھی کے باہر پھنپھن۔ ٹٹل مچا ہائیں ہائیں لینا لینا کہاں کہاں! میاں ہنسوڑ چیترا بدل سامنے کھڑے ہو گئے۔ بس دور سے ہی بات چیت ہو۔ سامنے آئے اور میں نے ٹٹا ہاتھ دیا۔

مہاجن : اے صاحب روپے تو دیجیے؟

ہنسوڑ : کیسے روپے؟ ہم نہیں بیچتے۔

مہاجن : کیا کہا، نہیں بیچتے؟ کیا اشرفیاں آپ کی ہیں؟

ہنسوڑ : جی، اور نہیں تو کیا آپ کے باپ کی ہیں؟ ہم نہیں بیچتے، آپ کا اجارہ ہے کچھ؟

آپ ہیں کون زبردستی کرنے والے؟

اتنے میں آزاد بھی وہاں آپہنچے۔ دیکھا تو مہاجن اور ان کے منیم جی گل چا رہے ہیں تم

اشرفیاں لائے کب تھے؟ اور ہنسوڑ کہہ رہے ہیں، ہم نہیں بیچتے۔ سیکڑوں آدمی جمع تھے۔ پولس کا

ایک جمعدار بھی آ موجود ہوا۔

جمعدار : یہ کیا جھگڑا ہے لالہ چٹالال؟ وہ نہیں بیچتے تو زبردستی کیوں کرتے ہو؟ اپنے مال

پر سب کو اختیار ہے۔

مہاجن : اچھی پنچایت کرتے ہو جمعدار! یہاں چار ہزار روپے پر پانی پھرا جاتا ہے

آپ کہتے ہیں جانے بھی دو۔ یہ اشرفیاں تو ہماری ہیں۔ یہ میاں خریدنے آئے تھے، ہم نے

گن دی۔ بس باندھ بوندھ کر چل کھڑے ہوئے۔

ایک آدمی : واہ بھلا کوئی بات بھی ہے! یہ اکیلے آپ دس، جو ایسا ہوتا تو یہ کونسی کے باہر

بھی آنے پاتے؟ آپ سب مل کر ان کا اچار نہ نکال لیتے؟ اتنے بڑے مہاجن، اور دو سو

اشرفیوں کے لیے ایمان چھوڑ دیتے ہو۔

جمعدار : بری بات!

ہنسوڑ : دیکھیے آپ بازار بھر میں بھی دریافت کر لیں کہ ہم نے کتنی دوکانوں میں یہ

اشرفیاں دکلائیں اور پرکھوائیں ہیں؟ بازار بھی گواہ ہے، کچھ ایک دو آدمی وہاں تھوڑے تھے؟

اس کو بھی جانے دیجیے۔ یہ پرچہ پڑھے۔ اگر یہ بیچتے ہوتے تو میں کی در سے حساب لگاتے،

یا ساڑھے انیس سے؟ مفت میں ایک شریف کے بیچے پڑے ہیں، لیما ایک نہ دینا دو۔

آخر یہ طے ہوا کہ بازار میں چل کر تحقیقات کی جائے۔ میاں ہنسوڑ، ساہوکار، ان کے

منیم، جمعدار اور تماشائی سب مل کر بازار چلے۔ وہاں تحقیقات کی تو دلالوں اور دکانداروں نے

گواہی دی کہ بے شک ان کے پاس اشرفیاں تھیں اور انھوں نے پرکھوائیں بھی تھیں۔ ابھی

ابھی یہاں سے گئے تھے۔

جمدار : لالہ صاحب، اب خیر اسی میں ہے کہ چپکے رہیے، نہیں تو بے ڈھب ٹھہرے گی۔ آپ کی ساکھ جائے گی اور منیم کی شامت آ جائے گی۔
 مہاجن : کیا اندھیر ہے! چار ہزار روپیوں پر پانی پڑ گیا، اتنے روپے کبھی عمر بھر میں نہیں جمع کیے تھے، اور جو ہے ہمیں کو الو بناتا ہے۔ خیر صاحب، لیجیے ہاتھ دھوئے۔
 دونوں آدمی گھر پہنچے تو بانچھیں کھلی جاتی تھیں۔ جاتے ہی دو سو اشرفیاں کھن کھن کر کے ڈال دیں۔

آزاد : دیکھو یوں لاتے ہیں۔ اب یہ اشرفیاں ہماری بھابھی جان کے پاس رکھو۔
 ہنسوڑ : بھئی، تم ایک ہی استاد ہو، آج سے میں تمہارا شاگرد ہو گیا۔
 آزاد : لے، بھابھی سے تو خوشخبری کہہ دو۔ بہت منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔
 میاں ہنسوڑ نے گھر میں جا کر کہا، کہاں ہو! کیا سو رہیں؟
 بیوی : کیا کمائی کر کے لائے ہو ڈپٹ رہے ہو؟
 ہنسوڑ : (اشرفیاں کھکا کر) لو، ادھر آؤ، بہت مزاج نہ کرو۔ یہ لو دس ہزار روپے کی اشرفیاں۔

بیوی : یہ بٹے کسی اور کو دیجیے گا! یہ تو وہی ہیں جو ابھی مرزا کے یہاں سے منگوائی تھیں۔

ہنسوڑ : وہ یہ ہیں، ادھر۔
 بیوی : دیکھوں (کھلکھلا کر) کسی کے یہاں پھاندے تھے کیا؟ آخر لائے کس کے گھر سے؟ بس، چپکے سے ہمارے صندوقچے میں رکھ دو۔
 ہنسوڑ : کیوں نہ ہو، مار کھائیں غازی میاں، مال کھائیں مجادر۔
 بیوی : سچ بتاؤ، کہاں مل گئیں؟ تمہیں ہماری قسم!
 ہنسوڑ : یہ انھیں کی کرامات ہیں، جنھیں تم شہدا اور لپٹا بناتی تھیں۔
 بیوی : میاں، ہمارا قصور معاف کرو۔ آدمی کی طبیعت ہمیشہ ایک سی تھوڑے ہی رہتی ہے۔ میں تو تمہاری لونڈی ہوں۔

آزاد : (باہر سے) ہم بھی سن رہے ہیں بھابھی صاحب! ابھی تو آپ نے ہمارے بھائی بھارے کو ڈپٹ لیا تھا، گھر سے باہر کر دیا تھا، ہم کو جو گالیاں دیں سو گھاتے ہیں۔ اب

جو اشرفیاں دیکھیں تو پیاری بیوی بن گئیں۔ اب ان کے کان نہ گرمائے گا، یہ بچارے بے باپ کے ہیں۔

بیوی نے اندر سے کہا: آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کو کیا کہوں آپ کی ہنسی سر آنکھوں پر۔

(24)

بڑی بیگم صاحبہ پرانے زمانے کی رئیس زادی تھیں، ٹوٹے ٹوٹے میں انھیں پورا دھواں تھا۔ بلی اگر گھر میں کسی دن آجائے تو آفت ہو جائے۔ اُلو بولا اور ان کی جان نکلی۔ جوتے پر جوتا دیکھا اور آگ ہو گئیں۔ کسی نے سیٹی بجائی اور انھوں نے کوسا شروع کیا۔ کوئی پاؤں پر پاؤں رکھ کر سویا اور آپ نے للکارا۔ کتا گلی میں رویا اور ان کا دم نکل گیا۔ راستے میں کانا ملا اور انھوں نے پاکی پھیر دی۔ تیلی کی صورت دیکھی اور خون سوکھ گیا۔ کسی نے زمین پر لکیر بنائی اور اس کی شامت آئی۔ راستے میں کوئی ٹوک دے، تو اس کے سر ہو جاتی تھیں۔ ساون کے مہینے میں چارپائی بنوانے کی قسم کھائی تھی۔ جب دیکھا کہ لڑکیاں سیانی ہو گئیں تو شادی کی فکر ہوئی۔ اونچے اونچے گھروں سے پیغام آنے لگے۔ بڑی لڑکی حسن آرا کی شادی ایک رئیس کے لڑکے سے طے ہو گئی۔ حسن آرا پڑھی لکھی عورت تھی۔ اسے یہ کب منظور ہو سکتا تھا کہ بنا دیکھے بھالے شادی ہو جائے۔ جس کی صورت خواب میں بھی نہیں دیکھی، جس کی لیاقت اور عادت کی ذرا بھی خبر نہیں اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے باندھ دی جاؤں گی۔ سہیلیاں تو اسے مبارک باد دیتی تھیں اور اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ یا خدا کس سے اپنے دل کا درد کہوں؟ بولوں تو اڑوس پڑوس کی عورتیں طعنہ دیں کہ یہ لڑکی سوار کو کھڑے کھڑے گھوڑے پر سے اتار لے۔ دل ہی دل میں بیچاری کڑھنے لگی۔ اپنی چھوٹی بہن سپہر آرا سے اپنا دکھ کہتی تھی اور دونوں بہنیں گلے مل کر روتی تھیں۔

ایک دن دونوں بہنیں بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ اس میں ایک شریر لڑکے کی داستان چھپی ہوئی تھی، پڑھنے لگیں۔

’یہ حضرت دو بار قید بھی رہ چکے ہیں، اور انھوں نے یہ ہے کہ ایک رئیس کے صاحب زادے ہیں۔ پرسوں رات کو آپ نے یہ شرار۔‘ کیا کہ ایک رئیس کے یہاں کودے اور کوٹھری کا تالہ

تو ذکر اندر گھسنے لگے۔ مہاجن کی لڑکی نے جو آہٹ پائی تو کلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ماں کو جگایا۔ ذری جاگو تو پلی نے تیل کا گھڑا گرا دیا، بل بل! اس کی ماں گڑبڑا کر جو ابھی تو آپ کو غری کے باہر ایک چارپائی کے نیچے دبک رہے۔ اس نے اپنے لڑکے کو جگایا۔ وہ جوان لات ٹھوک کر چارپائی پر سے کودا، چور کا کلیجہ کتنا۔ آپ چارپائی کے نیچے سے گھبرا کر نکلے۔ مہاجن کا لڑکا بھی ان کی طرف جھپٹ پڑا اور انھیں اٹھا کر دے مارا۔ تب اس بد معاش نے کمر سے چھری نکالی اور اس مہاجن کے پیٹ میں بھونک دی۔ آنا فانا جان نکل گئی۔ پڑوسی اور چوکیدار دوڑ پڑے اور اس شریف زادے کو گرفتار کر لیا۔ اب وہ حوالات میں ہے۔ افسوس کی بات تو یہ کہ اس کی شادی نواب فرید و جنگ کی لڑکی سے قرار پائی تھی جس کا نام حسن آرا ہے۔

یہ لکھ پڑھ کر حسن آرا آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی۔ اس کی چھوٹی بہن اس کے گلے سے چمٹ گئی اور اس کو بہت کچھ سمجھا بجا کر اپنی بوڑھی ماں کے پاس گئی۔ اخبار دکھا کر بولی، دیکھیے کیا غضب ہو گیا تھا، آپ نے بے دیکھے بھالے شادی منظور کر لی تھی۔ بوڑھی بیگم نے یہ حال سنا تو سر پیٹ کر بولی، بیٹی آج تڑکے جب میں پلنگ سے اٹھی تو پٹ سے کسی نے چھینکا اور میری بائیں آنکھ بھی پھرنے لگی۔ اسی دم پاؤں تلے مٹی نکل گئی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آج کچھ اسکن ہوگا۔ چلو اللہ نے بڑی خیر کی۔ حسن آرا کو میری طرف سے چھاتی سے لگاؤ اور کہہ دو کہ جسے تم پسند کرو اسی کے ساتھ نکاح کر دوں گی۔

سپہر آرا اپنی بہن کے پاس آئی تو بانجھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آتے ہی بولی، لو بہن اب تو منہ مانگی مراد پائی؟ اب اداس کیوں بیٹھی ہو؟ خدا قسم وہ خوشخبری سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ حسن آرا: اے ہے، تو کچھ کہو گی بھی! یہاں کیا جانے اس وقت کس غم میں بیٹھے ہیں، یہ خوشی کا کون موقع ہے؟

سپہر آرا: اے واہ، ہم یوں بتا چکے۔ بنا مشائی لیے نہ بتاویں گے۔ اماں جان نے کہہ دیا کہ آپ جس کے ساتھ جی چاہے شادی کر لیں۔ وہ اب دخل نہ دیں گی۔ ہاں شریف زادہ اور کٹے ٹھٹے کا جوان ہو۔

حسن آرا: خوبصورتی عورتوں میں دیکھی جاتی ہیں، مردوں کو اس سے کیا کام؟ ہاں کالا کلوٹا نہ ہو، بس۔

سپر آرا: یہ آپ کیا کہتی ہیں؟ 'آدی آدی انتر، کوئی ہیرا کوئی کنکر' کیا چاند میں گرہیں لگاؤ گی؟

حسن آرا: اے تو سوت نہ کپاس، کوری سے لٹھم لٹھا۔

اتنے میں بوڑھے میاں چہر بخش نے آواز دی 'بٹی کہاں ہو، میں بھی آؤں؟'

سپر آرا: آؤ، آؤ، تمہاری ہی تو کسرتھی۔ آج سویرے سویرے کہاں تھے؟ کل تو بچرا ایسا ڈالو اڈول ہوتا تھا، جیسے تنکا بھا چلا جاتا ہے۔ کلیجہ دھک دھک کرتا تھا۔

چہر بخش: تم سے کچھ کہنا ہے بٹی! دیکھو، تم ہماری پوتیوں سے بھی چھوٹی ہو۔ تم دونوں کو میں نے گودیوں کھلایا ہے، اور تمہاری ماں ہمارے سامنے بیاہ آئی ہیں۔ تم دونوں کو میں اپنے بیٹے سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میں جو کہوں اسے کان لگا کر سننا۔ تم اب سیانی ہوئیں، اب مجھے تمہاری شادی کی فکر ہے۔ پہلے تم سے صلاح لے لوں، تو بیگم صاحب سے عرض کروں۔ یوں تو کوئی لڑکی آج تک بن بیاہی نہیں رہی، لیکن ورنہ لڑکیوں کو اچھا ملتا ہے جو خوش نصیب ہیں۔ تمہاری ماں ہیں پرانی لکیر کی فقیر، مگر یہ میرا ذمہ کہ جسے تم پسند کرو اسے وہ بھی منظور کر لیں گی۔ آج کل یہاں ایک شریف نوجوان آکر ٹھہرے ہیں۔ صورت شاہزادوں کی سی، عادت فرشتوں کی سی، چلن بھلے مانسوں کا سا، بدن چمک رہا، داڑھی مونچھ کا نام نہیں۔ ابھی اٹھتی جوانی ہے۔ شعر کہنے میں، بول چال میں، علم و کمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ تصویر ایسی کھینچیں کہ بول اٹھے۔ بانک پٹے میں اچھے اچھے بانکوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ ان کی نس نس میں خوپیاں کوٹ کوٹ کر لہری ہیں۔ اگر حسن آرا کے ساتھ ان کا نکاح ہو جائے تو خوب ہو۔ پہلے تم دیکھ لو، اگر پسند آئیں تو تمہاری ماں سے ذکر کروں۔ ہاں یہ وہی جوان ہیں جو بجرے کے ساتھ تم کو دیکھتے ہوئے باغ میں جا رہے تھے۔ یاد آیا؟

حسن آرا: وہاں تو بہت سے آدی تھے، کیا جانے کس کو کہتے ہو، بے دیکھے بھالے کوئی کیا کہے۔

سپر آرا: مطلب یہ کہ دکھا دو۔ بھلا دیکھیں تو ہیں کیسے!

چہر بخش ہالے جوان تو ہم نے آج تک کبھی دیکھے نہ تھے۔ وہ نور ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ قسم خدا کی جو بات کرے رتبہ جائے۔

حسن آرا: ہم بتاویں جب ہم بچروں پر ہوا کھانے چلیں تو انھیں بھی وہاں لاؤ، ہم ان

کو دیکھ لیں تب تم اماں سے کہنا۔

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر میاں آزاد اپنے ہنسوڑ دوست کے ساتھ اسی کوشی کی طرف ٹہلتے چلے آرہے تھے۔ راستے میں آٹھ دس گدھے ملے۔ گدھے والا ان سبوں پر کوڑے پھنکار رہا تھا۔ آزاد نے کہا کیوں بھی، آخر ان گدھوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، جو پیٹتے جاتے ہو؟ کچھ خدا کا بھی خوف ہے، یا نہیں؟ گدھے والے نے اس کا تو کچھ جواب نہ دیا، گد سے ایک اور بھائی۔ تب تو میاں آزاد آگ ہو گئے۔ بڑھ کر گدھے والے کے کئی چاٹنے لگائے۔ ابے آخر ان میں جان ہے یا نہیں؟ اگر نہ چلے تو ہم کہتے خیر یوں ہی سہی خامسے جارہے ہیں کھٹاکٹ، اور آپ پیٹ رہے ہیں۔

ہنسوڑ: آپ کون ہوتے ہیں بولنے والے؟ اس کے گدھے ہیں، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آزاد: بھی، ہم سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی بے زبان پر کوئی آدمی ظلم کرے اور ہم بیٹھے دیکھا کریں۔

کوئی دس ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ دیکھا ایک چڑی مار کپنے میں لاسا لگائے نڈی پر پتے جمائے چڑیوں کو پکڑتا پھرتا ہے۔ میاں آزاد آگ بھسوکا ہو گئے۔ اتنے میں ایک طوطا جال میں آ پھنسا۔ تب تو میاں آزاد بوکھلا گئے۔ غل مچا کر کہا او چڑی مار، چھوڑ دے اس طوطے کو، ابھی ابھی چھوڑ۔ چھوڑتا ہے یا آؤں؟ چڑی مار ہکا بکا رہ گیا۔ بولا صاحب، یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ آخر اس کو چھوڑ دیں، تو کریں پھر کیا؟ آزاد بولے بھیک مانگ، مزدوری کر، مگر یہ پیشہ چھوڑ دے۔ یہ کہہ کر آپ نے جھولا، کلپا، جال، سب چھین چھان لیا۔ جھولے کو جو کھولا تو سب جانور پھر سے اڑ گئے۔ اتنا ہی نہیں کپنے کو کاٹ کوٹ کر پھینکا، جال کو نوچ ناچ کر برابر کیا۔ تب جیب سے نکال کر دس روپے چڑی مار کو دیے اور بڑی دیر تک سمجھایا۔

ہنسوڑ: یا ر تم بڑے بے ذہب آدمی ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم سنک گئے ہو۔ آزاد: بھی، تم سمجھتے ہی نہیں کہ میرا اصل مطلب کیا ہے؟ ہنسوڑ: آپ اپنا مطلب رہنے دیجیے۔ میرا آپ کا ساتھ نہ ہوگا۔ کہیں آپ کسی بڑے دل سے بھڑ پڑے تو آپ کے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔ آزاد: اچھا غصے کو تھوک دیجیے، چلیے ہمارے ساتھ۔ ہنسوڑ: اب تو راستے میں نہ لڑ پڑیے گا؟

آزاد: کہہ تو دیا کہ نہیں۔

دونوں آدمی آگے چلے، تو کیا دیکھتے ہیں، راہ میں ایک گاڑی بان بیل کی دم اینٹھ رہا ہے۔ آزاد نے لٹکارا۔ اے او گاڑی بان، خبردار، جو آج سے بیل کی دم اینٹھی۔

نسوز: پھر وہی بات! اتنی جلدی بھول گئے؟

آزاد چپ ہو گئے۔ دونوں آدمی چپ چاپ چلنے لگے۔ تھوڑی دیر میں کونسی کے قریب جا پہنچے۔ یکا یک بوڑھے میاں پیر بخش آتے دکھائی دیے۔ علیک سلیک کے بعد باتیں ہونے لگیں۔

آزاد: کہیے ادھر بھی گئے تھے؟

پیر بخش: ہاں صاحب، گیا کیوں نہ تھا۔ سویرے سویرے جا پہنچا اور آپ کی اتنی تعریف کی کہ بل باندھ دیے۔ اور پھر آپ چاہیے، گو کہ بندہ عالم نہیں، فاضل نہیں، فنی نہیں، لیکن بڑے بڑے عالموں کی آنکھیں تو دیکھی ہیں، ایسے لمبے دار باتیں کیں کہ آپ کا رنگ جم گیا۔ اب آپ کو دیکھنے کو بے قرار ہیں۔ ہاں، ایک بری سچ یہ ہے کہ آپ کا امتحان لیں گی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ پوچھ بیٹھیں اور آپ بغلیں جھانکنے لگیں۔

نسوز: بھئی، امتحان کا تو نام برا۔ شاید رہ گئے، تو پھر؟

آزاد: پھر آپ کا سر! رہ جانے کی ایک ہی کمی۔ امتحان کے نام سے آپ جیسے لوگوں کی جان نکلتی ہے یا میری؟

پیر بخش: تو میں جا کر کہہ دوں کہ وہ آئے ہیں؟

یہ کہہ کر پیر بخش گھر میں گئے اور کہا وہ آئے ہیں، کہو تو بلا لاؤں؟

سپہر آرانے کہا: اجنبی کا کھٹ سے گھر میں چلا آنا برا۔ پہلے ان سے کہیے چل کر باغ کی سیر کریں۔

پیر بخش باہر گئے اور میاں آزاد کو لے کر باغ میں ٹہلنے لگے۔ دونوں بہنیں جھروکھوں سے دیکھنے لگیں۔ سپہر آرا بولی بہن سچ سچ یہ تو تمہارے لائق ہیں۔ اللہ نے یہ جوڑی اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔

حسن آرا: اے واہ، کیسی نادان ہو! بھلا شادی بیاہ بھی یوں ہوا کرتے ہیں؟

سپہر آرا: میں ایک نہ مانوں گی۔

حسن آرا: مجھ سے کیوں جھگڑتی ہو، اماں جان سے کہو۔

سپہر آرا: اچھا تو میں اماں جان کے یہاں جاتی ہوں، مگر دیکھیے مگر نہ چاہئے گا۔

یہ کہہ کر سپہر آرا بڑی بیگم کے پاس پہنچی اور آزاد کا ذکر پھیر کر بولے، اماں جان میں نے تو آج تک ایسا خوبصورت آدمی دیکھا ہی نہیں۔ شریف، ہنس مکھ اور پڑھے لکھے، آپ بھی ایک دفعہ دیکھ لیں۔

بڑی بیگم نے سپہر آرا کو چھاتی سے لگایا اور ہنس کر کہا تو مجھ سے اڑتی ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتی کہ سکھائی پڑھائی آئی ہوں۔

سپہر آرا: نہیں اماں جان، آپ انھیں ضرور بلائیں۔

بیگم: حسن آرا سے بھی پوچھا؟ وہ کیا کہتی ہے؟

سپہر آرا: وہ تو کہتی ہیں اماں جان جس سے چاہیں، اس سے کریں۔ مگر دل ان کا آیا ہوا ہے۔

بیگم: اچھا، بلوا لو۔

سپہر آرا وہاں سے لوٹی تو مارے خوشی کے اچھلی پڑتی تھی۔ فوراً پیر بخش کو بلا کر کہا۔ آپ میاں آزاد کو اندر لائیے۔ اماں جان انھیں دیکھنا چاہتی ہیں۔

ذرا دیر میں پیر بخش میاں آزاد کو لیے ہوئے بیگم کے پاس پہنچے۔

آزاد: آداب بجالاتا ہوں۔

بیگم: جیتے رہو بیٹا! آؤ اھر آکر بیٹھو، مزاج تو اچھے ہیں؟ سپہر آرا تمہاری بڑی تعریف کرتی تھی، اور بے شک تم ہو اس لائق۔ تم کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔

آزاد: آپ کی زیارت کا بہت دنوں سے شوق تھا۔ سچ ہے بڑے بوزھوں کی کیا بات ہے۔

بیگم: کیوں بیٹا، ہاتھی کو خواب میں دیکھے تو کیسا؟

آزاد: بہت برا، مگر ہاں اگر ہاتھی کسی پر اپنی سوط پھیر رہا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ آئی ہوئی بلائیں گئی۔

بیگم: شاباش، تم بڑے لائق ہو۔

بیگم صاحب نے میاں آزاد کو بڑی دیر تک بٹھایا اور ساتھ ہی کھانا کھلایا۔ آزاد ہاں میں

ہاں ملائے جاتے تھے اور دل ہی دل میں کلکلاتے تھے۔ جب شام ہوئی تو آزاد رخصت ہوئے۔

آسمان پر ہادل چھائے ہوئے تھے، تیز ہوا چل رہی تھی، مگر دونوں بہنوں کو جبرے پر سیر کرنے کی دھن سنائی۔ ددیا کے کنارے آجپھیں۔ پیر بخش نے بجز اکھولا اور دولوں بہنوں کو بٹھا کر سیر کرانے لگے۔ بجز ابھاؤ پر بھراٹے سے بہا جاتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، کالی کالی گھٹائیں، سپہر آرا کی پیاری پیاری باتیں، بوندوں کا گرنا، لہروں کا تھرکنا عجب بہار دکھاتا تھا۔ اتنے میں ہوانے وہ زور باندھا کہ میڈھا اچھلنے لگا۔ اب جبرے کی یہ حالت ہے کہ ڈالو ڈول ہو رہا ہے۔ یہ ڈوبا وہ ڈوبا۔ پیر بخش تھا تو خراٹ، لیکن اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے، سیر دریا کی کہانیاں سب بھول گئے۔ دولوں بہنیں کا پچنے لگیں۔ ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ دو کی دونوں رو رہی تھیں۔ میاں آزاد ابھی تک دریا کے کنارے ہی ٹہل رہے تھے۔ جبرے کو پانی میں چکر کھاتے دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ اتنے میں ایک دفعہ بجلی چمکی۔ سپہر آرا ڈر کر دوڑی مگر مارے گھبراہٹ کے ندی میں گر پڑی۔ ڈوبتے ہی پہلے غوط کھایا اور لگی ہاتھ پاؤں پھینٹا۔ ذرا دیر کے بعد پھر ابھری اور پھر غوط کھایا۔ آزاد نے یہ کیفیت دیکھی تو جھٹ پٹ کپڑے اتار کر دم سے کود ہی تو پڑے۔ پہلی ڈبکی ماری تو سپہر آرا کے بال ہاتھ میں آئے۔ انھوں نے جھٹ سے زلف کو پکڑ کر کھینچا، تو وہ ابھری۔ یہ وہی سپہر آرا ہے جو کسی انجان آدمی کو دیکھ کر منہ چھپا لیتی اور پھرتی سے بھاگ جاتی تھی۔ میاں آزاد اسے ساتھ لیے ملائی چیرتے اور کھڑی لگاتے جبرے کی طرف چلے۔ لیکن بجز ابھا سے باتیں کرتا چلا جاتا تھا۔ پانی بلیوں اچھلتا تھا۔ آزاد نے زور سے پکارا او میاں پیر بخش، بجز روکو، خدا کے واسطے روکو، پیر بخش کے ہوش و ہواس اڑے ہوئے تھے۔ بجز خدا کی راہ پر جدھر چاہتا تھا جاتا تھا۔ میاں آزاد بہت اچھے تیراک تھے۔ لیکن برسوں سے عادت چھوٹی ہوئی تھی۔ دم پھول گیا۔ اتفاق سے ایک بھنور میں پڑ گئے۔ بہت زور مارا مگر ایک نہ چل سکی۔ اس پر ایک مصیبت یہ کہ سپہر آرا چھوٹ گئی۔ آزاد کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ پھر بڑی پھرتی سے جھپٹے، لاش کو ابھارا اور لاد کر لے چلے۔ مگر اب دیکھتے ہیں تو جبرے کا کہیں پتہ نہیں۔ دل میں سوچے بجز ڈوب گیا اور حسن آرا لہروں کا لہہ بن گئی۔ اب میں سپہر آرا کو لادے لادے کہاں تک جاؤں۔ لیکن دل میں ٹھان لی کہ چاہے بچوں چاہے ڈوبوں، سپہر آرا کو نہ چھوڑوں گا۔ پھر

چلائے۔ یارو کوئی مدد کو آؤ۔ ایک بڑھا آدمی کنارے پر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ آزاد کو اس حالت میں دیکھ کر آواز دی۔ شاباش دینا، شاباش! میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کپڑے اتارے اور لنگوٹ باندھ کر دم سے کود بی تو پڑا۔ اس کی آواز سننا تھا کہ میاں آزاد کو ڈھارس ہوا، وہ تیزی کے ساتھ چلے گئے۔ بڑھے آدمی نے دو ہی ہاتھ کھڑی کے لگائے تھے کہ سانس پھول گئی اور پانی نے اس زوڑ سے تھینڑا دیا کہ پچاس گز کے فاصلے پر ہوا۔ اب نہ آزاد کو وہ سوجھتا ہے اور نہ اس کو آزاد نظر آتے ہیں۔ طالع نے بجرے پر سے بڑھے کو دیکھ لیا۔ سمجھا کہ میاں آزاد ہیں۔ پکارا ارے ابھی آزاد زور کر کے ادھر آؤ۔ بڑھے نے ہاتھ بندھ مارے نہ جاسکا۔ تب پیر بخش نے ڈانٹ سنجالے اور بڑھے کی طرف چلے۔ مگر افسوس دو چار ہی ہاتھ رہ گیا تھا کہ ایک مگر نے بھاڑ سا منہ کھول کر بڑھے کو ٹھک لیا۔ طالع نے سر پیٹ کر رونا شروع کیا۔ ہائے آزاد، تم بھی جدا ہوئے۔ بھاری سپہر آرا کا ساتھ دیا یہ آواز میاں آزاد کے کانوں میں بھی پڑی۔ سمجھے وہی بڑھا جو ٹیلے پر سے کودتا تھا چلا رہا ہے۔ اتنے میں بجزا نظر آیا تو باغ باغ ہو گئے۔ اب یہ بالکل بے دم ہو چکے تھے۔ لیکن بجرے کو دیکھتے ہی ہمت بندھ گئی۔ زور سے کھڑی لگانی شروع کی۔ بجرے کے قریب آئے تو پیر بخش نے پہچانا۔ مارے خوشی کے تالیاں بجانے لگے۔ آزاد نے سپہر آرا کو بجرے میں لٹا دیا اور دونوں نے کل کر پیٹ سے پانی نکالا۔ پھر لٹا کر اپنے بیک سے کوئی دوا نکالی اور اسے پلا دی۔ اب حسن آرا کی فکر ہوئی۔ وہ بھاری بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ آزاد نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ تو ذرا ہوش آیا مگر آنکھیں بند۔ پیاری سپہر آرا کہاں ہے؟ آزاد جیتے بچے۔ پیر بخش نے پکار کر کہا آزاد تمہارے سر ہانے بیٹھے ہیں اور سپہر آرا تمہارے پاس لیٹی ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ حسن آرا نے آنکھ کھولی اور آزاد کو دیکھ کر بولی آزاد میری جان اگر تم پر سے فدا ہو جائے تو اس وقت مجھے اس سے زیادہ خوشی ہو جتنا سپہر آرا کے بچ جانے سے ہوئی ہے۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں مجھے تم سے سچی محبت ہے۔

اتنے میں دوا کا اثر جو پہنچا تو سپہر آرا بھی آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ دونوں بہنیں گلے مل کر رونے لگیں۔ حسن آرا بار بار آزاد کی پلائیں لیتی تھی۔ میں تم پر واری ہو جاؤں، تم نے آج وہ کیا جو دوسرا کبھی نہ کرتا۔ ہوا بندھ گئی تھی، بجزا آہستہ آہستہ کنارے پر آگیا۔ آزاد نے گھاس پر لیٹ کر کہا اف مرنے۔

حسن آرا: چنگ سپہ آرا کی جان بچائی، میری جان بچائی، اس بچارے بڑھے کی جان بچائی اس سے بڑھ کر اور اب کیا ہوگا۔

بیر بخش: میاں آزاد، خاتم کو ایسا بڑھا کرے کہ تمہارے پڑپوتے مجھ سے بڑے ہو کر تمہارے سامنے کھلیں۔ میں نے کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ ایک آدمی تیرا ہوا جاتا تھا میں نے سمجھا تم ہو۔

آزاد: ہاں ہاں میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔ پھر وہ کہاں گیا؟

بیر بخش: کیا کہوں، اس کو تو ایک مگر گل گیا۔

آزاد: افسوس! کتنا دلیر آدمی تھا مجھے مصیبت میں دیکھ کر دم سے کود پڑا۔

سپہ آرا: مجھے نصیبوں جلی کی وجہ سے اس بچارے کی جان مفت میں گئی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا ہوا ہے۔ اس دریا کا ستیہ ناش ہو جائے۔ جس وقت میں اپنا گرنا اور غوطے لگانا یاد کرتی ہوں تو روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہلے تو میں نے خوب ہاتھ پاؤں مارے مگر جب نیچے بیٹھ گئی تو منہ میں پانی جانے لگا۔ میں نے دلوں ہاتھوں سے منہ بند کر لیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔

حسن آرا: بڑے گاڑھے وقت کام آئے۔

پیش بخش: اب آپ ذرا سو رہے، تو تھکاوٹ کم ہو جائے گی۔

تینوں آدمی تھک کر چور ہو گئے تھے۔ وہیں ہری ہری گھاس پر لیٹے تو تینوں کی آنکھ لگ گئی۔ چار گھنٹے تک سوتے رہے۔ جب نیند کھلی تو گھر چلنے کی ٹھہری۔ بیر بخش نے کہا اس وقت بجرے پر سوار ہونا تو حماقت ہے۔ سڑک سڑک چلیں۔

آزاد: ابی تو کیا ہر دم طوفان آیا کرتا ہے؟

دلوں بہنوں نے کہا ہم تو اس وقت بجرے پر نہ چڑھیں گے، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

آزاد نے کہا: جو اس وقت جھمک گئیں تو عمر بھر خوف لگتا رہے گا۔

حسن آرا: چلیے رہنے دیجیے، اب تو مارے تھکاوٹ کے آپ کے بدن میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی ہوگی کہ کسی کی لاش کو دو قدم بھی لے چلیے۔ نا صاحب بندی نہیں جانے کی۔ بجرے کی صورت دیکھنے سے بدن کا ہپتا ہے۔ ہم حصیں بھی نہ جانے دیں گے۔

سہرا آرا: آپ بجزے پر بیٹھے اور ہم احرار دنیا میں چھانڈ چڑے۔
 آخر یہ طے ہوا کہ ہر بخش بجز لائیں اور تئیں آدی اوپر اوپر گھر کی طرف چلیں۔
 آزاد نے موقع پایا، تو بولے۔ اب تو ہم سے کبھی پہانا نہ ہوگا؟ ہم آپ کو اپنا دل دے
 چکے۔ حسن آرا نے کچھ جواب نہ دیا، شرما کر سر جھکا لیا۔

رات بہت زیادہ بیت گئی تھی۔ آزاد ہر بخش کے ساتھ سوئے۔ صبح کو اٹھے تو کیا دیکھتے
 ہیں حسن آرا کے ساتھ ان کی دو چھوڑی بہنیں چھماچھم کرتی چلی آتی ہیں۔ ایک کا نام جہاں
 آرا تھا، دوسری کا کہتی آرا۔ دونوں بہنوں نے آزاد کو جھروکے سے دیکھا۔ جب جہاں آرا
 حسن آرا سے بولی بہن تمہاری پسند کی میں قائل ہوگئی۔ ایسا ہانکا جوان میری نظر سے نہیں
 گزرا۔

سہرا آرا: ہم کہتے نہ تھے کہ یہاں آزاد سا طرح دار جوان کم ہوگا۔ پھر میری تو انھوں
 نے جان ہی بچائی ہے۔ جب تک جیوں گی جب تک ان کا دم بھروں گی۔

اتنے میں پھر بخش بھی آچپٹے۔ جہاں آرا نے ان سے کہا کیوں جی ان سن سے سفید
 بالوں میں خضاب کیوں نہیں لگاتے؟ اب تو کوئی دوسو سے اوپر ہوں گے۔ کیا مرنا بالکل بھول
 بیٹھے۔ تمہیں تو موت نے بھی ساڑھ کی طرح چھوڑ دیا۔

پھر بخش: بیٹی، بہت کٹ گئی، تھوڑی باقی ہے۔ یہ بھی کٹ جائے گی۔ خضاب لگا کر رو
 سیاہ کون ہو۔

سہرا آرا: آزاد سے تو اب کوئی پردا ہے نہیں۔ انھیں بھی نہ بلا لیں؟

کہتی آرا: کبھی کی جان پہچان ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔

آزاد نے سامنے سے آکر کہا۔ فقیروں سے بھی جان پہچان کی ضرورت؟ فقیروں سے

کیا پردہ؟

کہتی آرا: یہ فقیر آپ کب سے ہوئے؟

آزاد: جب سے حسنین کی محبت ہوئی۔

کہتی آرا: آپ شاعر بھی تو ہیں۔ اگر طبیعت حاضر ہو تو اس مصرعے پر ایک غزل

کہیے۔

مرض عشق لا دوا دیکھا

آزاد: طبیعت کی تو نہ پوچھیے، ہر وقت حاضر رہتی ہے۔ رہا دماغ، وہ اپنے میں نہیں۔
پھر بھی آپ کا حکم کیسے ٹالوں۔ سنئے:

شیخ، کبھے میں تو نے کیا دیکھا
ہم بتوں سے ملے، خدا دیکھا
سوزِ دل نے کچھ اثر نہ کیا
ہم یہ سہار بھی بجا دیکھا
آہ نے میری کچھ نہ کام کیا
ہم نے یہ تیر بھی لگا دیکھا
ہر مرض کی دوا مقرر ہے
مرضِ عشق لا دوا دیکھا
شکلِ ناخون ہے گرچہ ابروئے یار
پر نہ اس کو گرہ کشا دیکھا
ہم نے دیکھا نہ عاشقِ آزاد
اور جو دیکھا تو جہلا دیکھا

کہتی آرا: ماشاء اللہ کیسی حاضر طبیعت ہے!

آزاد: انصاف کے تو یہ معنی ہیں کہ میں نے آپ کو خوش کیا، اب آپ مجھ کو خوش
کریں۔

کہتی آرا: آپ کچھ فرمائیں میں کوشش کروں گی۔

آزاد: یہ تو میری صورت سے ظاہر ہے کہ اپنا دل حسنِ آرا کو دے چکا ہوں۔

کہتی آرا: کیوں حسنِ آرا، مان کیوں نہیں جانتیں؟ یہ پیارے قصیں اپنا دل دے چکے۔
حسنِ آرا: واہ، کیا سفارش ہے! کیوں مان لیں، شادی بھی کوئی دل لگی ہے؟ میں بے
کعبے بوجھے ہاں نہ کروں گی۔ سنیے صاحب، میں آپ کی ادا، آپ کی وفا، آپ کی چال
ڈھال، آپ کی لیاقت اور شرافت پر دل اور جان سے عاشق ہوں۔ مگر یہ یاد رکھیے، میں ایسا
کام نہیں کرنا چاہتی جس سے بڑی لکھی عورت بدنام ہوں۔ ہمیں ایسا چال چلن رکھنا چاہیے جو
ادبوں کے لیے نمونہ ہو۔ اس شہر کی سب عورتیں مجھے دیکھتی رہتی ہیں کہ یہ کس طرف کو جاتی

ہے۔ آپ کو کوئی یہاں جانتا نہیں۔ آپ پہلے یہاں شریفوں میں عزت پیدا کیجیے، آپ کے یہاں پندرہویں دن مشاعرہ ہو اور لوگ آپ کو جانیں۔ کوئی کوٹھی کرائے پر لیجیے اور اسے خوب سجائیے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ سلیقہ کا آدمی ہے اور روٹیوں کو محتاج نہیں۔ شریف زادوں کے سوا امیروں غیروں سے صحبت نہ رکھیے، اور ہر روز جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جایا کیجیے۔ لیکن دکھاوا بھی ضروری ہے۔ ایک سواری بھی رکھیے اور صبح شام ہوا کھانے جائیے، اگر ان باتوں کو آپ مانیں تو مجھے شادی کرنے میں عذر نہیں۔ یوں تو میں آپ کے احسان سے دہلی ہوئی ہوں لیکن آپ سمجھ دار آدمی ہیں، اس لیے میں نے صاف صاف سمجھا دیا۔

آزاد: ایسے سمجھ دار ہونے سے باز آئے۔ ہم گنوار ہی سہی۔ آپ نے جو کچھ کہا، سب ہمیں منظور ہے، لیکن آپ بھی مجھے کبھی کبھی یہاں تک آنے کی اجازت دیجیے، اور آپ کی یہ بنییں مجھ سے ملا کریں۔

کیتی آرا: ذری پھر تو کہیے گا! آپ کو اپنی حسن آرا سے کام ہے یا ان کی بہنوں سے؟ حسن آرا نے آپ سے جو کچھ کہا اس کو غور کیجیے۔ ابھی جلدی نہ کیجیے، آپ شراب تو نہیں پیتے؟

آزاد: شراب کی صورت اور نام سے نفرت ہے۔

حسن آرا: پھر آپ کے پاس بجرے پر کہاں سے آئی، جو آپ نے سپہر آرا کو پلائی۔

آزاد: واہ، وہ تو دوا تھی۔

جہان آرا: اے باجی، بھیا کب سے سو رہا ہے، ذرا جگا دو۔ دو گھڑی کھیلنے کو جی چاہتا

ہے۔

کیتی آرا: نہ کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ بچے جب سوتے ہوں تو ان کو جگانا نہ چاہیے۔ ان کو جگانا ان کی باڑھ کو روکنا ہے۔

حسن آرا: اس وقت ہوا بڑے زور سے چل رہی ہے اور تم نے بھیا کو باریک شرقی پہنا دی ہے۔ اے دلی بہار۔ فلائین کا کرتا نیچے پہنا دو۔ یہ روپیہ کون بھیا کے ہاتھ میں دے گیا؟ اور جو کھیتے کھیتے منہ میں لے جائے تو؟

دل بہار: اے حضور، چھین تو لوں جب وہ دے بھی۔ وہ تو رونے لگتا۔

حسن آرا: دیکھو، ہم کس ترکیب سے لے لیتے ہیں، بھلا روئے تو (چکار کر) بھیا

(تالیاں بجا کر) بھیا لو تجھے چیز منگا دوں۔

یہ کہہ کر حسن آرا نے لڑکے کو گدگدایا۔ لڑکا ہنس پڑا اور روپیہ ہاتھ سے الگ۔

دل بہار: موسیٰ کو کیسے چپ چپاتے روپیہ دے دیا اور ہم نے ہاتھ ہی لگایا تھا کہ غل بچانے لگا۔

کیتی آرا: عمر بھر تم نے لڑکے پالے، مگر پالنا نہ آیا۔ بچوں کا پالنا کچھ ہنسی کھیل تھوڑے ہی ہے۔

دل بہار: ابھی میرا سن ہی کیا ہے کہ یہ باتیں جانوں۔

کیتی آرا: دیکھو، رات کو درخت کے تلے بچے کو نہ سلا یا کرو۔ بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔

دل بہار: ہاں، سنا ہے، لڑکے بھوت پریت کے جھپٹ میں آ جاتے ہیں۔

حسن آرا جھپٹ اور بھوت پریت سب ڈھکوسلا ہے۔ رات کو درخت کے نیچے سونا اس

لیے برا ہے کہ رات کو درخت سے زہریلی ہوا نکلتی ہے۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، عورتوں کی تعلیم کا ذکر چھڑا ہوا تھا، حسن آرا عورتوں کی تعلیم

پر زور دے رہی تھی، ادھر میاں پیر بخش کو بال بنوانے کا شوق جو چڑایا تو حجام کو بلوایا۔ حجام

بال بناتے بناتے کہنے لگا۔ حضور ایک دن میں سرائے میں گیا تھا تو وہاں یہ بھی نکلے ہوئے

تھے یہی جو جوان سے ہیں گورے گورے، بجرے پر سیر کرنے گئے تھے یاں یاد آ گیا۔ میاں

آزاد وہ بھی وہاں ملے۔ وہ صاحب تمھارے اس سرائے کی بھٹیاری سے شادی کرنے کو تھے

مل پھر نکل گئے۔ اس نے ان پر نالش جڑ دی تو وہاں سے بھاگے۔ اس بھٹیاری کو اونٹ پر

سوار کر کے رات کو لیے پھرتے تھے۔ پیر بخش نے قصہ سنا تو سناٹے میں آ گئے۔ بولے خبردار

اور کسی سے نہ کہنا۔

(25)

میاں آزاد حسن آرا کے یہاں سے چلے، تو گھومتے گھومتے ہنسوز کے مکان پر پہنچے اور

پکارا۔ لوٹھی بولی کہ وہ تو کہیں گئے ہیں، آپ بیٹھے۔

آزاد: بھابھی صاحبہ سے ہماری بندگی کہہ دو اور کہو، مزاج پوچھتے ہیں۔

لوٹھی: بیگم صاحبہ سلام کہتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ کہاں رہے؟

آزاد: ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔

لوٹری: وہ کہتی ہیں ہم سے نہ اڑے۔ یہاں مکی گولیاں نہیں کھیلیں۔ کہیے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہے۔ یہ بجرے پر ہوا کھانا اور یہاں آکر بٹے تانا۔

آزاد: آپ سے یہ کون کچا چٹا کہہ گیا؟

لوٹری: کہتی ہیں کہ مجھ سے بھی پردا ہے؟ اتنا تو بتا دیجیے کہ برات کس دن چڑھے گی؟ ہم نے سنا ہے حسن آرا آپ پر بے طرح رنجھ گئیں۔ اور کیوں نہ رنجھیں، آپ بھی تو ماشاء اللہ کبرو جوان ہیں۔

آزاد: پھر بھائی کس کے ہیں، جیسے وہ خوبصورت، ویسے ہم۔

لوٹری: فرماتی ہیں کہ دھاندلی رہنے دیجیے۔

آزاد: بھابھی صاحب، یہ گھونگھٹ کیسا؟ ہم سے کیسا پردہ؟

اتنے میں کسی نے پیچھے سے میاں آزاد کی آنکھیں بند کر لیں۔

آزاد چلا اٹھے۔ بھائی صاحب

ہنسوڑ: وہاں تو آپ نے خوب رنگ جمایا۔

آزاد: اجی آپ کی دعا ہے، میں بھلا کیا رنگ جماتا۔ مگر دونوں بہنیں ایک سے ایک

بڑھ کر ہیں۔ حسن آرا کی دو بہنیں اور آئی تھیں۔ واللہ خوب مزے رہے۔

ہنسوڑ: خوش نصیب ہو بھائی، جہاں جاتے ہو وہیں پو بارہ ہوتے ہیں۔ واللہ مان گیا۔

آزاد: مگر بھائی ایک غلطی ہو گئی۔ انھوں نے کسی طرح بھانپ لیا کہ میں شراب بھی پیتا

ہوں۔

ہنسوڑ: بڑے احمق ہو بھئی، کوئی ایسی حرکت کرتا ہے۔ تمھاری صورت سے نفرت ہو گئی۔

آزاد: اجی مجھے تو اپنی صورت سے آپ نفرت ہو گئی۔ مگر اب کچھ تدبیر تو بتاؤ؟

ہنسوڑ: اسی بڑھے کو سانٹو تو کام چلے۔

اس وقت دونوں آدمی کھانا کھا کر لیٹے۔ جب شام ہوئی تو دونوں حسن آرا کی طرف

چلے۔ بھری برسات کے دن، کوئی گولی کے نپے پر گئے ہوں گے کہ پچھم کی طرف سے متوالی

کالی گٹنا جھومتی ہوئی آئی اور دم کے دم چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ دوکاندار دوکانیں جھپٹ

بند کرنے لگے۔ کھونچے والوں نے کھونچا سنبھالا، اور لیے ہوئے۔ کوئی ٹوکڑ سوئے پر سونے

لگتا ہے کسی کا تیل دم دبائے بھاگا جاتا ہے۔ کہار پاکی اٹھائے، قدم جمائے اڑے جاتے ہیں، دہن جنگی، باتیں چرچا ہوں ہوں ہوں۔ پیدل چلنے والے تیز قدم اٹھاتے ہیں، پانچے چڑھاتے ہیں۔ کسی نے جوتیاں بغل میں دبائیں اور سر پٹ بھاگا۔ کسی نے کمر کسی اور گھوڑے کو لٹغز دی۔ اندھیرا اس غضب کا ہے کہ راہ سوچتی ہی نہیں، ایک پر ایک بھد بھد کر کے گرتا ہے اور میاں آزاد قہقہے لگاتے ہیں۔ کیوں، حضرت پوچھنا نہ پاچھنا اور دھماک سے لڑھک جانا۔

آزاد: بس، اور تھوڑی دور رہ گیا ہے۔

ہنسوڑ: آپ کو تھوڑی دور ہوگا، یہاں تو قدم بھر چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ ذرا دیکھ بھال کر قدم اٹھائیے گا۔ اف ہوانے کیا زور باندھا میں تو واللہ کاپنے لگا۔ اگر صلاح ہو تو گھر پلٹ چلیں۔ وہ لیجیے، بوندیں بھی پڑنے لگیں۔ کسی بھلے مانس کے پاس جانے کا بھلا یہ کون موقع ہے۔

آزاد: اجی یہ باتیں اس سے کیجیے جو اپنے ہوش میں ہو۔ یہاں تو دیوانہ پن سوار

ہے۔

اتنے میں بڑی بیگم کا محل نظر پڑا۔ آزاد نے مارے خوشی کے ٹوپی اچھال دی۔ تب تو ہنسوڑ نے بگڑ کر اسے ایک اندھے کوئیں میں پھینک دیا اور کہا بس تم میں یہی تو عیب ہے کہ اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ 'اوجھے کے گھرتیز، باہر رکھوں کہ بھیتز۔' آزاد:

یا تنگ نہ کر تاص ناداں مجھے اتنا

یا لالا کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

تم روکھے پھیکے آدمی، چہرے پر بھوسہ اڑ رہا ہے۔ تم یہ محبت کی باتیں کیا جانو؟ جب محل کے قریب پہنچے تو چوکیدار نے للکارا، کون؟ میاں ہنسوڑ تو جھنجکے، مگر آزاد نے بڑھ کر کہا ہم ہیں ہم۔

چوکیدار: اجی، ہم کا نام تو فرمائیے، یا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے۔

آزاد: ہم؟ ہمارا نام میاں آزاد ہے تم دل بہار کو اطلاع کر دو۔

خیر، کسی طرح آزاد اندر پہنچے۔ حسن آرا اس وقت سو رہی تھیں اور سپہر آرا بیٹھی ایک

شاعر کا دیوان پڑھ رہی تھی۔ آزاد کی خبر سنتے ہی بولی۔ کہاں ہیں کہاں بلا لاؤ، میاں آزاد مکان میں داخل ہوئے۔

پہر آرا:

وہ آئے ہیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
آزاد: یہ روکی خاطر داری کب تک ہوگی؟ ہمیں دلہا بھائی کب سے کہیے گا؟
پہر آرا: خدا وہ دن دکھائے تو۔

آزاد: آپ کی باجی کہاں ہیں؟

پہر آرا: آج کچھ طبیعت نامسا ہے۔ دل بہار جگا دو، کہو میاں آزاد آئے ہیں۔
حسن آرا انگڑائی لیتی، انکھیلیاں کرتی چلی اور آزاد کے قریب آکر بیٹھ گئی۔
آزاد: اس وقت ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔

پہر آرا: کیوں نہیں پھر منہ مانگی مراد بھی تو مل گئی۔

آزاد: آخر اب ہم کب تک ترسا کریں؟ آج میں بے قبولوائے اشوں تو آزاد نہیں۔
حسن آرا: ہمارا تو اس وقت برا حال ہے۔ نیند اندی چلی آتی ہے۔ اب ہمیں سونے
جانے دیجیے۔

آزاد: (دوپٹے پاؤں سے دبا کر) ہاں، جائے، آرام کیجیے۔

حسن آرا: شرارت سے آپ باز نہیں آتے! دامن تو دبائے ہیں اور کہتے ہیں جائے
جائے، کیوں کر جائیں؟

آزاد: دوپٹے کو پھینک جائیے۔

حسن آرا: بجا ہے، یہ کسی اور کو سکھائیے (بیٹھ کر) اب صاف کہہ دوں۔

آزاد: ضرور، مگر آپ کے تہر اس وقت بے ڈھب ہیں، خدا ہی خیر کرے۔ جو کچھ کہنا
ہو کہہ ڈالیے۔ خدا کرے میرے مطلب کی بات منہ سے نکلے۔

حسن آرا: آپ لائق ہیں مگر ایک پردیسی آدمی، ٹھور نہ ٹھکانہ، گھر نہ بار۔ کسی سے آپ
کا ذکر کروں تو کیا کہوں؟ کس کے لڑکے ہیں؟ کس کے پوتے ہیں؟ کس خاندان کے ہیں؟
شہر بھر میں یہی خبر مشہور ہو جائے گی کہ حسن آرا نے ایک پردیسی کے ساتھ شادی کر لی۔ مجھے تو

اس کی پرواہ نہیں لیکن ڈر یہ ہے کہ کہیں اس نکاح سے لوگ پڑھی لکھی عورتوں کو نیچی نظر سے نہ دیکھنے لگیں۔ بات وہ کرنی چاہیے کہ دھبہ نہ لگے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب پھر کہتی ہیں کہ شہر میں نام پیدا کیجیے، عزت کمائیے، چار بھلے آدمیوں میں آپ کی قدر ہو۔

آزاد: کیسے آگ میں پھاند پڑوں؟

حسن آرا: ماشاء اللہ، کبھی بھی تو زانی! اگر آپ آگ میں پھاند پڑے، تو لوگ آپ کو سڑی سمجھیں گے۔

سپہر آرا: کوئی کتاب لکھیے۔

حسن آرا: نہیں، کوئی بہادری کی بات ہو کہ جو سنے واہ واہ کرنے لگے۔ اور پھر اچھی اچھی رئیس زادیاں چاہیں کہ ان کے ساتھ میاں آزاد کا بیاہ ہو جائے۔ اس وقت موقع بھی اچھا ہے۔ روم اور روس میں لڑائی چھڑنے والی ہے۔ روم کی مدد کرنا آپ کا فرض ہے۔ آپ روم کی طرف سے لڑے اور جواں مردی کے جوہر دکھائیے، تمغے لٹکائے ہوئے آئیے تو پھر ہندستان بھر میں آپ ہی کی چرچا ہو۔

آزاد: منظور، دل و جان سے منظور، جاؤں اور بیچ کھیت جاؤں۔ مرے تو سیدھے جنت میں جائیں گے، بچے تو تم کو پائیں گے۔

سپہر آرا: میرے تو لڑائی کے نام سے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ (حسن آرا سے چٹ کر) باجی، تم کیسی بے درد ہو، کہاں کالے کوسوں بھیجتی ہو۔ تمہیں خدا کی قسم اس خیال سے باز آؤ۔ آزاد جائیں گے تو پھر ان کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گی۔ دن رات آنسو بہاؤ گی۔ کیوں مفت میں کسی کی جان کی دشمن ہوئی ہو؟

کنارے دریا پہنچ کے پانی

پیا نہیں ایک بوند تس پر

چڑھی ہے موجوں کی ہم سے تیوری

حباب آنکھیں بدل رہے ہیں

یہ کہتے کہتے سپہر آرا کی آنکھوں سے گول گول آنسو کی بوندیں گرنے لگیں۔

حسن آرا: ہیں ہیں، بہن، یہ مفت کا رونا دھونا اچھا سوانگ ہے، وہ مبارک دن میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے جب آزاد تمغے لٹکائے ہوئے ہمارے دروازے پر کھڑے

ہوں گے۔

میاں آزاد پر اس وقت وہ جو بن تھا کہ ادھوہو، جوانی پٹی پڑتی تھی۔ آنکھیں سرخ جیسے کبوتر کا خون، کھڑا گورا جیسے گلاب کا پھول، کپڑے وہ ہانگے پہنے تھے کہ سر سے پاؤں تک ایک ایک انگ نکھر رہا تھا۔ ٹوپی وہ ہانگی کہ ہانگین بھی لوٹ جائے۔ کمر سے دوہری کٹواریں لٹکی ہوئیں۔ حسن آرا کو ان کا چاند سا کھڑا ایسا بھایا کہ جی چاہا کہ اسی وقت نکاح کر لوں۔ مگر دل پر ضبط کیا۔

آزاد : آج ہم گھر سے موت کی تلاش میں ہی نکلے تھے :

جب سے سنا کہ مرنے کا ہے نام زندگی

سر سے کفن کو باندھے قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

سپہر آرا : پیارے آزاد، خدا کے واسطے اس خیال سے باز آؤ۔

آزاد : یا ہاتھ توڑ جائیں گے یا کھولیں گے نقاب۔

حسن آرا سی بیوی پانا دل لگی نہیں۔ اب ہم پھر شادی کا حرف بھی زبان پر لائیں تو

جواں مرد نہیں۔ اب ہماری ان کی شادی اسی روز ہوگی جب ہم میدان سے سرخ رو ہو کر

لوٹیں گے۔ ہم سر کٹوائیں گے، زخم پر زخم کھائیں گے، مگر میدان سے قدم نہ ہٹائیں گے۔

سپہر آرا : جو آپ نے دالان تک بھی قدم رکھا تو ہم رو رو کر جان دے دیں گے۔

آزاد : تم گھبراؤ نہیں جیتے بچے تو پھر آئیں گے۔ ہمارے دل سے حسن آرا کی اور

تمہاری محبت جاتی رہے یہ مشکل ہے۔ تم میری خاطر سے رونا دھونا چھوڑ دو۔ آخر کیا لڑائی

میں سب کے سب مر ہی جاتے ہیں؟

سپہر آرا : اتنی دور جا کر ایسی ہی تقدیر ہو، تو آدمی لوٹے۔ اب میری زندگی محال ہے۔

مجھے دفنا کے جانا۔ اللہ جانے، کن کن جنگلوں میں رہو گے، کیسے کیسے پہاڑوں پر چڑھنا ہوگا،

کہاں کہاں لڑنا بھڑنا ہوگا۔ ایک ذرا سی گولی تو ہاتھی کا کام تمام کر دیتی ہے، انسان کی کون

کہے۔ تم وہاں گولیاں کھاؤ گے اور ہم دن رات بیٹھے بیٹھے کڑھا کریں گے۔ ایک ایک دن ایک

ایک برس ہو جائے گا۔ اور پھر کیا جانے آؤ نہ آؤ لڑائی چڑھائی پر جانا کچھ ہنسی تھوڑے ہی

ہے۔ یہ تو قصیں مردوں کا کام ہے۔ ہم تو یہیں سے نام سن سن کر کانپتے ہیں۔

حسن آرا : میری پیاری بہن ذرا صبر سے کام لو۔

سہرا آرا: نہ مانوں گی نہ مانوں گی۔

حسن آرا: سن تو لو۔

سہرا آرا: جی، بس، سن چکی۔ خون کیچے، اور کبھے سن تو لو۔

حسن آرا: یہ کیا بری بری باتیں منہ سے نکالتی ہو۔ ہمیں برا معلوم ہوتا ہے۔ میں ان کو زبردستی تھوڑے سی بھیجتی ہوں وہ تو آپ جاتے ہیں۔

سہرا آرا: سمندر سمندر جانا پڑے گا۔ کوئی طوفان آگیا، تو جہاز ہی ڈوب جائے گا۔
آزاد: اب رات زیادہ آئی، آپ لوگ آرام کریں، ہم کل رات کو یہاں سے کوچ کریں گے۔

سہرا آرا: اس طرح جانا تھا تو ہمارے پاس دل دکھانے آئے کیوں تھے؟ (ہاتھ پکڑ کر)
دیکھوں، کیوں کر جاتے ہیں۔

آزاد: دل و جگر خون ہو چکے ہیں

ہواں تک اپنے جا چکے ہیں

وہی محبت کا حوصلہ ہے

ہزار صدے اٹھا چکے ہیں

حسن آرا: ہائے، کس غضب میں جان پڑی۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹے جاتے ہیں، آنکھیں
جل رہی ہیں۔ آزاد اگر مجھے دنیا میں کسی کی چاہ ہے تو تمہاری۔ لیکن دل سے لگی ہے کہ تم
روسیوں کو نیچا دکھاؤ۔ مرنا جینا مقدر کے ہاتھ ہے۔ کون رہا ہے اور کون رہے گا۔

تاج میں جن کے کلتے تھے گوہر

ٹھوکر میں کھاتے ہیں وہ سرتا سر

ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ

نہ کسی جا ہے گل دمن کا پتہ -

یہی دنیا کا کارخانہ ہے

یہ الٹ پھیر کا زمانہ ہے

آزاد: ہم تو جاتے ہیں تم سہرا آرا کو سمجھاتی رہنا۔ نہیں تو راہ میں میرے قدم نہ
اٹھیں گے۔ کل رات کو مل کر کوچ کروں گا۔

حسن آرا: بہن ان کو جانے دو کل آئیں گے۔
 سپہ آرا: جانیے، میں آپ کو روکنے والی کون؟

آزاد یہاں سے چلے کہ سامنے سے چنڈوباز آتے ہوئے مل گئے۔ گلے سے لپٹ کر بولے، واللہ آنکھیں آپ کو ڈھونڈتی تھیں۔ صورت دیکھنے کو ترس گئے۔ وہ جو چلتے وقت آپ نے تان کر چابک جمایا تھا، اس کا نشان اب تک بنا ہے۔ بارے ملے خوب۔ بی اللہ رکھی تو مر گئی، بھاری مرتے وقت خدا کی قسم اللہ اللہ کہا کیس اور دم توڑنے کے پہلے تین دفعہ آزاد آزاد کہہ کر چل بسیں۔

آزاد نے چنڈوباز کی صورت دیکھی، تو ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ روم کا جانا اور تنغے لٹکانا بھول گئے۔ سوچے اب عزت خاک میں ملی۔ لیکن جب چنڈوباز نے بیان کیا کہ اللہ رکھی چل بسیں اور مرتے وقت تک میرے ہی نام کی رٹ لگاتی رہی تو بڑا افسوس ہوا۔ آنکھوں ہے آنسو بہنے لگے، بولے بھی تم نے بری خبر سنائی۔ ہائے مرتے وقت دو باتیں بھی نہ کرنے پائے۔

چنڈوباز: کیا عرض کروں، قسم خدا کی اس پیار اور اس حسرت سے تمہیں یاد کیا کہ کیا کہوں۔ میری تو روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا تو کہتیں آزاد آئے۔ آپ اپنا ایک رومال وہاں بھول آئے ہیں، اس کو ہر روز دیکھ لیا کرتی تھیں۔ مرتے وقت کہا کہ ہماری قبر پر یہ رومال رکھ دیتا۔

آزاد (رو کر) اف کبچہ منہ کو آتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس غریب کو مجھ سے اتنی محبت تھی۔

چنڈوباز: ایک گلدستہ اپنے ہاتھ سے بنا کر دے گئی ہے کہ اگر میاں آزاد آجائیں تو ان کو دے دیتا اور کہتا اب حشر میں آپ کی صورت دیکھیں گے۔

آزاد: بھئی، اسی وقت دو۔ خدا کے واسطے ابھی لاؤ۔ میں تو مرا بے موت، لاؤ گلدستہ ذرا چم لوں۔ آنکھوں سے لگاؤں، گلے سے لگاؤں۔

چنڈوباز: (آنسو بہا کر) چلیے، میں سرائے میں اترا ہوا ہوں۔ گلدستہ ساتھ ہے۔ اس کو جان سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں۔

دونوں آدمی مل کر چلے، راہ میں اللہ رکھی کے روپ رنگ اور بھولی بھولی باتوں کا ذکر

کیا۔ چلتے چلتے دونوں سرائے میں داخل ہوئے۔ میاں آزاد جیسے ہی چند باز کی کھڑی میں کھسے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بی اللہ رکھی بگلے کے پر جیسا سفید کپڑا پہنے کھڑی ہیں۔ دیکھتے ہی میاں آزاد کا رنگ فق ہو گیا۔ چپ، اب بلتے ہیں نہ بولتے ہیں۔

اللہ رکھی (تالیاں بجا کر) آداب عرض کرتی ہوں۔ ذرا ادھر نظر کیجیے۔ یہ کوسوں کی راہ طے کر کے ہم آپ ہی کی زیارت کے لیے آئے ہیں اور آپ کو ہم سے ایسی نفرت کہ آنکھ تک نہیں ملاتے۔ واہ ری قسمت! اب ذرا سر تو ہلایئے، گردن تو اٹھائیئے، وہ چاند سا کھڑا تو دکھائیے۔ ہائے کیا عظم ہے، جن پر ہم جان دیتے ہیں، وہ ہماری صورت سے بیزار ہیں۔ کبھی آپ کی حسن آرا تو اچھی ہیں؟ ذرا ہم کو تو ان کا جو بن دکھاؤ۔ ہم نے سنا، کبھی کبھی بجزوں پر دریا کی سیر کو جاتی ہیں، کبھی ہم جولیوں کو لے کر جشن مناتے ہیں۔ کیوں، حضرت ہم بک رہے ہیں، یا بھونک رہے ہیں؟ ہمارا ہی لہو پے جو ادھر نہ دیکھے۔

آزاد: خدا کی قسم صرف تمہیں کو دیکھنے آیا ہوں۔

چند باز: بھئی، آزاد کی روتے روتے ہنگی بندھ گئی تھی۔ قسم خدا کی، میں نے جو یہ فقرہ چست کیا کہ اللہ رکھی نے مرتے وقت آزاد آزاد کہہ کے دم توڑا تو یہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اللہ رکھی: خیر، اتنی تو ڈھارس ہوئی کہ مرنے کے بعد بھی ہم کو کوئی پوچھے گا لیکن:

آئے تربت پہ بہت روئے، کیا یاد مجھے

خاک اڑانے لگے، جب کر چکے برباد مجھے

آزاد: اللہ رکھی، اب ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔ اگر تمہیں ہم سے محبت ہے، تو ہمیں دق نہ کرو۔ نہیں ہم سٹکیاں کھا کر جان دے دیں گے۔ اگر ہمیں جلانا چاہتی ہو تو ہمیں آزاد کر دو۔

اللہ رکھی: سنو آزاد، ہم بھی شریف زادی ہیں، مگر اللہ کو یہی منظور تھا کہ ہم بھٹیاری بن کر رہے ہیں۔ یاد ہے، ہمارے بوڑھے میاں نے تمہیں خط دے کر ہمارے مکان پر بھیجا تھا اور تم کئی دن تک ہمارے گھر کا چکر لگاتے رہے تھے؟ ہم دن رات کڑھا کرتے تھے۔ آخر وہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہی تھے، چل بے۔ اس دن ہم نے مسجد میں کبھی کے چراغ جلائے۔ مقدر کھینچ کر یہاں لایا۔ لیکن اللہ جانتا ہے، جو میری آنکھیں کسی سے لڑی ہوں۔ تم سے بیاہ کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن تم راضی نہ ہوئے، اب ہم نے سنا ہے کہ حسن آرا کے

ساتھ تمھارا نکاح ہونے والا ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ اب ہم نے آپ کو اجازت دے دی، خوشی سے بیاہ کیجیے، لیکن ہمیں بھول نہ جانا۔ لوٹری بن کر رہوں گی، مگر تم کو نہ چھوڑوں گی۔

آزاد: اف تم وہ ہو جس کا اس بوڑھے سے بیاہ ہوا تھا؟ یہ جید تو اب کھلا۔ مگر ہائے افسوس تم نے یہ کیا کیا۔ تمھاری ماں نے بڑی ہی بے وقوفی کی، جو تم جیسی کاہنی کا ایک بڑھے کے ساتھ بیاہ کر دیا۔

اللہ رکھی: اپنی تقدیر!

کچھ دیر تک آزاد بیٹھے اللہ رکھی کو تسلی دیتے رہے۔ پھر گلا چھڑا کر، چکا دے کر نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ طبلے کی تھک کانوں میں آئی۔ گھر کا راستہ چھوڑ محفل میں جا پہنچے۔ دیکھا وہاں خوب دھماچوڑی مچ رہی ہے۔ ایک نے غزل گائی، دوسری نے ٹھمری، تیسری نے ٹپا۔ آزاد ایک ہی رسیا وہیں جم گئے۔ اب اس سنک کو دیکھیے کہ غیر کی محفل اور آپ انتظام کرتے ہیں، کسی حقے کی چلم بھرواتے ہیں۔ کسی گڑگڑی کو تازا کرواتے ہیں۔ کبھی ٹھمری کی فرمائش کی، کبھی غزل کی۔ دس پندرہ گنواروں نے جو گانے کی آواز سنی تو دھنس پڑے۔ میاں آزاد نے انھیں دھکے دے کر باہر کیا۔ مالک مکان نے جو دیکھا کہ ایک شریف نوجوان آدمی انتظام کر رہے ہیں، تو ان کو پاس بلایا، تپاک سے بٹھایا، کھانا کھلایا۔ یہی بہار دیکھتے دیکھتے آزاد نے رات کاٹ دی۔ وہاں سے اٹھے تو تڑکا ہو گیا تھا۔

میاں آزاد کو آج ہی روم کے سفر کی تیاری کرنی تھی۔ اسی فکر میں بدحواس جا رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک باغ میں جمولے پڑے ہیں، کئی لڑکیاں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے، گلے میں ہار ڈالے پیٹنگ لگا رہی ہیں اور سب کی سب سر بلبل آواز سے لہرا لہرا کر یوں گا رہی ہیں:

ندیا کنارے پیلا کس نہ بویا، ندیا کنارے

پیلا بھی بویا، جمیلی بھی بوی، فچ

فچ بویا رے گلاب، ندیا کنارے

آزاد کو یہ گیت ایسا بھایا کہ تھوڑی دیر ٹھہر گئے۔ پھر خود جمولے پر جا بیٹھے اور پیٹنگ لگانے لگے۔ کبھی کبھی گانے بھی لگتے تھے اس پر لڑکیاں کلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔ یکا یک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کالا کلونا مریل سا آدمی کھڑا لڑکیوں کو گھور رہا ہے۔ آزاد نے کئی بار یہ

کیفیت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا، ایک چپت جما ہی تو دی۔ ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلا اٹھا اور گالیاں دے کر کہنے لگا۔ نہ ہوئی ولایتی اس وقت پاس، نہیں تو بھٹا سا سراڑا دیتا۔ اور جو کہیں جوان ہوتا تو کھود کر گاڑ دیتا۔ اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچا ہی کھا جاتا۔ اور جو کہیں نشے کی چاٹ ہوتی تو گھول کے پی جاتا۔

آزاد پہچان گئے، یہ میاں خوبی تھے۔ کون خوبی؟ نواب کے مصاحب، کون نواب؟ وہی بئیر باز، جن کے صف حکم کو ڈھونڈنے آزاد نکلے تھے۔ بولے ارے بھائی خوبی ہیں؟ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ مزاج تو اچھے ہیں؟

خوبی: جی ہاں، مزاج تو اچھا ہے لیکن کھوپڑی بھٹا رہی ہے۔ بھلا ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو کہیے میں تمہیں پہچان گیا، نہیں تو اس وقت جان سے مار ڈالتا۔
آزاد: اس میں کیا جھگ، آپ ہیں ہی ایسے دلیر! آپ ادھر کیسے آنکے؟
خوبی: آپ ہی کی تلاش میں تو آیا تھا۔
آزاد: نواب تو اچھے ہیں؟

خوبی: اچی وہ گئے چولہے میں۔ یہاں سر بھٹا رہا ہے۔ لے اب چلو، تمہارے ساتھ چلیں۔ کچھ تو کھلاؤ یار۔ مارے بھوک کے بے دم ہوئے جاتے ہیں۔
آزاد: ہاں ہاں، چلیے خوب شوق سے۔

دونوں مل کر چلے تو آزاد نے خوبی کو شراب کی دکان پر لے جا کر اتنی شراب پلائی کہ وہ نہیں ہو گئے، انھیں وہیں چھوڑ کر میاں ہنسوڑ کے گھر جا پہنچے۔

میاں ہنسوڑ بہت ناراض ہوئے کہ مجھے تو لے جا کر حسن آرا کے مکان کے سامنے کھڑا کر دیا اور آپ اندر ہو رہے۔ آدمی رات تک تمہاری راہ دیکھتا رہا۔ یہ آخر آپ رات کو تھے کہاں؟

آزاد ابھی کچھ جواب دینے والے ہی تھے کہ ایک طرف سے میاں پیر بخش کو آتے دیکھا اور دوسری طرف سے چند ہواز کو۔ آپ دور ہی سے بولے، عجیب طرح کے آدمی ہو میاں! وہاں سے کہہ کر چلے کہ ابھی آتا ہوں، ہل بھر کی بھی دیر نہ ہوگی، اور جب کے گئے گئے اب تک صورت نہیں دکھائی، اللہ رکھی ہے چاری ڈھاڑیں مار مار کر رو رہی ہیں۔ چلیے ان کے آنسو تو پونجیے۔

میاں پیر بخش نے باتیں سنیں تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔ حجام کے منہ سے تو یہ سن ہی چکے تھے کہ میاں آزاد کسی سرائے میں ایک بھکاری پر لٹو ہو گئے تھے، پر اب تک حسن آرا سے انھوں نے یہ بات چھپا رکھی تھی۔ اس وقت جو پھر وہی ذکر سنا تو دل میں سوچنے لگے کہ وہاں تو لڑکیوں کو رات رات بھر نیند نہیں آتی، حسن آرا تو کسی قدر ضبط بھی کرتی ہیں مگر سپہر آرا بیچاری پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ اور یہاں یہ ہے کہ کان پر جوں تک نہیں ریگنتی۔ بولے آپ چل رہے ہیں یا یہاں بیٹھے ہوئے بی اللہ رکھی کے دکھڑے سینے گا؟ اگر کہیں دونوں بہنیں سن لیں، تو کیسی ہو؟ بس اب بھل منسی اسی میں ہے کہ میرے ساتھ چلے چلے، نہیں تو حسن آرا سے ہاتھ دھویئے گا اور پھر اپنی پھوٹی قسمت کو رویئے گا۔

چنڈو باز : میاں، ہوش کی دوا کرو! بھلا مجال ہے کہ یہ اللہ رکھی کو چھوڑ کر یہاں سے جائیں۔ کیا خوب ہم تو سیکڑوں کوئیں جھانکتے آئے، آپ بیچ میں بولنے والے کون؟ آزاد : اجی انھیں بکنے بھی دو، ہم تمہارے ساتھ اللہ رکھی کے پاس چلیں گے۔ اس محبت کی تپنی کو دغا نہ دیں گے۔ تم گھبراتے کیوں ہو؟ کھانا تیار ہے، آج میٹھا پکویا ہے، تم ذرا بازار سے لپک کر چار آنے کی بلائی لے لو۔ مزے سے کھانا کھائیں۔ کیوں استاد، ہے نہ معاملے کی بات، لانا ہاتھ۔

چنڈو باز بالائی کا نام سنتے ہی کھل اٹھے۔ جھپ سے پیسے لیے اور لڑھکتے ہوئے چلے بالائی لانے۔ میاں آزاد انھیں بنا دے کر پیر بخش سے بولے، چلیے حضرت ہم اور آپ چلیں راستے میں باتیں ہوتی جائیں گی۔

دونوں آدمی وہاں سے چلے۔ آزاد تو ڈبل چال چلنے لگے، پر میاں پیر بخش پیچھے رہ گئے۔ تب بولے، اجی ذرا قدم روکے ہوئے چلیے۔ کسی زمانے میں ہم بھی جوان تھے۔ اب یہ فرمائیے کہ یہ اللہ رکھی کون ہے؟ جو کہیں حسن آرا سن پائیں تو آپ کی صورت نہ دیکھیں، بڑی بیگم تو تم کو اپنے محل کے ایک میل ادھر ادھر پھٹکنے نہ دیں۔ آپ اپنے پاؤں میں آپ کھلاڑی مار رہے ہیں۔ اب شادی وادی ہونا خیر صلاح ہے۔ سوچ لیجیے کہ اگر وہاں اس کی بات چلی تو کیا جواب دیتیے گا۔

آزاد : جناب، یہاں سوچنے کا مرض نہیں۔ اس وقت جو زبان پر آئے گا کہہ جاؤں گا۔ ایسی دکالت کروں کہ آپ بھی دنگ ہو جائیں، زبان سے پھلجھڑی چھوٹنے لگے۔

اتنے میں کوٹھی سامنے نظر آئی اور ذرا دیر میں دونوں آدمی محل میں داخل ہوئے۔ سپہر آرا تو آزاد سے ملنے دوڑی، مگر حسن آرا اپنی جگہ سے نہ اٹھی۔ وہ اس بات پر روٹھی ہوئی تھی کہ اتنا دن چڑھ آیا اور میاں آزاد نے صورت نہ دکھائی۔

حسن آرا: بہن، ان سے پوچھو کہ آپ کیا کرنے آئے ہیں؟
 آزاد: آپ خود پوچھیے، کیا منہ نہیں ہے یا منہ میں زبان نہیں ہے؟
 سپہر آرا: یہ اب تک آپ کہاں غائب رہے؟
 حسن آرا: اجی، ہمیں ان کی کیا پرواہ، کوئی آئے یا نہ آئے، ہم کسی کے ہاتھ کبے تھوڑے ہی ہیں۔

سپہر آرا: باجی کی آنکھیں روتے روتے لال ہو گئیں۔
 حسن آرا: پوچھو، آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟
 آزاد: پوچھتے کون، آخر آپ خود کیوں نہیں پوچھتیں؟
 کہوں کیا میں تجھ سے کہ کیا چاہتا ہوں
 جہاں ہو چکی اب وفا چاہتا ہوں
 بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن
 کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں
 حسن آرا: ان سے کہہ دو، یہاں کسی کی دہائی تباہی بکواس سننے کا شوق نہیں ہے۔ معلوم ہے آپ بڑے شاعر کی دُم ہیں۔

سپہر آرا: بہن، تم لاکھ بنو، دل کی لگی کہیں چھپانے سے چھپتی ہے۔
 حسن آرا: چلو، بس چپ بھی رہو۔ بہت کلیجہ نہ پکاؤ، ہمارے دل پر جو گزر رہی ہے ہمیں جانتے ہیں۔ چلو ہم اور تم کمرہ خالی کر دیں جس کا جی چاہے بیٹھے، جس کا جی چاہے جائے۔ حیا دار کے لیے ایک چلو کافی ہے۔

یہ کہہ کر حسن آرا اٹھی اور سپہر آرا بھی کھڑی ہوئی۔ میاں آزاد نے سپہر آرا کا پہنچا پکڑ لیا۔ اب دل لگی دیکھیے کہ میاں آزاد تو اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور حسن آرا اپنی طرف کھینچتی ہوئی کہہ رہی ہیں: ہماری بہن کا ہاتھ کوئی پکڑے تو ہاتھ ہی ٹوٹیں۔ جب ہم نے نکا سا جواب دے دیا تو پھر یہاں آنے والا کوئی کون! واہ ایسے حیا دار بھی نہیں دیکھے!

آزاد : صاحب آپ اتنا خفا کیوں ہوئی ہیں؟ خدا کے واسطے ذرا بیٹھ جائیے۔ مانا کہ ہم خطاوار ہیں، مگر ہم سے جواب تو سنیے، خدا گواہ ہے ہم بے قصور ہیں۔

حسن آرا : بس بس، زبان نہ کھلوائیے۔ بس اب رخصت۔ آپ اب چھ مہینے کے بعد صورت دکھائیے گا، ہم بھی کلیجے پر پتھر رکھ لیں گے۔

یہ کہہ کر حسن آرا تو وہاں سے چلی گئی مگر میاں آزاد اکیلے بیٹھے بیٹھے سوچنے لگے کہ اسے کیسے مناؤں۔ آخر انھیں ایک چال سوچی۔ ارگنی پر سے چادر اتار لی اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہے۔ چہرے بیماروں کا سا بنا لیا اور کراہنے لگے۔ اتفاق سے میاں پیر بخش اس کمرے میں آٹکے۔ آزاد کی صورت جو دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔ جا کر حسن آرا سے بولے، جلد پلنگ بچھو! میاں آزاد کو بخار ہو آیا ہے۔

حسن آرا : ہیں ہیں یہ کیا کہتے ہو، پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔
 سپر آرا : کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ ایسی سنائی اللہ ساتویں دشمن کو بھی نہ سنائے۔
 حسن آرا : ہائے میرے اللہ، میں کیا کروں! میں نے اپنے پیروں میں آپ کلباڑی ماری۔

ذرا دیر میں پلنگ بچھ گیا۔ حسن آرا، اس کی بہن، پیر بخش اور دل بہار چار پائی کے پاس کھڑے ہو کر آنسو بہانے لگے۔

دل بہار : میاں، کسی حکیم جی کو بلاؤ۔

سپر آرا : چہرہ کیسا زرد ہو گیا۔

پیر بخش : میں ابھی جا کر حکیم صاحب کو لاتا ہوں۔

حسن آرا : حکیم جی کا یہاں کیا کام ہے؟ اور یوں آپ چاہیں جس کو بلائیں۔

میاں پیر بخش تو باہر گئے اور حسن آرا پلنگ پر جا بیٹھی، میاں آزاد کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ سپر آرا پھولوں کا پنکھا جھٹکنے لگی۔

حسن آرا : میری زبان کٹ پڑے۔ میری ہی جلی کئی باتوں نے یہ بخار پیدا کیا۔

یہ کہہ کر اس نے آہستہ آہستہ آزاد کی پیشانی کو سہلانا شروع کیا۔ آزاد نے آنکھیں کھول دیں اور بولے :

میرے جنازے کو ان کے کوچے میں
 ناحق احباب لے کے آئے
 نگاہ حسرت سے دیکھتے ہیں
 وہ رخ سے پردہ ہٹا ہٹا کر
 سحر ہے نزدیک شب ہے آخر
 سرا سے چلتے ہیں ہم مسافر
 جنہیں ہے ملنا وہ سب ہیں حاضر
 جس سے کہہ دو، کوئی صدا کر
 حسن آرا: کیوں حضرت، یہ مکاری! خدا کی پناہ، میری تو بری گت ہوگئی۔
 آزاد: ذرا اسی طرح ان نازک ہاتھوں سے پھر ماتھا سہلاؤ۔
 حسن آرا: میرا بلا جاتی ہے، وہ وقت ہی اور تھا۔
 آزاد:

میں نے جو کہا ان سے کہ شب کو یہیں رہو
 آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر
 حسن آرا: آپ نے آخر یہ سوانگ کیوں رچا؟ چھپائے نہیں صاف صاف بتائیے۔
 آزاد:

اب کہتی ہو کہ تم مری محفل میں آئے کیوں
 آتا تھا کون کوئی کسی کو بلائے کیوں
 کہتا ہوں صاف صاف کہ مرتا ہوں آپ پر
 ظاہر جو بات ہو اسے کوئی چھپائے کیوں
 یہاں مارے بخار کے دم نکل رہا ہے آپ مکر سمجھتی ہیں۔
 یہاں دونوں میں یہی نوک جھونک ہو رہی تھی، اتنے میں میاں خوبی پتہ پوچھتے ہوئے
 آپہنچے۔

خوبی: میاں ہوت ذرا آزاد کو تو بلاؤ۔
 دربان: کس سے کہتے ہو؟ آئے کہاں سے؟ ہو کون؟

خوبی : ایں یہ تو کچھ تابوتی سا معلوم ہوتا ہے۔ ابے التجا کر دے کہ خوبہ صاحب آئے ہیں۔

دربان : خوبہ صاحب؟ ہمیں تو جولاہے سے معلوم ہوتے ہو۔ بھلے مانسوں کی صورت ایسی ہی ہوا کرتی ہے؟

آزاد نے یہ باتیں سنیں تو باہر نکل آئے اور خوبی کو بلا لیا۔
خوبی : بھئی، ذرا آئینہ تو منگوا دیتا۔

آزاد : یہ آئینہ کیا ہوگا؟ بندگی نہ سلام، بات نہ چیت، آتے ہی آتے آئینہ یاد آیا۔ بندر کے ہاتھ میں آئینہ بھلا کون دینے لگا!

خوبی : اجی منگواتے ہو یا دل لگی کرتے ہو۔ دربان سے ہم سے جموڑ ہو گئی۔ مردود کہتا ہے تمہاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ اب کوئی اس سے پوچھے پھر کیا چمار کی سی ہے یا پاجی کی سی۔

آزاد : بھئی اگر راج پوچھتے تو تمہاری صورت سے ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے۔ خدا چاہے پاجی بنائے، مگر پاجی کی صورت نہ بنائے۔ پر اب اس کا علاج ہی کیا؟
خوبی : واہ، اس کا کچھ علاج ہی نہیں؟ ڈاکٹروں نے مردے تک کے جلا لینے کا تو بندوبست کر لیا ہے آپ فرماتے ہیں علاج ہی نہیں۔ اب پاجی نہ بنیں گے، پاجی بن کے جنے تو کیا۔

آزاد : کل ہم روم جانے والے ہیں، چلتے ہو ساتھ؟
خوبی : نہ چلے، اس پر بھی لعنت، نہ لے چلے، تو اس پر بھی لعنت۔
آزاد : مگر وہاں چندو نہ ملے گا، اتنا یاد رکھیے۔
خوبی : اجی انیم ملے گی کہ وہ بھی نہ ملے گی؟ بس، تو پھر ہم اپنا چندو بنالیں گے۔ ہمیں ضرور ملے چلیے۔

آزاد اندر جا کر بولے : حسن آرا، اب رخصت کا وقت قریب آتا جاتا ہے، ہنسی خوشی رخصت کرو، خدا نے چاہا تو پھر ملیں گے۔

حسن آرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بولی، ہائے اندر والا نہیں مانتا اس کو بھی تو سمجھاتے جاؤ۔ یہ کس کا ہو کر رہے گا؟

آزاد: تمھاری یہ حالت دیکھ کر میرے قدم رکے جاتے ہیں۔ اب ہمیں جانے دو۔ زندگی شرط ہے، ہم پھر ملیں گے اور جشن کریں گے۔ یہ کہہ کر آزاد باہر چلے آئے اور خوبی کے ساتھ چلے۔ خوبی نے سمجھا تھا، روم کہیں لکھنؤ کے آس پاس ہوگا۔ اب جو سنا کہ سات سمندر پار جانا پڑے گا تو ہکا بکا ہو گئے۔ ہاتھ پاؤں کا پینے لگے۔ بھئی ہم سمجھے تھے دل لگی کرتے ہو۔ یہ کیا معلوم تھا کہ سچ سچ تک تو بڑا چڑھا کر بھاگا ہی چاہتے ہو۔ میاں تم لاکھ عالم فاضل سہی پھر بھی لڑکے ہی ہو۔ یہ خیال دل سے نکال ڈالو۔ ایک ذرا سی پنے کے برابر گولی پڑے گی، تو ٹائیس سے رہ جاؤ گے۔ آپ کو کبھی مورچے پر جانے کا شاید اتفاق نہیں ہوا۔ خدا بھلے مانس کو نہ لے جائے۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ گولی پڑی، یہ مر گیا۔ دائیں دائیں کی آواز سے کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ توپ کا گولا آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ گولا پھٹا اور بہتر کھڑے ہوئے، اور ایک ایک کھڑے نے دس دس آدمیوں کو اڑا دیا۔ جو کہیں تلوار چلنے لگی تو موت سامنے نظر آتی ہے، بے موت جان جاتی ہے۔ کھٹا کھٹ تلوار چل رہی ہے اور ہزاروں آدمی گرتے جاتے ہیں۔ سو بھئی وہاں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تھوڑے ہی ہے۔ خدا کے لیے ادھر رخ نہ کرنا۔ اور بندہ تو اپنے حساب، جانے والے کو کچھ کہتا ہے۔ ہم ایک ترکیب بتائیں، وہ کام کیوں نہ کیجیے کہ حسن آرا آپ کو خود روکے اور لاکھوں قسمیں دیں۔ آپ اندر جاکر بیٹھیے اور ہم کو چک کے پاس بٹھائیے۔ پھر دیکھیے میں کیسی ترکیب کرتا ہوں کہ دونوں بہنیں کانپ اٹھیں۔ ان کو یقین ہو جائے کہ میاں آزاد گئے اور اثنا غنیل ہوئے۔ میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ بھئی آزاد ذرا اپنی تصویر تو کھینچوا لو۔ آخر اب تو جاتے ہی ہو۔ واللہ جو کہیں یہ تقریر سن پائیں تو حشر تک تمھیں نہ جانے دیں اور جھپ سے شادی ہو جائے۔

آزاد: بس اب اور کچھ نہ فرمائیے۔ مرنا جینا کسی کے اختیار کی بات تو ہے نہیں۔ لاکھوں آدمی کورے آتے ہیں، اور ہزاروں راہ چلتے لوٹ جاتے ہیں۔ حسن آرا ہم سے کہے کہ ترکیب جاؤ اور ہم باتیں بتائیں اس کو دھوکا دیں۔ جس سے محبت کی اس سے فریب۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ آپ میاں ہنوز کے یہاں جائیے اور ان سے کہیے کہ ہم ابھی آتے ہیں۔ ہم پہنچے اور کھانا کھا کر لمبے ہوئے۔ خوبی تو گرتے پڑتے چلے، مگر دو قدم جاکر پھر پلٹے۔ بھئی ایک بات تو سنو۔ کیا کیا پکوا رکھوں؟ آزاد بہت ہی جھلائے۔ عجب نا سمجھ آدمی ہو! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا! ان کے یہاں جو کچھ ممکن

ہوگا تیار کریں گے۔ یہ کہہ کر آزاد تو اپنے دو چار دوستوں سے ملنے چلے، ادھر میاں خوبی ہنسوڑ کے گھر پہنچے۔ جا کر غل مچانا شروع کیا کہ جلد کھانا تیار کرو، میاں آزاد ابھی ابھی جانے والے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ پانچ سیر بیٹھے کھڑے، سات سیر پلاؤ، دس سیر فرنی، دس ہی سیر کھیر۔ کوئی چودہ سیر زردہ۔ کوئی پانچ سیر مربہ اور بیٹھے اچار کی اچاریاں جلد تیار ہوں۔ میاں ہنسوڑ کی بیوی کھانا بنانے میں برق تھیں۔ ہاتھوں ہاتھ سب سامان تیار کر دیا۔ میاں آزاد شام کو پہنچے۔

ہنسوڑ: کہیے آج تو سفر کا ارادہ ہے۔ کھانا تیار ہے، کہیے تو کھلویا جائے۔ برف بھی منگوا رکھی ہے۔

آزاد: کھانا تو ہم اس وقت نہ کھائیں گے ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔

ہنسوڑ: خیر آپ نہ کھائیے گا نہ کسی آپ کے اور دوست کہاں ہیں؟ ان کے ساتھ دو نوالے تم بھی کھا لیتا۔

آزاد: دوست کیسے! میں نے تو کسی دوست کے لیے کھانا پکانے کو نہیں کہا تھا۔

ہنسوڑ: اور سنے گا! کیا آپ نے اپنے ہی لیے دس سیر کھیر، اٹھارہ سیر بیٹھے کھڑے اور خدا جانے کیا کیا الم غلم چکویا ہے۔

آزاد: آپ سے یہ کہا کس نامعقول نے؟

ہنسوڑ: خوبی نے اور کس نے؟ بیٹھے تو ہیں پوچھیے نہ!

آزاد: خوبی تم مر بھوکے ہی رہے۔ یہ اتنی چیزیں کیا سر پر لاد کر لے جاؤ گے؟ لاحول

ولا قوۃ۔

خوبی: لاحول کا ہے کی؟ آپ نہ کھائیے، میں تو ڈٹ کر کچھ چکا۔ راستے کے لیے بھی باندھ رکھا ہے۔

آزاد: اچھا تو اب بوریاں بندھنا اٹھائیے، لادیے پھاندیے۔

خوبی: جناب، اس وقت تو یہ حال ہے جیسے چوہے کو کوئی پارا پلا دے۔ اب بندہ لوٹ

مارے گا۔ اور یہ تو بتاؤ سواری کیا ہے؟

آزاد: اکا۔

خوبی: غضب خدا کی! تب تو میں جا چکا۔ اکے پر تو یہاں کبھی سواری ہی نہیں ہوئے۔

اور پھر کھانا کھا کر تو مری جاؤں گا۔

خیر، میاں آزاد نے جھٹ پٹ کھاٹ کھایا اور اسباب کس کر تیار ہو گئے۔ خوشی پڑے خزانے لے رہے تھے روتے گاتے اٹھے۔ باہر جا کر دیکھتے ہیں تو ایک سند گھوڑی پوری ادھ مرامیل ٹٹو۔ آزاد گھوڑی پر سوار ہوئے اور میاں ہنسوڑکی بیوی سے بولے بھابھی بھول نہ جائے گا۔ بھائی صاحب تو بھلکو آدی ہیں، آپ یاد رکھیے گا۔ آپ کے ہاتھ کا کھانا مر بھر نہ بھولوں گا۔ انھوں نے رخصت کرتے ہوئے کہا، جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو، خدا کرے اسی طرح بند بھی دکھاؤ۔ امام ضامن کو بھونپا۔

اب سینے کے میاں خوشی نے اپنے مریل ٹٹو کو جو دیکھا تو گھبرائے۔ گھوڑے پر کبھی زندگی بھر سوار نہ ہوئے تھے۔ لاکھ چاہتے ہیں کہ سوار ہو جائیں مگر ہمت نہیں پڑتی۔ یار لوگ ڈراتے ہیں۔ دیکھو دیکھو وہ پتک اچھالی، وہ دولتی جھاڑی، وہ منہ کھول کر لپکا۔ مگر ٹٹو کھڑا ہے، کان تک نہیں ہلاتا۔ ایک دفعہ آنکھ بند کر کے حضرت نے چاہا کہ لد لیں مگر یاروں نے تالیاں جو بجائیں تو ٹٹو بھاگا اور میاں خوشی بھد سے زمین پر۔ دیکھا کہتے نہ تھے کہ ہم اس ٹٹو پر نہ سوار ہوں گے۔ مگر آزاد نے دو گھڑی دل لگی دیکھنے کے لیے ہم کو الو بنایا۔ وہ تو کہو ہڈی پھلی بچ گئی نہیں تو چہرہ ہو جاتی۔ خیر دو آدمیوں نے ان کو اٹھایا اور لاد کر گھوڑی کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ انھوں نے لگام ہاتھ جس لی ہی تھی کہ ایک گھڑے دل نے چابک جما دیا۔ ٹٹو دم دبا کر بھاگا اور میاں خوشی لڑھک گئے۔ بارے آزاد نے آکر ان کو اٹھایا۔

خوبی: اب کیا روم تک برابر اس ٹٹو ہی پر جانا ہوگا؟

آزاد: اور نہیں کیا آپ کے واسطے اڑن کھولا آئے گا؟

خوبی: بھلا اس ٹٹو پر کون جائے گا؟

آزاد: ٹٹو، آپ تو اسے ٹانگھن کہتے تھے۔

خوبی: بھئی، ہمیں آزاد کر دو۔ ہم باز آئے اس سفر سے۔

آزاد: ارے بے وقوف ریل تک اسی پر چلنا ہوگا، وہاں سے بھئی تک ریل پر

جائیں گے۔

میاں آزاد اور خوشی آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر میں خوشی کا ٹٹو بھی گرمایا اور آزاد کی گھوڑے کے پیچھے قدم بڑھا کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے ٹٹو نے شرارت کی۔ بوٹ کے ہرے

ہرے کھیت دیکھے تو ادھر لپکا۔ کسان نے جو دیکھا تو لٹھ لے کر دوڑا اور لگا برا بھلا کہنے۔ اس کی جورو بھی چمک کر لپکی اور کوٹنے لگی کہ پلایا مر جائے، کیڑے پڑیں، ابھی ابھی پیٹ پھنے داڑھی ہار کی لباس لٹھے۔ اور کسان بھی گالیاں دینے لگا۔ ارے پوٹو کون سار کیر آئے۔ سر ہرے کھیت میں پیٹھائے دیں۔ میاں خوبی گالیاں کھا کر بگڑ گئے۔ ان میں ایک صفت یہ تھی کہ بے سوچے سمجھے لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دو گنا چوگنا ہو۔ وہ چٹ ہی جاتے تھے۔ غصے کی یہ خامیت ہے کہ جب آتا تھا کمزور پر۔ مگر میاں خوبی کا غصہ بھی نرالا تھا جب آتا تھا تو شہ زور پر، کسان نے ان کے ٹٹو کو کئی لٹھ جمائے تو میاں خوبی تڑ سے اتر کر کسان سے گٹھ گٹھ گئے۔ وہ گنوار آدمی بدن کا کرارا اور یہ دبلے پتلے آدمی، ہوا کے جمونکے میں اڑ جائیں۔ اس نے ان کی گردن دلوچی اور گد سے زمین پر پھینکا۔ پھر اٹھے تو ان کی جورو ان سے چٹ گئی اور گئی ہاتھ پائی ہونے۔ اس نے گھونسا جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا، تو چاروں شانے چٹ۔ دو تھپڑ بھی رسید کیے۔ ایک ادھر ایک ادھر۔ کسان کھڑا ہنس رہا ہے کہ مہارو سے جیت ناعی پاوت، یہ سنڈن سے کا لڑیہ بھلا۔ کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک کر چل دی۔ اور آپ نے پکارنا شروع کیا، قسم ابا جان کی جو کہیں چھرا پاس ہوتا تو ان دونوں کی لاش اس وقت پھڑکتی ہوتی۔ وہ تو کہیے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میرے پاس چھرا نہ تھا، نہیں تو اتنی کروایاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ کھڑا تو رہ او گیدی۔ اس پر گاڈن والوں نے خوب قہقہہ اڑایا۔ ایک نے پوچھا کیوں میاں صاحب چھری ہوتی تو کیا بھونک کر مر جاتے؟ اس پر میاں خوبی اور بھی آگ ہو گئے۔

میاں آزاد کوئی دو گولی کے پٹے پر نکل گئے تھے۔ جب خوبی کو پیچھے نہ دیکھا تو چکرائے کہ ماجرا کیا ہے؟ گھوڑی پھیری اور آکر خوبی سے 'بولے یہاں کھیت میں کب تک پڑے رہو گے؟ اٹھو گرد جھاڑو۔

خوبی: کرولی نہ ہوئی پاس نہیں تو اس وقت دو لاشیں یہاں پھڑکتی ہوئی دیکھتے۔
 آزاد: اجی وہ تو جب دیکھتے تب دیکھتے، اس وقت تو تمہاری لوتھ دیکھ رہے ہیں۔
 انھوں نے پھر خوبی کو اٹھایا اور ٹٹو پر سوار کرایا۔ تھوڑی دیر میں پھر دونوں آدمیوں میں ایک کھیت کا فاصلہ ہو گیا۔ خوبی سے ایک بٹھان نے پوچھا کہ شیخ جی آپ کہاں رہتے ہیں؟
 حضرت نے جھٹ سے ایک کوزا جمایا اور کہا ابے ہم شیخ نہیں خواجہ ہیں۔ وہ آدمی غصے سے

آگ ہو گیا اور ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا، تو خوبی کھٹ سے زمین پر۔ اب چاروں شانے چت پڑے ہیں، اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ آزاد نے جو پیچھے پھر کر دیکھا تو ٹٹو آ رہا ہے مگر خوبی غدار۔ پلٹے، دیکھیں اب کیا ہوا۔ ان کے پاس پہنچے تو دیکھا پھر اسی طرح زمین پر پڑے کرولی کی ہانک لگا رہے ہیں۔

آزاد: حمیس شرم نہیں آتی! کزوری مار کھانے کی نشانی۔ دم نہیں ہے تو کٹے کیوں مرتے ہو؟ مفت میں جوتیاں کھانا کون جواں مردی ہے؟

خوبی: واللہ جو کرولی کہیں پاس ہو تو چلتی ہی کر ڈالوں۔ وہ تو کہیے خیریت ہوئی کہ کرولی نہ تھی نہیں تو اس وقت قبر کھودنی پڑتی۔

آزاد: اب اٹھو گے بھی یا پرسوں تک یوں ہی پڑے رہو گے۔ تم نے تو اچھا ناک میں دم کر دیا۔

خوبی: اجی، اب نہ اٹھیں گے جب تک کرولی نہ لا دو گے بس اب بنا کرولی کے نہ بنے گی۔

آزاد: بس اب بیہودہ نہ بکو، نہیں تو میں اب کی ایک لات جماؤں گا۔

خیر، دونوں آدمی یہاں سے چلے تو خوبی بولے یہاں جوت جوت میں درد ہو رہا ہے۔ اس کسان کی موسنڈھی عورت نے تو کچھمر ہی نکال ڈالا۔ مگر قسم ہے خدا کی جو کہیں کرولی پاس ہوتی تو غضب ہی ہو جاتا۔ ایک کو تو جیتا چھوڑتا ہی نہیں۔

آزاد: خدا گننے کو بچے نہیں دیتا۔ کرولی کی آپ کو ہمیشہ تلاش رہی مگر جب آئے پٹ ہی کے آئے جوتیاں ہی کھائیں۔ خیر یہ دکھڑا کوئی کہاں تک روئے، اب یہ بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟ جی مٹلا رہا ہے، بند بند ٹوٹ رہا ہے، آنکھیں بھی جلتی ہیں۔

خوبی: لینڈوری آگئی۔ اب حضرت بھی آتے ہوں گے۔

آزاد: یہ لینڈوری کیسی؟ اور حضرت کون؟ میں کچھ نہیں سمجھا۔ ذرا بتاؤ تو؟

خوبی: ابھی لڑکے نہ ہو بخار کی آمد ہے۔ آنکھوں کی جلن، جی کا مٹلانا، بدن کا ٹوٹنا، سب اسی کی علامتیں ہیں۔ اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر چلنا برا ہے۔ اب آپ گھوڑے سے اتر پڑیے اور چل کر کہیں لیٹ رہیے، کہنا مایہ۔

آزاد: یہاں کوئی اپنا گھر ہے جو اتر پڑوں؟ کسی سے پوچھو تو کہ گاؤں کتنی دور ہے۔

خدا کرے پاس ہی ہو، نہیں تو میں یہاں گر پڑوں گا۔ اور قبر بھی یہیں بنے گی۔
 خوجی: اجی، ذرا دل کو سنبھالو۔ کوئی اتنا گھبراتا ہے؟ قبر کیسی؟ ذرا دل کو ڈھارس دیجیے۔
 آزاد: واللہ، پھونکا جاتا ہوں، بدن سے آگ نکل رہی ہے۔
 خوجی: وہ گاؤں سامنے ہی ہے، ذرا گھوڑی کو تیز کر دو۔

آزاد نے گھوڑی کو ذرا تیز کیا تو وہ اڑ گئی۔ خوجی نے بھی کوڑے پر کوڑا جمانا شروع کیا۔ مگر لدو ٹٹو کہاں تک جاتا؟ آخر خوجی نے جھلا کر ایک ایڑ دی تو ٹٹو اگلے پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور میاں خوجی سنبھل نہ سکے، دم سے زمین پر آ رہے۔ اب ٹٹو پر بگڑ رہے ہیں کہ نہ ہوئی کرو لی اس وقت نہیں تو اتنی بھونکتا کہ بلبلانے لگتا۔ خیر کسی طرح اٹھے، ٹٹو کو پکڑا اور لد کر چلے۔ دو چار دل لگی باز آدمیوں نے تالیاں بجائیں اور کہنا شروع کیا۔ لد ا ہے لد ا ہے لینا، جانے نہ پائے۔ خوجی بگڑ کھڑے ہوئے۔ ہٹو سامنے سے، نہیں تو ہنٹر جمانا ہوں۔ مجھے بھی کوئی ایسا دیا سمجھے ہو۔ میں سپائی آدمی ہوں۔ نوابی میں دو دو تلواریں کمر سے لگی رہتی تھیں۔ اب لاکھ کنزور ہو گیا ہوں لیکن اب بھی تم جیسے پچاس پر بھاری ہوں۔ لوگوں نے خوب ہنسی اڑائی۔ جی ہاں آپ ایسے ہی جواں مرد ہیں۔ ایسے سوراہوتے کہاں ہیں۔

خوجی: اتروں گھوڑے سے، آؤں؟

یاروں نے کہا: نہیں صاحب، ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا! آپ ٹھہرے پہلوان اور سپاہی آدمی، کہیں مار ڈالے آکر تو کوئی کیا کرے گا۔

اس طرح گرتے پڑتے ایک سرائے میں پہنچے اور اندر جا کر کوفریاں دیکھنے لگے۔ سرائے بھر میں چکر لگائے لیکن کوئی کوفری پسند نہ آئی۔ بھیلیاں پکار رہی ہیں کہ میاں مسافر ادھر آؤ ادھر دیکھو، خاصی صاف ستھری کوفری ہے۔ ٹٹو باندھنے کی جگہ الگ۔ اتنا کہنا تھا کہ میاں خوجی آگ ہو گئے۔ کیا کہا، ٹٹو ہے یہ میکو کا ٹانگھن ہے۔ ایک بھیلیاری نے چمک کر کہا ٹانگھن ہے یا گدھا؟ تب تو خوجی جھلائے اور چھری اور کرو لی کی تلاش کرنے لگے۔ اس پر سرائے بھر کی بھیلیاریوں نے انھیں بتانا شروع کیا۔ آخر آپ اتنے دق ہوئے کہ سرائے کے باہر نکل آئے اور بولے۔ بھئی چلو آگے کے گاؤں میں رہیں گے۔ یہاں سب کے سب شریر ہیں۔ مگر آزاد میں اتنا دم کہاں کہ آگے جا سکیں۔ سرائے میں گئے اور ایک کوفری میں اتر پڑے۔ خوجی نے بھی وہیں بستر بچایا۔ سائیس تو کوئی ساتھ تھا نہیں، خوجی کو اپنے ہی ہاتھ

سے دونوں جانوروں کو گھیرا کرتا پڑا۔ بھیری نے سمجھا یہ سائیکس ہے۔
 بھیری : او سائیکس بھیا، ذرا گھوڑی کو ادھر باندھو۔
 خوجی : کسے کہتی ہے ری سائیکس کون ہے؟
 بھیری : اے تو بگڑتے کیوں ہو میاں، سائیکس نہیں چرکتے سہی۔
 آزاد : چپ رہو یہ ہمارے دوست ہیں۔
 بھیری : دوست ہیں صورت تو بھلے مانسوں کی سی نہیں ہے۔
 خوجی : بھئی آزاد ذرا آئینہ تو نکال دینا۔ کئی آدمی کہہ چکے۔ آج میں اپنا چہرہ ضرور
 دیکھوں گا۔ آخر سب کیا ہے کہ جسے دیکھو بھی کہتا ہے۔
 آزاد : چلو واہیات نہ بکو، میرا تو برا حال ہے۔
 بھیری نے چار پائی بچھا دی اور آزاد لیٹے۔
 خوجی نے کہا : اب طبیعت کیسی ہے؟
 آزاد : بری گت ہے، جی چاہتا ہے اس وقت زہر کھالوں۔
 خوجی : ضرور، اور اس میں تھوڑی سکھیاں بھی ملا لیتا۔
 آزاد : مرکبنت، دل لگی کا یہ موقع ہے؟
 خوجی : اب بوڑھا ہوا مردوں کس پر، مرنے کے دن تو آ گئے۔ اب تم ذرا سونے کا
 خیال کرو۔ دو چار گھڑی نیند آجائے تو جی ہلکا ہو جائے۔ اتنے میں بھیری نے آکر پوچھا۔
 میاں کیسے ہو؟
 آزاد : کیا بتاؤں مر رہا ہوں۔
 بھیری : کس پر؟
 آزاد : تم پر۔
 بھیری : خدا کی ستوار
 آزاد : کس پر؟
 بھیری نے خوجی کی طرف اشارہ کر کے کہا ان پر
 خوجی : انوس، نہ ہوئی کرولی!
 آزاد : ہوتی، تو کیا کرتے؟

خوجی: بھونک لیتے اپنے پیٹ میں۔

آزاد: بھئی، اب کچھ علاج کرو، نہیں تو مفت میں دم نکل جائے گا۔

بھیری: ایک حکیم یہاں رہتے ہیں میں بلائے لاتی ہوں۔

یہ کہہ کر بی بھیری جا کر حکیم جی کو بلا لائی۔ میاں آزاد دیکھتے ہیں تو عجب ڈھنگ کے آدمی، دھوتی باندھے، گاڑھے کی مرزئی پہنے، چہرے سے دیہاتی پن برس رہا ہے، آدمیت چھو ہی نہیں گئی۔

آزاد: حکیم صاحب، آداب۔

حکیم: تاہیں دیواؤ تاہیں، بخار میں دابے نقصان ہوت ہے۔

آزاد: آپ کا نام؟

حکیم: ہمارا نام دانگو

آزاد: دانگو یا جانگو؟

حکیم: نسخہ لکھوں؟

آزاد: جی نہیں، معاف کیجیے، بس یہاں سے تشریف لے جائیے۔

حکیم: بخار میں اک بک کرت ہیں، چاند کے پنے کتر دا ڈالو۔

خوجی: کچھ بیدھا تو نہیں ہوا! نہ ہوئی کرولی، نہیں تو توند پر رکھ دیتا۔

حکیم: بھائی، ہم سے ان کا علاج نہ ہو سکے ہے۔ اب ایک ہوئے تو علاج کریں۔ یوں

پاگل کو ہے ہو؟ ہم کا الٹی کا پلوا بکت ہے سر۔

آخر خوجی نے جھلا کر ان کو اٹھا دیا اور یہ نسخہ لکھا۔

آلو بخارا دو دانہ، قمر ہندی چھ ماشہ عرق گاؤز ہاں دو تولہ۔

آزاد: یہ نسخہ تو آپ کل پلائیں گے یہاں تو رات بھر میں کام ہی تمام ہو جائے گا۔

خوجی: اس وقت بندہ کچھ نہیں دینے کا۔ ہاں آلو کا پانی پیچھے پانچ دانے بھگوئے دیتا

ہوں۔ کھانا اس وقت کچھ نہ کھانا۔

آزاد: واہ کھانا نہ ملا تو میں آپ ہی کو چٹ کر جاؤں گا۔ اس بھروسے نہ رہیے گا۔

خوجی: واللہ، ایک دانہ بھی آپ کے پیٹ میں گیا اور آپ برس بھر تک یوں ہی پڑے

رہے۔ آلو کا پانی بھی گھونٹ گھونٹ کر کے پینا۔ یہ نہیں کہ پیالہ منہ سے لگایا اور غٹ غٹ پی

ہمیں۔

یہ کہہ کر خوبی نے چند نکس کر آزاد کی چھاتی پر رکھا۔ پالک کے پتے چارپائی پر بچھا دیے۔ کچھرہ کاٹ کر ماتھے پر رکھا اور ذرا سانک باریک پیس کر پاؤں میں ملا۔ تلوے سہلائے۔

آزاد: یہاں تو کوئی حکیم بھی نہیں۔

خوبی: اجی، ہم خود علاج کریں گے۔ حکیم نہ سہی حکیموں کی آنکھیں تو دیکھی ہیں۔

آزاد: علاج تک مضائقہ نہیں مگر مار نہ ڈالنا بھائی۔ ہاں ذرا اتنا احسان کرنا۔

آزاد کی بے چینی کچھ کم ہوئی تو آنکھ لگ گئی۔ یکا یک پڑوس کی کوفری۔ سے شور و گل کی

آواز آئی۔ آزاد چونک پڑے اور پوچھا یہ کیسا شور ہے؟ بھیلیاری تم ذرا جا کر ان کو لٹکارو۔

خوبی: کہو کہ ایک شریف آدمی بخار میں پڑا ہوا ہے۔ خدا کے واسطے ذرا خاموش

ہو جاؤ۔

بھیلیاری: میاں میں ٹھہری عورت ذات اور وہ مردوے۔ اور پھر اپنے آپے میں نہیں۔

جو بھی پر پل پڑے تو کیا کروں گی؟ ہاں بھیلیارے کو بھیجے دیتی ہوں۔

بھیلیارے نے جا کر جو ان شرابیوں کو ڈانٹا تو سب کے سب اس پر ٹوٹ پڑے اور

چپتیں مار مار کر بھگا دیا۔ اس پر بھیلیاری طیش میں آکر اٹھی اور انگلیاں ملکا کر اتنی گالیاں

سنائیں کہ شرابیوں کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ اتنا ڈرے کہ کوفری کا دروازہ بند کر لیا۔

لیکن تھوڑی دیر میں پھر شور ہوا اور آزاد کی نیند اچٹ گئی۔ خوبی کو جو شامت آئی تو

شرابیوں کی کوفری کے دروازے کو اس زور سے دم دھمایا کہ چول نکل گئی۔ سب شرابی جھلا کر

باہر نکل آئے اور خوبی پر بے بھاد کی پڑنے لگی۔ انھوں نے ادھر ادھر چھری اور کروٹی کی بہت

کچھ تلاش کی، مگر خوب پیٹے۔ اس کے بعد وہ سب سو گئے رات بھر کوئی نہ نکلا۔ صبح کو اس

کوفری سے رونے کی آواز آئی۔ خوبی نے جا کر دیکھا تو ایک آدمی مرا پڑا ہے اور باقی سب

کھڑے رو رہے ہیں۔ پوچھا تو ایک شرابی نے کہا بھائی ہم سب روز شراب پیا کرتے ہیں۔

کل کی شراب بہت تیز تھی۔ ہم نے بہت منع کیا پر بوتل کی بوتل خالی کر دی۔ رات کو ہم لوگ

سوئے تو اتنا ابلتہ کہا کہ کلیجہ پھونکا جا رہا ہے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو مرا ہوا ہے۔ آپ تو جان

سے گیا اور ہم کو بھی قتل کر گیا۔

خونجی: غضب ہو گیا۔ اب تم سب دھرے جاؤ گے اور سزا پاؤ گے۔

شرابی: ہم کہیں گے سانپ نے کاٹا تھا۔

خونجی: کہیں ایسی بھول بھی نہ کرنا۔

شرابی: اچھا، بھاگ جائیں گے۔

خونجی: تب تو ضرور ہی پکڑے جاؤ گے۔ لوگ تاڑ جائیں گے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔

شرابی: اچھا ہم کہیں گے کہ چھری مار مار کر مر گیا اور گلے میں چھری بھی بھونک

دیں گے۔

خونجی: یہ حماقت ہے، میں جیسے کہوں ویسے کرو۔ تم سب کے سب روؤ اور سر پیٹو۔ ایک کہے کہ میرا سا بھائی تھا، دوسرا کہے کہ میرا بہنوئی تھا۔ تیسرا اسے ماموں بتائے۔ جو کوئی پوچھے کہ کیا ہوا تھا، تو گردے کا درد بتاتا۔ خوب چلا چلا کر روتا۔ جو یوں آنسو نہ آویں تو مرچے لگا لو۔ آنکھوں میں دھول جمونک لو۔ ایسا نہ ہو کہ گڑبڑا جاؤ اور جیل خانے جاؤ۔

ادھر تو شرابیوں نے رونا پینا شروع کیا، ادھر کسی نے جا کر تھانے میں جڑ دئی کہ سرائے میں کئی آدمیوں نے مل کر ایک مہاجن کو مار ڈالا۔ تھانے دار اور دن چوکیدار رپ رپ کرتے آپہنچے۔ ارے او بھیری بتا وہ مہاجن کہاں نکا ہوا تھا؟
بھیری: کون مہاجن؟ کسی کا نام تو لیجیے۔

تھانیدار: تیرا باپ، اور کون!

بھیری: میرا باپ؟ اس کی تلاش ہے تو قبرستان جائیے۔

تھانیدار: خون کہاں ہوا؟

بھیری: خون! ارے توجہ کر بندے۔ خون ہوا ہوگا تھانے پر۔

تھانیدار: ارے اس سرائے میں کوئی مرا ہے رات کو؟

بھیری: ہاں تو یوں کہیے وہ دیکھیے، پچھارے کھڑے رو رہے ہیں۔ ان کے بھائی تھے۔ کل درد ہوا۔ رات کو مر گئے۔

تھانیدار: لاش کہاں ہے؟

شرابی: حضور، یہ رکھی ہے۔ ہائے ہم تو مر گئے۔ مگر میں جا کر کیا منہ دکھائیں گے، کس منہ سے اب گھر جائیں گے۔ کسی ڈاکٹر کو بلوایئے، ذرا نبض تو دیکھ لیں۔

تھانیدار: اجی اب نبھ میں کیا رکھا ہے۔ بچارہ بری موت مرا۔ اب اس کے دفن کفن کی فکر کرو۔

تھانیدار چلا گیا، تو میاں خوبی خوب کھلکھلا کر ہنسنے لگا کہ واللہ کیا بات بتائی ہے۔ شرابیوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی کہ واہ استاد، کیا جھانسا دیا۔ آپ کی بدولت جان بچی، نہیں تو نہ جانے کس مصیبت میں پھنس جاتے۔

تھوڑی ہی دیر بعد کسی کٹھری سے پھر شور مٹا دیا۔

آزاد: اب یہ کیسا ٹھل ہے بھائی؟ کیا یہ بھی کوئی شرابی ہے؟

بھیری: نہیں ایک رئیس کی لڑکی ہے۔ اس پر ایک پریت آیا ہے۔ ذرا سی لڑکی لیکن اتنی دلیر ہو گئی ہے کہ کسی کے سنبھالے نہیں جھپٹتی۔

آزاد: یہ سب ڈھکوسلا ہے۔

بھیری: اے واہ ڈھکوسلا ہے۔ اس لڑکی کا بھائی آگرہ میں تھا اور وہاں سے پانچ سو روپے اپنے باپ کی تحصیل سے چرا لایا۔ یہاں جو آیا تو لڑکی نے کہا کہ تو چور ہے چوری کر کے آیا ہے۔

آزاد: اجی اس لڑکے نے اپنی بہن سے کہہ دیا ہو گا نہیں تو بھلا اسے کیا خبر ہوتی؟

بھیری: بھلا غزلیں اسے کہاں سے یاد ہیں؟

آزاد: اس میں اچرج کی کون سی بات ہے؟ قصص بھی دو چار غزلیں یاد ہی ہوں گی۔

بھیری: میں یہ نہ مانوں گی۔ اپنی آنکھوں دیکھ آئی ہوں۔

آزاد تو کچھ دیر پکڑا کر کھانے لگے اور میاں خوبی گھاس لانے چلے۔ جب گھساری نے

بارہ آنے مانگے تو آپ نے کردلی دکھائی، اس پر گھساری نے گٹا ان پر پھینک دیا۔ بچارے

گٹے کے بوجھ سے زمین پر آ رہے۔ ٹکٹا مشکل ہو گیا۔ لگے چیخنے۔ نہ ہوئی کردلی نہیں تو بتا

دیتا۔ ایسے ایسے ڈاکو میرا لوہا مانتے ہیں۔ ایک نہیں پچاسوں کو میں نے چر گٹو کیا ہے۔ یہ

گھساریان مجھ سے لڑے۔ اب اٹھاتی ہے گٹھیا یا آکر کردلی بھونکوں؟

لوگوں نے گٹھیا اٹھایا تو میاں خوبی باہر نکلے۔ داڑھی مونچھ پر مٹی جم گئی تھی، لت پت

ہو گئے تھے۔ ادھر آزاد کچھ دیر کھا کر لیٹے ہی تھے کہ تے ہوئی اور پھر بخار ہو گیا۔ تڑپنے لگے۔

تب خوبی بھی گھبرائے۔ سوچے اب بنا حکیم کے کام نہ چلے گا؟ بھیری سے پوچھ کر ایک حکیم

کے یہاں پہنچے۔

حکیم صاحب پالکی پر سوار ہو کر آ پہنچے۔

خوجی: بے حد کمزوری ہے، بات کرنے کی طاقت نہیں۔

حکیم: یہ آپ کے کون ہیں؟

خوجی: جی حضور، یہ غلام کا لڑکا ہے۔

حکیم: آپ مجھے معزے معلوم ہوتے ہیں۔

خوجی: جی ہاں، مسخرا نہ ہوتا تو لڑکے کا باپ ہی کیوں ہوتا۔

آزاد: جناب یہ بے حیا بے شرم آدمی ہے۔ نہ اس کو جوتیاں کھانے کا ڈر، نہ چپتیاے

جانے کا خوف، اس کی باتوں کا تو خیال ہی نہ کیجیے۔

خوجی: حکیم صاحب، مجھے تو کچھ دنوں سے بوا سیر کی شکایت ہو گئی ہے۔

حکیم: اچی، میں خود ہی اس شکایت میں گرفتار ہوں۔ میرے پاس اس کا آزمایا ہوا نسخہ

موجود ہے۔

خوجی: تو آپ نے اپنے بوا سیر کا علاج کیوں نہ کیا؟

آزاد: خوجی، تمہاری شامت آئی ہے۔ آج پٹو گے۔

خیر، حکیم صاحب نے نسخہ لکھا اور رخصت ہوئے۔ اب سینے کے نسخے میں لکھا تھا۔ روغن

مغل۔ آپ نے پڑھا روغن مغل، یعنی مٹ کا تیل۔ آپ نسخہ بندھوا کر لائے اور مٹی کے تیل

میں پکا کر آزاد کو پلایا۔ تو مٹی کے تیل کی بدبو آئی۔ آزاد نے کہا یہ بدبو کیسی ہے؟ اس پر میاں

خوجی نے انھیں خوب ہی للکارا۔ واہ، بڑے نازک مزاج ہیں اب کوئی عطر پلائے آپ کو، یا

کیسر کا کھیت چرائے، تب آپ خوش ہوں۔ آزاد چپ ہو رہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اتنے

زور کا بخار چڑھا کہ خوجی دوڑے ہوئے حکیم صاحب کے پاس گئے اور بولے۔ جناب مریض

بہت بے چین ہے۔ اور کیوں نہ ہو آپ نے بھی تو مٹی کا تیل نسخے میں لکھ دیا۔

حکیم: مٹی کا تیل کیسا؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔

خوجی: جی ہاں، آپ کا ہے کو سمجھنے لگے۔ آپ ہی تو روغن مغل لکھ آئے تھے۔

حکیم: ارے بھلے آدمی، کیا غضب کیا! کیسے جانگلوں سے پالا پڑا ہے۔ ہم نے لکھا

روغن مغل، اور آپ مٹی کا تیل دے آئے۔ واللہ، اس وقت اگر آپ میرے مکان پر نہ آئے

ہوتے تو کھڑے کھڑے لکھوا دیتا۔

خوبی: آپ کے ہواس تو خود ہی ٹھکانے نہیں۔ آپ کے مکان پہ نہ آیا ہوتا تو آپ لکھوا کہاں سے دیتے؟ جناب، پہلے فسد کھلوائیے۔

یہ کہہ کر میاں خوبی لوٹ آئے۔ آزاد نے کہا بھئی، حکیم کو تو دیکھ چکے، اب کوئی ڈاکٹر لاؤ۔

خوبی: ڈاکٹروں کی دوا گرم ہوتی ہے۔ بخار کا علاج ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔

آزاد: آپ ہیں احسن! جاکر چیک سے کسی ڈاکٹر کو بلا لائیے۔

خوبی پتہ پوچھتے ہوئے اسپتال چلے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔

ڈاکٹر: زبان دکھاؤ، جناب!

آزاد: بہت خوب!

ڈاکٹر: آنکھیں دکھاؤ!

آزاد: آنکھیں دکھاؤں تو گھبرا کر بھاگو۔

ڈاکٹر: کیا بک بک کرتا ہے، آنکھ دکھا۔

خیر ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھا اور نفیس لے کر چپٹ ہوئے۔ آزاد نے چار گھنٹے ان کی دوا کی، مگر پیاس اور بے چینی بڑھتی گئی۔ سیروں برف پی گئے، مگر تسکین نہ ہوئی۔ اگلے اور پیچش نے ناک میں دم کر دیا۔ صبح ہوتے ہوتے میاں خوبی ایک ویدھ راج کو بلا لائے۔ انھوں نے ایک گولی دی اور شہد کے ساتھ چٹا دی۔ تھوڑی دیر میں آزاد کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے۔ خوبی بہت گھبرائے اور دوڑے ویدھ کو بلانے۔ راہ میں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر مل گئے۔ یہ انھیں گیر گھار کر لائے۔ انھوں نے ایک چھوٹی سی شیشی سے دوا کی دو بوندیں پانی میں ڈال دیں۔ اس کے پیچے ہی آزاد کی طبیعت اور بھی بے چین ہو گئی۔

میاں آزاد نے دو تین دن میں اتنے حکیم، ڈاکٹر اور ویدھ بدلے کہ اپنی ہی مٹی پلید کر لی۔ اس قدر طاقت بھی نہ رہی کہ کھنیا سے اٹھ سکیں۔ خوبی نے اب انھیں ڈانٹنا شروع کیا۔ اور سوئیے اوس میں۔ ذرا سی لنگی باندھ لی اور ترچھوٹے پر سوس رہے۔ پھر آپ بیمار نہ ہوں تو کیا ہم ہوں۔ روز کہتا تھا کہ اوس میں سونا برا ہے مگر آپ سنتے کس کی ہیں۔ آپ اپنے کو تو جالینوس سمجھتے ہیں اور باقی سب کو گدھا۔ دنیا میں بس ایک آپ ہی تو بقراط ہیں۔

بھیری : اے تم بھی عجب آدمی ہو! بھلا کوئی بیمار کو ایسے ڈانٹتا ہے؟ جب اچھے ہو جائیں تو خوب کوس لیتا۔ اور جو اس کی کہتے ہو تو میاں یہ تو عادت پر ہے۔ ہم تو دس برس سے اس ہی میں سوتے ہیں۔ آج تک زکام بھی جو ہوا ہو تو قسم لے لو۔

آزاد : کونے دو۔ اب یہاں گھڑی دو گھڑی کے اور مہمان ہیں۔ اب مرے۔ نہ جانے کس بری ساعت گھر سے چلے تھے۔ حسن آرا کے پاس خط بھیج دو کہ ہم کو آکر دیکھ جائیں۔ آج اس وقت سرائے میں لیٹے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، کل پرسوں تک قبر میں ہوں گے۔

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تہائی میں آہ کون ہووے گا انیس
ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

خوجی : میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم کو سرسام نہ ہو جائے۔

بھیری : چپ بھی رہو، آخر کچھ عقل بھی ہے؟

آزاد : میرے دن ہی برے آئے ہیں، ان کا کوئی قصور نہیں۔

بھیری : آپ نے بھی تو حکیم کی دوا کی۔ حکیم لٹکائے رہتے ہیں۔

آزاد : خدا حکیموں سے بچائے۔ مونگ کی کچھڑی دے دے کر مریض کو ادھ مرا کر ڈالتے ہیں۔ اس پر پیالے بھر بھر دو۔ اگر دو مہینے میں بھی کھٹیا چھوڑی تو سمجھیے کہ بڑا خوش نصیب تھا۔

خوجی : جی ہاں، جب ڈاکٹر نہ تھے، تب تو سب مری جاتے تھے۔

آزاد : خیر، چپ رہو، سرمت کھاؤ۔ اب ہمیں سونے دو۔

میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی۔ خوجی بھی اونگھنے لگے۔ ایک آدمی نے آکر تو ان کو چکایا اور کہاں میرے ساتھ آئیے آپ سے کچھ لیتا ہے۔ خوجی نے دیکھا ان کی خاصی جوڑ تھی۔ ان سے انگل دو انگل دیتے ہی تھے۔

خوجی : تو آپ پلے کیوں پڑتے ہیں؟ دور ہی سے کہیے، جو کچھ کہنا ہو۔

مسافر : میاں آزاد کہاں ہیں؟

خوجی : آپ اپنا مطلب کہیے، یہاں تو آزاد وزاد کوئی نہیں ہے۔ آپ اپنا خاص مطلب

کچھ

مسافر: امی، آزاد ہمارے بہنوئی ہیں۔ ہماری بہن نے بیجا ہے کہ دیکھو کہاں ہیں۔
خوبی: ان کی شادی تو ہوئی نہیں بہنوئی کیوں کر بن گئے؟
مسافر: کتنے محل کے دشمن، بھلا کوئی بے وجہ کسی کو اپنا بہنوئی بتائے گا؟
خوبی: بھلا آزاد کی بیوی کہاں ہیں؟ ہم کو تو دکھا دیجیے۔

مسافر: امی، اس سرائے کے اس کونے میں چلو دکھا دیں۔ تم سے کیا چوری ہے۔
خوبی: میاں کوٹھری کے اندر آئے۔ بالوں میں تیل ڈالا سفید کپڑے پہنے۔ لال پھوند نے دار ٹوپی دی۔ میاں آزاد کا ایک خاکی کوٹ ڈاٹا اور جب خوب بن ٹھن چکے تو آئینہ لے کر صورت دیکھنے لگے۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ داڑی کے بال اونچے نیچے پائے، مونچھیں گری پڑی۔ آپ نے قینچی لے کر بال برابر کرنا شروع کیا۔ قینچی تیز تھی، ایک طرف کی مونچھ بالکل اڑ گئی۔ اب کیا کرتے، اپنے پاؤں میں کھلاڑی ماری۔ مجبور ہو کر باہر آئے، تو مسافر انہیں دیکھ کر ہنس پڑا۔ مگر آدمی تھا چالاک، ضبط کیے رہا اور خوبی کو ساتھ لے چلا۔ جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت صحن میں بسی ہوئی، رنگین کپڑے پہنے چار پائی پر سو رہی ہے۔ زلفیں کالی نامن کی طرح لہراتی ہوئی، گردن کے ارد گرد پڑی ہوئی ہیں۔ خوبی لگے آنکھیں پینکٹے۔ اتنے میں اس عورت نے آنکھیں کھول دیں اور خوبی کو دیکھ کر لٹکا رہا۔ تم کون ہو؟ یہاں کیا کام؟
خوبی: آپ کے بھائی پکڑ لائے۔

عورت: اچھا، پنکھا جھلو، مگر آنکھیں بند کر کے۔ خبردار مجھے نہ دیکھنا۔ خوبی پنکھا جھلنے لگے اور اس عورت نے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ خوبی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ اس کا آنکھیں کھولنا تھا کہ میاں خوبی نے آنکھیں خوب زور سے بند کر لیں۔

عورت: کیوں جی، گھورتے کیوں ہو! بتاؤ کیا سزا دوں؟
خوبی: اتفاق سے آنکھ کھل گئی۔

عورت: اچھا بتاؤ میاں آزاد کہاں ہیں؟

ادھر میاں آزاد کی آنکھ جو کھلی تو خوبی ندارد۔ جب گھٹنوں ہو گئے اور خوبی نہ آئے تو ان کا ماتھا ٹٹکا کہ کمزور آدمی ہیں ہی کسی سے ٹرائے ہوں گے، اس نے گردن تاپی ہوئی۔

بھاریے کو بھیجا جا کر ذرا دیکھو تو۔ اس نے ہنس کر کہا ذری سے تو آدی ہیں، بھیڑیا اٹھالے گیا ہوگا۔ دوسرا بولا، آج ہوا سناٹے کی چلتی ہے کہیں اڑ گئے ہوں گے۔ آخر بھاری نے کہا کہ انھیں تو ایک آدی بلا کر لے گیا ہے۔ خوجی خوب بن ٹھن کر گئے ہیں۔

آزاد کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے کہ خوجی کو کون پکڑ لے گیا۔ گڑگڑا کر بھاری سے کہا چاہے جو ہو خوجی کو لاؤ۔ کسی سے پوچھو پاچھو۔ آخر گئے کہاں؟

ادھر میاں خوجی اس عورت کے ساتھ بیٹھ کر دسترخوان پر بٹھے لگا رہے تھے۔ کھاتے جاتے تھے اور تعریفیں کرتے جاتے تھے۔ ایک لقمہ کھایا اور کئی منٹ تک تعریف کی۔ یہ تو تعریف ہی کرتے رہے اور ادھر میاں مسافر نے دسترخوان صاف کر دیا۔ خوجی دل میں بچھڑائے کہ ہم سے کیا حماقت ہوئی۔ پہلے خوب پیٹ بھر کھا لیتے، پھر چاہے دن بھر بیٹھے تعریف کرتے۔ اس عورت نے پوچھا کہ کچھ اور لاؤں؟ شرمائے گا نہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔۔۔ خوجی کچھ مانگنے ہی والے تھے کہ میاں مسافر نے کہا، نہیں جی، اب کیا ہیضہ کراؤ گی؟ یہ کہہ کر اس نے دسترخوان ہٹا دیا اور خوجی منہ تاکتے رہ گئے۔ کھانا کھانے کے بعد پان کی باری آئی۔ دو ہی گوریوں تھیں۔ مسافر نے ایک تو اس عورت کو دی اور دوسری اپنے منہ میں رکھ لی۔ خوجی پھر منہ دیکھ کر رہ گئے۔ اس کے بعد مسافر نے ان سے کہا۔ میاں ہوت، ارے بھائی تم سے کہتے ہیں۔

خوجی: کس سے کہتے ہو جی؟ کیا کہتے ہو؟

مسافر: ابھی کہتے ہیں کہ ذرا پلنگ سے اتر کر بیٹھو۔ کیا مزے سے برابر جا کر ڈٹ گئے۔ اترا کہ میں پہنچوں؟ اور دیکھیے، آپ پلنگ پر چڑھ کر بیٹھے ہیں۔ اپنی حیثیت کو نہیں دیکھتا۔

خوجی: چپ گیدی، نہ ہوئی کرولی، نہیں تو بھوک دیتا۔

عورت: کرولی پیچھے ڈھونڈھے گا، پہلے ذرا یہاں سے کھسک کر نیچے بیٹھیے۔

خوجی: بہت اچھا، اب بیٹھوں تو توپ پر اڑا دیتا۔

مسافر: لے چلو، اٹھو، یہ لو جھاڑو۔ ابھی جھاڑو دے ڈالو۔

خوجی: جھاڑو تم دو۔ ہم کو کوئی بھڑ بھو جاسمجا ہے؟ ہم خاندانی آدی ہیں۔ رئیسوں سے

اس طرح باتیں کہتا ہے گیدی۔

مسافر: ہمیں تو ٹاہنوں کا معاملہ ہوتا ہے۔ چلیے، اٹھیے، جہاز دیجیے۔ بڑے رئیس زادے بن کر بیٹھے ہیں۔ رئیسوں کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے؟

خوبی نے دل میں سوچا کہ جس سے ملتا ہوں، وہ بھی کہتا ہے کہ بھلے مانس کی ایسی صورت نہیں ہوتی۔ اور اس وقت تو ایک طرف کی مونچھ ہی اڑی گئی ہے، بھلا مانس کون کہے گا۔ کچھ نہیں اب ہم پہلے منہ بنوائیں گے۔ بولے اچھا رخصت۔

مسافر: واہ کیا دل لگی ہے، بیٹھے چلم بھر کے جائیے گا۔

میاں خوبی ایسے جھلائے کہ چٹ ہی تو گئے۔ دونوں میں چپت بازی ہونے لگی۔ دونوں کا قد کوئی چھ چھ بالشت کا، دونوں مرل، دونوں چنڈوباز۔ یہ آہستہ سے ان کو چپت لگاتے ہیں، وہ دیر سے ان پر دھپ جماتے ہیں۔ انھوں نے ان کے کان پکڑے، انھوں نے ان کی ناک پکڑی۔ انھوں نے ان کو کاٹ کھایا، انھوں نے ان کو نوچ لیا۔ اور مزہ یہ کہ دونوں رو رہے ہیں۔ میاں خوبی کردلی کی دھن باندھے ہوئے ہیں۔ آخر دونوں ہانپ گئے۔ نہ یہ جیتے نہ وہ۔ خوبی لڑکھڑا کر گرے، تو چاروں شانے چٹ۔ اس حسینہ نے دو تین دھول اوپر سے جما دیے۔ ان کا تو یہ حال ہوا ادھر میاں مسافر نے چکر کھایا اور دھم سے زمین پر۔ آخر حسینہ نے دونوں کو اٹھایا اور کہا بس لڑائی ہو چکی۔ اب کیا کٹ ہی مرو گے؟ چلو، بیٹھو۔

خوبی: نہ ہوئی کردلی، نہیں تو بھونک دیتا۔ ہت تیرے کی۔

مسافر: وہ تو ہانپ گیا، نہیں تو دکھا دیتا آپ کو مزہ۔ کچھ ایسا ویسا سمجھ لیا ہے۔ سیکڑوں بیچ یاد ہیں۔

حسینہ: خبردار جواب کسی کی زبان کھلی۔ چلو اب چلیں میاں آزاد کے پاس۔ ان کی بھی تو خبر لیں جس کام کے لیے یہاں تک آئے ہیں۔

شام ہو گئی تھی۔ حسینہ دونوں آدمیوں کے ساتھ آزاد کی کوٹھری میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ آزاد سوئے ہیں اور بھیری بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔ اس نے چٹ آزاد کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ آزاد کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ دیکھا اللہ رکھی سرہانے کھڑی ہیں اور میاں چنڈوباز سامنے کھڑے پاؤں دبا رہے ہیں۔ آزاد کی جان سی نکل گئی۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا، ہوش ہیرے ہو گئے۔ یا خدا یہاں یہ کیسے پہنچی؟ کس نے پتا بتایا؟ ذرا بیماری ہلکی ہوئی تو اس بلانے آدبوچا۔

ایک آفت سے تو مرے مر کے ہوا تھا جینا

پڑ گئی اور یہ کیسی میرے اللہ نئی

خوبی: حضرت اٹھیے، دیکھیے سرہانے کون کھڑا ہے۔ واللہ بھڑک جاؤ تو کسی۔

آزاد: (اللہ رکھی سے) بیٹھے بیٹھے خوب ملیں۔

خوبی: اجی، ابھی ہم سے اور آپ کے سالے سے بڑی شائیں شائیں ہوگئی۔ وہ تو

کیسے کرولی نہ تھی نہیں سالار جنگ کے پلستر گاڑ دیے ہوتے۔

آزاد نے خوبی، چنڈ دہاز اور بھٹیاری کو کمرے کے باہر جانے کو کہا۔ جب دونوں اکیلے

رہ گئے تو آزاد نے اللہ رکھی سے کہا۔ کیسے آپ کیسے تشریف لائی ہیں؟ ہم تو وہ آزاد ہی نہیں

رہے۔ وہ دل ہی نہیں، وہ انگ ہی نہیں اب تو روم ہی جانے کی دھن ہے۔

اللہ رکھی: پیارے آزاد، تم تو چلے روم کو۔ ہمیں کس کے سپرد کیے جاتے ہو؟ نہ ہو زمین

ہی کو سوئپ دو۔ اب ہم کس کے ہو کر رہیں؟

آزاد: اب ہماری عزت اور آمد آپ ہی کے ہاتھ ہے۔ اگر روم سے جیتے واپس آئے

تو تم کو نہ بھولیں گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی بیڑا پار کلاے گا۔ میری طبیعت دو تین دن سے

اچھی نہیں ہے۔ کل تو نہیں پرسوں ضرور روانہ ہوں گا۔

خوبی: (بھیتز آکر) بی اللہ رکھی ابھی پوچھ رہی تھیں کہ مجھ کو کس کے سپرد کیے جاتے

ہو، آپ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ جو کوئی اور نہ ملے تو ہمیں یہ مصیبت کھیں۔ ہمارے ہی

سپرد کر دیجیے۔ آپ جانیے، ہم اور وہ یہاں رہیں گے۔

آزاد: تم یہاں کیوں چلے آئے؟ لکھو یہاں سے۔

اللہ رکھی بڑی دیر تک آزاد کو سمجھاتی رہی۔ ہمارا کچھ خیال نہ کرو، ہمارا اللہ مالک ہے۔

تم حسن آرا سے قول ہارے ہو تو روم جاؤ اور ضرور جاؤ، خدا نے چاہا تو ہر گز رو ہو کر آؤ گے۔

میں بھی جا کر حسن آرا ہی کے پاس رہوں گی۔ انھیں تسلی دیتی رہوں گی۔ ذرا جو کسی پر کھلنے

پاؤے کہ مجھ سے تم سے کیا تعلق ہے۔ اتنا خیال رہے کہ جھلی جہاں ڈاک جاتی ہو وہاں

وہاں سے خط برابر بھیجتے جانا۔ ایسا نہ ہو کہ بھول جاؤ۔ نہیں تو وہ کڑھ کڑھ کر مر ہی جائے گی۔

اور میرا تو جو حال ہے اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ اپنا دکھ کس سے کہوں؟

آزاد: اللہ رکھی، خدا کی قسم ہم تم کو اپنا اتنا سچا دوست نہیں جانتے تھے۔ تم کو میرا اتنا

خیال اور میری اتنی محبت ہے، یہ تو آج معلوم ہوا۔
اس طرح دو تین گھنٹے تک دونوں نے باتیں کیں۔ جب اللہ رکھی روانہ ہوئی تو دونوں
گلے مل کر خوب روئے۔

(26)

آزاد نے سوچا کہ ریل پر چلنے سے ہندستان کی حالت دیکھنے میں نہ آئے گی۔ اس
لیے وہ لکھنؤ کے اسٹیشن پر سوار نہ ہو کر گھوڑے پر چلے تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جانا،
جنگل اور دیہات کی سیر کرنا، نئے نئے آدمیوں سے ملنا انھیں پسند تھا۔ ریل پر یہ موقع نہیں
ملتا۔ اللہ رکھی کے چلے جانے کے ایک دن بعد وہ بھی چلے۔ گھومتے گھومتے ایک قصبے میں جا
پہنچے۔ بیماری سے تو اٹھے ہی تھے، تھک تھک کر ایک مکان کے سامنے بسز بچھایا اور ڈٹ
گئے۔ میاں خوبی نے آگ سلگائی اور چلم بھرنے لگے۔ اتنے میں اس مکان کے اندر سے
ایک بوڑھے میاں نکلے اور پوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں؟

آزاد: ارادہ تو بڑی دور کا کر کے چلا ہوں، روم کا سفر ہے دیکھو پہنچتا ہوں یا نہیں۔
بوڑھے میاں: خدا آپ کو سرخ رو کرے۔ ہمت کرنے والے کی مدد خدا کرتا ہے۔
آئیے آرام سے گھر میں بیٹھیے۔ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔

آزاد اس مکان میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عورت چک اٹھائے مسکرا رہی
ہے۔ آزاد جیوں ہی فرش پر بیٹھے وہ حینہ باہر نکل گئی اور بولی۔ میرے پیارے آزاد آج
برسوں کے بعد تمہیں دیکھا۔ سچ کہنا کتنی جلدی پہچان گئی۔ آج منہ مانگی مراد پائی۔

میاں آزاد چکرائے کہ یہ حینہ کون ہے جو اتنی محبت سے پیش آتی ہے۔ اب صاف
صاف کیسے کہیں کہ ہم نے تمہیں نہیں پہچانا۔ اس حینہ نے یہ بات تاڑ لی اور مسکرا کر کہا:
ہم ایسے ہو گئے اللہ اکبر اے تیری قدرت

ہمارا نام سن کر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

آپ اور ہمیں اتنی جلدی بھول جائیں۔ ہم وہ ہیں جو لڑکپن میں تمہارے ساتھ کھیلا کیے
ہیں۔ تمہارا مکان ہمارے مکان کے پاس تھا۔ میں تمہارے باغ میں روز بھول چھنے جایا کرتی
تھی۔ اب سمجھے کہ اب بھی نہیں سمجھے؟

آزاد: آہا، اب بھاف اوہ! برسوں بعد تمہیں دیکھا۔ میں بھی سوچتا تھا کہ یا خدا یہ کون ہے کہ ایسی بے جھجک ہو کر ملی۔ مگر پہچانتے تو کیوں کر پہچانتے؟ تب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سچ کہتا ہوں زینت تم کچھ اور ہی ہو گئی ہو۔

زینت: آج کسی بھلے کا منہ دیکھ کر ابھی تھی۔ جب سے تم گئے زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی گنتی

اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
آزاد: یہاں بھی بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں، لیکن تمہیں دیکھتے ہی ساری کلفتیں دور ہو گئیں:

تب لطف زندگی ہے، جب ابر ہو چمن ہو
پیش نظر ہو ساقی پہلو میں گل بدن ہو

یہاں اختر نہیں نظر آتی۔

زینت: ہے تو، مگر اس کی شادی ہو گئی۔ تمہیں دیکھنے کے لیے بہت ترپتی تھی۔ اس بچاری کو چچا جان نے جان بوجھ کر کھاری کوئیں میں دھکیل دیا۔ ایک لپے کے پالے پڑی ہے، دن رات رویا کرتی ہے۔ اتنا جان جب سے سدھارے، ان کے پالے پڑے ہیں۔ جب دیکھو، سوٹا لیے کلمے پر کھڑے رہتے ہیں۔ ایسے شہدے کے ساتھ میاہ دیا جس کا ٹھور نہ ٹھکانہ۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کوئی روپے والا یا بہادر شاہ کے خاندان کا ہوتا۔ غریب آدمی کی لڑکی کچھ غریبوں ہی کے یہاں خوش رہتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سمجھ دار ہو، چال چلن اچھا ہو، یہ نہیں کہ پڑھے نہ لکھے، نام محمد فاضل، الف کے نام ب نہیں جانتے، مگر دعویٰ یہ ہے کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ ہمارے نزدیک جس کی عادت بری ہو اس سے بڑھ کر پانچی کوئی نہیں۔ مگر اب تو جو ہونا تھا سو ہوا، تم خوب جانتے ہو آزاد کی سالی کو اپنے بہنوئی کا کتنا پیار ہوتا ہے۔ مگر قسم لو جو اس کا نام لینے کو بھی جی چاہتا ہے۔ بیوی کا زیور سب سچ کر چٹ کر گیا، کچھ داؤں پر رکھ آیا، کچھ کے اونے پونے کیے۔ مکان دکان سب اسی جوئے کے پھیر میں محوم گیا۔ اب کلمے کلمے کو محتاج ہے۔ ذرا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دن یہاں آکر کپڑے لٹے نہ اٹھالے جائے۔ چچا کو اس کا سب حال معلوم تھا مگر لڑکی کو بھاڑ میں جھونک ہی دیا۔ آتی ہوگی، دیکھنا کیسی گھل کے کاٹا ہو گئی ہے۔ ہڈی ہڈی گن لو۔ اے اختر ذرا

یہاں آؤ میاں آزاد آئے ہیں۔

ذرا دیر میں اختر آئی۔ آزاد نے اس کو اور اس نے آزاد کو دیکھا تو دونوں بے اختیار کھٹکھٹا کر فٹ پڑے۔ مگر ذرا ہی دیر میں اختر کی آنکھیں بھر آئیں اور گول گول آنسو پٹ پٹ مگر نہ لگے۔ آزاد نے کہا بہن ہم تمہارا سب حال سن چکے، پر کیا کریں کچھ بس نہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی سب کا مالک ہے۔ کسی حالت میں آدمی کو گھبرانا نہ چاہیے۔ مبر کرنے والوں کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔

اس پر اختر نے اور بھی آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا۔

زینت بولی: بہن آزاد بہت دنوں کے بعد آئے ہیں۔ یہ رونے کا موقع نہیں۔

آزاد: اختر، وہ دن یاد ہیں جب تم کو ہم چڑھایا کرتے تھے اور تم انگور کی ٹٹی میں روٹھ کر چھپ رہی تھیں، ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر تمہیں مناللاتے تھے اور پھر چڑھاتے تھے؟ ہم کو جو تمہاری دونوں کی محبت ہے اس کا حال ہمارا خدا ہی جانتا ہے۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا کہ میں تم کو اس مصیبت میں دیکھتا۔ تمہاری وہ صورت ہی بدل گئی۔

اختر: بھائی اس وقت تم کو کیا دیکھا، جیسے جان میں جان آگئی۔ اب پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے جاؤ گے تو نہیں؟ ادھر تم گئے اور ادھر ہمارا جنازہ نکلا۔ برسوں بعد تمہیں دیکھا ہے اب نہ چھوڑوں گی۔

اسی طرح باتیں کرتے کرتے رات ہو گئی۔ آزاد نے دونوں بہنوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ تب زینت بولی۔ آج پرانی صحبتوں کی بہار آنکھوں میں پھر گئی۔ آئیے کھانا کھا کر چن میں چلیں۔ باغ تو ویران ہے مگر چلیے ذرا سول بہلا آئیں۔ قسم لیجیے جو میٹوں چن کا نام بھی لیتی ہوں۔

نظر آتا ہے گل آزرده دشمن باغباں مجھ کو

بنانا تھا نہ ایسے بوستان میں آشیاں مجھ کو

آزاد: ادوہو، یہ پرانا درخت ہے۔ اسی کے سائے میں ہم رات رات بیٹھے رہتے تھے۔ آہا، یہ وہ روش ہے جس پر ہمارا پاؤں بھستتا تھا اور ہم گرے، تو اختر خوب کھٹکھٹا کر ہنسی۔ تمہارے یہاں ایک بڑھی عورت تھی نمنب کی ماں۔

اختر: تمہیں کیوں، کیا اب نہیں ہیں؟ اے وہ ہم سے تم سے ہنسی کئی ہے۔ کھاسی کنھوا

کی بنی ہوئی ہے۔

آزاد: کیا وہ بوڑھی ابھی تک زندہ ہے؟ کیا عاقبت کے بورے بورے گی؟ چلتے چلتے باغ میں ایک جگہ دیوار پر لکھا دیکھا کہ میاں آزاد نے آج اس باغ کی سیر کی۔
اتنے میں زینت کے بوڑھے چچا اپنے اور بولے، بھئی ہم نے آج جو قصص دیکھا تو خیال نہ آیا کہ کہاں دیکھا ہے۔ خوب آئے۔ یہ تو ہلاؤ اتنے دن رہے کہاں؟ زینت قصص روز یاد کرتی تھی، اٹھتے بیٹھتے تمہارا ہی نام زبان پر رہتا تھا۔ اب آپ یہیں رہے۔ زینت کو جو تم سے محبت ہے وہ اس کا اور تمہارا دونوں کا دل جانتا ہوتا۔ میری دلی آرزو ہے کہ تم دونوں کا نکاح ہو جائے۔ اسی باغ میں رہے اور اپنا گھر سنبھالیے۔ میں تو اب گوشے بیٹھ کر خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہوں۔

میاں آزاد یہ باتیں سن کر پانی پانی ہو گئے۔ ہاں، کہیں تو نہیں بنتی، نہیں کہیں تو شامت آئے۔ سناٹے میں تھے کہ کہیں کیا۔ آخر بہت دیر کے بعد بولے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ آپ کی مہربانی ہے۔ میں تو اپنے کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ جس کا تصور نہ تھا کہ وہ زینت کے قابل کب ہو سکتا ہے؟

میاں آزاد تو یہاں چھن کر رہے تھے، ادھر میاں خوبی کا حال سننے۔ میاں آزاد کی راہ دیکھتے دیکھتے پینک جو آگئی تو ٹٹو ایک کسان کے کھیت میں جا پہنچا۔ کسان نے للکارا۔ ارے کس کا ٹٹو ہے؟ آپ ذرا بھی نہ بولے۔ اس نے خوب گالیاں دیں۔ آپ بیٹھے سنا کیے۔ جب اس نے ٹٹو کو پکڑا اور کانچی ہاؤس لے چلا تب آپ اس سے لپٹ گئے۔ اس نے جھلا کر ایک دھکا جو دیا تو آپ نے میں لڑھکنیاں کھائیں۔ وہ ٹٹو کو لے چلا۔ جب خوبی نے دیکھا کہ وہ ہاری جیتی ایک نہیں مانتا تو آپ دم سے ٹٹو کے پیٹ پر ہو رہے۔ اب آگے آگے کسان پیچھے پیچھے ٹٹو اور ٹٹو کی پیٹ پر خوبی۔ راہ چلتے لوگ دیکھتے تھے۔ خوبی بار بار کروڑ کی ہانک لگاتے تھے۔ اس طرح کانچی ہاؤس پہنچے۔ اب کانچی ہاؤس کا چراسی اور نشی بار بار کہتے ہیں کہ حضرت ٹٹو پر سے اترے، اسے ہم ہمیر بند کریں گے۔ مگر آپ اترنے کا نام نہیں لیتے، اوپر بیٹھے بیٹھے کروڑی اور ٹٹو کا رونا رو رہے ہیں۔ آخر مجبور ہو کر نشی نے خوبی کو چھوڑ دیا۔ آپ ٹٹو لیے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دیتے گھر کی طرف چلے، گویا کوئی قلعہ جیت کر آئے ہیں۔

ادھر آزاد سے اختر نے کہا، کیوں بھائی وہ پھیلیاں بھی یاد ہیں، جو تم پہلے بھایا کرتے

تھے؟ بہت دن ہوئے، کوئی چیتاں سننے میں نہیں آئی۔

آزاد: اچھا بوجھیے۔

آں چیت دہن ہزار دارد (وہ کیا ہے جس کے سونہ ہوتے ہیں)

در ہر دہن دو مار دارد (ہر منہ میں دو سانپ ہوتے ہیں)

شاہ است نشستہ در سر تخت (ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے)

آں را ہمار دارد (اسی کو سب گنتے ہیں)

اختر: ہزار منہ، یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

زعنت: گنتی کیسی؟

آزاد: کچھ نہ بتائیں گے۔ جو خدا کی بندگی کرتے ہیں وہ آپ ہی سمجھ جائیں گے۔

اختر: آہا، میں سمجھ گئی۔ اللہ کی قسم سمجھ گئی۔ تسبیح ہے، کیوں کیسی بوجھی؟

آزاد: ہاں! اچھا، یہ تو کوئی بوجھیے:

راجا کے گھر آئی رانی

اوگٹ گھاٹ وہ پیوے پانی

مارے لاج کے ڈوبی جائے

ناحق چوٹ پروی کھائے

زعنت: بھائی، ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ بتا دو بس بوجھ چکی۔

اختر: واہ، دیکھو بوجھتے ہیں، گھڑیاں ہے۔

آزاد: واللہ، خوب بوجھی، اب کی بوجھیے:

ایک نار جب سجا میں آوے

ساری سجا چکت رہ جاوے

چاٹر چاٹر باکے یار

مورکھ دیکھیں منہ پھار

زعنت: جو اس کو کوئی بوجھ دو، تو مٹھائی کھاؤں۔

آزاد: یہ اس وقت یہاں ہے۔ بس اتنا اشارا بہت ہے۔

اختر: ہم ہار گئے، آپ بتا دیں۔

آزاد: بتا ہی دوں یہ پہیلی ہے۔

زمینت: ارے، کتنی موٹی بات پوچھی اور ہم نہ بتا سکے۔

اختر: اچھا، بس ایک اور کہہ دیجیے۔ لیکن اب کی کوئی کہانی کیجیے۔ اچھی کہانی ہو، لڑکوں کے بھلانے کی نہ ہو۔

آزاد نے اپنی اور حسن آرا کی محبت کی داستان بیان کرنی شروع کی۔ بجرے پر سیر کرنا، پہرہ آرا کا دریا میں ڈوبنا اور آزاد کا اس کو نکالنا، حسن آرا کا آزاد سے روم جانے کے لیے کہنا اور آزاد کا کسر باندھ کر تیار ہو جانا، یہ ساری باتیں بیان کیں۔

اختر: بے شک بچی محبت تھی۔

آزاد: مگر میاں عاشق وہاں سے چلے، تو راہ میں نیت ڈانوا ڈول ہو گئی۔ کسی اور کے ساتھ شادی کر لی۔

اختر: توبہ! توبہ! بڑا برا کیا! بس زبانی داخلہ تھا؟

زمینت: بچی محبت ہوتی تو حور پر بھی آنکھ نہ اٹھاتا۔ روم جاتا اور پھر جاتا۔ مگر وہ کوئی مکار آدمی تھا۔

آزاد: وہ عاشق میں ہوں اور معشوق حسن آرا ہے۔ میں نے اپنی ہی داستان سنائی اور اپنی ہی حالت بتائی۔ اب جو حکم دو وہ منظور، جو صلاح بتاؤ وہ قبول۔ روم جانے کا وعدہ کر آیا ہوں، مگر یہاں تم کو دیکھا تو اب قدم نہیں اٹھتا۔ قسم لے لو، جو تمہاری مرضی کے خلاف کروں۔

اتنا سننا تھا کہ اختر کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور زمینت کا منہ اداس ہو گیا۔ سر جھکا کر رونے لگی۔

اختر: تو پھر آئے یہاں کیا کرنے؟

زمینت: تم تو ہمارے دشمن نکلے۔ ساری امنگوں پر پانی پھیر دیا۔

شکوہ نہیں ہے آپ جو اب پوچھتے نہیں

وہ شکل مٹ گئی وہ شاہت نہیں رہی

اختر: بابی، اب ان کو یہی صلاح دو کہ روم جائیں۔ مگر جب واپس آئیں تو ہم سے بھی ملیں، بھول نہ جائیں۔

اتنے میں باہر سے آواز آئی کہ نہ ہوئی کرو لی ورنہ خون کی ندی بہتی ہوتی، کئی آدمیوں کا خون ہو گیا ہوتا۔ وہ تو کہیے خیر گزری۔ آزاد نے پکارا، کیوں بھائی خوبی آگئے۔
 خوبی: واہ واہ واہ! کیا ساتھ دیا! ہم کو چھوڑ کر بھاگے، تو خیر بھی نہ لی۔ یہاں کسان سے ڈنڈا چل گیا، کاغی ہاؤس میں ایک چوکیدار سے لاشی پونگا ہو گیا مگر آپ کو کیا۔
 آزاد: اجی چلو، کسی طرح آتو گئے۔

خوبی: اجی، یہی بوڑھے میاں راہ میں ملے وہ یہاں تک لے آئے۔ نہیں تو جج جج گھاس کھانے کی نوبت آتی۔

میاں آزاد دوسرے دن دونوں بہنوں سے رخصت ہوئے۔ روتے روتے زینت کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آزاد بھی نرم دل آدمی تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کہا میں اپنی تصویر دیے جاتا ہوں اسے اپنے پاس رکھنا۔ میں خط برابر بھیجتا رہوں گا۔ واپس آؤں گا تو پہلے تم سے ملوں گا، پھر کسی سے۔ یہ کہہ کر دونوں بہنوں کو پانچ پانچ اشرفیاں دیں۔ پھر زینت کے چچا کے پاس جا کر بولے۔ آپ بزرگ ہیں، لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ آپ نے اختر کو جیتے جی مار ڈالا۔ دین کا رکھا نہ دنیا کا۔ آدمی اپنی لڑکی کا بیاہ کرتا ہے تو دیکھ لیتا ہے کہ داماد کیسا ہے، یہ نہیں کہ شہدے اور بد معاش کے ساتھ بیاہ کر دیا۔ اب آپ کو لازم ہے کہ اسے کسی دن بلائیے اور سمجھائیے شاید سیدھے راستے پر آجائے۔

بوڑھے میاں: کیا کہیں بھائی، ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا ہم کو اختری کا پیار نہیں ہے؟ مگر کریں کیا؟ اس بد نصیب کو سمجھائے کون؟ کسی کی سنے بھی۔

آزاد: خیر اب زینت کی شادی ذرا سمجھ بوجھ کر کیجیے گا۔ اگر زینت کسی اچھے گھر بیابی جائے اور اسی کا شوہر چلن کا اچھا ہو تو اختر کے بھی آنسو پونچھے کہ میری بہن تو خوش ہے یہی سہی۔ چار دن جو کہیں بہن کے یہاں جا کر رہے گی تو جی خوش ہوگا۔ بڑی ڈھارس ہوگی۔ اب بندہ تو رخصت ہوتا ہے۔ مگر آپ کو اپنے ایمان اور میری جان کی قسم ہے زینت کی شادی دیکھ بھال کر کیجیے گا۔

یہ کہہ کر آزاد گھر سے باہر نکلے تو دونوں بہنوں نے چلا چلا کر رونا شروع کیا۔
 آزاد: پیاری اختر اور پیاری زینت خدا گواہ ہے اس وقت اگر مجھے موت آجائے تو سمجھوں، جی اٹھا۔ مجھے خوب معلوم ہے میری جدائی تمہیں اکھرے گی لیکن کیا کروں؟ کسی

ایسی دینی جگہ جانا ہوتا تو خیر، کوئی مضائقہ نہ تھا مگر ایک ایسی مہم پر جانا ہے جس سے انکار کرنا کسی مسلمان کو گوارا نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔
 زینت نے کلیجہ تھام کر کہا۔ جائیے، اس کے آگے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔
 اختر: جس طرح پیٹھ دکھائی اسی طرح منہ بھی دکھاؤ۔

(27)

میاں آزاد اور خوجی چلتے چلتے ایک نئے قصبے میں جا لیجے اور اس کی سیر کرنے لگے۔
 راستے میں ایک انوکھی جگہ دھج کے جوان دکھائی پڑے۔ سر سے پیر تک پیلے کپڑے پہنے ہوئے، ڈھیلے پانچے کا پا جامہ، کیسریے کچھل لوٹ کا انگرکھا، کیسریا رنگی دہلی ٹوپی، کندھوں پر کیسریا رومال، جس میں لچکا دکا ہوا۔ سن کوئی چالیس سال کا۔
 آزاد: کیوں بھی خوجی، بھلا بھانپو تو یہ کس دیس کے ہیں؟
 خوجی: شاید کابل کے ہوں۔

آزاد: کالیوں کا یہ پہناوا کہاں ہوتا ہے؟
 خوجی: واہ خوب سمجھو! کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟
 آزاد: ذرا حضرت کی چال تو دیکھیے گا، کیسے کندے جھارتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔
 کبھی ذری کے جوتے پر دھیان ہے کبھی رومال پھڑکاتے ہیں۔ کبھی انگرکھا چمکاتے ہیں۔ کبھی لچکے کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس داڑھی مونچھ کا بھی خیال نہیں۔ یہ داڑھی اور یہ لچکے کی گوٹ، سبحان اللہ۔

خوجی: آپ کو ذرا چھینڑیے تو، دل لگی ہی سہی۔
 آزاد: جناب، آداب عرض ہے، واللہ آپ کے لباس پر تو وہ جوہن ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی، نگاہ کے پاؤں پھسلے جاتے ہیں۔

زرد پوش: (شرما کر) جی، اس کا ایک خاص سبب ہے۔
 آزاد: وہ کیا؟ کیا کسی سرکار سے وردی ملی ہے؟ یا جج کہنا استاد، کسی نائی سے تو نہیں پھین لائے؟

زرد پوش: (اپنے نوکر سے) رمضان ذرا بتا تو دینا ہمیں اپنے منہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رضانی: حضور، میاں کا نکاح ہونے والا ہے، اسی پہناوے کی رسم ہے حضور!
 آزاد: رسم کی ایک ہی کمی۔ یہ اچھی رسم ہے۔ داڑھی مونچھ والے آدمی اور لچکا، بٹ،
 پنجا لگا کر کپڑے پہنیں۔ ارے بھی یہ کپڑے لہن کے لیے ہیں یا آپ جیسے چھکو چھکو بیک
 کے لیے؟ خدا کے لیے ان کپڑوں کو اتار دو اور مردوں کا پوشاک پہنو۔

ادھر آزاد تو یہ پٹکار سنا کر الگ ہوئے ادھر خدمت گار نے میاں زرد پوش کو سمجھانا
 شروع کیا میاں بچ تو کہتے تھے۔ جس گلی کو چے میں آپ نکل جاتے ہیں لوگ تالیاں بجاتے
 اور ہنسی اڑاتے ہیں۔

زرد پوش: ہنسنے دو جی، ہنسنے ہی گھر لیتے ہیں۔

خدمت گار: میاں، میں جاہل آدمی ہوں نمل بری بات بری ہی ہے۔ ہم غریب آدمی
 ہیں پھر بھی ایسے کپڑے نہیں پہنتے۔

میاں آزاد ادھر آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں، ایک دکڑی سانسے سے آ رہی ہے۔ اس
 پر تین نوجوان بڑے ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں۔ تینوں عینک باز ہیں۔ آزاد بولے، یہ نیا فیشن
 دیکھنے میں آیا۔ جسے دیکھو عینک باز۔ اچھی خاصی آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بننے کا
 شوق۔

میاں آزاد کو یہ قصبہ ایسا پسند آیا کہ انھوں نے دو چار دن یہیں رہنے کی ٹھانی۔ ایک
 دن گھومتے گھومتے ایک نواب کے دربار میں جا پہنچے۔ سچی سجائی کوٹھی بڑے بڑے کمرے۔ ایک
 کمرے میں غالیچے بچھے ہوئے، دوسرے میں چوکیاں، میز، مسہریاں قرینے سے رکھی ہوئیں۔
 خوبی یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اپنے نواب کو بھول گئے۔ جا کر دونوں آدمی دربار میں بیٹھے۔ خوبی
 تو نوابوں کی صحبت اٹھاتے تھے، جاتے ہی جاتے کوٹھی کی اتنی تعریف کی کہ پل باندھ دیے۔
 حضور خدا جانتا ہے کیا سچی سجائی کوٹھی ہے۔ قسم ہے حسین کی جو آج تک ایسی عمارت نظر سے
 گزری ہو۔ ہم نے تو اچھے اچھے رئیسوں کی مصاحبت کی ہے مگر کہیں یہ ٹھاٹ نہیں دیکھا۔
 حضور بادشاہوں کی طرح رہتے ہیں۔ حضور کی بدولت ہزاروں غریبوں شریفوں کا بھلا ہوتا
 ہے۔ خدا ایسے رئیس کو سلامت رکھے۔

مصاحب: اجی ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے؟ مصاحب لوگ تو اب آچلے ہیں۔ شام
 تک نسب آجائیں گے۔ ایک میلے کا میلہ روز لگتا ہے۔

نواب: کیوں صاحب، یہ فری میٹن بھی جادوگر ہے شاید؟ آخر جادو نہیں تو ہے کیا؟
 مصاحب: حضور بجا فرماتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے میری ایک فری میٹن سے ملاقات ہوئی۔ میں، آپ جلیے، ایک ہی کائیاں۔ ان سے خوب دوستی پیدا کی۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا، تو بولے یہ وہ مذہب ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مذہب ہی نہیں۔ کیوں نہیں ہو جاتے فری میٹن؟ میرے دل میں بھی آگئی۔ ایک دن ان کے ساتھ فری میٹن ہوا۔ وہاں حضور، کروڑوں لاشیں تھیں۔ سب کی سب مجھ سے گلے ملیں اور ہنسیں۔ میں بہت ہی ڈرا۔ مگر ان لوگوں نے دلاسا دیا۔ ان سے ڈرتے کیوں ہو؟ ہاں خبردار، کسی سے کہنا نہیں، نہیں تو لاشیں کچا ہی کھا جائیں گی۔ اتنے میں خداوند آگ برسنے لگی اور میں جل بھن کر خاک ہو گیا۔ اس کے بعد ایک آدمی نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو پھر ہٹا کٹا موجود۔ حضور، سچ تو یوں ہے کہ دوسرا ہوتا تو رو دیتا، لیکن میں ذرا بھی نہ گھبرایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دیو جیسے آدمی نے مجھے ایک حوض میں دھکیل دیا۔ میں دو دن اور دو رات وہیں پڑا رہا۔ جب نکالا گیا تو پھر نیاں سا موجود۔ سب کی صلاح ہوئی کہ اس کو یہاں سے نکال دو۔ حضور خدا خدا کر کے بچے، نہیں تو جان ہی پر بن آئی تھی۔

گہی: حضور، سنا ہے، کام روپ میں عورتیں مردوں پر ماش پڑھ کر پھونکتی ہیں اور بکرا، بیل، گدھا وغیرہ بنا ڈالتی ہیں۔ دن بھر بکرے بنے میں میں کیا کیے سانی کھایا کیے رات کو پھر مرد کے مرد۔ دنیا میں ایک سے ایک انیک جادوگر پڑے ہیں۔

خوشامدی: حضور، یہ موٹھ کیا چیز ہے؟ کل رات کو حضور تو یہاں آرام فرماتے تھے، میں دو بجے کے وقت قرآن پڑھ کر ٹہلنے لگا تو حضور کے سر ہانے کے اوپر روشنی سی ہوئی۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔

مصاحب: ہوش اڑنے کی بات ہی ہے۔

خوشامدی: حضور، میں رات بھر جاگتا رہا اور حضور کے پلنگ کے ارد گرد پہرا دیا کیا۔

نواب: تمہیں قرآن کی قسم؟

خوشامدی: حضور کی بدولت میرے بال بچے پلٹے ہیں۔ بھلا آپ سے اور جھوٹ بولوں؟ نمک کی قسم بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ اگر میرا باپ بھی ہوتا تو میں پہرا نہ دیتا۔ مگر حضور کا نمک جوش کرتا تھا۔

جمعدار: حضور، یہاں ایک جوڑی بکاؤ ہے۔ حضور خریدیں تو دکھاؤں۔ کیا جوڑی ہے کہ اوہو، ڈیڑھ ہزار سے کم میں نہ دے گا۔

مصاحب: اے تو آپ نے خرید کیوں نہ لی؟ اتنی تعریف کرتے ہو اور پھر ہاتھ سے جانے دی۔ حضور انھیں حکم ہو کہ بس خرید ہی لائیں۔ بادشاہی میں ان کے یہاں بھی کئی گھوڑے تھے، سوار بھی خوب ہوتے ہیں، اور چابک سواری میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔
نواب: منیم سے کہو، انھیں دو ہزار روپے دیں اور دو سائیکس ان کے ساتھ جائیں۔
جمعدار منیم کے گھر پہنچے اور بولے، لال جواہر مل، سرکار نے دو ہزار روپے دلوائے ہیں جلد آئیے۔

جواہر مل: تو جلدی کا ہے کی ہے؟ یہ روپے ہوں گے کیا؟
جمعدار: ایک جوڑی لی جائے گی۔ استاد دیکھو ہم کو بدنام نہ کرنا۔ چار سو کی جوڑی ہے۔ باقی رہے سولہ سو۔ اس میں سے آٹھ سو یاں لوگ کھائیں گے باقی آٹھ سو میں چھ سو ہمارے، دو سو تمہارے۔ ہے کئی بات نہ؟
جواہر مل: تم لو چھ سو اور ہم لیں دو سو! میاں بھائی ہو نہ! ارے یار تین سو ہم کو دو پانچ سو تو اڑا۔ یہ معاملے کی بات ہے۔

جمعدار: اجی، میاں بھائی کی نہ کہیے، میاں بھائی تو نواب بھی ہیں، مگر اللہ میاں کی گائے، تم تو لاکھوں کھا جاؤ، مگر گاڑھے کی لنگوٹی لگائے رہو۔ کھانے کو ہم بھی کھائیں گے، مگر شرتی کے انگرکھے ڈالے ہوئے، نواب بنے ہوئے، قورمہ اور پلاؤ کے بغیر کھانا نہ کھائیں گے۔ تم ابالی کچھڑی ہی کھاؤ گے۔ خیر، نہیں مانتے تو جیسی تمہاری مرضی۔

میاں جمعدار جوڑی لے کر پہنچے تو دربار میں اس کی تعریفیں ہونے لگیں۔ کوئی اس کے تھوٹھن کی تعریف کرتا، کوئی ماتھے کی، کوئی چھاتی کی۔ خوشامدی بولے، واللہ کنوئیاں تو دیکھیے، پیار کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

گہی: حضور، ایسے جانور قسمت سے ملتے ہیں۔ قسم خدا کی ایسی جوڑی سارے شہر میں نہ لکے گی۔

مطلبی: حضور، دو دو ہزار کی ایک ایک گھوڑی ہے۔ کیا خوبصورت ہاتھ پاؤں ہیں۔ اور مزہ یہ کہ کوئی عیب نہیں۔

نواب: کل شام کوفٹن میں جوتا، دیکھیں کیسی جاتی ہے۔
گہی: حضور، آندھی کی طرح جائے کیا دل لگی ہے کچھ۔

رات کو میاں آزاد سرائے میں پڑے رہے۔ دوسرے دن شام کو پھر نواب صاحب کے یہاں پہنچے۔ دربار جمع ہوا تھا مصاحب لوگ گہیں اڑا رہے تھے۔ اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ مصاحبوں نے کہا حضور روزہ کھولنے کا وقت آگیا۔

نواب: قسم قرآن کی، ہمیں آج تک معلوم ہی نہ ہوا کہ روزہ رکھنے سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ مفت میں بھوکوں مرنا کون سا ثواب ہے؟ ہم تو حافظ کے چیلے ہیں وہ بھی روزہ نماز کچھ نہ مانتے تھے۔

آزاد: حضور نے خوب کہا:

دوش از مسجد سوئے سے خانہ آدم چیر ما

چیت یارانے طریقت بعد ازیں تدبیر ما

(کل میرے پیر مسجد سے شراب خانے کی طرف آئے، دوستو تلاؤ اب میں کیا

کروں؟)

خوشامدی: واہ واہ کیا شعر ہے، سعدی کا کیا کہنا۔

گہی: سنا گاتے بھی خوب تھے۔ بہاگ کی دھن پر سر دھنتے ہیں۔

آزاد دل میں خوب ہنسے۔ یہ مسخرے اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ سعدی کا شعر ہے یا

حافظ کا۔ اور مزہ یہ کہ ان کو بہاگ بھی پسند تھا۔ کیسے کیسے گوکھے جمع ہیں۔

مصاحب: حضور، بجا فرماتے ہیں، بھوکوں مرنے سے بھلا خدا کیا خوش ہوگا؟

نواب: ابھی، یہاں تو جب سے پیدا ہوئے قسم لے لو، جو ایک دن بھی فائدہ کیا ہو۔

پھر بھوک میں نماز کی کسے سوچتی ہے؟

خوشامدی: حضور، آپ ہی کے نمک کی قسم، دن رات کھانے کی ہی فکر رہتی ہے۔ چار

بجے اور لوٹدی کی جان کھانے لگے۔ لہسن لا، پیاز لا، کباب پکھیں تو!

ہندو مصاحب: حضور، ہمارے یہاں بھی برت رکھتے ہیں لوگ، مگر ہم نے تو ہر برت

کے دن گوشت چکھا۔

خوشامدی: شاباش لالہ، شاباش! واللہ تمہارا مذہب پکا ہے۔

نواب: پڑھے لکھے آدمی ہیں کچھ جاہل گنوار تھوڑے ہی ہیں۔

خوجی: واہ واہ حضور نے وہ بات پیدا کی کہ توبہ ہی بھلی۔

خوشامدی: واہ بھئی، کیا تعریف ن ہے۔ کہنے لگے، توبہ ہی بھلی۔ کس جنگل سے پکڑ کے آئے ہو بھی تم نے تو وہ بات کہی کہ توبہ ہی بھلی۔ خدا کے لیے ذری سمجھ بوجھ کر بولا کرو۔

گپی: اے حضرت بولیں کیا بولنے کے دن اب گئے۔ برسات ہو چکی نہ؟

خوجی: میاں ایک ایک آؤ، یا کہو، چوکی لڑیں۔ ہم اس سے بھی نہیں ڈرتے۔ یہاں عمر بھر نوابوں کی ہی صحبت میں رہے۔ تم لوگ ابھی کچھ دن سیکھو۔ آپ اور ہم پر منہ آئیں۔ ایک بار ہمارے نواب صاحب کے یہاں ایک حضرت آئے، بڑے بھلکرو۔ آتے ہی مجھ پر فقرے کنسنے لگے۔ بس میں نے جو آڑے ہاتھوں لیا تو جھینپ کر ایک دم بھاگے۔ میرے مقابلے میں کوئی ٹھہرے تو بھلا۔ لے بس آئیے دو دو چوچیں ہوں۔ پالی سے ناک دم نہ بھاگو تو مونچیں منڈوا ڈالوں۔

مصاحب: آئیے پھر آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ بندے کی زبان بھی وہ ہے کہ کترنی کو مات کرے۔ زبان آگے جاتی ہے بات پیچھے رہ جاتی ہے۔
خوجی: زبان کیا چرخہ ہے رائڈ کا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو روٹی کو حضور لوتی کہتے ہوں گے۔

مصاحب: جب خدا جھوٹ نہ بلائے تو آپ اور جھوٹ نہ بولیں۔ جب سے ہوش سنبھالا کبھی سچ بولے ہی نہیں۔ ایک دفعہ دھوکے سے کچی بات نکل آئی تھی، جس کا آج تک افسوس ہے۔

خوجی: اور وہ اس وقت جب آپ سے کسی نے آپ کے باپ کا نام پوچھا تھا اور آپ نے جلدی میں صاف صاف بتا دیا تھا۔

اس پر سب کے سب ہنس پڑے اور خوجی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ڈکڑی آئی اور اس پر سے ایک سینہ اتر پڑی۔ وہ پتلی کمر کو پکاتی ہوئی آئی۔ نواب کا منہ گھسیٹا اور بڑے ٹھاٹ سے بیٹھ گئی۔

نواب: مزاج شریف؟

آبادی: آپ کی بلا سے!

مصاحب : حضور خدا کی قسم اس وقت آپ ہی کا ذکر تھا۔

آبادی : چلو جھوٹے! علی کی سنوار تجھ پر اور نواب پر۔

مصاحب : خدا کی قسم

آبادی : اب ہم ایک چپت جمائیں گے۔ دیکھو نواب اپنے ان گرگوں کو منع کرو، میرے

منہ نہ لگا کریں۔

اتنے میں ایک مہری پانچ چھ برس کے ایک لڑکے کو گود میں لائی۔

آبادی : ہماری بہن کا لڑکا ہے۔ لڑکا کیا پہاڑی مینا ہے۔ بھیا، نواب کو گالیاں تو دینا،

کیوں نواب، ان کو مٹائی دو گئے نہ؟

نواب : ہاں، ابھی ابھی۔

لڑکا : پہلے مٹائی لاؤ، پھر ہم دالی دے دیں دے۔

اب چاروں طرف سے مصاحب بلاتے ہیں، آؤ ہمارے پاس آؤ۔ لڑکے نے نواب کو

اتنی گالیاں دیں کہ توبہ ہی بھلی۔ نواب صاحب خوب ہنسنے اور ساری محفل لڑکے کی تعریف

کرنے لگی۔ خداوند اب اس کو مٹائی منگوا دیجیے۔

نواب : اچھا بھئی، ان کو پانچ روپے کی مٹائی لا دو۔

آبادی : اے ہنو بھی! آپ اپنے روپے رہنے دیں۔ کیا کوئی فقیر ہے؟

نواب : اچھا ایک اشرفی کی لا دو۔

آبادی : بھیا نواب کو سلام کر لو۔

نواب : اچھا، یہ تو ہوا، اب کوئی چیز سناؤ۔ پیلو کی کوئی چیز ہو تمہیں قسم ہے۔

آبادی : اے ہنو بھی آج روزے سے ہوں، آپ کو گانے کی سوجھتی ہے۔

فرش پر کئی نیو پڑے ہوئے تھے۔ بی صاحب نے ایک نیو داہنے ہاتھ میں لیا اور دوسرا نیو

اسی ہاتھ سے اچھالا اور روکا۔ کئی منٹ تک اسی طرح اچھالا اور روکا بھی۔ لوگ شور مچا رہے

ہیں۔ کیا تلے ہوئے ہاتھ ہیں سبحان اللہ۔ وہ بولیں کہ بھلا نواب، تم تو اچھا لو۔ جب جانیں کی

نیو گرنے نہ پائے۔ نواب نے ایک نیو ہاتھ میں لیا اور دوسرا اچھالا، تو تر سے ناک پر گرا پھر

اچھالا تو کھوپڑی پر تر سے۔

آبادی : بس جاؤ، بھی اتنا بھی شعور نہیں ہے۔

نواب : یہ انگلی میں کپڑا کیسا بندھا ہے؟

آبادی : بوجھو، دیکھیں کتنی عقل ہے؟

نواب : یہ کیا مشکل ہے، چھالیاں کترتی ہوں گی۔

آبادی : ہاں، وہ خون کا تار بندھا کہ تو بہ۔ میں نے پانی ڈالا اور کپڑا باندھ لیا۔

مصاحب : حضور، آج اس شہر میں ان کی جوڑ نہیں ہے۔

نواب : بھلا کبھی نواب خفقان حسین کے یہاں بھی جاتی ہو؟ سچ جچ کہنا۔

آبادی : علی کی سنوار اس پر۔ جچ کر آیا ہے۔ اس منحوس سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ آپ

کہاں کے ایسے بڑے مولوی بن بیٹھے؟

نواب : جی بجا ہے جو آپ کو نہ بلائے وہ منحوس ہوا۔

آبادی : بلائے گا کون؟ جس کو غرض ہوگی، آپ دوڑا آوئے گا۔

آزاد اور خوجی یہاں سے چلے، تو آزاد نے کہا آپ کچھ سمجھے؟ یہ جوڑی وہی تھی، جو

روشن علی خرید کر لائے تھے۔

خوجی : یہ کون بڑی بات ہے، اسی میں تو رئیسوں کا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ ان کی صحبت

میں جب بیٹھے، خوب گپ اڑائیے اور جھوٹ اس قدر بولیے کہ زمین آسمان کے قلابے

ملائیے۔ رنگ جم جائے، تو دونوں ہاتھوں سے لوٹے اور سونے کی اینٹیں ہوا کر صندوق میں رکھ

چھوڑ دیے۔ لیکن ایسے مال کو رہتے نہ دیکھا، معلوم نہیں ہوتا کدھر آیا اور کدھر گیا۔

آزاد : یہ نواب بالکل چونکا ہے۔

خوجی : اور نہیں تو کیا، زرا چونچ۔

آزاد : خدا کرے، یہ رئیس زادے پڑھ لکھ کر بھلے آدمی ہو جائیں۔

خوجی : ارے، خدا نہ کرے بھائی، یہ جاہل ہی رہیں تو اچھا۔ جو کہیں پڑھ لکھ جائیں تو

بھراتے بھلے مانسوں کی پرورش کون کرے؟

تیسرے دن دونوں بھر نواب کی کوٹھی پر پہنچے۔

خوجی : خدا ایسے رئیس کو سلامت رکھے۔ آج یہاں سناٹا سا نظر آتا ہے۔ کچھ چہل پہل

نہیں ہے۔

مصاحب : چہل پہل کیا خاک ہو! آج مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

آزاد: ذرا خیر کر بے کچھ تو فرمائیے۔

نواب: کیا عرض کروں، جب برے دن آتے ہیں تو چاروں طرف سے بری ہی بری باتیں سننے میں آتی ہیں۔ گھر میں وضع حمل ہو گیا۔

آزاد: یہ تو کچھ بری بات نہیں۔ وضع حمل کے معنی لڑکا پیدا ہونا۔ یہ تو خوشی کا موقع ہے۔

مصابح: ہمارے حضور کا منشا اسقاط حمل (گر بھ پات) سے تھا۔ خوشامدی: اجی، اسے وضع حمل بھی کہتے ہیں لغت دیکھیے۔

نواب: اجی، اتنا ہی ہوتا تو دل کو کسی طرح سمجھا لیتے ہیں۔ یہاں تو ایک اور مصیبت نے آ گھیرا۔

مصابح: (شٹنڈی سانس لے کر) خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔ خوشامدی: حضرت، کیا عرض کروں حضور کا ایک میڑھا مر گیا، کیسا تیار تھا کہ کیا کہوں، گینڈا بنا ہوا۔

گمی: اجی، یوں نہیں کہتے کہ گینڈے کو ٹکرا دیتا تو نہیں کر کے بھاگتا۔ ایک دفعہ میں اپنے ساتھ باغ لے گیا۔ اتفاق سے ایک راجا صاحب پاٹھے پر سوار بڑھے ٹھاٹ سے آرہے تھے۔ بندہ مینڈھے کو عین سڑک پر لیے ہوئے ڈٹا کھڑا ہے۔ سپاہی نے للکارا کہ ہٹا بکری کو سڑک سے۔ اتنا کہنا تھا کہ میں آگ ہی تو ہو گیا۔ پوچھا کیا کہا بھائی؟ پھر تو کہنا۔ سپاہی آنکھیں نیلی پیلی کر کے بولا۔ ہٹا بکری کو سانے سے، سواری آتی ہے۔ تب تو جناب میرے خون میں جوش آ گیا۔ میں نے مینڈھے کو للکارا تو اس نے جھپٹ کر ہاتھی کے منک پر ایک ٹکر لگائی۔ وہ آواز آئی جیسے کوئی درخت زمین پر آ رہا ہو۔ بندر ڈال ڈال چیخنے لگے، بندریاں بچوں کو چھاتی سے لگائے دبک رہیں تو وجہ کیا، ان کو میڑھے پر بھیڑیے کا دھوکا ہوا۔ خوجی: میڑھے کو بھیڑیا سمجھی! مگر واللہ آپ کو تو بے دم کا لنگور سمجھا ہو گا۔

گمی: بس حضرت ایک ٹکر لگا کر پیچھے ہٹا اور بدن کو تول کر چھلانگ جو مارتا ہے تو ہاتھی کے منک پر! وہاں سے پھر اچکا تو فیل بان کے ماتھے پر ایک ٹکر لگائی، مگر آہستہ سے۔ ذرا اس تیز کو دیکھیے گا، سمجھا کہ اس میں ہاتھی کا سا زور کہاں۔ مگر راجا کا ادب کیا۔ اب میں لاکھ لاکھ زور کرتا ہوں پر وہ کسی کی سنتا ہے؟ غصہ آیا سو آیا جیسے سر پر بھوت سوار ہو گیا۔ چمڑا کر

پھر لپکا اور ایک دو تین چار، بس خدا جانے اتنی ٹکریں لگائیں کہ ہاتھی ہوا ہوگا اور چنگھاڑ کر بھاگا۔ آدمی پر آدمی گرتے ہیں آپ جانیے، پاشے کا بگڑنا کچھ ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں۔ جناب وہی میڈھا آج چل بسا۔

آزاد: نہایت افسوس ہوا۔

خوبی: سن شریف کیا تھا؟

نواب: سن کیا تھا ابھی بچہ تھا۔

مصاحب: حضور، وہ آپ کا دشمن تھا، دوست نہ تھا۔

نواب: ارے بھئی، کس کا دوست، کیسا دشمن، اس بیچارے کا کیا تصور؟ وہ تو اچھا گیا مگر ہم سب کو جیتے جی مار ڈالا۔

آزاد: حضرت، یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ یہاں سے جو گیا اچھا گیا۔ مگر نوجوان کے مرنے کا رنج ہوتا ہے۔

مصاحب: اور پھر جوان کیسا کہ ہونہار۔ ہاتھ مل کر رہ گئے یار، بس اور کیا کریں۔

آزاد: مرض کیا تھا؟

مصاحب: کیا مرض بتائیں، بس قسمت ہی پھوٹ گئی۔

خوشامدی: مگر کیا موت پائی ہے، رمضان کے مہینے میں، اس کی روح جنت میں ہوگی۔ طوبیٰ کے تلے جو گھاس ہے وہ چر رہا ہوگا۔

اتنے میں ایک مہری گل بدن کا لہنگا جس میں آٹھ آٹھ انگل گوٹ لگی تھی، پھڑکاتی اور گلابی دوپٹے کو چمکاتی آئی اور نواب کے کان میں جھک کر بولی۔ بیگم صاحبہ حضور کو بلاتی ہیں۔

نواب: یہ نادری حکم؟ اچھا صاحب، چلیے۔ یہاں تو بیگم اور مہری دونوں سے ڈرتے ہیں۔

نواب صاحب اندر گئے، تو بیگم نے خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا، اے میں کہتی ہوں یہ کیسا رونا دھونا ہے؟ کہاں کی ایسی مصیبت پڑ گئی کہ آنکھیں خون کی بوٹی بن گئیں؟ میڈھے ٹکڑے مرا ہی کرتے ہیں۔ ایسی عقل پر پتھر پڑے کہ موئے جانور کی جان کو رو رہے ہیں۔ تمہارے عقل کو دن دن دیمک چاٹے جاتی ہے کیا؟ اور ان مفت خوروں نے تو آپ کو اور بھی چنگ پر چڑھایا ہے۔ اللہ کی قسم، اگر آپ نے رنج و غم کیا، تو ہم زمین آسمان ایک

کر دیں گے۔ آخر وہ میڈھا کوئی آپ کا... بس اب کیا کہوں۔ بیٹکی ملی بنے گنر گنرس رہے تھے۔

نواب: تمہارے سر کی قسم، اب ہم اس کا ذکر بھی نہ کریں گے۔ مگر جب آپ کی ملی مر گئی تھی تو آپ نے کیوں دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا؟ اب ہماری دفعہ آپ غزاتی ہیں؟
مصاحب: (پردے کے پاس سے) واہ حضور، ملی کے لیے غزانا بھی کیا خوب، واللہ ضلع سے تو کوئی فقرہ آپ کا خالی نہیں ہوتا۔

بیگم: دیکھو، ان موئے مسندوں کو منع کر دو کہ ڈیوڑھی پر نہ آنے پائیں۔
دربان نے جواتی شہہ پائی تو ایک ڈانٹ بتائی۔ بس جی سنو چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اب ڈیوڑھی پر آنے کا نام لیا تو تم جانو گے۔ بیگم صاحبہ ہم پر خفا ہوتی ہیں۔ تمہاری گرہ سے کیا جائے گا۔ ہم سپاہی آدمی ہم تو نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

مصاحب سپاہی سے تو کچھ نہ بولے، مگر بڑبڑاتے ہوئے چلے۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیوں بھی اس وقت ناک بھوں کیوں چڑھائے ہو؟ بولے اجی کیا کہیں ہمارے نواب تو بس بچھیا کے بابا ہی رہے۔ بیوی نے ڈپٹ لیا، زن مرید ہے جی! آبرو کا بھی کچھ خیال نہیں۔ عورت ذات پھر جو رو اور الٹے ڈانٹ بتائے اور داڑھی مونچھوں والے ہو کر چپ چاپ سنا کریں۔ واللہ، جو کہیں میری بیوی کہتی تو گلا ہی گھونٹ دیتا۔ یہاں ناک پر کبھی تک بیٹھنے نہیں دیتے۔

آزاد: بھئی، غصے کو تھوک دو۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ ان کی بیوی ہیں، چاہے گھڑکیاں سنیں، چاہے جھڑکیاں کہیں، آپ سچ میں بولنے والے کون؟ اور پھر جس کا کھاتے ہو اسی کو کوستے ہو۔ اس پر دھوئی یہ ہے کہ ہم نمک حلال اور کٹ مرنے والے لوگ ہیں۔

اتنے میں نواب صاحب باہر نکلے۔ امیروں کے دربار میں آپ چاہیے، ایک کا ایک دشمن ہوتا ہے۔ سیکڑوں چغل خور رہتے ہیں۔ ہر دم یہی فکر رہتی ہے کہ دوسرے کی چغلی کھائیں اور سب کو دربار سے نکلوا کر ہی ہم نظر آئیں۔ دو مصاحبوں نے صلاح کی کہ آج نواب نکلیں تو اس کی چغلی کھائیں اور اس کو کھڑے کھڑے نکلوا دیں۔ نواب کو جو آتے دیکھا تو چلا کر کہنے لگے۔ سنا بھی بس اب جو کوئی کلمہ کہا تو ہم سے نہ بنے گا۔ جس کا کھائے اسی کا گائے۔ یہ نہیں کہ جس کا کھائیں اسی کو گالیاں سنائیں۔ نواب صاحب کو چاہے آپ پیٹھ پیچھے زن مرید بنائیں، یا بیٹکی ملی کہیں مگر خبردار جو آج سے بیگم صاحبہ کی شان میں کوئی گستاخی کی، خون ہی

پی لوں گا۔

نواب : (تواریاں بدل کر) کیا؟

حافظ جی : کچھ نہیں حضور، خیریت ہے۔

نواب : نہیں کچھ تو ہے ضرور۔

روشن علی : تو چھپاتے کیوں ہو، سرکار سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟ حضور

بات یہ ہے کہ میاں صاحب جب دیکھو جب حضور کی ہجو کیا کرتے ہیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا یہ بری

بات ہے میاں کہہ کر بھائی کہہ کر، بیٹا کہہ کر، بابو کہہ کر، ہاتھ جوڑ کر، ہر طرح سمجھایا، مگر یہ تو

لاٹوں کے آدمی ہیں باتوں سے کب مانتے ہیں۔ ہم بھی چپکے ہو رہے تھے کہ بھی چغلی کون

کھائے، مگر آپ زبانی ڈیوڑھی سے..... حضور، بس کیا کہوں، اب اور نہ کہلوائے۔

نواب : ان کو ہم نے موقوف کر دیا۔

میاں مصاحب تو کھسکے۔ اتنے میں مڑگشت آپہنچے اور نواب کو سلام کر کے بولے،

خداوند، آج خوب سیر سہا کیا۔ اتنا گھوما کہ ٹانگوں کے ٹٹو کی گامچیاں درد کرنے لگیں۔ کوئی

علاج بتائیے۔

حافظ جی : گھاس کھائیے، یا کسی سالوتری کے پاس جایئے۔

نواب : خوب! ٹٹو کے لیے گھاس اور سالوتری کی اچھی کہی۔ اب کوئی تازہ تازہ خبر

سنائیے، باسی نہ ہو گرما گرم۔

مڑگشت : وہ خبر سناؤں کہ محفل بھر کو لوٹ پوٹ کر دوں حضور، کسی ملک سے چند پری

زاد عورتیں آئی ہیں۔ تماشائیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ سنا تھیٹر میں تاجتی ہیں اور ایک ایک

قدم اور ایک ایک ٹھوکر میں عاشقوں کے دل کو پامال کرتی ہیں۔ انھیں میں سے ایک پری زاد

جو دن سے نکل گئی تو بس میری جان سن سے نکل گئی۔ دریا کنارے خیسے پڑے ہیں۔ وہیں

اندر کا اکھاڑا سجا ہوا ہے۔ آج شام کو نوبے تماشہ ہوگا۔

نواب : بھی، تم نے خوب مزے کی خبر سنائی۔ اس جانب ضرور جائیں گے۔

اتنے میں خدیار خاں جنھیں ذرا پہلے نواب نے موقوف کر دیا تھا، آ بیٹھے اور بولے،

حضور ادھر خداوند نے موقوفی کا حکم سنایا، ادھر گھر پہنچا، تو جو رو نے طلاق دے دی۔ کہتی ہے

’روٹی نہ کپڑا سنت میت کا بھڑا‘

آزاد: حضور، ان غریب پر رحم کیجیے۔ نوکری کی نوکری گئی اور بیوی کی بیوی۔

نواب: حافظ جی ادھر آؤ، کچھ حال ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔

حافظ: حضور، انھوں نے کہا کہ نواب تو زے بچھیا کے تاؤ ہی ہیں زن مرید۔ اور بیگم صاحبوں کو اس نابکار نے وہ باتیں کہیں کہ بس، کچھ نہ پوچھیے۔ عجب شیطان آدمی ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو انھیں سے پوچھ لیجیے۔

نواب: کیوں میاں آزاد، کچھ کہو تم نے کیا سنا؟

آزاد: حضور، اب جانے دیجیے قصور ہوا، میں نے سمجھا دیا ہے۔

حافظ: یہ بیچارے تو ابھی ابھی سمجھا رہے تھے کہ او گیدی تو اپنی مالک کو ایسی ایسی کھوٹی

کھری کہتا ہے۔

نواب: (دربان سے) دیکھو جی حسین علی، آج سے اگر خدایار خاں کو آنے دیا تو تم

جانو گے۔ کھڑے کھڑے نکال دو گے۔ اسے پھانک میں قدم رکھنے کا حکم نہیں۔

خدایار: حضور، غلام سے بھی تو سنیے۔ آج میاں روشن علی نے مجھے تاڑی پلا دی اور یہی

منصوبہ تھا کہ یہ نشے میں چور ہو، تو اسے کسی لم میں نکلوا دیں۔ سو حضور، ان کی مراد بر آئی۔ مگر

حضور، میں اس در کو چھوڑ کر اور جاؤں کہاں؟ خدا آپ کے بال بچوں کو سلامت رکھے، یہاں

تو رواں رواں حضور کے لیے دعا کرتا ہے۔ حضور تو پوتروں کے رئیس ہیں، مگر چغل خوروں نے

کان بھر دیے۔

خدا کے غضب سے ذرا دل میں کانپ

چغل خور کے منہ کو ڈستے ہیں سانپ

نواب: اچھا یہ بات ہے۔ خبردار، آج سے ایسی بے ادبی نہ کرنا۔ جاؤ، ہم نے تم کو

بحال کیا۔

مصاحبوں نے غل مچایا: واہ حضور، کتنا رحم ہے! ایسے رئیس پیدا کا ہے کو ہوتے ہیں۔ مگر

خدایار خاں کو تو ان کی جورو نے بچالیا۔ نہ وہ طلاق دیتی نہ یہ بحال ہوتے۔ واللہ جو رو بھی

قسمت سے ملتی ہے۔

(28)

دوسرے دن نوبجے رات کو نواب صاحب اور ان کے مصاحب تھیز دیکھنے چلے۔

نواب: بھئی، آبادی جان کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔

مصاحب: ضرور ضرور، حضور ان کے بغیر مزہ کرکرا ہو جائے گا۔

اتنے میں فنن آجینچی اور آبادی جان جھم جھم کرتی ہوئی آکر مسند پر بیٹھ گئی۔

نواب: واللہ ابھی آپ ہی کا ذکر تھا۔

آبادی: تم سے لاکھ دفعہ کہہ دیا کہ ہم سے جھوٹ نہ بولا کرو۔ ہمیں کوئی دیہاتی سمجھا

ہے۔

نواب: خدا کی قسم، چلو تم کو تماشا دکھا لائیں۔ مگر مردانے کپڑے پہن کر چلیے، ورنہ

ہماری بے عزتی ہوں۔

آبادی نے تنگ کر کہا: جو ہمارے چلنے میں بے آبروئی ہے تو سلام۔

یہ کہہ کر وہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ نواب نے دوپٹہ دبا کر کہا۔ ہمارا ہی خون پیے، جو

ایک قدم بھی آگے بڑھائے، ہمیں کو روئے، جو روٹھ کر جائے! حافظ جی ذرا مردانے کپڑے تو

لائیے۔

غرض آبادی جان نے عمامہ سر پر باندھا، چست انگڑیاں اور کسا ہوا گھٹنا، ٹاٹ بانی

بوٹ، پھندا جھلکتا ہوا، ان کے گورے بدن پر کھل اٹھا۔ نواب صاحب ان کے ساتھ فنن پر

سوار ہوئے اور مصاحبوں میں کوئی نگہی پر، کوئی ٹم ٹم پر، کوئی پاکی گاڑی پر لدے ہوئے تماشا

گھر میں داخل ہوئے۔ مگر آبادی جان جلدی میں پازیب اتارنا بھول گئی تھیں۔ وہاں پہنچ کر

نواب نے اول درجے کے دو ٹکٹ لیے اور سرکس میں داخل ہوئے۔ لیکن پازیب کی جھم جھم

نے وہ شور مچایا کہ سبھی تماشاویوں کی نگاہیں ان دونوں آدمیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ جو ہے اسی

طرف دیکھتا ہے، تاڑنے والے تاڑ گئے، بھاپنے والے بھانپ گئے، نواب صاحب اکڑتے

ہوئے ایک کرسی پر جا ڈٹے اور آبادی جان بھی ان کی بغل میں بیٹھ گئی۔ بہت بڑا شامیانہ منگا

ہوا تھا۔ بجلی کی قیتوں سے چکا چوندھ کا عالم تھا۔ پتھر ایک بڑا میدان، ارد گرد کوئی دو ہزار

کرسیاں۔ خیمہ بھر جگمگ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں دس بارہ جوان گھوڑے کڑکڑاتے ہوئے

میدان میں آئے اور چکر کاٹنے لگے، اس کے بعد ایک جوان نازنین، آفت کی پرکالا، گھوڑے پر سوار، اس شان سے آئی کہ محفل بھر پر آفت ڈھائی۔ ساری محفل مست ہو گئی۔ وہ گھوڑے سے پھرتی کے ساتھ اچکی اور پھر پیٹھ پر آ پٹنی۔ چاروں طرف سے واہ واہ کا شور مچ گیا۔ پھر اس نے گھوڑے کو میدان میں چکر دینا شروع کیا۔ گھوڑا سر پٹ جا رہا تھا، اتنا تیز کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ یکا یک وہ لیڈی تڑ سے زمین پر کود پڑی۔ گھوڑا جیوں کا تیوں دوڑتا رہا۔ ایک دم میں وہ جھپٹ کر پھر پیٹھ پر سوار ہو گئی۔ اس پر اتنی تالیاں بجیں کہ خیمہ بھر گونج اٹھا۔ اس کے بعد شیروں کی لڑائی، بندروں کی دوڑ اور خدا جانے کتنے اور تماشے ہوئے۔ گیارہ بجتے بجتے تماشا ختم ہوا۔ نواب صاحب گھر پہنچے تو سانسیں بھرتے تھے اور میاں آزاد دونوں ہاتھوں سے سر دھنتے تھے۔ دونوں مس ورجینا (تماشا کرنے والی عورت) کی نگاہوں کے شکار ہو گئے۔

حافظ جی بولے: حضور، ابھی مشکل سے تیرہ چودہ برس کا سن ہوگا، اور کس پھرتی سے اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر ہو رہتی تھی کہ واہ جی واہ۔ میاں روشن علی بڑے شہ سوار بننے لگے۔ قسم خدا کی، جوان کے باپ بھی قبر سے اٹھ آئیں تو یہ کرتب دیکھ کر ہوش اڑ جائیں۔

نواب: کیا چاند سا کھڑا ہے۔

آبادی جان: یہ کہاں کا دکھڑا ہے؟ ہم جاتے ہیں۔

مصاحب: نہیں حضور، ایسا نہ فرمائیے، کچھ دیر تو بیٹھیے۔

لیکن آبادی جان روٹھ کر چلی ہی گئی۔ اب نواب کا یہ حال ہے کہ منہ پھلائے، غم کی صورت بنائے بیٹھے سرد آہیں کھینچ رہے ہیں۔ مصاحب سب بیٹھے سمجھا رہے ہیں، مگر آپ کو کسی طرح صبر ہی نہیں آتا۔ اب زندگی وبال ہے، جان جنجال ہے۔ یہ بھی فخر ہے کہ ہمارا دل کسی پری زاد پر آیا ہے، شہر بھر میں دھوم ہو جائے کہ نواب صاحب کو عشق چڑایا ہے۔

تاکہ مشہور ہو ہزاروں میں

ہم بھی ہیں پانچویں سوار میں

مصاحبوں نے سوچا، ہمارے شہ دینے سے یہ ہاتھ سے جاتے رہیں گے، اس لیے وہ چال چلیے کہ 'سانپ مرے نہ لٹھی ٹوٹے' لگے سب اس عورت کی ہجو کرنے۔ ایک نے کہا بھائی، جادو کا کھیل تھا، دوسرے بولے، جی ہاں میں نے دن کے وقت دیکھا تھا، نہ وہ رنگ نہ وہ روغن، نہ وہ چمک دک، نہ وہ جوہن، رات کی پری دھوکے ٹٹی ہے۔ آخر مس ورجینا

نواب کی نظروں سے گر گئی۔ بولے جانے بھی دو اس کا ذکر ہی کیا۔ جب مصاحبوں کی جان میں جان آئی۔ نواب صاحب کے یہاں سے رخصت ہوئے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں۔
حافظ جی: ہمارے نواب بھی کتنے بھولے بھالے رئیس ہیں۔

روشن علی: اجی، نرے بچھیا کے تاؤ ہیں۔ خدایار خاں ٹھیک ہی تو کہا تھا۔
خدایار خاں: اور نہیں تو کیا جھوٹ بولے تھے؟ ہمیں لگی لپٹی نہیں آتی چاہے جان جاتی رہے، مگر خوشامد نہ کریں گے۔

حافظ جی: بھئی، یہ آزاد نے بڑا اڑنگا مارا ہے۔ اس کو نہ پہچاڑا تو ہم سب نظروں سے گر جائیں گے۔

روشن علی: اجی میں ترکیب بتاؤں، جو پٹ پڑے تو نام نہ رکھوں۔ نواب ڈرپوک تو ہیں ہی، کوئی اتنا جا کر کہہ دے کہ میاں آزاد اشتہاری مجرم ہیں۔ بس پھر دیکھیے کیا تاتھیا مچتی ہے۔ آپ مارے خوف کے گھر میں گھس رہیں اور زنانے میں تو کہرام ہی مچ جائے۔ آزاد اور ان کے ساتھی انچی دونوں کھڑے کھڑے نکال دیے جائیں۔

خوشامدی: واہ استاد، کیا تڑ سے سوچ لیتے ہو! واللہ ایک ہی نیاریے ہو۔
روشن علی: پھر ان جھانسون کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔

حافظ جی: ہاں، خوب یاد آیا، پرسوں تیج بہادر دھن سے آئے ہیں۔ بیچارے بڑی تکلیف میں ہیں۔ ہمارے سچے دوستوں میں ہیں۔ ان کے لیے ایک روٹی کا سہارا ہو جائے تو اچھا۔ آپ میں سے کوئی چھیڑ دے تو ذرا بس پھر میں لے اڑوں گا۔ مگر تعریف کے پل باندھ دیجیے۔ نواب کو جھانے میں لانا کوئی بڑی بات تو ہے نہیں۔ تھالی کے بیگن ہیں۔

حافظ جی: ایک کام کیجیے، کل جب سب جمع ہو جائیں تو ہم پہلے چھیڑیں کہ اس دربار میں ہر فن کا آدمی موجود ہے اور ریاست کہتے اسی کو ہیں کہ گنیوں کی پرورش کی جائے، شریفوں کی قدردانی حضور ہی کا حصہ ہے۔ اس پر کوئی بول اٹھے کہ اور تو سب موجود ہیں، بس یہاں ایک بن بیٹے کی کسر ہے۔ پھر کوئی کہے کہ آج کل دھن سے ایک صاحب آئے ہیں، جو بوٹ کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ دو چار آدمی ہاں میں ہاں ملا دیں تو انھیں وہ وہ تیج یاد ہیں کہ تلواریں جھین لیں۔ ذرا سے آدمی مگر سامنے آئے اور بجلی کی طرح ترپ گئے۔ ہم کہیں گے واللہ آپ لوگ بھی کتنے احمق ہیں کہ ایسے آدمی کو حضور کے سامنے اب تک پیش نہیں کیا۔ اور

جو کوئی رئیس انھیں نوکر رکھ لے تو پھر کیسی ہو؟ بس دیکھ لینا، نواب خود ہی کہیں گے کہ ابھی ابھی لاؤ۔ مگر تیغ بہادر سے کہہ دینا کہ خوب ہانکے بن کر آئیں مگر بات چیت نرمی سے کریں، جس میں ہم لوگ کہیں گے کہ دیکھیے خداوند، کتنی شرافت ہے۔ جن لوگوں کو کچھ آتا جاتا نہیں، وہ ہی زمین پر قدم نہیں رکھتے۔

مصاحب: مگر کیوں میاں، یہ تیغ بہادر ہندو ہیں یا مسلمان؟ تیغ بہادر تو ہندوؤں کا نام بھی ہوا کرتا ہے۔ کسی ہندو کے گھر محرم کے دنوں میں لڑکا پیدا ہوا اور امام بخش نام رکھ دیا۔ ہندو بھی کتنے بے شکے ہوتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ پوچھیے کہ تم جو تیزی کو سجدہ کرتے ہو، درگاہوں میں شربت پلاتے ہو، امام باڑے بنواتے ہو، تو پھر مسلمان ہی کیوں نہیں ہو جاتے۔ حافظ علی: مگر تم لوگوں میں بھی تو ایسے کوکھے ہیں جو چپک میں ماہن کو بلاتے ہیں، چوراہے پر گدھے کو پنے کھلاتے ہیں، جنم پتری بنواتے ہیں۔ کیا یہ ہندو پن نہیں ہے؟ اس کی نہ کہیے۔

ادھر میاں آزاد بھی مس درجینا پر قہو ہو گئے۔ رات تو کسی طرح کروٹیں بدل بدل کر کاٹیں۔ صبح ہوتے ہی مس درجینا کے پاس جا پہنچے۔ اس نے جو میاں آزاد کی صورت سے ان کی حالت تاڑ لی تو اس طرح چپک چپک کر چلنے لگی کہ ان کی جان پر آفت ڈھائی۔ آزاد اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

درجینا: معلوم ہوتا ہے یا تو تم پاگل ہو یا ابھی پاگل خانے سے رسیاں تڑا کر آئے ہو۔

آزاد: ہاں پاگل نہ ہوتا تو تمھاری ادا کا دیوانہ کیوں ہوتا؟

درجینا: بہتر ہے کہ ابھی سے ہوش میں آجاؤ، میرے کتنے ہی دیوانے پاگل خانے کی سیر کر رہے ہیں۔ روس کے تین جنرل مجھ پر رہکھے، یونان میں ایک رئیس لٹو ہو گئے، انگلستان کے کتنے ہی ہانکے آہیں بھرتے رہے، جرمنی کے بڑے بڑے امیر سائے کی طرح میرے ساتھ گھوما کیے، روم کے کئی پاشا زہر کھانے پر تیار ہو گئے۔ مگر دنیا میں دغا بازی کا بازار گرم ہے کسی سے دل نہ ملایا، کسی کو منہ نہ لگایا۔ ہمارے چاہنے والے کو لازم ہے کہ پہلے آئینے میں اپنا منہ تو دیکھے۔

آزاد: اب مجھے دیوانہ کہیے یا پاگل، میں تو مر رہا۔

بھری چشم بت بے چہرہ دیکھو
 ہماری گردش تقدیر دیکھو
 انھیں ہے طوق منت کا گراں بار
 ہمارے پاؤں کی زنجیر دیکھو

ورجینا: مجھے تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے۔ کیوں جان دینے پر تلے ہوئے ہو۔
 آزاد: جی کر ہی کیا کروں گا؟ ایسی زندگی سے تو موت ہی اچھی۔

ورجینا: آگئے تم بھی جھانسنے میں۔ ارے میاں میں عورت نہیں ہوں، جو تم سو میں۔ مگر قسم کھاؤ کہ کسی سے یہ بات نہ کہو گے۔ کئی سال سے میں نے یہی بھیس بنا رکھا ہے۔ امیروں کو لوٹنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور تدبیر نہیں۔ ایک ایک چٹون کے ہزار دلوں پونڈ لاتا ہوں پھر بھی کسی کو منہ نہیں لگاتا۔ آج تمہاری بے قراری دیکھ کر تم کو صاف صاف بتا دیا۔
 آزاد: اچھا مردانے کپڑے پہن کر میرے سامنے آؤ، تو مجھے یقین آئے۔

مس ورجینا ذرا دیر میں کوٹ اور چٹلون پہن کر آزاد کے سامنے آئی اور بولی اب تو تمہیں یقین آیا، میرا نام ماس ہوڈ ہے، اگر تم کو وہ چٹھیاں دکھاؤں جو ڈھیر کی ڈھیر میرے پاس پڑی ہیں۔ تو جتنے ہتے تمہارے پیٹ میں بل پڑ جائے۔ دیکھیے، ایک صاحب لکھتے ہیں:
 جنازہ میرا گلی میں ان کی جو پہنچے ٹھہرا کے اتنا کہنا
 اٹھانے والے ہوئے ہیں ماندے سو تھک کے کاندھا بدل رہے ہیں۔

دوسرے صاحب لکھتے ہیں:

ہم بھی کشتہ تیری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
 او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے!

ایک بار اٹلی گیا یہاں اکثر امیروں اور رئیسوں نے میری دعوتیں کیں اور اپنی لڑکیوں سے میری ملاقات کرائی۔ میں کئی دن تک ان پر یوں کے ساتھ ہوا کھاتا رہا۔ اور ایک دل لگی سی۔ ایک امیر زادی نے میرے ہاتھوں کو چوم کر کہا کہ ہمارے میاں تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سے ان کی شادی نہ ہوئی تو وہ زہر کھا لیں گے۔ یہ امیر زادی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس کا شوہر مجھے دیکھتے ہی پھول اٹھا اور ایسی ایسی باتیں کیں کہ میں مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کر سکا۔

آزاد بہت دیر تک ٹامس ہوڈ سے ان کی زندگی کے قصے سنتے رہے۔ دل میں بہت شرمندہ تھے کہ یہاں کتنے احمق بنے۔ یہ باتیں دل میں سوچتے ہوئے سرائے میں پہنچے تو پھانک ہی کے پاس سے آواز آئی، لانا تو میری کروٹی، نہ ہوا طمنچہ نہیں تو دکھا دیتا تماشہ۔ آزاد نے لکارا کہ کیا ہے بھائی، کیا ہے ہم آ پہنچے۔ دیکھا تو خوبی ایک کتے کو دنگار رہے ہیں۔

(29)

آج تو نرالا سماں ہے۔ غریب امیر، سب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں۔ کہیں بلبل کے چہچہے، کہیں قمری کے قہقہے، یہ عید کی تیاریاں ہیں۔ نواب صاحب کی مسجد کا حال نہ پوچھیے۔ روزے تو آپ پہلے ہی چٹ کر گئے تھے۔ لیکن عید کے دن دھوم دھام سے مجلسِ نجی۔ نور کے بڑکے سے مصاحبوں نے آنا شروع کیا اور مبارک مبارک کی آواز ایسی بلند کی کہ فرشتوں نے آسمان کو تھام لیا، نہیں تو زمین اور آسمان کے قلابے مل جاتے۔

مصاحب : خدا عید مبارک کرے، میرے نواب جگ جگ جیئیں۔

حافظ جی : برس دن کا ایک دن مبارک کرے۔

روشن علی : خدا حضور کی عید مبارک کرے۔

نواب : آپ کو بھی مبارک ہو۔ مگر سنا کہ آج تو عید میں فرق ہے۔ بھئی آدھا تیر اور

آدھا بیڑ نہیں اچھا۔

مصاحب : حضور، فرنگی محل کے علماء نے تو آج ہی عید کا فتویٰ لگایا ہے۔

نواب : بھلا چاند کل کسی نے دیکھا بھی؟

مصاحب : حضور، پکے پل کر چار بھشتیوں نے دیکھا، راجا کی بازار میں حافظ جی نے

دیکھا اور میرے گھر میں بھی دیکھا۔

نواب : آپ کی بیگم صاحبہ کا سن کیا ہے؟ ہے کوئی چودہ پندرہ برس کی!

مصاحب نے شرما کر گردن جھکا لی۔

نواب : آپ اپنی بیگم صاحبہ کی عمر تو چھپاتے ہیں پھر ان کی شہادت ہی کیا؟ باقی رہے

حافظ جی ان کی آنکھیں پڑھتے پڑھتے جاتی رہیں۔ ان کو دن کو اونٹ تو سوچتا ہی نہیں۔

بھلا سر شام دونوں وقت ملتے ناخون کے برابر چاند کیا سوچھے گا۔
 آزاد: حضرت، میں نے اور میاں خوبی نے کل شام کو اپنی آنکھوں دیکھا۔
 نواب: تو تین گواہیاں معتبر ہوئیں۔ ہماری عید تو ہر طرح آج ہے۔
 اتنے میں فتن پر سے آبادی جان مسکراتی ہوئی آئی۔
 نواب: آئیے آئیے آپ کی عید کس دن ہے؟
 آبادی جان: کیا کوئی بھاری جوڑا بنوا رکھا ہے؟ پھٹے سے منہ شرم نہیں آتی۔
 نواب:

عید قرباں ہے یہی دن تو ہے قربانی کا
 آج تلوار کے مانند گلے مل قاتل
 ہم کو کیا یہاں تو تیسوں روزے چٹ کیے بیٹھے ہیں۔ دو وقتہ پلاؤ اڑتا تھا۔ یہ فکر تو ان
 کو ہوگی جو دین کا ٹوکرا سر پر لادے لادے پھرتے ہیں۔
 آبادی: انھیں لچھنوں تو دوزخ میں جاؤ گے۔
 نواب: خیر، ایک تسکین تو ہوئی۔ آپ سے تو وہاں ضرور گلے ملیں گے۔
 مصاحب: سبحان اللہ، کیا خوب سوچھی، واللہ خوب سوچھی! کیا گرما گرم لطیفہ کہا ہے۔
 اتنے میں چمپا لونڈی اندر سے گھبرائی ہوئی آئی۔ لٹ گئی، لٹ گئی! اے حضور چوری
 ہو گئی۔ سب موس لے گیا۔

نواب: کیا کیا، چوری ہو گئی! کب؟
 چمپا: رات کو، اور کب؟ اس وقت جو بیگم صاحبہ کوٹھری میں جاتی ہیں تو روشنی دیکھتے ہی
 آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ جا کر دیکھتی ہیں تو ایک بلوکا، کپڑے لٹے سب تتر بتر پڑے
 ہیں۔
 مصاحب: اے خداوند، کل تو ایک بجے تک یہاں دربار گرم رہا۔ معلوم ہوتا ہے کوئی
 پہلے ہی سے گھسا بیٹھا تھا۔

نواب: ذری ہمار تلوار تو لانا بھی! احتیاط شرط ہے۔ شاید چمپا بیٹھا ہو۔
 تلوار لے کر گھر میں گئے تو دیکھتے ہیں بیگم صاحبہ ایک نازک پلنگڑی پر سر پکڑے بیٹھی
 ہیں، اور لونڈیاں سمجھا رہی ہیں کہ نواب کی سلامتی رہے ایک سے ایک بڑھیا جوڑا بن جائے

گا۔ آپ گھبراتی کاہے کو ہیں؟ نواب نے جا کر کوٹھری کو دیکھا اور تلوار ہاتھ میں لیے پیٹنرے بدلتے ہوئے گھر بھر میں معائنہ کیا پھر بیگم سے بولے، ہمارا لہو پیسے جو روئے۔ آخر یہ رونا کاہے کا، مال گیا، گیا۔

لوٹڈی: ہاں سچ تو فرماتے ہیں۔ جان کی سلامتی رہے مال بھی کوئی چیز ہے؟ بیگم: آج عید کے دن خوشیاں مناتے، ڈونمیاں آتیں، مبارک بادیاں گاتیں، دن بھر دھا چوڑی مچتی، رات کو رت جگا کرتے، سو آج یہ نیا گل کھلا۔ مگر گہنے کی صندوق چھوڑ گیا، اتنا احسان کیا۔ ابھی تک کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔

نواب: ہمارے سر کی قسم، لو اٹھو، منہ دھو ڈالو۔ عید مناؤ، ہمارا ہی جنازہ دیکھے جو چوری کا غم کرے۔ دو ہزار کوئی بڑی چیز ہے۔

آخر بہت کہنے سننے پر بیگم صاحبہ انھیں۔ لوٹڈی نے منہ دھلایا۔ نواب صاحب نے کہا تمہیں واللہ ہنس تو دو۔ وہ ہونٹ پر ہنسی آئی! دیکھو مسکراتی ہو۔ وہ ناک پر آئی۔

بیگم صاحبہ کلکھلا کر ہنس پڑیں اور گھر بھر میں قہقہے پڑنے لگے۔ یوں بیگم صاحبہ کو ہنسا کر نواب صاحب باہر نکلے، تو مصاحب، حوالی موالی خدمت گار غل مچانے لگے، حضور کچھ تو بتائیے، یہ معاملہ کیا ہے؟ آخر کدھر سے چور آیا؟ کوئی کہتا ہے حضور بے گھر کے بھدی کے چوری نہیں ہوتی۔ ہم کو اس جشن پر شک ہے۔ جشن اندر سے گالیاں دے رہی ہے۔ اللہ کرے جھوٹے پر بجلی گرے، آسمان پھٹ پڑے۔ کسی نے کہا۔ خداوند چوکیدار کی شرارت ہے۔ چوکیدار ہے کہ لاکھوں قسمیں کھاتا ہے۔ گھر بھر میں ہر بونگ مچا ہوا ہے۔ اتنے میں ایک مسخرے نے بڑھ کر کہا۔ حضور قسم ہے قرآن کی، ہمیں معلوم ہے۔ بھلا بے بھلا ہم پہچان گئے، ہم سے اڑ کر کوئی جائے گا کہاں؟

مصاحب: معلوم ہے تو پھر بتاتے کیوں نہیں؟ مسخرہ: اجی بتانے سے فائدہ کیا؟ مگر معلوم مجھ کو بیشک ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ غلط ہو تو ہاتھ ہاتھ بدلتے ہیں۔

نواب: ارے، جس پر تجھے شک ہے اس کا نام بتا کیوں نہیں دیتا۔ مصاحب: بتاؤ، تمہیں خدا کی قسم۔ کس پر تم کو شک ہے؟ آخر کس کو تاکا ہے؟ بھی ہم کو بچا دینا استاد۔

مخبرہ: (نواب صاحب کے کان میں) حضور یہ کسی چور کا کام ہے۔

مصاحب: کیا کہا حضور، کس کا نام لیا؟

نواب: (خس کر) آپ چپکے سے فرماتے ہیں یہ کسی چور کا کام ہے۔

لوگوں کے ہنسنے ہنسنے پیٹ میں ہل پڑ گئے۔ جسے دیکھو لوٹ رہا ہے۔ اتنے میں ریل کے ایک چراسی نے آکر تار کا لفافہ دیا۔ لفافہ دیکھتے ہی نواب صاحب کا چہرہ فق ہو گیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بولے بھی کسی انگریزی داں کو بلاؤ اور تار پڑھاؤ۔ خدا جانے کہاں سے گولا آیا ہے۔

مصاحب: کیوں میاں جوان، یہ تار بڑے صاحب کے دفتر سے آیا ہے نہ؟

چراسی: نہیں ریل گھر سے آوا ہے۔

مصاحب: واہ رے انگریز و اللہ جانتا ہے اپنے فن کے استاد ہیں۔ اور سینے جلدی کے لیے اب تار کی خبر بھی ریل پر آنے لگی۔ واہ رے استاد، عقل کام نہیں کرتی۔

حافظ: خدا جانے یہ تار بولتا کیوں کر ہے؟ آخر تار کے تو جان نہیں ہوتی۔

خدمت گار ایک انگریزی داں کو لے آیا۔ تار پڑھا گیا، تو معلوم ہوا کہ کسی نے مرزاپور سے پوچھا ہے کہ عید آج ہے یا کل ہوگی؟

مصاحب: یہ تو فرمائیے بھیجا کس نے؟

بابو: ثار حسین نے۔

نواب: سمجھ گیا۔ مرزاپور میں ہمارے ایک دوست ہیں ثار حسین۔ انھیں نے تار بھیجا ہوگا۔ اس کا جواب کسی سے لکھوائیے جس سے آج ہی پہنچ جائے۔ ایک روپے دو روپے جو خرچ ہو داروغہ سے دلوا دو۔ اور میاں ندرت کو تار گھر بھیجو اور کہو کہ اگر بابو کچھ مانگیں تو دے دیتا۔ مگر اتنا کہہ دینا کہ خبر ضرور پہنچے۔ ایسا نہ ہو کہیں راہ میں رک رہے، تو غضب ہی ہو جائے۔

میاں ندرت لکھنؤ کے آدمی، نخاس کے باہر عمر بھر قدم ہی نہیں رکھا۔ وہ کیا جانیں کہ تار گھر کس بلا کا نام ہے۔ راہ میں ایک ایک سے پوچھتے جاتے ہیں کیوں بھی تار گھر کہاں ہے؟ آخر کار ایک چراسی نے کہا۔ کل کی برق کے سامنے ہے۔ میاں ندرت گھبرا رہے تھے، برے پھنسنے یار، تار گھر میں نہ جانے کیا واردات ہو۔ ہم انگریزی قانون وانون نہیں جانتے۔

دیکھیں آج کیا مصیبت پڑتی ہے؟ خیر، خدا مالک ہے۔ چلتے چلتے کوئی دو گھنٹے میں عیش باغ پہنچے۔ یہاں سے پتہ پوچھتے پوچھتے چلے حسین گنج۔ وہاں ایک بابو سڑک پر کھڑے تھے۔ ان سے پوچھا کیوں بابو جی تار گھر کہاں ہے؟ انھوں نے کہا سامنے چلے جاؤ۔ پھر پلٹے بابو جی ایک روپیہ لایا ہوں اور کھوانا یہ ہے کہ آج عید سنیوں کی ہے کل شیعوں کی ہوگی۔ بھلا وہاں بیٹھا رہوں؟ جب خبر پہنچ جائے، تب آؤں؟ بابو نے کہا ایسا کچھ ضروری نہیں، خیر تار گھر پہنچے تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے کہ دیکھیے جان کیوں کر بچتی ہے۔ تھوڑی دیر بھانک پر کھڑے رہے اور وہاں سے مارے ڈر کے بیرنگ واپس۔ راہ میں دونوں روپے انھوں نے بھنائے اور بیوی کے لیے بیچ میل مٹھائی چکنیل میں لے چلے۔ راستے میں یہی سوچتے رہے کہ نواب سے یوں چمکہ چلیں گے یوں جھانسا دیں گے۔ چین کرو۔ استاد اب تمہارے پوراہہ ہیں۔ حلوائی کی دوکان اور دادا جی کا فاتحہ گھر میں خوش خوش گھسے تو بیوی دیکھتے ہی کھل گئیں۔ جھپٹ کر چکنیل ان کے ہاتھ سے چھینی۔ دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ برنی پر چاندی کا ورق لگا ہوا، امرتیاں تازہ، لڈو گرما گرم۔ پیڑے وہ جو متھرا کے پیڑوں کے دانت کھٹے کر دیں۔ دو تین لڈو اور ایک برنی تو دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر گئیں۔ پیڑا اٹھانے ہی کو تھیں کہ میاں ندرت جھلا کر پہنچا پکڑ لیا اور بوسے، ارے بس بھی تو کروگی؟ ایک لڈو کھایا، میں کچھ نہ بولا، دوسرا نکالا میں چپ چاپ دیکھا کیا۔ تیسرے لڈو پر ہاتھ بڑھایا برنی کھائی اور اب چلیں پیڑے پر ہاتھ ڈالنے۔ اب کھانے پینے کی چیز میں ٹوکے کون، اتنی بڑی لومڑ ہو گئیں مگر بلو ہی بنی رہیں۔ مریکوں کی طرح مٹھائی پر گر پڑنے کے کیا معنی؟ دو پیالیاں لاؤ، افیم گھولو پیو، جب خوب نئے گٹھیں تو مٹھایاں چکھو۔ خدا کی قسم، یہ افیم بھی نعمت کی ماں کا کلیجہ ہے۔

بیوی: (نک کر) بس، نعمت کی ماں کا کلیجہ تمہیں کھاؤ۔ کھاؤ، چاہے بھاڑ میں جاؤ۔ واہ آج اتنے بڑے تیوہار کے دن مٹھائی کیا لائے کہ دماغ ہی نہیں ملتا۔ موتی کی سی آب اتار لی۔ ایک پیڑے کے خاطر پہنچا دھر کے مروڑ ڈالا۔

اتنے میں باہر سے آواز آئی، میاں ندرت ہیں؟

بیوی: سنتے ہو یا کانوں میں ٹھینٹھیاں ہیں؟ ایک آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا ہے، دروازے کو چول سے نکالے ڈالتا ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟ کہیں چوری کر کے تو نہیں آئے ہو؟

ندرت : ذرا آہستہ آہستہ باتیں کرو۔

بیوی : اے ہے سچ کہیے گا۔ ہم تو خوب غل چائیں گے۔ ماما، ہم پردے میں ہوئے جاتے ہیں۔ جا کر ان سے کہہ دو گھر میں گھسے بیٹھے ہیں۔

ندرت : نہیں نہیں، یہ دل لگی اچھی نہیں۔ کہہ دو نواب صاحب کے یہاں گئے ہیں۔ ماما : (باہر جا کر) میاں کیا غل چا رہے ہو؟ میں تو سمجھی کہیں سے دوڑ آئی ہے۔ وہ تو سورے نواب صاحب کے یہاں گئے تھے، ابھی آئے نہیں۔ جو ملیں تو بھیج دیجیے گا۔

پکارنے والا : یہ کیسی بات؟ نواب صاحب کے یہاں سے تو ہم ابھی ابھی آرہے ہیں۔ وہاں ڈھونڈھیں مچی ہوئی ہے کہ چل کہاں دیے۔ اچھا، ابھی صاحب سے کہو آج عید کے دن دروازے پر آئے ہیں کچھ سویاں ویوئیاں تو کھلائیں۔ ہم تو بے تکلف آدمی ہیں۔ تقاضا کر کے دعوت لیتے ہیں۔

ماما نے اندر سے لے جا کر باہر برآمدے میں ایک موڑھا ڈال دیا۔ ادھر میاں بیوی میں تکرار ہونے لگی۔

میاں : اجی، ٹال بھی دو، ایسے ایسے مفت خورے بہت آیا کرتے ہیں۔ ماما، تم بھی پاگل ہی رہیں۔ موڑھا ڈالنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟
بیوی : اے واہ! ہم تو ضرور خاطر کریں گے۔ یہ اچھا کہ نواب کے یہاں جا کر ہم کو گنوار بنائے؟ اس میں تمھاری ناک نہ کٹے گی۔

بیوی نے ایک طشتری میں پانچ چھ ڈلیاں مٹھائی کی قرینے سے لگا کر اس پر ریشمی ہرا رومال ڈھک دیا اور ماما سے کہا جاؤ دے آؤ۔ میاں ندرت کی روح پر صدمہ ہوا کہ چار پانچ ڈلی تو بیوی باتیں کرتے کرتے چکھ گئیں۔ اور پانچ چھ اب نکل گئیں۔ غضب ہی ہو گیا۔ ماما مٹھائی لے کر چلی، تو ڈیوڑھی میں دو لڈو چپکے سے نکال کر ایک طاق میں رکھ دیے۔ اتفاق سے ایک چھوکر ا دیکھ رہا تھا۔ جیسے ماما باہر گئی ویسے ہی دونوں لڈو مزے سے کھا گیا۔ چلیے چور کے گھر میں مور بیٹھا۔ مصاحب نے رومال ہٹایا، تو کہا، واہ ابھی صاحب تو بھائی صاحب سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ یہ ہاتھی کے منہ میں زیرہ، خیر، پانی تو لاؤ۔ حضرت نے مٹھائی کھائی اور پانی پیا، تو پان کی فرمائش کی۔ بیوی نے اپنے ہاتھ سے دو گوریاں بنائیں۔ مصاحب نے چکھی تو حقہ مانگا۔ ندرت نے کہا۔ دیکھا نہ ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔ مٹھائی لاؤ، پان کھلاؤ، پانی

پلاؤ، حقہ بھر لاؤ، گویا بابا کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ ان موجیوں کی تو قبر تک سے میں واقف ہوں۔ اور ایک اس پر کیا موقوف ہے۔ نواب کے یہاں جتنے ہیں سب گر گئے، مفت خور، پرایا مال تاکنے والے۔ ماما جا کر کہہ دو حقہ یہاں کوئی نہیں چیتا۔ لیکن بیوی نے حقہ بھرا کر بھیج ہی دیا۔ جب پی چکے تو باہر سے آواز دی کہ ماما چار پائی یہاں موجود ہے ذری غلچیا دے جائیے گا۔ اب ٹھیک دوپہر میں کون اتنی دور جائے۔ ذرا کمر سیدھی کر لیں۔ تب تو میاں ندرت خوب ہی جھلائے۔ آخر شیطان کا منصوبہ کیا ہے؟ دیکھ رہا ہے کہ مالک گھر میں نہیں ہے۔ پھر یہ دروازے پر چار پائی پر سونا کیا معنی؟ اور مجھ سے اس سے کہاں کا ایسا یارانہ ہے کہ آتے ہی بھابھی صاحب سے فرمائش ہونے لگیں۔

ادھر ماما ڈیوڑھی میں گئی کہ لڈو چکے چکے کھائے۔ طاق میں ڈھونڈھ مارا، پر لڈوؤں کا کہیں پتہ نہیں۔ چھوکرے نے پوچھا، ماما وہاں کیا ڈھونڈھ رہی ہو؟ وہ تو چوہا کھا گیا۔ بچ کہنا کیسی ہوئی؟ چوہے نے تمہارے اچھے کان کترے؟ مصاحب : ماما جی، ذری دری دے جائیے۔ ماما : یہاں دری دری نہیں ہے۔

مصاحب : ہم جانتے ہیں بڑے بھائی کہیں اس وقت عید ملنے گئے ہیں۔ بس سمجھ جائیے۔

ندرت نے کہا : خوش ہو کس؟ کچھ سمجھیں بھی؟ اب یہ اس فکر میں ہیں کہ تم کو ہم کولڑوا دیں۔ اور مٹھائیاں بھیجو، گھوریاں چکھاؤ۔

جب میاں مصاحب چمپت ہوئے تو میاں ندرت بھی چٹکیں کی طرف بڑھے اور افیم کی پینک میں خوب چمک کر مٹھائی چکھی۔ پھر چلے نواب کے گھر۔ قدم قدم پر فقرے سوچتے جاتے ہیں۔ بارے داخل ہوئے تو لوگوں نے آسمان سر پر اٹھایا۔

نواب : شکر ہے زندہ تو بچ! یہ آپ اب تک رہے کہاں آخر؟

مصاحب : حضور، تار گھر تو یہ سامنے ہے۔

حافظ : ہاں اور نہیں تو کیا؟ بات کرتے تو آدمی پہنچتا ہے۔

روشن علی : کون، مجھ سے کہیے تو اتنی دیر میں اٹھارہ پھیرے کروں۔

ندرت : ہاں بھائی، گھر بیٹھے جو چاہے کہہ لو، کوئی جائے تو آئے دال کا بھاء معلوم ہو۔

چلتے چلتے آندھی روک آجاتا ہے۔ بکری مرگئی اور کھانے والے کو مزہ نہ آیا آپ لوگ تھان کے قریب ہیں۔ کہنے لگے، دو قدم پر ہے۔ یہاں سے گئے سعادت گنج، وہاں سے دھنیا مہری کے پل، وہاں سے عیش باغ، وہاں سے گنیش گنج، وہاں سے امین آباد ہوتے ہوئے تارکھر پہنچے۔ دم ٹوٹ گیا، شل ہو گئے، مر گئے، نہ کھانا نہ دانہ۔ آپ لوگ بیٹھے بیٹھے یہاں جو چاہے فرمائیں، کہنے اور کرنے میں فرق ہے۔

نواب: تو اس ٹھانیں ٹھانیں سے کیا واسطہ، یہ کیسے خبر پہنچی کہ نہیں؟

ندرت: خدانند، بھلا میں اس کا کیا جواب دوں؟ خبر دے آیا۔ بابو نے میرے سامنے کھٹ کھٹ کیا، صاحب نے روپے لیے چھڑاسیوں کو انعام دیا۔ چار روپے اپنے جیب سے دینے پڑے۔ وہ تو کہیے وہاں میرے ایک جان پہچان کے نکل آئے نہیں بیرنگ واپس آنا پڑتا۔

نواب: خیر، تسکین ہوئی، اب فرمائیے اتنی دیر کہاں ہوئی؟

ندرت: خدانند، جلدی کے مارے بگدھی کرائے کر کے گیا تھا، لوٹی بار اس نے وہ پلٹا کھایا کہ میں تو سمجھا بس کھل ہی گیا۔ مگر خدا کارساز ہے گرا تو لیکن بچ گیا۔ کوئی گھنٹے تک کوچ وان یم ہی درست کیا کیا۔ اس سے دیر ہوئی حضور اب گھر جاتا ہوں۔

نواب: ارے بھئی، کھانا تو کھاتے جاؤ۔ اچھا، چار روپے وہ ہوئے اور بگدھی کے کرائے کے بھی کوئی تین روپے ہوئے ہوں گے؟ سات روپے داروغہ سے لے لو۔

ندرت: نہیں خدانند جھوٹ نہیں بولوں گا۔ چاہے فائدہ کروں مگر کہوں گا سچ ہی۔ یہی تو غلام میں جو ہر ہے۔ دو روپے اور پانچ پیسے دیے۔ دیکھیے، خدا کو منہ دکھانا ہے۔

نواب: داروغہ، ان کو دس روپے دے دو۔ سچ بولنے کا کچھ انعام بھی تو دوں۔

(30)

دوسرے دن صبح کو نواب صاحب زنان خانے سے نکلے تو مصاحبوں نے جھک جھک کر سلام کیا۔ خدمت گار نے چائے کی صاف ستھری پیالیاں اور چمچے لا کر رکھے۔ نواب نے ایک ایک پیالی اپنے ہاتھ سے مصاحبوں کو دی اور سب نے گرم گرم دودھیا چائے اڑائی شروع کی۔ ایک ایک گھونٹ پیتے جاتے ہیں اور گپ بھی اڑاتے جاتے ہیں۔

مصاحب: حضور، کشمیری خوب چائے تیار کرتے ہیں۔

حافظ: ہماری سرکار میں جو چائے تیار ہوتی ہے ساری خدائی میں تو بنتی نہ ہوگی۔ ذرا رنگ تو دیکھیے۔ ہندو بھی دیکھے، تو منہ میں پانی بھر آئے۔

روشن علی: قربان جاؤں ایسی چائے تو بادشاہ کے یہاں بھی نہیں بنتی تھی۔ خدا جانے میاں رحیم کہاں سے نسخہ پا گئے۔ مگر ذرا تلخی باقی رہ جاتی ہے۔

رحیم: سبحان اللہ! آپ تو بادشاہوں کے یہاں چائے پی چکے ہیں، اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ چائے میں تلخی نہ ہو تو وہ چائے ہی نہیں۔

خدمت گار: خداوند، شیودین حلوائی حاضر ہے۔

نواب: داروغہ جی، اس حلوائی کا حساب کر دو، اور سمجھا دو کہ اگر خراب یا سڑی ہوئی پاسی منضائی بھیجی تو اس سرکار سے نکال دیا جائے گا۔ پرسوں برنی خراب بھیجی تھی مگر میں شکایت کرتی تھیں۔

داروغہ: سنئے ہو شیودین؟ دیکھو، سرکار کیا فرماتے ہیں؟ خبردار جو سڑی گلی منضائی بھیجی۔ اب تم نے نمک حرامی پر کمر باندھی ہے۔ کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے۔

حلوائی: نہیں خداوند، اول مال دوں اول، چاشنی ذرا بہت آگئی، تو دانا کم پڑا۔ کڑی ہوگئی۔ چاشنی کی گولی دیر میں دیکھی، نہیں تو اس دوکان کی برنی تو شہر بھر میں مشہور ہے۔ وہ لڑتی ہوتی ہے کہ ہونٹ بندھنے لگتے ہیں۔

داروغہ: چلو، تمہارا حساب کر دیں، لے بتلاؤ، کتنے دن سے خرچ نہیں پایا اور تمہارا کیا

آتا ہے؟

حلوائی: اگلے مہینے میں 25 اور کچھ آنے کی آئی تھی۔ اور اب کی 10 تاریخ انگریزی تک کوئی ستر یا اتنی کی۔

داروغہ: اچی تم تو گدے بازیاں کرتے ہو! ستر یا اسی، سو یا پانچ سو، اس مہینے میں اتنی اور اس مہینے میں اتنی۔ یہ بکھیزا تم سے پوچھتا کون ہے؟ ہم سے تو بس گھڑی بتا دو کتنا ہوا؟

حلوائی: اچھا، حساب تو کر لوں (تھوڑی دیر کے بعد) بس، 142 روپے اور دس آنے دیجیے۔ چاہے حساب کر لیجیے، بولتا جاؤں۔

داروغہ: اچی تم کوئی نئے تو ہو نہیں۔ بتاؤ اس میں یاروں کا کتنا ہے؟ سچ بولنا لالہ (پیٹھ

ٹھونک کر) آؤ، وارے نیارے ہوں کیوں ہے نا؟

حلوئی: بس، سو ہم کو دے دو بیالیس تم لے لو۔ سیدھا سیدھا میں تو یہ جانتا ہوں۔
داروغہ: اچھا، منظور، مگر بیالیس کے باون کرو۔ ایک سو تمہارے، باون ہمارے۔ سچ کہتا
دونوں مہینوں میں چالیس کی مٹھائی آئی ہوگی یا کم؟

حلوئی: اجی حضور، اب اس مجید سے آپ کو کیا واسطہ؟ آپ کو آم کھانے سے غرض ہے
یا پیڑ گننے سے۔ سچ سچ یہ کہ سب ملا کر اڑتیس روپے کی آئی ہوگی۔ مل وزن میں مار دیتا
ہوں۔ سیر بھر لڈو مانگ بیجھ، ہم نے پاؤ سیر کم کر دیے۔

داروغہ: ادھ اس کی نہ کہیے یہاں اندھیر گری چوہٹ راج ہے۔ یہ دماغ کسے کی تولنے
بیٹھے۔ میاں لکھ لوٹ بیوی ان سے بڑھ کر۔ دس کے پچاس لو اور سیر کے تین پاؤ بھیجیو۔
مزے ہیں۔ اچھا یہ سو روپے گن لو اور ایک سو باون کی رسید ہمیں دو۔

حلوئی: یہ مول تول ہے۔ سو اور پانچ ہم لیں اور باقی حضور کو مبارک رہیں۔

اب سینے، میاں خوبی نے یہ ساری باتیں سن لیں۔ جب شیودین چلا گیا تو بڑھ کر
بولے، اجی حضرت آداب عرض ہے۔ کہیے اس میں کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟ یا باون کے
باون خود ہی ہضم کر جاؤ گے۔ اور ڈکار تک نہ لو گے؟ اب ہمارا اور آپ کا سا جھانہ ہوگا تو بری
ٹھہرے گی۔

داروغہ: کیا؟ کس سے کہتے ہیں آپ! یہ سا جھانہ! جھنگ تو نہیں پی گئے ہو کہیں؟ یہ
کیا واپسی تباہی بک رہے ہو؟ یہاں بیہودہ بکنے والوں کی زبان کھینچ لی جاتی ہے۔ تم نکلز گدوں
کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟

خوبی: (کمر کس کر) او گیدی، قسم خدا کی اتنی کرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرو۔ مجھے بھی
کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو؟ میں آدمی کو دم کے دم میں سیدھا بنا دیتا ہوں۔ کسی اور بھر سے نہ
بھولیے گا۔ کیا خوب، اڑتیس کے ڈیڑھ سو دلوائے، پچاس خود اڑائے اور اوپر سے خزا تا ہے
مردک۔ ابھی تو نواب صاحب سے سارا کچا چٹھا جڑتا ہوں۔ کھڑے کھڑے نہ نکال دیے جاؤ
تو سہی۔ ہم بھی تمام عمر رئیسوں کی ہی صحبت میں رہے ہیں۔ گھاس نہیں چھیلا کیے ہیں۔ بائیں
ہاتھ سے بیس روپے ادھر رکھ دیجیے۔ بس اسی میں خیر ہے، ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔ اب
سوچتے کیا ہو؟ ذرا چھیں چڑ کرو گے، تو قلعہ کھول دوں گا۔ بولو، اب کیا رائے ہے؟ بیس روپے

سے غم کھاؤ گے یا ذلت اٹھاؤ گے؟ ابھی تو کوئی کانوں کان نہیں سنے گا، پیچھے البتہ بڑی ٹیڑھی کھبر ہے۔

داروغہ : واہ ری پھوٹی قسمت! آج صبح صبح بوہی تو اچھی ہوئی تھی اچھے کام نہ دیکھ کر اٹھے تھے، مگر حضرت نے اپنی منوں صورت دکھائی۔ اب ہاؤن میں سے آپ کو ہمیں روپے رقم کی رقم نکال دیں تو ہمارے پاس کیا خاک رہے؟ اور ہاں خوب یاد آیا ہاؤن کس مردود کو ملے۔ سینتالیس ہی تو ہمارے ہتھے چڑھے۔ دس تم بھی لے لو (گردن میں ہاتھ ڈال کر) مان جاؤ استاد۔ ہمیں ضرورت تھی اس سے کہا، ورنہ کیا بات تھی۔ اور پھر ہم تم زعمہ ہیں تو سیکڑوں لوٹیں گے میاں، یہ ہاتھ دونوں لوٹنے ہی کے لیے ہیں یا کچھ اور؟

خوبی : دس میں تو ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ اچھا بھئی پندرہ دو۔

آخر داروغہ نے مجبور ہو کر پندرہ روپے میاں خوبی کو نذر کیے اور دونوں آدمی جاکر محفل میں شریک ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر بیٹھے ہوں گے کہ چوب دار نے آکر کہا حضور، وہ بزاز آیا ہے جو دلائی کپڑا بیچتا ہے۔ کل بھی حاضر ہوا تھا مگر اس وقت موقع نہ تھا میں نے عرض نہ کیا۔

نواب : داروغہ سے کہو مجھ سے کیا گھڑی گھڑی آکے پرچا جڑتے ہو (داروغہ سے) آؤ بھئی، اس کو بھی لگے ہاتھوں بھگت ہی دو۔ جھنجھٹ کیوں باقی رہ جائے۔ کچھ اور کپڑا آیا ہے ولایت سے؟ آیا ہو تو دکھاؤ۔ مگر بابا مول کی سند نہیں۔

بزاز : اب کوئی دوج تک سب کپڑا آجائے گا۔ اور حضور ایسی باتیں کہتے ہیں۔ بھلا اس ڈیوڑھی پر ہم نے کبھی مول تول کی بات کی ہے آج تک؟ اور یوں تو آپ امیر ہیں، جو چاہے کہیں مالک ہیں ہمارے۔

داروغہ اور بزاز چلے۔ جب داروغہ صاحب کی کھیریل میں دونوں جاکر بیٹھے تو میاں خوبی بھی ریگتے ہوئے چلے اور دن سے موجود۔ داروغہ نے جوان کو دیکھا تو کاٹو تودن میں لہو نہیں، مردنی سی چہرے پر چھا گئی۔ چپ! ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ سمجھے کہ یہ خوبی ایک ہی کانیاں ہے۔ اس سے خدا پناہ میں رکھے۔ صبح کو تو مردود نے ہتھے ہی پر ٹوک دیا اور پندرہ پٹیلے۔ اب جو دیکھا کہ بزاز آیا تو پھر موجود۔ آج رات کو اس کی ٹانگ نہ توڑی ہو تو سہی۔ مگر پھر سوچے کہ گڑ سے جو مرے، تو زہر کیوں دیں۔ آؤ، اس وقت چنی چنا کریں پھر سمجھا جائے

گا۔ بولے، آؤ بھائی جان، ادھر موڑھے پر بیٹھو۔ اچھی طرح بھی؟ حقہ لاؤ، آپ کے لیے۔
 بزاز صدر بازار کا رہنے والا ایک ہی استاد تھا۔ تاڑ گیا کہ اس کے بیٹھنے سے میرا اور
 داروغہ کا مطلب خبط ہو جائے گا۔ کسی تدبیر سے اس کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔ پہلے تو کچھ دیر
 داروغہ سے اشاروں میں باتیں ہوا کیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بزاز نے کہا میاں صاحب
 آپ کو یہاں کچھ کام ہے؟

خوبی: تم اپنی کہو لالہ جی، ہم سے کیا واسطہ؟

بزاز: تم یہاں سے اٹھ جاؤ۔ اٹھتے ہو کہ میں دوں ایک لات اوپر سے۔

خوبی: او گیدی، زبان سنہال، نہیں تو اتنی کرو لیاں بھونکوں گا کہ خون خرابہ ہو جائے گا۔

بزاز: انھوں، پھر میں؟

خوبی: اٹھ کے تماشا بھی دیکھ لے!

بزاز: بیدھا ہے کیا؟

خوبی: واللہ جو بے تے کیا تو اتنی کرو لیاں۔

خوبی کچھ اور کہنے ہی کو تھا کہ بزاز نے بیٹھے بیٹھے منہ دبا دیا اور ایک چپت جمائی۔ چلیے
 دونوں گٹھ گٹھ۔ اب داروغہ جی کو دیکھیے۔ بچ بچاؤ کس مزے سے کرتے ہیں کہ خوبی کے
 دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کمر دبائے ہوئے ہیں اور بزاز اوپر سے ان کو ٹھوک رہا ہے۔ داروغہ
 صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر غل مچائے جاتے ہیں کہ میاں کیوں لڑے مرتے ہو؟ بھئی دھول دھپے
 کی سند نہیں۔ خوبی اپنے دل میں جھلا رہے ہیں کہ اچھے میر فیصلی بنے۔ اتنے میں کسی نے
 نواب صاحب سے جا کر کہہ دیا کہ میاں خوبی، داروغہ اور بزاز تینوں گٹھے پڑے ہیں۔ اسی
 وقت بزاز بھی دوڑا ہوا آیا اور فریاد کی کہ حضور ہم آپ کو یہاں تو سستا مال دیتے ہیں مگر یہ
 خوبی حساب کتاب کے وقت سر پر سوار ہو گئے۔ لاکھ لاکھ کہا کیے کہ بھی ہم اپنے مال کا بھاؤ
 تمہارے سامنے نہ بتائیں گے مل انھوں نے ہاری مانی نہ جیتی، اور اگلے پنجے جھاڑ کے چپت
 پٹ کی ٹھہرائی۔ کمزور مار کھانے کی نشانی۔ میں نے وہ گمدا دیا کہ چھٹی کا دودھ یاد کرتے
 ہوں گے۔ داروغہ بھی روتے پیٹتے آئے کہ دہائی ہے چار پائی کی ہٹی توڑ ڈالی، خاص دان توڑ
 ڈالا اور سیکڑوں کی گالیاں دیں۔

میاں خوبی ایسے دھیائے گئے اور اتنی بے بھاؤ کی پڑی کہ بس، کچھ پوچھے نہیں۔

نواب نے پوچھا آخر جھگڑا کیا تھا؟

داروغہ: حضور، یہ خوبی بڑے ہی تیکھے آدمی ہیں۔ بات بات پر کڑی بھونکتے ہیں اور گیدی تو نکیہ کلام ہے۔ اس وقت لالہ بلدیو سے ہی بھڑ پڑے۔ وہ تو کہیے میں نے بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ ایک آدھ کا سر ہی پھوٹ جاتا۔

بزاز: بڑے بھلے آدمی ہیں۔ داروغہ جی بیچارے نہ آجائیں تو کپڑے وپڑے پھاڑ ڈالیں۔

خوبی: تو اب روتے کا ہے کو؟ اب یہ دکھڑا لے کے کیوں بیٹھے ہو!

نواب: لپا ڈگی تو نہیں ہوئی۔

خوبی: نہیں حضور، شریفوں میں کہیں ہاتھ پائی ہوتی ہے بھلا؟ ہم نے ان کو لکارا، انھوں نے ہم کو ڈانٹا، مگر کندے تول تول کر دونوں رہ گئے۔ بھلے مانس پر ہاتھ اٹھانا کوئی دل لگی ہے۔

خیر، میاں خوبی تو محفل میں جا کر بیٹھے اور ادھر لالہ بلدیو اور داروغہ صاحب حساب کرنے گئے۔

داروغہ: ہاں بھئی، بتاؤ۔

لالہ: ابی بتائیں کیا، جو چاہے دلوا دو۔

داروغہ: پہلے یہ بتاؤ، تمہارا آتا کیا ہے؟ سو، دوسو، دس، بیس، پچاس جو ہو، کہہ دو۔

لالہ: داروغہ جی، آج کل کپڑا بڑا مہنگا ہے؟

داروغہ: لالہ تم نرے گاودی ہی رہے۔ ہم کو مہنگے سستے سے کیا واسطہ؟ ہم کو تو اپنے حق سے مطلب، تم تو اس طرح کہتے ہو جیسے ہماری گرہ سے جاتا ہے۔

لالہ: پھر تو 753 نکالے۔

داروغہ: بس، ارے میاں، اب کی اتنے دنوں میں سات ساڑھے سات سو ہی کی نوبت

آئی؟

لالہ: جی ہاں، آپ سے کچھ پردہ تھوڑے ہی ہے۔ دو سو اور پچپن روپے کا کپڑا آیا ہے اندر باہر سب ملا کر۔ مگر پرسوں نواب صاحب کہنے لگے کہ اب کی تو تمہارا کوئی پانچ چھ سو کا مال آیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایسے موقع پر چونکا گدھا پین ہے۔ وہ تو پانچ چھ سو بتاتے تھے،

میرے منہ سے نکل گیا حساب کیسے سے معلوم ہوگا۔ مل کوئی آٹھ سات سو کا آیا ہوگا۔ تو اب 753 ہی رکھیے۔ اس میں ہمارا اور آپ کا سمجھوتہ ہو جائے گا۔

داروغہ: اجی، سمجھوتہ کیسا، ہم تم کچھ دو تو ہیں نہیں، اور ہمارے تمہارے تو باپ دادا کے وقت سے دوستانہ ہے۔ پولو کتنے پر فیصلہ ہوتا ہے۔

لالہ: بس، دو سو چھپیس تو ہم کو ایک دیجیے، اور تین سو اور دیجیے اس کے بعد بڑھے سو آپ کا۔

داروغہ: (ہنس کر) اچھا بھی منظور، ہاتھ پر ہاتھ مارو۔ مگر 753 روپے چھ آنے کی رسید لکھو۔ جس سے معلوم ہو کہ آنے پانی سے حساب لیس ہے۔

لالہ: بڑے کا یاں ہو داروغہ جی! اجی 227 روپے چھ آنے کل آپ کا؟

خوبی: بلکہ آپ کے باپ کا۔

یہ آواز سن کر دونوں چونکے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ داروغہ کے حواس غائب۔ بزاز کے بدن میں خون کا نام نہیں۔ اتنے میں پھر آواز آئی۔ کہو کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟ تب دونوں کے رہے سہے ہوش اور بھی اڑ گئے۔

اب سینے: میاں خوبی کھرمل کے پچھواڑے کے ایک موکھے کی راہ سے سب سن رہے تھے۔ جب کل کارروائی ختم ہو گئی تو آواز لگائی۔ خیر داروغہ اور لالہ ہلدیو نے ان کو ڈھونڈ نکالا اور لٹو پٹو کرنے لگے۔

بزاز: ہمارا قصور پھر معاف کیجیے۔

داروغہ: اجی، یہ ایسے آدمی نہیں ہیں، یہ بیچارے کسی سے لڑنے بھڑنے والے نہیں۔ باقی لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ دل میں کدورت آئی اور صاف ہو گئی۔

خوبی: یہ باتیں تو عمر بھر ہوا کریں گی۔ مطلب کی بات فرمائیے۔ لاؤ کچھ ادھر بھی۔ داروغہ: جو کہو۔

خوبی: سو دلوائیے پورے۔ ایک سو لیے بغیر نہ ظلوں گا۔ آج تم دونوں نے مل کر ہماری خوب مرمت کی ہے۔

داروغہ: یہ تیس روپے تو ایک لیجیے اور یہ دس کا نوٹ۔ بس اور جو سیٹھ کیجیے تو اس سے بھی ہاتھ دھویئے۔

خوبی: خیر لائیے، چالیس ہی کیا کم ہیں۔

داروغہ: ہم سمجھتے تھے کہ بس ہی ہم ہیں مگر آپ ہمارے بھی گرو پیدا ہوئے۔

میاں خوبی اور داروغہ صاحب ہاتھ میں ہاتھ دیے جا کر محفل میں بیٹھے، گویا دونوں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ مگر داروغہ کا بس چلتا تو خوبی کو کالے پانی ہی بھیج دیتے، یا زندہ چنوا دیتے۔ محفل میں لطیفے اڑ رہے تھے۔

ندرت: حضور آج ایک آدمی نے ہم سے پوچھا کہ اگر دریا میں نہائیں تو منہ کس طرف رکھیں۔ ہم نے کہا کہ ابھی اگر عقل مند ہو تو اپنے کپڑوں کی طرف رکھو، ورنہ چور اٹھالے جائے گا اور آپ غوطے ہی کھاتے رہ جائیں گے۔

حافظ: پرانا لطیفہ ہے۔

آزاد: ایک حکیم نے کہا کہ جب تک میں بن بیاہ تھا، تو بیوی والے گونگے ہو گئے تھے اور اب جو شادی کر لی تو ایک ایک منہ میں سو سو زبائیں ہیں۔

اتنے میں گندھی نے آکر سلام کیا۔

نواب: داروغہ جی ان کو بھی بھگتا دو۔

داروغہ اور گندھی کھریل میں پہنچے تو داروغہ نے پوچھا کتنا عطر آیا؟

گندھی: دیکھیے، آپ کے یہاں تو لکھا ہوگا۔

داروغہ: ہاں، لکھا تو ہے مگر خدا جانے وہ کاغذ کہاں پڑا ہے؟ تم اپنی یاد سے جو جی میں آئے بتا دو۔

گندھی: 35 تو کل کے ہوئے اور 80 ادھر کے۔ بیگم صاحبہ نے اب کی عطر کی بھرمار ہی کر دی۔ قراہ کے قراہ خالی کر دیے۔

داروغہ: اچھا بھئی، پھر اس میں کسی کے باپ کا کیا اجارہ۔ شوقین ہیں، رئیس زادی ہیں، امیر ہیں۔ عطر انھیں کے لیے ہے یا ہمارے آپ کے لیے؟ اچھا تو کل 115 ہوئے نا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے؟ لوسو یہ ہیں اور تین لوٹ پانچ پانچ کے۔

گندھی: اچھا لیجیے، یہ عطر کی شیشی آپ کے لیے لایا ہوں۔

داروغہ: کس چیز کا ہے؟

گندھی: سو لیجیے تو معلوم ہو۔ خدا جانتا ہے 10 روپے تولے میں جھڑا جھڑا جا رہا ہے۔

میاں گندمی احمد روانہ ہوئے، ادھر دارودہ جی خوش خوش چلے، تو آواز آئی کہ استاد اس شیشی میں یاروں کا بھی حصہ ہے۔ پیچھے پھر کے دیکھتے ہیں تو میاں خوبی گھومتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

دارودہ: یار، تم نے تو بے طرح پیچھا کیا۔

خوبی: اب کی تو تم کو کچھ نہ ملا۔ مگر اس عطر میں سے آدمی شیشی لیں گے۔

دارودہ: اچھا بھئی، لے لینا۔ تم سے تو کور ہی دبی ہے۔ دونوں آدمی جا کر محفل میں پھر شریک ہو گئے۔

(31)

ایک دن پچھلے پھر سے کھٹلوں نے میاں خوبی کے ناک میں دم کر دیا۔ دن بھر کا خون جو تک کی طرح پی گئے۔ حضرت بہت ہی جھلائے، چیخ اٹھے، لانا کرولی، ابھی سب کا خون چوس لوں۔ یہ ہانک جو اوروں نے سنی تو نیند حرام ہو گئی۔ چور کا شک ہوا۔ لینا لینا جانے نہ پائے۔ سرائے بھر میں ہلچل مچ گیا۔ کوئی آنکھیں ملتا ہوا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے، کوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنی گٹھری کو دیکھتا ہے، کوئی مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ میاں خوبی نے جو چور چور کی آواز سنی، تو خود بھی غل مچانا شروع کیا۔ لانا میری کرولی۔ ٹھہرا! میں بھی آپہنچا۔ پینک میں سوچ رہی تھی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے، دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھاتے ہیں تو ارر دھوں۔ گرے بھی تو کہاں جہاں کہہار کے ہنڈے رکھے تھے۔ گرنا تھا کہ کئی ہنڈے پکنا چور ہو گئے۔ کہہار نے لکارا کہ چور چور۔ یہ اٹھنے ہی کو تھے کہ اس نے آکر دبوچ لیا اور پکارنے لگا دوڑو دوڑو چور پکڑ لیا۔ مسافر اور بھٹیاریے سب کے سب دوڑ پڑے۔ کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی لٹھ باندھے۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوبی۔ خوب بے بھاؤ کی پڑی۔ یار لوگوں نے تاک تاک کر زانے کے ہاتھ لگائے۔ خوبی کی سٹی بٹی بھول گئی، نہ کرولی یاد رہی نہ طمچ۔ جب خوب پٹ پٹا پٹے تو ایک مسافر نے کہا بھئی یہ تو خوبی معلوم ہوتے ہیں۔ جب چراغ جلایا گیا تو آپ دیکھ ہوئے نظر آئے۔ میاں آزاد سے کسی نے جا کر کہہ دیا کہ تمہارے ساتھی خوبی چورنی کی علت میں پھنسے ہیں، کسی مسافر کی ٹوپی چرائی تھی۔ دوسرے نے کہا نہیں نہیں یہ نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک کہہار کی ہانڈیاں چرانے گئے تھے۔ مل جاگ ہو گئی۔

میاں آزاد کو یہ بات کچھ جچی نہیں۔ سوچے، خوبی بچارے چوری چکاری کیا جائیں۔ پھر چوری بھی کرتے تو ہاڈیاں کی؟ دل میں ٹھان لی کہ چلیں اور خوبی کو بچا لائیں۔ چارپائی سے اترے ہی تھے تو دیکھا خوبی صاحب جھومتے چلے آتے ہیں اور بڑا ہاتھ جاتے ہیں۔ ہت تیری گیدی کی، بڑا آزاد بنا ہے۔ چارپائی پر پڑا خرخر کیا کیا اور ہماری خبر ہی نہیں۔

آزاد: خیر، ہم کو تو پیچھے گالیاں دینا پہلے یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے؟

خوبی: ہاتھ پاؤں! اجی، آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندے نے کیا کیا جو ہر دکھائے۔ پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے، پورے پچاس ایک کم نہ زیادہ اور میں پھلجھڑی بنا ہوا تھا۔ بس یہ کیفیت تھی کہ کسی کو انٹی دی دھم سے زمین پر، کسی کو کول پر لاد کر مارا۔ دو چار میرے رعب میں آکر قہر قہرا کے گر ہی تو پڑے۔ دس پانچ کی ہڈی پہلی چٹنا چور کر دی۔ جو سامنے آیا اسے نچا دکھایا۔

آزاد: کج؟

خوبی: خدائی بھر میں کوئی ایسا جیوٹ دار آدمی دکھا تو دیجیے۔

آزاد: بھئی، خدائی بھر کا حال تو خدا ہی کو خوب معلوم ہے۔ مگر اتنی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ آپ سا بے حیا دنیا بھر میں نہ ہوگا۔

دونوں آدمی اس وقت سو رہے، دوسرے دن سویرے نواب صاحب کے یہاں پہنچے۔

آزاد: جناب، رخصت ہونے آیا ہوں، زندگی ہے تو پھر ملوں گا۔

نواب: کیا کوچ کی تیاری کر دی؟ بھئی، واپس آنا تو ملاقات ضرور کرنا۔

آزاد اور خوبی رخصت ہوئے تو خوبی پہنچے زنانی ڈیوڑھی پر اور دربان سے بولے، یار

ذرا بوا زعفران کو نہیں بلا دیتے۔ دربان نے آواز دی۔ بوا زعفران تمہارے میاں آئے ہیں۔

بوا زعفران کے میاں خوبی سے بالکل ملتے جلتے تھے، ذرا فرق نہیں۔ وہی سوا بالشت کا

قد، وہی دبے پتلے ہاتھ پاؤں۔ زعفران ان سے روز کہا کرتی تھی تم افیم کھانا چھوڑ دو۔ وہ

کب چھوڑنے والے تھے بھلا۔ اسی سبب سے دونوں میں دم بھر نہیں بنتی تھی۔ زعفران نے جو

باہر آکر دیکھا تو حضرت پینک لے رہے ہیں۔ جل بھن کر خاک ہی تو ہو گئی۔ جاتے ہی میاں

خوبی کے پٹے پکڑ کر دو تین چار پانچ چائے لگا ہی تو دیے۔ خوبی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چونک

کر بولے لانا تو کرولی، کھوپڑی پلپلی ہو گئی۔ ہاتھ جھڑا کر بھاگنا چاہا مگر وہ دیونی نواب کا مال

کھا کھا کر ہنسی بنی پھرتی تھی۔ ان کو چمر کر ڈالا۔ ادھر غل غپاڑے کی آواز ہوئی، تو بیگم صاحبہ،
 ماما، لونڈیاں سب پردے کے پاس دوڑیں۔

بیگم: زعفران، آخر یہ ہے کیا؟ روٹی کی طرح اس بے چارے کو تو م کے دھر دیا۔

ماما: حضور، زعفران کا قصور نہیں، یہ اس مردوے کا قصور ہے جو جو رو کے ہاتھ بک گیا
 ہے۔ (خوبی کے کان پکڑ کر) جو رو کے ہاتھ سے جوتیاں کھاتے ہو اور ذرا چوں نہیں کرتے؟
 خوبی: ہائے افسوس، اجی یہ جو رو کس مردود کی ہے۔ خدا خدا کرو۔ بھلا میں اس ہڑنگی،
 کالی کلٹی ڈائن کے ساتھ بیاہ کرتا۔ مار مار کے بھر کس نکال دیا۔

یوا زعفران نے جو یہ باتیں سنیں تو وہ آواز ہی نہیں۔ غور کر کے دیکھتے ہیں تو یہ کوئی اور
 ہی ہیں۔ دانتوں کے تلے انگلی دبا کر خاموش ہو رہیں۔

لونڈی: اے واہ یوا زعفران! اتنی بھی نہیں پہچانتیں۔ یہ بے چارے تو نواب صاحب
 کے یہاں بنے رہتے تھے۔ آخر تم کو سوچھی کیا؟

بیگم صاحب نے بھی زعفران کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اتنے میں کسی نے نواب
 صاحب سے سارا قصہ کہہ دیا۔ محفل بھر میں قہقہہ پڑ گیا۔

نواب: زعفران کی سزا یہی ہے کہ خوبی کو دے دی جائیں۔

خوبی: بس، غلام کے حال پر رحم کیجیے۔ غضب خدا کا۔ میاں کے دھوکے میں تو
 اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیے اور جو کہیں بچ بچ میاں ہی ہوتے تو چٹنی ہی کر
 ڈالتی۔ کیا کہیں کچھ بس نہیں چلتا، نہیں نوابی ہوتی تو اتنی کروٹیاں بھونگی ہوتیں کہ عمر بھر یاد
 کرتی۔ یہاں کوئی ایسے دیسے نہیں۔ گھاس نہیں کھودا کیے ہیں۔

بڑی دیر تک اندر باہر قہقہے پڑے، تب دونوں آدمی پھر سے رخصت ہو کر چلے۔ راستے
 میں میاں آزاد مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

خوبی: جناب آپ ہنستے کیوں ہیں؟ میں نے بھی ایسی ایسی چٹکیاں لی ہیں کہ زعفران
 بھی یاد ہی کرتی ہوگی۔

آزاد: میاں ڈوب مرد جا کر، ایک عورت سے ہاتھ پائی میں جیت نہ پائے۔

خوبی: جی، وہ عورت سو مرد کے برابر ہے۔ چٹ پڑے تو آپ کے بھی حواس اڑ
 جائیں۔

دونوں آدمی سرائے پہنچ کر چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ کھانا کھا کر پوریا بھجے سنبھال اسٹیشن کو چلے۔

خوجی: حضرت، چلنے کو تو ہم چلتے ہیں مگر اتنی شرطیں آپ کو قبول کرنی ہوں گی۔
1- کروٹی ہم کو ضرور لے دیجیے۔

2- برس بھر کے لیے انیم لے لیجیے۔ میں اپنے لادے لادے پھروں گا۔ ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اور بے منت مر جاؤں گا۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی نہیں، مگر میں بغیر انیم پیسے ایک قدم نہ چلوں گا۔ پردیس میں انیم ملے یا نہ ملے، کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔

3- اتنا بتا دیجیے کہ وہاں ہوا عفران کی سی ڈنڈیل دیونیاں تو نظر نہ آئیں گی؟ واللہ، کیا کس کس کے لاتے لگائی ہیں، اور کیا تان تان کے کئے بازی کی ہے کہ پیٹھن ہی نکال ڈالا۔
4- سرائے میں ہم سب تمام عمر نہ اتریں گے، اور جہاز پر کبھار ہوئے تو ہم ڈوب ہی مریں گے۔ ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھر کم، کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈا ٹوٹ گیا تو کبھار سے ٹھائیں ٹھائیں ہو جائے گی۔

5- جس رئیس کی صحبت میں بزاز آتے ہوں گے وہاں ہم نہ جائیں گے۔
6- جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کانچی ہاؤس تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کانچی ہاؤس پہنچا دے۔

7- ٹنو پر ہم سوار نہ ہوں گے چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔
8- میٹھے پلاؤ روز پکے۔

9- ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب کہا کیجیے۔ یہ خوجی کے کیا معنی؟
10- مورچہ پر ہم نہ جائیں گے۔ لوٹ مار میں جو کچھ ہاتھ آئے وہ ہمارے پاس رکھا جائے۔

11- گولی کھانے کے تین گھنٹے پہلے اور مرنے کے دو گھنٹے پہلے ہمیں بتلا دینا۔
12- اگر ہم مر جائیں تو پتا لگا کر ہمارے والد کے پاس ہی ہماری لاش دفن کرنا۔ اگر پتہ نہ لگے تو کسی قبرستان میں جا کر سب سے اچھی قبر کے پاس ہم کو دفن کرنا۔ اور لکھ دینا کہ یہ ان کے والد کی قبر ہے۔

13۔ پنک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑتا۔

آزاد: تمہاری سب شرطیں منظور، ار، تو چلیے گا۔

خوجی: ایک بات اور باقی رہ گئی۔

آزاد: لگے ہاتھوں وہ بھی کہہ ڈالیے۔

خوجی: میں اپنی دادی جان سے تو پوچھ لوں۔

آزاد: کیا وہ بھی زندہ ہیں؟ خدا جھوٹ نہ بلائے، تو آپ کوئی پچاس کے پینے میں

ہوں گے۔ اور وہ اس حساب سے کم سے کم کیا ڈیڑھ سو برس کی بھی نہ ہوں گی؟

خوجی: اجی میں دل لگی کرتا تھا۔ ان کی تو ہڈیوں تک کا پتہ نہ ہوگا۔

اسٹیشن پر پہنچے غل غپاڑا مچا ہوا تھا۔ دونوں آدمی بھیڑ کاٹ کر اندر داخل ہوئے تو دیکھا

ایک آدمی گیر دئے کپڑے پہنے کھڑا ہے۔ فقیروں کی سی داڑھی، بال کمر تک، مونچھیں ہڑی

ہوئیں، کوئی پچاس کے پینے میں۔ مگر چہرہ سرخ، جیسے لال انگارہ، آنکھیں آگ بجھوکا۔

آزاد: (ایک سپاہی سے) کیوں بھی، کیا یہ کوئی فقیر ہیں؟

سپاہی: فقیر نہیں چندال ہے۔ کوئی چار مہینے ہوئے یہاں آیا اور ایک آدمی کو سبز باغ

دکھا کر اپنا چیلہ بتایا۔ رفتہ رفتہ اور لوگ بھی شاگرد ہوئے۔ پھر تو حضرت پہنچے لگے۔ اب کوئی تو

کہتا ہے کہ باباجی نے دس سیر منٹائی دریا میں ڈال دی اور دوسرے دن جا کر کہا گنگا جی ہمارا

امانت ہم کو واپس کر دو۔ دریا لہریں مارتا ہوا باباجی کے پاس آیا اور دس سیر گرما گرم منٹائی کسی

نے آپ ہی آپ ان کے دامن میں باندھ دی۔ کوئی قسمیں کھا کھا کر کہتا ہے کہ کئی مردے

انہوں نے زندہ کر دیے۔ ایک صاحب نے یہاں تک بڑھایا کہ ایک دن موسلا دھار مینہ

برس رہا تھا اور ان پر بوند نے اثر نہ کیا۔ کوئی فرشتہ ان پر لھستری لگائے رہا۔

آزاد: چکے گھڑے بن گئے۔

سپاہی: کچھ پوچھیے نہیں۔ ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ قید خانے سے نکل

جائیں گے۔ مگر تین دن سے حوالات میں ہیں اور اب سٹی پٹی بھولی ہوئی ہے۔ میں جو ادھر

سے آؤں جاؤں تو روز دیکھوں کہ بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ مگر عورتیں زیادہ اور مرد کم۔ جو آتا ہے وہ

سجدہ کرتا ہے۔ آپ کی دیکھا دیکھی میں گیا میری دیکھا دیکھی آپ گئے۔ باباجی کے یہاں روز

دربار لگنے لگا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ باباجی نے اپنی کٹھری میں ٹاٹ کے نیچے دس پانچ روپے رکھ دیے اور چپکے سے باہر نکل آئے۔ جب دربار جم گیا، تو ایک آدمی نے کہا باباجی ہم کو کچھ دکھائیے۔ بنا کچھ دیکھے ہم ایک نہ مانیں گے۔ باباجی نے آنکھیں نیلی پیلی کیں اور شیر کی طرح گرہے۔ لوگوں کے ہوش اڑ گئے، دو چار ڈرپوک آدمیوں نے تو مارے ڈر کے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک آدمی نے کہا بابا انجان ہے۔ اس پر رحم کیجیے۔ دوسرا بولا نادان ہے جانے دیجیے۔

فقیر: نہیں اس سے پوچھو کیا دیکھے گا؟

آدمی: بابا میں تو روپے کا بھوکا ہوں۔

فقیر: بچہ فقیروں کو دولت سے کیا کام؟ مگر تیری خاطر کرنا بھی ضرور ہے۔ چل چل چل۔ برسوں برسوں برسوں، کھن کھن کھن، اچھا بچہ، کٹی میں دیکھ، ٹاٹ کا کونا اٹھا۔ خدا نے تیرے لیے کچھ بیجا ہی ہوگا۔ مگر داہتا سر چلتا ہو، تبھی جانا نہیں تو دھوکا کھائے گا۔ وہاں کوئی ڈراونی صورت دکھائی دے تو ڈر مت جانا، نہیں تو مر جائے گا۔

باباجی نے کٹی کے ایک کونے میں پردا ڈال دیا تھا اور اس پردے میں ایک آدمی کا منہ کالا کر کے بٹھا دیا تھا۔ اب تو آدمی ڈرا کہ نہ جانے کیسے بھیا تک صورت نظر آئے گی۔ کہیں ڈر نہ جاؤں، تو جان ہی جاتی رہے۔ باباجی ایک ایک سے کہتے ہیں مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ تب ایک لوجوان نے اٹھ کر کہا لیجیے میں جاتا ہوں۔

فقیر: بچہ، جانا تو ہے مگر ذرا سنبھل کر جانا۔

لوجوان بے دھڑک کٹھری میں گھس گیا۔ ٹاٹ کے نیچے سے روپے نکال کر جب میں رکھ لیے اور چلنے ہی کو تھا کہ پردے میں سے وہ کالا آدمی نکل پڑا اور جوان کی طرف منہ کھول کر جھپٹا۔ جوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لکڑی اس کی حلق میں ڈال دی اور اتنی چوٹیں لگائیں کہ بوکھلا دیا۔ جب وہ روپے لیے اکڑتا ہوا باہر نکلا، تو ہوائی موالی سب دنگ کہ یہ تو خوش خوش آتے ہیں اور ہم سمجھے تھے کہ اب ان کی لاش دیکھیں گے۔

لوجوان: (فقیر سے) کہیے حضرت، اور کوئی کرامات دکھائیے گا؟

فقیر: بچہ، تمہاری جوانی پر ہمیں ترس آ گیا۔

لوجوان: پہلے جا کر اندر دیکھیے تو کہ آپ کے دیو صاحب کی کیا حالت ہے؟ ذرا مرہم

پٹی کیجیے۔

اگر وہاں سمجھ دار لوگ ہوتے تو سمجھ جاتے کہ باباجی پورے ٹھگ ہیں۔ مگر وہاں تو سبھی جاہل تھے۔ وہ سمجھے، بیشک باباجی نے نوجوان پر رحم کیا۔ خیر باباجی نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ ایک دن کسی مہاجن کے یہاں گئے۔ وہاں محلہ بھر کے مرد اور عورتیں جمع ہو گئیں۔ رات کو جب سب لوگ چلے گئے تو انھوں نے مہاجن کے لڑکے سے کہا، ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ جو چاہے مانگ لے۔ لڑکا ان کے قدموں پر گر پڑا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک کوری ہانڈی لاؤ، چولہا گرم کرو، مگر لکڑی نہ ہو کٹڑے ہوں۔ کہہاں نے سب سامان چکلیوں میں لیس کر دیا۔ تب آپ نے لوہے کا ایک پتر منگوایا۔ اسے ہانڈی میں پانی بھر کر ڈال دیا۔ پانی کو لے کر کچھ پڑھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پڑیا دی اور کہا یہ سفید دوا اس میں ڈال دے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مہاجن کا لڑکا اندر گیا تو باباجی نے لوہے کا پتر نکال لیا۔ اور اپنے پاس سے سونے کا پتر ہانڈی میں ڈال دیا، اور پھل دیے۔ مہاجن کا لڑکا باہر آیا تو باباجی کا پتہ نہیں۔ ہانڈی کو جو دیکھا تو لوہے کا پتر غائب، سونے کا تھکا موجود۔ محلے بھر میں شور مچ گیا۔ لوگ باباجی کو ڈھونڈنے لگے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک مالدار کی بیوی نے چکے میں آکر اپنا پانچ چھ ہزار کا زیور اتار دیا۔ باباجی زیور لے کر اڑ گئے۔ سال بھر تک کہیں پتہ نہ چلا۔ پرسوں پکڑے گئے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی آئی۔ دونوں آدمی جا بیٹھے۔

(32)

صبح کو گاڑی ایک بڑے اسٹیشن پر رکی۔ نئے مسافر آ آ کر بیٹھنے لگے۔ میاں خوبی اپنے کمرے کے دروازے پر پڑے گھڑکیاں جما رہے تھے۔ آگے جاؤ، یہاں جگہ نہیں ہے، کیا میرے سر پر بیٹھو گے؟ اتنے میں ایک نوجوان دلہا باراتی کپڑے پہنے آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بارات کے اور آدمی اسباب لدوانے میں مصروف تھے۔ دلہن اور اس کی لوطی زنانے کمرے میں بیٹھائی گئی تھیں۔ گاڑی چلنے والی ہی تھی کہ ایک بد معاش نے گاڑی میں کھس کر دلہے کی گردن پر تلوار کا ایسا ہاتھ لگایا کہ سر کٹ کر دھڑ سے الگ ہو گیا۔ اس بے گناہ کی لاش پھڑکنے لگی۔ اسٹیشن پر کھرام مچ گیا۔ سیکڑوں آدمی دوڑ پڑے اور قاتل کو گرفتار کر لیا۔ یہاں تو یہ آفت

تھی ادھر لہن اور مہری میں اور ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

لہن : دل بہار، دیکھو تو یہ فل کیسا ہے؟ ذری جھانک کر دیکھنا تو۔

دل بہار : ہیں ہیں، کسی نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ چوڑا سارا لہلہا ہوا ہے۔

لہن : ارے غضب! کیا جانے، کون تھا پچارا۔

دل بہار : ارے! بات کیا ہے! لاش کے سر ہانے کھڑے تمہارے دیور رو رہے ہیں۔

ایک دفعہ لاش کی طرف سے آواز آئی، ہائے بھائی، تو کدھر گیا! لہن کا کلیجہ دھک

دھک کرنے لگا۔ بھائی بھائی کر کے کون روتا ہے۔ ارے غضب! وہ گھبرا کر ریل سے اتری اور

چھاتی پٹنٹی ہوئی چلی۔ لاش کے پاس پہنچ کر بولی، ہائے لٹ گئی! ارے لوگو یہ ہوا کیا؟

دل بہار : ہیں ہیں لہن تمہارا نصیب پھوٹ گیا۔

اتنے میں اسٹیشن کی دو چار عورتیں، تار بالو کی بیوی، گاڑی کی لڑکی، ڈرائیور کی بھتیجی وغیرہ

نے آکر سمجھانا شروع کیا۔ اسٹیشن ماتم سرا بن گیا۔ لوگ لاش کے ارد گرد کھڑے افسوس کر رہے

تھے۔ بڑے بڑے سنگ دل آٹھ آٹھ آنسو بہا رہے تھے۔ سینہ پھٹا جاتا تھا۔ یکا یک لہن نے

ایک ٹھنڈی سانس لی زور سے ہائے کر کے چلائی اور اپنے شوہر کی لاش پر دم سے گر پڑی۔

چند منٹ میں اس کی لاش بھی تڑپ کر سرد ہو گئی۔ لوگ دونوں لاشوں کو دیکھتے تھے اور حیرت

سے دانتوں انگلی دباتے تھے۔ تقدیر کے کیا کھیل ہیں، لہن کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی

ہوئی، سر سے پاؤں تک زیوروں سے لدی ہوئی، مگر دم کے دم میں کفن کی نوبت آ گئی۔ ابھی

اسٹیشن سے ایک پاکی پر چڑھ کر آئی تھی، اب تابوت میں جائے گی۔ ابھی کپڑوں سے عطر کی

مہک آ رہی تھی کہ کافور کی تدبیریں ہونے لگیں۔ صبح کو دروازے پر روشن چوکی اور شہنائی بج

رہی تھی، اب ماتم کی صدا ہے۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ شہر کے لوگ چھتوں اور دوکانوں سے

برات دیکھ رہے تھے، اب جنازہ دیکھیں گے۔ دل بہار دونوں لاشوں کے پاس بیٹھی تھی۔ مگر

آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ وہ لہن کے ساتھ کھیلی تھی۔ دنیا اس کی نظروں میں اندھیری

ہو گئی تھی۔ دلہا کے خدمت گار قافل کو زور زور سے جوتے اور تھپڑ لگا رہے تھے اور مرنے

والے کو یاد کر کے ڈھاریں مار کے روتے تھے۔ خیر اسٹیشن ماسٹر نے لاشوں کے اٹھانے کا

انتظام کیا۔ گاڑی تو چلی گئی مگر بہت سے مسافر ریل پر سے اتر آئے۔ بلا سے ٹکٹ کے دام

مئے۔ اس قافل کو دیکھ کر سب کی آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو اسی دم

ہیں ڈالیں۔ اتنے میں لال کرتی کا ایک گورا جو بڑی دیر سے چلا چلا کر رو رہا تھا غصے کو روک نہ سکا، جوش میں آکے جھپٹا اور قاتل کی گردن پکڑ کر اسے خوب پیٹا۔

آزاد اور میاں خوبی بھی ریل سے اتر پڑے تھے۔ دونوں لاشوں کے ساتھ ان کے گھر گئے۔ راہ میں ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ ساتھ ہو گئی۔ جن لوگوں نے ان دونوں کی صورت خواب میں بھی نہ دیکھی تھی جانتے بھی نہ تھے کہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں وہ بھی زار زار روتے تھے۔ عورتیں بازاروں، جھروکوں اور پھتوں پر سے چھاتی پٹنی تھیں کہ خدا ایسی گھڑی ساتویں دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ دوکانداروں نے جنازے کو دیکھا اور دوکان بڑھا کے ساتھ ہوئے۔ رئیس زادے سوار یوں پر سے اتر اتر پڑے اور جنازے کے ساتھ چلے۔ جب دونوں لاشیں گھر پر پہنچیں تو سارا شہر اس جگہ موجود تھا۔ دہن کا باپ ہائے ہائے کر رہا تھا اور دولہے کا باپ مبر کی سل چھاتی پر رکھے اسے سمجھاتا تھا۔ بھائی سنو ہماری اور تمہاری عمر ایک ہے، ہمارے مرنے کے دن نزدیک ہیں۔ اور دو چار برس بے حیائی سے جیسے تو جیسے ورنہ اب چل چلاؤ ہے۔ کسی کو ہم کیا روئیں۔ جس طرح تم آج اپنی پیاری بیٹی کو رو رہے ہو اسی طرح ہزاروں آدمیوں کو اپنی اولاد کا غم کرتے دیکھ چکے ہو۔ اس کا انوس ہی کیا؟ وہ خدا کی امانت تھی خدا کے سپرد کردی گئی۔

ادھر قاتل پر مقدمہ پیش ہوا اور پھانسی کا حکم ہو گیا۔ صبح کے وقت قاتل کو پھانسی کے پاس لائے۔ پھانسی دیکھتے ہی بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے۔ بڑی حسرت کے ساتھ بولا۔ سب بھائیوں کو سلام، یہ کہہ کر پھانسی کی طرف نظر کی اور یہ شعر پڑھے :

کوئی دم کیجے کس طور سے آرام کہیں
چمن دیتی ہی نہیں گردش ایام کہیں
سید لافز ہوں میری جلد خبر لے صیاد
دم نکل جائے تڑپ کر نہ تہہ دام کہیں

خوبی: کیوں میاں، شعر اس نے تو کچھ بے نیکی سے پڑھے۔ بھلا اس وقت شعر کا کیا ذکر تھا۔

آزاد: چپ بھی رہو۔ اس بے چارے کی جان پر بن آئی ہے اور تم کو مذاق سوچتا

ہے۔

انہیں کچھ رحم بھی آتا ہے یا رب وقت خوں ریزی

چھری جب حلق عاجز پر رواں جلا کر تے ہیں

قاتل پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور لاش پھرنے لگی۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی گھوڑا کڑکڑاتا سانسے سے آرہا ہے۔ وہ سیدھا جیل خانے میں داخل ہوا اور چلا کر بولا خدا کے واسطے ایک منٹ کی مہلت دو۔ مگر وہاں تو لاش پھرنے لگی تھی۔ یہ دیکھتے ہی سوار دم سے گھوڑے سے گر پڑا اور رو کر بولا یہ تیسرا تھا۔ جیل کے داروغہ نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے پھر آہستہ سے کہا یہ تیسرا تھا۔ اب ایک ایک آدمی اس سے پوچھتا ہے کہ میاں تم کون ہو اور روک لو روک لو کی آواز کیوں دی تھی؟ وہ سب کو یہی جواب دیتا ہے یہ تیسرا تھا۔

آزاد: آپ کی حالت پر افسوس ہوتا ہے۔

سوالی: بھی، یہ تیسرا تھا۔

انسان کا بھی عجب حال ہے۔ ابھی دو ہی دن ہوئے کہ شہر بھر اس قاتل کے خون کا پیاسا تھا۔ سب دعا کر رہے تھے کہ اس کے بدن کو جیل کو لے کھائیں۔ وہ بھی اس بوڑھے کی حالت دیکھ کر رونے لگے۔ قاتل کی بے رہی یاد نہ رہی۔ سب لوگ اس بوڑھے سوار سے ہم دردی کرنے لگے۔ آخر جب بوڑھے کے ہوش و ہوا اس درست ہوئے تو یوں اپنا قصہ کہنے لگا۔ میں قوم کا پٹھان ہوں۔ تین اوپر ستر برس کا سن ہوا۔ خدا نے تین بیٹے دیے۔ تینوں جوان ہوئے اور تینوں نے پھانسی پائی۔ ایک نے ایک قافلے پر چھاپا مارا۔ اس طرف لوگ بہت تھے۔ قافلہ والوں نے اسے پکڑ لیا اور اپنے آپ ایک پھانسی بنا کر لٹکا دیا۔ جس وقت اس کی لاش کو پھانسی پر سے اتارا، میں بھی وہاں جا پہنچا۔ لڑکے کی لاش دیکھ کر غش کی نوبت آئی، مگر چپ۔ اگر ذرا ان لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس کا باپ ہے تو مجھے بھی جیتا نہ چھوڑیں۔ یکا یک کسی نے ان سے کہہ دیا کہ یہ اس کا باپ ہے۔ یہ سنتے ہی دس پندرہ آدمی چٹ گئے اور آگ جلا کر مجھ سے کہا کہ اپنے لڑکے کی لاش اس میں جلا۔ بھائی جان بڑی پیاری ہوتی ہے، انہیں ہاتھوں سے جن سے لڑکے کو پالا تھا اسے آگ میں جلا دیا۔

اب دوسرے لڑکے کا حال سنے، وہ راولپنڈی میں راہ راہ چلا جاتا تھا کہ ایک آدمی نے جو گھوڑے پر سوار تھا اس کو چابک سے ہٹایا۔ اس نے جھلا کر تلوار میاں سے کھینچی اور اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ حاکم نے پھانسی کا حکم دیا۔ اور آج کا حال تو آپ لوگوں نے خود ہی

دیکھا۔ اس لڑکی کے باپ نے قرار دیا تھا کہ میرے بیٹے کے ساتھ نکاح پڑھوائے گا۔ لڑکے نے جب دیکھا کہ یہ دوسرے کی بیوی بنی تو آپے سے باہر ہو گیا۔
 میاں آزاد اور خوبی بڑی حسرت کے ساتھ وہاں سے چلے۔
 خوبی: چلیے، اب کسی دوکان پر انیم خرید لیں۔
 آزاد: اجی بھاڑ میں گئی آپ کی انیم، آپ کو انیم کی پڑی ہے یہاں مارے غم کے کھانا پینا بھول گئے۔

خوبی: بھئی، رنج گھڑی دو گھڑی کا ہے۔ یہ مرنا جینا تو لگا ہی رہتا ہے۔
 دونوں آدمی باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دوکان پر انیم جہڑا جھڑبک رہی ہے۔ خوبی کی بانجھیں کل گئیں، مرادیں مل گئیں۔ جاتے ہی چونی دکان پر پھینکی، انیم لی، لیتے ہی گھولی اور گھولتے ہی غٹ غٹ پی گئے۔
 خوبی: اب آنکھیں کھلیں۔

آزاد: یوں نہیں کہتے کہ اب آنکھیں بند ہوئیں۔
 خوبی: کیوں استاد، جو ہم حاکم ہو جائیں تو بڑا مزہ آئے۔ میرا کوئی اچھی بھائی کسی کو قتل بھی کر آئے تو بے داغ چھوڑ دوں۔
 آزاد: تو پھر نکالے بھی جلد جائیے۔
 دونوں آدمی یہی باتیں کرتے ہوئے ایک سرائے میں جا پہنچے۔ دیکھا، ایک بوڑھا ہندو زمین پر بیٹھا چلم پی رہا ہے۔

آزاد: رام رام بھائی، رام رام!
 بوڑھا: سلام صاحب، سلام، ستھنا پہنے ہو اور رام رام کہتے ہو؟
 آزاد: ارے بھائی رام اور خدا ایک ہی تو ہیں۔ سمجھ کا پھیر ہے۔ کہاں جاؤ گے؟
 بوڑھا: گاؤں یہاں سے پانچ چوکی ہے۔ پہر رات کا گھر سے چلین، نہاوا، پوجن کین، چہینا باندھا اور ٹھنڈے ٹھنڈے چلے آئیں۔ آج کچہری ماں ایک تاریخ ہتی۔ سانجھ لے پھر چلے جاؤ۔ زمین داری ماں اب کچہری دھاوے کے سوائے اور کا رہی گا؟
 آزاد: تو زمین دار ہو؟ کتنے گاؤں ہیں تمہارے؟
 بوڑھا: اے حضور، اب پو سمجھو کوئی دوئی ہزار خرچ برج کر کے بچ رہے ہیں۔

آزاد نے دل میں سوچا کہ دو ہزار سال کی آمدنی اور بدن پر ڈھنگ کے کپڑے تک نہیں۔ گاڑھے کی مرزئی پہنے ہوئے ہے، اس کی کنجوسی کا بھی ٹھکانہ ہے؟ یہ سوچتے ہوئے دوسری طرف چلے تو دیکھا ایک قالین بڑے کھف سے بچا ہے اور ایک صاحب بڑے ٹھاٹ سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جام دانی کا کرتا، ادھی کا انگرکھا، تین روپے کی سفید ٹوپی، دو ڈھائی سو کی جیب گھڑی، اس کی سونے کی زنجیر گلے میں پڑی ہوئی۔ قریب ہی چار پانچ بھلے آدمی اور بیٹھے ہوئے ہیں، اور دوسرے تنہا کو اڑا رہے ہیں۔ آزاد نے پوچھا تو معلوم ہوا آپ بھی ایک زمیندار ہیں۔ پانچ چھ کوس پر ایک قصبے میں مکان ہے۔ کچھ 'سیر' بھی ہوتی ہے۔ زمین داری سے سو روپے ماہوار کی بچت ہوتی ہے۔

آزاد: یہاں کس غرض سے آنا ہوا؟

ریس: کچھ روپے قرض لینا تھا مگر مہاجن دو روپے سیکڑا سود مانگتا ہے۔

میاں آزاد نے زمین دار صاحب کے نشی کو اشارے سے بلایا الگ حلے جا کر یوں باتیں کرنے لگے۔

آزاد: حضرت ہمارے ذریعہ سے روپے لیجیے۔ دس ہزار میں ہزار بھتا کیجیے، مگر جاگیر قرق کر لیں گے اور چار روپے سیکڑا سود لیں گے۔

نشی: واہ! نیکی اور پوچھ پوچھ! اگر آپ چودہ ہزار بھی دلوا دیں تو بڑا احسان ہو۔ اور سود چاہے پانچ روپے سیکڑا لیجیے تو کوئی پروا نہیں۔ سود دینے میں تو ہم آندھی ہیں۔

آزاد: بس، مل چکا۔ یہ سود کی کیا بات چیت ہے بھلا؟ ہم کہیں سود لیا کرتے ہیں؟ منافع نہیں کہتے؟

نشی: اچھا حضور، منافع سہی۔

آزاد: اچھا یہ بتاؤ کہ جب سو روپے مہینہ فق رہتا ہے تو پھر چودہ ہزار قرض کیوں لیتے ہیں؟

نشی: جناب آپ سے تو کوئی پردہ نہیں۔ سو پاتے ہیں اور پانچ سو اڑاتے ہیں۔ اچھا کھانا کھاتے ہیں، باریک اور قیمتی کپڑے پہنتے ہیں، یہ سب آئے کہاں سے؟ بنگ سے لیا، مہاجنوں سے لیا، سب چودہ ہزار کے پینے میں آگئے۔ اب کوئی نکا نہیں دیتا۔

آزاد دل میں اس بوڑھے ٹھاکر کا ان ریس صاحب سے مقابلہ کرنے لگے۔ وہ بھی

زمین دار یہ بھی زمین دار، ان کی آمدنی ڈیڑھ سو سے زیادہ، ان کی مشکل سے سو وہ گاڑھے کی دھوتی اور گاڑھے کی مرزئی پر خوش ہیں اور یہ شرقی اور جام دانی پھڑکاتے ہیں۔ وہ ڈھائی تلے کا چم رودھا جوتا پہنتے ہیں یہاں پانچ روپے کی سلیم شاہی جوتیاں۔ وہ پالک اور چنے کی روٹیاں کھاتے ہیں اور یہ دو وقت شیرمال اور مرغ پلاؤ پر ہاتھ لگاتے ہیں۔ وہ نکلے گز کی چال چلتے ہیں یہاں ہوا کے گھوڑوں پر سوار۔ دونوں پر پھٹکار۔ وہ کنجوس اور یہ فضول خرچ۔ وہ روپے کو فن کیے ہوئے، یہ روپے لٹاتے پھرتے ہیں وہ کھا نہیں سکتے تو یہ بچا نہیں سکتے۔
شام کو دونوں آدمی ریل پر سوار ہو کر پونا جا پہنچے۔

(33)

ریل سے اتر کر دونوں آدمیوں نے ایک سرائے میں ڈیرا جمایا اور شہر کی سیر کو نکلے۔ یوں تو یہاں کی سبھی چیزیں بھلی معلوم ہوتی تھیں لیکن سب سے زیادہ جو بات انھیں پسند آئی وہ یہ تھی کہ عورتیں بلا چادر اور گھونگھٹ کے سڑکوں پر چلتی پھرتی تھیں۔ شریف زادیاں بے حجاب نقاب اٹھائے مگر آنکھوں میں حیا اور شرم چھپی ہوئی۔

خوجی: کیوں میاں یہ تو کچھ عجیب رسم ہے؟ یہ عورتیں منہ کھولے پھرتی ہیں۔ شرم اور حیا سب بھون کھائیں۔ واللہ کیا آزادی ہے۔

آزاد: آپ خاصے احمق ہیں۔ عرب میں، عجم میں، افغانستان میں، مصر میں، ترکستان میں، کہیں بھی پردہ ہے؟ پردا تو آنکھ کا ہوتا ہے۔ کہیں چادر حیا سکھاتی ہے؟ جہاں گھونگھٹ کاڑھا اور نظر پڑنے لگی۔

خوجی: اچی میں دنیا کی بات نہیں چلاتا۔ ہمارے یہاں تو کہاریاں اور مانس تک پردہ کرتی ہیں، نہ کہ شریف زادیاں ہی! ایک قدم تو بے پردے کے جاتی نہیں۔

آزاد: ارے میاں نقاب کو شرم سے کیا سروکار؟ آنکھ کی حیا سے بڑھ کر کوئی پردہ ہی نہیں۔ ہمارے ملک میں تو پردے کا نام نہیں مگر ہندستان کا تو بابا آدمی ہی نرالا ہے۔

خوجی: آپ کا ملک کون؟ ذرا آپ کے ملک کا نام تو سنوں۔

آزاد: کشمیر وہی کشمیر جسے شاعروں نے دنیا کا فردوس مانا ہے۔ وہاں ہندو مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھ کر نکلتی ہیں، مگر یہ نہیں کہ عورتیں گھر کے باہر قدم ہی نہ رکھیں۔ یہ روگ تو

ہندستان ہی میں پھیلا ہے۔ ہم تو جب ترکی سے آئیں گے تو یہیں بستر جمائیں گے اور حسن آرا کو ساتھ لے کر آزادی کے ساتھ ہوا کھائیں گے۔

خوجی: یار بات تو اچھی ہے مگر میری بیوی تو اس لائق ہی نہیں کہ ہوا کھلانے لے جاؤں۔ کون اپنے اوپر تالیاں بجوائے؟ پھر اب تو بوڑھی ہوئی اور رنگ بھی ایسا صاف نہیں۔ آزاد: تو اس میں شرم کی کون سی بات ہے؟ آپ ان کے کالے منہ سے جھینپتے کیوں ہیں؟

خوجی: جب جش جاؤں گا تو وہاں ہوا کھلاؤں گا۔ آپ نئی روشنی کے لوگ ہیں۔ آپ کی حسن آرا آپ سے بھی بڑھی ہوئی جو دیکھے پھڑک جائے کہ کیا چاند سورج کی جوڑی ہے۔ ایسی شکل و صورت ہو تو ہوا کھلانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اب کیا جوش دکھائیں، نہ وہ امنگ ہے نہ وہ ترنگ۔

آزاد: ہم کہتے ہیں بوا زعفران کو بیاہ لو اور ایک ٹولے دو۔ بس اسی طرح وہ بھی بازاروں میں ہوا کھائیں۔

خوجی: (کان پکڑ کر) یا خدا بچائیو، بیچ پی، ہزار نیامت کھائی، مارے چتوں کے کھوپڑی گنجی کردی تھی۔ کیا وہ بھول گیا؟ آزاد: یہاں سے بمبئی بھی تو قریب ہے۔

خوجی: ارے غضب! کیا جہاز پر بیٹھنا ہوگا؟ تو بھی میرے لیے اہم لے دو۔ پونے سے بمبئی تک دن میں کئی گاڑیاں جاتی تھیں۔ دونوں آدمیوں نے سرائے میں پہنچ کر کھانا کھایا اور بمبئی روانہ ہوئے۔ شام ہو گئی تھی۔ ایک ہوٹل میں جا کر ٹھہرے۔ آزاد تو دن بھر کے تھکے ہوئے تھے، لیٹتے ہی خزانے لینے لگے۔ خوجی انہی آدمی نیند کہاں؟ اسی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نیند کو کیوں کر بلاؤں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لمبی ترنگی بچہ ہتھی عورت چمکتی دکتی چلی آتی ہے۔ پورے سات فٹ کا قد، نہ جو بھر کم، نہ جو بھر زیادہ۔ دھانی چادر اوڑھے اٹھلا اٹھلا کر چلتی ہوئی میاں خوجی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ خوجی نے اس کی طرف نظر ڈالی تو اس نے ایک نیکی چتون سے ان کو دیکھا اور آگے چلی۔ آپ کو شرارت جو سوچی تو سیٹی بجانے لگے۔ بیٹی کی آواز سنتے ہی وہ ان کی طرف جھک پڑی اور چھماچھم کرتی ہوئی کمرے میں چلی آئی۔ اب میاں خوجی کے حواس بہتر ہوئے کہ اگر آزاد کی آنکھ کھل

گئی تو لے ہی ڈالیں گے، اور جو کہیں سمجھ گئے تو ہماری خیریت نہیں۔ ہم بس نیبو اور نون چاٹ کر رہ جائیں گے۔ اشارے سے کہا۔ ذری آہستہ آہستہ بولو۔

عورت : ارے واہ میاں اچھے ملے۔

خوبی : میاں آزاد سوئے ہوئے ہیں۔

عورت : ان کا بڑا لحاظ کرتے ہو کیا باپ ہیں تمہارے؟

خوبی : خدا کے واسطے چپ بھی رہو۔

عورت : چلو ہم تم دوسری کوٹھری میں چل کر بیٹھیں۔

دونوں پاس کی ایک کوٹھری میں جا بیٹھے۔ عورت نے اپنا نام قیصر بتلایا اور بولی واللہ جانتا ہے تم پر میری جان جاتی ہے۔ خدا کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں کہ جی چاہتا ہے چوم لوں۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوبی : (اکڑ کر) ابھی کیا، جوانی میں دیکھنا ہم کو۔

کیا خوب، ابھی جوانی شاید آنے والی ہے۔ کچھ اوپر پچاس کا سن ہوا، اور آپ ابھی لڑکے ہی بنے ہوئے ہیں۔ اس عورت نے آپ کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا لیکن آپ سمجھے کہ سچ سچ سمجھ ہی گئی۔ اور بھی بھٹکنے لگے۔

عورت : ذیل ڈول کتنا پیارا ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوبی : اگر میں کسرت کروں تو اچھے اچھے پہلوانوں کو لڑا دوں۔

عورت : ذرا کان تو پھٹ پھٹا لو۔ شاباش

خوبی : ایک بات بتاؤں کیوں برا تو نہ مانو گی؟

عورت : برا مانوں گی تو ذرا کھوپڑی سہلا دوں گی۔

خوبی : جاں بخشی کرو تو کہوں۔

عورت : (چپٹ لگا کر) کیا کہتا ہے کہہ۔

خوبی : بھئی یہ دھول دھپا شریفوں میں جائز نہیں

عورت : تجھ موئے کو کون گھوڑی شریف سمجھتی ہے۔

ایک چپٹ اور پڑی۔ خوبی نے تیوریاں بدل کر کہا : بھئی یہ عادت مجھے پسند نہیں۔

مجھے بھی غصہ آجائے گا۔

عورت: آنکھیں کیا نیلی چلی کرتا ہے؟ پھوڑ دوں دونوں آنکھیں۔
 خوجی: اب ہمارا مطلب تو اس جھنجھٹ میں خط ہوا جاتا ہے۔ اب تو بتاؤ کچھ مانگیں تو
 دوگی؟

عورت: ہاں، کیوں نہیں ایک لہڑا اور دوسرا ادھر۔ کیا مانگتے ہو؟
 خوجی: کہنا یہ ہے کہ..... مگر کہتے ہوئے دل کا پٹا ہے۔
 عورت: اب میں تم کو ٹھیک نہ بتاؤں کہیں؟
 خوجی: تمہارے ساتھ بیاہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔
 عورت: اے، ابھی تم بچے ہو، دودھ کے دانت تک تو ٹوٹے نہیں۔ بیاہ کیا کرے گا
 بھلا؟

خوجی: واہ واہ! میرے دو بچے کھیلتے ہیں، ابھی تک ان کے نزدیک لوٹے ہی ہیں ہم۔
 عورت: اچھا، کچھ کمائی تو نکال اور داڑھی منڈوا۔
 خوجی: (دس روپے دے کر) لو یہ حاضر ہے۔
 عورت: دیکھو! اوں ہاتھی کے منہ میں زیر!!
 خوجی: لو یہ پانچ اور لو۔ ابھی میں تم کو بیگم بنا کر رکھوں گا۔
 عورت: اچھا ایک شرط سے شادی کروں گی۔ تڑکے اٹھتے مجھے سات بار سلام کرنا اور
 میں سات چیتیں لگاؤں گی۔
 خوجی: اجی، بلکہ اور دس۔

عورت: اچھا، اسی بات پر کچھ اور نکالو۔
 خوجی: لو یہ پانچ اور لو۔ تمہارے دم کے لیے سب کچھ حاضر ہے۔
 عورت نے جھٹ سے میاں خوجی کو گود میں اٹھالیا اور بغل میں دبا کر لے چلی، تو
 خوجی بہت چکرائے۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے، مگر اس نے جو دبایا تو اس طرح لے چلی جیسے
 کوئی چڑی مار جانوروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے لے چلے۔ اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوجی
 پھڑکتے ہوئے جاتے ہیں اور وہ عورت جھم جھم کرتی چلی جاتی ہے۔
 خوجی: اب چھوڑتی ہے یا نہیں؟

عورت: اب عمر بھر تو چھوڑنے کا نام نہ لوں گی۔ ہم بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں چھوڑ دینا

کیا جائیں۔ بس ایک کے سر ہو رہیں۔ بھاگے کہاں جاتے ہو میاں؟

خوبی: میں کچھ قیدی ہوں؟

عورت: (چپٹ لگا کر) اور نہیں، کون ہے تو؟ اب میں کہیں جانے بھی دوں گی؟
خوبی پیچھے ہٹے لگے، تو اس نے پٹے پکڑ کر خوب بے بھاد کی لگائی۔ اب یہ جھلائے
اور غل چایا کہ کوئی ہے؟ لانا کرولی، بہت سے تماشائی کھڑے ہنس رہے تھے۔

ایک: کیا ہے میاں؟ یہ دھرم پکڑ کیسی!

عورت: آپ کوئی قاضی ہیں؟ یہ ہمارے میاں ہیں۔ ہم چاہے چتیا نہیں چاہے پنیں
کسی کو کیا؟

دوسرا: مہارو گردن دا بے اٹھائے لیے جات ہے، وہ کرولی نکارت ہے۔

خوبی: برے پھنسنے! یارو ذرا میاں آزاد کو سرائے سے بلانا۔

عورت نے پھر خوبی کو گود میں اٹھایا اور منگ کی طرح پیٹھ پر رکھ کر منگ دریاؤ، ٹھنڈا
پانی، کبھی ہوئی لے چلی۔

ایک آدمی: کیسے مرد ہوئی! عورت سے جیت نہیں پاتے۔ بس عزت ڈوبودی بالکل۔

خوبی: امی، اس عورت پر شیطان کی پھٹکار۔ یہ تو مردوں کی کان کاٹی ہے۔

اسنے میں میاں آزاد کی نیند کھلی تو خوبی غائب۔ باہر نکلے تو دیکھا خوبی کو ایک عورت
دبائے کھڑی ہے۔ لٹکار کر کہا تو کون ہے۔ انھیں چھوڑتی کیوں نہیں؟

عورت نے خوبی کو چھوڑ دیا اور سلام کر کے بولی، حضور میرا انعام ہوا۔ میں بہر و پیا

ہوں۔

دوسرے دن خوبی میاں آزاد کے ساتھ شہر کی سیر کرنے چلے، تو شہر بھر کے لوٹھے

لہاڑیے ساتھ، پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے جاتے ہیں۔ ایک بولا کہو چڑھا بیوی نے چاند گنجی
کردی نہ؟ ہت تیرے کی۔ دوسرا بولا کہو استاد، کھوپڑی کا کیا رنگ تہے؟

بے چارے خوبی کو راستہ چلنا مشکل ہو گیا۔ دو چار آدمیوں نے بہر و پے کی تعریف کی تو

خوبی جل بھن کر خاک ہو گئے۔ اب کسی سے نہ بولتے ہیں نہ چالتے۔ دم دبائے، ڈگ

بوھائے، گردن جھکائے پتا توڑ بھاگ رہے ہیں۔ بارے خدا خدا کر کے دوپہر کو بھر سرائے

میں آئے۔ نیم کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹ گئے، تو ایک بھٹیاری نے مسکرا کے کہا گاج

پڑے ایسی عورت پر، جو میاں کو گود میں اٹھائے اور بازار بھر میں نہجائے۔ غرض سرائے کی بھاریوں نے خوبی کو ایسا انگلیوں پر نہجایا کہ خدا کی پناہ! ایسے جھینپے کہ کروٹی تک بھول گئے۔ اسنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لمبے ڈیل ڈول کا خوبصورت جوان طنپہ کمر میں لگائے، اودی مچوڑی سر پر جمائے، باگی ترچھی چھوڑ دکھاتا ہوا اکڑتا چلا آتا ہے۔ بھاریاں چھپ چھپ کے جھانکنے لگیں۔ سمجھیں کہ مسافر ہے بولیں میاں ادھر آؤ یہاں بستر بھاؤ۔ میاں مسافر دیکھو کیسا صاف ستھرا مکان ہے۔ پکریاں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں ہے، ذرا تو تکلیف ہوگی نہیں۔ سپاہی بولا ہمیں بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے کوئی ہمارے ساتھ چلے تو سودا خرید کر ہم آجائیں۔ ایک بھاری بولی، چلبے ہم چلتے ہیں۔ دوسری بولی لوٹدی حاضر ہے۔ سپاہی نے کہا میں کسی پرانی عورت کو نہیں لے جانا چاہتا۔ کوئی پڑھا لکھا مرد چلے، تو پانچ روپے دیں۔ میاں خوبی کے کان میں جو بھنک پڑی تو کلبلا کر اٹھ بیٹھے اور کہا میں چلتا ہوں مگر پانچوں نقد گنوا دیجیے۔ میں السیٹھ سے ڈرتا ہوں۔ سپاہی نے جھٹ سے پانچوں نوٹ گن دیے۔ روپے تو خوبی نے ٹینٹ میں رکھے اور سپاہی کے ساتھ چلے۔ راستے میں جو انھیں دیکھتا ہے قہقہہ لگاتا ہے بچہ کی کھوپڑی جانتی ہوگی چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ جب چاروں اُور سے بوچھاریں پڑنے لگیں تو خوبی بہت ہی جھلائے اور غل جچا کر ایک ایک کو ڈانٹنے لگے۔ چلتے چلتے ایک انیم کی دوکان پر پہنچے۔

سپاہی: کہو بھی جوان، ہے شوق؟ پلو اؤں؟

خوبی: اجی میں تو اس پر عاشق ہوں۔

سپاہی نے میاں خوبی کو خوب انیم پلائی۔ جب خوب سرور مٹھے تو سپاہی نے ان کو ساتھ لیا اور چلا۔ باتیں ہونے لگیں۔ خوبی بولے: بھی انیم پلائی ہے تو مٹھائی بھی کھلاؤ، احسان کرے تو پورا۔

سپاہی: اجی ابھی لو، یہ چار منڈے کی بیچ میل مٹھائی حلوائی کی دوکان سے لاؤ۔

حلوائی کی دوکان سے خوبی نے لڑکے خوب مٹھائی لی۔ اور جھومتے ہوئے چلے۔ بھوک کے مارے راستے ہی میں ڈلیاں نکال کر چکھنی شروع کردی۔ سپاہی کتکیوں سے دیکھتا جاتا تھا، مگر آنکھ چرا لیتا تھا۔ آخر دونوں آدمی ایک بزاز کی دوکان پر پہنچے۔ سپاہی نے خوبی کی طرف اشارہ کر کے کہا ان کے انگر کھ کے برابر جام دانی نکال دیجیے۔

بزاز: حضور، اپنے انگر کے لیے لیں تو کچھ ہمیں بھی مل رہے۔ ان کا تو انگر کھا اور پاجامہ سب گز بھر میں تیار ہے۔

خوجی: نکالو، جام دانی نکالو۔ بہت باتیں نہ بناؤ۔ ابھی ایک دھکا دوں تو پچاس لڑکھنیاں کھاؤ۔

بزاز: لیجیے، کیا جام دانی ہے۔ بہت بڑھیا! مول تول دس روپے گز۔ مگر سات روپے گز سے کوڑی کم نہ ہوگی۔

سپاہی: بھئی، ہم تو پانچ روپے کے دام دیں گے۔

بزاز: اب نگرار کون کرے۔ آپ چھ کے دام دے دیں۔

سپاہی: اچھا، دو گز اتار دو۔

سپاہی نے بزاز سے سب ملا کر کوئی پچیس روپے کا کپڑا لیا اور کھٹا باندھ کر اٹھ کھڑا

ہوا۔

بزاز: روپے؟

سپاہی: ابھی گھر سے آکر دیں گے؟ ذرا کپڑے پسند تو کرا لائیں۔ یہ ہمارا سالا بیٹھا ہے ہم ابھی آئے۔

وہ تولے دے کر چل دیا۔ خوجی اکیلے رہ گئے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو بزاز نے گردن

ٹاپی، کہاں چلے آپ! کہاں چلے کہاں؟

خوجی: ہم کیا کسی کے غلام ہیں؟

بزاز: غلام نہیں تو اور ہو کون؟ تمہارے بہنوئی تم کو بٹھا کر کپڑا لے گئے ہیں۔

خوجی پینک سے چوٹے تھے۔ سپاہی اور بزاز میں جب باتیں ہی رہی تھیں تب وہ

پنک میں تھے۔ جھلا کر بولے، ابے کس کا بہنوئی؟ اور کون سالا؟ کچھ واہی ہوا ہے؟

اتنے میں ایک آدمی نے آخر خوجی سے کہا، تمہارے بہنوئی تمہیں یہ خط دے گئے

ہیں۔ خوجی نے کھول کر پڑھا تو لکھا تھا:

ہت تیری کی، کیوں؟ کھا گیا نہ جھانسا؟ دیکھ اب کی پھر پھانسا تب کی بیوی بن کے

چپتیا، اب کی بہنوئی بن کے جھانسا دیا۔ اور انیم کھاؤ گے؟

خوجی، ارے! کر کے رہ گئے۔ واہ رے بہرہوچے اچھا گھن چکر بنایا۔ خیر اور تو جو ہوا وہ

ہوا اب یہاں سے چھٹکارا کیسے ہو۔ بزاز اس دم ٹٹروں ٹوں اور کروی پاس نہیں۔ مگر ایک دفعہ رعب جمانے کی ٹھانی۔ دوکان کے نیچے اتر کر بولے، اس پھیر میں بھی نہ رہنا میں نے بڑے بڑوں کی گردنیں ڈھیلی کر دی ہیں۔

بزاز: یہ رعب کسی اور پر جمائیے گا۔ جب تک آپ کے بہنوئی نہ آئیں گے دوکان سے ہٹنے نہ دوں گا۔

بارے تھوڑے ہی دیر میں ایک آدمی نے آکر بزاز کو گچس روپے دیے اور کہا اب ان کو چھوڑ دیجیے۔

(34)

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر آزاد سے ایک آدمی نے آکر کہا جناب آج میلہ دیکھنے نہ چلیے گا؟ وہ وہ صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ دیکھنا ہی رہ جائے۔

باز سے پانچے اٹھائے ہوئے شرم سے جسم کو چرائے ہوئے
نعرۂ بادۂ شباب سے چور، چال مستانہ حسن پر مغرور
سیکڑوں بل کر کو دیتی ہوئی جان طاؤس کبک لیتی ہوئی
چلیے اور مہاں خوجی کو ساتھ لیجیے۔ آزاد رینگتے تھے ہی، چٹ تیار ہو گئے۔ ج دج کر
اکڑتے ہوئے چلے۔ کوئی پچاس قدم چلے ہوں گے کہ ایک جھروکے سے آواز آئی۔
خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شان آئینے کو یاد کرتے ہیں

مہاں آزاد نے جو اوپر نظر کی تو جھروکے کا دروازہ خوبی کی آنکھ کی طرح بند ہو گیا۔
آزاد حیران کہ خدا یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ ہادو تھا، چھلاوا تھا، آخر تھا کیا؟ آزاد کے ساتھی نے یہ
رنگ دیکھا تو آہستہ سے کہا حضرت اس پھیر میں نہ پڑیے گا۔

اتنے میں دیکھا کہ وہ نازنین بھر نقاب اٹھائے جھروکے پر آکھڑی ہوئی اور اپنی مہری
سے بولی، ففس تیار کراؤ ہم میلے جائیں گے۔

آزاد کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اوپر سے ایک کانڈ نیچے آیا۔ آزاد نے دوڑ کر اٹھایا تو
موٹے قلم سے لکھا تھا:

دل لگی کرتی ہیں پریاں میرے دیوانے سے
آزاد پڑتے ہی اچھل پڑے۔ یہ شعر پڑھا:

ہم ایسے ہو گئے اللہ اکبر! اے تیری قدرت
ہمارے نام سے اب ہاتھ وہ کالوں پہ دھرتے ہیں

اتنے میں ایک مہری اندر سے آئی اور مسکرا کر میاں آزاد کو اشارے سے بلایا۔ آزاد خوش
خوش مہتابی پر پہنچے تو دل باغ باغ ہو گیا۔ دیکھا ایک حسینہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے ایک کرسی پر
بیٹھی ہے۔ میاں آزاد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی معلوم ہوتا ہے آپ چوٹ کھائے
ہیں کسی کے زلف میں دل پھنسا ہے۔

کھلتے ہیں کچھ اشتیاق کے طور
رخ میری طرف نظر کہیں اور

آزاد نے دیکھا تو اس نازنین کی شکل و صورت حسن آرا سے ملتی تھی۔ وہی صورت وہی
گلاب سا چہرہ۔ وہی لعلی آنکھیں بال برابر بھی فرق نہیں۔ بولے برسوں اس کو بچے کی سیر کی
مگر اب دل پھنسا چکے۔

حسینہ: تو بسم اللہ جائیے۔

آزاد: جیسی حضور کی مرضی۔

حسینہ: واہ ری بد دماغی، کہیے تو آپ کا کچا چننا کہہ چلوں؟ میاں آزاد آپ ہی کا نام
ہے نہ؟ حسن آرا سے آپ ہی کی شادی ہونے والی ہے نہ؟
آزاد: یہ باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں؟

حسینہ: کیوں کیا بچے کی کہی! اب بتا ہی دوں؟ حسن آرا میری چھوٹی چچا زاد بہن ہے۔
کبھی کبھی خط آجاتا ہے۔ اس نے آپ کی تصویر بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ انھیں بھیجی میں روک
لیتا۔ اب آپ ہمارے یہاں ٹھہریں۔ میں آپ کو آزماتی تھی کہ دیکھوں کتنے پانی میں ہیں۔
اب مجھے یقین ہو گیا کہ حسن آرا سے آپ کو بچی محبت ہے۔

آزاد: تو پھر میں یہیں اٹھ آؤں؟

حسینہ: ضرور۔

آزاد: شاید آپ کے گھر میں کسی کو ناگوار گزرے؟

حسینہ : واہ آپ خوب جانتے ہیں کہ کوئی شریف زادی کسی اجنبی آدمی کو اس طرح بے
 دھڑک اپنے یہاں نہ بلائے گی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ تمہارے بھائی صاحب کسی غیر آدمی کو
 بیٹھے دیکھیں گے تو ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگے گا؟ مگر وہ تو خود اس وقت تمہاری تلاش
 میں لکے ہیں۔ بہت دیر سے گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔ اب آپ میرے آدمی کو بھیج
 دیجیے۔ آپ کا اسباب لے آئے۔

آزاد نے خوبی کے نام یہ رقعہ لکھا:

خواجہ صاحب!

اسباب لے کر اس آدمی کے ساتھ چلے آئے۔ یہاں اتفاق سے حسن آرا کی بہن مل
 گئیں۔ یار ہم تم دونوں ہیں قسمت کے دہنی، یہاں انیم کی دکان بھی قریب ہے۔
 تمہارا، آزاد!

(35)

خوبی نے دل میں ٹھان لی کہ اب جو آئے گا اس کو خوب غور سے دیکھوں گا۔ اب کی
 چمکہ چل جائے تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ دو دفعہ کیا جانیں، کیا بات ہوگی کہ وہ چمکہ دے
 گیا۔ یہاں اڑتی چڑیا پکڑنے والے ہیں۔ ہم بھی اگر یہاں رہتے ہوتے تو اس مردود
 بہروپے کی چچا ہی بنا کر چھوڑتے۔

اتنے میں سامنے یکا یک ایک گھیارا گھاس کا گٹھاسر پر لادے پسینے میں تر آکھڑا ہوا
 اور خوبی سے بولا، حضور، گھاس تو نہیں چاہیے؟

خوبی : (خوب غور سے دیکھ کر) چل اپنا کام کر۔ ہمیں گھاس واس کچھ نہیں چاہیے۔
 گھاس کوئی اور کھاتے ہوں گے۔

گھیارا : لیے لیجے حضور ہری ہری دوب ہے۔

خوبی : چل بے چل ہم پہچان گئے ہم سے بہت چمکے بازی نہ کرنا بچو۔ اب کی پلیٹھن
 ہی نکال ڈالوں گا۔ تیرے بہروپے کی دم میں رستا۔

اتفاق سے گھیارا بہرا تھا۔ وہ سمجھا بلاتے ہیں۔ ان کی طرف آنے لگا۔ تب تو میاں
 خوبی غصہ ضبط نہ کر سکے اور چلا اٹھے او گیدی، بس آگے نہ بڑھنا نہیں تو سر دھڑ سے جدا

ہوگا۔ یہ کہہ کر لپکے اور گٹھا پکڑ کر چاہا کہ گھسیارے کو چپت لگاویں۔ اس نے جو جھڑانے کے لیے زور کیا تو میاں خوجی منہ کے بل زمین پر آ رہے اور گٹھا ان کے اوپر گر پڑا۔ جب آپ گٹھے کے نیچے سے غرائے گئے۔ اچھے او گیدی، اتنی کرولیاں بھونکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ بدعاش نے ناگوں دم کر دیا۔ بارے بڑی مشکل سے آپ گٹھے کے نیچے سے نکلے اور منہ بھلائے بیٹھے تھے کہ آزاد کا آدی آکر بولا۔ چلیے آپ کو میاں آزاد نے بلایا ہے۔ خوجی: کس سے کہتا ہے؟ کبخت اب کی سند سیا بن کر آیا! جب کی گھسیارا بنا تھا۔ پہلے عورت کا بھیس بدلا۔ پھر سیا ہی بنا چل بھاگ!

آدی: رتھ تو پڑھ لیجیے۔

خوجی: میں جلتی بلتی لکڑی سے داغ دوں گا سمجھے؟ مجھے کوئی لوٹا مقرر کیا ہے؟ تیرے جیسے بہروپے یہاں جب میں پڑے رہتے ہیں۔

آدی نے جا کر آزاد سے سارا حال کہا۔ حضور وہ تو کچھ جھلائے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کیا انھوں نے ایک تو سنی نہیں۔ بس، دور ہی دور سے غراتے رہے۔ آزاد: خط کا جواب لائے؟

آدی: غریب پرور، کہتا جاتا ہوں کہ قریب پھٹکنے تو دیا نہیں جواب کس سے لاتا؟ یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ اس حسینہ کے شوہر آپنیچے اور کہنے لگے۔ شہر بھر گھوم آیا سیکڑوں چکر لگائے مگر میاں آزاد کا کہیں پتہ نہ چلا۔ سرائے میں گیا تو وہاں خبر ملی کہ آئے ہیں۔ ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے، ان سے پوچھا تو بڑی دل لگی ہوئی۔ جیوں ہی میں قریب گیا تو وہ کلبلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کون؟ آپ کون؟ میں نے کہا یہاں: میاں آزاد نامی کوئی صاحب تشریف لائے ہیں؟ بولے پھر آپ سے واسطہ؟ میں نے کہا: صاحب آپ تو کانے کھاتے ہیں۔ تو مجھے غور سے دیکھ کر بولے: اس بہروپے نے تو میری ناک میں دم کر دیا۔ آج بھلے مانس کی صورت بنا کر آئے ہیں۔

بیگم: ذری اوپر آؤ۔ دیکھو ہم نے میاں آزاد کو گھر بیٹھے بلوا لیا۔ نہ کہو گے۔

آزاد: آداب بجا لاتا ہوں۔

مرزا: حضرت آپ کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی تھیں۔

آزاد: میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔

مرزا: جناب اس کا ذکر نہ کیجیے۔ آپ سے ملنے کی مدت سے قناتھی۔

ادھر میاں خرمی اپنے دل میں سوچے کہ بہروپے کو کوئی ایسا چمکہ دینا چاہیے کہ وہ بھی عمر بھر یاد کرے۔ کئی گھنٹے تک اسی فکر میں غوطے کھاتے رہے۔ اتنے میں مرزا صاحب کا آدمی بھر آیا۔ خرمی نے اس سے خط لے کر پڑھا تو لکھا تھا۔ آپ اس آدمی کے ساتھ چلے آئیے ورنہ بہروپیا آپ کو بھر دھوکا دے گا۔ بھائی کہا مانو جلدی آؤ۔ خرمی نے آزاد کی لکھاوت بیکانی تو اسباب وغیرہ سمیٹ کر خدمت گار کے سپرد کیا اور کہا تو جا ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ خدمت گار تو اسباب لے کر ادھر چلا ادھر آپ بہروپے کے مکان کا پتا پوچھتے ہوئے ہا پہنچے۔ اتفاق سے بہروپیا گھر میں نہ تھا، اور اس کی بیوی اپنے سینکے بیجیے کے لیے کپڑوں کا ایک پارسل بنا رہی تھی۔ تیس روپے کی ایک گڈی بھی اس میں رکھ دی تھی۔ پارسل تیار ہو چکا تو لوٹری سے بولی۔ دیکھ کوئی پڑھا لکھا آدمی ادھر سے نکلے تو اس پارسل پر پتا لکھوا لینا۔ لوٹری راہ دیکھ رہی تھی کہ میاں خرمی جا نکلے۔

خرمی: کیوں نیک بخت ذرا پانی پلا دوگی؟

لوٹری یہ سنتے ہی پھول گئی۔ خرمی کی بڑی خاطر داری کی، پان کھلایا، حقہ پلایا اور اندر سے پارسل لا کر بولی میاں اس پر پتہ تو لکھ دو۔

خرمی: اچھا لکھ دوں گا۔ کہاں جائے گا؟ کس کے نام ہے؟ کون بھیجتا ہے؟

لوٹری: میں بیوی سے سب حال پوچھ آؤں، تو بتاؤں۔

خرمی: اچھی بات ہے جلد آنا۔

لوٹری دوڑ کر پوچھ آئی اور پتہ ٹھکانہ بتانے لگی۔

خرمی چمکہ دینے تو گئے ہی تھے، جھٹ پارسل پر اپنا لکھنؤ کا پتہ لکھ دیا اور اپنی راہ لی۔ لوٹری نے فوراً ڈاک خانے میں پارسل دیا اور رجسٹری کرا کے چلتی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بہروپیا جو گھر میں گھسا تو بیوی نے کہا تم بھی بڑے بھلکھو ہو۔ پارسل پر پتا لکھا ہی نہ تھا۔ ہم نے لکھوا کر بھیج دیا۔

بہروپیا: دیکھوں، رسید کہاں ہے؟ (رسید پڑھ کر) اف! مار ڈالا۔ بس غضب ہی ہو گیا۔

بیوی: خیر تو ہے۔

بہروپیا: تم سے کیا بتاؤں؟ یہ وہی مرد ہے جس سے میں نے کئی روپے اٹھائے تھے، بڑا

(36)

میاں آزاد مرزا صاحب کے ساتھ جہاز کی فکر میں گئے۔ ادھر خوبی نے الفیم کی چسکی لگائی اور پتنگ پر دراز ہوئے۔ زمین لوٹھی جو باہر آئی تو حضرت کو پتنگ میں دیکھ کر خوب کھلکھلائی، اور بیگم سے جاکر بولی: بیوی ذری پردے کے پاس آئیے، تو لوٹ پوٹ جائیے۔ سوا خوبی الفیم کھائے اوندھے منہ پڑا ہوا ہے۔ ذری آئیے تو سہی۔ بیگم نے پردے کے پاس سے جھانکا تو ان کو ایک دل لگی سوچھی۔ جھپ سے ایک بتی بنائی اور زمین سے کہا کہ لے چپکے سے اس کی ناک میں بتی کر۔ زمین ایک ہی شریر، بس کی گانٹھ۔ وہ جاکر بتی میں تیتا مرج لگا لائی اور خوبی کی کھنیا کے نیچے کھس کر میاں خوبی کی ناک میں آدمی بتی داخل ہی تو کر دی۔ اف! اس وقت مارے ہنسی کے لکھا نہیں جاتا۔ خوبی جو کھلا کر اٹھے تو آچھی چھی چھی او گید۔ آں چھی! او گیدی کہنے کو تھی کہ چھینک آگئی، اور بگڑے، او تا۔ آچھ۔ او نامتقول کہنے کو تھے کہ چھینک نے زبان بند کر دی۔ اتفاق سے پڑوس میں ایک پرانے فیشن کے بھلے آدمی نوکری کی تلاش میں ایک حاکم کے پاس جانے والے تھے۔ وہ جیسے ہی سامنے آئے ویسے ہی خوبی نے پھینکا۔ بے چارے اندر چلے گئے۔ پان کھایا ذرا دیر ادھر ادھر ٹہلے۔ پھر ڈیوڑھی تک پہنچے کہ چھینک پڑی۔ پھر اندر گئے۔ چھنی ڈلی کھائی۔ روانہ ہونے ہی کو تھے کہ ادھر آں چھی کی آواز آئی اور ادھر بیوی نے لوٹھی نے دوڑائی کہ چلیے اندر بلاتی ہیں۔ اندر جا کے انھوں نے جوتے بدلے پانی پیا اور رخصت ہوئے۔ باہر آکر اُسے میں بیٹھے ہی تھے کہ خوبی نے ناک کی دتالی بندوق سے ایک اور فیر داغ دی۔ تب تو وہ بہت ہی جھلائے۔ ہت تیری ناک کانوں اور پاؤں تو کان بھی صاف کتر لوں۔ مردک نے مرچوں کی ناس لی ہے کیا؟ ناک کیا تک چھینکنی کی جھاڑی ہے۔ نمخوس نے گھر سے لٹکا مشکل کر دیا۔ بیوی اندر سے بولی کہ ناک ہی کئے موئے کی۔ ذری زمین کو بلا کر پوچھو کہ یہ کس کٹھے کو بسایا ہے؟ اللہ کرے، گدھے کی سواری نصیب ہو۔

میاں بیوی پانی پی پی کر بھارے کو کوس رہے تھے۔ ادھر خوبی کا چھینکتے چھینکتے حلیہ بگڑ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ گھر کے اندر سے ہنسی کے مارے لوٹی پڑتی تھیں۔ مگر واہ ری زمین! وہ دم

سادھے اب تک چارپائی کے نیچے دکی پڑی تھی۔ مگر مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ جب چھینکوں کا زور ذرا کم ہوا تو انھوں نے غل مچایا، اوگیدی، بھلا دے بہروپے، نکالی نہ کسر تو نے۔ اچھا بچہ، چچا ہی بنا کر چھوڑوں تو سہی۔ چارپائی سے اٹھے، منہ ہاتھ دھویا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے خوب تریڑے دیے، کھوپڑی پر خوب پانی ڈالا، تب ذرا تسکین ہوئی۔ بیٹھ کر بہروپے کو کوسنے لگے۔ خدا کرے، سانپ کاٹے مردود کو۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا ضد پڑ گئی ہے۔ کل تیرے چھپر پر چنگاری نہ رکھ دی، تو کہنا۔

یوں کوستے ہوئے انھوں نے سب دروازے بند کر لیے کہ بہروپیا پھر نہ آجائے۔ اب تو زمین چکرائی۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا اور قریب تھا کہ چیخ کر نکل بھاگے، مگر جب میاں خوبی چارپائی پر دراز ہو گئے اور ناک پر ہاتھ رکھ لیا، تو زمین کی جان میں جان آئی۔ چپکے سے کھسکتی ہوئی نکل اور اندر بھاگی۔

بنگم: جاؤ پھر ناک میں بتی کرو۔

زمین: تابی بی، اب میں نہیں جانے کی، سڑی سودائی آدمی کے منہ کون لگے۔ زمین کا دیور دس برس کا چھوکر بڑا ہی شریر تھا۔ نس نس میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ کمرے میں جا کے جھانکا تو دیکھا حضرت پینک لے رہے ہیں۔ کتا گھر میں بندھا تھا۔ جھٹ اس کو زنجیر سے کھول زنجیر میں رسی باندھی اور باہر لے جا کر چارپائی کے پائے میں کتے کو باندھ دیا۔ خوبی کی ٹانگ میں بھی وہی رسی باندھ دی اور چپٹ ہو گیا۔ کتے نے جو بھونکنا شروع کیا، تو خوبی چونک کر اٹھے۔ دیکھتے ہیں تو ٹانگ میں رسی اور رسی میں کتا۔ اب ادھر خوبی چلاتے ہیں، ادھر کتا چل پوں مچاتا ہے۔ زمین دوڑی گھر میں سے آئی۔ خیر تو ہے! کیا ہوا؟ ارے، تمھاری ٹانگ میں کتا کون باندھ گیا؟

خوبی: یہ اسی بہروپے مردک کا کام ہے، کسی اور کو کیا پڑی تھی؟

زمین: مگر، موا آیا کدھر سے؟ کواڑے تو سب بند پڑے ہوئے ہیں۔

خوبی: یہی تو مجھے بھی حیرت ہے۔ مگر اب کی میں نے بھی ناک پر اس زور سے ہاتھ رکھا کہ بہروپیا بھی میرا لوہا مان گیا ہوگا۔ مگر یہ تو سوچو کہ آیا کس طرف سے؟ زمین: میاں، کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اس جگہ ایک شیطان رہتا ہے۔ خوبی: شیطان! اجی نہیں یہ اس بہروپے ہی کا کام ہے۔

زمین : اب تم یوں تھوڑے ہی مانو گے۔ ایک دن شیطان چارپائی الٹ دے گا، تو معلوم ہوگا۔

خوبی : یہ بات تھی، تو اب تک ہم سے کیوں نہ کہا بھلا، جان لوگی کسی کی؟
زمین : میں بھی کہوں کہ بند دروازے سے کتا آیا کیسے؟ میرا ماتھا ٹھکا تھا، مدام بولی نہیں۔

خوبی : اب آزاد آئیں تو ان کو آڑے ہاتھوں لوں۔ وہ بھوت چڑیل ایک کے بھی قابل نہیں۔ سوئیں تو معلوم ہو۔

خوبی تو اسی فکر میں بیٹھے بیٹھے پنک لینے لگے۔ آزاد اور مرزا صاحب آئے تو انھیں اونگھتے دیکھ کر دونوں ہنس پڑے۔

آزاد : (خوبی کے کان میں) کیا پہنچ گئے؟

خوبی نے ہانک لگائی : 'بہروپیا، بہروپیا' اور اس زور سے آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اپنے حساب چور کو گرفتار کیا تھا۔ آنکھیں تو حضرت کی بند ہیں، مگر بہروپیا بہروپیا غل مچاتے جاتے ہیں۔ میاں آزاد نے اس زور سے جھٹک دیا کہ ہاتھ چھوٹ گیا اور خوبى پھٹ سے منہ کے بل زمین پر آ رہے۔ آزاد نے غل مچایا کہ بھاگا بھاگا، وہ بہروپیا بھاگا جاتا ہے۔ خوبى بھی 'لینا لینا' کہتے ہوئے لپکے۔ دس ہی پانچ قدم چل کر آپ ہانپ گئے اور بولے 'نکل گیا، نکل گیا'۔ میں نے تو گردن تاپی تھی مگر نالی سچ میں آگئی، اس سے بچ گیا ورنہ پکڑ ہی لیتا۔

آزاد : اجی، میں تو دیکھ ہی رہا تھا کہ آپ بہروپے کے کلمے تک پہنچ گئے تھے۔

اتنے میں ایک قاضی صاحب میاں آزاد سے ملنے آئے۔ آزاد نے نام پوچھا، تو بولے عبداللہ قدوس۔

خوبی : کیا! استو قدوس! یہ نئی گڑھت کا نام ہے۔

آزاد : نہایت گستاخ آدمی ہو تم، بس چونچ سنبھالو۔

خوبی کی آنکھیں بند تھیں۔ جب آزاد نے ڈانٹ بتائی، تو آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ قاضی صاحب پر نظر پڑی۔ دیکھتے ہی آگ ہو گئے اور بکتنے لگے۔ اور دیکھیے گا ذری مردود آج مولانا بن کر آیا ہے۔ بھئی، گرگٹ کے سے رنگ بدلتا ہے اس دن گھسارا بنا تھا آج مولوی بن بیٹھا۔

قاضی صاحب بہت جھینپے۔ مگر آزاد نے کہا کہ جناب یہ دیوانہ ہے؟ یوں ہی اول جلول بکا کرتا ہے۔

جب قاضی صاحب چلے گئے تو آزاد نے خوبی کو خوب للکارا، نامعقول، بنا دیکھے بھالے بے سمجھے بوجھے جو چاہتا ہے بک دیتا ہے۔ کچھ پڑھے لکھے ہوتے تو آدمیوں کی قدر کرتے۔ لکھے نہ پڑھے، نام محمد فاضل۔

خوبی: جی ہاں، بس اب ایک آپ ہی تو بڑے لقمان بنے ہیں۔ ہم کو یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی گدھا ہے۔ اور یہاں عربی چائے بیٹھے ہیں۔ افعال، فالو ما فالت اور سینے، غلم غلمو۔

مرزا: یہ کون سینہ ہے بھائی؟

خوبی: جی یہ سینہ الم غلم ہے۔ یہاں دیوان زبان پر ہیں۔ مگر مفت کی شنی جتانے سے کیا فائدہ۔

مرزا صاحب کے گھر کے سامنے ایک تالاب تھا۔ خوبی ابھی اپنے کمال کی ڈیک مار ہی رہے تھے کہ شور مچا، ایک لڑکا ڈوب گیا۔ دوڑو دوڑو پھراک اپنے کرتب دکھانے لگے۔ کوئی پل پر سے کودا دم۔ کوئی چبوترے سے آیا تڑ۔ کوئی ملاجی چیرتا ہے کوئی کھڑی لگا رہا ہے۔ نوٹیکھے اپنے کنارے ہی پر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، اور ڈرپوک آدمی تو دور ہی سے سیر دیکھ رہے ہیں۔ بھئی، پانی اور آگ سے زور نہیں چلتا، ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔

آزاد نے شور سنا تو دوڑے ہوئے پل پر آئے اور دم سے کود پڑے۔ غوطہ لگاتے ہی اس لڑکے کا ہاتھ مل گیا۔ نکال کر کنارے لائے تو دیکھا جان باقی ہے۔ لوگوں نے مل کر اس کو الٹا لٹکایا۔ جب پانی نکل گیا تو لڑکے کو ہوش آیا۔

اب سینے کہ وہ لڑکا سمیٹ کے ایک پارسی رئیس رستم جی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ ابھی آزاد لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر ہی کر رہے تھے کہ کسی نے جا کر رستم جی کو یہ خبر سنائی۔ بچارے دوڑے آئے اور آزاد کو گلے سے لگا لیا۔

رستم: آپ نے اپنے لڑکے کو ڈوبنے سے بچایا۔ ہم آپ کا بہت شکر گزار ہیں۔

آزاد: اگر آپس میں اتنی ہمدردی بھی نہ ہو تو آدمی ہی کیا؟

خوبی: سچ ہے، سچ ہے۔ ہم ایسے شیروں کے تم ایسے شیر ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی اگر

یہاں ہوتا تو ضرور کود پڑتا۔ مگر یار اب دعا مانگتی پڑی کہ یہ موٹی توند والا بھی کسی دن غوطہ کھائے تو پھر یاروں کے گہرے ہیں۔

آزاد: (پاری سے) میں بڑے موقع سے پہنچ گیا۔

رستم: اپنے کو بڑی خوشی کا بات چیت۔

خوبی: کچھ آلو کا پٹھا معلوم ہوتا ہے۔

رستم: کال آپ آوے تو ہمارا لیڈی لوگ آپ کو گانا سنا دے۔

خوبی: اچی، کیا بے وقت کی شہنائی بجاتے ہو؟ اچی کچھ انیم گھولو، چسکی لگاؤ، منھائی منگواؤ، رئیس کی دم بنے ہیں۔

رئیس: آپ تو اپنا کا باپ ہے۔

آزاد: کل میں ضرور آؤں گا۔

خوبی: ملی دادا! خوب پچھانا، واہ پٹھے!

رستم جی آزاد سے یہ وعدہ لے کر چلے گئے، تو خوبی اور آزاد بھی گھر آئے۔ شام کو رستم جی نے پانچ ہزار روپیوں کی ایک فیملی آزاد کے پاس بھیجی اور خط میں لکھا کہ آپ اسے ضرور قبول کریں۔ مگر آزاد نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دیا۔

(37)

ذرا خوبہ صاحب کی قطع دیکھیے، واللہ اس وقت فوٹو اتارنے کے قابل ہیں۔ نہ ہوا فوٹو، صبح کا وقت ہے۔ آپ کھا دیے کی ایک لنگی باندھے پتیل کے درخت کے سائے میں کھٹیا بچھائے ادھک رہے ہیں، مگر گڑگڑی بھی ایک ہاتھ میں تھامے ہیں۔ چاہے پیسے نہ، مگر چلم پر کونٹے دیکھتے رہیں۔ اتفاق سے ایک جیل نے درخت پر سے بیٹ کر دی۔ تب آپ چوکنے اور چوکنے ہی آئی گئے۔ بہت اچھے کودے اور اتنا غل چھایا کہ محلہ بھر سر پر اٹھالیا۔ ہت تیرے گیدی کی، ہمیں بھی کوئی وہ سمجھ لیا ہے۔ آج جیل بن کر آیا ہے۔ کرولی تو وہاں تک پہنچے گی نہیں، توڑے دار بندوق ہوتی تو وہ تاک کے نشانہ لگانا کہ یاد ہی کرتا۔

آزاد: یہ کس پر گرم ہو رہے ہو خوبہ صاحب؟

خوبی: اور اوپر سے پوچھتے ہو کس پر گرم ہو رہے ہو؟ گرم کس پر ہوں گے۔ وہی

بہرور پیا ہے جو مولوی بن کر آیا تھا۔

مرزا: تو پھر اب اسے کچھ سزا دیجیے۔

خوجی: سزا کیا خاکِ دوں! میں زمین پر، وہ آسمان پر۔ کہتا تو ہوں کہ توڑے دار بندوق مگلو دیجیے، تو پھر دیکھیے کیسا نشانہ لگاتا ہوں۔ مگر آپ کو کیا پڑی ہے۔ جائے گا تو غریب خواجہ کے ماتھے ہی۔

مرزا: ہم بتائیں، ایک زینہ مگلوادیں اور آپ پیڑ پر چڑھ جائیں، بھاگ کر جائے گا کہاں؟

خوجی: (اچھل کر) لانا ہاتھ۔

مرزا صاحب نے آدمی سے کہا کہ بڑا زینہ اندر سے لے آؤ، مگر جلد لانا، ایسا نہ ہو کہ بیٹھ رہو۔

خوجی: ہاں میاں، اسی سال آتا میرے یار دیکھو ایسا نہ ہو کہ گیدی بھاگ نکلے۔

آدمی: جب اندر سیڑھی لینے گیا تو بیگم نے پوچھا، سیڑھی کیا ہوگی؟

آدمی: حضور، وہی جو سڑی ہیں خفقان، ان پر کہیں چیل نے بیٹ کر دی، سواب سیڑھی لگا کر پیڑ پر چڑھیں گے۔

منسوڑ عورت، خوب ہی کھلکھلائی اور فوراً چھت پر جا پہنچی۔ آبی دوپٹہ کھسکا جاتا ہے، جوڑا کھلا پڑتا ہے اور زینہ کو لٹکار رہی ہیں کہ اس سے کبو جلد سیڑھی لے جائے۔ میاں خوجی نے سیڑھی دیکھی تو کمر کسی اور کانپتے ہوئے زینے پر چڑھنے لگے۔ اب آخری زینے پر پہنچ کر درخت کی ٹہنی پر بیٹھے تو چیل کی طرف منہ کر کے بولے گانس لیا گانس لیا، پھانس لیا، پھانس لیا، ہمت تیرے گیدی کی، اب جاتا کہاں ہے؟ لے اب میں بھی کچلے پر آ پہنچا۔ بچہ آج ہی تو پھنسنے ہو۔ روز جھانے دے کر اڑنچھو ہو جایا کرتے تھے۔ اب سوچو تو جاؤ گے کدھر سے؟ لے آئیے بس، اب چوٹ کے سامنے۔ میں نے بھی کرولی تیز کر رکھی ہے۔

اتنے میں پیچھے پھر کر دیکھتے ہیں تو زینہ غائب۔ لگے سر پینے۔ ادھر چیل بھی پھر سے اڑ گئی۔ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ بیگم صلبہ نے جو یہ کیفیت دیکھی تو تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگیں۔

خوجی: یہ مرزا صاحب کہاں گئے۔ ذری چار آنکھیں تو کیجیے ہم سے۔ آخر ہم کو آسمان

پر چڑھا کر قاعب کہاں ہو گئے؟ ارے یارو، کوئی سانس ڈکار ہی نہیں لیتا۔ ارے میاں آزاد، مرزا صاحب! کوئی ہے یا سب مر گئے؟ آخر ہم کب تک یہاں ٹکے رہیں گے۔
 بیگم: اللہ کرے پینک آئے۔

خوبی: یہ کون بولا؟ (بیگم کو دیکھ کر) واہ حضور، آپ کو تو ایسی دعا نہ دینی چاہیے۔
 میاں آزاد سوچے کہ خوبی اٹھی آدمی ایسا نہ ہو، پاؤں ڈگمگا جائیں تو مفت کا خون ہماری گردن پر ہو۔ آدمی سے کہا۔ زینہ لگا دو، بیگم نے جو سنا تو ہزاروں قسمیں دیں، خبردار سیزمی نہ لگنا۔ وارے سیزمی لگا دی گئی اور خوبی نیچے اترے۔ اب سب سے ناراض ہیں۔
 سب کو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے کیا مجھے مسخرہ سمجھ لیا ہے! آپ لوگوں جیسے میرے لڑکے ہوں گے۔

مرزا: بندگی۔ کہاں رہے سلارو، آج تو بہت دن کے بعد دکھائی دیے۔

سلارو: کچھ نہ پوچھیے خداوند، بڑی مصیبت میں پھنسا ہوں۔

مرزا: کیا ہے کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو؟

سلارو: کیا بتاؤں کہتے شرم آتی ہے۔ پرسوں میرا داماد میری لڑکی کو لیے گاؤں جا رہا تھا۔ جب تھانے کے قریب پہنچا تو تھانیدار صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی باگ روک لی اور میرے داماد سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے اپنا نام بتایا۔ اب تھانیدار صاحب اس فکر میں ہوئے کہ میری لڑکی کو بھلا کر رکھ لیں اور داماد کو دھتا بتا دیں۔ بولے بد معاش، یہ تیری بیوی نہیں ہو سکتی۔ سچ بتا یہ کون ہے؟ اور تو اسے کہاں سے بھگا لایا ہے؟

داماد: یہ میری جورو ہے۔

تھانیدار: سو، ہم تیرا چالان کر دیں گے۔ تیری ایسی قسمت کہاں کہ یہ حسینہ تجھ کو ملے۔ اگر تو ہماری نوکری کر لے تو اچھا، نہیں تو ہم چالان کرتے ہیں (عورت سے) تم کون ہو، بولو؟
 داماد: داروغہ جی، آپ مجھ سے باتیں کیجیے، اس سے نہ بولیے۔

میری لڑکی مارے شرم کے گڑے جاتی تھی۔ گردن جھکا کر قہر قہر کا نپتی تھی۔ اپنے دل میں سوچتی تھی کہ اگر زمین میں گڈھا ہو جاتا تو میں حُسن جاتی۔ سپاہی الگ لکار رہا ہے اور تھانیدار الگ کلتے پر سوار۔

داماد: میرے ساتھ کسی سپاہی کو بھیج دیجیے۔ معلوم ہو جائے کہ یہ میری بیامتا بیوی ہے یا نہیں۔

تھانیدار: چپ، بدمعاش، میں بدمعاشوں کی آنکھ پہچان جاتا ہوں۔ تم کہاں کے ایسے خوش نصیب ہو کہ ایسی پری تمہارے ہاتھ آئی۔ یہ سب بتاؤںٹ کی باتیں ہیں۔
سپاہی: ہاں، داروغہ جی، یہی بات ہے۔

آخر تھانیدار صاحب میری لڑکی کو ایک درخت کی آڑ میں لے گئے اور سپاہی نے میرے داماد کو دوسری طرف لے جا کے کھڑا کیا۔ تھانیدار بولا بیوی ذرا گردن تو اٹھاؤ، بھلا تم اس پر کئے کے قابل ہو! خدا نے چہرہ تو نور سا دیا ہے لیکن شوہر لنگور سا۔
لڑکی: مجھے وہ لنگور ہی پسند ہے۔

ادھر تو تھانیدار صاحب یہ اظہار لے رہے تھے، ادھر سپاہی میرے داماد کو اور ہی پٹی پڑھا رہا تھا۔ بھائی سنی صوبیدار صاحب کے سامنے تو میں ان کی سی کہہ رہا تھا۔ نہ کہوں تو جاؤں کہاں؟ مگر ان کی نیت بہت خراب ہے۔ چمٹا ہوا گرگا ہے۔

داماد: اور کچھ نہیں، میں سمجھ گیا کہ پھانسی ضرور پاؤں گا۔ اب تو مجھے چاہے جانے یا نہ جانے دے، میں اسے بے مارے نہ رہوں گا۔ اب بے عزتی میں باقی کیا رہ گیا۔
تھانیدار: سپاہی، سپاہی، یہ کہتی ہیں کہ یہ آدمی انھیں بھگا لایا ہے۔

لڑکی: جس نے یہ کہا ہو اس پر آسمان پھٹ پڑے۔
داماد: اب آپ کی مرضی کیا ہے؟ جو ہو صاف صاف کہیے۔

خیر، تھانیدار صاحب ایک کرسی پر ڈٹ گئے اور میری لڑکی سے کہا کہ تم اس سامنے والی کرسی پر بیٹھو، اب خیال کیجیے کہ گرمستہ عورت بنا گھونگٹ نکالے کوئیں تک پانی بھرنے بھی نہیں جاتی، وہ اتنے آدمیوں کے سامنے کرسی پر کیسے بیٹھتی۔ سپاہی جھک جھک کر دیکھ رہے تھے اور وہ ہجاری گردن جھکائے بت کی طرح کھڑی تھی۔ تب تھانیدار نے دھمکا کر کہا تم دس برس کے لیے بیچے جاؤ گے۔ پورے دس برس کے لیے!

داماد: جب کوئی جرم ثابت ہو جائے۔

تھانیدار: ہاں، آپ قانون بھی جانتے ہیں؟ تو ہم اب ضابطے کی کارروائی کریں۔
داماد: یہ کل کارروائی ضابطے ہی کی تو ہے۔ خیر، اس وقت تو آپ کے بس میں ہوں جو

چاہے کیجیے۔ مگر میرا خدا سب دیکھ رہا ہے۔

تھانیدار: تم ہمارا کہا کیوں نہیں مان لیتے؟ ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ تم نوکری کر لو اور اپنی جورو کو لے کر یہیں رہا کرو۔

داماد: آپ سے میں اب بھی منت سے کہتا ہوں کہ اس بات کو دل سے نکال ڈالیے۔ نہیں تو بات بڑھ جائے گی۔

اتنے میں کسی نے پیچھے سے آکر میرے داماد کی مشکلیں کس لیس اور لے چلے، اور ایک سپاہی میری لڑکی کو تھانیدار صاحب کے گھر کی طرف لے چلا۔ اب رات کا وقت ہے۔ ایک کمرے میں تھانیدار لڑکی کے پیروں پر گر پڑا۔ اس نے ایک ٹھوکر دی اور جھپٹ کر اس تیزی سے بھاگی کہ تھانیدار کے ہوش اڑ گئے۔ اب غور کیجیے کہ کم سن عورت، پردیس کا واسطہ، اندھیری رات، راستہ گم، میاں ندارد۔ سوچی یا خدا کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ کبھی میاں کی مصیبت پر روتی، کبھی اپنی حالت پر۔ اس طرح گرتی پڑتی چلی جاتی تھی کہ ایک تعلقے سے بھیٹ ہو گئی۔ بولا کون جاتا ہے؟ کون جاتا ہے چھپا ہوا؟ لڑکی تھر تھر کانپنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے بولی غریب عورت ہوں، راستہ بھول کر ادھر نکل آئی۔ آخر بڑی مشکل سے کانوں کا کرن بھول دے کر اپنا گلا چھڑایا۔ آگے بڑھی تو اس کا شوہر مل گیا سپاہیوں نے اسے ایک مکان میں بند کر دیا تھا، مگر وہ دیوار پھاند کر نکل بھاگا آ رہا تھا۔ دونوں نے خدا کا شکر کیا اور ایک سرائے میں رات کاٹی۔ صبح کو میرے داماد نے تھانیدار کو گھوڑے پر سے کھینچ کر اتنی لکڑیاں ماریں کہ بے دم ہو گیا۔ گاؤں والے تو تھانیدار کے دشمن تھے ہی، ایک نے بھی نہ بچایا بلکہ جب دیکھا کہ ادھ مرا ہو گیا تو دو چار نے لائیں بھی جمائیں۔ اب میرا داماد میرے گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ ہٹلائیے کیا کروں؟

خوجی: مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اسی بہرو پیے کی شرارت تھی۔

سلارو: کون بہرو پیا؟

مرزا: تمہاری سمجھ میں نہ آئے گا۔ یہ قصہ طلب بات ہے۔

سلارو: تو پھر مجھے حکم کیا ہوتا ہے؟ ہم تو غریب نکلے کے آدمی ہیں مگر آبرودار ہیں۔

آزاد: بس جا کر چمیں کرو۔ جب شور غل مچے تو آنا۔ صلاح کی جائے گی۔

سلارو نے سلام کیا اور چلا گیا۔

خوجی نے ایک دن کہا : ارے یارو، یہاں اندھیر ہے۔ تم روم چلے چلے بڑھے ہو جاؤ گے۔ کچھیں سنیں، دھوئیں چکھیں، اب بچہ سنبالو اور چلو۔ اب چاہے اھر کی دنیا اھر ہو جائے ہم ایک نہ مانیں گے۔ چلیے، اٹھیے، کوچ بولیے۔

آزاد : مرزا صاحب، اتنے دنوں میں خوجی نے تو ایک بھی تو بات کہی کہی۔ اب جہاز کا جلد انتظام کیجیے۔

خوجی : پہلے یہ بتائیے کتنے دنوں کا سفر ہے؟

آزاد : اسے کیا واسطہ؟ ہم کبھی جہاز پر سوار ہوئے ہوں تو بتائیں۔

خوجی : جہاز! ہائے غضب! کیا تری تری جانا ہوگا؟ میری تو روح کا پنے لگی۔ بمیا، میں نہیں جانے کا۔

آزاد : اچی چلو بھی، وہیں ترکی عورت کے ساتھ تمہارا بیاہ کر دیں گے۔

خوجی : خشکی خشکی چلو تو بھائی، میں چلوں گا۔ سمندر میں جاتے پاؤں ڈگمگاتا ہے۔

مرزا : جناب، آپ کو شرم نہیں آتی؟ اتنی دور تک ساتھ آئے اب ساتھ چھوڑ دیتے ہو؟

ڈوب مرنے کی بات ہے۔

خوجی : کیا خوب! یوں بھی ڈوبوں اور دوں بھی ڈوبوں؟ خشکی ہی خشکی کیوں نہیں چلتے؟

مرزا : آپ بھی واللہ زے چوچ ہی رہے۔ خشکی کی راہ سے کتنے دنوں میں پہنچو گے بھلا؟ خشکی کی ایک ہی کہی؟

خوجی : اب آپ سے حجت کون کرے۔ جہاز کا کون اعتبار۔ ذرا کسی سوراخ کی راہ سے پانی آیا، اور بس، پہنچے جہنم سیدھے۔

آزاد : تو نہ چلو گے؟ صاف صاف بتا دو، ابھی سویرا ہے۔

خوجی : چلیں تو چچ کھیت، مگر پانی کا نام سنا اور کلیجہ دلی اٹھا۔ بھلا کیوں صاحب یہ تو بتائیے کہ سمندر کا پاٹ لنگا کے پاٹ سے کوئی دوتا ہوگا یا کچھ کم بیش؟

مرزا : جی، بس اور کیا۔ چلیے آپ کو سمندر دکھلا دیں نہ، تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔

خوجی : کیوں نہیں، ہم کو لے چلیے اور چھپ چہر گٹو کر کے جہاز پر بٹھا دیجیے۔ ایک شرط

سے چلتے ہیں۔ بیگم صلیب ضمانت کریں۔ ہمارے سر کی قسم کھائیں کہ زبردستی نہ کریں گے۔
 آزاد: اس میں کیا دفعہ ہے۔ چلیے، ہم بیگم صلیب سے کھلائے دیتے ہیں۔ آپ اور
 آپ کے باپ دونوں کے سر کی قسم کھالیں تو سہی۔

مرزا: ہاں ہاں، وہ ضمانت کر دیں گی۔ آئیے اٹھیے۔

میاں آزاد اور مرزا دونوں مل کر گئے اور بیگم سے کہا اس سٹری سے اتنا کہہ دینا کہ تو
 جہاز دیکھنے جا۔ یہ لوگ زبردستی سوار نہ کریں گے۔ بیگم صلیب نے جو ساری داستان سنی تو تنک
 کر بولیں ہم نہ کہیں گے۔ آپ لوگوں نے ذرا سی بات نہ مانی اور سٹری ہٹا لی۔ اچھا، خیر
 پردے کے پاس بلا لو۔

خونہی نے پردے کے پاس آکر سلام کیا، مگر جواب کون دے۔ بیگم صلیب تو مارے ہنسی
 کے لوٹی جاتی ہیں۔ میاں آزاد کے خیال سے اپنی چلبلاہٹ پر لجاتی بھی ہیں شرم اور ہنسی،
 دونوں نے مل کر رخساروں کو اور بھی سرخ کر دیا۔ اتنے میں خونہی نے پھر ہانک لگائی کہ حضور
 نے غلام کو کیوں یاد فرمایا ہے؟

مرزا: کہتی ہیں کہ ہم ضمانت کیے لیتے ہیں۔

خونہی: آپ رہنے دیجیے، انہیں کو کہنے دیجیے۔

بیگم: خواجہ صاحب بندگی، آپ کیا پوچھتے ہیں؟

خونہی: یہ لوگ مجھے جہاز دکھانے لیے جاتے ہیں۔ جاؤں یا نہ جاؤں؟ جو حکم ہو وہ

کروں۔

بیگم: کبھی بھول کے نہ جانا نہیں تو پھر کے نہ آؤ گے۔

خونہی: آپ ان کی ضمانت کرتی ہیں۔

بیگم: میں کسی کی ضامن وامن نہیں ہوتی۔ ’زر دیجیے ضامن نہ ہو جیے‘، یہ ڈوبو ہی

دیں گے۔ موٹی کروٹی رکھی ہی رہے گی۔

خونہی: چلیے بس حد ہوگئی، اب ہم نہیں جانے کے۔

آزاد: بھئی، تم ذرا ساتھ چل کر میر تو دیکھ آؤ۔

خونہی: واہ! اچھی سیر ہے۔ کسی کی جان جائے آپ کے نزدیک سیر ہے۔ اب جانے

والے پر تین حرف۔

خیر، سمجھا بھا کر دلوں آدمی خوبی کو لے چلے۔ جب سمندر کے کنارے پہنچے تو خوبی اسے دیکھتے ہی کئی قدم پیچھے ہٹے اور چیخ پڑے۔ پھر دس پانچ قدم پیچھے کھٹکے اور رونے لگے۔ یا خدا بچائیے! لہریں دیکھتے ہی کسی نے کلیجے کو مسوس لیا۔

مرزا: کیا لطف ہے! خدا کی قسم، جی چاہتا ہے پھاند ہی پڑوں۔
 خوبی: کہیں بھول سے پھاند نے واہنے کا ارادہ نہ کرنا۔ حیا دار کے لیے ایک چلو کافی ہے۔

آزاد: عجب مسخرہ ہے بھائی! ایک آنکھ سے روتا ہے، ایک آنکھ سے ہنستا ہے۔
 اتنے میں دو چار ملاح سامنے آئے۔ خوبی نے جو انھیں غور سے دیکھا تو مرزا صاحب سے بولے۔ یہ کون ہیں بھائی؟ ان کی تو کچھ وضع ہی نرالی ہے۔ بھلا یہ ہماری بولی سمجھ لیں گے؟

مرزا: ہاں ہاں خوب! اردو خوب سمجھتے ہیں۔
 خوبی: (ایک ملاح سے) کیوں بھی انجمنی جہاز پر کوئی جگہ ایسی بھی ہے جہاں سے سمندر نظری نہ آئے اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں؟ سچ بتانا استاد! ابی ہم پانی سے بہت ڈرتے ہیں بھائی۔

انجمنی: ہم آپ کو ایسی جگہ بیٹھا دیں گے جہاں پانی کیا، آسمان تو سو جھ ہی نہ پڑے۔
 خوبی: ارے تیرے قربان۔ ایک بات اور بتا دو۔ گئے ملتے جائیں گے راہ میں یا ان کا اکال ہے۔

انجمنی: گئے وہاں کہاں؟ کیا کچھ منڈی ہے؟ اپنے ساتھ چاہے جتنے لے چلیے۔
 خوبی: ہائے، گنڈیریاں تازی تازی کھانے میں نہ آئیں گی۔ بھلا طوائف کی دوکان تو ہوگی؟ آخر یہ اتنے شوقین انجمنی جو جاتے ہیں تو کھاتے کیا ہیں؟
 انجمنی: ابی جو چاہو ساتھ رکھ لو۔

خوبی: اور جو منہ ہاتھ دھونے کو پانی کی ضرورت ہو تو کہاں سے آوے؟
 آزاد: پاگل ہے پورا! اتنا نہیں سمجھتا کہ سمندر میں جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ پانی کہاں سے آئے گا۔

خوبی: تو آپ کیوں الجھ پڑے؟ آپ سے پوچھتا کون ہے؟ کیوں یار انجمنی، بھلا ہم

گئے یاں سے ہاندھ لے چلیں اور جہاز پر چوسیں، مگر چھلکے پھینکیں گے کہاں۔ آخر ہم دن بھر میں چار چھ پوٹے کھایا ہی چاہیں۔

آزاد: یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، گنوں کے چھلکے کھانے پڑیں گے۔

خوجی: آپ سے کون بولتا ہے؟ کیوں بھئی، جو کرولی ہاندھیں تو ہرج تو نہیں ہے کچھ؟
ہانجی: لیسن لے لیجیے گا، اور کیا ہرج ہے؟

خوجی: دیکھیے ایک بات معلوم ہوئی نہ! اچھا، یہ بتاؤ کہ بہرودیا تو جہاز پر نہیں چڑھنے پاتے؟

ہانجی: چاہے جو سوار ہو، دام دے سوار ہو لے۔

خوجی: یہ تو تم نے بے ڈھب سنائی۔ جہاز پر کھار تو نہیں ہوتے؟
ہانجی: آج ملک کوئی کھار نہیں گیا۔

خوجی: اے میں تیری زبان کے قربان۔ بڑی ڈھارس ہوئی۔ خیر کھار سے تو بچے۔ باقی رہا بہرودیا، اس گیدی کو سمجھ لوں گا۔ اتنی کرولیاں بھونکوں کہ یاد ہی کرے۔ ہاں بس ایک اور بات بھی بتا دینا۔ یہ قید تو نہیں ہے کہ آدی صبح شام ضرور نہائے؟
ہانجی: معلوم دیتا ہے افیم بہت کھاتے ہو؟

خوجی: ہاں، خوب پہچان گئے۔ یہ کیوں کر بوجھ گئے بھائی؟ شوق ہو تو نکالوں؟
ہانجی: رام رام! ہم افیم چھوتے تک نہیں۔

خوجی: او گیدی! نکلے کا آدی اور جھک مارتا ہے۔ نکالوں کرولی؟

مرزا: ہاں ہاں خولجہ صاحب، دیکھیے ذرا کرولی میان ہی میں رہے۔

خوجی: خیر، آپ لوگوں کی خاطر ہے۔ ورنہ ادھیڑ کر دھر دیتا پاجی کو۔ آپ لوگ جج میں نہ پڑیں تو بھرس ہی نکال دیا ہوتا۔

اتنے میں گھوڑے پر سوار ایک انگریز آکر آزاد سے بولا۔ اس درخت کا کیا نام ہے؟
آزاد: اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں۔ ہم لوگ ذرا ان باتوں کی طرف کم دھیان دیتے

ہیں۔

انگریز: ہم اپنے ملک کی سب گھاس پھوس پہچانتا ہے۔

خوجی: ولایت کا ایک گھیارا معلوم ہوتا ہے۔

انگریز: چڑیا کا علم جانتا ہے آپ؟
 آزاد: جی نہیں یہ علم یہاں نہیں سکھایا جاتا۔
 انگریز: چڑیا کا علم ہم خوب جانتا ہے۔
 خوبی: چڑی مار ہے لندن کا۔ بس قلعی کھل گئی۔
 انگریز: گھوڑا بڑھا کر نکل گیا۔ ادھر آزاد اور مرزا صاحب کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

(39)

شام کے وقت مرزا صاحب کی بیگم پردے کے پاس آکر کہا۔ آج اس وقت کچھ چہل پہل نہیں ہے، کیا خوبی اس دنیا سے سدھار گئے؟
 مرزا: دیکھو خوبی، بیگم صلحہ کیا کہہ رہی ہیں؟
 خوبی: کوئی افیم تو پلویا نہیں، چہل پہل کہاں سے؟ لطفیے سناؤں تو افیم پلویاے گا؟
 بیگم: ہاں، ہاں، کہو تو! مرو بھی، تو پوتے ہی کے کھیت میں دفنائے جاؤ۔ کافور کی جگہ افیم ہو، تو سہی۔

خوبی: ایک خوش نویس تھے۔ ان کے قلم سے ایسے حروف نکلتے تھے جیسے سانچے کے ڈھلے ہوئے۔ مگر ان حضرت میں ایک سخت عیب یہ تھا کہ غلط نہ لکھتے تھے۔
 آزاد: کچھ جانگو ہو کیا؟

خوبی: خدا ان لوگوں سے بچائے۔ بھئی میرے تو ناکوں دم ہو گیا۔ بات پوری سنی نہیں اور اعتراض کرنے کو موجود۔ بات کاٹنے پر ادھار کھائے ہوئے ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ غلط نہ لکھتے تھے مگر عیب یہ تھا کہ اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کو قرآن لکھانے کی ضرورت ہوئی۔ سوچے کہ ان سے بڑھ کوئی خوش نویس نہیں اگر دس پانچ روپے زیادہ بھی خرچ ہوں تو بلا سے، لکھوائیں گے انھیں سے۔

بیگم: اے واہ ری عقل! کوئی آپ ہی کے سے جانگو ہوں گے۔ کلی گلی تو چھاپے خانے ہیں۔ کوئی چھاپا ہوا قرآن کیوں نہ مول لے لیا؟

خوبی: حضور، وہ سیدھے سادے مسلمان تھے۔ منفق (نیائے) نہیں پڑھے تھے۔ خیر

صاحب خوش نویس کے پاس پہنچے اور کہا حضرت جو اجرت مانگیے دوں گا مگر عرض یہ ہے کہ کیسے کہوں کیسے نہ کہوں۔ خوش نویس نے کہا۔ ضرور کیسے خدا کی قسم ایسا لکھوں کہ جو دیکھے پھڑک جائے۔ وہ بولے۔ حضرت یہ تو صحیح ہے لیکن اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھا دیجیے گا۔ خوش نویس نے کہا۔ کیا جال! آپ اطمینان رکھیے ایسا نہ ہونے پاوے گا۔ خیر وہ حضرت تو گھر گئے ادھر میاں خوش نویس لکھنے بیٹھے۔ جب ختم کر چکے تو کتاب لے کر چلے۔ لیجیے حضور قرآن موجود ہے۔ انھوں نے پوچھا۔ ایک بات صاف فرما دیجیے۔ کہیں اپنی طرف سے تو کچھ نہیں ملا دیا۔ خوش نویس نے کہا۔ جناب بدلتے یا بڑھاتے ہوئے ہاتھ کا پتہ تھے۔ مگر اس میں جگہ جگہ شیطان کا نام تھا۔ میں نے سوچا خدا کے کلام میں شیطان کا کیا ذکر؟ اس لیے کہیں آپ کے باپ کا نام لکھ دیا کہیں اپنے باپ کا۔

بیگم: بس یہی لطیفہ ہے؟ یہ تو سن چکی ہوں۔

خوبی: اس دھاندلی کی سند نہیں۔ جب انیم پلانے کا وقت آیا تو دھاندلی کرنے لگیں؟ مرزا صاحب بولے: اجی یہ پلوایں یا نہ پلوایں میں پلوائے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک تھالی میں تھوڑا سا کھٹا گھول کر خوبی کو پلا دیا۔ خوبی کو دن کو تو اونٹ سو جھتا نہ تھارات کو کھتے اور انیم کے رنگ میں کیا تمیز کرتے۔ پورا پیالہ چڑھا لیا اور انیم پینے کے خیال سے پینک لینے لگے۔ مگر جب رات زیادہ ہوئی تو آپ کو اگڑائیاں آنے لگیں، جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے پانی جاری ہو گیا۔ ڈبیا جب سے نکالی کہ شاید کچھ کھرچن ارچن پڑی پڑائی ہو، تو اس دم جی جاکیں۔ مگر دیکھا تو سفاحٹ، بس سن سے جان نکل گئی۔ آدمی رات کا وقت، اب انیم آئے تو کہاں سے؟ سوچے بھئی چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے انیم کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی لاویں گے۔ دن سے چل ہی تو کھڑے ہوئے۔ گلی میں سپاہی سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔

سپاہی: کون؟

خوبی: ہم ہیں خواجہ صاحب!

سپاہی: کس دفتر میں کام کرتے ہو؟

خوبی: پولس کے دفتر میں۔ مایک جی بھائی جی کی جگہ پر آج سے کام کرتے ہیں۔ یار اس وقت کہیں سے ذرا سی انیم لاؤ، تو بڑا احسان ہو۔ آخر استاد پالا ہمیں سے پڑے گا۔

تمہارے ہی دفتر میں ہیں۔

سپاہی: ہاں ہاں لیجیے اسی دم میں تو خود انیم کھاتا ہوں۔ انیم تو تو یہ ہے مگر اس وقت کھولے گا کاہے میں؟

خوبی: واہ سپاہی ہو کہ باتیں؟ گھر کی حکومت ہے! سرکاری سپاہی کو سبھی مانتے ہیں۔

سپاہی: اچھا، چلو پلا دیں۔

خوبی: واہ صوبیدار صاحب! بڑے بڑے وقت کام آئے۔ ہم آپ جاہے انجی آدمی شام کو انیم کھانا بھول گئے، آدھی رات کو یاد آیا، ڈیہا کھولی تو سناٹا لے کہیں سے پانی اور پیالی دلواد، تو جی انھیں۔

خیر، سپاہی نے خوبی کو خوب انیم پلائی۔ یہاں تک کہ گھر کو لوٹے تو راستہ بھول گئے۔ ایک بھلے مانس کے دروازے پر پہنچے تو پینک میں سوچھی کہ یہی مرزا صاحب کا مکان ہے۔ لگے زنجیر کھٹکھٹانے کھول کھولو، بھی اب تو کھڑا نہیں رہا جاتا۔ دروازہ کھول دینا۔

خوبی صاحب تو باہر کھڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں اور اندر سے اس مکان میں میاں کا دم نکلا جاتا ہے۔ کوئی ایک اوپر دس برس کا سن، کھیل کود کے دن، خوبی کے بھی چچا، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، قدم تین کم سوا دو انچ کا۔ سوا ہڈی اور چمڑے کے گوشت کا کہیں نام نہیں۔ اور ان کی بیوی خاصی دیونی، بٹی کٹی مسنڈی، بڑے ڈیل ڈول کی عورت، انھنی جوانی، مگر ایک آنکھ کی کانٹی۔ ایک گھونسا تان کے لگاوے تو شیدی لندھور کا بھرکس نکل جائے۔ کوئی دو تین کم بیس برس کی عمر۔ دونوں میٹھی نیند میں سو رہے تھے کہ خوبی نے دم دھانا شروع کیا۔ میاں: یا خدا بچائیے۔ اس اندھیری رات میں کون آیا؟ مارے ڈر کے روح کانپتی ہے، مگر جو بیوی کو جگاؤں اور مردانے کپڑے پہنا کر لے جاؤں تو یہ حضرت بھی کانپنے لگے۔

خوبی: کھولو، میٹھی نیند سونے والو کھولو، یہاں جاتے دیر نہیں ہوئی اور کواڑ جھپ سے

بندر کر لیے؟ کشیا دنیا سب غائب کر دی؟

میاں: بیگم، بیگم، کیا سو گئیں؟

وہاں سنا کون ہے جوانی کی نیند ہے کہ دل لگی۔ کوئی چارپائی بھی الٹ دے تو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سر پر جھکی پٹے، تو بھی آنکھ نہ کھلے۔ میاں آنکھوں کو مارے ڈر کے ایک ہاتھ سے بند کیے بیوی کے سر ہانے کھرے ہیں مگر تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ آخر ایک بار کچکا کچکا

خوب زور سے کندھا ہلایا اور بولے، اد بیگم سختی ہو کہ نہیں؟ بجلی ہیں مگر دم سادھے پڑی ہیں۔ بیگم (ہاتھ جھٹک کر) اے ہو لے کے کندھا اکھاڑ ڈالا۔ اللہ کرے یہ ہاتھ ٹوٹیں۔ ہماری میٹھی میٹھی نیند خراب کر دی۔ خدا جانتا ہے، میں تو کبھی ہالا ڈالا آگیا۔ خدا خدا کر کے ذرا آنکھ لگی تو یہ آفت آئی۔ اب کہ جگایا تو تم جانو گے۔ پھر اپنے داؤں کو تو بیٹھ کر روتے ہیں۔ بے حیا چل دور ہو۔

میاں: ارے، کیا پھر سوئیں گیں؟ جیسے نیند کے ہاتھوں بک گئی ہو۔ بیگم سختی ہو کہ نہیں بیگم: کیا ہے کیا؟ کچھ منہ سے بولو گے بھی؟ بیگم بیگم کی اچھی رٹ لگائی ہے۔ ڈر لگتا ہو تو منہ ڈھانک کر سو رہیں۔ ایک تو آپ نہ سوئیں دوسرے ہماری نیند بھی حرام کریں۔
خوجی: ارے بھی کھولو، مر گیا پکارتے پکارتے۔

میاں: بیگم خدا کرے بہری ہو جائیں۔ دیکھو تو یہاں کواڑ کون توڑے ڈالتا ہے؟ بندا تو اس اندھیاری میں ہمنے والا نہیں۔ ذری تھیں دروازے تک جا کر دیکھ لو۔
بیگم: جی! میری بیچارہ اٹھتی ہے۔ تمہاری تو وہی مثل ہوئی کہ روٹی کھائے دس بارہ، دودھ پیے، مٹکا، سارا، کام کرنے کو ننھا بیچارا۔ پہلے تو میں عورت ذات اور جو ڈر گئی تو پھر کیسی ہو؟ چور چکار سے بیوی کو بھڑواتے ہیں۔ مرد بنے ہیں، جو روا سے کہتے ہیں کہ باہر جا کر چور سے لڑو۔

خوجی: اجی بیگم صاحب خدا کی قسم افیم لانے گیا تھا۔ ذرا دروازہ کھلوا دیجیے۔ یہ مرزا صاحب اور مولانا آزاد تو میری جان کے دشمن ہیں۔

بیگم نے جو افیم کا نام سنا تو آگ بھجھو کا ہو گئیں۔ اٹھ کر میاں کے ایک لات لگائی، اور اوپر سے کوٹنے لگیں۔ اس افیم کو آگ لگے، پینے والوں کا ستیاناس ہو جائے۔ ایک تو میرے ماں باپ نے اس گھٹو کے کھونٹے میں باندھا۔ دوسرے اس کے ماں باپ نے افیم اس کی گھٹئی میں ڈال دی۔ کیوں جی تم نے تو قسم کھائی تھی کہ آج سے افیم نہ پیوں گا؟ تمہاری قسم کا اعتبار نہ زبان کا۔ قسم بھی کیا مولیٰ گا جبر ہے کہ کر کر کے چما گئے!

میاں: (گرو جھاڑ پونچھ کر) کیوں جی، اور جو میں بھی ایک لات کسکے جمانے کے لائق ہوتا تو پھر کیسی ٹھہرتی۔

بیوی: میں تو پہلے باتوں سے سمجھاتی ہوں اور کوئی نہ سمجھے تو پھر لاتوں سے خبر لیتی

ہوں۔ میں تو اس فکر میں ہوں کہ تم کو کھلا پلا کر ہٹا کتنا بنا دوں، پردی طے تو نہ دیں۔ اور تم پیو افیم، تو جی جٹے یا نہ جٹے؟

میاں صاحب دل ہی دل میں اپنے ماں باپ کو گالیاں دے رہے تھے۔ یہاں دھان پان آدمی، بیوی لاکے بٹھا دی دیوٹی۔ وہ تو بیاہ کر کے چھٹی پا گئے لاتیں ہمیں کھانی پڑتی ہیں۔ میں تو سمجھا کہ اپنا کام ہی تمام ہو گیا۔ مگر بے حیا جیوں کا تیوں موجود۔ بولے تمہاری جان کی قسم، کون مردود چندو کے قریب بھی گیا ہو۔ آج یا کبھی افیم کی صورت بھی دیکھی ہو۔ اور یوں خواہ مخواہ بدگمانی کا کون سا علاج ہے؟ ذرا چل کے دیکھو تو! آخر ہے کون؟ آؤ دیکھا نہ تاؤ کس کر ایک لات جمادی بس۔ اور جو کہیں کمر ٹوٹ جاتی؟

خوجی پینک میں زنجیر بکڑے تھے۔ ادھر میاں بیوی چلے تو اس طرح کہ بیوی آگے آگے چننا ہاتھ میں لیے ہوئے اور میاں پیچھے پیچھے مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے ہوئے۔ دروازہ کھلا تو خوجی دم سے گرے سر کے بل اور میاں مارے خوف کے خوجی پر ارار کر کے آرہے۔ بیوی نے اوپر سے دونوں کو دبوچا۔ خوجی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ نکل کر بھاگے تو ناک کی سیدھ میں چلے ہوئے مرزا صاحب کے مکان پر داخل۔ وہاں دیکھا خدمت گار پڑا خرائے لے رہا ہے۔ چپکے سے اپنی کھنیا پر دراز ہوئے مگر مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ سوچے ہم تو تھے ہی یہ میاں ہمرے بھی چچا نکلے۔

(40)

صبح کا وقت تھا میاں آزاد پینک سے اٹھے تو دیکھا بیگم صاحبہ منہ کھولے بے تکلفی سے کھڑی ان کی اُور نکلیوں سے تاک رہی ہیں۔ مرزا صاحب کو آتے دیکھا تو بدن کو چرا لیا، اور چھلانگ ماریں تو زہین کی اوٹ میں تھیں۔

مرزا: کیسے آج کیا ارادے ہیں؟

آزاد: اس وقت ہم کو کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلیے جو ترکی کے معاملے میں خوب واقف ہو۔ ہمیں وہاں کا کچھ حال معلوم ہی نہیں۔ کچھ سن تو لیں۔ وہاں کے رنگ ڈھنگ تو معلوم ہوں۔

مرزا: بہت خوب چلیے میرے ایک دوست ہیڈ ماسٹر ہیں۔ بہت ہی ذہین اور یار باش

آدی ہیں۔

آزاد تیار ہوئے تو بیگم نے کہا: اے تو کچھ کھاتے تو جاؤ۔ ایسی ابھی کیا جلدی ہے؟
آزاد: جی نہیں دیر ہوگی۔

بیگم: اچھا چائے تو پی لیجیے۔

تھوڑی دیر میں دونوں آدمیوں نے چائے پی، پان کھائے اور چلے۔ ہیڈ ماسٹر کا مکان
تھوڑی ہی دور تھا کھٹ سے داخل۔ سلام ولام کے بعد آزاد نے روم اور روس کی لڑائی کا تازہ
حال پوچھا۔

ہیڈ ماسٹر: ترکی کی حالت بہت نازک ہوگئی ہے۔

خوبی: یہ بتائیے کہ وہاں توپ داغ رہی ہے یا نہیں؟ دندان کی آواز کان میں آتی
ہے یا نہیں؟

ہیڈ ماسٹر: دندان کی آواز تو یہاں تک آچکی، مگر لڑائی چھڑ گئی ہے اور خوب زوروں سے
ہورہی ہے۔

خوبی: اف میرے اللہ! یہاں تو جان ہی نکل گئی۔

آزاد: میاں ہمت نہ ہارو، خدا نے چاہا تو فتح ہے۔

خوبی: ابی، ہمت گئی بھاڑ میں یہاں تو قافیہ تک ہوا جاتا ہے۔

آزاد: لڑائی روس سے ہورہی ہے یا آپس میں؟

ہیڈ ماسٹر: آپس ہی میں کھجیے۔ اکثر صوبے بگڑ گئے اور لڑائی ہورہی ہے۔

آزاد: یہ تو بری ہوئی۔

خوبی: بری ہوئی تو پھر جاتے کیوں ہو؟ کیا تباہی آئی ہے؟

ہیڈ ماسٹر: سریا کی فوج سرحد کو پار کر گئی۔ ترکوں سے ایک لڑائی بھی ہوئی۔ سنا ہے کہ

سربیا ہار گیا۔ مگر اس کا کہنا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔ ہم ڈٹے ہوئے ہیں اور ترکوں کو بوسینیا
کی سرحد پر زک دی۔

خوبی: اب میرے گئے بغیر بیڑا پار نہ ہوگا۔ قسم خدا کی اتنی کرو لیاں بھونکی ہوں کہ

پرے کے پرے صاف ہو جائیں۔ دل لگی ہے کچھ!

ہیڈ ماسٹر: دوسری خبر یہ ہے کہ سریا اور ترکوں میں سخت لڑائی ہوئی مگر نہ کوئی ہارا نہ

جیتا۔ سر میا والے کہتے ہیں کہ ہم نے ترکوں کو بھگا دیا۔

خوجی : بھئی آزاد، سنئے ہو؟ واپس چلو؟ اجی شرط تو یہی ہے کہ نہ کہ تحفے لٹاکر آؤ؟
آپ واپس چلیے میں ایک تمغہ بنوا دوں گا۔

کچھ دیر تک میاں آزاد اور ہیڈ ماسٹر صاحب میں یہی باتیں ہوتی رہیں۔ دس بجتے بجتے
یہاں سے رخصت ہو کر گھر آئے۔ جب کھانا کھا کر بیٹھے تو بیگم صاحبہ نے آزاد سے کہا حضرت
ذرا اس مصرعے پر کوئی مصرع لگائیے :

اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں۔

آزاد : ہاں، ہاں سنئے :

غیر دیکھے ان کی صورت اس کی تاب آئی نہیں

اس لیے تصویر جاناں..... نہیں

اس کی فرقت ذہن میں اپنے کبھی آئی نہیں

اس لیے تصویر جاناں..... نہیں

بیگم : کہیے، آپ کی خاطر سے تعریف کر دیں۔ مگر مصرعے ذرا پھیکے ہیں۔

آزاد : اچھا، لے آپ ہی کوئی چہچہا مصرع کہیے۔

بیگم : اے ہم عورت ذات بھلا شعر و شاعری کیا جانیں۔ اور جو آپ کی یہی مرضی ہے

تو لیجیے :

لوح دل ڈھونڈھا کیے پر ہاتھ ہی آئی نہیں

اس لیے..... نہیں

خوجی : واہ بیگم صاحبہ! آپ نے تو سلیمان ساؤجی کے بھی کان کانٹے۔ پر اب ذرا

میری اچ بھی سنئے گا :

چینک انیوں سے تک فرصت کبھی پائی نہیں

اس لیے..... نہیں

اس مصرعے کا سننا تھا کہ مرزا صاحب، ان کی ہنسوز بیوی اور میاں آزاد ہنستے ہنستے لوٹ

گئے۔ ابھی یہی چرچا ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک آدمی نے باہر سے آواز دی۔ مرزا نے زمین

سے کہا کہ جاؤ دیکھو تو کون ہے؟ میاں خلیفہ ہوں تو کہنا اس وقت ہم بال نہ بنائیں گے۔

تیسرے پہر کو آجائے۔ زہن آنا گوندھ رہی تھی۔ 'اچھا' کہہ کر چپ ہو رہی۔ آدی نے پھر باہر سے آواز دی۔ جب تو زہن کو مجبور ہو کر اٹھنا ہی پڑا۔ ناک بھوں چڑھاتی نوکر کو جلی کئی سناتی چلی۔ جو ہے میری ہی جان کا گاہک ہے۔ جسے دیکھو میرا ہی دشمن۔ واہ ایک کام چھوڑ دوسرے پر لپکو۔ اب کی چاند ہو تو میں تنخواہ لے کے اپنے گھر بیٹھ رہوں۔ کیوں گھوڑی نوکری کا بھی کچھ اکال ہے؟ زہن کا قاعدہ تھا کہ کام سب کرتی تھی مگر بڑبڑا کر۔ بات بات پر تنک جانا تو گویا اس کی گھٹئی میں پڑا تھا۔ مگر اپنے کام میں چست تھی۔ اس لیے اس کی خاطر ہوتی تھی۔ منہ پھلا کر باہر گئی۔ پہلے تو جاتے ہی خدمت گار کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ کیا گھر بھر میں میں ہی اکیلی ہوں؟ جو پکارتا ہے بھی کو پکارتا ہے موائے اللہ کے منہ میں نام پڑ گیا ہے۔ خدمت گار نے کہا: مجھ سے کیوں بگڑتی ہو؟ یہ میاں آئے ہیں حضور سے کر ان کا پیغام کہہ دو۔ مگر ذرا سمجھ بوجھ کر کہنا۔ سب باتیں سن لو اچھی طرح۔

زہن : (اس آدی سے) کون ہو جی؟ کیا کہتے ہو؟ تمہیں بھی اسی وقت آنا تھا؟
 آدی : طاح ہوں، اور ہوں کون؟ جا کر اپنے میاں سے کہہ دو آج جہاز روانہ ہوگا۔
 ابھی دس گھنٹے کی دیر ہے۔ تیار ہو جائیے۔
 زہن نے اندر جا کر یہ خبر دی۔ بیگم صاحبہ نے جہاز کا نام سنا تو دھک سے رہ گئیں۔
 چہرے کا رنگ پیکا پڑ گیا۔ کلبجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اگر ضبط نہ کرتیں تو آنسو جاری ہو جاتے۔
 مرزا: لیجیے حضرت اب کوچ کی تیاری کیجیے۔

آزاد : تیار بیٹھا ہوں، یہاں کوئی بڑا لمبا چوڑا سامان تو کرنا نہیں۔ ایک بیک، ایک درمی، ایک لوٹا، ایک لکڑی۔ چلیے اللہ اللہ خیر صلی اللہ، وقت پر دن سے کھڑا ہوں گا۔
 خوجی : یہاں بھی وہی حال ہے۔ ایک ڈبیا، اک پیالی، چندو پینے کی ایک ٹگالی، ایک کتارا، ایک دوٹا مٹائی کا، ایک چاقو، ایک کروٹی، بس اللہ اللہ خیر صلی اللہ، بندا بھی کیل کاٹنے سے درست ہے۔

یہ سن کر میاں آزاد اور مرزا صاحب دونوں ہنس پڑے۔ مگر بیگم صاحبہ کے ہونٹوں پر ہنسی نہ آئی۔ مرزا صاحب تو اسی وقت طاح سے باتیں کرنے کے لیے باہر چلے گئے اور میاں آزاد اور بیگم صاحبہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ کچھ دیر تک تو بیگم نے مارے رنج کے سر تک نہ اٹھایا۔ پھر بہت سنبھل کر بولیں میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔

آزاد: آپ گھبرائیے نہیں، میں جلد واپس آؤں گا۔
 بیگم: ہائے، اگر اتنی ہی امید ہوتی تو رونا کا بے کا تھا؟
 آزاد: صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ خدا بڑا کارساز ہے۔
 بیگم: آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ کیا آج ہی جاؤں گا؟ آج ہی! تمہارے جانے کے بعد میری نہ جانے کیا حالت ہوگی؟
 آزاد: خدا نے چاہا تو ہنسی خوشی پھر ملیں گے۔
 اتنے میں مرزا صاحب نے باہر سے آکر کہا کہ صبح کو ٹرکے جہاز روانہ ہوگا۔
 بیگم: یوں جانے کو سبھی جاتے ہیں لاکھوں مرد عورت ہر سال حج کرتے ہیں، مگر لڑائی میں شریک ہونا! بس یہی خیال تو مارے ڈالتا ہے۔
 آزاد: یہ لاکھوں آدمی جوڑنے جاتے ہیں، کیا سب کے سب مر رہے جاتے ہیں؟ پھر تقاضا کا وقت کون ٹال سکتا ہے جیسے یہاں ویسے وہاں۔
 مرزا: بھئی، میرا تو دل گواہی دیتا ہے کہ آپ سرخ رو ہو کر آئیں گے۔ اور یوں تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔
 بیگم: یہ سب باتیں تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر سمجھاؤں کسے؟
 مرزا: جب جانتی ہو، تب رونا دھونا بیکار ہے۔ ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ زمین پانی لاؤ۔ یہی تو تم میں عیب ہے کہ کام شام کو اور شام کا کام صبح کو کرتی ہو۔ لاؤ پانی چھلپٹ۔
 زمین: یا اللہ! اب آلو پھیلوں یا پانی لاؤں!
 آخر زمین دل ہی دل میں برا بھلا کہتی پانی لائی۔ بیگم نے منہ دھویا اور بولیں۔ اب میں کوئی ایسی بات نہ کہوں گی جس سے میاں آزاد کو رنج ہو۔
 خوبی: اجی میاں آزاد! چلنے کا وقت قریب آیا۔ کچھ میری بھی فکر ہے؟ وہ کرو لیٹے ہی لیتے رہ گئے؟ الیم کا کیا بندوبست کیا؟ یار کہیں ایسا نہ ہو کہ الیم راہ میں نہ ملے اور ہم جیتے جی مرئیں۔ ذری زمین کو بازار تک بھیج کر کوئی ساٹھ ستر قطارے تو گرم گرم منگوا دیجیے۔ نہیں تو میں جیتا نہ پھروں گا۔
 زمین: ہاں، زمین ہی تو گھر بھر میں خالتو ہے۔ لپک کر بازار سے لے کیوں نہیں آتے؟ کیا چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی؟ اور میں عورت ذات الیم لینے کہاں جاؤں گی بھلا؟

بیگم: راتے میں اس پگے کے سبب سے خوب چہل پہل رہے گی۔
 آزاد: ہاں، اسی لیے تو لیے جاتا ہوں۔ مگر دیکھیے کیا کیا بیہودگیاں کرتے ہیں؟
 خوبی: اجی، آپ سے سو قدم آگے رہوں تو سہی۔
 مرزا: اس میں کیا شک ہے؟ لیکن اس طرف کوئی بہرہ دیا ہوا تو کیسی ٹھہرے گی؟
 خوبی: سچ کہتا ہوں اتنی کردلیاں بھونکوں کہ یاد کرے۔ میں دغانے والی پلٹن میں
 رسالدار تھا۔ اودھ میں خدا جان کتنی گڈھیاں جیت لیں۔
 بیگم: اے رسالدار صاحب، آپ کی کردلی کیا ہوئی؟ مورچہ کھا گئی ہو تو صاف کر
 لیجیے۔ ایسا نہ ہو مورچے پر میان ہی میں ہے۔

زبین: رسالدار صاحب ہمارے لیے وہاں سے کیا لائیے گا؟
 خوبی: اجی، جیتے آویں تو یہی بڑی بات ہے۔ یہاں تو بدن کانپ رہا ہے۔
 انھیں باتوں میں چلنے کا وقت آگیا۔ آزاد نے اپنا اور خوبی کا سامان باندھا۔ کبھی تیار
 ہوئی۔ جب میاں آزاد نے چلنے کے لیے لکڑی اٹھائی تو بیگم بیچاری بے اختیار رو دیں۔ کانپتے
 ہوئے ہاتھوں سے امام خامن کی اثرنی باندھی اور کہا جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح منہ
 بھی دکھانا۔

میاں آزاد، مرزا اور خوبی جا کر گھنٹی میں بیٹھے۔ جب گاڑی چلی تو خوبی بولے ہم سے
 کوئی نہانے کو کہے گا تو ہم کردلی ہی بھونک دیں گے۔
 مرزا: تو جب کوئی کہے نہ؟

خوبی: ہاں بس اتنا یاد رکھیے گا ذرا اور ہم یہ بھی جتا دیے ہیں کہ گنا چوس چوس کر
 سمندر کے باپ میں پھینکیں گے اور جو کوئی بولے گا تو دبوچ بیٹھیں گے۔ ہاں ایسے ویسے نہیں
 ہیں یہاں!
 سامنے سمندر نظر آنے لگا۔

(41)

حسن آرا میٹھی نیند میں سو رہی تھی۔ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ ایک بوڑھے میاں سبز
 کپڑے پہنے اس کے قریب آکر کھڑے ہوئے اور ایک کتاب دے کر فرمایا کہ اسے لو اور اس

میں فال دیکھو۔ حسن آرا نے کتاب لی اور فال دیکھا تو یہ شعر تھا :

ہمیں کیا خوف ہے طوفان آوے یا بلا ٹوٹے

آنکھ کل گئی تو نہ بوڑھے میاں تھے، نہ کتاب۔ حسن آرا فال وال کی قائل نہ تھی مگر پھر بھی دل کو کچھ تسکین ہوئی۔ صبح کو وہ اپنی بہن سپہرا سے اس خواب کا ذکر کر رہی تھی کہ لوٹری نے آزاد کا خط لا کر اسے دیا۔

حسن آرا : ہم پڑھیں گے۔

سپہرا آرا : واہ، ہم پڑھیں گے۔

حسن آرا : (پیار سے جھڑک کر) بس یہی باتیں تو ہمیں بھاتیں نہیں۔

سپہرا آرا : نہ بھادیں دھمکائی کیا ہو؟

حسن آرا : میری پیاری بہن، دیکھو بڑی بہن کا اتنا کہنا مان جاؤ لاؤ خط خدا کے لیے۔

سپہرا آرا : ہم تو نہ دیں گے۔

حسن آرا : تم تو خواہ مخواہ ضد کرتی ہو، بچوں کی طرح چلی جاتی ہو۔

سپہرا آرا : رہنے دیجیے، واہ واہ! ہم اپنے آزاد کا خط نہ پڑھیں؟

یہ کہہ کر سپہرا آرا نے آزاد کا خط پڑھ سنایا :

اب تو جاتے ہیں ہند سے آزاد

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

آج جہاز پر سوار ہوتا ہوں۔ دو گھنٹے اور ہندستان میں ہوں۔ اس کے بعد سفر سفر سفر،

میں خوش ہوں مگر اس خیال سے جی بے چین ہے کہ تم بیقرار ہوگی۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ تم

بھی خوش ہو تو جی جاتا۔ اب تو یہی دھن ہے کہ کب روم پہنچوں۔ بس رخصت

تمہارا آزاد

’ہاں پیاری سپہرا آرا کو خوب سمجھانا۔ ان کا دل بہت نرم ہے۔ اس وقت خوبی پانی کی

صورت دیکھ کر کھل رہے ہیں۔

حسن آرا : یہ موا خوبی ابھی بیٹا ہی ہے؟

سپہرا آرا : اسے تو پانی کا نام سن کر بجوی چڑھ آتی تھی۔

حسن آرا : آخر بیچارے جہاز پر سوار ہو گئے۔ اب دیکھیں روم سے کب خط آتا ہے؟

سہر آرا: اب تو فال پر ایمان لائی؟ دیکھا میں کیا کہتی تھی اب مٹھائی کھلوائے۔ ذری کوئی یہاں آتا۔ پانچ روپے کی بچ میل مٹھائی لاؤ۔

حسن آرا: یہ کیا خط ہے؟

سہر آرا: آپ کی بلا سے۔ ایک ڈلی تم بھی کھا لینا۔

حسن آرا: خوب! پانچ روپے کی مٹھائی اور اس میں ہم کو ایک ڈلی ملے؟ آتے ہی آتے آدمی نہ کچھ جاؤں تو کہنا۔

سہر آرا: واہ دے چکی میں! ایسی کچی نہیں ہوں!

حسن آرا: بھلا، کتاب سے آگے کا حال کیا معلوم ہوگا؟ مجھے بڑی ہنسی آتی ہے جب کوئی فال دیکھتا ہے۔ آنکھیں بند کیے ہوئے تھوڑی دیر بڑھائے اور کتاب کھولی۔ پھر اپنے اپنے طور پر مطلب نکالنے لگے۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ ہم کو بڑے استاد نے سبق پڑھایا ہے۔ تھوڑی دیر میں سپاہی نے باہر سے آواز دی کہ ماما مٹھائی لے جاؤ۔ سہر آرا دوڑی۔ مجھے دینا۔ حسن آرا الگ پھرتی سے جھپٹی کہ ہمیں ہمیں۔ اب ماما پیچاری کس کو دے ایک چنگیل دو گا کہ۔ اس نے حسن آرا کو چنگیل دے دی۔

حسن آرا: اب بتلائیے کھانے میں لٹکا لگاؤں؟ برنی پر چاندی کے چمکتے ورق کتنی بہار دیتے ہیں!

سہر آرا: ماما تم دیوانی ہو گئی ہو کچھ؟ روپے ہم نے دیے تھے یا انھوں نے؟ پرایا مال کیا جھپ سے اٹھالیا۔ واہ واہ! ہاں ہاں — کہتی جاتی ہوں سستی ہی نہیں!

ماما: وہ آپ کی بڑی.....

سہر آرا: چلو بس رہنے بھی دو۔ اوپر سے باتیں بناتی ہو۔

سہر آرا نے مٹھائی بانٹی تو ماما حسن آرا کی بوڑھی دادی کو بھی اس میں سے دس پانچ ڈلیاں دے آئیں۔

بوڑھی: یہ مٹھائی کیسی!

ماما: حضور، حسن آرا نے فال دیکھی تھی۔

بوڑھی: فال کیسی؟

ماما: چھی آئی تھی کہیں سے۔

بوڑھی: چٹھی کیسی؟

اما: بی بی دبی جو ہیں دیکھیے کیا نام ہے ان کا جدائی۔

بوڑھی: جدائی کیسی؟ لا میری چھری تو دے۔

بوڑھی بیگم کمر جھکائے لٹھیا ٹپکتے ہوئے چلیں۔ آکر دیکھا تو دونوں بہنیں مٹھائی چکھ رہی

ہیں۔

بوڑھی: یہ مٹھائی کیسی آئی ہے؟

سپہر آرا: اماں جان حسن آرا نے ہم سے شرط ہاری ہیں۔ کہتی تھیں ہمارے دیوان حافظ

میں چار سو صفحے ہیں، میں نے کہا نہیں چار سو چالیس ہیں۔

بوڑھی: یہ بات تھی! اماں مٹھیا گئی ہے کیا؟ جانے کیا کیا بکتی تھی۔

شام کے وقت دونوں بہنیں سہیلیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیے چھت پر اٹھ کھیلیاں

کر رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے کے چنگلی لی کسی نے کسی کو گدگدایا، ذرا خیال نہیں کہ تین

منزلے پر کھڑی ہیں ذرا پاؤں ڈمگایا تو غضب ہی ہو جائے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی۔

یکا یک ایک چٹنگ آکر گرا۔ سپہر آرا نے لپک کر لوٹ لیا۔ آہا، اس پر تو کسی نے کچھ لکھا ہے۔

مانی جال والا چٹنگ، سب کی سب دوڑ پڑیں۔ حسن آرا نے یہ شعر پڑھ کر سنائے:

بہت تیز ہے آج کل تیر مڑگاں

کوئی دل نشانہ ہوا چاہتا ہے

میرے قتل کرنے کو آتا ہے قاتل

تمام آج قصہ ہوا جاتا ہے

حسن آرا کا ماتھا ٹھکا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ تازگئی کہ کوئی نئے عاشق پیدا ہوئے،

مجھ پر یا سپہر آرا پر شیدا ہوئے۔ معلوم نہیں کون ہے؟ کہیں مجھے باہر دیکھ تو نہیں لیا؟ دماغ پھر

گیا ہے موئے کا۔ جب سب سہیلیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو حسن آرا نے بہن سے کہا تم

کچھ سمجھیں؟ یہ چٹنگ پر کیا لکھا تھا؟ تم تو کھیل رہی تھیں۔ میں اس وقت سے اسی فکر میں

ہوں کہ ماجرا کیا ہے؟

سپہر آرا: کچھ کچھ تو میں بھی سمجھتی ہوں، مگر اب کسی سے کہو سنو نہیں۔

حسن آرا: تمہیں برے ہیں۔ اس چٹنگ کو پھاڑ پھوڑ کر پھینک دو۔ کوئی دیکھنے نہ پائے۔

اتنے میں خدمت گار نے ماما کو آواز دی اور ماما باہر سے ایک لفافہ لے آئی۔ حسن آرا نے جو لفافہ لیا تو مارے خوشبو کے دماغ تر ہو گیا۔ پھر ماتھا ٹھکا۔ خوشبو کیسی! ماما سے بولی کس نے دیکھا ہے؟

ماما: ایک آدمی خدمت گار کو دے گیا ہے۔ نام نہیں بتایا۔ دیا اور لہا ہوا۔

سپر آرا: کھولو تو دیکھو ہے کیا؟

لفافہ کھولا تو ایک خط نکلا۔ لکھا تھا 'ایک غریب مسافر ہوں، کچھ دنوں کے لیے آپ کے پردوس میں آکر ٹھہرا ہوں۔ اس لیے کوئی غیر نہ سمجھے گا۔ سنا ہے کہ آپ دونوں بہنیں شطرنج کھیلنے میں برق ہیں۔ یہ نقشہ بھیجتا ہوں میری خاطر سے اسے حل کر دو تو بڑا احسان ہو۔ میں نے تو بہت دماغ لڑایا پر نقشہ سمجھ میں نہ آیا۔

مرزا ہمایوں فر

اس خط کے نیچے شطرنج کا ایک نقشہ دیا ہوا تھا۔

سپر آرا: باجی، سچ کہنا یہ تو کوئی بڑے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ مگر تم ذرا غور کرو تو چٹکیوں میں حل کرلو۔ تم تو بڑے بڑے نقشے حل کر لیتی ہو۔ بھلا اس کی کیا حقیقت ہے؟
حسن آرا: بہن یہ نقشہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کو دیکھو تو اچھی طرح۔ مگر یہ تو سوچو کہ بھیجا کس نے ہے۔

سپر آرا: ہمایوں فر تو کسی شہزادے ہی کا نام ہوگا۔ ماما کو بلاؤ اور کہو سپاہی سے پوچھو کون لایا تھا؟ کیا کہتا تھا؟ آدمی کا پتہ مل جائے تو بھیجنے والے کا پتہ ملا داخل ہے۔

ماما نے باہر جا کر اشارے سے سپاہی کو بلایا۔

سپاہی: کہو، کیا کہتی ہو؟

ماما: ذری ادھر تو آ۔

سپاہی: وہاں کونے میں کیا کروں آن کے۔ کوئی وہاں ہو لے ہو لے باتیں کرتے دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ یہاں سے نکلوا دو گی کیا؟

ماما: اے چل چھو کرے! کل کا لوٹا، کیسی باتیں کرتا ہے؟ چھوٹی بیگم پوچھتی ہیں کہ جو آدمی لفافہ لایا تھا وہ کدھر گیا؟ کچھ معلوم ہے؟

سپاہی: وہ تو بس لایا اور دے کے چھپت ہوا مگر مجھے معلوم ہے وہ سامنے والے باغ

میں ایک شہزادے آن کے نکلے ہیں انھیں کا چوہ دار تھا۔
حسن آرا نے یہ سنا تو بولی: شہزادے تو ہیں مگر بدتمیز۔

پہر آرا: یہ کیوں؟

حسن آرا: اول تو کسی کنواری شریف زادی کے نام خط بھیجنا برا، دوسرے پننگ گرایا۔
خط بھیجا وہ بھی عطر میں بسا ہوا۔

پہر آرا: باجی یہ تو بدگمانی ہے کہ خط کو عطر میں بسایا۔ شہزادے ہیں، ہاتھ کی خوشبو خط میں بھی آگئی۔ مگر خط ادب سے لکھا ہے۔

حسن آرا: ان کو خط بھیجنے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ اب خط آئے تو نہ لینا خبردار۔ وہ
شہزادے ہمارا ان کا مقابلہ کیا؟ اور پھر بدنامی کا ڈر۔

پہر آرا: اچھا نقشہ تو سوچے، اس میں تو کوئی برائی نہیں۔

حسن آرا نے بیس منٹ تک غور کیا اور تب ہنس کر بولی لو۔ حل کر دیا۔ نہ کہو گی اللہ
جانتا ہے بڑی میز می کھیر ہے۔ لاؤ پھر اب جواب تو لکھ بھیجیں۔ مگر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں
انگی دیتے ہی پہنچا نہ پکڑ لیں۔ جانے بھی دو۔ مفت کی بدنامی اٹھانا بھلا کون سی دانائی ہے؟
پہر آرا: نہیں نہیں بہن، ضرور لکھ بھیجو۔ پھر چاہے کچھ نہ لکھنا۔

حسن آرا: اچھا، لاؤ لکھیں، جو ہونا ہوگا سو ہوگا!

پہر آرا: ہم بتائیں خط و طو تو لکھو نہیں بس اس نقشے کو حل کر کے ڈاک میں بھیج دو۔

(42)

شہر سے کوئی دو کوس کے فاصلے پر ایک باغ ہے جس میں ایک عالی شان عمارت بنی
ہوئی ہے۔ اسی میں شہزادہ ہمایوں فرآ کر ٹھہرے ہیں۔ ایک دن شام کے وقت شہزادہ صاحب
باغ میں سیر کر رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ شام بھی ہوگئی، مگر خط کا جواب نہ
آیا۔ کہیں ہمارا خط بھیجنا انھیں برا تو نہ معلوم ہوا۔ افسوس، میں نے جلدی کی۔ جلدی کا کام
شیطان کا۔ اپنے خط اور اس کی عبارت کو سوچنے لگے کہ کوئی بات ادب کے خلاف زبان سے
نکل گئی ہو تو غضب ہی ہو جائے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی سانڈنی پر سوار دور
سے چلا آرہا ہے۔ کبھے، شاید میرے خط کا جواب لاتا ہوگا۔ خدمت گاروں سے کہا کہ دیکھو یہ

کون آدمی ہے؟ خط لایا ہے یا خالی ہاتھ آیا ہے؟ آدمی لوگ دوڑے ہی تھے کہ سائٹنی سوار ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں ایک چہرہ نظر آیا۔ سمجھ، بس یہ قاصد ہے۔ چہرہ ہی نے دربان کو خط دیا اور شہزادہ صاحب کی ہاتھیں کھل گئیں۔ دل نے گواہی دی کہ ساری مرادیں مل گئیں۔ خط کھولا، تو ایک لیکچر کا نوٹس تھا۔ مایوس و کر خط کو رکھ دیا اور سوچا کہ اب خط کا جواب آنا مشکل ہے۔ غم غلط کرنے کو ایک غزل گانے لگے۔ اتنے ہی میں ڈاک کا ہرکارا لال پکیا جمائے، دھانی دھکا پھڑکائے، لہر طوطے کی صورت بنائے آ پہنچا اور خط دے کر روانہ ہوا۔ شہزادے خط کھولا اور عبارت پڑھی تو پھڑک گئے۔ ہائے کیا پیاری زبان ہے کیا بول چال ہے۔ زبان اور بیان میں بھی نگاہ کی طرح جادو کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس نازک ہاتھ کے صدمے جس نے یہ سطوریں لکھی ہیں۔ کتنے وقت کلائی لچکی جاتی ہوگی۔ ایک ایک لفظ سے شوخی نکلتی ہے، ایک ایک حرف سے رنگین جھلکتی ہے۔ اور نقشہ تو ایسا حل کیا کہ قلم توڑ دیے۔ آخر میں لکھا تھا :

عشق کا حال پیشوا جانیں

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں؟

خود ہی شعر پڑھتے تھے اور خود ہی جواب دیتے تھے۔

ایک ایک ان کے ایک دوست آئے اور بولے کہیے کچھ جواب آیا؟ یا دھتا بتا دیا؟

شہزادہ : واہ دھتا تم جیسوں کو بتاتی ہوں گی۔ لو یہ جواب ہے۔

دوست : (لفافہ پڑھ کر) واہ، بڑے ادب سے خط لکھا ہے۔

شہزادہ : جناب، کچھ بازاری عورتیں تھوڑے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے شرافت برتی

ہے۔

دوست : پھر پوچھتے کیا ہو! گھرے ہیں ہمیں نہ بھولے گا۔

اب شہزادے کو فکر ہوئی کہ کسی طرح ملاقات کی ٹھہرے۔ بنے یا مگڑے۔ جب آنے

سانے بات ہو تب دل کو چین آئے۔ سوچتے سوچتے آپ کو ایک حکمت سوجھ ہی گئی۔

مونچوں کا صفایا کر دیا، نقلی بال لگا لیے، زنا نے کپڑے پہنے اور پالکی پر سوار ہو کر حسن آرا کے

دروازے پر جا پہنچے۔ اپنی مہری کو ساتھ لے لیا تھا۔ مہری نے پکارا، ارے کوئی ہے؟ ذرا اندر

خبر کر دو کہ مرزا ہمایوں فرکی بہن ملنے آئی ہیں۔

بڑی بیگم نے جو سنا تو آکر حسن آرا کو بولیں ذرا قرینے سے بیٹھنا۔ تمیز سے باتیں کرنا۔ کوئی بھاری سا جوڑا پہن لو، سمجھیں۔

حسن آرا: اماں جان، کپڑے تو بدل لیے ہیں۔

بڑی بیگم: دیکھوں! یہ کیا سفید دوپٹہ ہے؟

حسن آرا: نہیں، اماں جان گھلائی ہے۔ وہی جام دانی کا دوپٹہ جس میں کاہانی کی آڑی

بیل ہے۔

بڑی بیگم: بیٹا، کوئی اور بھاری جوڑا نکالو۔

حسن آرا: ہمیں تو یہی پسند ہے۔

اتنے میں عاشق بیگم پاکی سے اتریں اور جا کر بولیں، آداب بجالاتی ہوں۔

حسن آرا: تسلیم، آئیے۔

عاشق: آؤ، بہن گلے تو ملیں۔

دونوں بہنیں بے جھجک عاشق بیگم سے گلے ملیں۔

پہر آرا:

آمد ہمارے گھر میں کسی مہ لقا کی ہے

یہ شان کردگار یہ قدرت خدا کی ہے

حسن آرا:

یہ کون آیا ہے رکھ کر پھول، موئے غیر انشاں میں

مبا اترائی پھرتی ہے جو ان روزوں گلستاں میں

عاشق:

’صغدر‘ زباں سے راز محبت عیاں نہ ہو

دل آشنائے درد ہو، لب پر نفاں نہ ہو

پہر آرا: آپ نے آج غریبوں پر کرم کیا۔ ہمارے بڑے نصیب۔

عاشق: بہن، ہماری تو کئی دن سے خواہش تھی کہ آپ سے ملیں، مگر پھر ہم سوچے کہ

شاید آپ کو ناگوار ہو۔ ہم تو غریب ہیں۔ امیروں سے ملتے ہوئے ذرا وہ معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا: بجا ہے، آپ تو خدا کے فضل سے شہزادی ہیں، ہم تو آپ کی رعایا ہیں۔

عاشق : آپ دونوں بہنیں ایک دن کوٹھے پر ٹہل رہی تھیں تو ہمایوں نے مجھے بلا کر دکھایا تھا۔

حسن آرا نے گھوری بنا کر دی اور عاشق بیگم نے انھیں کے ہاتھوں سے کھائی۔ کتھا کیوڑے میں بسا ہوا، چاندی سونے کا ورق لگا ہوا، چکنی ڈلی اور الائچی۔ غرض کہ بڑے تکلف والی گھوریاں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد طرح طرح کے کھانے دسترخوان پر چنے گئے اور تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر عاشق بیگم نے بے تکلفی سے حسن آرا کی رانوں پر سر رکھ دیا اور لیٹ رہیں۔ سپہر آرا نے اٹھ کر کشمیر کا ایک دوشالہ اوڑھا دیا اور قریب آکر بیٹھ گئیں۔

عاشق : بہن، اللہ جانتا ہے تم دونوں بہنیں چاند کو بھی شرماتی ہو۔

حسن آرا : اور آپ؟

اپنے جو بن سے نہیں یار خبردار ہنوز
ناز و انداز سے واقف نہیں زہار ہنوز

تینوں میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ دس بجے کے قریب عاشق بیگم اٹھ بیٹھیں اور فرمایا کہ بہن اب ہم رخصت ہوں گے۔ زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔

سپہر آرا :

بے چین کر رہا ہے کیا کیا دل و جگر کو
ہر دم کسی کا کہنا، جاتے ہیں ہم تو گھر کو

اس طرح محبت کی باتیں کر کے عاشق بیگم رخصت ہوئیں اور جاتے وقت کہہ گئیں کہ ایک دن آپ کو ہمارے یہاں آنا پڑے گا۔ پاکی پر سوار ہو کر عاشق بیگم نے ماماؤں، خدمت گاروں اور دربانوں کو دو دو اشرفیاں انعام کی دیں اور چپکے سے ماما کو ایک تصویر دے کر کہا کہ یہ دے دیتا۔

کہاروں نے تو پاکی اٹھائی اور ماما نے اندر جا کر تصویر دی۔ حسن آرا نے دیکھا تو دھک سے رہ گئیں۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

’پیارے‘

میں عاشق بیگم نہیں ہوں، ہمایوں فرماؤں۔ اب اگر تم سے بے وفائی کی تو زہر کھا کر جان دے دوں گا۔

حسن آرا: بہن، غضب ہو گیا!

پہر آرا: کیا، ہوا کیا؟ بولو تو!

حسن آرا: لو، یہ تصویر دیکھو۔

پہر آرا: (تصویر دیکھ کر) ارے، غضب ہو گیا! اس نے تو بڑا بجل دیا۔

حسن آرا: (ہیرے کی کیل ناک سے نکال کر) بہن، میں تو یہ کھا کر سو رہی ہوں۔

پہر آرا: (کیل چھین کر) اف ظالم نے بڑا دھوکا دیا۔

حسن آرا: ہم گلے مل چکیں۔ ظالم زانو پر سر رکھ کر سویا۔

پہر آرا: مگر باجی، اتنا تو سوچو کہ بہن کہہ کہہ کر بات کرتے تھے۔ بہن بنا گئے ہیں۔

حسن آرا: یہ سب باتیں ہیں، کس کی بہن اور کیسا بھائی!

وہ یوں مجھے دیکھ کر گیا ہے

کھال اس کی جو کھینچے سزا ہے

پہر آرا: واہ! کسی کی مجال پڑی ہے جو ہم سے شرارت کرے؟

حسن آرا: خبردار، اب اس سے کچھ واسطہ نہ رکھنا۔ آدمیوں کو تاکید کر دو کہ کسی کا خط

بے سمجھے بوجھ نہ لیں، ورنہ نکال دیے جائیں گے؟

پہر آرا: ذری سوچ لو، لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے کہ ابھی تو اتنے جوش سے ملیں

اور ابھی یہ نادری حکم۔

حسن آرا: ہاں، سچ تو ہے۔ ابھی تک ہی تم جانتے ہیں۔

پہر آرا: کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی سے ذکر کر دیں۔

حسن آرا: اس سے اطمینان رکھو، وہ شہدے تو ہیں نہیں۔

پہر آرا: واہ، شہدے نہیں، تو اور ہیں کون! شہدے کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں؟

حسن آرا: اب آج سے چھت پر نہ چڑھنا۔

پہر آرا: واہ بہن، سچ کھیت چڑھیں۔ کسی نے دیکھ ہی لیا تو کیا! اپنا دل صاف

رہنا چاہیے۔

حسن آرا: مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے صاحب تمہاری فکر میں ہیں۔

پہر آرا: چلیے، بس اب چھٹیڑ خانی رہنے دیجیے۔

حسن آرا: ارے واہ! دل میں تو خوشی ہوئی ہوگی، چاہے زبان سے نہ کہو۔

سپہر آرا: آپ بھی کیا داعی جاتی جکتی ہیں؟

حسن آرا: آخر برا کیا ہے؟ شہزادے ہیں کہ نہیں۔ اور صورت تو تم دیکھ ہی چکی ہو، لو آج کے دوسرے ہی مہینے دروازے پر شہنائی بجتی ہوگی۔

سپہر آرا: ہم اٹھ کر چلے جائیں گے ہاں! یہ ہنسی ہم کو گوارا نہیں۔

حسن آرا: خدا کی قسم، میں دل لگی سے نہیں کہتی۔ آخر اس بیچارے میں کیا برائی ہے! حسین، والدہ، کسن، شوقین، نیک، بخت۔

سپہر آرا: بس، اور دس پانچ باتیں کہیں نہ۔

سپہر آرا کے دل پر ان باتوں کا بہت بڑا اثر ہوا۔ آدمی کی طبیعت بھی کیا جلد پلٹا کھاتی ہے۔ ابھی تو ہمایوں فرکو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور اب دل ہی دل میں کھلی جاتی تھیں کہ ہاں ہے تو سچ۔ آخر ان میں عیب ہی کیا ہے؟

دونوں بہنوں میں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں اور وہ مہری، جو عاشق بیگم کے ساتھ آئی تھی دروازے پر چپکلی کھڑی سن رہی تھی۔ جب حسن آرا چپ ہوئیں تو اس نے اندر پہنچ کر سلام کیا۔

حسن آرا: کون ہو؟

مہری: حضور، میں ہوں۔ اچھن۔

حسن آرا: کہاں سے آئی ہو؟

مہری: آپ مجھے اتنی جلد بھول گئیں! بیگم صاحبہ نے بھیجا ہے۔

حسن آرا: بیگم صاحبہ کون؟

مہری: وہی عاشق بیگم جو آپ سے مل گئی ہیں۔

حسن آرا: کہو، کیا پیغام بھیجا ہے؟

مہری: (مسکرا کر) حضور کو ذرا وہاں تک تکلیف دی ہے۔

مہری کا مسکرانا دونوں بہنوں کو بہت برا لگا۔ مگر کرتیں کیا۔ مہری انھیں چپ دیکھ کر پھر

بولی، بیگم صاحبہ نے فرمایا ہے کہ اگر کچھ ہرج نہ ہو تو اس وقت ہمارے یہاں آئیے۔

سپہر آرا: کہہ دینا، ہمیں فرصت نہیں۔

مہری: انھوں نے کہا ہے کہ اگر آپ کو فرصت نہ ہو تو میں خود آ جاؤں۔
 سپہر آرا: جی، کچھ ضرورت نہیں ہے۔ بس اب دور ہی سے سلام ہے۔ اور اب آج سے
 تم نہ آنا یہاں، سنا کہ نہیں؟

مہری: بہت اچھا، لوٹری حکم بجا لاوے گی۔ بیگم صاحبہ کی جیسی نوکر، ویسی ہی حضور کی۔
 سپہر آرا: چلو بس، بہت باتیں نہ بناؤ۔ کہہ دینا خیر اسی میں ہے کہ اب کوئی خط و ط نہ
 آئے۔ شہزادے ہیں اس سے چھوڑ دیا کوئی دوسرا ہوتا تو خون ہو جاتا۔ اتنے بڑے شہزادے
 اور غریب شریف زادوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ بس چلے تو وہ سزا دوں کہ عمر بھر یاد کریں۔ واہ!
 اچھا جال پھیلایا ہے۔

حسن آرا: بس، اب خاموش بھی رہو۔ کوئی سن لے گا۔ اب کچھ کہو نہ سنو (مہری سے)
 چلو، سامنے سے ہو۔

مہری: حضور، جان بخشی ہو تو عرض کروں؟

حسن آرا: اب تم جاؤ، ہم نے کئی دفعہ کہہ دیا۔ نہیں بچتاؤ گی۔

مہری روانہ ہوئی۔ قسم کھائی کہ اب نہیں آنے کی۔ سپہر آرا کا چہرہ مارے غصے کے لال
 بھسوکا ہو گیا۔ حسن آرا سمجھاتی تھیں کہ بہن، اب اور باتوں کا خیال کرو۔ لیکن سپہر آرا ٹھنڈی
 نہ ہوتی تھیں۔ بہت دیر کے بعد بولیں، بس معلوم ہوا کہ کوئی شہدا ہے اگر سچی محبت ہے تو حیا
 اور شرم کے ساتھ ظاہر کرنا چاہیے یا اس بے شکے پن سے؟

(43)

شہزادہ ہمایوں فرمہری کو بھیج کر ٹہلنے لگے، مگر سوچتے جاتے تھے کہ کہیں دونوں بہنیں خفا
 نہ ہوگئی ہوں، تو پھر بے ڈھب ٹھہرے۔ بات کی بات جائے اور شاید جان کے بھی لالے پڑ
 جائیں۔ دیکھیں، مہری کیا خبر لاتی ہے۔ خدا کرے دونوں مہری کو ساتھ لے کر چھت پر چلی
 آویں۔ اتنے میں مہری آئی اور منہ پھلا کر کھڑی ہوگئی۔

شہزادہ: کہو، صاف صاف!

مہری: حضور، کیا عرض کروں!

شہزادہ: وہ تو ہم تمھاری چال ہی سے سمجھ گئے تھے کہ بے ڈھب ہوئی۔ کہہ چلو بس۔

مہری : اب لوٹتی وہاں نہیں جانے کی۔

شہزادہ : پہلے مطلب کی بات تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟

مہری : میں نے جا کر پردے کے پاس سے سنا کہ آپ ہی کی باتیں چپکے چپکے کر رہی ہیں۔ میں جو گئی تو بڑی بہن نے رکھائی کے ساتھ باتیں کیں اور چھوٹی بہن تو بس برس ہی پڑیں۔ میں کھڑی کانپ رہی تھی کہ کس مصیبت میں پڑی۔ بہت تیز ہو کے بولیں اب نہ آتا، نہیں تو تم جانو گی۔ اور ان سے بھی کان کھول کے کہہ دینا کہ بہت چل نہ نکلیں۔ بہت ہی مگڑیں۔ میں چور کی طرح چپکے چپکے سنتی رہی۔

ہمایوں : افسوس! تو بہت ہی مگڑیں؟

مہری : کیا کہوں حضور، اپنے آپ ہی میں نہیں تھیں۔

ہمایوں : ہم نے بڑی غلطی کی۔ پہلے تو ہمیں جانا نہ تھا اور گئے تو بچھونا نہ تھا۔

مہری : اب جانے دانے کا ارادہ نہ کیجیے گا۔

دوسرے دن ہمایوں فرحمت پر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حسن آرا بیگم اپنے کوٹھے پر چڑھی ہیں اور منہ پر نقاب ڈالے کھڑی ہیں۔ اتنے میں سپہر آرا بھی اوپر آئیں اور شہزادے کو دیکھتے ہی اچک کر آڑ میں ہو رہیں۔ دم کے دم میں حسن آرا بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ بیچارے نظر بھر دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ دونوں نظر سے غائب ہو گئیں۔ سوچے ایسی ہی حیا پھٹ پڑی تھی تو کوٹھے پر کیوں آئیں؟

اب ادھر کی کیفیت سنئے۔ حسن آرا کو معلوم ہی نہ تھا کہ حضرت اس وقت کوٹھے پر نہل رہے ہیں۔ جب سپہر آرا نے کوٹھے پر آکر شہزادے کو دیکھ لیا تو چپکے سے کہا۔ بہن یہیں بیٹھ جاؤ، وہ تاک جھانک سے باز نہ آویں گے۔ حسن آرا نے چھلانگ بھری تو کھٹ سے نیچے۔ سپہر آرا بھی اچک کر زینے پر جا پہنچیں۔

حسن آرا : پگلی پڑے، اے واہ اچھا گھر پر کھ لیا ہے۔

سپہر آرا : میرا بس چلے تو اس کا گھر اجڑا دوں۔

حسن آرا : یہ کیا ستم کرتی ہو؟ گھر آباد کرتے ہیں یا اجڑاتے ہیں؟

سپہر آرا : بابی، اللہ خیر کرے، یہ موا جب دیکھو کوٹھے پر کھڑا رہتا ہے۔

حسن آرا : تو تم کا ہے کو اپنی زبان خراب کرتی ہو؟ آدمی ہی تو وہ بھی ہے۔

سہرآرا: باجی، تم چاہے مانو چاہے نہ مانو، یہ موا بہر و پیا ہے کوئی۔
 اتنے میں ایک لونڈی نے آکر کہا لیجیہ بڑی بیگم صاحبہ نے یہ مٹائی دی ہے۔ وہ جو اس
 دن آئی نہیں تھیں انھوں نے مٹائیوں کے دو خوان بیچے ہیں۔
 لونڈی کی لڑکی کا نام پیاری تھا۔ اس نے مٹائی جو دیکھی تو توٹھلا کر بولی بھلا سی ہمیں
 دیجیے۔

سہرآرا: ارے واہ ان کو دیجیے۔ بڑی وہ بن کے آئی ہیں! اچھا اتنا بتا دے کہ کسے بیاہ
 کرے گی؟

پیاری: پہلے مٹائی دیجیے تو بتاؤں۔
 سہرآرا: تو مل چکی، گڑھیا میں منہ دھو آ۔
 پیاری: میں ایک خصم کروں گی، اول بھل چھوڑ کے دوسلا۔ اور بھل تیرا، بھل چوتھا،
 ان سب کو لاتیں مال مال کے نکال دوں گی۔ لے، اب دیجیے۔
 سہرآرا: جا اب نہ دوں گی۔

حسن آرا: دے دو، دے دو، رو رہی ہے۔
 سہرآرا: اچھا، لے مگر پانی نہ پینے دوں گی۔
 پیاری: ہاں، نہ پیوں گی، لاؤ تو بھلا۔

اس پر قہقہہ پڑا۔ ذرا سی لڑکی اور کیسی باتیں بتاتی ہے۔ اتنے میں بڑی بیگم آکر بولیں،
 ارے تمھاری وہی گویاں جو اس دن آئی تھیں انھیں کے یہاں سے مٹائی کے دو خوان آئے
 ہیں۔ ایک عورت ساتھ تھی۔ کہہ گئی ہے کہ دونوں بہنوں کو کل بلایا ہے۔ سو کل کسی وقت چلی
 جانا، گھڑی دو گھڑی دل بہلا کے چلی آنا۔ نہیں تو مفت میں شکایت ہوگی۔

حسن آرا: کل کی کل کے ہاتھ ہے اماں جان!
 بیگم صاحبہ تو چلی گئیں ادھر حسن آرا کا رنگ اڑ گیا۔ بولیں بہن، یہ میز می کھیر ہے۔
 سہرآرا: ایک کام کیجیے۔ اب بے خوشاں کے کام نہ چلے گا۔ ان کے نام ایک خط لکھیے
 اور صاف صاف مطلب سمجھا دیجیے۔ موئے کو اچھے اچھے لکھے یاد ہیں۔ جب ادھر دال نہ گئی تو
 اماں جان سے لاسا لگایا۔ اور وہ بھی کتنی بھولی ہیں۔

ایکا ایک دروازے پر ایک نیا گل کھلا۔ دس بارہ آدمیوں نے مل کر گانا شروع کیا۔

مان کریں نندلال سوں
 سہاگن چچا مان کرے نندلال سوں
 دودھ پوت اور ان دھن بچھی
 گود کھلائے نندلال سوں! مان

دس پانچ آدمی گاتے ہیں دو چار تال دیتے جاتے ہیں۔ دو ایک مجیرا بجاتے ہیں۔ ایک حضرت ڈھولکی تھپتھپاتے ہیں۔

گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ لڑکا کس کے ہوا ہے؟ بڑی بیگم بیوہ، دونوں بہنیں کنواری، یہ کیا اندھیر ہے بھی! ماما: ارے، تم کون لوگ ہو؟

کئی آدمی: اے حضور، خدا سلامت رکھے بھانڈ ہیں۔ ایک صاحب نہنہا کر بولے میرے پچھیزے کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ ماں کے پیٹ ہی سے نہنہنا نکلا تھا۔

دوسرے صاحب نے اچک کر فرمایا: ہیں ہیں ہیں، دو بانگے ہیں، اور ادھر تالیاں بج رہی ہیں مان کرے نندلال.....!

بڑی بیگم: ارے لوگو یہ ہے کیا؟ یہ دن دھاڑے کیا اندھیر ہے؟ ان گھوڑے بھانڈوں سے پوچھو، آئے کس کے یہاں ہیں؟ دربان: چپ رہو جی، آخر کہاں آئے ہو؟

ایک بھانڈ: واہ شیرا، کیوں نہ ہو کیا دم ہلا کے بھونکے ہو۔ دربان: آخر تم لوگوں سے کس نے کیا کہا؟ کچھ گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ ماما: یہ کیا غضب کرتے ہو!

بھانڈ: غضب پڑے برے کی جان پر، اور آنکھ لڑے ہم سے۔ سپاہی: مہاں، قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہاں لڑکا دڑکا نہیں ہوا۔ تم مانتے ہی نہیں ہو۔ بھانڈ: واہ جناب! کیوں نہ ہو کھڑی مونچھیں اور چڑھی داڑھی۔

سپاہی: (آہستہ سے) بھلا لڑکا ہوگا کس کے؟ دو لڑکیاں، دے کنواری ہیں گی ایک بڑی بیگم وہ بوڑھی کھٹ، اور تو کوئی عورت ہی نہیں تم یہ بک کیا رہے ہو!

بھاٹ: یہ اچھی دل لگی ہے بھئی، پھر اس مرد نے کہا ہی کیوں تھا؟
 سپاہی: یہ کانٹے کس کے بوئے ہوئے ہیں۔
 بھاٹ: ارے صاحب کچھ نہ پوچھیے بڑا چکمہ ہو گیا۔
 دربان: لے، اب مجھرا وجہ را ہٹاؤ، نہیں تو یہاں ٹھیک کیے جاؤ گے۔
 بھاٹ: واللہ ہو بڑے نمک حلال
 ادھر دونوں بہنوں میں یوں باتیں ہونے لگیں۔
 سپہر آرا: یہ اسی کی شرارت ہے۔
 حسن آرا: کن کی؟ نہیں تو بہ۔
 سپہر آرا: آپ چاہے نہ مانیں ہم تو یہی کہیں گے۔
 حسن آرا: بہن، وہ شہزادہ ہیں، ان سے یہ حرکت نہیں ہو سکتی۔
 سپہر آرا: اچھا، پھر یہ بھاٹ کیوں آئے؟ اگر کسی نے بہکا کر بھیجا نہیں تو آئے کیسے؟
 حسن آرا: ہاں کہتی تو سچ ہو، مگر اللہ جانتا ہے اس سے ایسی حرکت نہیں ہو سکتی۔
 سپہر آرا: آپ میرے کہنے سے انھیں ایک خط لکھ بھیجئے کہ پھر ایسی حرکت کی تو ہم زہر
 ہی کھالیں گے۔

حسن آرا خط لکھنے پر راضی ہو گئیں اور یوں خط لکھا:
 ’حیا سے منہ نہ موڑیں گے ستائے جس کا جی چاہے
 وفاداری میں ہم کو آزمائے جس کا جی چاہے
 کبھی مانند گوہر آہرد ’صفر‘ نہ جائے گی
 بظاہر خاک میں ہم کو ملائے جس کا جی چاہے
 ارے ظالم، کچھ خدا کا ڈر بھی ہے؟ کیوں جی، شریفوں کی یہ نبی حرکتیں ہوتی ہیں؟ شرم
 نہیں آتی! بہن بنا کر اب یہ شرارتیں کرتے ہو۔ یہ ہی مردوں کے کام ہیں!
 اگر اب کی کسی کو بھیجا تو ہم ہیرے کی کٹی کھالیں گے۔ خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ آخر
 تم اپنے دل میں ہم کو سمجھتے کیا ہو؟ اگر بھوت سر پر سوار ہے تو کہیں اور منہ کالا کیجیے۔ ہم
 گھر گرسٹ شریف زادیاں ان باتوں سے کیا واسطہ؟ دل لینا جانے نہ دل دینا۔

کانٹوں میں نہ ہو اگر الجھنا
تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

ہمایوں فر کے پاس جب یہ خط پہنچا تو بہت شرمائے۔ سمجھ گئے کہ یہاں ہماری دال نہ
گلے گی۔ دل میں ارادہ کر لیا کہ اب بھول کر بھی ایسی چالیں نہ چلیں گے۔

(44)

حسن آرا اور سپہر آرا دونوں رات کو سو رہی تھیں کہ دربان نے آواز دی۔ ماما جی دروازہ
کھولو۔

اما: دل بہار دیکھو کون پکارتا ہے؟

دل بہار: اے واہ، پھر کھول کیوں نہیں دیتیں؟

اما: میری اٹھتی ہے جوتی، دن بھر کی تھکی ماندی ہوں۔

دل بہار: اور یہاں کون چندن چوکی پر بیٹھا ہے؟

دربان: اجی، لڑ لینا پیچھے، پہلے کواڑیں کھول جاؤ۔

اما: اتنی رات گئے کیوں آفت نہ چا رکھی ہے؟

دربان: اجی کھولو تو، سواریاں آئی ہیں۔

حسن آرا: کہاں سے؟ ارے دل بہار! اما! کیا سب کی سب مر گئیں؟ اب ہم جانیں
دروازہ کھولنے؟

حسن آرا کی آواز سن کر سب کی سب ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اما نے پردا کرا کر
سواریاں اتروائیں۔

سپہر آرا: افخواہ، روح افزا بہن ہیں، اور بہار بیگم آئیے بندگی۔

یہ دونوں حسن آرا کی چچیری بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ سرال سے دونوں
بہنوں سے ملاقات کرنے آئی تھیں۔ چاروں بہنیں گلے ملیں۔ خیر عافیت کے بعد حسن آرا نے
کہا۔ دو برس کے بعد آپ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

بہار بیگم: ہاں اور کیا!

سب کی سب باتیں کرتے کرتے سو گئیں۔ صبح کو حسن آرا نے بڑی بیگم سے دونوں

بہوں کے آنے کی خبر سنائی۔

بڑی بیگم: جیسی میری بایں آنکھ پھڑکتی تھی۔ میں بھی کہوں کہ اللہ کیا خوشخبری سنوں گی۔ کہاں ہیں کہاں، ذرا بلاؤ تو۔

حسن آرا: ابھی سو رہی ہیں۔

بڑی بیگم: اے تو جگا دے بیٹا، اچھی تو ہیں؟

حسن آرا نے آکر دیکھا تو دونوں غافل سو رہی ہیں۔ روح افزا کی لٹیں کالی ناگن کی طرح بل کھا کر نیکی پر سے پلنگ کے نیچے لہرا رہی ہیں۔ بہار بیگم کا دوپٹہ کہیں ہیں دلائی کہیں، ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے خراٹے لے رہی ہیں۔

حسن آرا: اجی سوتی ہی رہے گا! اماں جان بلاتی ہیں۔

روح افزا: بہن، اب تک آنکھوں میں نیند بھری ہے۔ نماز پڑھ لوں تو چلوں۔

حسن آرا: (بہار بیگم کا ہاتھ ہلا کر) اے بہن اب اٹھو۔

بہار بیگم: اللہ اتنا دن چڑھ آیا! سارے گھر میں دھوپ پھیل گئی۔

حسن آرا: اٹھیے اما جان بلا رہی ہیں۔

بہار بیگم: روح افزا کو تو جگاؤ۔

سپہر آرا: وہ کیا بیٹھی ہیں سانسے۔

دونوں نے اٹھ کر نماز پڑھی اور بڑی بیگم کے پاس چلیں۔ روح افزا جاتے ہی بڑی بیگم سے چٹ گئیں۔ بہار بھی ان سے گلے ملیں اور ادب کے ساتھ فرش پر بیٹھیں۔

بڑی بیگم: کیوں روح افزا، اب تو اس بیماری نے چچھا جھوڑا؟ کیا کہتے ہیں تو بہ مجھے تو اس کا نام بھی نہیں آتا۔

سپہر آرا: (مسکرا کر) ڈینگو بخار، آپ تو روز روز بھول جاتی ہیں۔

بڑی بیگم: ہاں، وہی ڈنگو!

سپہر آرا: ڈنگو نہیں، ڈینگو۔

روح افزا: اب ایک مہینے سے چچھا جھوٹا ہے کہیں، میری تو جان پر بن آئی تھی۔

بڑی بیگم: چہرہ کیسا زرد پڑ گیا ہے۔

بہار بیگم: اب تو آپ انہیں اچھی دیکھتی ہیں یہ تو کھل کر کاٹنا ہو گئی تھیں۔

بڑی بیگم: حکیم محمد حسین نے علاج کیا تھا نہ وہاں؟
روح افزا: جی نہیں، ایک ڈاکٹر تھا۔

بڑی بیگم: اے ہے بھولے سے علاج نہ کرنا ڈاکٹر واگڈر کا۔

روح افزا: میں تو اس کی بولی ہی نہ سمجھوں۔ کہے، زبان دکھاؤ، جب منہ دکھادیں تب تو زبان دکھادیں؟ میں نے کہا یہ تو حشر تک نہیں ہونے کا۔ پھر نبض دیکھی تو ہاتھ پردے سے نکال لیا اور کہا چوڑیاں اتار ڈالو۔ میں نے سونے کی چوڑیاں تو اتار ڈالیں مگر شیشے کی ایک چوڑی پہنے رہی۔ شب کہنے لگا ہم سے باتیں کرو۔ تب تو میں نے دولہا بھائی کو بلایا اور کہا واہ صاحب، آپ تو اچھے ڈاکٹر گولائے! منہ کیا، ہم تو ایزی بھی نہ دکھادیں۔ اور کہتا ہے ہم سے باتیں کرو۔ یہاں گھڑی گٹ پٹ کسے آتی ہے! بس درگزی ایسے علاج سے۔ آپ انھیں دھتا بتائیے۔ اتنے میں اس نے گھڑی جیب سے نکالی اور کہنے لگا گنتی منو۔ نیے جیسے لڑکیوں کے مدرسے میں امتحان لے رہے ہوں۔ آخر میں نے ایک دو پانچ بیس گیارہ اناپ شاپ بکا۔ بڑی کڑوی دوائیاں دیں۔ بارے بیج گئی۔

بڑی بیگم: پہلا، یہ تم مہینوں خط کیوں نہیں بھیجتی ہو؟

بہار بیگم: امان جان، خطوں کا میں تو تار باندھ دوں، مگر جب کوئی لکھنے والا بھی ہو۔
روح افزا: یہ تو گرتی کے دھندے میں ایسی پڑ گئیں کہ پڑھا لکھا سب چوٹ کر دیا۔
حسن کلا: اور دولہا بھائی نے تو خط لکھنے کی قسم کھائی ہے۔

روح افزا: دن بھر بیٹھے شعر کہا کرتے ہیں۔

بڑی بیگم: کہو، تمھاری ساس تو اچھی ہیں؟

بہار بیگم: ہاں، بڑے مجھے موت آتی ہے نہ انھیں۔

حسن آرا: کل پرسوں تک دولہا بھائی یہاں آویں گے تو میں ان کو خوب جھاڑوں گی۔

بڑی بیگم: بہار، بچی بات تو یہ ہے کہ تم بھی ذرا تیز حراج ہو۔

سہرا آرا: جو ایک گرم اور نرم ہو تو بات بنے۔ اور جو دولوں تیز ہوئے تو کیسے بنے؟

بہار بیگم: اب تم اپنی ساس سے نہ لڑنا۔ تم نرم ہی رہنا۔ میرے تو ناک میں دم آ گیا۔

بڑی بیگم: اب کی مرزا یہاں آئیں تو سمجھاؤں۔

بہار بیگم: امان جان، مجھ سے ان سے حشر تک نہ بنے گی۔ جو کوئی لوٹری باندی بھی مجھ

سے اچھی طرح باتیں کر لے تو جل مرتی ہیں۔ اور میں جان بوجھ کر اور جلاتی ہوں۔
حسن آرا: بہن، مل جل کر رہنا چاہیے۔

بہار بیگم: جب تم سسرال جاؤ گی ایسی ہی ساس پاؤ گی اور پھر مل جل کر رہو گی تو سات
بار سلام کروں گی۔

روح افزا: جھٹڑا سارا یہ ہے کہ دلہا بھائی ان کی خاطر بہت کرتے ہیں۔ بس ان کی
ساس جلی مرتی ہیں کہ یہ جو رو کی خاطر کیوں کرتا ہے؟

بہار بیگم: اللہ جانتا ہے ہزاروں دفعہ طرح دے جاتی ہوں۔ مگر جب نہیں رہا جاتا تو
میں بھی بکنے لگتی ہوں۔ مجھے تو انھوں نے بے حیا کر دیا۔ اب وہ ایک کہتی ہیں تو میں دس
سناتی ہوں۔

بڑی بیگم: (پینٹھ ٹھوک کر) شاباش!

حسن آرا: میری طرف سے بھی پیٹھ ٹھوک دیجیے گا۔

بہار بیگم: بہن، ابھی کسی سے پالا نہیں پڑا ہم کو تو ایسا دق کر رکھا ہے کہ اللہ کرے اب
وہ مر جائیں یا ہم۔

چارو بہنیں یہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گئیں اور بناؤ سنگار کرنے لگیں۔ حسن
آرا، سپہر آرا اور روح افزا تو بن ٹھن کر موجود ہو گئیں مگر بہار بیگم ابھی بال ہی سنوار رہی تھیں۔

روح افزا: انھیں جب دیکھو بال ہی سنوارا کرتی ہیں۔

بہار بیگم: تم آئے دن یہی طعنہ دیا کرتی ہو۔

روح افزا: ایسی تو صورت بھی اللہ نے نہیں بنائی ہے۔

بہار بیگم نے کوئی دو گھنٹے میں کنگھی چوٹی سے فراغت پائی۔ پھر چاروں نکل کر باتیں
کرنے لگیں۔ سپہر آرا ڈلی کترتی تھیں، حسن آرا گوریاں بناتی تھیں، روح افزا ایک تصویر کی
طرف غور سے دیکھتی تھیں، مگر بہار بیگم کی نگاہ آئینے ہی پر تھی۔

سپہر آرا: ارے اب تو آئینہ دیکھ چکیں؟ یا گھنٹوں صورت ہی دیکھا کیجیے گا؟

بہار بیگم: تم کہتی جاؤ ہم جواب ہی نہ دیں گے۔

روح افزا: اللہ جانتا ہے انھیں یہ مرض ہے۔

سپہر آرا: ہاں معلوم تو ہوتا ہے۔

بہار بیگم: تم سب بہنیں ایک ہو گئیں۔ اپنی ہی زبان تھکاؤ گی۔
 حسن آرا: روح افزا تم اٹھ کر آئینے پر کپڑا گرا دو۔
 روح افزا: چڑ جائیں گی۔

حسن آرا: ہاں بہن، بتاؤ تو یہ بات کیا ہے؟ ساس سے بنتی کیوں نہیں تم سے؟
 بہار بیگم: ایسی ساس کو تو بس چپکے سے زہر دے دے۔ کچھ کم ستر کی ہونے کو آئیں
 ابھی خاصی کھوٹا سی بنی ہیں۔ میرا ہاتھ پکڑ لیں تو چھڑانا مشکل ہو جائے۔ موٹی دیوٹی ہے۔
 حسن آرا: کیا یہ بھی کوئی عیب ہے؟

بہار بیگم: ایک دن کا ذکر سنو، کسی کے یہاں سے مہری آئی۔ کچھ میوے لائی تھی۔ وہ
 اس وقت جھوٹ موٹ قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ مہری نے آکے مجھ کو سلام کیا اور میوے
 کی طشتری سامنے رکھ دی۔ بس دن بھر منہ پھلائے رہیں۔
 حسن آرا: مگر باتیں تو بڑی میٹھی میٹھی کرتی ہیں۔

بہار بیگم: ایک دن کسی نے ان کو دو چکوتے دیے۔ انھوں نے ایک چکوترا مجھ کو بھیجا
 اور ایک میری نند کو۔ وہ ان سے بھی بڑھ کر دس کی گانٹھ۔ جاکر ماں سے جڑ دیا کہ بھائی نے
 ہم کو آدھا سڑا ہوا چکوترا دیا اور بھابھی کو بڑا سا! بس اس پر صبح سے شام تک چرنا کاتی
 رہیں۔

حسن آرا: میں ایک بات پوچھوں؟ سچ کچھ کہنا، دولہا بھائی تو پیار کرتے ہیں؟
 بہار بیگم: یہی تو خیر ہے۔

حسن آرا: دل سے؟

بہار بیگم: دل اور جان سے۔

حسن آرا: بھلا ماں سے بنتی ہے؟

بہار بیگم: وہ خود جانتے ہیں کہ بڑھیا چڑ چڑی عورت ہے۔

حسن آرا: بہن، وہ تو بڑی ہیں ہی مگر تم بھی تیزی کے مارے ان کو اور جلاتی ہو، جوں
 کے چلو تو وہ تمہارا پانی بھرنے لگیں۔

بہار بیگم: اچھا، تمہیں بتاؤ کیسے مل کے چلوں؟

حسن آرا: اب کی جاؤ جب تو ادب کے ساتھ جھک کر سلام کرو۔

بہار بیگم: کس کو؟

حسن آرا: اپنی ساس کو اور کس کو؟

بہار بیگم: واہ! مر جاؤں مگر سلام نہ کروں مُردار کو۔

حسن آرا: بس یہی تو بری بات ہے۔

بہار بیگم: رہنے دیجیے بس وہ تو ہم کو دیکھ کر جل مرے اور ہم ان کو جھک کر سلام

کریں۔ ایک دن ماما سے بولیں کہ ہمارا پان دان اس کو کیوں دے آئیں؟ میرے منہ سے

بس اتنی سی بات نکل گئی کہ میری ساس کا ہے کو ہیں، یہ تو میری سوت ہیں۔ بس اس پر اتنا

جھڑیں کہ توبہ ہی بھلی۔

حسن آرا: بہن، تم نے بھی تو غضب کیا۔ تمہارے نزدیک یہ اتنی سی ہی بات تھی؟

ساس کو سوت بنایا، اور اس کو اتنی سی ہی بات کہتی ہو؟ اگر تمہاری بہو آئے اور تمہیں سوت

بنائے تب دیکھو گی اچھلتی کودتی ہو کہ نہیں؟

سپہر آرا: اف! بڑی بری بات کہی۔

روح افزا: تو اب بن چکی بس۔

بہار بیگم: تم سب کو اس نے کچھ رشوت ضرور دی ہے۔ جب کہتی ہو اسی کی سی۔

سپہر آرا: ہماری بہن، اور ایسی منہ پھٹ! ساس کو سوت بنائے!

حسن آرا: اور پھر شرمائے نہ شرمانے دے۔

بہار بیگم: اچھا بتائیے تو پہلے جھک کے سلام کروں خوب زمین پر سوکر، پھر؟

حسن آرا: میرے تو بہن روٹنے کھڑے ہو گئے کہ تم سے یہ کہا کیوں کر گیا۔

بہار بیگم: بتاؤ بتاؤ ہماری قسم بتاؤ۔

حسن آرا: تم ہنسو گی اور ہمیں ہوگا رنج۔

بہار بیگم: نہیں نہیں گے نہیں، بولو۔

حسن آرا: جا کر سلام کرو۔

بہار بیگم: جو وہ جواب نہ دیں تو اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤں؟

سپہر آرا: واہ! ایسا ہو نہیں سکتا۔

حسن آرا: نہ جواب دیں تو قدموں پر گر پڑو۔

بہار بیگم: میری بیچارہ گرتی ہے قدموں پر۔ وہ جیسا میرے ساتھ کرتی ہیں ویسا ان کی آنکھوں، گھٹنوں کے آگے آئے۔

حسن آرا: خرچ تو اہل ہے یا نہیں ہے؟

بہار بیگم: تین سو وٹھے کے بول ڈھائی سو گاؤں سے آتے ہیں۔ نقد کوئی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہی زیادہ ہوگا۔ مکان، باغ، دکانیں الگ ہیں، دکانت میں کوئی چھ سات سو مہینہ ملتا ہے۔

حسن آرا: تم کو کیا دیتے ہیں؟

بہار بیگم: بڑھیا سے چرا کر میرے اوپر کے خرچ کے لیے سو روپے مقرر ہیں۔

سپہر آرا: روح افزا بہن، تمہارے میاں کیا تنخواہ پاتے ہیں؟

روح افزا: چار سو ہوئے ہیں، چار پانچ سو زمین سے مل جاتے ہیں۔

حسن آرا: تمہاری ساس تو اچھی ہیں؟

روح افزا: ہاں، بیچاری بڑی سیدھی ہیں۔ ہاں ان کی لڑکی نے البتہ میری ناک میں دم کر دیا ہے۔ جب آتی ہے روز ماں کو بھرا کرتی ہے۔

سپہر آرا: بہار بیگم جو وہاں ہوتیں تو ان سے بھی نہ بنتی۔

بہار بیگم: اچھا چپ ہی رہیے گا، نہیں تو کاٹ کھاؤں گی۔ بڑی وہ بن کے آئی ہیں۔

اتنے میں کالی کالی گٹھا چھا گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ بہار نے کہا۔ جی چاہتا ہے

چھت پر سے دریا کی سیر کریں۔ سب نے کہا ہاں۔ ہاں چلیے۔ مگر حسن آرا کو یاد آگئی کہ

ہمایوں فر ضرور خبر پائیں گے اور کوٹھے پر آکے ستائیں گے۔ لیکن مجبور تھی۔ چاروں چوڑیاں

بھرتی ہوئی چھت پر جا پہنچیں۔ ہوا اس زور سے چلتی تھی کہ دوپٹہ کھسکا جاتا تھا۔ گورا گورا بدن

صاف نظر آتا تھا۔ کسی نے جا کر ہمایوں فر سے کہہ دیا کہ اس وقت تو سامنے والا کوٹھا۔ اندر کا

اکھاڑا ہو رہا ہے۔ ان کو تاب کہاں؟ چٹ سے کوٹھے پر آ پہنچے۔ سپہر آرا اوپر کے کمرے میں

ہو رہیں۔ روح افزا وہیں بیٹھ گئیں۔ حسن آرا نے ایک چھلانگ بھری تو راڈی میں۔ مگر بہار

بیگم نے بے ڈھب آنکھیں لڑائیں۔ ہمایوں فر نے بہت جھک کر سلام کیا۔

بہار بیگم: آنکھیں ہی پھوٹیں، جو ادھر دیکھے۔

ہمایوں: (ہاتھ کے اشارے سے) اپنا گلا آپ کاٹ ڈالوں گا۔

بہار بیگم: شوق سے۔
 نسخی نسخی بوندیں پڑنے لگیں اور چاروں پریاں نیچے چل دیں۔ مرزا ہمایوں فرمٹھ تاکتے
 رہ گئے۔

حسن آرا: (بہار سے) آپ تو خوب ڈٹ بکے کھڑی ہو گئیں۔
 بہار بیگم: کیوں کیا کوئی گھول کر پی جائے گا؟ میں انہیں جانتی ہوں ہمایوں فر تو ہیں۔
 سپہر آرا: تم کیوں کر جانتی ہو بہن!
 بہار بیگم: اے واہ اور سنیے گا، لڑکپن میں ہم کھیلنا کیے ہیں ان کے ساتھ۔ خوب چپتیں
 جمایا کیے ہیں ان کو! ان کی ماں اور دادی میں خوب جھوٹا جھوٹا ہوا کرتا تھا۔
 اتنے میں ماما نے آکر کہا: بڑی بیگم صلبہ نے یہ میوے بھیجے ہیں۔
 سپہر آرا: دیکھوں، یہ چلغوزے لیتی جاؤ۔
 پیاری: ہم کو دیجیے۔

سپہر آرا: ان کو دیجیے۔ 'پیر نہ شہید، نکلوں کو چھاپا' سب کے بدلے ان کو دیجیے۔
 حسن آرا: اچھا، پہلے سلام کرو۔
 چاروں بہنوں نے مزے سے میوے چکھے۔ ایک دوسری کے ہاتھ سے چھین چھین کر
 کھاتی تھیں۔ جوانی کی امنگ کا کیا کہنا۔

ادھر مرزا ہمایوں فر اپنی جھت پر کھڑے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔
 نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
 تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
 جب بڑی دیر تک جھت پر کسی کو نہ دیکھا تو یہ شعر زبان پر لائے:
 کل بد آموز (رقیب) نے کیا تم کو سکھایا ہے ہائے!
 آج وہ آنکھ، وہ چشمک، وہ اشارہ ہی نہیں۔

(45)

ایک دن حسن آرا کو سوجھی کہ آؤ اب کی اپنی بہنوں کو جمع کر کے ایک لیکچر دوں۔ بہار
 بیگم بولیں، کیا؟ کیا دوگی؟

حسن آرا: لیکچر، لیکچر، لیکچر نہیں سنا سکی؟

بہار بیگم: لیکچر کیا بلا ہے؟

حسن آرا: وہی جو دولہا بھائی جلسوں میں آئے دن پڑھا کرتے ہیں۔

بہار بیگم: تو ہم کیا تمہارے دولہا بھائی کے ساتھ ساتھ گھوما کرتے ہیں؟ جانے کہاں

کہاں جاتے ہیں، کیا پڑھ پڑھ کے سناتے ہیں۔ اتنا ہم کو معلوم ہے کہ شعر بہت کہتے ہیں۔

ایک دن ہم سے کہنے لگے، چلو تم کو سیر کرا لائیں۔ فنن پر بیٹھ لو۔ رات کا وقت ہے تم دو سالہ

سے خوب منہ اور جسم چرا لیتا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ نہ صاحب، بندی ایسی سیر

سے درگزری۔ وہاں جانے کون کون ہو، ہم نہیں جانے کے۔

سپہر آرا: اب کی آویں تو ان کے ساتھ ہم ضرور جائیں۔

بہار بیگم: چلو، بیٹھو لڑکیاں بہنویوں کے ساتھ یوں نہیں جایا کرتیں۔

روح افزا: مگر سنے گا کون؟ دس پانچ لڑکیاں اور بھی تو ہوں کہ ہی تم ٹنوں نوں؟

سپہر آرا: دیکھیے، میں بلواتی ہوں، ابھی ماما کو بھیجے دیتی ہوں۔

حسن آرا: مگر نظیر کو نہ بلاؤ۔ ان کے ساتھ جانی بیگم بھی آئیں گی وہ بات بات میں

شاخیں نکالتی ہیں۔ انھیں خط ہے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی حسین ہی نہیں۔ ’’شکل چڑیلوں کی، ناز

پر یوں کا‘۔ دن رات بناؤ سنوار ہی میں لگی رہتی ہیں۔

سپہر آرا: پھر اچھا تو ہے، بہار بیگم سے بھڑا دینا۔

تھوڑی دیر میں ڈولیلوں پر ڈولیاں اور بگھیوں پر بگھیاں آنے لگیں۔ دربان بار بار آواز

دیتا تھا سواریاں آتی ہیں۔ لونڈیاں جا جا کر مہمانوں کو سواریوں پر سے اترواتی تھیں اور وے

چمک چمک کر اندر آتی تھیں۔ آخر میں جانی بیگم اور نظیر بیگم بھی آئیں۔ جانی بیگم کی بوٹی بوٹی

پھڑکتی تھی آنکھیں ناچتی رہتی تھیں۔ نظیر بیگم بھولی بھالی شرمیلی لڑکی تھی۔ شرم سے آنکھیں جھکی

پڑتی تھیں۔ جب سب آپہنچیں تو حسن آرا نے اپنا لیکچر سنانا شروع کیا۔

’’میری پیاری بہنو، ساس بہوؤں کے جھگڑے، نند بھاؤ جوں کے بکھیرے، بات بات پر

تکرار، میاں بیوی کی جوتی پیزار سے خدا کی پناہ۔ ان بری باتوں سے خدا بچائے۔ بھٹے

مانسوں کی بہو بیٹیوں میں ایسی بات نہ آنے پائے۔ اس پھوٹ کی ہماری ہی دیس میں اتنی

گرم بازاری ہے کہ ساس کی زبان پر کوسنا جاری ہے، بہو مصروف گریہ و زاری ہے اور میاں

کی عقل ماری ہے۔ نند بھادج سے منہ پھلائے ہوئے، بھادج نند سے توجریاں چڑھائے ہوئے۔ بہو چکیاں لے لے کر روتی ہے، ساس زہر کھا کر سوتی ہے۔ اور جو ساس خضے در ہوئی اور بہو زبان کی تیز تو مار پیٹ کی نوبت پہنچتی ہے۔ میاں اگر بیوی کی سی کہیں تو اماں کی گھڑکیاں ہے، اماں کی سی کہے تو بیوی کی باتیں سنے۔ ماں اُدھر بیوی اُدھر کان بھرتی ہے وہ ان کے اور یہ ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتی ہیں۔

مگر تالی ایک ہاتھ سے نہیں بھتی۔ ساس بھلی ہو، تو بہو کو منا لے، اور بہو آدمی ہو تو ساس کو آدمی بنا لے۔ ایک شریف زادی نے اپنی ماما سے کہا کہ ہماری ساس تو ہماری سوت ہیں۔ خدا جانے ان کی زبان سے یہ بات کیسے نکلی! اس پر بھی انھیں دھوئی ہے کہ ہم شریف زادی ہیں۔ اگر وہ ہماری رائے پر چلیں تو ان کی ساس انھیں اپنے سر پر بٹھائیں۔ وہ سیدی جاکر ساس کے قدموں پر گر پڑیں اور آج سے ان کی کسی بات کا جواب نہ دیں۔ کیا ان کی ساس کا سر پھر گیا ہے، یا انھیں باولے کتے نے کاٹا ہے؟ بہو اگر ساس کی خدمت کرے تو دنیا بھر کی ساسوں میں کوئی ایسی نہ ملے جو چھڑ کر بہو سے لڑے۔

اب سوچو تو ذرا دل میں اس تکرار اور جوتی پیزار کا انجام کیا ہے؟ گھر میں پھوٹ، ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، لوٹڑیوں باندیوں میں ذلیل، ساری دنیا میں بدنام، گھر تباہ۔ ایک چپ ہزار بلا کو ٹالتی ہے فساد کو جہنم میں ڈالتی ہے۔ ہاں جو یہ خیال ہو کہ ساس ایک کہیں تو دس سنائیں، وہ دو باتیں کہیں تو بیس مرتبہ ان کو التو بنائیں، تو بس میل ہو چکا۔ ساس نہ ہوئی بھنی مونگ ہوئی۔ آخر اس کا بھی کوئی درجہ ہے یا نہیں؟ یا بس بہو سرال میں جاتے ہی مالکن بن بیٹھے، ساس کو طاق پر رکھ دے اور میاں پر حکم چلانے لگے؟ اب میں آپ لوگوں سے اتنا چاہتی ہوں کہ سچ سچ اپنی اپنی ساسوں کا حال بیان کیجیے۔

ایک : اللہ کرے، ہماری ساس کو آج رات ہی کو ہیضہ ہو۔

دوسری : اللہ کرے، ہماری ساس کو ہیضہ ہو گیا ہو۔

تیسری : اللہ کرے ہماری ساس ایسی جگہ مرے جہاں ایک بوند پانی نہ ملے۔

بہار بیگم : یا خدا میری ساس کے پاؤں میں باؤلا سکا کاٹے اور وہ بھونک بھونک کر

مرے۔

چوتھی : ہم تو اپنی ساس کو پہلے ہی چٹ کر گئے جہنم چلی گئیں۔

پانچویں: ساس تو ساس، ہماری نند نے تاک میں دم کر دیا۔
 جانی بیگم: میرنی ساس تو میرے آگے چوں نہیں کر سکتیں۔ بولیں اور میں نے کھا گھوٹا۔
 اس لیکچر کا اور کسی پر تو زیادہ نہیں مگر نظیر بیگم پر بہت اثر ہوا۔ حسن آرا سے بولیں۔ بہن
 ہم کل سے آیا کریں گے، ہمیں کچھ پڑھاؤ گی؟
 حسن آرا: ہاں، ہاں، ضرور آؤ۔
 جانی بیگم: اے واہ، یہ کیا پڑھا کریں گی بھلا! ہمارے پاس آؤ، تو ہم روز پڑھا دیا
 کریں۔

نظیر بیگم: آپ کے تو پڑوس ہی میں رہتے ہیں ہم، مگر بہن تم تو ہزدنگا سکھاتی ہو، دن
 بھر کوٹھے پر گھوڑے کی طرح دوڑا کرتی ہو کبھی نیچے کبھی اوپر۔
 جانی بیگم: (نظیر بیگم کا ہاتھ پکڑ کر) مروڑ ڈالو ہاتھ۔
 نظیر: دیکھا، دیکھا، بس کبھی ہاتھ مروڑا کبھی ڈھکیل دیا۔
 جانی بیگم: (نظیر کا گال کاٹ کر) اب خوش ہوئیں؟
 سپہر آرا: اے واہ، لے کے گال کاٹ لیا۔
 جانی بیگم: پھر عورت ہیں یا مرد ہیں کوئی؟
 نظیر بیگم: اب آپ اپنی محبت رہنے دیں۔

جب سب مہمان وداع ہوئے تو چاروں بہنیں مل کر گئیں اور بڑی بیگم کے ساتھ ایک
 ہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ کھاتے وقت یوں گفتگو ہوئی۔
 بہار بیگم: حسن آرا کی شادی کہیں تجویزی؟
 بڑی بیگم: ہاں فکر میں تو ہوں۔
 بہار بیگم: فکر نہیں اماں جان اب دن دن چڑھتا ہے۔
 بڑی بیگم: اپنے جانے تو جلدی کر رہی ہوں۔
 بہار بیگم: جلدی کیا دو چار برس میں؟
 روح افزا: بہن اللہ اللہ کرو۔

بہار بیگم: بیچاری سپہر آرا بھی تاک رہی ہیں کہ ہم ان کا بھی ذکر کریں۔
 سپہر آرا: دیکھیے یہ چھیڑ خانی اچھی نہیں، ہاں!

بڑی بیگم: (مسکرا کر) تم جانو یہ جانیں۔
 بہار بیگم: ابھی کل شام ہی کو تو تم نے کہا تھا کہ اماں جان سے ہمارے میاہ کی سفارش کرو۔ آج مکرئی ہو؟ بھلا کھاؤ تو قسم کہ تم نے نہیں کہا؟
 سپہر آرا: واہ، ذرا ذرا سی بات پر کوئی قسم کھایا کرتا ہے!
 روح افزا: پانی مرتا ہے کچھ؟
 سپہر آرا: جی ہاں، آپ بھی بولیں؟
 روح افزا: اچھا، قسم کھا جاؤ نا!
 سپہر آرا: کاہے کو کھائیں!
 بڑی بیگم: اے تو چڑتی کیوں ہو بیٹی۔
 سپہر آرا: اماں جان، جھوٹ موٹ لگاتی ہیں، چوہیں نہیں؟
 روح افزا: کیا! جھوٹ موٹ؟
 سپہر آرا: اور نہیں تو کیا؟
 روح افزا: اچھا، ہمارے سر کی قسم کھاؤ۔
 سپہر آرا: اللہ کرے، میں مر جاؤں۔
 روح افزا: چلو بس رو دیں، اب کچھ نہ کہو۔
 بہار بیگم: اماں جان، ایک رئیس ہیں ان کا لڑکا کوئی انیس بیس برس کا ہوگا خدا جانتا ہے بڑا حسین ہے آج کل سکندر نامہ پڑھتا ہے۔
 بڑی بیگم: کھانے پینے سے خوش ہیں؟
 روح افزا: خوش؟ آٹھ تو گھوڑے ہیں ان کے یہاں۔
 بہار بیگم: اماں جان، وہ لڑکا حسن آرا کے ہی لائق ہے۔ دو لڑکے ہیں، دونوں لائق ہیں، ہوشیار، نیک چلن، ہمارے یاں دوسرے تیسرے آیا کرتے ہیں۔
 روح افزا: ضرور منظور کیجیے۔
 بڑی بیگم: اچھا، اچھا سوچ لوں۔
 حسن آرا نے یہ بات چیت سنی تو ہوش اڑ گئے۔ خدا ہی خیر کرے۔ یہ دونوں بہنیں اماں جان کو پکا کر رہی ہیں۔ کہیں منظور کر لیں تو غضب ہی ہو جائے۔ بیچارے آزاد وہاں

مصیبتیں جمیل رہے ہیں اور یہاں جشن ہو۔ اس فکر میں اس سے اچھی طرح کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ اپنے کمرے میں آکر لیٹ رہی اور منہ ڈھانپ کر خوب روئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ نیتوں بھی آئیں اور حسن آرا کو لپٹے دیکھ کر بھلائیں۔

بہار بیگم: مکر کرتی ہوں گی، سوئیں گی کیا ابھی۔

پہر آرا: نہیں بہن، یہ نیکیے پر سر رکھتے ہی سو جاتی ہیں۔

بہار بیگم: جی ہاں، سن چکی ہوں، ایک تم کو نیکیے پر سر رکھتے ہی نیند آ جاتی ہے، دوسرے

ان کو۔

روح افزا: (گلدگدا کر) اٹھو، بہن ہمارا ہی خون پئے، جو نہ اٹھے۔ میری بہن نہ اٹھ

بیٹھو شاباش!

پہر آرا: سونے دیجیے۔ آنکھیں مارے نیند کے متوالی ہو رہی ہیں۔

بہار بیگم: ریلی متوالیوں نے جادو ڈالا۔ ہمارے یہاں پڑوس میں روز تعلیم ہوتی ہے۔

مگر ہمارے میاں کو اس کی بڑی چڑھ ہے کہ عورتیں ناچ دیکھیں یا گانا سنیں۔ مردوں کی بھی

کیا حالت ہے! گھر کے جو رو سے باتیں نہ کریں باہر شیر۔ اللہ جانتا ہے ہم تو ان سب موئی

پیشواؤں کو ایک پڑی پر قربان کر دیں۔ ایک نے۔ مٹی کی گھڑی جمائی تھی جیسے بطن نے کچھ

کھائی ہو۔

روح افزا: (حسن آرا کو چوم کر) اٹھو بہن۔

حسن آرا: (آنکھیں کھول کر) سر میں درد ہے۔

بہار بیگم:

صندلی رنگوں سے مانا دل ملا

درد سر کی کس کے ماتھے جائے گی

حسن آرا: یہاں ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔

بہار بیگم: درست

روح افزا: ضرور کسی سے آنکھ لڑائی ہے، اسی سے نیند آئی ہے۔ اچھا اب سچ بچ کہہ دو

کس سے دل ملا ہے؟ دل دیجیے تو یا ر طرح دار دیکھ کر۔

پہر آرا: اور کیا

معشوق کیجیے تو پری زاد کیجیے
حسن آرا:

کسی سے ملنے کا اب حوصلہ نہیں ہے جاں
بہت اٹھائے مزے ان سے آشنا ہو کر
روح افزا: بس، بہت باتیں نہ بنائیے۔ ہم سب سن چکی ہیں۔ بھلا کسی پر دل نہیں آیا،
تو آنکھوں سے آنسو کیوں کر نکلے؟ ذری آئینے میں صورت دیکھیے۔

سپہر آرا: اے بہن، یہ دھان پان آدمی، ذری سر میں درد ہوا اور لیٹ رہیں۔
بہار بیگم: لڑکی باتیں بناتی ہے۔ ہم کو چنگیوں پر اڑاتی ہے۔
حسن آرا: اب آپ جو چاہیں کہیں، یہاں نہ کوئی عاشق ہے نہ کوئی معشوق۔
روح افزا: اڑو نہ، کہہ چلوں سب؟

حسن آرا: ہاں، ہاں کہیے، سو کام چھوڑ کے۔ آپ کو خدا کی قسم۔
روح افزا: اچھا، اس وقت دل کیوں بھر آیا؟
حسن آرا:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں؟
بہار بیگم: (تالیاں بجا کر) کھل گئی نہ بات؟
روح افزا: جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔
حسن آرا: منہ میں زبان ہے جو چاہو بکو۔

بہار بیگم: اچھا، بڑی سچی ہو ایک تو بات کرو۔ ہم ایک ہاتھ میں کوئی چیز لیں اور دوسرا
ہاتھ خالی رکھیں۔ مٹھی باندھ کے آئیں اور تم ایک ہاتھ مارو۔ جو خالی ہاتھ پر پڑے تو تم
جھوٹی۔ دوسرے ہاتھ پر پڑے تو ہم جھوٹے۔
حسن آرا: اے واہ چھو کر یوں کا کھیل۔

روح افزا: انخواہ اور آپ ہیں کیا؟
سپہر آرا: اچھا، آپ آئیے، مگر ہم دونوں ہاتھ دیکھ لیں گے۔
بہار بیگم: ہاں ہاں دیکھ لیتا۔

بہار بیگم نے دوسرے کمرے میں جا کر ایک چھوٹی سی شیشی کی گولی داہنے ہاتھ میں رکھی اور پایاں ہاتھ خالی۔ دونوں ہتھیلیاں خوب زور سے بند کر لیں اور جا کر بولیں، اچھا۔ مارو ہاتھ پر ہاتھ۔

حسن آرا: یہ واہیات باتیں ہیں۔

روح افزا: تو کانپی کیوں جاتی ہو؟

سپہر آرا: باجی، پولو کس ہاتھ میں ہے؟

حسن آرا: ادھر والے میں۔

سپہر آرا: نہیں باجی، دھوکہ کھاتی ہو۔ ہم تو بائیں ہاتھ پر مارتے ہیں۔

بہار بیگم: (پایاں ہاتھ کھول کر) سلام۔

سپہر آرا: ارے وہ ہاتھ تو دکھاؤ۔

بہار بیگم: دیکھو ہے ششے کی گولی کہ نہیں؟

حسن آرا: دیکھا! کہا تھا کہ اس ہاتھ میں ہے۔ کہا نہ مانا۔

روح افزا: کیسے اب تو جج ہے۔

حسن آرا: یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔

بہار بیگم: اچھا بہن اب اتنا بتا دو کہ میاں آزاد کون ہیں؟

حسن آرا: کیا جانیں، کیا واپسی جانی جکتی ہو۔

بہار بیگم: اب چھپانے سے کیا ہوتا ہے بھلا، سن تو چکے ہی ہیں ہم۔

حسن آرا: بتائیں کیا، جب کچھ بات بھی ہو؟

سپہر آرا: ان دونوں بہنوں نے خواب دیکھا تھا کل معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا: ہاں، سچ کہا، خواب دیکھا ہوگا۔

روح افزا: خواب تو نہیں دیکھا مگر سنا ہے کہ صورت شکل میں کروڑوں میں ایک ہیں۔

بہار بیگم: حسن آرا نے تو اپنا جوڑ چھانت لیا اب سپہر آرا کا نکاح ہمایوں فر کے ساتھ

ہو جائے تو ہم سمجھیں کہ یہ بڑی خوش نصیب ہیں۔

سپہر آرا: میرے تو نکووں کو بھی نہ پہنچیں۔

حسن آرا: طوطی کا کوئے سے جوڑ لگاتی ہو؟

بہار بیگم : واہ، چہرے سے نور برستا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں دیکھا کریں۔ اماں سے آج ہی تو کہوں گی میں۔

حسن آرا : کہہ دیجیے گا، دھمکاتی کیا ہو؟
 سپہر آرا : آپ کے کہنے سے ہوتا کیا ہے؟ یہاں کوئی پسند بھی کرے!
 روح افزا : انکار کر دی تو پچھتاؤ گی۔

(46)

سورے حسن آرا تو کچھ پڑھنے لگیں اور بہار بیگم نے سنگار دان منگا کر نکھرنا شروع کیا۔
 حسن آرا : بس صبح تو سنگار، شام تو سنگار، کنگھی چوٹی، تیل پھیل اس کے سوا تمہیں اور کسی چیز سے واسطہ نہیں۔ روح افزا سچ کہتی ہیں کہ تمہیں اس کا روگ ہے۔
 بہار بیگم : چلو، پھر تمہیں کیا؟ تمہاری باتوں میں خیال بٹ گیا، مانگ ٹیز ہی ہو گئی۔
 حسن آرا : ہے ہے، غضب ہو گیا۔ یہاں تو دولہا بھائی بھی نہیں ہیں؟ آخر یہ نکھار دکھاؤ گی کسے؟

بہار بیگم : ہم اٹھ کر چلے جائیں گے، تم چھوڑتی جاتی ہو اور موا چھپکا سیدھا نہیں رہتا۔
 حسن آرا : اب تک مانگ کا خیال تھا اب چھپکے کا خیال ہے۔
 بہار بیگم : اچھا، ایک دن ہم تمہارا سنگار کر دیں، خدا کی قسم وہ جوین آجائے کہ جس کا حق ہے۔

حسن آرا : پر اب صاف صاف کہلاتی ہو، تم لاکھ بوٹھو ہمارا جوین خداداد ہوتا ہے، ہمیں بناؤ چنار کی کیا ضرورت بھلا!
 بہار بیگم : اپنے منہ میاں مٹھو بن لو۔

حسن آرا : اچھا، سپہر آرا سے پوچھو، جو یہ کہیں وہ ٹھیک۔
 سپہر آرا : جس طرح بہار بہن نکھرتی ہیں اس طرح اگر تم بھی نکھرو تو چاند کا کلوا بن جاؤ۔ تمہارے چہرے پر سرفی اور سفیدی کے سوانک بھی بہت ہے۔ مگر وہ گوری چٹنی ہیں بس نمک نہیں۔

روح افزا : سچی بات تو یہ ہے کہ حسن آرا ہم سب میں بڑھ چڑھ کر ہیں۔

اتنے میں ایک فن کھڑا ہوا، مشق جوڑی جتی ہوئی۔ نواب خُرخید علی اتر کر بڑی بیگم کے پاس پہنچے اور سلام کیا۔

بڑی بیگم: آؤ بیٹا، بائیں آنکھ جب پھڑکتی ہے تب کوئی نہ کوئی آتا ضرور ہے۔ اس دن آنکھ پھڑکی تو لڑکیاں آئیں یہ روح افزا کی کیا حالت ہو گئی ہے؟
نواب صاحب: اب تو بہت اچھی ہیں۔ مگر پرہیز نہیں کرتیں۔ تینا مرچ نہ ہو تو کھانا نہ کھائیں، پھر بھلا اچھی کیوں کر ہوں؟

یہاں سے باتیں کر کے نواب صاحب اس کمرے میں پہنچے جس میں چاروں بہنیں بیٹھی تھیں۔ نواب صاحب کا لباس دیکھیے، جزاں خاکی رنگ کا، گھٹنا چست، کرتا سفید فلائین کا۔ اس پر سیاہ بنات کا دھگا اور ہری گرنت کی گوٹ۔ بائیں نکتے دار ٹوپی۔ پاؤں میں سیاہ وارنش کا بوٹ، ایک سفید دلائی اوڑھے ہوئے۔ حسن آرا اور سپہر آرا نے نیچی گردن کر کے بندگی کی۔
روح افزا نے کہا آپ بے اطلاع کیے ہمارے کمرے میں کیوں چلے آئے صاحب؟
نواب صاحب: حکم ہو تو لوٹ جاؤں۔

بہار بیگم: شوق سے۔ بن بلائے کوئی نہیں آتا، لو سپہر آرا اب ان کے ساتھ بٹھکی پر ہوا کھانے جاؤ۔

سپہر آرا: واہ کیا جھوٹ موٹ لگاتی ہو۔ بھلا میں نے کب کہا تھا؟
روح افزا: ہم گواہ ہیں۔

نواب صاحب: اچھا، پھر اس میں عیب ہی کیا ہے؟
اتنے میں روح افزا ایک شیشے کی طشتری میں چکنی ڈلیاں رکھ کر لائیں۔ نواب صاحب نے دو اٹھا کر کھالیں اور 'آکھ تھو، آکھ تھو' کرتے کرتے بولے پانی منگاؤ خدا کے واسطے۔
وہ چکنی ڈلی اصل میں مٹی کی تھی۔ چاروں بہنوں نے قہقہہ لگایا اور وہ حضرت بہت جھینپے۔ جب منہ دھو چکے تو سپہر آرا نے ایک گھوری دی۔

نواب صاحب: (گھوری کھول کر) اب بے دیکھے بھالے کھانے والے کی ایسی تیشی۔
کہیں اس میں مرچیں نہ جھونک دی ہوں۔ اس وقت تو بھوک لگی ہوئی ہے۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

حسن آرا: باسی کھیر کھائیے تو لاؤں؟

نواب صاحب: نیکی اور پوچھ پوچھ؟

حسن آرا جا کر ایک کٹلی اٹھا لائی۔ نواب صاحب نے بڑی خوشی سے لی، مگر کھولتے ہیں تو مینڈھلی اچک کر نکل پڑی۔

نواب صاحب: خوب! یہ روح افزا سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ بڑی بی تو بڑی بی، جھوٹی بی سبحان اللہ۔

رات کو نواب صاحب آرام کرنے گئے تو بہار بیگم نے پوچھا، کھوتھاری اماں جان تو جیتی ہیں، یا ڈھلک گئیں؟

نواب صاحب: کیا بے لگی اڑاتی ہو، خواہ مخواہ دل دکھاتی ہو، ایسی باتیں کرتی ہو کہ سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

بہار بیگم: ہاں ان کی تو محبت پھٹ پڑی ہے تم کو، بتیس دھار کا دودھ پلایا ہے کہ نہیں! نواب صاحب: اسی سے آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

بہار بیگم: تو کیوں آئے؟ کیا چکلا گھوڑا اجڑ گیا ہے؟ یا بازار میں کسی نے آگ لگا دی؟ نواب صاحب: اچھا، اس وقت تو خدا کے لیے یہ باتیں نہ کرو۔ کوئی چھ دن کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔

بہار بیگم: کیا کہیں آج اور ٹھکانہ نہ لگا؟

نواب: تم تو جیسے لڑنے پر تیار ہو کر آئی ہو۔

بہار بیگم: کیوں؟ آج پرائن صاحب نہ بنو گے؟ کوٹ پتلون پہن کے نہ جاؤ گے؟ مجھ سے اڑتے ہو!

نواب صاحب رنگین مزاج آدمی تھے۔ بہار بیگم کو ان کے سیر سپاٹے بڑے معلوم ہوتے تھے۔ اسی سبب سے کبھی کبھی میاں بیوی میں جھج چل جاتی تھی۔ مگر اب کی مرتبہ بہار بیگم نے ایک ایسی بات سنی تھی کہ آنکھوں سے خون برسنے لگا تھا۔ ایک دن نواب صاحب کوٹ پتلون ڈاٹ کر ایک بنگلے پر جا پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آدمی نے آکر پوچھا۔ آپ کہاں سے آتے ہیں؟ آپ نے کہا۔ ہمارا نام پرائن صاحب ہے۔ میم صاحب کو بلاؤ۔ اب بیٹے، ایک کنبڑن جو پڑوس میں رہتی تھی، وہاں ترکاری بیچنے گئی ہوئی تھی۔ وہ ان حضرت کو پہچان گئی اور گھر میں آکر بہار بیگم سے کچا چٹھا کہہ سنایا۔ بیگم سننے ہی آگ بھسوکا ہو گئیں اور سوچی کہ

آج تو آنے دو، کیا آڑے ہاتھوں لیتی ہوں کہ چٹھی کا دودھ یاد آ جائے۔ مگر اسی دن یہاں چلی آئیں اور بات جیوں کی تئیں رہ گئی۔ بھری تو بیٹھی ہی تھیں، اس وقت موقع ملا، تو اُبل پڑیں۔ نواب نے جو پتے پتے کی سنی، تو سٹائے میں آ گئے۔

بہار بیگم: کہیے پرائن صاحب، مزاج تو اچھے ہیں؟

نواب صاحب: تم کیا کہتی ہو؟ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کچھ۔

بہار بیگم: ہاں، ہاں، آپ کیا سمجھیں گے۔ ہم ہندوستانی اور آپ خاص ولایت کے

پرائن صاحب! ہماری بولی آپ کیا سمجھیں گے؟

نواب صاحب: کہیں بھنگ تو نہیں لی گئی ہو؟

بہار بیگم: اب بھی نہیں شرماتے؟

نواب صاحب: خدا گواہ ہے، جو کچھ سمجھ میں بھی آیا ہے۔

بہار بیگم: جلائے جاؤ اور پھر کہو کہ دھواں نہ نکلے۔ میں کیا جانتی تھی کہ تم پرائن صاحب

بن جاؤ گے!

ادھر تو میاں بیوی میں لوک جھونک ہو رہی تھی، ادھر ان کی سالیوں دروازے کے پاس کھڑی چپکے چپکے جھانکتیں اور ساری داستان سن رہی تھیں۔ مارے ہنسی کے رہا نہ جاتا تھا۔ آخر جب ایک مرتبہ بہار نے زور سے نواب کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ آپ تو پرائن صاحب ہیں، میں آپ کو اپنے گھر میں نہ گھسنے دوں گی۔ تو سپہر آرا کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ بہار نے ہنسی کی آواز سنی تو دھک سے رہ گئی۔ نواب بھی ہٹکا بٹکا ہو گئے۔

نواب صاحب: تمہاری بہنیں بڑی شوخ ہیں۔

روح افزا: بہن، سلام!

سپہر آرا: دلہا بھائی، بندگی عرض۔

حسن آرا: میں بھی پرائن صاحب کو آداب عرض کرتی ہوں۔

نواب صاحب: سمجھا دو، یہ بڑی بات ہے۔

سپہر آرا: بگڑتے کیوں ہو پرائن صاحب!

بہار بیگم: (کمرے سے نکل کر) اے، تو اب بھاگی کہاں جاتی ہو؟

روح افزا: بہن، اب جاییں۔ پرائن صاحب سے باتیں کریے۔

بہار بیگم: آؤ آؤ حسیں خدا کی قسم۔
 سپہر آرا: کوئی اپنا بھائی بند ہو، تو آئیں۔ بھلا پرائن صاحب کو کیا منہ دکھائیں؟
 نواب صاحب: اس پرائن کے نام نے تو ہمیں خوب جھنڈے پر چڑھایا۔ کیسے رسوا ہوئے!
 بہار بیگم: اپنی کرتوتوں سے۔
 سپہر آرا: اب تو قلعہ کھل گئی۔

تینوں بہنوں نے نواب صاحب کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ بے چارے بہت جھینپے۔
 جب وہ چلی گئیں، تو بہار بیگم نے بھی پرائن صاحب کا قصور معاف کر دیا۔
 دلوں میں کہنے سننے سے عداوت آ ہی جاتی ہے
 جب آنکھیں چار ہوتی ہیں، محبت آ ہی جاتی ہے

(47)

آج ہم ان نواب صاحب کے دربار کی طرف چلتے ہیں، جہاں خوبی اور آزادانہ
 مہینوں مصاحبت کی تھی اور آزاد بنیر کی تلاش میں مہینوں سیر سپانے کرتے رہے تھے۔ شام کا
 وقت تھا۔ نواب صاحب ایک مسند پر شان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ارد گرد مصاحب لوگ بیٹھے
 کچے گڑ گڑاتے تھے۔ بی اللہ رکھی بھی جا کر مسند کا کونا دبا کر بیٹھیں۔

نواب صاحب: یوں آئیے، بی صاحب!

اللہ رکھی: (کھسک کر) بہت خوب!

مصاحب: (دوسرے مصاحب کے کان میں) کیا زمانہ ہے، واہ! ہم شریف اور شریف
 کے لڑکے اور یہ عزت کی جوتیوں پر بیٹھے ہیں۔ کوئی نکلے کو نہیں پوچھتا۔

نذرت: یار، کیا کہیں، اتنا جان چکے دار تھے، جس کا چاہا، بھٹکا سا سر اڑا دیا۔ ڈنکا
 سامنے بجاتا تھا۔ انھیں آنکھوں کے سامنے دونوں طرف آدمی جھک جھک کر سلام کرتے تھے،
 اور انھیں آنکھوں پر بھی دیکھ رہیں کہ بیسوا آکر مسند پر بیٹھ گئی اور ہم نیچے بیٹھے ہیں۔ واہ ری
 قسمت! پھوٹ گئی۔

نواب صاحب: آپ کا نام کیا ہے بی صاحب؟

اللہ رکھی: حضور، مجھے اللہ رکھی کہتے ہیں۔

نواب صاحب: کیا پیارا نام ہے!

عذرت: حضور، چاہے آپ برامائیں یا بھلا، ہم تو سچ کھیت کہیں گے کہ آپ کے یہاں شریفوں کی قدر نہیں۔ غضب خدا کا، یہ نکلے کی بازاری عورت مسند پر آکے بیٹھ جائے اور ہم شریف لوگ ٹھوکریں کھائیں! آسمان نہیں پھٹ پڑتا! کیسے کیسے گوکھے رئیس جمع ہیں دنیا میں۔ اتنا کہنا تھا کہ حافظ جی بگڑ کھڑے ہوئے اور لپک کے عذرت کے منہ پر ایک لڑجھایا۔ وہ آدمی تھے کرارے، لڑکھاتے ہی آگ ہو گئے۔ جھپٹ کے حافظ جی کو دے پٹکا۔ اس پر کل مصاحب اور ہوالی موالی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک: چھوڑ دے بے!

دوسرا: اتنی لاتیں لگا کا کہ بھر کس نکل جائے گا۔

تیسرا: مردک، جس کا نمک کھاتا ہے، اسی کو گالیاں سناتا ہے؟

نواب صاحب: نکال دو اسے باہر۔

حافظ: دیکھیے تو نمک حرام کی باتیں!

نواب: آج سے دربار میں نہ آنے پائے۔

تین چار آدمیوں نے مل کر حافظ جی کو چھڑایا۔ دربار میں ہلو بجا ہوا تھا۔ اللہ رکھی کھڑے کھڑے تھر تھراتی تھی اور نواب صاحب ان کو دلا سہ دیتے جاتے تھے۔

ایک: مصاحب: (اللہ رکھی سے) اے حضور، آپ نہ گھبرائیں۔

دوسرا: مصاحب: واللہ بی صاحب، جو آپ پر ذرا بھی آنچ آنے پائے۔

نواب: تم تو میری پناہ میں ہو جی!

اللہ رکھی: جی ہاں، مگر خوف معلوم ہوتا ہے۔

نواب: ابھی اس موذی کو یہاں سے نکلوائے دیتا ہوں۔

حافظ: حضور، وہ باہر کھڑے سب کو گالیاں دے رہے ہیں۔

سب نے مل کر میاں عذرت کو باہر تو نکال دیا، پر وہ بڑا آدمی تھا، باہر جا کر لنگڑی تنہی سنانے لگا۔ ایسے رئیس پر آسمان پھٹ پڑے، جو ان نکلے نکلے کی عورتوں کے شریفوں سے اچھا سمجھے۔ کسی زمانے میں ہم بھی ہاتھی نشین تھے۔ چودہ چودہ ہاتھی ہمارے دروازے پر

جھوٹے تھے۔ آج اس لویہ رئیس نے ہم کو فرش پر بیٹھایا اور مال زادی کو مسند پر جگہ دی۔
خدا اس مردک سے کہے!

نواب صاحب: یہ کون غل بچا رہا ہے؟

ایک: مصاحب: وہی ہے حضور۔

دوسرا: مصاحب: نہیں حضور، وہ کہاں! وہ بھگا چکا توڑ۔ یہ کوئی فقیر ہے۔ بھوکوں مرتا

ہے۔

نواب: کچھ دلوا دو بھائی!

ایک مصاحب نے داروغہ جی کو بلایا اور ان سے دس روپے لے کر باہر چلا۔ جب اس کے لوٹ آنے پر بھی باہر کا شور نہ بند ہوا، تو نواب نے خدمت گار کو بھیجا کہ دیکھ، اب کون چلا رہا ہے؟ خدمت گار نے باہر جا کر جو دیکھا، تو میاں عدت کھڑے گالیاں سنارہے ہیں۔ جب وہ نواب صاحب کے پاس جانے لگا، تو داروغہ جی نے اسے روک کر سمجھایا۔ اگر تم نے ٹھیک ٹھیک بتلا دیا، تو ہم تم کو ماری ڈالیں گے۔ خبردار، یہ نہ کہنا کہ میاں عدت گالیاں دے رہے ہیں۔ بلکہ یوں بیان کرنا کہ وہ فقیر تو دس روپے لے کر چل دیا، مگر اور کئی فقیر، جو اس وقت وہاں موجود تھے، آپ کو دعائیں دے رہے ہیں۔ ان کا سوال ہے کہ حضور کے دربار سے کچھ انھیں بھی ملے۔

نواب صاحب نے یہ سنا، تو انھیں یقین آ گیا۔ بے چارے بھولے بھالے آدمی تھے، حکم دیا کہ اسی وقت سب فقیروں کو انعام ملے، کوئی دربار سے نامراد نہ لوٹے، ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔

حافظ: داروغہ جی، ان فقیروں کو چالیس روپے دے دیجیے۔

نواب: کیا، چالیس! بھلا سو روپے تو تقسیم کرو!

مصاحب: اے، خدا سلامت رکھے۔

حافظ: واہ واہ، کیوں نہ ہو میرے نواب!

داروغہ نے سو روپے لیے اور باہر نکلے۔ کئی مصاحب بھی ان کے ساتھ ساتھ باہر آ

پہنچے۔

ایک: ایسے غوث رئیس کہاں ملیں گے؟

دوسرا: کیا پاگل ہے، واللہ۔

داروغہ: کہہ دیں کہ دے آئے۔

حافظ: بے وقوف، کاٹھ کا الو۔

داروغہ: کہہ دیں گے کہ دے آئے۔

حافظ: لیکن جو پھر غل مچائے؟

داروغہ: اجی، اس کو نکال باہر کر دو۔ دو دھکے۔

سب نے میاں ندرت کو گھیر لیا اور کوسوں تک رگیدتے ہوئے لے گئے۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے چلے۔ اللہ رکھی کو بھی خوب کوسا۔

نواب نے لاکھوں قسمیں دیں کہ اللہ رکھی کھانا کھائیں اور کچھ دن اسی باغیچے میں آرام سے رہیں، مگر اللہ رکھی نے ایک نہ مانی۔ میاں ندرت کا اسے بار بار طعنے دینا، اسے نکلے کی عورت اور بیسوا کہنا اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

نواب: سچ کہیے بی صاحبہ، آخر آپ کیوں اس قدر رنجیدہ ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو، تو معاف کرو۔

اللہ رکھی: جانے ہمیں اس وقت کیا یاد آیا۔ آپ سے کیا بتائیں دل ہی تو ہے۔

نواب: مجھ سے تو کوئی تصور نہیں ہوا۔

اللہ رکھی: حضور، یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ ہماری سی بے حیا زندگی کسی کی نہ ہو۔ ماں باپ نے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیا، آپ چین سے اڑایا کیے، ہمیں بھاڑ میں جھونک گئے۔ ہمارے بوڑھے میاں شادی کرتے ہی دوسرے شہر میں جا بسے۔ ہم ان کے نام کو رو بیٹھے۔ جب وہ اثنا غفل ہو گئے، تو ہماری ماں نے بڑا جشن کیا اور ایک دوسرے لڑکے سے شادی ٹھہرائی۔ مگر اماں سے کسی نے کہہ دیا۔ خبردار، لڑکی کو اب نہ بیاہنا، بھلے مانسوں میں بیوہ کا نکاح نہیں ہوتا۔ بس، اماں چٹ سے بدل گئیں۔ آخر میں ایک رات کو گھر سے نکل بھاگی۔ لیکن اس دن سے آج تک جیسی پاک پیدا ہوئی تھی، ویسی ہی ہوں۔ آج اس آدمی نے جو مجھے نکلے کی عورت اور بیسوا بنایا، تو میرا دل بھر آیا۔ قسم لے لیجیے، جو میاں آزاد کے سوا کسی سے کبھی آنکھیں لڑی ہوں۔

نواب : کون، کون؟ کس کا نام تم نے لیا؟
حافظ : اچھا پتہ لگا۔ وہ تو نواب صاحب کے دوست ہیں۔
نواب : ہم کو ان کی خبر ملے، تو فوراً بلوالیں۔

اللہ رکھی : وہ تو کہیں باہر گئے ہیں۔ کچھ دنوں ہماری سرائے میں ٹھہرے تھے۔ اچھے خوبصورت جوان ہیں۔ ان کو ایک بھولے بھالے نواب مل گئے تھے۔ نواب نے ایک بیئر پالا تھا۔ میاں آزاد نے اسے کابک سے نکال کر چھپا لیا۔ نواب کے مصاحبوں نے بیئر کی خوب تعریفیں کیں۔ کسی نے کہا، قرآن پڑھتا تھا، کسی نے کہا، روزے رکھتا تھا۔ سب نے مل کر نواب کو اتو بنا لیا۔ میاں آزاد کو اونٹنی دی گئی کہ جا کر بیئرے ڈھونڈ لاؤ۔ آزاد اونٹنی لے کر ہمارے یہاں بہت دن تک رہے۔

نواب صاحب مارے شرم کے گڑھے جاتے تھے۔ عمر بھر میں آج ہی تو انھیں خیال آیا کہ ایسے مصاحبوں سے نفرت کرنا لازم ہے۔ مصاحبوں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ رنگ جمائیں مگر نواب اور بھی بددماغ ہو گئے۔

نواب : وہ بھولا بھالا نواب میں ہی ہوں۔ آپ نے اس وقت میری آنکھیں کھول دیں۔

مصاحب : غریب پرور، خدا جانتا ہے، ہم لوگ کٹ مرنے والے ہیں۔
نواب : بس، ہم سمجھ گئے۔

حافظ : حضور، توپ دم کر دیجیے، جو ذرا خطا ہو۔ ہم لوگ جان دینے والے آدمی ہیں۔
نواب : بس، چڑھاؤ نہیں۔ اب قلعی کھل گئی۔
مصاحب : خدا جانتا ہے۔

نواب : اب قسمیں کھانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ جو ہوا سو ہوا، آگے سمجھا جائے گا۔
اللہ رکھی : جو مجھ کو معلوم ہوتا، تو یہ ذکر ہی کبھی نہ کرتی۔

نواب : خدا کی قسم، تم نے مجھ پر اور میرے باپ پر، دونوں پر اس وقت احسان کیا۔ تم ذکر نہ کرتیں، تو میں ہمیشہ اندھا بنا رہتا، تم نے تو اس وقت مجھے جلا لیا۔

مصاحب : جس نے جو کہہ دیا، وہی حضور نے مان لیا۔ بس، یہی تو خرابی ہے۔ ذرا ہماری خدمتوں کو دیکھیں، تو ہم کو موتیوں میں تولیں۔ قسم خدا کی۔ موتیوں میں تولیں۔

نواب : میرا بس چلے، تو تم سب کو کالے پانی بھیج دوں۔ اور اوپر سے باتیں بناتے ہو؟ بیڑ بھی روزہ رکھتے ہیں؟

حافظ : خداوند، خدا کی خدائی میں کیا کچھ بعید ہے۔

نواب : چلو بس، خدائی میں دخل نہ دو۔ معلوم ہوا، بڑے دیندار ہو۔ میرا بس چلے، تو تم کو ایسی جگہ قتل کروں، جہاں پانی تک نہ ملے۔

حافظ : اگر کوئی قصور ثابت ہو، تو قتل کر ڈالیے۔

مصاحب : خداوند، وہ آزاد ایک ہی گرگا ہے، بڑا دعا باز۔

اللہ رکھی : بس، بس، ان کو نہ کچھ کہیے۔ ان کا سا آدمی کوئی ہو تو لے!

نواب : کیا شک ہے۔ خیر، اب بھی سویرا ہے، سستے چھوٹے۔

اللہ رکھی : چھپتے تو سستے۔ اے ہاں، یہ کہاں کی نمک حلائی ہے کہ بیڑ کو روزہ دار اور نمازی بنا دیا؟ جو سنے گا، کیا کہے گا؟

نواب : نمک حلال کے بچے بنے ہوئے ہیں!

مصاحب : خداوند! جو چاہے، کہہ لیجیے، ہم لوگ حجت اور تکرار تھوڑے ہی کر سکتے ہیں۔

نواب : اجی، تم تو زہر دے دو، سکھیاں کھلا دو۔ خوب دیکھ چکا۔

اللہ رکھی : ایسے بے ایمانوں سے خدا بچائے۔

مصاحب : ہاں، مسند پر بیٹھ کر جو چاہے کہہ لو۔ بازار میں جھوٹ جھوٹ کرتی پھرتی ہو، اور یہاں آکے باتیں بناتی ہو۔

نواب : بس، زبان بند کرو۔ میرا دل کھٹا ہو گیا۔

مصاحب : جو ہم خطا دار ہوں تو ہمارا خواہم سے سمجھیں۔ ذرا بھی کسی بات میں نمک حرامی کی ہو، تو ہم پر آسان پھٹ پڑے۔ حضور چاہے نہ مانیں، مگر دنیا کہتی ہے کہ جیسے مصاحب حضور کو ملے ہیں، ویسے بڑے خوش قسمتوں کو ملتے ہیں۔

نواب : یوں کہوں کہ جس کی قسمت پھوٹ جاتی ہے، اس کو تم جیسے گر گئے ملتے ہیں۔ بس، آپ لوگ بوریا بدھنا اٹھائیے اور چلتے پھرتے نظر آئیے۔

مصاحب : حضور، مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑیں گے، نہ چھوڑیں گے۔

حافظ : یہ دامن چھوڑ کر کہاں جائیں؟

مرزا: کہیں ٹھکانہ بھی ہے؟

حافظ: ٹھکانہ تو سب کچھ ہو جائے، مگر چھوڑ کر جانے کو بھی جب جی چاہے۔ جس کا اتنے دن تک نمک کھایا، اس سے بھلا الگ ہونا کیسے گوارہ ہو؟ مار ڈالیے، مگر ہم تو اس ڈیوڑھی سے نہیں جانے کے۔ یہ در اور یہ سر۔ مریں بھی، تو حضور ہی کی چوکھٹ پر، اور جنازہ بھی نکلے، تو اسی دروازے سے!

نواب: باتیں نہ بناؤ۔ جہاں سینگ سائے، چلے جاؤ۔
حافظ: حضور کو خدا سلامت رکھے۔ جہاں حضور کا پسینہ گرے، وہاں ہمارا خون ضرور گرے گا۔

مگر نواب صاحب ان چکموں میں نہ آئے۔ خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ان سبھوں کو پکڑ کر باہر نکال دو۔ اگر نہ جائیں، تو ٹھوکر مار کر نکال دو۔
اب بی اللہ رکھی کا بھی حال سینے۔ ان کو میاں ندرت کی باتوں کا ایسا قلق ہوا، دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اپنے کل زیور اور اسبابِ حج کر بستی کے باہر ایک ٹیلے پر فقیروں کی طرح رہنے لگیں۔ قسم کھالی کہ جب تک آزاد روس سے نہ لوٹیں گے، اسی طرح رہوں گی۔

(48)

جس جہاز پر میاں آزاد اور خوبی سوار تھے، اسی پر ایک نوجوان انگریز افسر اور اس کی میم بھی تھی۔ انگریز کا نام چارلس ہیلٹن تھا اور میم کا وینیڈیا۔ آزاد کو اداس دیکھ کر وینیڈیا نے اپنے شوہر سے پوچھا— اس جنیل مین سے کیونکر پوچھیں کہ یہ بار بار لمبی سانسیں کیوں لے رہا ہے؟

صاحب: تم ایسے ویسے آدمیوں کو جنیل مین کیوں کہتی ہو؟ یہ تو مگر (کالا آدمی) ہے۔
میم: مگر تو ہم جشی کو کہتے ہیں۔ یہ تو گورا چٹا، خوبصورت آدمی ہے۔
صاحب: تو کیا خوبصورت ہونے سے ہی کوئی جنیل مین ہو جاتا ہے؟ انگلینڈ کے سب سپاہی گورے ہوتے ہیں، تو کیا اس سے وہ سب کے سب جنیل مین ہو گئے؟

میم: تم تو اپنی دلیل سے آپ قائل ہو گئے۔ جب گورے چمڑے سے کوئی جنیل مین نہیں ہوتا، تو پھر تم سب کیوں جنیل مین کہلاؤ؟ اور ان لوگوں کو مگر کیوں کہو؟ واہ، اچھا انصاف

ہے!

اتنے میں جہاز کے ایک کونے سے آواز آئی کہ اومیدی، نہ ہوئی کرولی، نہیں تو لاش پھڑکتی ہوتی۔

میاں آزاد ڈرے کہ ایسا نہ ہو، میاں خوبی کسی انگریز سے لڑ پڑیں، انیم کی لہر میں کسی سے بے وجہ جھگڑ پڑیں۔ قریب جا کر پوچھا۔ یہ کیوں بگڑے جی، کس پر غل مچایا؟

خوبی: اجی، جاؤ بھی، یہاں شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔ واللہ، گرفتار ہی کر لیا تھا۔ میدی کو پاتا، تو اتنی کردلیاں لگتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ مگر میرا پاؤں پھسل گیا اور وہ نکل گیا۔

آزاد: تمہیں ایک آنچ کی ہمیشہ کسر رہ جاتی ہے۔ یہ تھا کون؟

خوبی: تھا کون، وہی بہروپیا! اور کس کو پڑی تھی بھلا!

آزاد: بہروپیا

خوبی: جی ہاں بہروپیا۔ بڑا تعجب ہوا آپ کو؟

آزاد: بھی ہاں، تعجب کہیں لینے جاتا ہے۔ کیا بہروپیا بھی جہاز پر سوار ہو لیا ہے؟ بڑا

لاگو ہے بھی؟

خوبی: سوار نہیں ہوا، تو آیا کہاں سے؟

آزاد: کیا سوتے ہو خوبی، یا پینک میں ہو؟

خوبی: خوبی کی ایسی کی تھی۔ پھر تم نے خوبی کہا ہم کو!

آزاد: معاف کرنا بھی، قصور ہوا۔

خوبی: واہ، اچھا قصور ہوا! کسی کے جوتے لگائے اور کہیے، قصور ہوا۔ جب دیکھو، خوبی

خوبی۔

آزاد: اچھا جناب خواجہ صاحب، اب تو راضی ہوئے! یہ بہروپیا کہاں سے آگیا؟

خوبی: ارے صاحب، اب تو خواب میں بھی آنے لگے۔ ابھی میں سوتا تھا، آپ آ

پہنچے۔ میرے ہاتھ میں اس وقت انیم کی ڈیا تھی۔ پینک کے ڈیا اور لے کے کنارہ جو پیچھے

جھپٹا، تو دو کوس نکل گیا۔ مگر شامت یہ آئی کہ ایک جگہ ذرا سا پانی پڑا تھا۔ میری تو جان ہی

نکل گئی۔ پھسلا، تو آرا۔ را۔ را۔ دھوں!

آزاد: کیا گر پڑے؟ جاؤ بھی!

خوجی: بس، کچھ نہ پوچھیے۔ میرا گرتا ایسا معلوم ہوا، جیسے ہاتھی پہاڑ سے گرا۔ دھڑام! دھڑام!

آزاد: اس میں کیا شک! آپ کے ہاتھ پاؤں ہی ایسے ہیں۔ وہ تو کہیے، بڑی خیریت گزری۔

خوجی: اور کیا، مگر جاتا کہاں ہے گیدی۔ رگید کے ماروں یہاں، پلٹن میں صوبے داری کر چکے ہیں۔

میم اور صاحب، دونوں میاں آزاد اور خوجی کی باتیں سن رہے تھے۔ صاحب تو اردو خوب سمجھتے تھے، مگر میم صاحب کوری تھیں۔ صاحب نے ترجمہ کر کے بتایا، تو دینیچیا بھی مارے ہنسی کے لوٹ گئی۔ یہ انچ بھر کا آدمی، ایک ایک ماشے کے ہاتھ پاؤں، اور آپ کے گرنے سے اتنی بڑی آواز ہوئی کہ جیسے ہاتھی گرے!

صاحب: سبزی ہے کوئی۔ جانے کیا وہی تباہی بکتا ہے۔

میم: تم چپ رہو۔ ہم اس جنٹل مین سے پوچھتے ہیں، یہ کون پاگل ہے۔

صاحب: اچھا، مگر ہندوستانی بدتمیز ہوتے ہیں۔ تم اس سے باتیں نہ کرو۔

میم: اچھا، تمہیں پوچھو۔

اس پر صاحب نے انگلی کے اشارے سے آزاد کو بلایا۔ آزاد بھلا کب سننے والے تھے۔

بولے ہی نہیں۔ صاحب پلٹنی آدمی، چہرہ مارے غصے کے لال ہو گیا۔ خیال ہوا کہ دینیچیا تالیاں بجائے گی کہ ایک مگر تک مخاطب نہ ہوا، بات کا جواب تک نہ دیا۔ دینیچیا نے جب یہ حالت دیکھی تو اٹھلائی اور مسکراتی ہوئی میاں آزاد کی طرف گئی۔ آزاد لیڈیوں سے بولنے چالنے کے عادی تو تھے ہی، ایک خوبصورت لیڈی کو آتے دیکھا، تو ٹوپی اتار کر سلام کیا اور پوچھا۔ آپ کہاں تشریف لے جائیں گی؟

میم: مگر جارہی ہوں۔ یہ ممکنہ آدمی کون ہے؟ خوب باتیں کرتا ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ

میں بل پڑ پڑ گئے۔

آزاد: جی ہاں، بڑا مسخرہ ہے۔

میم: چارلی، یہ تو کہتے ہیں وہ بونا مسخرہ ہے۔

صاحب: بس کی باتیں بڑے مزے کی ہوتی ہیں۔

صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آزاد کی ڈیل ڈول دیکھ کر ڈر گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں جہاز پر ایک دل لگی باز کو سوچھی کہ آؤ، خوبی کو بنائیں۔ دو چار اور شہدے اس سے مل گئے۔ جب دیکھا کہ میاں خوبی پینک میں سو گئے، تو ایک آدمی نے دو لا لال مرچیں ان کی ناک میں ڈال دیں۔ خوبی نے جو آنکھ کھولی، تو مارے پھینکوں کے بوکھلا گئے۔ باولے کتے کی طرح ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ میم اور صاحب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔

آزاد: جناب خواجہ صاحب!

خوبی: بس، الگ رہیے گا، آک چھیں!

آزاد: آخر یہ ہوا کہ؟ کچھ بتاؤ تو!

خوبی: چلیے، آپ کو کیا، چاہے جو کچھ ہوا! آ..... چھیں!

آزاد: یار یہ اسی بہرہ پیا کی شرارت ہے۔

خوبی: دیکھیے تو، کتنی کردلیاں بھونکی ہوں کہ آ..... چھی۔ یاد ہی تو کرے۔ چھیں۔

آزاد: مگر تم تو گر گر پڑتے ہو میاں! ایک دفعہ جی کڑا کر کے پکڑ کیوں نہیں لیتے؟

خوبی: ناک میں مرچیں ڈال دیں گیدی نے۔

آزاد: اب کی آپ ناک میں بیٹھے رہیے، بس، آتے ہی پکڑ لیجیے۔ مگر ہے بڑا شریر، ج

ج ناک میں دم کر دیا۔

خوبی: کچھ ٹھکانہ ہے! ناک میں مرچیں جھونکنے کی کون سی دل لگی ہے؟

آزاد: اور کیا صاحب، یہ بیجا بات ہے۔

خوبی: بیجا و بیجا کے بھروسے نہ رہیے گا، میں کسی دن ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دوں گا۔ کہاں

کے بڑے کڑے خاں ہیں آپ! میں نے صوبے داری کی ہے۔

آزاد: تو آپ میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کرتے ہیں؟ میں نے تو آپ کا کچھ بگاڑا

نہیں۔

خوبی: (آنکھیں کھول کر) ارے! یہ آپ تھے! بھی، معاف کرنا۔ بس، دیکھتے جاؤ،

اب گرفتار ہی کیا چاہتا ہوں گیدی کو۔

آزاد: لیکن، ذرا ہوشیار رہیے گا۔ بہرہ پیا گیا جہنم میں، ایسا نہ ہو، کوئی حضرت روپے

پیسے غائب کر دیں، بے وقوف کہیں کا! ابے گدھے، یہاں بہرہ ویا کہاں؟
 خوبی: بس، چونچ سنبھالیے، بندہ چلتا ہے۔ دوستی ہو چکی۔ کچھ آپ کے غلام نہیں
 ہیں۔ اور سنیے، ہم گدھے ہیں۔ کیا جانے کتنے گدھے ہم نے بنا ڈالے۔
 آزاد: خیر، یہی سنیے۔ لیکن جائے گا کہاں؟ یہاں بھی کچھ خشکی ہے؟
 خوبی: ارے او جہاز کے کپتان! جہاز روک لے۔ ابھی روک لے۔
 صاحب: وہ یوں نہ سنے گا۔ دو چار ہاتھ کرولی کے لگائیے، تو پھر سنے۔
 اتنے میں حاضری کھانے کا وقت آیا۔ آزاد نے بے تکلفی کے ساتھ ان دونوں کے
 ساتھ کھانا کھایا۔ پھر تینوں ٹہلنے لگے۔ آزاد کو وینچیا کی ایک ایک جھولی بھاتی تھی اور وہ حسینہ
 کبھی شوخی سے اٹھلاتی تھی، کبھی ناز کے ساتھ مسکراتی تھی۔ اتنے میں خوبی نے یہ شعر پڑا۔
 گر تم نہیں تو اور بت مہ جیں سہی
 ہم کو دل لگی سے غرض ہے، کہیں سہی
 آزاد نے جو یہ شعر سنا، تو خوبی کے پاس آکر بولے۔ یہ کیا غضب کرتے ہو جی؟
 اس کا شوہر شعر خوب سمجھ لیتا ہے۔
 خوبی: وہ گیدی ان اشاروں کو کیا جانے۔
 آزاد: تم بڑے شریر ہو۔
 خوبی: کیوں استاد، ہمیں سے یہ اڑن گھانیاں بتاتے ہو، کیوں؟ کچھ کہنا، حسن آرا کے
 لگ بھگ ہے کہ نہیں۔ بہیٹی والی بیگم بھی ایسی ہی شوخ تھی۔
 وینچیا نے خوبی کو مسکراتے دیکھا، تو انگلی کے اشارے سے بلایا۔ خوبی تو ریشاختی ہو
 گئے۔ بہت اٹھتے اور اکڑتے ہوئے چلے۔ گویا لندھور پہلوان کے بھی چچا ہیں۔ واہ، کیوں نہ
 ہو۔ اس وقت ذرا پاؤں پھسلے، تو دل دنگی ہو۔ میم صاحب کے پاس پہنچے۔
 آزاد: ٹوٹی اتار کر سلام کرو خوبی۔
 خوبی کا لفظ سننا تھا کہ خواجہ صاحب کا غصہ ایک سو بیس درجہ پر جا پہنچا۔ بس، پلٹ
 پڑے اور پلٹتے ہی اٹلے پاؤں بھاگنے لگے۔
 آزاد: او گیدی جو پلٹ گیا تو اتنی کرو لیا بھو لگی کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔
 میم: کیوں خبری، کیا مجھ سے خفا ہو گئے؟

آزاد: کیوں بھائی، کیا شیطان نے پھر انگلی کر دی؟ میاں خوجی؟
 خوجی: خوجی پر خدا کی مار! خوجی پر شیطان کی پٹکار! ایک دفعہ خوجی کہا، میں خون پی
 کر رہ گیا، اب پھر دہرایا۔ خدا جانے، کب کا دیا اس گاڑھے وقت کام آیا۔ نہیں تو مارے
 کرویلیوں کے بھٹا سا سر اڑا دیتا۔ لاکھ گیا گزرا ہوں، تو کیا ہوا، عمر بھر رسالہ داری کی ہے،
 گھاس نہیں کھودی۔

میم: اچھا، یہ خوجی کے نام پر بگڑے! ہم سمجھے، ہم سے روٹھ گئے۔
 خوجی: نہیں، میم صاحب! ایسی بات آپ فرماتیں ہیں۔
 آزاد: ذرا ان سے ان کی بیوی جان کا حال پوچھیے۔ اس کا نام ہوا زعفران ہے۔
 دیونی ہے دیونی۔

خوجی نے ہوا زعفران کا نام سنا، تو رنگ فق ہو گیا اور سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ آزاد
 نے جب وینیشیا سے سارا قصہ کہا، تو مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئی۔

(49)

ایک عالی شان محل کی چھت پر حسن آرا اور ان کی تینوں بہنیں بیٹھی نیند سو رہی ہیں۔
 بہار بیگم کی زلفِ عنبر کی پلٹیں آتی تھیں، روح افزا کے گھونگر والے بال نوجوانوں کے مزاج
 کی طرح بل کھاتے تھے، پہرہ آراہ کی مہندی عجب لطف دکھاتی تھیں اور حسن آرا بیگم کے
 گورے گورے کھنڈے کے گرد کالی کالی زلفوں کو دیکھ کر دھوکا ہوتا تھا کہ چاند گرہن سے نکلا
 ہے۔

ادھر تو یہ چاروں پریاں بے خبر آرام میں ہیں، ادھر شہزادہ ہمایوں فر اپنے دوست میر
 صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہیں۔

میر کچھ اڑوسی پڑوسی کا تو حال کہیے۔ دونوں حسنین نظر آتی ہیں یا نہیں؟
 شہزادہ: ارے میاں، اب تو چوگرزی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ سب مست
 ہیں۔ مگر بلا کی حیا دار۔

میر: یہ کیسے، گہرے ہیں استاد!
 شہزادہ: اجی، ابھی خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک مہری حسن آرا کا خط لائی ہے۔ خط پڑھ

ہی رہا تھا کہ آپ بلا کی طرح آپہنچے۔ جی چاہتا ہے، گولی مار دوں۔

میر: کیوں صاحب، آپ نے تو کان پکڑے تھے۔

شہزادہ: دل پر قابو بھی تو ہو؟

میر: کلک کا نیکا لگاؤ گے؟ خدا کے لیے پھر توبہ کرو۔ آخر چاروں چھوڑ دیوں میں سے

آپ رکھے کس پر! یا چاروں پر دل آیا ہے؟

شہزادہ: چار نکاح تو جائز ہیں۔

میر: تو یہ کیسے، چاروں پر دانت ہے۔

شہزادہ: نہیں میاں، ہنستا ہوں۔ دو ہی تو کنواری ہیں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ یکایک محلے میں چور چور کا غل مچا۔ کوئی چراغ جلاتا ہے،

کوئی بیوی کے زیور ٹٹوتا ہے۔ چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ بڑی بیگم

صلبہ کے کمر چور گھسا تھا۔ شہزادے نے جو یہ بات سنی تو میر صاحب سے بولے۔ بھئی،

موقع تو اچھا ہے۔ چلو، اس وقت ذرا ہو آئیں۔ اسی بہانے احسان جتائیں۔

میر: سوچ لو، ایسا نہ ہو، پیچھے میرے ماتھے جائے۔ تم تو شہزادے بن کر چھوٹ

جاؤ گے، اٹو میں بنوں گا۔ آخر وہاں چل کر کیا کہو گے؟

شہزادہ: اجی، کہیں گے کیا! بس، افسوس کریں گے۔ شاید اسی پھیر میں ایک بھٹک مل

جائے۔ اور نہیں، تو آواز ہی سن لیں گے۔

دونوں آدمی بیگم صلبہ کے مکان پر پہنچے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ چالیس پچاس آدمی ایک

چور کو گھیرے کھڑے ہیں اور چاروں طرف سے اس پر بے بھاد کی پڑ رہی ہیں۔ ایک نے تڑ

سے چپت بھائی، دوسرے نے کھوپڑی پر دھول لگائی۔ چور پر اتنی پڑی کہ بلبلا گیا۔ تھوڑا جھولا

کر رہ جاتا تھا۔ دو تین بھلے آدمی لوگوں کو سمجھا رہے تھے، بس کرو، اب تو کھوپڑی پھیلی کر

دی۔ کیا جماتے ہی جاؤ گے؟

1۔ بھئی، خوب ہاتھ گرمائے۔

2۔ ہم تو پولے ہاتھ سے لگاتے تھے۔ جس میں چوٹ کم آئے، مگر آواز خوب ہو۔

چور: چھوٹوں گا تو ایک ایک سے سمجھوں گا۔ کیا کروں، بے بس ہوں، ورنہ سب کو پیس

کر دھر بتیا۔

بہار بیگم کے مياں بھی کھڑے تھے۔ بولے۔ ایک ہی شیطان ہے۔
شہزادہ: آخر، یہ آیا کدھر سے؟

نواب صاحب: میں گھوم کر کوئی دس بجے کے لگ بھگ۔ کھانا کھا کر لینا ہی تھا کہ نیند آگئی۔ یہ غل بچا، تو تلووار لے کر دوڑ پڑا۔ اب سینے، میں تو اوپر سے آرہا ہوں، اور چور نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ راستے میں مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے چمڑی نکالی، مگر میں نے بھی تلووار کا وہ ہاتھ چلایا کہ ذرا ہاتھ اوچھا نہ پڑے، تو بھنڈارا کھلا جائے۔ پھر تو ایسا سہا کہ ہوش اڑ گئے۔ بھاگتے راہ نہ ملی۔ اب چھت پر پہنچا اور چاہتا تھا کہ چھت کر نیچے کود پڑے، مگر میری چھوٹی سالی نے اس پھرتی سے رسی کا پھندا بنا کر پھینکا کہ الجھ کر گرا۔ اٹھ کر بھاگنے کو ہی تھا کہ میں گلے پر پہنچ گیا اور جاتے ہی چھاپ بیٹھا۔ عورتوں نے دہائی دینا شروع کی، لیکن میں نے نہ چھوڑا۔ آپ نے اس وقت کہاں تکلیف فرمائی؟

شہزادہ: میں نے کہا، چل کر دیکھوں، کیا بات ہوئی۔ بارے شکر ہے کہ خیریت ہوئی۔ مگر آپ کی سالی بڑی دلیر ہیں۔ دوسری عورت ہو، تو ڈر جائے۔

یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر اندر چاروں بہنوں میں بھی یہی ذکر تھا۔ چاروں ہنس ہنس کر یوں باتیں کر رہی تھیں۔

سپہر آرا: ہے ہے باجی، میں نے جب اس کالے کالے سنڈے کو دیکھا، تو سن سے جان نکل گئی۔

روح افزا: مواں تمباکو کا پنڈا۔

حسن آرا: وہ تو خیر گزری کہ صندوق ہاتھ سے گر پڑا، نہیں تو سب موس لے جاتا۔
سپہر آرا: بہار بیگم کی چڑچڑی سال لاکھوں ہی سناتی کہ میری بہو کے گہنے سب بچ کھائے۔

بہار بیگم: چور چور کی بھٹک کان میں پڑی، تو میں کلبلا کر چونک پڑی۔ بھاگی، تو جوڑا بھی کھل گیا۔ اللہ جانتا ہے، بڑی محنت سے باندھا تھا۔ چلو خیر!
روح افزا: بس، ہماری باجی کو چوٹی کشتی کی فکر رہتی ہے۔
حسن آرا: بھتا ان کو اس بات کا خیال ہے، اتنا ہمارے خاندان بھر میں کسی کو نہیں ہے۔ جی تو دلہا بھائی اتنے دیوانے رہتے ہیں۔

بہاریگم: چلو، بیٹھی رہو، چھوٹے منہ کی بڑی بات!
حسن آرا: دلہا بھائی کو ان کے ساتھ مشق ہے۔

بہاریگم: کاٹر لگائی ہے ناحق!

اب دل لگی سینے کہ مرزا ہمایوں فر باہر بیٹھے چپکے چپکے ساری باتیں سن رہے تھے۔ نواب بے چارے کٹ کٹ گئے، مگر چپ۔ اندر جا کر سمجھائیں، تو ادب کے خلاف، چپکے بیٹھے رہے، تو بھی رہا نہیں جاتا۔ جان عذاب میں تھکا۔ خیر حلقہ پی کر شہزادہ رخصت ہوئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد نواب صاحب اندر آئے اور بولے۔ تم لوگوں کی بھی عجیب عادت ہے۔ جب دیکھو گی کہ کوئی غیر آدمی آکے بیٹھا ہے، بس، تمہی غل مچاؤ گی۔ اس وقت ایک بھلے مانس بیٹھے تھے اور یہاں چہل ہو رہی تھی۔

بہاریگم: وہ بھلا مانس گھوڑا کون تھا، جو اتنے وقت پناہت کرنے آ بیٹھا؟
روح افزا: تو اب کوئی ان کے مارے اپنے گھر میں بات نہ کرے؟ گھوٹ کر مار نہ ڈالے۔

حسن آرا: ہم بھی تو سنیں، وہ بھلے مانس کون تھے؟
نواب: اجی، بیبی، جو سامنے رہتے ہیں، شہزادے؟
حسن آرا: تو آپ نے آکر ہم سے کہہ کیوں نہ دیا؟ پھر ہم کاہے کو بولتے؟
بہاریگم: اپنی خطا نہ کہیں گے، دوسروں کو للکاریں گے۔
نواب: اس وقت وہاں سے آنے کا موقع نہ تھا۔ مجھ سے پوچھا کہ چور کو کس نے پکڑا۔ میں نے کہا، میری چھوٹی سالی نے۔ تو بہت ہی ہنسے۔
نواب صاحب باہر چلے گئے، تو پھر باتیں ہونے لگیں۔
سپہر آرا: ذرا ان کی ڈھائی تو دیکھو کہ چور کا نام سنتے ہی آڈٹا۔ بھلا کیا وجہ تھی اس کی؟
ایسا کہاں کا بڑا رستم تھا؟

حسن آرا: تین بجے کے وقت آپ جو آئے، تو کیوں آئے!
روح افزا: میں بتاؤں، اس کو یہ خبر نہ ہوگی کہ دولہا بھائی گھر پر ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو گھر میں گھس پڑتا۔

بہاریگم: نہیں، واہ، شہزادہ ہے، کوئی ایسا ویسا ہے!

پہر آرا: کام تو شہدے کے جیسے ہیں۔

اب ایک اور دل لگی سینے۔ چور آیا، غل مچاڑا ہوا، پکڑا گیا، زمانے بھر میں ہلو چا، محلہ بھر جاگ اٹھا، چور تھانے پر پہنچا، مگر بڑی بیگم صاحبہ ابھی تک خرائے ہی لے رہی ہیں۔ جب جاگیں، تو ماما سے بولیں۔ کچھ غل سا چا تھا ابھی؟

ماما: ہاں، کچھ آواز تو آئی تھی۔

بیگم: ذری، کسی سے پوچھو تو۔

ماما: اے بی بی، پوچھنا اس میں کیا ہے؟ بھیڑیا دیریا آیا ہوگا۔

بیگم: میں نے آج ہاتھی کو خواب میں دیکھا ہے، اللہ بچائے۔

اتنے میں چور کے آنے کی خبر ملی۔ تب تو بیگم صاحبہ کے ہوش اڑ گئے۔ ماما کو بھیجا کہ جا پوچھ، کچھ لے تو نہیں گیا۔

حسن آرا: اماں جان بہت جلد جاگیں! کیا تو بھی گھوڑے بیچ کر سوئی تھی؟ اللہ ری نیند! ماما: ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ مگر کچھ غل کی آواز ضرور آئی تھی۔

حسن آرا: بھر جاگ اٹھا، تمہارے نزدیک کچھ ہی کچھ غل تھا۔ ٹھیک! جا کے لتاں سے کہہ دے کہ چور آیا تھا، مگر جاگ ہو گئی۔

پہر آرا: اے، کاہے کے واسطے بہکتی ہو۔ ماما، تو جا کے سو رہے، شور غل کہیں کچھ نہ تھا، کوئی سوتے میں بڑا اٹھا ہوگا۔

حسن آرا: نہیں ماما، یہ دل لگی کرتی ہیں۔ چور آیا تھا۔

ماما: اے، گیا چولے میں گلوڑا چور! ادھر آنے کا رخ کرے، تو آنکھیں ہی پھوٹ جائیں۔ کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔

پہر آرا: دیکھو تو سہی بھلا!

ماما: ابھی بیگم صاحبہ سن لیں، تو دنیا سر پر اٹھالیں۔

ماما نے جا کر بیگم سے کہا۔ اے حضور، کچھ ہے نہ دے، بے کار کو جگایا۔ نہ بھیڑیا، نہ چور، کوئی سوتے سوتے بڑا اٹھا تھا۔

بیگم: ذرا باہر جا کر تو پوچھ یہ غل کیسا تھا؟

مہری: بی بی، میں ابھی باہر سے آئی ہوں، کوٹھے پر کل مونہا آیا تھا۔ کوٹھری کا قفل توڑ

کر جب صندوق اٹھایا تو، جاگ ہو گئی۔ اتنے میں نواب صاحب کوٹھے پر سے نکلے تلوار لیے دوڑے آئے۔

بیگم: نواب صاحب کے دشمنوں کو تو کہیں چوٹ اُٹ نہیں آئی؟

مہری: نہ بی بی ایک پھانس تک تو چھپی نہیں۔

بیگم: چور کچھ لے تو نہیں گیا؟

مہری: ایک بھی تک نہیں۔

بیگم: چور اب کہاں ہے؟

مہری: خادم حسین تھانے پر لے گیا۔

اما: اب چکی پیسی پڑے گی۔

بیگم: تو تو کہتی تھی کہ کوئی سوتے سوتے بڑا اٹھا تھا۔ جھوٹی زمانے بھر کی! چل، جا، ہٹ!

اب تھانے کا حال سینے۔ تھانے دار ندارد، جعدار شراب پیے مست، کانشیل اپنی اپنی

ڈیوٹی پر۔ ایک کانشیل پہرے پر کھڑا سو رہا تھا۔ خادم حسین نے بہت غل مچایا، تب جا کے

حضرت کی نیند کھلی۔ بگڑے کہ مجھے جگایا کیوں؟ چور کو چھوڑ دو۔

خادم حسین: واہ چھوڑ دینے کی ایک ہی کہی۔ میں بھی تھانے میں محرر رہ چکا ہوں۔

کانشیل: نہ چھوڑ گئے تم؟

خادم حسین: ہوش کی دوا کرو میاں! اس کے ساتھ تم کو بھی پھنساؤں گا تو سہی۔

کانشیل: (چور سے) تجھے انھوں نے اپنے یہاں کے گھنٹے رکھا تھا؟

چور: پکڑ کر بس یہاں لے آئے؟

کانشیل: دت گوکھے! ابے، تو کہنا کہ میں راہ راہ چلا جاتا تھا، ان سے مجھ سے لاگ

ڈاٹ تھی۔ انھوں نے گھات پا کر مجھے پکڑ لیا، خوب پیٹا اور چار گھنٹے تک اصطبل کی کوفٹری میں

بند رکھا۔

چور: لاگ ڈاٹ کیا بتاؤں؟

کانشیل: کہہ دینا کہ میری جورو پر یہ بری نگاہ ڈالتے تھے۔ بس، لاگ ڈاٹ ہو گئی۔

چور: مگر میری جورو تو چار برس ہوئے ایک کے ساتھ نکل گئی۔

کانشیل: بس، تو بات بن گئی! کہہ دینا، انھیں کی سازش سے نکلی تھی۔ تو ان پر دو جرم

قائم ہوں گے۔ ایک یہ کہ تم کو جھوٹ موٹ پھانس لیا، دوسرے زبردستی قید رکھا۔

خادم حسین: تمہاری باتوں پر کچھ ہنسی آتی ہے، کچھ غصہ

کانٹیل: جب بڑا گھر دیکھو گے، تب ہنسی کا حال کھل جائے گا۔

خادم حسین: ہمارے گھر میں چوری ہو اور ہمیں پھنسیں؟

خیر، کانٹیل صاحب روز نامہ لکھنے بیٹھے۔ خادم حسین نے ساری داستان بیان کی۔ جب

اس نے یہ کہا کہ نواب صاحب تلوار لے کر دوڑے، تو کانٹیل نے قلم روک دیا اور کہا۔ ذرا

خبر، تلوار کا لائنس ان کے پاس ہے؟

خادم حسین: ان کے ساتھ تو میں سپاہی تلوار باندھے نکلتے ہیں۔ تم ایک لائنس لیے

پھرتے ہو!

آخر رپورٹ ختم ہوئی اور خادم اپنے گھر آیا۔

(50)

ایک دن میاں آزاد مسٹر اور مسز ہیملٹن کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ ایک ہنسوز

آبیٹھے اور لطیفے کہنے لگے۔ بولے۔ اجی، ایک دن بڑی دل لگی ہوئی۔ ہم ایک دوست کے

یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو اس کے خدمت گار کی بیوی دس انڈے چٹ کر گئی۔ جب

دوست نے پوچھا، تو خدمت گار نے یگوئی بات بنا کر کہا کہ بلی کھا گئی۔ مگر میں نے دیکھ لیا

تھا، جب بلی آئی تو وہ عورت اسے مارنے دوڑی۔ میں نے کہا۔ بلی کو مار نہ ڈالنا نہیں تو پھر

انڈے ہضم نہ ہوں گے۔

آزاد: بات تو یہی ہے۔ کھائے کوئی، بلی کا نام بد۔

ہیملٹن: آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟

ہنسوز: شادی کرنا تو آسان ہے، مگر بیوی کا سنبھالنا مشکل۔ ہاں، ایک شرط پر ہم شادی

کریں گے۔ بیوی دس بچوں کی ماں ہو۔

میم: بچوں کی قید کیوں؟

ہنسوز: آپ نہیں سمجھی۔ اگر جوان آئی، تو اس کے خڑے اٹھاتے اٹھاتے ناک میں دم

آجائے گا ادھیڑ بیوی ہوئی تو خڑے نہ کرے گی اور بچے بڑے کام آئیں گے۔

آزاد: وہ کیا؟

ہنسوڑ: قحط کے دنوں میں بچ لیں گے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوبی لڑھکتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ ایک سوکھا کنار

ہاتھ میں ہے۔

آزاد: آئیے۔ بس، آپ ہی کی کسرتھی۔

خوبی: مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کسی سے پوچھوں تو کہ یہ سمندر ہے کیا چیز اور کس کی

دعا سے بنا ہے؟

ہنسوڑ: میں بتاؤں! اگلے زمانے میں ایک ملک تھا گھامزنگر۔

خوبی: ذری ٹھہر جائے گا۔ وہاں انیم بھی بکتی تھی؟

ہنسوڑ: اس ملک کے باشندے بڑے دلیر ہوتے تھے، مگر قد کے چھوٹے۔ بالکل مٹی

مرغے کے برابر۔

خوبی: (موٹھوں پر تاؤ دے کر) ہاں ہاں، چھوٹے قد کے آدمی تو دلیر ہوتے ہی

ہیں۔

ہنسوڑ: اور کوئی بغیر کردلی باندھے گھر سے نہ نکلتا تھا۔

خوبی: (اکڑ کر) کیوں میاں آزاد، اب نہ کہو گے؟

ہنسوڑ: مگر ان لوگوں میں ایک عیب تھا، سب کے سب انیم پیتے تھے۔

خوبی: (تیوریاں چڑھا کر) او گیدی!

آزاد: ہیں ہیں! شریف آدمیوں سے یہ بدزبانی!

خوبی: ہم تو سر سے پاؤں تک ہلکے گئے، آپ شریف لیے پھرتے ہیں۔

ہنسوڑ: وہاں کی عورتیں بڑی گرائڈیل ہوتی تھیں۔ جہاں میاں ذرا مگڑے، اور بیوی

نے بغل میں دبا کر بازار میں گھسیٹا۔

خوبی: ابا ہا، سنتے ہو یا را وہ بہرہ ویا وہیں کا تھا۔ اب تو اس گیدی کا مکان بھی مل گیا۔

چچا بنا کر چھوڑوں، تو سہی۔

ہنسوڑ: وہ سب رسالداری کرتے تھے۔

خوبی: اور وہاں کیا کیا ہوتا تھا؟ اس ملک کے آدمیوں کی تصویریں بھی آپ کے پاس

ہیں؟

ہنسوڑ: تمہیں تو، مگر اب نہیں رہیں۔ بس، بالکل تمہارے ہی سے ہاتھ پاؤں تھے۔
کراہے جوان۔ پوڑے بہت کھاتے تھے۔

خوجی: اوہو! وہ سب ہمارے ہی باپ دادا تھے۔ دیکھو بھائی آزاد، اب یہ بات
اچھی نہیں۔ وہاں سے تو لمبے چوڑے وعدے کر کے لائے تھے کہ کروڑی ضرور لے دیں گے،
اور یہاں صاف مکر گئے۔ اب ہمیں کروڑی منگا دو، تو خیریت ہے، نہیں تو ہم بگڑ جائیں گے۔
واللہ، کون گیدی دم بھر ٹھہرے یہاں۔

آزاد: اور یہاں سے آپ جائیں گے کہاں؟ جہنم میں؟

وینچیا: کچھ روپے بھی ہیں؟ جہاز کا کرایہ کہاں سے دو گے؟

آزاد: میں ان کا خزانچی ہوں۔ یہ مگر جائیں، کرایہ میں دے دوں گا۔

ہنسوڑ: اس خزانچی کے لفظ پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا۔ شادی کے پہلے نوجوان لیڈیاں
اپنے عاشق کو اپنا خزانہ کہتی ہیں۔ شادی ہونے کے بعد اسے خزانچی کہنے لگتی ہیں۔ خزانچی کے
خزانچی اور میاں کے میاں۔

وینچیا: اچھا ہوا، تمہاری بیوی چل بسیں، نہیں تو تمہاری کفایت ان کی جان ہی لے
لیتی۔

ہنسوڑ: عجیب عورت تھی، شادی کے بعد ایسی رونی صورت بنائے رہتی تھی کہ معلوم ہوتا
تھا، آج باپ کے مرنے کی خبر آئی ہے۔ دو برس کے بعد ہم سے چھ مہینے کے لیے جدا ہوئی۔
اب جو دیکھتا ہوں، تو اور ہی بات ہے۔ بات بات پر مسکرا نہ اور ہنسا۔ بات ہوئی اور کھل گئی۔
میں نے پوچھا کیا تم وہی ہو، جو ناک بھوں چڑھائے رہتی تھیں؟ مسکرا کر کہا۔ ہاں، ہوں تو
وہی۔ میں نے کہا۔ خیر، کایا پلٹ تو ہوئی۔ ہنس کے بولی۔ واہ اس میں تعجب کا ہے کا۔ ایک
دن مجھے خیال آگیا، بس، تب سے اب ہر وقت ہنستی ہوں۔ تب تو میں نے اپنا منہ پیٹ لیا۔
رونی صورت بنا کر بولا۔ ہم تو خوش ہوئے تھے کہ اب ہم سے تم سے خوب بنے گی، مگر
معلوم ہو گیا کہ تمہاری ہنسی اور رونے دنوں کا اعتبار نہیں۔ اگر تمہیں اسی طرح بیٹھے بیٹھے کسی
دن خیال آگیا کہ رونا اچھا، تو پھر رونا ہی شروع کر دو گی۔

آزاد: مجھے بھی ایک بات یاد آگئی۔ ہمارے محلے میں ایک خواجہ صاحب رہتے تھے۔

ان کے ایک لڑکی تھی، اتنی حسین کہ چاند بھی شرما جائے۔ بات کرتے وقت بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کی شادی ایک گنوار جاہل سے ہوئی، جو اتنا بد صورت تھا کہ اس سے بات کرنے کا بھی جی نہ چاہتا تھا۔ آخر لڑکی اسی غم میں کڑھ کڑھ کر مر گئی۔

(51)

کئی دن تک تو جہاز خیریت سے چلا گیا، لیکن پیریم کے قریب پہنچ کر جہاز کے کپتان نے سب کو اطلاع دی کہ ایک گھنٹے میں بڑی سخت آندھی آنے والی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی سب کے ہوش حواس غائب ہو گئے۔ عقل نے ہوا بتلائی، آنکھوں میں اندھیری چھائی، موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ تڑا یہ کہ آسمان فقیروں کے دل کی طرح صاف تھا، چاندنی خوب نکھری ہوئی، کسی کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ طوفان آئے گا، مگر بیرمیٹر سے طوفان کی آمد صاف ظاہر تھی۔ لوگوں کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، جان کے لالے پڑ گئے، یا خدا، جائیں تو کہاں جائیں، اور اس طوفان سے نجات کیوں کر پائیں؟ کپتان کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کے نائب بھی سٹی پٹی بھول گئے۔ بیڑیوں سے تختے پر آتے تھے اور گھبرا کر پھر اوپر چڑھ جاتے تھے۔ کپتان لاکھ لاکھ سمجھاتا تھا، مگر کسی کو اس کی بات کا یقین نہ آتا تھا۔

کسی طرح سے سمجھتا نہیں دل ناشار،
وہی ہے رونا، وہی چیخنا، وہی فریاد۔

اتنے میں ہوانے وہ زور باندھا کہ لوگ تڑائی تڑائی کرنے لگے۔ کپتان نے ایک پال تو رہنے دیا، اور جہاز کو خدا کی راہ پر چھوڑ دیا۔ لہروں کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ جہاز جموٹکے کھا کر گیند کی طرح ادھر سے ادھر اچھلتا تھا۔ سب کے سب زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، اپنی جانوں کو رو بیٹھے۔ بچے سہم کر اپنی ماؤں سے چپٹے جاتے تھے۔ کوئی عورت منہ ڈھنک کر روتی تھی کہ عمر بھی کی کمائی اسی سمندر میں گموائی۔ کوئی اپنے پیارے بچے کو چھاتی سے لگا کر کہتی۔ بیٹا، اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ پر وہ نادان مسکراتا تھا اور اس بھولے پن سے ماں کے دل پر بجلیاں گراتا تھا۔ کسی کو مارے خوف کے چپ لگ گئی تھی، کسی کے ہاتھ پاؤں میں کچکی تھی۔ کوئی سمندر میں کود پڑنے کا ارادہ کر کے رہ جاتا تھا، کوئی بیٹھا

دیوتوں کو مناتا تھا۔ کیا بوڑھے، کیا جوان، سب کی عقل گم تھی۔ وینیشیا کے چہرے کا رنگ کا نور ہو گیا۔ ہنسوں کے دل سے ہنسی کا خیال کوسوں دور ہو گیا۔ میاں آزاد کا چہرہ زرد، ہیملٹن کے ہاتھ پاؤں سرد۔ میاں آزاد سوچنے لگے، یا خدا، یہ کس مصیبت سے دوچار کیا، معشوق کے عوض موت کو گلے کا ہار کیا! جی لگانے کی خوب سزا پائی، عشق کی دھن میں جان بھی گنوائی۔ ہماری ہڈیاں تک گل جائیں گی، پر حسن آرا ہماری خبر بھی نہ پائیں گی۔ سپہر آرا بار بار فال دیکھیں گی کہ آزاد کب میدان سے سرخرو ہو کر آئیں گے اور ہم کب مسجد میں گھر کے چراغ جلائیں گے، مگر آزاد کی کشتی غوطے کھاتی ہے اور ذرا دیر میں تہہ کی خبر لاتی ہے۔

جہاز میں تو یہ کہرام مچا تھا، مگر خوبی لمبی تانے سو ہی رہے تھے۔ اس نیند پر خدا کی مار، اس پینک پر شیطان کی پھٹکار! آزاد نے جگایا کہ خوابہ صاحب، اٹھیے، طوفان آیا ہے۔ حضرت نے لیٹے ہی لیٹے بھینسا کر فرمایا کہ چپ گیدی، ہم نے خواب میں بہرہ پیا پکڑ پایا ہے۔ تب تو آزاد کلائے اور کس کر ایک لات لگائی۔ خوبی کلبلا کر اٹھ بیٹھے اور سمندر کی بھیا تک صورت دیکھی، تو کانپ اٹھے۔

کپتان خوب سمجھتا تھا کہ حالت ہر گھڑی نازک ہوتی جاتی ہے، لیکن پرانا آدمی تھا، کلیجہ مضبوط کیے ہوئے تھا۔ اس سے لوگوں کو تسلی ہوتی تھی کہ شاید جان بچ نکلے۔ سامنے پیرم کا جزیرہ نظر آتا تھا، مگر وہاں تک پہنچنا محال تھا۔ سب کے سب دعا کر رہے تھے کہ جہاز کسی طرح اس ٹاپو تک پہنچ جائے۔ مرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں آزاد نے کیا دیکھا کہ ہیملٹن وینیشیا کا ہاتھ پکڑ کر تختہ پر کھڑے ہو رہے ہیں۔ آزاد کو دیکھتے ہی وینیشیا نے کہا۔

مسٹر آزاد رخصت! ہمیشہ کے لیے رخصت!

آزاد: رخصت!

ہنسوں: ہے ہے! لو، اب بھنور میں جہاز آگیا۔

یہ سن کر عورتوں نے وہ فریاد مچائی کہ لوگوں کے کلیجے دہل گئے۔

ہیملٹن: بس، اتنی ہی دنیا تھی!

آزاد: ہاں، اتنی ہی دنیا تھی!

خوبی: بھئی آزاد، خدا گواہ ہے، میں اس وقت انیم کے نشے میں نہیں۔ افسوس، تمہاری جان جاتی ہے، حسن آرا سمجھیں گی کہ آزاد نے دھوکہ دیا۔ ہائے آزاد، تیری جوانی مفت گئی۔

ایکا ایک جہاز تین بار گھوما اور ہوا کے جھونکے سے کئی گز کے فاصلے پر جا پہنچا۔ اب لائف بوٹ کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ جہاز ڈوبنے ہی کو تھا، دس فیٹ سے زیادہ پانی اس میں سا گیا تھا۔ لائف بوٹ سمندر میں اتارے گئے اور آزاد لڑکوں اور عورتوں کو اٹھا اٹھا کر لائف بوٹ میں بیٹھانے لگے۔ ان کی اپنی جان خطرے میں تھی، مگر ابن کی انھیں پرواہ نہ تھی۔ جب وہ وینیشیا کے پاس پہنچے، تو اس نے ان سے ہاتھ ملایا اور امیلین اور وہ، دونوں لائف بوٹ میں کود پڑے۔ آزاد کی دلیری پر لوگ حیرت سے دانتوں تلے انگلی دباتے تھے۔ لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے، جو بے گناہوں کی جان بچانے کے لیے آیا ہے۔

ٹاپو کے باشندے کنارے پر کھڑے روشنی کر رہے تھے کہ شعلے انھیں اور جہاز کے لوگ سمجھ جائیں کہ زمین قریب ہے۔ سینکڑوں آدمی غل مچاتے تھے، تالیاں بجاتے تھے۔ کچھ لوگ رو رہے تھے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے، جو دل میں کھلے جاتے تھے کہ اب پو بارہ ہیں۔

ایک: بس، اب جہاز ڈوبا۔ تڑکے ہی سے لیس ہو کر آڈٹوں گا۔

دوسرا: ہمیں ایک بار جواہرات کا ایک صندوق مل گیا تھا۔

تیسرا: اچی، ہم نے اسی طرح بہت کچھ پیدا کیا۔

چوتھا: اچی، کیا بکتے ہو؟ کچھ تو خدا سے ڈرو۔ وے سب تو مصیبت میں ہیں، اور تم

لوگوں کو لوٹ کی دھن سوار ہے۔ شرم ہو، تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔

میاں خوبی بار بار ہمت باندھ کر لائف بوٹ کی طرف جاتے اور ڈر کر لوٹ آتے تھے۔ آخر آزاد نے انھیں بھی گھسیٹ کر لائف بوٹ میں پہنچایا۔ وہاں جاتے ہی انھوں نے غل مچایا کہ افیم کی ڈبیا تو ہیں رہ گئی! میاں! ذری لپک کے کوئی ہماری ڈبیا لے آئے۔ آزاد نے کہا۔ میاں، تم بھی کتنے پاگل ہو؟ یہاں جانوں کے لالے پڑے ہیں، تمہیں اپنی ڈبیا ہی کی فکر ہے۔

لائف بوٹ گل تین تھے۔ ان میں مشکل سے پچاس ساٹھ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن ہر شخص چاہتا تھا کہ میں بھی لائف بوٹ میں پہنچ جاؤں۔ کپتان نے یہ حالت دیکھی، تو زنجیر کھول دیں۔ کشتیاں بہہ نکلیں۔ اب باقی آدمیوں کی جو حالت ہوئی، وہ بیان میں نہیں آسکتی۔ اگر کوئی فوٹو گرافر ان بد نصیبوں کی تصویر اتارتا، تو بڑے سے بڑے سنگ دل بھی اسے دیکھ کر سر دھننے۔ موت چھٹی جاتی ہے، اور موت کے بچوں میں پھنسی ہوئی جان پھڑ پھڑا رہی ہے۔ مگر

جان بڑی پیاری چیز ہے۔ لوگ خوب جانتے تھے کہ جہاز کے ڈوبنے میں دیر نہیں، لائف بوٹ بھی دور نکل گئے، مگر پھر بھی یہ امید ہے، شاید کسی طرح بچ جائیں۔ دو بد نصیب بہنیں یوں باتیں کر رہی تھیں۔

بڑی بہن: کود پڑو پانی میں۔ شاید بچ جائیں۔
 چھوٹی بہن: لہریں کہیں نہ کہیں پہنچا ہی دیں گی۔
 بڑی: اماں سنیں گی تو کیا کریں گی؟
 چھوٹی: میں تو کودتی ہوں۔
 بڑی: کیوں جان دیتی ہے؟

ایک عورت نے اپنے پیارے بچے کو سمندر میں پھینک دیا اور کہا۔ یہ لڑکا تیرے سپرد کرتی ہوں۔

یہ کہہ کر خود بھی گر پڑی۔

اب سنیے، جس لائف بوٹ پر وینیشیا اور اہیلٹن تھے، وہ ہوا کے جھونکے سے پیرم سے دور ہٹ گیا۔ وینیشیا نے کہا۔ اب کوئی امید نہیں!
 اہیلٹن: خدا پر بھروسہ رکھو۔
 وینیشیا: یا خدا، ہمیں بچالے۔ ہم بے گناہ ہیں۔
 اہیلٹن: صبر، صبر!

وینیشیا: لو، آزاد کی کشتی بھی ادھر ہی آنے لگی۔ اب کوئی نہ بچے گا۔

دونوں کشتیاں تھوڑے ہی فاصلے پر جا رہی تھیں، اتنے میں ایک لہر نے اہیلٹن کی کشتی کو ایسا جھونکا دیا کہ وہ نیچے اوپر ہونے لگی اور تین آدمی سمندر میں گڑ پڑے۔ اہیلٹن بھی ان میں سے ایک تھے۔ ان کے گرتے ہی وینیشیا نے ایک جیج ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ آزاد نے یہ حال دیکھا، تو فوراً بوٹ پر سے کود پڑے اور جان ہتھیلی پر لیے ہوئے، لہروں کو چیرتے، اہیلٹن کی مدد کو چلے۔ ادھر اہیلٹن کا سکا بھی پانی میں کودا اور ان کے سر کے بال دانتوں سے پکڑ کے اوپر لایا۔ مہاں آزاد بھی تیرتے ہوئے جا پہنچے اور اہیلٹن کو پکڑ لیا۔ اسی وقت کشتی بھی آپہنچی اور لوگوں نے مدد دے کر اہیلٹن کو کھینچ لیا۔ مگر کشتی اتنی تیزی سے نکل گئی کہ آزاد اس پر نہ آسکے۔ اب ان کے لیے موت کا سامنا تھا۔ مگر وہ کلیجہ مضبوط کیے ٹاپو کی طرف تیرتے

چلے جاتے تھے۔ ٹاپو والوں نے انہیں آتے دیکھا تو اور بھی حوصلہ بڑھایا، اور ہمت دلائی۔ سب کے سب دعا کر رہے تھے کہ یا خدا، اس جوان کو بچا۔ جیوں ہی آزاد ٹاپو کے قریب پہنچے، رستیاں پھینکی گئیں اور آزاد اوپر آئے۔ سب نے ان کی پیٹھ ٹھوکی۔ وینیشیا نے میاں آزاد سے کہا۔ تم نہ ہوتے، تو میں کہیں کی نہ رہتی۔ تمہارا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔

ہیٹلٹن : بھائی، دیکھنا، بھول نہ جانا۔ ترکی سے خط لکھتے رہنا۔

آزاد : ضرور، ضرور!

وینیشیا : آزاد، جیسے بہن کو اپنے بھائی کی محبت ہوتی ہے، ویسی ہی مجھ کو تمہاری محبت

ہے۔

آزاد : میں جہاں رہوں گا، آپ لوگوں سے ضرور ملوں گا۔

خوجی : یار، ہماری افیم کی ڈبیا جہاز ہی میں رہ گئی۔ دیکھیں، کس خوش نصیب کے ہاتھ لگتی ہے۔

سب لوگ یہ جملہ سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”(52)“

مالٹا میں آرمیدیاں، عرب یونان، اسپین، فرانس سبھی دیشوں کے لوگ ہیں۔ مگر دو دن سے اس جزیرے میں ایک بڑے گرانڈیل جوان کا گزر ہوا ہے۔ قد کوئی آدھ گز کا، ہاتھ پاؤں دو دو ماشے کے، ہوا ذرا تیز چلے، تو اڑ جائیں۔ مگر بات بات پر خیکھے ہوئے جاتے ہیں۔ کسی نے ذرا ترچھی نظر سے دیکھا، اور آپ نے کروٹیاں سیدھی کی۔ نہ دین کی فکر تھی، نہ دنیا کی، بس، افیم ہو، اور چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔

آزاد نے کہا۔ بھئی، تمہارا یہ فقرہ عمر بھر نہ بھولے گا کہ دیکھیں ہماری افیم کی ڈبیا کس خوش نصیب کے ہاتھ لگتی ہے۔

خوجی : پھر، اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟ ہماری تو جان پر بن آئی، اور آپ کو دل لگی سوچتی ہے۔ جہاز کے ڈوبنے کا کس مردک کو رنج ہو۔ مگر افیم کے ڈوبنے کا البتہ رنج ہے۔ دو دن سے جمہائیوں پر جمہائیاں آتی ہیں۔ پیسے لاؤ، تو دیکھوں، شاید کہیں مل جائے۔

میاں آزاد نے دو پیسے دیے اور آپ ایک دکان پر پہنچ کر بولے۔ افیم لانا جی؟

دکاندار نے ایک ہاتھ سے کہا کہ ہم نے سمجھا نہیں۔
 خوجی: عجب جانگو ہے! اے، ہم انیم مانتے ہیں۔
 دکان دار ہنسنے لگا۔

خوجی: کیا پٹھی جوتی کی طرح دانت نکالتا ہے! لاتا ہے انیم کہ نکالوں کرولی!
 اتنے میں میاں آزاد پہنچے اور پوچھا۔ یہاں کیا خریداری ہوتی ہے؟
 خوجی: اجی، یہاں تو سبھی جانگو ہی جانگو رہتے ہیں۔ گھنٹے بھر سے انیم مانگ رہا ہوں،
 سنتا ہی نہیں۔
 آزاد: پھر کہنے سے تو آپ برا مانتے ہیں بھلا یہ بارود بیچتا ہے یا انیم؟ بالکل موکھے ہی
 رہے۔

خوجی: اگر انیم کا یہی حال رہا، تو ترکی تک پہنچنا محال ہے۔
 آزاد: بھئی، ہمارا کہا مانو۔ ہمیں ترکی جانے دو اور تم گھر جاؤ۔
 خوجی: واہ وا، اب میں ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔ اور میں چلا جاؤں گا، تو تم لڑو گے کس
 کے برتے پر؟

آزاد: بے شک، آپ ہی کے برتے پر تو میں لڑنے جاتا ہوں نا؟
 خوجی: کون؟ قسم کھا کے کہتا ہوں، جب سینے گا، یہی سینے گا کہ خواجہ صاحب نے توپ
 میں کیل لگا دی۔

آزاد: جی، اس میں کیا شک ہے۔

خوجی: شک دک کے بھروسے نہ رہیے گا! اکیلی کلزی چولھے میں بھی نہیں جلتی۔ جس
 وقت خواجہ صاحب عربی گھوڑے پر سوار ہوں گے اور اکڑ کر بیٹھیں گے، اس وقت اچھے اچھے
 جنڈیل کنڈیل جھک جھک کر سلام کریں گے۔

اتنے میں ایک حبشی سامنے سے آ نکلا۔ کرارا جوان، مچھلیاں بھری ہوئیں، سینہ چوڑا۔
 خوجی نے جو دیکھا کہ آدمی اکڑتا ہوا سامنے سے آ رہا ہے، تو آپ بھی اٹھنے لگے۔ حبشی نے
 قریب آ کر کندھے سے ذرا دھکا دیا، تو میاں خوجی نے بیس لڑھکیاں کھائیں۔ مگر بے حیا تو
 تھے ہی، جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور حبشی کو لٹکار کہا۔ اے او گیدی، نہ ہوئی کرولی
 اس وقت۔ ذرا میرا پیڑ پھسل گیا، نہیں تو وہ پکینی دیتا کہ انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے!

آزاد: تم کیا تمہارا گاؤں بھر تو اس کا مقابلہ کر لے!
 خوبی: اچھا، لڑا کر دیکھ لو نا! چھاتی پر نہ چڑھ بیٹھوں، تو خواجہ نام نہیں۔ کہو، تو لگا دوں
 جا کر۔

آزاد: بس، جانے دیجیے۔ کیوں ہاتھ پیر کے دشمن ہوئے ہو!
 دوسرے دن جہاز وہاں سے روانہ ہوا۔ آزاد کو بار بار حسن آرا کی یاد آتی تھی۔ سوچتے
 تھے، کہیں لڑائی میں مارا گیا، تو اس سے ملاقات بھی نہ ہوگی۔ خوبی سے بولے۔ کیوں جی، ہم
 اگر مر گئے، تو تم حسن آرا کو ہمارے مرنے کی خبر دو گے، یا نہیں؟
 خوبی: مرنا کیا ہنسی لٹا ہے؟ مرتے ہیں ہم جیسے دبلے پتلے بوڑھے اچھی کہ تم ایسے
 بٹے کئے جوان؟

آزاد: شاید ہمیں تم سے پہلے مر جائیں؟
 خوبی: ہم تم کو اپنے پہلے مرنے ہی نہ دیں گے۔ ادھر تم پیار ہوئے، اور ہم نے ادھر
 زہر کھایا۔

آزاد: اچھا، جو ہم ڈوب گئے؟
 خوبی: سنو میاں، ڈوبنے والے دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ وہ سمندر میں ڈوبنے نہیں آیا
 کرتے، ان کے لیے ایک چلو کافی ہوتا ہے۔

آزاد: ذرا دیر کے لیے مان لو کہ ہم مر گئے، تو اطلاع دو گے نہ؟
 خوبی: پہلے تو ہم تم سے پہلے ہی ڈوب جائیں گے، اور اگر بد نصیبی سے بچ گئے، تو جا
 کر کہیں گے۔ آزاد نے شادی کر لی، اور پھر بڑے ازار ہے ہیں۔

آزاد: جب تو آپ دوستی کا حق خوب ادا کریں گے!
 خوبی: اس میں حکمت ہے۔
 آزاد: کیا ہے، ہم بھی سنیں؟

خوبی: اتنا بھی نہیں سمجھتے! ارے میاں، تمہارے مرنے کی خبر پا کر حسن آرا کی جان پر
 بن آئے گی، وہ سر پک پک کر دم توڑ دے گی، اور جو یہ سنے گی کہ آزاد نے دوسری شادی
 کر لی، تو اسے تمہارے نام سے نفرت ہو جائے گی، اور رنج تو پاس پھٹکنے بھی نہ پائے گا
 کیوں، ہے نہ اچھی ترکیب؟

آزاد: ہاں، ہے تو اچھی!

خوبی: دیکھا، بوڑھے آدمی ڈبیا میں بند کر رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تم لاکھ پڑھ جاؤ، پھر لوٹو ے ہی ہو ہمارے سامنے۔ مگر تمہاری آج کل یہ کیا حالت ہے؟ کوئی کتاب پڑھ کر دل کیوں نہیں بہلاتے؟

آزاد: جی اچاٹ ہو رہا ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔

خوبی: تو خوب سیر کرو۔ ارے یار، پہلے تو ہمیں امید ہی نہیں کہ ہندستان پہنچے، لیکن زندہ پہنچے، اور ہندستان کی صورت دیکھی، تو زمین پر قدم نہ رکھیں گے، لوگوں سے کہیں گے، تم لوگ کیا جانو، مالٹا کہاں ہے؟ خوب گئے اڑائیں گے۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی ایک کوٹھے میں گئے۔ وہاں قبوے کی دکان تھی۔ آزاد نے ایک آدمی کے ہاتھ افیم منگائی۔ خوبی نے افیم دیکھی تو کھل گئے۔ وہیں گھولی اور چسکی لگائی۔ واہ آزاد، کیوں نہ ہو، یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اس وقت ہم بھی اپنے وقت کے بادشاہ ہیں۔

فکر دنیا کی نہیں رہتی ہے مے خواروں میں،

غم غلط ہو گیا جب بینہ گئے یاروں میں۔

اس دکان میں بہت سے اخبار میز پر پڑے تھے۔ آزاد ایک کتاب دیکھنے لگے۔ مالک دکان نے دیکھا، تو پوچھا۔ کہاں کا سفر ہے؟ آزاد: ترکی جانے کا ارادہ ہے۔

مالک: وہاں ہماری بھی ایک کوٹھی ہے۔ آپ وہاں ٹھہریے گا۔

آزاد: آپ ایک خط لکھ دیں، تو اچھا ہو۔

مالک: خوشی سے۔ مگر آج کل تو وہاں جنگ چھڑی ہے!

آزاد: اچھا، چھڑ گئی؟

مالک: ہاں، چھڑ گئی۔ لڑائی سخت ہوگی۔ لوہے سے لوہا لڑے گا۔

جب آزاد یہاں سے چلنے لگے، تو مالک نے اپنے لڑکے نام خط لکھ کر آزاد کو دیا۔

دونوں آدمی وہاں سے آکر جہاز پر بیٹھے۔

رات کے گیارہ بجے تھے، چاروں بہنیں چاندنی کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ ایک ایک ماما نے کہا۔ اے حضور، ذری چپ تو رہیے۔ یہ غل کیسا ہو رہا ہے؟ آگ لگی ہے کہیں۔
حسن آرا: ارے، وہ شعلے نکل رہے ہیں۔ یہ تو بالکل قریب ہے۔
نواب صاحب: کہاں ہو سب کی سب! ضروری سامان باندھ کر الگ کرو۔ پڑوس میں شہزادے کے یہاں آگ لگ گئی۔ زیور اور جواہرات الگ کر لو۔ اسباب اور کپڑے کو جہنم میں ڈالو۔

بہار بیگم: ہائے، اب کیا ہوگا!
حسن آرا: ہائے ہائے، شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔
بچے اتر کر سبھوں نے بڑی پھرتی سے سب چیزیں باہر نکالیں اور پھر کوٹھے پر گئیں، تو کیا دیکھتی ہیں کہ ہمایوں فر کی کوٹھی میں آگ لگی ہے اور ہر طرف سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ یہ سب اتنی دور پر کھڑی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف بھٹی ہی بھٹی ہے۔ دھقیاں جو چٹکیں، تو بس، یہی معلوم ہوا کہ بادل گرج رہا ہے۔
بہار بیگم: ہائے، لاکھوں پر پانی پڑ گیا۔

سپہر آرا: بہن، ادھر تو آؤ۔ دیکھو، ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ ذرا دیکھو، وہ کون ہے؟ ہے! وہ کون ہے؟

بہار بیگم: کہاں کون ہے؟
سپہر آرا: وہ مہتابی پر کون ہے؟
حسن آرا: ارے، یہ تو ہمایوں فر ہیں۔ غضب ہو گیا۔ اب یہ کیونکر بچیں گے؟
سپہر آرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر بولی۔ باجی، اب ہوگا کیا؟ چاروں طرف آگ ہے۔ بچے گا کیونکر بے چارہ!
بہار بیگم: اس کی جوانی پر ترس آتا ہے۔

حسن آرا منہ ڈھانپ کر خوب روئی۔ سپہر آرا کا یہ حال تھا کہ آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ ہمایوں فر مہتابی پر اس تاک میں سوئے تھے کہ شاید ان حسینوں میں سے کسی کا جلوہ نظر آئے۔

لیکن ٹھنڈی ہوا چلی، تو آنکھ لگ گئی۔ جب آگ لگی اور چاروں طرف غل مچا، تو جاگے، لیکن کب؟ جب مہتابی کے نیچے کے حصے میں چاروں طرف آگ لگ چکی تھی۔ خدمت گاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہی سوچتے تھے، کسی طرح سے اس بے چارے کی جان بچائیں۔ اسباب بٹورنے کی فکر کئے! کوئی شہزادے کی جوانی کو یاد کر کے روتا تھا، کوئی سردھن کر کہتا تھا۔ غریب بوڑھی ماں کے دل پر کیا گزرے گی؟ شہر کے غول کے غول آدمی آکر جمع ہو گئے۔ سپاہی اور چوکیدار، شہر کے رئیس اور افسر امڑے چلے آتے تھے۔ دریا سے ہزاروں گھڑے پانی لایا جاتا تھا۔ بہشتی اور مزدور آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ مگر ہوا اس تیزی پر تھی کہ پانی تیل کا کام دیتا تھا شہزادے اس ناامیدی کی حالت میں سوچ رہے تھے کہ جن لوگوں کے دیدار کے لیے میں نے اپنی جان گنوائی، انھیں معلوم ہو جائے، تو میں سمجھوں کہ جی اٹھا۔ اتنے میں ادھر نظر پڑی، تو دیکھا کہ سب کی سب عورتیں کوٹھے پر کھڑی ہائے ہائے کر رہی ہیں۔ سوچے، خیر شکر ہے! جس کے لیے جان دی، اس کو اپنا ماتم کرتے تو دیکھ لیا۔ ایک ایک انھیں اپنا جھوٹا بھائی یاد آیا۔ اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ بھئی، گھر بار تمہارے سپرد ہے۔ ماں کو تسلی دینا کہ ہمایو فر نہ رہا، تو میں تو ہوں۔ یہ فقرہ سن کر سب لوگ رونے لگے۔ اتنے میں آگ کے شعلے اور قریب آئے اور ہوا نے اور زور باندھا، تو شہزادہ نے سپہر آرا کی طرف نظر کر کے تین بار سلام کیا۔ چاروں بہنیں دیواروں سے سر ٹکرانے لگیں کہ ہائے، یہ کیا ستم ہوا! شہزادے نے یہ کیفیت دیکھی، تو اشارے سے منع کیا۔ لیکن دونوں بہنوں کی آنکھوں میں اتنے آنسو بھرے ہوئے تھے کہ انھیں کچھ دکھائی نہ دیا۔

سپہر آرا کھڑکی کے پاس جا کر پھر بر پینے لگی۔ ہمایوں فر اسے دیکھ کر اپنا صدمہ بھول گئے اور ہاتھ باندھ کر دور ہی سے کہا۔ اگر یہ کروگی، تو ہم اپنی جان دے دیں گے! گویا جان بچنے کی امید ہی تو تھی! چاروں طرف آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے، دھواں بادل کی طرف چھایا ہوا تھا۔ بھاگنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ ہوا کہتی ہے کہ میں آج ہی تیزی دکھلاؤں گی، اور آپ کہتے ہیں کہ میں اپنی جان دے دوں گا۔

اتنے میں جب آگ بہت ہی قریب آگئی، تو ہمایوں فر کی ہمت جھوٹ گئی۔ بے چینی کی حالت میں ساری جھٹ پر گھومنے لگے۔ آخر یہاں تک نوبت آئی کہ جو لوگ قریب کھڑے تھے، وہ لپٹوں کے مارے اور دور بھاگنے لگے۔ آگ ہمایوں فر سے صرف ایک گز

کے فاصلے پر تھی۔ آج سے پھونکے جاتے تھے۔ جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی، تو آخری بار سپہرآرا کی طرف ٹوپی اتار کر سلام کیا اور بدن کو تول کر دم سے کود پڑے۔

اُدھر سپہرآرا نے بھی ایک چیخ ماری اور کھڑکی سے نیچے کودی۔

شہزادہ صاحب نیچے گھاس پر گرے۔ یہاں زمین بالکل نرم اور گیلی تھی۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور ہاتھوں ہاتھ زمین سے اٹھالیا۔ لطف کی بات یہ کہ سپہرآرا کو بھی ذرا چوٹ نہیں لگی تھی۔ اس نے اٹھتے ہی کہا کہ لوگو، ہمایوں شہزادہ بچا ہو، تو ہمیں دکھا دو۔ نہیں تو اسی کی قبر میں ہم کو بھی زندہ دفن کر دیتا۔

اٹنے میں نواب صاحب نے سپہرآرا کو الگ لے جا کر کہا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ شہزادہ

صاحب خیریت سے ہیں۔

سپہرآرا: ہائے! دولہا بھائی، میں کیونکر مانوں۔

نواب صاحب: نہیں بہن، آؤ، ہم انھیں ابھی دکھائے دیتے ہیں۔

سپہرآرا: پھر دکھاؤ میرے دولہا بھائی!

نواب صاحب: ذرا بھیڑ چھٹ جائے، تو دکھاؤں۔ تب تک گھر چلی چلو۔

سپہرآرا: پھر دکھاؤ گے؟ ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو۔

نواب صاحب: اس سر کی قسم، ضرور دکھائیں گے۔

سپہرآرا کو اندر پہنچا کر نواب صاحب ہمایوں فر کے یہاں پہنچے، تو دیکھا کہ ٹانگ میں

کچھ چوٹ آئی ہے۔ ڈاکٹر جیٹی باندھ رہا ہے اور بہت سے آدمی انھیں گھیرے کھڑے ہیں۔

لوگ اس بات پر بحث کر رہے ہیں کہ آگ لگی کیونکر؟ رات بھر شہزادے کی حالت بہت خراب

رہی۔ درد کے مارے تڑپ تڑپ اٹھتے۔ صبح کو چار پائی سے اٹھ کر بیٹھے ہی تھے کہ چٹھی رساں

نے آکر ایک خط دیا۔ شہزادے صاحب نے اس خط کو نواب صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

انھوں نے یہ مضمون پڑھ سنایا۔

اجی حضرت، تسلیم،

جج کہنا، کیسا بدلہ لیا! لاکھ لاکھ سمجھایا، مگر تم نے نہ مانا۔ آخر، تم خود ہی مصیبت میں

پرے۔ تم نے ہمارا دل جلایا ہے، تو ہم تمہارا گھر بھی نہ جلائیں؟ جس وقت یہ خط تمہارے

پاس پہنچے گا، مکان جل نہیں کے خاک ہو گیا ہوگا۔

شہزادے صاحب نے یہ مضمون سنا، تو تیوریوں پر بل پڑ گئے اور چہرہ مارے غصے کے سرخ پڑ گیا۔

(54)

رات کا وقت تھا، ایک سوار ہتھیار سجاتے، راتوں رات گھوڑے کو کڑکڑاتا ہوا، بگشت بھاگا جاتا تھا۔ دل میں چور تھا کہ کہیں پکڑ نہ جاؤں! جیل خانہ جیلوں۔ سوچ رہا تھا، شہزادے کے گھر میں آگ لگائی ہے، خیرت نہیں۔ پولس کی دوڑ آتی ہی ہوگی۔ رات بھر بھاگتا ہی گیا۔ آخر صبح کو ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ بدن تھک کر چور ہو گیا تھا۔ ابھی گھوڑے سے اترا ہی تھا کہ بستی کی طرف سے غل کی آواز آئی۔ وہاں پہنچا، تو کیا دیکھتا ہے کہ گاؤں بھر کے باشندے جمع ہیں، اور دو گنوار آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ابھی یہ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک نے دوسرے کے سر پر ایسا لٹھ مارا کہ وہ زمین پر آ رہا۔ لوگوں نے لٹھ مارنے والے کو گرفتار کر لیا اور تھانے پر لائے۔ شہسوار نے دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ دونوں کی ایک جوگن سے آشنائی تھی۔

سوار: یہ جوگن کون ہے بھی؟

ایک گنوار: اتنی عمر آئی، اُس جوگن کہوں نہ دیکھ۔

اتنے میں تھانے دار آگئے۔ زخمی کو چارپائی پر ڈال کر اسپتال بھجوا دیا اور خونی کو گواہوں کے ساتھ تھانے لے گئے۔ میاں سوار بھی ان کے ساتھ ہو لیے، تھانے میں تحقیقات ہونے لگی۔

تھانے دار: یہ کس بات پر جھگڑا ہوا جی؟

چوکیدار: حضور، وہ ساس جون جوگن بنی ہے۔

تھانے دار: تم تم سے اتنا پوچھتا ہے کس بات پر لڑائی ہوا؟

چوکیدار: جیسے ابو وہاں جات رہے اور وہو وہاں جات رہے۔ تون آپس میں لگا ڈانٹ ہو گئی۔ اے بس، ایک دن مار دھار ہو گئی۔ بس، لاشی چلے لاگ۔ مور سے رکت بہت بہا۔

مولوی: صوبے دار صاحب، آج دونوں نے خوب کجیاں چڑھائی تھیں۔

تھانے دار: آپ کون ہیں؟

مولوی: حضور، گاؤں کا قاضی ہوں۔

تھانے دار: یہیں مکان ہے آپ کا؟

مولوی: جی ہاں، پرانہ رئیس ہوں۔

شہسوار: بے شک!

تھانے دار: دیہات والے بھی عجیب جانگلو ہوتے ہیں۔ ایک بار ایک دیہاتی مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے گنوار کے لٹھ جمع تھے۔ ایک صاحب نے شعر پڑھا، تو آخر میں فرماتے ہیں— بیمار ہوں۔ لوگ حیرت میں تھے کہ اس ہوں کے کیا معنی۔ پھر حضرت نے فرمایا— سرشار ہوں۔ مارے ہنسی کے لوٹ گیا، ہاں، مولوی صاحب، پھر کیا ہوا؟

مولوی: بس، جناب، پھر دونوں میں کشتی ہوئی۔ کبھی یہ اوپر، وہ نیچے، کبھی وہ نیچے، یہ اوپر۔ تب تو میں بھاگا کہ چوکیدار سے کہوں۔ دھوڑتا گیا۔

تھانے دار: جناب، اس مہارے کو یاد رکھیے گا۔

مولوی: بس، میں دھوڑ کے پورن چوکیدار کے مکان پر گیا۔ اس کی جوڑو بولی۔

سوار: کون بولی؟

تھانے دار: (ہنس کر) سنا نہیں آپ نے؟ جوڑو!

مولوی: حضور، حکام ہیں، آپ کو ہنسانہ چاہیے۔

تھانے دار: جی ہاں، میں حکام ہوں، مگر آپ بھی تو امراء ہیں! ہاں، فرماؤ جی!

مولوی: دیکھیے، فرماتا ہوں۔

سوار: اب ہنسی ضبط نہیں ہو سکتی۔

مولوی: بس جناب وہاں سے میں اس چوکیدار کو لایا۔ وہاں آکر دیکھا، تو خون کے دریا

بہہ رہے تھے۔

اتنے میں خبر آئی کہ زخمی دنیا سے روانہ ہو گیا۔ تھانے دار صاحب مارے خوشی کے پھول

گئے۔ معمولی مار پیٹ 'خون' ہو گئی۔ خونی کا چالان کیا اور جج نے اسے پھانسی کی سزا دے

دی۔

جس وقت خونی کو پھانسی ہو رہی تھی، میاں سوار بھی تماشہ دیکھنے آ پہنچے۔ مگر اس وقت کی حالت دیکھ کر ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ آنکھیں کھل گئیں۔ سوچنے لگے۔ دنیا سے ناطہ توڑ لیں۔ کسی سے حسد اور کینہ نہ رکھیں۔ اگر کہیں پکڑ گیا ہوتا، تو مجھے بھی یوں ہی پھانسی ملتی۔ خدا نے بہت بچایا۔ مگر ذرا اس جوگن کو دیکھنا چاہیے۔ یہ دل میں ٹھان کر جوگن کے مکان کی طرف چلے۔

جب لوگوں سے پوچھتے ہوئے اس کے مکان پر پہنچے، تو دیکھا کہ ایک خوبصورت باغ ہے اور ایک چھوٹا سا خوشنما بنگلہ، بہت صاف ستھرا۔ مکان کیا، پری خانہ تھا۔ جوگن کے قریب جا کر اس کو سلام کیا۔ جوگن کے پور پور پر جو بن تھا۔ جوانی بھٹی پڑتی تھی۔ سر سے پیر تک سندلی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ شہسوار ہزار جان سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جوگن ان کے چہونوں سے تازگئی کہ حضرت کا دل آیا ہے۔

سوار: بڑی دور سے آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔

جوگن: اکثر لوگ آیا کرتے ہیں۔ کوئی آئے، تو خوشی نہیں، نہ آئے، تو رنج نہیں۔

سوار: میں چاہتا ہوں کہ عمر بھر آپ کے قدموں کے تلے پڑا رہوں۔

جوگن: آپ کا مکان کہاں ہے؟

سوار:

گھر بار سے کیا فقیر کو کام؟

کیا لیجے چھوڑے گاؤں کا نام

جوگن: یہاں کیسے آئے؟

سوار: رمتے جوگی تو ہیں ہی، ادھر بھی آنکے۔

جوگن: آخر اتنا تو بتلاؤ کہ ہو کون؟

سوار: ایک بدنصیب آدمی۔

جوگن: کیوں؟

سوار: اپنے کاموں کا بھل۔

جوگن: کج ہے۔

سوار: مجھے عشق ہی نے تو غادر کر دیا۔ ایک بیگم کی دو لڑکیاں ہیں۔ ان سے آنکھیں لڑ

نگیں۔ جیتے جی مرنا۔

جوگن : شادی نہیں ہوئی۔

سوار : ایک دشمن پیدا ہو گیا۔ آزاد نام تھا۔ بہت ہی خوبصورت جیلا جوان۔

میاں آزاد کا نام سنتے ہی جوگن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ شہسوار دنگ تھے کہ بیٹھے بٹھائے اسے کیا ہو گیا۔

سوار : ذرا دل کو ڈھارس دو، آخر تمہیں کس بات کا رنج ہے؟

جوگن :

خوف سے لیتے نہیں نام کہ سن لے نہ کوئی،

دل ہی دل میں تمہیں ہم یاد کیا کرتے ہیں۔

ہماری داستان غم سے بھری ہوئی ہے۔ سن کر کیا کرو گے۔ ہاں، تمہیں ایک صلاح دیتی

ہوں۔ اگر چاہتے ہو کہ دل کی مراد پوری ہو، تو دل صاف رکھو۔

سوار : تمہارے سوا اگر کسی اور پر نظر پڑے، تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔

جوگن : یہی دل کی صفائی ہے؟

سوار : شیشی سے گلاب نکال لو۔ مگر گلاب کی بو باقی رہے گی۔ دنیا کو چھوڑ تو بیٹھیں، پر

عشق دل سے نہ جائے گا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے ہی ساتھ زندگی بسر کریں۔ آزاد

اس کے ساتھ رہیں، ہم تمہارے ساتھ۔

جوگن : بھلا تم آزاد کو پاؤ، تو کیا کرو؟

سوار : کچا ہی چبا جاؤں؟

جوگن : تو پھر ہم سے نہ بنے گی؟ اگر تمہارا دل صاف نہیں، تو اپنی راہ لو۔

سوار : اچھا، اب آج سے آزاد کا نام ہی نہ لیں گے۔

(55)

آزاد کا جہاز جب اسکندریہ پہنچا، تو وہ خوبی کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ جب

کھانا کھانے کا وقت آیا، تو خوبی بولے۔ لاجول، یہاں کھانے والے کی ایسی تمیمی! چاہے

ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، مگر ہم ذرا سی تکلیفوں کے لیے اپنا مذہب نہ چھوڑیں گے۔ آپ

شوق سے جائیں اور مزے سے کھائیں، ہمیں معاف ہی رکھیے۔

آزاد: اور انیم کھانا مذہب کے خلاف نہیں ہے؟

خوجی: کبھی نہیں! اور، اگر ہو بھی، تو کیا یہ ضروری ہے کہ ایک کام مذہب کے خلاف

کیا، تو اور بھی سب کام مذہب کے خلاف ہی کریں؟

آزاد: اچی، تو کس گدھے نے تم سے کہا کہ یہاں کھانا مذہب کے خلاف ہے؟ میز

کرسی دیکھی اور چیخ اٹھے کہ مذہب کے خلاف ہے؟ اس خط کی بھی کوئی دوا ہے!

خوجی: اچی، وہ خط ہی سہی۔ آپ رہنے دیجیے۔

آزاد: کھاؤ، یا جہنم میں جاؤ۔

خوجی: جہنم میں دے جائیں گے، جو یہاں کھائیں گے۔ یہاں تو سیدھے جنت میں

پہنچے گے۔

آزاد: وہاں انیم کہاں سے آئے گی؟

اتنے میں دو ترکی آئے اور اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگے۔ آزاد کی چڑھ

بنی، پوچھا، خواجہ صاحب، بول میدی، اب شرمایا یا نہیں؟ خوجی نے پہلے تو کہا، یہ مسلمان نہیں

ہیں۔ پھر کہا، شاید ہوں ایسے دیسے! مگر جب معلوم ہوا کہ دونوں خاص ترکی کے رہنے والے

ہیں، تو بولے۔ آپ لوگ یہاں ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں؟ کیا یہ مذہب کے خلاف نہیں؟

ترکی: مذہب کے خلاف کیوں ہونے لگا؟

آخر خوجی جھینپے؟ پھر ہوٹل میں کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد آزاد تو ایک صاحب سے

ملنے چلے اور خوجی نے پینک لینا شروع کیا۔ جب نیند کھلی، تو سوچے کہ ہم بیٹھے بیٹھے کب تک

یہیں مکھیاں ماریں گے۔ آؤ دیکھیں، اگر کوئی ہندوستانی بھائی مل جائے، تو گتیں اڑائیں۔ ادھر

ادھر ٹہلنے لگے۔ آخر کار ایک ہندوستانی سے ملاقات ہوئی۔ سلام بندگی کے بعد باتیں ہونے

لگیں۔ خواجہ صاحب نے پوچھا۔ کیوں صاحب، یہاں کوئی انیم کی دکان ہے؟ اس آدمی نے

اس کا کچھ جواب ہی نہ دیا۔ خوجی جیسے آدمی۔ ان کا بھلا یہ تاب کہاں کہ کسی سے سوال

کریں اور وہ جواب نہ دے؟ بگڑ کھڑے ہوئے۔ نہ ہوئی کرولی، خدا کی قسم! ورنہ تماشہ دکھا

دیتا۔

ہندوستانی نے سمجھا، یہ پاگل ہے۔ اگر بولوں گا، تو خدا جانے، کاٹ کھائے، یا چوٹ

کرے۔ اس سے یہی اچھا کہ چپ ہو رہو۔ میاں خوبی کبھی کہ دب گیا اور بھی اکڑ گئے۔ اس نے سمجھا، اب چوٹ کیا ہی چاہتا ہے۔ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا پیچھے ہٹنا تھا کہ میاں خوبی اور بھی شیر ہوئے۔ مگر کندے تول تول کر رہ جاتے تھے۔ بھر رعب سے پوچھا۔ کیوں بے، یہاں ٹھنڈا پانی مل سکتا ہے؟ وہ غریب جھٹ پٹ ٹھنڈا پانی لایا۔ خوبی نے وہ چار گھنٹ پانی پیا اور اکڑ کر بولے۔ مانگ، کیا مانگتا ہے؟ اس آدمی نے سمجھا، یہ ضرور دیوانہ ہے! آپ کی حالت تو اتنی خراب ہے، پلے کا تو ہے نہیں اور کہتے ہیں۔ مانگ، کیا مانگتا ہے؟ خوبی نے بھرتن کر کہا۔ مانگ کچھ۔ اس آدمی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ یہ جو ہاتھ میں ہے، دے دیجیے۔

خوبی کا رنگ اڑ گیا۔ جان تک مانگتا، تو دینے میں دریغ نہ کرتے، مگر چیمبا بیگم تو نہیں دی جاتی۔ اس سے پوچھا۔ تم یہاں کب سے ہو، کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا۔ مجھے طہور خان کہتے ہیں۔

خوبی: بھلا، اس ہوٹل میں مسلمان لوگ کھاتے ہیں؟

طہور خان: برابر! کیوں نہ کھائیں؟

ہوٹل والوں نے مسکوٹ کی کہ خوبی کو چھڑنا چاہیے۔ اس ہوٹل میں قاہرہ کا رہنے والا ہوتا تھا۔ لوگ سوچے، بس بونے اور خوبی بے پکڑ ہو، تو اچھا۔ ہونا بڑا شریر تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا۔ چلو، تمہاری کشتی بدی گئی ہے۔ وہ دیکھو، ایک آدمی ہندستان سے آیا ہے۔ کتنا اچھا جوڑ ہے۔ یہ سن کر ہونا میاں خوبی کے قریب گیا اور جھک کر سلام کیا۔ خوبی نے جو دیکھا کہ ایک آدمی ہم سے بھی اونچا ملا، تو اکڑ کر آنکھوں سے سلام کا جواب دیا۔ بونے نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک دفعہ موقع جو پایا، تو میاں خوبی کی ٹوپی اتار کر پڑاک سے ایک دھول جمائی اور ٹوپی پھینک کر بھاگا۔ مگر ذرا ذرا سے پاؤں، بھاگ کر جاتا کہاں؟ خوبی بھی جھپٹے۔ آگے آگے ہونا اور پیچھے پیچھے میاں خوبی۔ کہتے جاتے تھے۔ او گیدی، نہ ہوئی کرولی، نہیں تو اسی دم بھونک دیتا۔ آخر ہونا ہانپ کر کھڑا ہو گیا۔ تب تو خوبی نے لپک کر ہاتھ پکڑا اور پوچھا۔ کیوں بے! اس پر بونے نے منہ چوہایا۔ خوبی غصے میں بھرے تو تھے ہی، آپ نے بھی ایک دھپ جڑی۔

خوبی: اور لے گا؟

یونا : (اپنی زبان میں) چھوڑ، نہیں ماری ڈالوں گا۔

خوجی : دے ماروں اٹھا کر؟

یونا : رات آنے دو۔

خوجی نے جھلا کر یونے کو اٹھا کر دے مارا، چاروں شانے چٹ، اور اکڑ کر بولے۔

وہ مارا! اور لے گا! خوجی سے یہ باتیں؟

اتنے میں آزاد آگئے۔ خوجی تنے بیٹھے تھے، عمر بھر میں انہوں نے آج پہلی ہی مرتبہ

ایک آدمی کو نیچا دکھایا تھا۔ آزاد کو دیکھتے ہی بولے۔ اس وقت ایک کشتی اور نکلی!

آزاد : کشتی کیسی؟

خوجی : کیسی ہوتی ہے کشتی؟ کشتی اور کیا؟

آزاد : معلوم ہوتا ہے، پنے ہو۔

خوجی : پننے والے کی ایسی تہی! اور کہنے والے کو کیا کہوں؟

آزاد : کشتی نکالی!

لمہور خان : ہاں حضور، یہ سچ کہتے ہیں۔

خوجی : لیجیے، اب تو آیا یقین۔

آزاد : کیا ہوا، کیا؟

لمہور خان : جی، یہاں ایک یونا ہے۔ اس نے ان کے دھول لگائی۔

آزاد : دیکھنا! میں تو سمجھا ہی تھا کہ پنے ہو گئے۔

خوجی : پوری بات تو سن لو۔

لمہور خان : بس، دھول کھا کر لپکے، اس کے کئی چپتے لگائیں، اور اٹھا کر دے پنکا۔

خوجی : وہ بخٹی بتائی کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا۔ دو مہینے تک کھنیا سے نہ اٹھ سکے گا۔

لمہور خان : وہ دیکھیے، سامنے کھڑا کون اکڑ رہا ہے؟ تم تو کہتے تھے کہ دو مہینے تک اٹھ

ہی نہ سکے گا۔

رات کو کوئی نو بجے آزاد نے پانی مانگا۔ ابھی پانی پی ہی رہے تھے کہ کمرے کا لپ غل

ہو گیا اور کمرے میں چٹاخ چٹاخ کی آوازیں گونجنے لگی۔

خوجی : ارے، یہ تو وہی یونا معلوم ہوتا ہے۔ پانی اسی نے پلایا تھا اور چپت بھی اسی

نے جڑی۔ دل میں کہا۔ کیا ترکانہ ہوگا؟ زندہ کھود کر گاڑ دوں، تو سہی۔

خوبی پانی پی کر لیٹے کہ دست کی حاجت ہوئی۔ بونے نے پانی میں جمال گونا ملا دیا تھا۔ گل جل پر دست آنے لگے۔ مشہور ہو گیا کہ خوبی کو ہیضہ ہوا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے دوا دی اور خوبی دستوں کے مارے طحال ہو کر چار پائی پر گر پڑے۔ آزاد ایک رئیس سے ملنے گئے تھے۔ ہوٹل کے ایک آدمی نے ان کو جا کر اطلاع دی۔ گھبرائے ہوئے آئے۔ خوبی نے آزاد کو دیکھ کر سلام کیا، اور آہستہ سے بولے۔ رخصت! خدا کرے، تم جلد یہاں سے لوٹو۔ یہ کہہ کر تین بار کلہ پڑھا۔

آزاد: کیسی طبیعت ہے؟

خوبی: مر رہا ہوں، ایک حافظ بلواؤ اور اس سے کہو، قرآن شریف پڑھے۔

آزاد: اجی، تم دو دن میں اچھے ہو جاؤ گے۔

خوبی: زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مگر بھی، خدا کے واسطے ذرا اپنی جان کا خیال رکھنا۔ ہم تو اب چلتے ہیں۔ اب تک ہلکی خوشی تمہارا ساتھ دیا، مگر اب مجبوری ہے۔ اب ودانے کی بات ہے، ہم کو یہاں کی مٹی تھپٹ لائی۔

آزاد: اجی نہیں، آج کے چوتھے روز دنناؤ گے۔ دیکھ لینا ڈنڈ پلٹے ہو گے۔

خوبی: خدا کے ہاتھ ہے۔

آزاد: دیکھیے، کب ملاقات ہوتی ہے۔

خوبی: اس بوڑھے کو کبھی کبھی یاد کرتے رہنا۔ ایک بات یاد رکھنا، پردیس کا واسطہ ہے، سب سے بل جمل کر رہنا۔ جوتی پیزار، لڑائی جھگڑا کسی سے نہ کرنا۔ سمجھدار ہو تو کیا، آخر بچے ہی ہو۔ یار، جدائی ایسی اکھر رہی ہے کہ بس، کیا بیان کروں۔

آزاد: اچھے ہو جاؤ، تو ہندستان چلے جانا۔

خوبی: ارے میاں، یہاں دم بھر کا بھروسہ نہیں ہے۔

دوسرے دن آزاد خوبی سے رخصت ہو کر جہاز پر سوار ہوئے۔ اتنے دنوں کے بعد خوبی کی جدائی سے انھیں بہت رنج ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند آگئی، تو خواب دیکھا کہ وہ حسن آرا بیگم کے دروازے پر پہنچے ہیں اور وہ انھیں پھولوں کا ایک گلدستہ دے رہی ہیں۔ ایک ایک توپ دفی اور آزاد کی آنکھ کھل گئی۔ جہاز قسطنطنیہ پہنچ گیا تھا۔

(56)

آزاد تو ادھر قاہرے کی ہوا کھا رہے تھے، ادھر حسن آرا بیمار پڑیں۔ کچھ دن تک تو حکیموں اور ڈاکٹروں کی دوا ہوئی، پھر گڈے تنوید کی باری آئی۔ آخر آب و ہوا تبدیل کرنے کی ٹھہری۔ بہار بیگم کے پاس گومتی کے کنارے ایک بہت اچھی کوٹھی تھی۔ چاروں بہنیں، بڑی بہن اور گھر کے نوکر چاکر سب اس نئی کوٹھی میں آ پہنچے۔

بیگم: مکان تو بڑا کشادہ ہے! دیکھوں چند رسید می ہے یا سوریہ بیدی۔
حسن آرا: ہاں لتاں جان، یہ ضرور دیکھنا چاہیے۔
روح افزا: اے لو، ضرور۔ ہزار کام چھوڑ کر۔

دونوں بہنیں ہنستی بولتی مکان کے دالان اور کمرے دیکھنے لگیں۔ چھت پر ایک کمرے کے دروازے جو کھولے، تو دیکھا، دریا لہریں مار رہا ہے۔ حسن آرا نے کہا۔ باجی، اس وقت جی خوش ہو گیا۔ ہماری پانگڑی یہیں بیچے۔ برسوں کا بیمار یہاں رہے، تو دو دن میں اچھا بھلا چنگا ہو جائے۔

سہمہ آرا: بہار بہن، بھلا کبھی اندھیرے اجالے دولہا بھائی نہانے دیتے ہیں دریا میں؟
بہار بیگم: اے ہے، اس کا نام بھی نہ لینا۔ ان کو بہت چوہ ہے اس بات کی۔
صبح کا وقت تھا، چاروں بہنیں اونچی چھت پر ہوا کھانے لگیں کہ اتنے میں ایک طرف سے دھواں اٹھا۔ حسن آرا نے پوچھا۔ یہ دھواں کیسا ہے؟

روح افزا: اس گھاٹ پر مُردے جلائے جاتے ہیں۔

حسن آرا: مردے یہیں جلتے ہیں؟

بہار بیگم: ہاں، مگر یہاں سے دور ہے۔

سہمہ آرا: ہائے، کیا جانے کون بے چارہ جل رہا ہوگا؟

روح افزا: زندگی کا بھروسہ نہیں۔

بڑی بیگم نے بنا کہ یہاں مُردے جلائے جاتے ہیں، تو ہوش اڑ گئے۔ بولیں۔ اے بہار، تم یہاں کیسے رہتی ہو؟ خورشید دولہا آئیں تو ان سے کہوں۔

حسن آرا: فائدہ؟ برسوں سے تو وہ یہاں رہتے ہیں، بھلا تمہارے کہنے سے مکان چھوڑ

دیں گے!

سہرآرا: یہ ہمیشہ یہاں رہتے ہیں، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہم جو دو دن رہیں گے، تو مردے آکر چٹ جائیں گے بھلا؟

بڑی بیگم کا بس چلا، تو کھڑے کھڑے چلی جاتیں، مگر اب مجبور تھیں۔ یہاں سے چاروں بہنیں دوسری چھت پر گئیں، تو بہار بیگم نے کہا۔ یہ جو اس طرف دور تک اونچے اونچے ٹیلے نظر آتے ہیں، یہاں آبادی تھی۔ جہاں تم بیٹھی ہو، یہاں وزیر کا مکان تھا۔ مجال کیا تھا کہ کوئی اس طرف آ جاتا! مگر اب وہاں خاک اڑتی ہے، کتے لوٹ رہے ہیں۔

اتنے میں ایک کشتی اسی گھاٹ پر آ کر رکی۔ اس پر سے دو آدمی اترے، ایک بوڑھے تھے دوسرا نوجوان۔ دونوں ایک قالین پر بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ بوڑھے میاں نے کہا۔ میاں آزاد سا دلیر جوان بھی کم دیکھنے میں آئے گا۔ یہ انھیں کا شعر ہے۔

سینے کا چمن بنائیں گے ہم،

گل کھائیں گے گل کھلائیں گے ہم۔

جوان (گل باز): میاں آزاد کون تھے جناب؟

اس پر بوڑھے میاں نے آزاد کی ساری داستان بیان کر دی۔ دونوں بہنیں کان لگا کر دونوں آدمیوں کی باتیں سنتی تھیں اور روتی تھیں۔ حیرت ہو رہی تھی کہ یہ دونوں کون ہیں اور آزاد کو کیسے جانتے ہیں؟ مہری سے کہا۔ جا کے پتہ لگا کہ وہ دونوں آدمی، جو درخت کے سائے میں بیٹھے تھے پی رہے ہیں، کون ہیں؟ مہری نے ایک بہشتی کے لڑکے کو اس کام پر تعینات کیا۔ لڑکے نے ذرا دیر میں آ کر کہا۔ دونوں آدمی سرائے میں ٹھہریں گے اور دو دن یہاں رہیں گے۔ مگر ہیں کون، یہ پتہ نہ چلا۔ مہری نے جا کر یہی بات حسن آرا سے کہہ دی۔ حسن آرا نے کہا۔ اس لڑکے کو یہ چوٹی دو اور کہو، جہاں یہ نکلیں، ان کے ساتھ جائے اور دیکھ آئے۔ مہری نے زور سے پکارا۔ ابے او خمراتی! سن، ان دونوں آدمیوں کے ساتھ جا۔ دیکھ، کہاں نکلتے ہیں۔

خمراتی: اجی، ابھی پہنچا۔

خمراتی چلے۔ راستے میں آپ کو شوق چڑایا کہ چھلا میری کھیلیں۔ ایک گھنٹے میں خمراتی نے کوئی ڈھیر پیسے کی کوڑیاں جیتیں۔ مگر لالچ کا برا ہو، جیسے تو دم کے دم میں ڈیڑھ

پیسہ وہ ہارے، اور بارہ کوڑیاں گرہ سے گئیں، وہاں سے اداس ہو کر چلے۔ راہ میں بندر کا تماشہ ہو رہا تھا۔ اب میاں خُمراتی جا چکے۔ کبھی بندریا کو پھینکا، کبھی بکرے پر ڈھیلا پھینکا۔ مداری نے دیکھا کہ لوٹا اتیز ہے، تو یولا۔ ادھر آؤ جوان، آدی ہو کہ جانور؟

خُمراتی : آدی۔

مداری : سور کہ شیر؟

خُمراتی : ہم شیر، تم سور۔

مداری : گدھا کہ گدھی؟

خُمراتی : گدھا۔

مداری : الو کہ تیل؟

خُمراتی : تم الو، تمہارے باپ تیل، اور تمہارے دادا بچھیا کے تاؤ۔

تھوڑی دیر کے بعد میاں خُمراتی یہاں سے روانہ ہوئے، تو ایک رئیس کے یہاں ایک سپیرا سانپ کا تماشہ دکھا رہا تھا۔ میاں خُمراتی بھی ڈٹ گئے۔ سپیرا تو نبی میں بھیروی کا رنگ دکھاتا تھا۔

رئیس نے کہا: تب جانیں، جب کسی کے سر سے سانپ نکالو۔

سپیرے نے کہا: حضور، منتر میں سب قدرت ہے۔ مل کوئی آدھ سیر آتا تو پیٹ بھر کھانے کو دو۔ جس کے بدن سے کہیے، سانپ نکالوں۔

لوٹے یہ سن کر ہڑ ہو گئے کہ دھرے نہ جائیں۔ میاں خُمراتی ڈٹے رہے۔

سپیرا: واہ جوان، تمہیں ایک بہادر ہو۔

خُمراتی: اور ہمارے باپ ہم سے بڑھ کر۔

سپیرا: یہاں بیٹھ تو جاؤ۔

میاں خُمراتی بے دھڑک جا بیٹھے، سپیرے نے جھوٹ موٹ کوئی منتر پڑھا اور زور سے میاں خُمراتی کی کھوپڑی پر دھپ جما کر کہا یہ لیجیے سانپ۔ واہ واہ کا دو گھڑا بج گیا۔ رئیس نے سپیرے کو پانچ روپے انعام دیے اور کہا۔ اس لوٹے کو چار آنے پیسے دے دو۔ میاں خُمراتی نے چوٹی پائی، تو پھولے نہ سائے۔ جاتے ہی گول چٹنے والے سے پیسے کے کپالو، دھیلے کے دھن بڑے، دھیلے کی سونٹھ کی نکلیا لی اور جھکتے ہوئے چلے۔ پھر عجیبے پر جا کر کوڑیاں کھیلنے لگے۔

دو پیسے کی کوڑیاں ہارے۔ وہاں سے اٹھے، تو طوائی کی دکان پر ایک آنے کی پوریاں کھائیں اور کنوئیں پر پانی پیا۔ وہاں سے آکر مہری کو پکارا۔

مہری: کہو، وہ ہیں؟

خُمراتی: وہ تو چلے گئے۔

مہری: کچھ معلوم ہے، کہاں گئے؟

خُمراتی: ریل پر سوار ہو کر کہیں چل دیے؟

مہری نے جا کر حسن آرا کو یہ خبر کہی، تو انھوں نے کہا۔ لوٹو سے پوچھو، شہر ہی میں ہیں یا باہر چلے گئے؟ مہری نے جا کر پھر خُمراتی سے پوچھا۔ شہر میں ہیں یا باہر چلے گئے؟ خُمراتی کو اس کی یاد نہ رہی کہ میں نے پہلے کیا کہا تھا، بولا۔ کسی اور سرائے میں اٹھ گئے۔

مہری: کیوں رے جھوٹے، تو تو کہتا تھا، ریل پر چلے گئے؟

خُمراتی: میں نے؟

مہری: چل جھوٹے، تو گیا کہ نہیں؟

خُمراتی: اتنا کی قسم، گیا تھا۔

مہری: چل دور ہو، موا جھوٹا۔

اتنے میں بڑی بیگم کا پرانا نوکر حسین بخش آگیا۔ حسن آرا نے اسے بلا کر کہا۔ بڑے میاں، ایک صاحب آزاد کے جانے والوں میں یہاں آئے ہیں اور کسی سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ تم ذرا اس لوٹوے خُمراتی کے ساتھ اس سرائے تک جاؤ اور پتہ لگاؤ کہ وہ کون صاحب ہیں۔ اب میاں خُمراتی چکرائے کہ خدا ہی خیر کرے۔ دل میں چور تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ابھی سرائے میں ٹکے ہی ہوں، تو مجھ پر بے بھاد کی پڑنے لگے۔ دبے دانتوں کہا، چلیے؟ آگے آگے حسین بخش اور پیچھے پیچھے میاں خُمراتی چلے۔ راہ میں خُمراتی نے ایک لوٹوے کی کھوپڑی پر دھپ جھائی، اور آگے بڑھے، تو ایک دیوانے پر کئی ڈھیلے چسکے۔ اور دُکھ قدم گئے، تو ایک بوڑھی ماما سے کہا۔ نانی، سلام۔ وہ گالیاں دینے لگی، مگر آپ بہت کھلکھلائے۔ اور آگے چلے، تو ایک اندھا ملا۔ آپ نے اس سے کہا۔ آگے گنڈھا ہے، اور اس کی لالچی جھین لی۔ حسین بخش کبھی مسکراتے تھے، کبھی سمجھاتے۔ چلتے چلتے ایک تیلی ملا، میاں خُمراتی نے پوچھا۔ کیوں بھئی تیلی، مرنا، تو اپنی کھوپڑی مجھے دے دینا۔ متر جگاؤں گا۔ تیلی نے کہا۔

چپ! لوٹا بڑا شر ہے۔ اور آگے بڑھے، تو ایک رگمیز سے پوچھا۔ کیوں بڑے بھائی، اپنی داڑھی نہیں رنگتے؟ اس نے کہا۔ کہو، تمہارے باپ کی داڑھی رنگ دیں نیل سے۔ اب سنیے، دو ہندو بوری کچا سنبھالے کہیں باہر جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ میاں شہزادی ایک آنکھ دبا کر سامنے جا کھڑے ہوئے۔ وہ سمجھے، سچ کچا کانا ہے۔ ایک نے کہا۔ ابے، ہٹ سامنے سے او بے کانے؟ آپ نے وہ آنکھ کھول دی۔ دوسری دہائی۔ دونوں آدمی اسے اسٹپن سمجھ کر اندر چلے گئے۔ اتنے میں ایک کانی عورت سامنے سے آئی۔ میاں شہزادی نے دیکھتے ہی ہانک لگائی۔ ’ایک لکڑیاں بانے کی، کانی آنکھ تماشے کی۔‘

جیوں ہی دونوں سرائے میں پہنچے، حسین بخش نے بڑھ کر بوڑھے میاں کو سلام کیا۔ بڑے میاں بولے۔ جناب، میاں آزاد سے میری پرانی ملاقات ہے۔ میری لڑکیوں کے ساتھ وہ مدت تک کھیلا کیے ہیں۔ میری چھوٹی لڑکی سے ان کے نکاح کی بھی تجویز ہوئی تھی، مگر اب تو وہ ایک بیگم سے قول ہار چکے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں۔ شام کو حسین بخش رخصت ہوئے اور گھر آکر حسن آرا سے کہا۔ وہ تو آزاد کے پرانے ملاقاتی ہیں۔ شاید آزاد نے ان کی ایک لڑکی سے نکاح کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے، یہ سنتے ہی حسن آرا کا رنگ فق ہو گیا۔ رات کو حسن آرا نے سپہر آرا سے کہا۔ کچھ سنا؟ اس بڑھے کی ایک لڑکی کے ساتھ آزاد کا نکاح ہونے والا ہے۔

سپہر آرا: غلط بات ہے۔

حسن آرا: کیوں؟

سپہر آرا: کیوں کیا، آزاد ایسے آدمی ہی نہیں۔

حسن آرا: دل لگی ہو، جو کہیں آزاد اس سے بھی اقرار کر گئے ہوں۔ چلو خیر، چار نکاح تو جائز بھی ہیں۔ لیکن اللہ جانتا ہے، یقین نہیں آتا۔ آزاد اگر ایسے ہرجائی ہوتے، تو جان ہتھیلی پر لے کر روم نہ جاتے۔

حسن آرا نے زبان سے تو یہ اطمینان ظاہر کیا، پر دل سے یہ خیال دور نہ کر سکیں کہ ممکن ہے، آزاد نے وہاں بھی قول ہارا ہو۔ ایک تو ان کی طبیعت پہلے ہی سے خراب تھی، اس پر یہ نئی ٹکر پیدا ہوئی، تو پھر بخدا آنے لگا۔ دل کو لاکھ لاکھ سمجھائیں کہ آزاد بات کے دہی ہیں، لیکن یہ خیال دور نہ ہوتا۔ ابھر ایک نئی مصیبت یہ آئی کہ ان کے ایک عاشق اور پیدا ہو گئے۔ یہ

حضرت بہار بیگم کے رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ نام تھا مرزا عسکری۔ عسکری نے حسن آرا کو لڑکپن میں دیکھا تھا۔ ایک دن بہار بیگم سے ملنے آئے، اور سنا کہ حسن آرا بیگم آج کل یہیں ہیں، تو ان پر ڈورے ڈالنے لگے۔ بہار بیگم سے بولے۔ اب تو حسن آرا سیانی ہوئی ہوں گی؟

بہار بیگم: ہاں، خدا کے فضل سے اب سیانی ہیں۔

عسکری: دونوں بہنوں میں حسن آرا گوری ہیں نا؟

بہار بیگم: اے، دونوں خاصی گوری چٹی ہیں، مگر حسن آرا جیسی حسین ہم نے تو نہیں دیکھی۔ گلاب کے پھول جیسا کھڑا ہے۔

عسکری: تم ہماری بہن کیسی ہو؟

بہار بیگم: اس کے کیا معنی؟

عسکری: اب صاف صاف کیا کہوں، سمجھ جاؤ۔ بہن ہو، بڑی ہو، اتنے ہی کام آؤ۔ پھر اور نہیں تو کیا، عاقبت میں بخشاؤ گی؟

بہار بیگم: عسکری، خدا جانتا ہے، ہمیں دل سے تمہاری محبت ہے۔

عسکری: برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔

بہار بیگم: ارے، یوں کیوں نہیں کہتے کہ میں گودیوں میں کھلایا ہے۔

عسکری: یہ ہم نہ مانیں گے۔ ایسی آپ کتنی بڑی ہیں مجھ سے۔ برس نہیں، حد دو برس۔

بہار بیگم: اے لو، اس جھوٹ کو دیکھو، چھتیں پرانی ہیں۔

عسکری: اچھا، پھر کوئی پندرہ برس کی چھوٹائی بڑائی ہے؟

بہار بیگم: جی ہاں؟

عسکری: اچھا، اب پھر کس دن کام آؤ گی؟

بہار بیگم: بھئی، اگر حسن آرا منظور کر لیں، تو ہے۔ میں آج اتنا جان سے ذکر کروں

گی۔

اتنے میں حسن آرا بیگم نے اوپر سے آواز دی۔ اے باجی ذری ہم کو ہرے ہرے ملائم سنگھاڑے نہیں منگا دیتیں؟ محمد عسکری نے رسوخیت جتانے کے لیے ماما سے کہا۔ میرے آبدی نے جا کر کہو کہ چار سیر تازے سنگھاڑے توڑوا کر لے آئے۔ حسن آرا نے جوان کی آواز سنی،

تو سپہر آرا سے پوچھا۔ یہ کون آیا ہے؟ سپہر آرا نے کہا۔ اے، وہی تو ہیں عسکری! تھوڑی دیر میں مرزا عسکری تو چلے گئے اور چلتے وقت بہار بیگم سے کہہ گئے کہ ہم نے جو کہا ہے، اس کا خیال رہے۔ بہار بیگم نے کہا۔ دیکھو، اللہ چاہے، تو آج کے دوسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم کے ساتھ منگتی ہو۔ حسن آرا اسی وقت نیچے آ رہی تھیں۔ یہ بات ان کے کان میں پڑ گئی۔ پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ اگلے پاؤں لوٹ گئیں اور سپہر آرا سے یہ قصہ کہا۔ اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔ کچھ دیر تک دونوں بہنیں ستائے میں پڑی رہیں۔ پھر سپہر آرا نے دیوان حافظ اٹھالیا اور فال دیکھی، تو سرے پر ہی شعر نکلا۔

بے رو این دام بر مرغ دیگر نے،

کہ عنقا را بلند است آشیانہ۔

(یہ جال دوسری چڑیا پر ڈال۔ عنقا کا گھونسلہ بہت اونچا ہے۔)

سپہر آرا یہ شعر پڑھتے ہی اچھل پڑی۔ بولی۔ لو، فتح ہے۔ بیڑا پار ہو گیا۔

اتنے میں بہار بیگم آپہنچیں اور حسن آرا سے بولیں۔ تم لوگوں نے مرزا عسکری کو تو دیکھا ہوگا؟ کتنا خوبصورت جوان ہے۔

سپہر آرا: دیکھا کیوں نہیں، وہی شوکین سے آدمی ہیں نا؟

بہار بیگم: اب کی آئے گا تو اوٹ میں سے دکھا دوں گی۔ بڑا ہنس مکھ، ملنسار آدمی ہے۔

جس وقت آتا ہے، مکان بھر مہکنے لگتا ہے۔ میری بیماری میں بے چارہ دن بھر میں تین تین پھیرے کرتا تھا۔

حسن آرا یہ باتیں سن کر دل ہی دل میں سوچنے لگیں کہ یہ کہہ کیا رہی ہیں۔ کیسے عسکری؟ یہاں تو آزاد کو دل دے چکے۔ وہ ٹرکی سدھارے، ہم قول ہارے۔ ان کو عسکری کی پڑی ہے۔ بہار بیگم نے بڑی دیر تک عسکری کی تعریف کی، مگر حسن آرا کب پیچھے والی تھیں۔ آخر، بہار بیگم خفا ہو کر چلی گئیں۔

دوسرے دن جب عسکری پھر آئے، تو بہار بیگم نے ان سے کہا۔ میں نے حسن آرا سے تمہارا ذکر تو کیا، مگر وہ بولیں ایک نہیں۔ اس موئے آزاد پر تو ہو رہی ہیں۔

عسکری: میں ایک ترکیب بتاؤں، ایک کام کرو۔ جب حسن آرا بیگم اور تم پاس بیٹھی ہو، تو آزاد کا ذکر ضرور چھیڑو۔ کہنا، عسکری ابھی ابھی اخبار پڑھتا تھا، اس کا ایک دوست ہے

آزاد، وہ نان بائی کا لڑکا ہے۔ اس کی بڑی تعریف چھی ہے۔ کہتا تھا، اس نان بائی کے لوٹے کی خوش قسمتی کو تو دیکھو، کہاں جا کر چٹا لڑایا۔ جب وہ کہیں کہ آزاد شریف آدمی ہیں، تو کہنا، عسکری کے پاس آزاد کے نہ جانے کتنے خط پڑے ہیں۔ وہ قسم کھاتا ہے کہ آزاد نان بائی کا لڑکا ہے، بہت دنوں تک میرے یہاں کچے بھرتا رہا۔

یہ کہہ کر مرزا عسکری تو پیدا ہوئے، اور بہار بیگم حسن آرا کے پاس پہنچیں۔

حسن آرا: کہاں تھیں بہن؟ آؤ، دریا کی سیر کریں۔

بہار بیگم: ذرا عسکری سے باتیں کرنے لگی تھی۔ کسی اخبار میں ان کے ایک دوست کی بڑی تعریف چھی ہے۔ کیا جانے، کیا نام بتایا تھا؟ بھلا ہی سا نام ہے۔ ہاں، خوب یاد آیا، آزاد۔ مگر کہتا تھا کہ نان بائی کا لڑکا ہے۔

حسن آرا: کس کا؟

بہار بیگم: نان بائی کا لڑکا بتاتا تھا۔ تمہارے عاشق صاحب کا بھی تو یہی نام ہے۔ کہیں وہی عسکری کے دوست نہ ہوں۔

سپہر آرا: واہ، اچھے آپ کے عسکری ہیں جو نان بائی کے چھوڑوں سے دوستی کرتے پھرتے ہیں۔

بہار تو یہ آگ لگا کر چلتی ہوئی، ادھر حسن آرا کے دل میں کھلبلی مچی۔ سوچیں، آزاد کے حال سے کسی کو اطلاع تو ہے نہیں، شاید نان بائی ہی ہوں۔ مگر یہ شکل و صورت، یہ علم اور کمال، یہ لیاقت اور ہمت نان بائی میں کیونکر آسکتی ہے؟ نان بائی پھر نان بائی ہے۔ آزاد تو شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔ سپہر آرا نے کہا۔ باجی، بہار بہن ادھاد کھائے بیٹھی ہیں کہ عسکری کے ساتھ تمہارا نکاح ہو۔ ساری کارستانی اسی کی ہے۔ عسکری کے ہتھ کنڈوں سے اب بچے رہتا۔ وہ بڑا نٹ کھٹ معلوم ہوتا ہے۔

شام کو ماما نے ایک خط لا کر حسن آرا کو دیا۔ انھوں نے پوچھا۔ کس کا خط ہے؟

ماما: پڑھ لیجیے۔

سپہر آرا: کیا ڈاک پر آیا ہے؟

ماما: جی نہیں، کوئی باہر سے دے گیا ہے۔

حسن آرا نے خط کھول کر پڑھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

قدم رکھ دیکھ کر الفت کے دریا میں ذرا اے دل،

خطر ہے ڈوب جانے کا بھی دریا کے نہانے میں۔

حسن آرا بیگم کی خدمت میں آداب۔ میں جتائے دیتا ہوں کہ آزاد کے پھیر میں نہ پڑیے۔ وہ بیچ قوم آپ کے قابل نہیں۔ ناہائی کا لڑکا، تندور جلانے میں تاک، آنا گوندھنے میں مہاق۔ وہ اور آپ کے لائق ہو! اول تو پاجی، دوسرے دل کا ہرجائی، اور پھر طرہ یہ کہ انہڑہ! بہار بہن مجھے خوب جانتی ہیں۔ میں لہتا ہوں یا برا، اس کا فیصلہ وہی کر سکتی ہیں۔ آزاد میرے دشمن نہیں، میں انہیں خوب جانتا ہوں۔ اسی سبب سے آپ کو صلاح دیتا ہوں کہ آپ اس کا خیال دل سے دور کر دیں۔ خدا وہ دن نہ دکھائے کہ آزاد سے تمہارا نکاح ہو۔
تمہارا عسکری

حسن آرا نے اس خط کے جواب میں یہ شعر لکھا۔

نہ جھپٹ اے نکبت باد بہاری، راہ لگ اپنی،

تجھے اٹھ کھیلیاں سو جھی ہیں، ہم بے زار بیٹھے ہیں۔

سپہر آرا نے کہا۔ کیوں باجی، ہم کیا کہتے تھے؟ دیکھا، وہی بات ہوئی نا؟ اور جھوٹا تو اسی ہے ثابت ہے کہ میاں آزاد کو انہڑہ بتاتے ہیں۔ خدا کی شان، یہ اور آزاد کو انہڑہ کہیں! ہم تو لکھتے ہی تھے کہ یہ بڑا عکھٹ معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا نے یہ پرزہ مانا کو دیا کہ جا، باہر دے آ۔ عسکری نے یہ خط پایا، تو جل اٹھے۔ دل میں کہا۔ اگر آزاد کو بچا نہ دکھایا، تو کچھ نہ کیا۔ جا کر بڑی بیگم سے ملے اور ان سے خوب ایک مرج ملا کر باتیں کیں۔ بہار بیگم نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور عسکری کی خوب تعریفیں کیں۔ آزاد کو جہاں تک بدنام کرتے بنا، کیا۔ یہاں تک کہ آخر بڑی بیگم بھی عسکری پر لٹو ہو گئیں۔ مگر حسن آرا اور سپہر آرا عسکری کا نام سنتے ہی جل اٹھتے تھیں۔ دونوں آزاد کو یاد کر کر کے رویا کرتیں، اور بہار بیگم بار بار عسکری کا ذکر کر کے انہیں دق کیا کرتیں۔ یہاں تک کہ ایک دن بڑی بیگم کے سامنے سپہر آرا اور بہار بیگم میں ایک جھوڑ ہو گئی۔ بہار کہتی تھیں کہ حسن آرا کی شادی مرزا عسکری سے ہوگی، اور ضرور ہوگی۔ سپہر آرا کہتی تھی۔ یہ ممکن نہیں۔

ایک دن بڑی بیگم نے حسن آرا کو بلا بھیجا، لیکن جب حسن آرا گئیں، تو منہ پھیر لیا۔ بہار بیگم بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ بولیں۔ لقاں جان تم سے بہت ناراض ہیں حسن آرا!

بیگم: میرا نام نہ لو۔

بہار بیگم: جی نہیں، آپ خفا نہ ہوں۔ محال ہے، آپ کا حکم نہ مانیں۔

بیگم: سنا ہوا ہے سب۔

بہار بیگم: حسن آراء، امتاں جان کے پاس آؤ۔

حسن آراء پریشان کہ اب کیا کروں۔ ڈرتے ڈرتے بڑی بیگم کے پاس جا بیٹھیں۔ بڑی

بیگم نے ان کی طرف دیکھا تنگ نہیں۔

بہار بیگم: امتاں جان، یہ آپ کے پاس آئی ہوئی ہیں، ان کا قصور معاف کیجیے۔

بیگم: جب یہ میرے کہنے میں نہیں ہیں، تو مجھ سے کیا واسطہ؟ عسکری ساڑ کا کوئی مشعل

لے کر بھی ڈھونڈھے، تو نہ پائے۔ مگر انھیں اپنی ہی ضد ہے۔

بہار بیگم: حسن آراء، خوب سوچ کر اس کا جواب دو۔

بیگم: میں جواب سواب کچھ نہیں مانگتی۔

بہار بیگم: آپ دیکھ لیجیے گا، حسن آراء آپ کا کہنا مان لیں گی۔

بیگم: بس، دیکھ لیا!

بہار بیگم: امتاں جان، ایسی باتیں نہ کہیے۔

بیگم: دل جلتا ہے بہار، دل جلتا ہے! اپنے دل میں کیا کیا سوچتے تھے، مگر اب اٹھ ہی

جائیں یہاں سے تو اچھا

یہ کہہ کر بڑی بیگم اٹھ کر چلی گئیں۔ حسن آراء بھی اوپر چلی گئیں اور لیٹ کر رونے

لگیں۔ تھوڑی دیر میں بہار نے آکر کہا۔ حسن آراء، ذری پردے ہی میں رہنا، عسکری آتے

ہیں۔ حسن آراء نے عسکری کا نام سنا، تو کانپ اٹھی۔ اتنے میں عسکری آکر، برآمدے میں

کھڑے ہو گئے۔

بہار بیگم: بیٹھو عسکری!

عسکری: جی ہاں، بیٹھا ہوں۔ خوب ہوا دار مکان ہے۔ اس کمرے میں تم رہتی ہونا؟

بہار بیگم: نہیں، اس میں ہماری بہنیں رہتی ہیں۔

عسکری: اب حسن آراء کی طبیعت کیسی ہے؟

بہار بیگم: پوچھ لو، بیٹھی تو ہیں۔

عسکری: نہیں بتاؤ تو آخر؟

بہار بیگم: تم بھی تو حکیم ہو؟ بھلا پردے کے پاس سے نبض تو دیکھو۔

حسن آرا مسکرائیں۔ سپہر آرا نے کہا۔ اے، ہٹو بھی! بڑے آئے وہاں سے حکیم!

بہار بیگم: تم تو ہوا سے لڑتی ہو۔

سپہر آرا: لڑتی ہی ہے۔

عسکری: اس وقت کھانا کھا چکی ہوں گی۔ شام کو نبض دیکھ لوں گا۔

بہار بیگم: اے، ابھی کھانا کہاں کھایا؟

سپہر آرا: ہاں، ہاں، کھا چکی ہیں۔

مرزا عسکری تو رخصت ہوئے، مگر بہار بیگم کو صبر کہاں؟ پوچھا۔ حسن آرا، اب بولو، کیا

کہتی ہو؟ سپہر آرا تنک کر بولی۔ اب کوئی اور بات بھی ہے، یا رات دن یہی ذکر ہے؟ کہہ

دیا ایک دفعہ کہ جس بات سے یہ چومتی ہیں، وہ کیوں کرو۔

بہار بیگم: ہونا وہی ہے، جو ہم چاہتی ہیں۔

حسن آرا: خیر، بہن، جو ہوتا ہے، ہو رہے گا۔ اس کا ذکر ہی کیا؟

سپہر آرا: بہار بہن، ناحق بیٹھے بیٹھائے رنج بڑھاتی ہو۔

بہار بیگم: یاد رکھنا، لہذاں جان ابھی ابھی قسم کھا چکیں ہیں کہ وہ تم دونوں کی صورت نہ

دیکھیں گی۔ بس، تمہیں اب اختیار ہے، چاہے مانو، چاہے نہ مانو۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ حسن آرا جب بڑی بیگم کے سامنے جاتیں، تو ہ منہ پھیر

لیتیں۔ دونوں بہنیں رات دن رویا کرتیں۔ سوچیں کہ یہ تو سب کے سب ہمارے خلاف ہیں،

آؤ، روح افزا کو بلائیں، شاید وہ ہمارا ساتھ دیں۔ ماما نے کہا۔ میں ابھی ابھی جاتی ہوں۔

جہاں تک بن پڑے گا، بہت کہوں گی۔ اور، کہنا کیا ہے، لے ہی آؤں گی۔

اتنے میں بہار بیگم نے آکر کہا۔ اے حسن آرا، ذری پردہ کر کے عسکری کو نبض دکھا

دو۔ زینے پر کھڑے ہیں۔ حسن آرا مجبور ہو گئی۔ سپہر آرا کو اشارے سے بلایا اور کہا۔ بہار

بہن تو باہر ہی بیٹھیں گی۔ میرے بدلے تم نبض دکھا دو۔ سپہر آرا نے مسکرا کر کہا۔ اچھا، اور

پردے کے پاس بیٹھ کر نبض دکھائی۔

عسکری: دوسرا ہاتھ لائیے۔

بہار بیگم: بخار تو نہیں ہے؟
 عسکری: تھوڑا سا بخار تو ضرور ہے۔ کمزوری بہت ہے۔
 جب عسکری چلے گئے، تو حسن آرا نے بہار بیگم سے کہا۔ آپ کے عسکری تو بڑے
 ہوشیار ہیں!

بہار بیگم: کیا شک بھی ہے؟
 حسن آرا: اف، مارے ہنسی کے برا حال ہے۔ واہ رے حکیم!
 سپر آرا: 'نیم حکیم، خطرے جان۔'
 بہار بیگم: یہ کا ہے سے؟
 حسن آرا: نبض کس کی دیکھی تھی؟
 بہار بیگم: تمہاری۔

حسن آرا: ارے واہ، کہیں دیکھی ہو نا؟ بس، دیکھ لی حکمت۔
 بہار بیگم: پھر کس کی نبض دیکھی؟ کیا سپر آرا بیٹھ گئی تھیں؟
 سپر آرا: اور نہیں تو کیا؟ کمزوری بتاتے تھے۔ کمزوری ہمارے دشمنوں کو ہو۔
 بہار بیگم: بھلا علاج میں کیا ہنسی کرنی تھی؟

باہر جا کر بہار نے عسکری کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اے، بس، جاؤ بھی، مفت میں
 ہم کو بد بنایا! حسن آرا نے ہنسی ہنسی میں سپر آرا کو اپنی جگہ بیٹھا دیا، اور تم ذرا نہ پہچان سکے۔
 خدا جانتا ہے، مجھے بہت شرم آئی۔

شام کو روح افزا بیگم آپہنچیں اور بڑی بیگم کے پاس جا کر سلام کیا۔
 بڑی بیگم: تم کب آئیں؟

روح افزا: ابھی ابھی چلی آتی ہوں۔ حسن آرا کہاں ہیں؟
 بہار بیگم: ہمیں ان کا حال معلوم نہیں۔ کوٹھے پر ہیں۔

روح افزا: ذری، بلوایے!

بہار بیگم: دونوں بہنیں، ہم سے خفا ہیں۔
 روح افزا کوٹھے پر گئیں، تو دونوں بہنیں ان سے کھلے مل کر خوب روئیں۔
 روح افزا: یہ تم کو کیا ہو گیا حسن آرا؟ وہ صورت ہی نہیں۔ ماجرا کیا ہے؟

سپر آرا: اب تو آپ آئی ہیں، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ سارا گھر ہم سے فرنٹ ہو رہا ہے۔ ہمیں تو کھانا پینا، المٹنا بیٹھنا سب حرام ہے۔
 بہار بیگم کو یہ مہر کیسے ہوتا کہ روح افزا آئیں اور دونوں بہنیں ان سے اپنا دکھڑا روئیں۔
 آکر دھیرے سے بیٹھ گئیں۔

روح افزا: بہن، یہ کیا بات ہے؟ آخر کس بات پر یہ رنج رنجی ہو رہی ہے؟
 بہار بیگم: میں تم سے پوچھتی ہوں، عسکری میں کیا برائی ہے، شریف نہیں ہے وہ، یا پڑھا لکھا نہیں ہے، یا اچھے خاندان کا نہیں ہے؟ آخر ان کے انکار کا سبب کیا ہے؟
 سپر آرا: ہم نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ ہم عسکری کا نام نہیں سننا چاہتے۔
 روح افزا: تو یہ کہو، بات بہت بڑھ گئی ہے۔ مجھے ذرا بھی کچھ حال معلوم ہوتا، تو فوراً ہی آ جاتی۔

بہار بیگم: اب آئی ہو، تو کیا بنا لوگی؟ یہ ایک نہ مانیں گی۔
 روح افزا: وہ تو شاید مان بھی جائیں، مگر آپ کا مان جانا البتہ مشکل ہے۔
 بہار بیگم: یہ کہیے، آپ ان کی طرف سے لڑنے آئی ہیں؟
 روح افزا: ہاں، ہم سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خواہ مخواہ جھگڑا ہو۔
 یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بڑی بیگم صاحبہ لٹھیا نیچتی ہوئی آئیں۔
 روح افزا: آئیے لتاں جان، بیٹھیے۔

بیگم: میں بیٹھنے نہیں آئی، یہ کہنے آئی ہوں کہ عسکری کے ساتھ حسن آرا کا نکاح ضرور ہوگا۔ اس میں ساری دنیا ایک طرف ہو، میں کسی کی نہ سنوں گی۔ میں جان دے دوں گی۔ یہ نہ مانیں گی تو، زہر کھالوں گی، مگر کروں گی یہی، جو کہہ رہی ہوں۔
 بڑی بیگم یہ کہہ کر چلی گئیں۔ حسن آرا اتنا روئیں کہ آنکھیں لال ہو گئیں۔ روح افزا نے سمجھایا، تو بولیں۔ بہن، اتنا جان مانیں گی نہیں، اور ہم سوا آزاد کے اور کسی کے ساتھ شادی نہ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہی نہ ہوں گے۔

(57)

حسن آرا بیگم کی جان عذاب میں تھی۔ بڑی بیگم سے بول چال بند، بہار بیگم سے ملنا

جلتا ترک۔ عسکری روز ایک نیا فیل کھلاتا۔ وہ ایک ہی کائیاں تھا، روح افزا کو بھی باتوں میں لگا کر اپنا طرف دار بنا لیا۔ ماما کو پانچ روپے دیے۔ وہ اس کا دم بھرنے لگی۔ مہری کو جوڑا بنا دیا، وہ بھی اس کا کلمہ پڑھنے لگی۔ نواب صاحب اس کے دوست تھے ہی۔ حسین بخش کو بھی کٹھ لیا۔ بس، اب سپہر آرا کے سوا حسن آرا کا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ ایک دن روح افزا چپکے چپکے ادھر آئی، تو دیکھا، کمرے کے سب دروازے بند ہیں۔ ششے سے جھانک کر دیکھا، حسن آرا رو رہی ہیں اور سپہر آرا اداس بیٹھی ہیں۔ روح افزا کا دل بھر آیا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور دونوں بہنوں کو گلے لگا کر کہا۔ آؤ، ہوا میں بیٹھیں۔ ذری، منہ دھو ڈالو۔ یہ کیا بات ہے! جب دیکھو، دونوں بہنیں روتی رہتی ہو؟

سپہر آرا: بہن، جان بوجھ کر کیوں انجان بنتی ہو؟ بھلا آپ سے بھی کوئی بات چھپی ہے؟ مگر آپ بھی ہمارے خلاف ہو گئیں! خیر، اللہ مالک ہے۔

روح افزا: تمہاری تو نئی باتیں ہیں؟ جہاں تمہارا پسینہ گرے، وہاں ہم لہو گرائیں، اور تم سمجھتی ہو کہ ہم تمہیں جلاتے ہیں۔ ہم تو محبت سے پوچھتے ہیں، اور تم ہمیں پرہیز کرتی ہو۔

حسن آرا: سنو باجی، تم کون سی باتیں نہیں جانتی ہو، جو پوچھتی ہو۔ ہم صاف صاف کہہ چکے کہ یا تو عمر بھر کنواری ہی رہیں گے یا آزاد کے ساتھ نکاح ہوگا۔

سپہر آرا: ایسے ایسے 360 عسکری ہوں، تو کیا؟ حلوہ کھانے کو منہ چاہیے۔

روح افزا: اب اس وقت بات بڑھ جائے گی۔ اور کوئی بات کرو۔

حسن آرا: ہم اتنا چاہتے ہیں کہ آپ ذرا انصاف کریں۔

روح افزا: مگر یہ گٹھنی کیونکر سلجھے گی؟

اتنے میں ماما نے ایک اخبار لا کر رکھ دیا! حسن آرا نے پڑھنا شروع کیا۔ ایک ایک مضمون دیکھ کر چونک اٹھی۔ مضمون یہ تھا کہ میاں آزاد نے ترکی میں ایک سانس کی بیوی سے شادی کر لی۔ سانس کو زہر دلوا دیا اور اب سانس کے ساتھ بھڑے اڑا رہے ہیں۔ حسن آرا نے اخبار پھینک دیا اور اٹھا کر کمرے میں چلی گئیں۔ سپہر آرا نے بھانپ لیا کہ ضرور آزاد کی کچھ خبر ہے۔ اخبار اٹھ کر دیکھنے لگی، تو یہ مضمون نظر پڑا۔ ستائے میں آگئی۔ جس آزاد کے لیے یہاں ساری دنیا سے لڑائی ہو رہی تھی۔ جس کا دونوں آسرا لگائے بیٹھی تھیں، اس کا یہ حال! حسن آرا کو جا کر تسکین دینے لگی۔ باجی، یہ سب غلط ہے۔

حسن آرا: قسمت کی خوبی ہے۔

سپہر آرا: ہم تو فال دیکھیں گے۔

حسن آرا: ہمارا تو دل ٹوٹ گیا۔ ہائے، ہم کیا جانتے تھے کہ محبت یہ برا دن دکھائے گی۔

حالی اوّل سے یہ نہ تھا ظاہر،

کہ اسی غم میں ہوں گے ہم آخر۔

اپنا کیا اپنے آگے آیا۔ میاں آزاد کے ہتھکنڈے کیا معلوم تھے۔ ان کو ہمارا ذرا خیال نہ آیا۔ ایک بیچ قوم کی عورت کو بیابا۔ حسن آرا کو بھول گئے۔ یہاں مہینوں اسی رنج میں گزر گئے کہ ترکی کیوں بھیجا۔ بیٹھے بیٹھائے ان کی جان کے در پہ کیوں ہوئی۔ رات دن دعا مانگی کہ وہ خیریت سے گھر آئیں۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ ایک ایک یہ غم کی بجلی گر پڑے گی۔ قسمت پھوٹ گئی۔ اب تو یہی آرزو ہے کہ ایک دفعہ چار آنکھیں ہوں، پھر جھک کر سلام کروں۔

سپہر آرا: اگر یہی کرنا تھا تو اتنی دور گئے کیا کرنے تھے؟

روح افزا کمرے میں آئی، تو دیکھا، حسن آرا دلائی اوڑھے پڑی ہیں۔ بند پر ہاتھ رکھا، تو تیز بخار۔ حسن آرا انھیں دیکھ کر رونے لگیں۔ روح افزا بولیں۔ بہن، طبیعت کو قابو میں رکھو۔ ایسی بھی نوج میں کوئی بیماری میں گھبرائے۔ بہار بیگم نے سنا، تو وہ بھی گھبرائی ہوئی آئیں۔ بدن پر ہاتھ رکھا، تو معلوم ہوا، جیسے کسی نے بھلسا دیا۔ حسن آرا نے روک کر کہا۔ باجی، ہر طرح کی بیماری میں نے اٹھائی ہے، مگر دل کبھی اتنا کمزور نہ ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جان نکل رہی ہے۔ بہار بیگم نے بڑی بیگم کو بلوایا۔ وہ بھی بدحواس آئی اور حسن آرا کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ اللہ، یہ ہوا کیا!

بہار بیگم: بخار سا بخار ہے!

نواب صاحب دوڑے ہوئے آئے۔ دیکھا، تو کہرام مچا ہوا ہے۔ اتنے میں عسکری

آئے۔ بہار بیگم نے کہا۔ بھیا، ذری نبض تو دیکھو۔ یہ دم کے دم میں کیا ہو گیا؟

عسکری: (نبض دیکھ کر) بہن، کیا بتاؤں نبض ہی نہیں ملتی!

اس فقرے پر بہار بیگم سر پٹنے لگیں۔ نواب صاحب نے سمجھایا، کہ یہ وقت دوا اور علاج

کا ہے، رونا تو عمر بھر ہے۔ عسکری فوراً بڑے حکیم صاحب کو بلانے گئے۔ شہزادہ ہمایوں فر بھی

آئے تھے۔ بولے۔ میں جا کر سول سرجن کو ساتھ لاتا ہوں۔ سرجن صاحب آئے اور نبض دیکھ کر کہا۔ دل پر کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو، یا ایسی ہی کوئی اور بات ہو۔ نسخہ لکھا اور فیس لے کر چل دیے۔ اتنے میں بڑے حکیم صاحب آئے اور نبض دیکھ کر عسکری کے کان میں کہا۔ کام تمام ہو گیا۔ نسخہ لکھ کر آپ بھی باہر گئے۔ بہار بیگم سب سے زیادہ بے قرار تھیں۔

شام کا وقت تھا، بڑی بیگم نماز پڑھ رہی تھیں، بہار بیگم اداس بیٹھی ہوئی تھیں، نواب صاحب ہمایوں فر کے ساتھ اسی بیماری کا ذکر کر رہے تھے کہ ایک ایک اندر سے رونے کی آواز آئی۔

نواب صاحب : کیا ہوا، کیا ہوا کیا !!

بہار بیگم : جو کچھ ہوتا تھا، وہ ہو گیا۔

نواب صاحب نے جا کر دیکھا، تو حسن آرا کی آنکھیں پھر گئیں تھیں اور بدن ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ نواب صاحب کو دیکھتے ہی بڑی بیگم نے ایک اینٹ اٹھائی اور سر پر پٹک لی۔ سپہر آرا نے تین بار دیوار سے سر ٹکرایا۔ نواب صاحب ڈاکٹر کو بلانے دوڑے۔

(58)

روم پہنچ کر آزاد ایک پارسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی ہوٹل میں جارجیہ کی ایک لڑکی بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کا نام تھا مینڈا۔ آزاد کھانا کھا کر اخبار پڑھ رہے تھے مینڈا کو باغ میں ٹہلنے دیکھا ہے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ آزاد کے کلیجے میں تیر سا لگا۔ مینڈا بھی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ یہ کون آدمی ہے۔ آدمی تو نہایت حسین ہے، مگر ترکی نہیں معلوم ہوتا ہے۔

آزاد کو بھی باغ کی سیر کرنے کی دھن سوار ہوئی، تو ایک پھول توڑ کر مینڈا کے سامنے پیش کیا، مینڈا نے پھول تو لے لیا، مگر بنا کچھ کہے سنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلی گئی۔ آزاد سوچ رہے تھے کہ یہاں کسی سے جان نہ پہچان، اب اس حسینہ کو کیونکر دیکھیں گے؟ اسی فکر میں بیٹھے تھے کہ ہوٹل کا مالک آ پہنچا۔ آزاد نے اس سے باتوں باتوں میں پتہ لگا لیا کہ یہ ایک کنواری لیڈی ہے۔ اس کی خوبصورتی کی دور دور چرچا ہے۔ جسے دیکھیے، اس کا عاشق

ہے۔ پیالو بجانے کا دلی شوق ہے۔ گھوڑے پر ایسا سوار ہوتی ہے کہ اچھے اچھے شہسوار دنگ رہ جاتے ہیں۔

شام کے وقت آزاد ایک کتاب دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت نے آکر کہا۔ ایک صاحب باہر آپ کی تلاش میں کھڑے ہیں۔ آزاد کو حیرت ہوئی کہ یہ کون ہے؟ باہر آئے، تو دیکھا، ایک عورت منہ پر نقاب ڈالے کھڑی ہے۔ انہیں دیکھتے ہی اس نے نقاب الٹ دی۔ یہ میڈا تھی۔

میڈا: میں وہی ہوں، جسے آپ نے پھول دیا تھا۔

آزاد: اور میں نے آپ کی صورت کو اپنے دل پر کھینچ لیا تھا۔

میڈا: یہاں کب تک ٹھہریے گا؟

آزاد: لڑائی میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔

میڈا: اس لڑائی کا برا ہو، جس نے ہزاروں گھروں کو برباد کر دیا! بھلا، اگر آپ نہ

جائیں، تو کوئی حرج ہے؟

آزاد: مجبوری ہے!

میڈا نے آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور باغ میں ٹہلتے ٹہلتے بولی۔ جب تک آپ یہاں رہیں

گے، میں روز آؤں گی۔

آزاد: میرے لیے یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ میں اچھی ساعت دیکھ کر گھر سے

چلا تھا۔

میڈا: آپ نے وزیر جنگ سے اپنے لیے کیا ملے کیا؟

آزاد: ابھی تو ان سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

میڈا: مجھے امید ہے کہ میں آپ کو کوئی اچھا عہدہ دلا سکوں گی۔

آزاد: آپ کا وطن کہاں ہے؟

میڈا: جارجیا۔

آزاد: تو یہ کہیے، آپ کوہ قاف کی پری ہیں۔

اس طرح کی باتیں کر کے میڈا چلی گئی۔ آزاد کچھ دیر تک سائے میں کھڑے رہے۔

اتنے میں ایک فرانسیسی افسر آکر بولا۔ تم ابھی کس سے باتیں کر رہے تھے؟

اس سے ہوشیار رہے گا۔

حمید: تمہیں اس کا پورا یقین ہے؟

معینا: مجھے آزاد کے ایک دوست ہی سے یہ بات معلوم ہوئی۔

حمید: تمہارا فائدہ۔

معینا: بے شک۔

یہ آگ لگا کر معینا گھر آئی، مگر بار بار یہ سوچتی تھی کہ میں نے بہت برا کیا۔ ایک بے گناہ کو مفت میں پھنسیا۔ خیال آیا کہ جا کر وزیر جنگ سے کہہ دے کہ آزاد بے گناہ ہے، مگر بدنامی کے خوف سے جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ میاں آزاد ہوٹل میں بیٹھے تھے پی رہے تھے کہ ایک ترکی افسر نے آکر کہا۔ آپ کو ترکی کی سرکار نے قید کر لیا۔

آزاد: مجھ کو؟

افسر: جی ہاں۔

آزاد: آپ غلطی کر رہے ہیں۔

افسر: نہیں، مجھے آپ ہی کا پتہ دیا گیا ہے۔

آزاد: آخر میرا قصور؟

افسر: مجھے بتانے کا حکم نہیں۔

تین دن تک آزاد قید خانے میں رہے، چوتھے دن حمید پاشا کے سامنے لائے گئے۔

حمید: مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم روسی جاسوس ہو۔

آزاد: بالکل غلط۔ میں کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ آپ بتلا سکتے ہیں کہ کس نے مجھے پر

الزام لگایا؟

حمید: ایک شریف لیڈی نے، جس کا نام معینا ہے۔

آزاد معینا کا نام سنتے ہی سٹائے میں آگئے۔ دل کے ککڑے ککڑے ہو گئے۔ منہ سے

ایک بات بھی نہ نکلی۔ اب آزاد پھر قید خانے میں آئے، تو منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

معینا! معینا!! تو نے مجھ پر برا ظلم کیا!

آزاد کو اس کا اتار بخ ہوا کہ اسی دن سے بخار آنے لگا۔ دو تین دن میں ان کی حالت

اتنی خراب ہو گئی کہ جیل کے بارونہ نے صبح شام سیر کرنے کا حکم دے دیا۔ ایک دن وہ شام کو

باہر سیر کر رہے تھے کہ ایک خوبصورت نوجوان گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔
 جوان : معاف کیجیے گا، آپ کی صورت میرے ایک دوست سے بہت ملتی ہے۔ میں
 نے سمجھا شاید وہی ہوں۔ آپ کچھ بیمار معلوم پڑتے ہیں۔
 آزاد : جی ہاں کچھ بیمار ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے کہیں آپ کو دیکھا ہے۔
 جوان : شاید دیکھا ہو۔
 یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ آزاد نے فوراً پہچان لیا۔ یہ مسکراہٹ بمیڈا کی تھی۔ آزاد نے کہا۔
 بمیڈا، تم نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔
 بمیڈا : میں اپنے کیے پر خود شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کرو۔

(59)

میاں خوبی پندرہ روز میں خاصے ٹائٹھے ہو گئے، تو کانسل سے جا کر کہا۔ مجھے آزاد کے
 پاس بھیج دیا جائے۔ کانسل نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ دوسرے دن خوبی صاحب جہاز
 پر بیٹھ کر قسطنطنیہ چلے۔ اُدھر میاں آزاد ابھی تک قید خانے میں ہی تھے۔ حمید پاشا نے ان کے
 بارے میں خوب تحقیقات کی تھی، اور گوانٹھیں اطمینان ہو گیا تھا کہ آزاد روسی جاسوس نہیں ہیں،
 پھر بھی ابھی تک آزاد رہا نہ ہوئے تھے۔

ایک دن میاں آزاد قید خانے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فرانسیسی قیدی آیا۔ اس پر
 بھی جاسوسی کا الزام تھا۔ آزاد نے پوچھا۔ آپ نے اپنی صفائی نہیں پیش کی؟
 فرانسیسی : اندھیر ہے، اندھیر! میں تو ان ترکوں کا جانی دشمن ہوں۔
 آزاد : مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ میں تو ترکوں کا عاشق ہوں۔ ایسی دلیر قوم دنیا میں
 نہیں ہے۔

فرانسیسی : ابھی ان لوگوں کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ آپ ہی کو بے وجہ قید کر لیا۔
 آزاد : لڑائی کے دنوں سے ابھی جگہ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔
 فرانسیسی : آپ روسی زبان نہیں جانتے؟
 آزاد : بالکل نہیں۔

فرانسیسی : روس کی سرکار نے بہت مجبور ہو کر لڑائی کی ہے۔

آزاد: میں تو سمجھتا ہوں، روس والوں کی زیادتی ہے، سارا یورپ ترکی کا دشمن ہے۔
اس طرح کی باتیں کر کے فرانسیسی چلا گیا اور دوسرے ہی دن میاں آزاد آزاد کر دیے
گئے۔ یہ قیدی فرانسیسی نہ تھا، حمید پاشا نے ایک ترکی افسر کو آزاد کے دل کا بھید لینے کے لیے
بھیجا تھا۔

شام کا وقت تھا، آزاد بیٹھے ہوئے میڈا سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے آکر
کہا۔ حضور، ایک نانا سا آدمی باہر کھڑا ہے، اور کہتا ہے کہ ہمیں کوٹھی کے اندر جانے دو۔
آزاد نے کہا۔ آنے دو۔ ایک منٹ میں میاں خوبی آکر کھڑے ہو گئے۔ آزاد نے دوڑ کر
انہیں گلے لگا لیا اور خیر حافیت پوچھنے کے بعد اپنی رام کہانی سنائی۔ میاں خوبی نے جب آزاد
کے قید ہونے کا حال سنا، تو مجز کر بولے۔ خدا نے چاہا، تو ہم تمہارا بدلہ لیں گے۔ کھڑے
کھڑے بدلہ نہ لے لیں تو نام نہیں!

آزاد: خیر، اب اس کا افسوس نہ کیجیے۔ بس میڈا ابھی آتی ہوں گی، ذرا ان کے
سامنے بے ہودگی نہ کیجیے گا۔

خوبی: بھئی، ابھی انہیں مت آنے دو۔ ذرا ہم بن ٹھن لیں۔ افسوس یہی ہے کہ
ہمارے پاس کروٹی نہیں۔ بے کروٹی کے ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔

آزاد: کیا ان سے لڑیے گا؟

خوبی: نہیں صاحب، لڑنا کیسا! بے کروٹی کے جو بن نہیں آتا۔ آپ یہ باتیں کیا
جائیں۔

اتنے میں بس میڈا دوسرے کمرے سے نکل آئیں۔ خوبی نے اپنا ٹھاٹ بنانے کے
لیے میز پر کا کپڑا اوڑھ لیا، تولیا سر میں باندھا اور ایک چھری ہاتھ میں لے کر میڈا کی طرف
گھورنے لگے۔ میڈا نے جو ان کی صورت دیکھی، تو مسکرا دی۔ خوبی کھل گئے۔ آزاد سے
بولے۔ کیوں آزاد، سچ کہنا، مجھے دیکھتے ہی کیسا کھل گئیں! میڈا نے آزاد سے پوچھا۔ یہ
کون آدمی ہے؟

آزاد: ایک پاگل ہے۔ اس کو یہ خط ہے کہ جو عورت اسے دیکھتی ہے، رچھ جاتی ہے۔
تم ذرا اس کو بتاؤ۔

میڈا نے خوبی کو اشارے سے قریب بلایا۔ آپ جا کر ایک کرسی پر ڈٹ گئے۔

میڈا: (ہاتھ میں ہاتھ دے کر) آپ کا نام کیا ہے؟
 خوبی: (آزاد سے) مجھے سمجھاتے جاؤ گی!
 آزاد نے ڈوبھاشے کا کام کرنا شروع کیا۔ میڈا جو کہتی تھی، ان کو سمجھاتے تھے، اور وہ
 جو کچھ کہتے تھے، اسے سمجھاتے تھے۔

میڈا: کل آپ کی دعوت ہے، آپ شراب پیتے ہیں؟
 خوبی: ہاں۔ نہیں۔ مگر اچھا، نہیں نہیں۔ کہہ دو انیم پیتا ہوں۔
 میڈا: یہ آپ کا گلاب سا چہرہ کھلا جائے گا!
 خوبی نے اکڑ کر آزادی کی طرف دیکھا۔
 میڈا: آپ کچھ گانا بھی جانتے ہیں۔
 خوبی: ہاں، اور ناچنا بھی جانتا ہوں۔

میڈا: او ہو، تو پھر ناچو۔
 خوبی نے ناچنا شروع کیا۔ اب میڈا ہنسنے لگی، تو آپ اور بھی پھول گئے۔ تھوڑی دیر
 میں میڈا ہوٹل سے چلی گئی۔ تب آزاد نے کہا۔ بھئی، خوبی، یہ بات اچھی نہیں۔ میں تم کو
 ایسا نہیں جانتا تھا۔

خوبی: تو میں کیا کروں؟ جب وہ خود ہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے، تو رکھائی کرنا بھی
 تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

تھوڑی دیر میں میڈا کا خط آیا۔ آزاد نے کہا۔ جناب خواجہ صاحب، ہم کو تو ذرا خط
 دکھانا۔

خوبی: بس، بس، چلیے، الگ بیٹے۔

آزاد: لاؤ ہم پڑھ دیں۔ تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا۔

خوبی: عجب آدمی ہیں آپ! آپ کہاں کے ایسے بڑے عالم ہیں!

خوبی نے خط کو تین بار چوما اور آزاد کو الگ بلا کر پڑھنے کو دیا۔ لکھا تھا۔

’میرے پیارے جوان، تمہاری ایک ایک ادا نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے۔ تمہاری
 سارس کی سی گردن اور بندر کی سی حرکتیں جب یاد آتی ہیں، تو میں اچھل اچھل پڑتی ہوں۔
 اب یہ بتاؤ کہ آج کس وقت آؤ گے؟ یہ خط اپنے دوست آزاد کو نہ دکھانا اور وعدے پر ضرور

خوجی: یار، تمہیں تو سب حال معلوم ہو گیا، مگر اس سے کہہ نہ دیتا۔

آزاد: میں تو جا کر شکایت کروں گا کہ ہم سے چھپایا کیوں؟ ابھی ابھی خط بھیجتا ہوں۔

خوجی: خیر، جانیے، کہہ دیجیے۔ وہ ہم پر عاشق ہیں۔ تم ایسے ہزار لگی چٹی باتیں کریں،

ہوتا کیا ہے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے!

آزاد: یار، اب تمہارے ساتھ نہ رہیں گے۔

خوجی: آخر، سب بتائیے۔

آزاد: غضب خدا کا! معیذا سی ماہ رو اور ہمارے سامنے تمہیں یہ خط لکھے۔

خوجی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بولے۔ یہ بات ہے؟ ہم جوان ہی ایسے ہیں، اس کو کوئی

کیا کرے۔ لیکن اگر تم خلاف ہو گئے، تو واللہ، میں معیذا سے بات تک نہ کروں گا۔ تم مجھے

جان سے بھی زیادہ پیارے ہو۔ قسم خدا کی، اب دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ بس، فقط

تم! اور ہم تو بوڑھے ہوئے۔ یہ بھی بس معیذا کی مہربانی ہے۔ اجی، مصر میں تو تم نہ تھے۔

وہاں پر بھی ایک عورت مجھ پر عاشق ہو گئی تھی! مگر خرابی یہ تھی کہ نہ ہم اس کی بات سمجھیں، نہ

وہ ہماری! ہاں، اشاروں میں خوب باتیں ہوئیں۔ اچھا، پھر ایک حجام تو بلواؤ۔ آج جانا ہے نا!

آزاد نے ایک حجام بلوایا۔ حجامت بننے لگی۔

خوجی: گھوٹو، گھوٹو، گھوٹے جا۔ ابھی کھوٹی باقی ہے۔ خوب گھوٹو۔

حجام نے پھر پتھر اچھیرا۔ خوجی نے پھر ٹنڈل کر کہا۔ ابھی کھوٹی باقی ہے گھوٹو۔

حجام: تو حضور، کب تک گھوٹا کروں!

خوجی: دو نے پیسے دیں گے ہم۔

حجام: مانا، مگر کوئی حد بھی ہے؟

خوجی: تم کو اس سے کیا مطلب!

حجام: خون نکلنے لگے گا۔

آزاد: اور اچھا ہے، لوگ کہیں گے، نوشا کے چہرے سے خون برستا ہے۔

خوجی: ہاں، خوب سوچی۔

حجام: (کسبت سنبھال کر) اب کسی اور نائی سے گھٹوائیے۔

آزاد : اچھا، بچے تو کترتے جاؤ۔

حجام نے حملہ کر آدمے بال کتر ڈالے۔ ایک طرف کی آدمی مونچھ اڑادی۔ خوبی ایک تو یوں ہی بڑے حسین تھے، اب حجام نے بال کتر کر اور بھی ٹھیک بنا دیا خوبی نے جو آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو مونچھیں ندارد حملہ کر کہا اد گیدی، یہ کیا کیا؟ حجام ڈرا کہ کہیں یہ صاحب مار نہ بیٹھیں۔

آزاد : کیوں، کیوں خفا ہو گئے بھی!

خوبی : اس نے پٹے اول جلول کترے، اور آپ بولے تک نہیں؟

آزاد : میں سچ کہتا ہوں آپ اتنے حسین کبھی نہ تھے۔

خوبی : اور چہرے کی تو فکر کرو!

آزاد : ہاں، ہاں، گھبراتے کیوں ہو؟

خوبی : ہم کو یاد آتا ہے کہ لوشا کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے غزلیں پڑھتے ہیں۔
دو ایک لوٹے بلوا لیجیے، تو ان کو غزلیں رٹا دیں۔

آزاد نے دو لڑکے بلوائے، اور میاں خوبی ان کو غزلیں یاد کرانے لگے۔ ایک غزل میاں آزاد نے یہ بتلائی۔

بھلا یہ تو بتاؤ کہ یہ کون بشر ہے،

سب صورت لنگور فقط دم کی کسر ہے۔

خوبی : چلیے بس، اب دل لگی رہنے دیجیے۔ واہ، اچھے لے!

آزاد : اچھا، اور غزل لکھوائے دیتا ہوں۔

فغاں ہے، آہ ہے، نالہ ہے، بے قراری ہے،

فراق، یار میں حالت حجب ہماری ہے۔

خوبی : واہ، شادی کو اس شعر سے کیا واسطہ!

آزاد : اچھا صاحب، یہ غزل یاد کروا دیجیے۔

کہا تھا بلبل سے حال میں نے

تیرے ستم کا بہت چھپا کر،

یہ کس نے ان کو خبر سنائی

کہ ہنس پڑے پھول کھلکھلا کر
میرے جنازے کو ان کے کوپے میں
باقی احباب لے کے آئے،
نگاہِ حسرت سے دیکھتے ہیں
وہ رخ سے پردہ اٹھا اٹھا کر۔

خوبی : واہ، جنازے کو شادی سے کیا مطلب ہے بھلا!

آزاد : اوپر والا شعر پسند ہے؟

خوبی : ہاں، ہنسنا اور کھلکھلانا، ایسے لفظ ہوں، تو کیا پوچھنا!

آزاد : اچھا، اور سنئے۔

خوبی : نہیں اتنا ہی کافی ہے۔ ذرا باجے والوں کی تو فکر کیجیے۔ ہاتھی، گھوڑے، پاکی،
سبھی چاہیے۔ مگر ہمارے لیے جو گھوڑا منگوائیے گا، وہ ذرا سیدھا ہو۔

آزاد : بھلا، گھوڑا نہ ملے، تو فخر ہو تو کیسا؟

خوبی : واہ، آپ نے مجھے کوئی گدھا سمجھا ہے؟

اتنے میں ہوٹل کا مینیجر آگیا اور یہ تیاریاں دیکھ کر ہنسنے لگا۔

خوبی : کیوں صاحب، یہ آپ ہنسے کیوں؟

مینیجر : جناب، یہاں شریف لوگ شادیوں میں باجے گاجے نہیں لے جاتے، اور پیدل
ہی جاتے ہیں۔ ہاں، ایک بات ہو سکتی ہے، دس پانچ آدمیوں کو تھالیاں دے دیجیے، بانس کی
کھپاچوں سے انھیں بجاتے جائیں۔ آواز کی آواز اور باجے کا باجا۔

خوبی : بھئی آزاد، سوچ لو۔

آزاد : وہ جب یہاں دستور ہی نہیں، تو پھر کیا کیا جائے گا؟ ہاں، نوشے کا پیدل جانا
ذرا بدنامی کی بات ہے۔

مینیجر : تو پیدل نہ جانیے۔ جس طرح یہاں رئیس لوگ جاتے ہیں، اس طرح
جانیے۔ آدمی کی گود میں۔

خوبی : منظور۔ مگر ہم کو اٹھا سکے گا کوئی؟

مینیجر : ہم اس کا بندوبست کر دیں گے۔ آپ گھبراہٹیں نہیں۔

دو گھڑی دن رہے خوبی کی برات چلی۔ تین مزدور آگے آگے تھا لیاں بجاتے جاتے ہیں، دو لوٹے آگے پیچھے ساتھ۔ خوبی ایک مزدور کی گود میں، گیروئے کپڑے پہنے، اکڑے بیٹھے ہیں۔ ایک ایک آپ بولے — ارے رے رے! روک لو برات۔ روک لو۔ بیخ شاخ والے کہاں ہے؟ کوئی بولتا ہی نہیں۔ پردیس میں بھی انسان پر کیا مصیبت پڑتی ہے؟ اب میں دولہا بن کر رہوں، یا انتظام کروں! یہ دونوں گیدی تو زرے جاں گویا ہی نکلے۔ پھر یاد آیا کہ نشان کا ہاتھی تو ہے ہی نہیں۔ ارے! کروئی بھی نہیں۔ حکم دیا کہ لوٹا دو برات۔ چلو ہوٹل میں۔

آزاد: یہ کیا بھی؟ کیا بات ہے؟ لوٹے کیوں جاتے ہو؟

خوبی: نشان کا ہاتھی تو ہے ہی نہیں۔

آزاد: عجب آدمی ہو بھی، آپ لڑنے جاتے ہیں، یا شادی کرنے؟ اور پھر یہاں ہاتھی کہاں؟ کیسے تو فخر پر ایک جھنڈی رکھوا دیں۔

اسنے میں مس میڈا آتی ہوئی دیکھائی دیں۔ خوبی انھیں دیکھتے ہی اور بھی اکڑ گئے۔ کیا کہوں، میرے ساتھ کے آدمی سب گولی مار دینے لائق ہیں۔ کوئی انتظام ہی نہ کیا۔

میڈا: خیر، کل آ جائے گا۔ مگر آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ یہاں ایک روسی بہت دنوں سے میرا عاشق ہے۔ پہلے اس سے لڑو، پھر ہمارے ساتھ شادی ہو۔

خوبی: مجال ہے اس کی کہ میرے سامنے کھڑا ہو جائے؟ ہم پچاس آدمیوں سے اکیلے لڑ سکتے ہیں۔ جب برات ہوٹل پہنچی، تو میڈا نے کہا۔ تو ان سے کب لڑیے گا؟

خوبی: جب کیسے۔ خون پی جاؤں گا۔

میڈا: اچھا، کل تیار رہیے گا۔

دوسرے دن میڈا نے ایک ترکی پہلوان کو لا کر ہوٹل میں بیٹھا دیا اور خوبی سے بولی — لیجیے، آپ کا دشمن آگیا۔ خوبی نے جب اسے دیکھا، تو ہوش اڑ گئے۔ دنیا بھر کے آدمیوں سے دو ٹھنی اونچا۔ دل میں سوچنے لگے، یہ تو کچا ہی کھا جائے گا۔ ایک چپت دے، تو ہم زمین میں دھنس جائیں۔ اس سے لڑے گا کون بھلا! مارے ڈر کے ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ میڈا نے کہا — آپ تو ابھی سے ڈرنے لگے۔ خوبی ایک ایک دھڑام سے گر پڑے اور چلانے لگے۔ اس طرح کا درد ہو رہا ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ افسوس، دل کی دل ہی میں رہ گئی! واللہ، وہ بھگنی دیتا کہ کمر ٹوٹ جاتی۔ مگر خدا کو منظور نہ تھا۔ ترکی پہلوان نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا،

تو دس قدم پر جا گرے۔ بولے۔ او گیدی، ذرا بیمار ہو گیا ہوں، نہیں تو کچا ہی کھا جاتا، نمک بھی نہ مانگتا۔

آخر اس بات پر فیصلا ہوا کہ جب خوبی اچھے ہو جائیں، تو پھر کسی دن کشتی ہو۔

(60)

میاں شہسوار کا دل دنیا سے تو گر گیا تھا، مگر جوگن کی اٹھتی جوانی دیکھ کر ذہن سمائی کہ اس کو نکاح میں لادیں۔ ادھر جوگن نے ٹھان لی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کروں گی۔ جس کے لیے جوگن ہوئی، اسی کی محبت کا دم بھروں گی۔ ایک دن شہسوار نے جو سنا کہ سپہر آرا کو ٹھسے پر سے کود پڑی، تو دل بے اختیار ہو گیا۔ چل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں، ماجرا کیا ہے؟ راستے میں ایک منشی سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں آدمی ساتھ ساتھ بیٹھے، اور ساتھی ہی ساتھ اترے۔ اتفاق سے ریل سے اترتے ہی منشی جی کو ہیضہ ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے چل بسے۔ شہسوار نے جو دیکھا کہ منشی کے پاس دولت کافی ہے، تو فوراً ان کے بیٹے بن گئے اور سارا مال اسباب لے کر چمپت ہو گئے۔ سات ہزار کی اشرفیاں، دس ہزار کے نوٹ اور کئی سو روپے ہاتھ آئے۔ رئیس بن بیٹھے۔ فوراً جوگن کے پاس لوٹ گئے۔

جوگن: کیا مجھے نہیں؟

شہسوار: آدمی ہی راہ سے لوٹ آئے۔ مگر ہم امیر ہو کر آئے ہیں۔

جوگن: امیر کیسے! بولو؟ ہم کو بناتے ہو؟

شہسوار: قسم خدا کی، ہزاروں لے کر آیا ہوں۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔

دنیا کے بھی عجب کارخانے ہیں۔ شہسوار کو بائیس ہزار تو نقد ملے اور جب کپڑوں کی گٹھری کھولی، تو ایک ٹوپی نکل آئی، جس میں ہیرے اور موتی نکلے ہوئے تھے۔ جوگن کے عاشقوں میں ایک جوہری بھی تھا۔ اس نے یہ ٹوپی بیس ہزار میں خرید لی۔ جب جوہری چلا گیا، تو شہسوار نے جوگن سے کہا۔ لو، اب تو اللہ میاں نے تو چھتر پھاڑ کے دولت دی۔ کہو، اب نکاح کی ٹھہرتی ہے؟ کیوں مفت میں جوانی کھوتی ہو؟

جوگن: اب رنگ لائی گلہری۔ او مجھے کے گھر تیر، باہر رکھوں کہ بھیتر۔ روپے کیا مل گیا، اپنے آپ کو بھول گئے۔

شہسوار سچ سچ اوجھا تھا۔ اب تک تو آپ جوگن کی خوشامد کرتے تھے، ڈٹی دیے بیٹھے تھے کہ کبھی نہ کبھی تو دل پیچے گا، مگر اب زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتے۔ بات بات پر جھکتے ہیں۔ جوگن، تو دنیا سے منہ موڑے بیٹھی تھی، ان کے چونچلے کیوں برداشت کرتی؟ شہسوار سے نفرت کرنے لگی۔

ایک دن شہسوار ہوا کے گھوڑے پر سوار ڈیک مارنے لگے۔ اس وقت ہم بھی لاکھ کے پیٹ میں ہیں۔ اور لاکھ روپے جس کے پاس ہوتے ہیں، اس کو لوگ تین چار لاکھ کا آدمی آسکتے ہیں۔ اب دو گھوڑے اور لیں گے۔ مگر ہم یہ مہاجنی کارخانہ نہ رکھیں کہ چار جامہ اور زین پوش۔ بس، انگریزی کاٹھی۔ اور ایک جوڑی فن کے لیے۔ جو دیکھے، کہے، رئیس جاتا ہے۔ اور رئیس کے کیا دو سینک ہوتے ہیں سر پر؟ ایک کوٹھی بھی بنوا دیں گے۔ کوئی تعلقہ دار اپنا علاقہ بیچے، تو کھڑے کھڑے خرید لیں۔

جوگن : اچھا، کھانا تو کھا لو۔

شہسوار : آج کھانا کیا پکا ہے؟

جوگن : مین کی روٹی۔

شہسوار : یہ تو رئیسوں کا کھانا نہیں۔

جوگن : رئیس کون ہیں؟

شہسوار : ہم تم، دونوں۔ کیا اب بھی رئیس ہونے میں شک ہے؟ ہاں، خوب یاد آیا،

ایک ہاتھی بھی خریدیں گے۔

جوگن : ہاں، بس اسی کی کسرتھی۔ دو تین گدھے بھی خریدنا۔

شہسوار : گدھے تو رئیسوں کے یہاں نہیں دیکھے۔

جوگن : نئی بات سہی۔

شہسوار : ہاں، خوب سوچھی۔

جوگن : پھر، یہ سب کب خریدو گے؟

شہسوار : جب چاہیں۔ روپے کا تو سارا کھیل ہے۔ تیس چالیس ہزار روپے تو بہت

ہوتے ہیں۔ انسان گنے، تو برسوں میں گنتی ختم ہو۔

جوگن : اجی، دو تین آدمی تو اتنے عرصے میں مرجائیں، دس پانچ کی آنکھیں پھوٹ

جائیں۔

اس دن سے شہسوار کی حالت نہ کچھ اور ہو گئی۔ کبھی روتے، کبھی بھیکی بھیکی باتیں کرتے۔ آخر جوگن نے وہاں سے کہنہ بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ پڑوس میں ایک آدمی رہتا تھا جو موم کے کھلونے خوب بناتا تھا۔ موم کے آدمی اپنے بناتا کہ اصل کا دھوکہ ہوتا تھا اسے بلا کر جوگن نے اس کے کان میں کچھ کہا اور کاریگر دس دن کی مہلت لے کر رخصت ہوا۔

نو دن تک تو جوگن نے کسی طرح کانٹے، دسویں دن ایک ایک شہسوار نے اسے دیکھا، تو چپ چاپ پڑی ہے۔ بلایا، جواب نہ دارت۔ قریب جا کر دیکھا، تو پچھاڑ کھا کر گر پڑے۔ لگے دیوار سے سر ٹکرانے۔ جی میں آیا کہ زہر کھالیں اور اسی کے ساتھ چلے چلیں۔ کیا لطف سے دن کٹتے تھے، اب یہ روپے کس کام آویں گے۔ جان جانے کا رنج نہیں، مگر یہ روپیہ کہاں جائے گا؟ آخر وصیت لکھی کہ میرے بعد میری ساری جائیداد سپہر آرا کو دی جائے۔ یہ وصیت لکھ کر شہسوار نے لکھ کر سر پٹنا شروع کیا۔ کھلونے بنانے والا کاریگر اسے سمجھانے لگا۔ مبر کیجیے۔ ہائے، کیا مزاج تھا! یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی کو بلالایا۔ دونوں نے لاش کو خوب لپیٹ کر کندھے پر اٹھایا۔ میاں شہسوار پیچھے پیچھے چلے۔

کاریگر: تم کیوں آتے ہو؟ قبرستان بہت دور ہے۔

شہسوار: قبر تک تو چلنے دو۔

کاریگر: کیا غضب کرتے ہو۔ تھانے والوں کو خبر ہو گئی تو مفت میں دھرے جاؤ گے۔

شہسوار: مٹی تو دے دوں۔

کاریگر: بس، اب ساتھ نہ آئیے۔

(61)

قید خانے سے چھوٹنے کے بعد میاں آزاد کو برسالے میں ایک عہدہ مل گیا۔ مگر اب مشکل یہ پڑی کہ آزاد کے پاس روپے نہ تھے۔ دس ہزار روپے کے بغیر تیاری مشکل۔ انہی آدمی، پرایا ملک، اتنے روپے کا انتظام کرنا آسان نہ تھا۔ اس فکر میں میاں آزاد کئی دن تک غوطے کھاتے رہے۔ آخر بھی سوچا کہ یہاں کوئی نوکری کر لیں اور روپے جمع ہو جانے کے بعد فوج میں جائیں۔ من مارے بیٹھے ہوئے تھے، کہ میٹھا آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس تپاک

کے ساتھ آزاد روز پیش آیا کرتے تھے۔ اس کا آج پتہ نہ تھا! چکرا کر بولی۔ اداس کیوں ہو! میں تو تمہیں مبارکباد دینے آئی تھی۔ یہ الٹی بات کیسی؟

آزاد: کچھ نہیں۔ اداس تو نہیں ہوں۔

بمبڈا: ذرا آئینے میں صورت تو دیکھیے۔

آزاد: ہاں، بمبڈا، شاید کچھ اداس ہوں۔ میں نے تم سے اپنے دل کی کوئی بات بھی نہیں چھپائی۔ مجھے عہدہ تو مل گیا، مگر یہاں نکا پاس نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟

بمبڈا: بس، اس لیے آپ اتنے اداس ہیں! یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ تم اس کی کوئی فکر نہ کرو۔

یہ کہہ کر بمبڈا چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کے آدمی نے آکر ایک لفافہ آزاد کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ آزاد نے لفافہ کھولا، تو اچھل پڑے۔ استنبول بینک کے نام میں ہزار کا چیک تھا۔ آزاد روپے پا کر خوش تو ہوئے، مگر یہ افسوس ضرور ہوا کہ بمبڈا نے اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھا ہوگا۔ اسی وقت بینک گئے، روپے لیے اور سب سامان ٹھیک کر کے دوسرے دن فوج میں داخل ہو گئے۔

دوپہر کے وقت گھر گھڑاٹ کی آواز آئی۔ خوبی نے سنا، تو بولے۔ یہ آواز کیسی ہے بھی؟ ہم سمجھ گئے۔ بھوچال آنے والا ہے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔ فوج جا رہی ہے۔ خوبی کوٹھے پر چڑھ گئے۔ دیکھا، فوج سامنے آرہی ہے۔ یہ گھر گھڑاٹ تو پ خانے کی تھی۔ ذرا دیر میں آزاد پر نظر پڑی۔ گھوڑے کی باگ اٹھائے، ران جمائے چلے جاتے تھے۔ خوبی نے پکارا۔ میاں، آزاد! ارے میاں، ادھر، ادھر! واہ، سنتے ہی نہیں۔ فوج میں کیا ہو گئے، مزاج ہی نہیں ملتے۔ ہم بھی پلٹن میں رہ چکے ہیں، رسال دار تھے، پر یہ نہ تھا کہ کسی کی بات نہ سنیں۔

سارے شہر میں ایک میلہ سا لگا ہوا تھا، کوٹھے پھٹے پڑتے تھے۔ عورتیں اپنے شوہروں کو لڑائی پر جاتے دیکھتی تھیں اور ان پر پھولوں کی بوچھاڑ کرتی تھیں۔ مائیں اپنے بیٹوں کے لیے خدا سے دعا کر رہی تھیں۔

فوج تو میدان کو گئی اور میاں خوبی مس بمبڈا سے ملنے چلے۔ بمبڈا کی ایک سیٹھی کا نام تھا۔ بس روز۔ بمبڈا خوبی کو دیکھتے ہی بولی۔ لیجیے، میں نے آپ کی شادی مس روز سے

ٹھیک کر دی۔ اب کل برات لے کر آئیے۔

خوبی: خدا آپ کو اس نیکی کا بدلہ دے۔ میں تو وزیر جنگ کو بھی نوید دوں گا۔

میڈا: اجی، سلطان کو بھی بلوائیے۔

خوبی: تو پھر بندوبست کیجیے۔ شادی کے لیے ناچ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر طلبے پر تھاپ نہ پڑی، محفل نہ جی، تو شادی ہی کیا؟

میڈا: مگر یہاں تو آدمی کا ناچ منع ہے۔ کہیں کوئی عورت ناچے، تو غضب ہی ہو جائے۔

خوبی: اچھا، پھر کسی سہیل سے ناچ کا نام تو ہو جائے۔

میڈا: اس کی تدبیر یوں کیجیے کہ کسی بندر نچانے والے کو بلا لیجیے۔ خرچ بھی کم اور لطف بھی زیادہ۔ تین بندر والے کافی ہوں گے۔

خوبی: تین تو منحوس ہیں۔ پانچ ہو جائیں، تو اچھا!

خیر، دوسرے دن خوبی برات سجا کر میڈا کے مکان کی اور چلے۔ آگے نشان کا ٹچر تھا، پیچھے ریچھ اور بندر۔ دس پانچ لڑکے مشعلیں لیے خوبی کے چاروں چلے جاتے تھے، اور خوبی تو پر سوار، گیسوئے رنگ کی پوشاک پہنے، سیاہ گہڑی باندھے، اکڑے بیٹھے تھے۔ ٹو اتنا مریل تھا کہ خوبی بار بار اچھلتے تھے، ایڑ پر ایڑ لگاتے تھے، مگر وہ دو قدم آگے جاتا تھا تو چار قدم پیچھے۔ ایک ایک تو بیٹھ گیا۔ اس پر لڑکوں نے اسے ڈنڈے مارنا شروع کیا۔ خوبی گہڑی پر بولے۔ او مسخرو، تم سب ہنتے کیا ہو! جلد کوئی تدبیر بتاؤ، ورنہ مارے کرو لیوں کے بولا دوں گا۔

سائیس: حضور، میں اس گھوڑے کی عادت خوب جانتا ہوں۔ یہ بغیر چابک کھائے اٹھنے والا نہیں۔

خوبی: تو مصلحت کرتا ہے کہ کسی تدبیر سے ٹٹو کو مناتا ہے؟

سائیس: آپ اتر پڑیے۔

خوبی اتر پڑے اور سائیس نے ٹٹو کو مار مار کر اٹھایا۔ خوبی پھر سوار ہونے چلے۔ ایک بھر رکاب پر رکھ کر دوسرا اٹھایا ہی تھا کہ ٹٹو چلنے لگا۔ خوبی ارا را، را کر کے دھم سے زمین پر آ رہے۔ گہڑی یہ گری، گردلی وہ گری۔ ڈیا ایک طرف، ٹٹو ایک طرف۔ سائیس نے کہا۔ اٹھیے،

اٹھیے۔ گھوڑے سے گرنا شہسواروں ہی کا کام ہے۔ جسے گھوڑا نصیب نہیں، وہ کیا گرے گا؟
خوجی: خیرت یہ ہوئی کہ میں گھوڑے پر نہ گرا، ورنہ میرے بوجھ سے اس کا کام ہی تمام ہو جاتا۔

خوجی نے پھر سر پر پگڑی رکھی، کروٹی کمر سے لگائی اور ایک لڑکے سے پوچھا۔ یہاں
آئینہ تو کہیں نہیں ملے گا؟ پھر سے پوشاک بھی ہے، ذرا منہ تو دیکھ لیتے۔

لڑکا: آئینہ تو نہیں ہے، کیسے، پانی لے جاؤں۔ اسی میں منہ دیکھ لیجیے۔
یہ کہہ کر وہ ایک ہانڈی میں پانی لایا۔ خوجی پینک میں تو تھے ہی، ہانڈی جو اٹھائی، تو
سارا پانی اوپر آ رہا۔ بگڑ کر ہانڈی چنک دی۔ پھر آگے بڑھے۔ مگر دو چار قدم چل کر یاد آیا کہ
مس روز کا مکان تو معلوم ہی نہیں، برات جائے گی کہاں؟ بولے۔ یارو، غصہ ہو گیا!
جلوس روک لو۔ کوئی مکان جانتا ہے؟

سائیس: کون مکان؟

خوجی: وہی جی، جہاں چلنا ہے۔

سائیس: مجھے کیا معلوم؟ جدھر کیسے، چلوں۔

خوجی: تم لوگ عجیب گھامڑ ہو۔ برات چلی اور دہن کے گھر کا پتہ تک نہ پوچھا۔

سائیس: نام تو بتائیے؟ کسی سے پوچھ لیا جائے۔

خوجی: ارے بھائی، مجھے ان کا نام نہ لینا چاہیے۔ انکل سے چلو اسی طرف۔

سائیس: ارے، کچھ نام تو بتائیے!

خوجی: کوہ قاف کی پری کہہ دو۔ پوری نام ہم نہ لیں گے۔

ایک طرف کئی آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سائیس نے پوچھا۔ یہاں کوئی پری رہتی ہے؟

ایک آدمی نے کہا۔ مجھے اور تو نہیں معلوم، مگر شہر باہر پورب کی طرف جو ایک تالاب

ہے، وہاں پار سال جو ایک فقیر بٹکے تھے، ان کے پاس ایک پری تھی۔

خوجی: لو، چل نہ گیا پتہ! اسی تالاب کی طرف چلے چلو۔

اب سینے۔ اس تالاب پر ایک ریس کی کوٹھی تھی۔ اس کی بیوی مر گئی تھی۔ گھر میں ماتم

ہو رہا تھا۔ دروازے پر جو یہ شور غل مچا، تو اس نے اپنے نوکروں سے پوچھا۔ یہ کیسا غل

ہے؟ باہر نکل کر خوب پیٹو بد معاشوں کو! دو تین آدمی ڈنڈے لے لے کر پھانک سے نکلے۔

خوبی : واہ رے آپ کے یہاں کا انتظام! کب سے برات کھڑی، اور دروازے پر روشنی تک ندارد!

ایک آدمی : تو کون ہے بے؟ کیا رات کو بندر نہ جانے آیا ہے؟
 خوبی : زبان سنبال۔ جا کر اپنے مالک سے کہہ، برات آئی ہے۔
 آدمیوں نے برات کو پیٹنا شروع کیا۔ خوبی پر ایک چپٹ پڑی، تو پگڑی گر پڑی۔ تو دوسرے نے تھو پر ڈنڈے بجائے۔

خوبی : بھئی، ایسی دل لگی نہ کرو۔ کچھ کبھتی تو نہیں آئی تم سب کی؟
 بندر والوں پر جب مار پڑی، تو دے سب بھاگے۔ لڑکے بھی چراغ پھینک پھاٹک کر بھاگے۔ ٹو نے بھی ایک طرف کی راہ لی۔ بے چارے خوبی اکیلے ہٹ پٹا کر ہوٹل کی طرف چلے۔

(62)

جوگن شہسوار سے جان بچا کر بھاگی، تو راستے میں ایک وکیل صاحب ملے۔ اے اکیلے دیکھا، تو چھیڑنے کی سوجھی۔ بولے — حضور کو آداب۔ آپ اس اندھری رات میں اکیلے کہاں جاتی ہیں؟

جوگن : ہمیں نہ چھیڑیے۔

وکیل : شہزادی ہو؟ نواب زادی ہو؟ آخر ہو کون؟

جوگن : غریب زادی ہوں۔

وکیل : لیکن آوارہ۔

جوگن : جیسا آپ سمجھیے۔

وکیل : مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہیں اکیلا پا کر کوئی دق نہ کرے۔ میرا مکان قریب ہے،

وہیں چل کر آرام سے رہو۔

جوگن : مجھے آپ کے ساتھ جانے میں کوئی عذر نہیں، مگر شرط یہی ہے کہ میری عزت

کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

وکیل : یہ آپ کیا فرماتیں ہیں؟ میں شریف آدمی ہوں۔

وکیل صاحب دیکھنے میں تو شریف معلوم ہوتے تھے، مگر دل کے بڑے کھوٹے تھے۔ جوگن نے سمجھا کہ اس وقت اور کہیں جانا تو مناسب نہیں۔ رات کو میسر رہ جاؤں، تو کیا حرج؟ وکیل صاحب کے گھر گئی، تو دیکھا، ایک کمرے میں ٹاٹ پر درمی پٹھی ہے، اور ایک ٹوٹی میز پر قلم داوات رکھی ہے۔ سمجھ گئی، یہ کوئی ٹٹ میچے وکیل ہیں۔

رات زیادہ آگئی تھی۔ جب جوگن سوئی، تو وکیل صاحب نے اپنے نوکر سالار بخش کو یوں بٹی پڑھائی۔ تم صبح ان سے کہنا کہ وکیل صاحب بہت بڑے رئیس ہیں۔ ان کے باپ چکلے دار تھے۔ ان کے یہاں دو ہتھیاں ہیں اور آدمیوں کی تنخواہ مہینے میں تین سو روپے دیتے ہیں۔

سالار بخش: بھلا وہ یہ نہ کہیں گی کہ رئیس ہیں، تو پھنے حالوں کیوں رہتے ہیں؟ ایک تو کھنیا آپ کے پاس، اور اس پر یہ باتیں کہ ہم ایسے اور ہم ویسے۔ ہاں، میں اتنا کہہ دوں گا کہ ہمارے حضور دل کے بڑے وہ ہیں۔

وکیل: وہ کے کیا معنی؟

سالار بخش: اجی، چالاک ہیں۔

وکیل: آج کھانا دل لگا کر پکاتا۔

سالار بخش: تو کسی باورچی کو بلا لیجئے نہ! دو روپے خرچے، تو اچھے سے اچھے کھانے پکوا دوں۔ اور ان کے لیے کوئی ماما رکھیے بے اس کے بات نہ بنے گی۔ ہاں، چاہے مار ڈالے ہمیں، ہم جھوٹ نہ بولیں گے کبھی۔

وکیل: دیکھو، سب فکر ہو جائے گی۔

سالار بخش: فکر کیا خاک ہوگی؟ مقدمے والے تو آتے ہی نہیں۔

وکیل: اجی، ایک مقدمے میں عمر بھی کی کسر نکل جائے گی۔

سالار بخش: تو کیا ملے گا ایک مقدمے میں؟

وکیل: اجی، ملنے کی نہ کہو! ملیں، تو دو لاکھ مل جائیں۔

سالار بخش: ایس، اتنا جھوٹ! میاں، میں نوکری نہیں کرنے کا۔ دیکھیے، جھت نہ گر پڑے کہیں! لوگ کہتے ہیں، کال پڑتا ہے، ہیضہ آتا ہے، میٹھ نہیں برستا۔ بر سے کیا خاک، اس جھوٹ کو تو دیکھیے، کچھ ٹھکانہ ہے، دو لاکھ ایک مقدمے میں آپ پائیں گے! کبھی بابا راج نے

بھی دو لاکھ کی صورت دیکھی تھی؟ ہم نے تو آپ کے بابا کو بھی جوتیاں جھٹکھاتے دیکھا۔ وہ تو کیسے، فقر کی دعا سے روٹیاں چلی جاتی ہیں۔ یہی غنیمت سمجھو؟
وکیل: تم بڑے گستاخ ہو۔

سلاربخش: میں تو کھری کھری کہتا ہوں۔
وکیل: خیر، کل ایک کام تو کرنا! ذرا دو آدمیوں لگا لانا۔
سلاربخش: کیا کرنا؟

وکیل: دو آدمیوں کو موکل بنا کر لے آنا، جس میں یہ سمجھیں کہ ان کے پاس مقدے بہت آتے ہیں۔ ہم تو رنگ جھاتے ہیں نہ اپنا۔ یہ بات! سمجھو!
سلاربخش: اگر دو ایک کو پھانس پھونس کر لائے بھی، تو فائدہ کیا؟ نکا تو وصول نہ ہوگا۔
وکیل: وہ سمجھیں گی کہ یہ بہت بڑے وکیل ہیں۔

سلاربخش: اچھا، اس وقت تو سوئیے۔ صبح دیکھی جائے گی۔
دونوں آدمی سوئے۔ سب سے پہلے جوگن کی آنکھ کھلی۔ سلاربخش سے بولی۔ کیوں جی، ان کا نام کیا ہے؟

سلاربخش: ان کا نام ہے بیگن؟
جوگن: کیا؟ بیگن! تب تو شریف ضرور ہوں گے اور ان کے باپ کا نام کیا ہے؟ بیگن؟
سلاربخش: باپ کا نام مداری۔
جوگن: واہ، بس، معلوم ہو گیا۔ اور پیشہ کیا ہے؟
سلاربخش: دلالی کرتے ہیں۔
جوگن: ایس، یہ دلال ہیں؟

سلاربخش: جی، اور کیا! باپ دادے کے وقت سے دلالی ہوتی آتی ہے۔
وکیل صاحب لیٹے لیٹے سن رہے تھے اور دل ہی دل میں سلاربخش کو گالیاں دے رہے تھے کہ پاجی نے جمع جمایا رنگ پھینکا کر دیا۔ اتنے میں بارہ کی توپ دغی اور وکیل صاحب اٹھ بیٹھے۔

وکیل پانی لاؤ۔ آج وہ دوسرا خدمت گار کہاں ہے؟
سلاربخش: حضور، چٹھی لے گیا ہے۔

وکیل : اور ما نہیں آئی؟

سلار بخش : رات اس کے لڑکا ہوا ہے۔

وکیل : اور کالے خاں کہاں مر گیا آج!

سلار بخش : لال خاں کے پاس گیا ہے حضور!

وکیل : اور ہمارا مھر؟

سلار بخش : انھیں نواب صاحب نے بلوا بیجا ہے۔

وکیل : سب موکل کہاں ہیں؟

سلار بخش : حضور، سب واپس چلے گئے۔

وکیل : کچھ پرواہ نہیں، ہم کو مقدموں کی کیا پرواہ!

سلار بخش : حضور کے گھر کی ریاست کیا کم ہے!

وکیل : (جوگن سے) آج تو آپ خوب سوئیں۔

جوگن : مارے سردی کے رات بھر کا نپتی رہی۔ قسم لے لو، جو آنکھ بھی جھپکی ہو۔ یہ تو

بتائیے۔ آپ کا نام کیا ہے؟

وکیل : ہمارا نام مولوی مرزا محمد صادق علی بیک، وکیل عدالت۔

جوگن : گھر کی چٹکی ہاسی ساگ۔

وکیل : ایس، اور نیسے۔

جوگن : تمہارا نام ہینگ ہے؟ اور ہینگ کے لڑے ہو، دلالی کرتے ہو؟

وکیل : ہینگ کس پاجی کا نام ہے؟

سلار بخش : ان سے کسی نے ہینگ کہہ دیا ہوگا۔

وکیل : تیرے سوا اور کون کہنے بیٹھا ہوگا؟

سلار بخش : تو کیا میں ہی اکیلا آپ کا نوکر ہوں کچھ؟ پندرہ بیس آدمی ہیں۔ کسی نے کہہ

دیا ہوگا۔ اس کو ہم کیا کریں لے بھلا؟

وکیل : اوپر سے اور ہنتا بے غیرت! (جوگن سے) ہم سے ایک فقیر نے کہا ہے کہ تم

جلد بادشاہ ہونے والے ہو۔

جوگن : ہاں، پھر آؤ تمہارے سر پر بیٹھا ہی چاہتا ہے۔ دو ہی طرح سے غریب آدمی

بادشاہ ہو سکتا ہے۔ یا تو ٹانگ ٹوٹ جائے، یا آلو سر پر بیٹھے۔ اچھا، آپ کی آمدنی کیا ہوگی؟
 وکیل: یہ نہ پوچھو۔ کچھ روپیہ گاؤں سے آتا ہے، کچھ وثیقہ ہے، کچھ وکالت سے پیدا کرتے ہیں۔

جوگن: اور سواری کیا ہے آپ کے پاس؟
 وکیل: آج کل تو بس، ایک پاکی ہے اور دو گھوڑے۔

جوگن: بندھتے کہاں ہے؟
 سلا رنچس: ادھر ایک اسٹبل ہے، اور اس کے پاس ہی فیل خانہ۔

جوگن: ایں، کیا آپ کے پاس ہاتھی بھی ہے؟
 وکیل: نہیں جی، کہنے دو اے۔ یہ یوں ہی کہا کرتا ہے۔

جوگن: اچھا وکالت میں کیا ملتا ہوگا؟
 وکیل: اب تو آج کل مقدمے ہی کم ہیں۔

جوگن: تو بھی بھلا؟

سلا رنچس: اس کی نہ پوچھیے، کسی مہینے میں دو چار ہاتھی آگئے، کسی مہینے میں دس پانچ اونٹ مل گئے۔

وکیل: تو اٹھ جا یہاں سے۔ ہزار بار کہہ دیا کہ مسخرے پن سے ہم کو نفرت ہے، مگر
 مانتا ہی نہیں شیطان! تجھ سے کچھ کہا تھا ہم نے!

سلا رنچس: ہاں، ہاں، یاد آگیا۔ لیجیے ابھی جاتا ہوں۔

وکیل صاحب سلا رنچس کے ساتھ برآمدے میں آئے کہ کچھ اور سمجھا دیں، تو سلا رنچس
 نے کہا۔ ابھی سبھوں کو چھانے لاتا ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے۔ مگر یہ بھی بیٹھی رہیں، جس
 میں لوگ سمجھیں کہ وکیل کی بڑی آمدنی ہے۔ میں کہہ دوں گا کہ گانا سننے کے لیے نوکر رکھا
 ہے۔ سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔

وکیل: سو نہیں، دو سو کہنا!

سلا رنچس: وہی بات کہیے گا، جو بے تکلی ہو۔ بھلا کسی کو بھی دنیا میں یقین آوے گا کہ
 یہ وکیل دو سو روپے خرچ کر سکتا ہے؟

وکیل: کیوں، کیوں؟

سلاربخش : اب آپ تو ہندی کی چندی نکالتے ہیں۔ دھیلے دھیلے پر تو آپ مقدے لیتے ہیں، دو سو کی رقم بھلا آپ کیا خرچ کریں گے؟
 وکیل : اچھا، بک نہ بہت۔ جا، پھانس لا دو چار کو۔

سلاربخش باہر جا کر دو چار اڑوسیوں پڑوسیوں کو سکھا پڑھا کر مونچھو پر تاء دیتے ہوئے آیا، اور ہٹھ بھر کر جوگن کے سامنے پیش کیا۔

جوگن : کیا کٹکو والے کی دکان سے لائے ہو؟ ہٹالے جاؤ اسے! تمہیں مدد یا بھی نہیں جرتا؟

وکیل : ارے، تو یہ ہٹھ کہاں اٹھا لایا؟ وہ ہٹھ کہاں ہے، جو نصیر الدین حیدر کے پینے کا تھا؟ وہ گنگا جمنی گؤگولی کہاں ہے، جو ہمارے سالے نے بھیجی تھی۔
 سلاربخش : وہ حضور کے بہنوئی لے گئے۔

وکیل : تو آخر، چچوان اور چاندی کا ہٹھ کیوں نہیں نکالتے؟ یہ بھدے سل ہٹھ اٹھا لائے وہاں سے۔

سلاربخش : خداوند، وہ سب تو بند ہیں۔
 جوگن : آخر یہ سب سامان بند کہاں ہے؟ ذریٰ سا تو مکان آپ کا، مرغی کے ٹاپے کے برابر۔ وہ کن کوشوں میں بند ہے سب کا سب؟

اتنے میں ایک مقدے والا آیا۔ ایک ہاتھ میں جھازو، دوسرے میں پنچہ۔ آتے ہی جھازوں کو نے میں کھڑی کر دی اور پنچہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ وکیل صاحب سر سے چیر تک پھونک گئے۔ پوچھا۔ تم کون ہو؟ اس نے کہا۔ ہم بھٹی ہیں صاحب! جوگن مسکرائی۔ وکیل صاحب نے سلاربخش کی طرف دیکھا۔ سلاربخش سر کھجلانے لگے۔

وکیل : کیا چاہتا ہے؟
 بھٹی : حضور، میری مٹی کا ایک بانس کوئی نکال لے گیا۔ حضور کو وکیل کرنے آیا ہوں۔ غلام ہوں خداوند۔

وکیل : کوئی ہے نکال دو اس پاجی کو۔
 سلاربخش : خداوند، امیروں کا مقدمہ تو آپ لیں، اور غریبوں کا کون لے؟ وکیل تو درجی کی سوئی ہے، کبھی ریشم میں، کبھی لٹھے میں!

وکیل: غریبوں کا مقدمہ غریب وکیل لے۔

سلار بخش: اب تو حضور اس کی فریاد سن ہی لیں۔ اچھا مہتر، بتاؤ کیا دو گے؟

مہتر: ہمارے پاس تو دو مٹو سائی ہیں۔

وکیل: (جھلا کر) نکالو، نکالو اس کبخت کو!

وکیل صاحب نے غصے میں مہتر کی جھاڑو اٹھالی اور اس پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ وہ

جھاڑو بچہ چھوڑ کر بھاگا۔

جوگن: اچھا، آپ اب الگ ہی رہے گا۔ جا کر غسل کیجیے۔

وکیل: آج تو بڑی سردی ہے۔

جوگن: اللہ جانتا ہے، غسل کرو، نہیں تو چھوئیں گے نہیں۔

سلار بخش: ہاں، سچ تو کہتی ہیں۔

وکیل: تو چپ رہ۔

جوگن نے سلار بخش کو حکم دیا کہ تم پانی بھرو۔ سلار بخش پانی بھر لائے۔ وکیل صاحب

نے روتے روتے کپڑے اتارے، لنگی باندھی اور بیٹھے۔ جیسے بدن پر پانی پڑا، آپ غل بجا کر

بھاگے۔ سلار بخش چڑے کا ڈول لیے ہوئے پیچھے دوڑا۔ پھر پانی پڑا، پھر روئے۔ جوگن

مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئی۔ مارے کسی طرح آپ کا غسل پورا ہوا۔ تھر تھر کانپ رہے تھے۔

منہ سے بات نہ نکلتی تھی اس پر سلار بخش نے پنکھا تھلنا شروع کیا، تب تو اور بھی تھلائے اور

کس کر اسے دو تین لائیں لگائیں۔ سلارو بھاگ کھڑے ہوئے۔

جوگن: اب یہ دری تو اٹھاواؤ۔

وکیل: کیوں، دری نے کیا قصور کیا؟

سلار بخش: حضور، بھنگی تو اسی پر بیٹھا تھا؟

وکیل: ارے، تو پھر بولا! قسم خدا کی، مارتے مارتے اُدھیر کر رکھ دوں گا۔

جوگن: سلار بخش، یہ چاندنی اٹھا لے جاؤ۔

دری اٹھی، تو قلعی کھل گئی۔ نیچے ایک پٹا پرانہ ٹاٹ پڑا تھا، بابا آدم کے وقت کا۔ وکیل

کٹ گئے۔ جوگن نے کہا۔ لے، اب اس پر کوئی فرش بچھواؤ۔

وکیل: وہ بڑی دری لاؤ، جو چھکڑے پر لد کر آئی تھی۔

سلاربخش : وہ! اس کو تو ایک لوٹا چرا لے گیا۔

جوگن : خدا کی پناہ، چمکڑے پر تولد کر موئی دری آئی، اور ذرا سا لوٹا چرا لے گیا!

وکیل : اچھا، وہ نہ سہی، جاؤ اور جو کچھ ملے اٹھا لاؤ۔

یہ کہہ کر وکیل صاحب تو برآمدے میں چلے گئے اور سلاربخش جا کر اپنا کبیل اور ایک دسترخوان اٹھا لایا۔ وکیل کمرے میں آئے، تو دیکھا کہ دسترخوان بچھا ہوا ہے اور جوگن کھلکھلا کر ہنس رہی ہے۔ سلاربخش ایک کوفری میں چھپ رہا تھا۔ وکیل نے حملہ کر ڈنڈا نکالا اور کوفری میں گھس کر اسے دو تین ڈنڈے لگائے۔ پھر ڈانٹ کر کہا۔ آخر جو تو میرا نمک کھاتا ہے، تو میرا رنگ کیوں پھیکا کرتا ہے؟ میں ایک کہوں، تو دو کہا کر۔ خیر خواہی کے معنی یہ ہیں۔ سکھلا دیا، سمجھا دیا، مگر تو ہندی کی چندی نکالتا ہے۔

سلاربخش : اچھا، حضور جیسا کہتے ہیں، وہی کروں گا۔ اور بھی جو کچھ سمجھانا ہو، سمجھا دیجیے۔ پھر میں نہیں جانتا۔

وکیل : اچھا، ہم جاتے ہیں، تو آکر کہنا کہ قصور معاف کیجیے۔ اور رونا خوب۔
وکیل صاحب ہدایت کر کے چلے گئے اور جوگن سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں سلاربخش روتا ہوا آیا۔ جوگن دھک سے رہ گئی۔ سلار تھوڑی دیر تک خوب روئے، پھر وکیل کے قدموں پر گر کر کہا۔ حضور، میرا قصور معاف کریں۔
وکیل : ابے، تو کوئی اس طرح روتا ہے۔

جوگن : میں تو سمجھی کہ آپ کے عزیزوں میں سے کوئی چل بسا۔
اتنے میں وکیل صاحب کے نام ایک خط آیا۔ جوگن نے پوچھا۔ کس کا خط ہے؟
وکیل : صاحب کے پاس سے آیا ہے۔
جوگن : کون صاحب؟ کوئی انگریز ہیں؟
وکیل : ہاں، ضلع کے حاکم ہیں۔ ہم سے یارانہ ہے۔
سلاربخش : آپ سے نا! اور ان سے بھی تو یارانہ ہے، جنھوں نے جرمانہ ٹھونک دیا تھا؟
وکیل : صاحب نے ہمیں بلایا ہے۔

جوگن : تو شاید آج تمھاری دعوت وہیں دیں؟ تبھی آج کھانا وانہ نہیں پک رہا ہے۔
دوپہر ہونے کو آئی، اور ابھی تک چولہا نہیں جلا۔

وکیل : ارے سلا رو، کھانا کیوں نہیں پکاتا؟

سلا ربخش : بازار بند ہے۔

جوگن : آگ لگے تیرے مسخرے پن کو! یہاں آنتیں کوں کاں کر رہی ہیں، اور تجھے دل لگی سوچتی ہے!

وکیل صاحب نے باہر جا کر سلا رو سے کہا— بچے سے آٹا کیوں نہیں لاتا؟

سلا ربخش : حضور، کوئی دے بھی! کوئی دس برس سے تو حساب نہیں ہوا۔ بازار میں کھانا ہوں، تو چاروں طرف سے تقاضے ہونے لگتے ہیں۔

وکیل : اے، اس وقت تو کسی بہانے سے مانگ لا۔ آخر کبھی نہ کبھی مقدمے آویں گے ہی۔ ہمیشہ یوں ہی سٹانا تھوڑے ہی رہے گا؟

خیر، سلا ربخش نے کھانا پکایا، اور کوئی چار بجے آٹھ موٹی موٹی روٹیاں، ایک پیالی میں ماش کی دال اور دوسری میں آدھ پاؤ گوشت رکھ کر لایا!

وکیل : اے، آج پاؤ نہیں پکا؟

سلا ربخش : حضور، بلی کھا گئی۔

وکیل : اور گوشت بھی ایک ہی طرح کا پکایا؟

سلا ربخش : حضور، میں پانی بھرنے چلا گیا، تو کتنا چکھ گیا۔

جوگن : یہاں کی بلی اور کتنے بڑے لاگو ہیں!

سلا ربخش : کچھ نہ پوچھیے۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔

سلا ربخش : کون صاحب ہیں؟

وکیل : دیکھو، ماموں صاحب نہ ہوں۔ کہہ دینا، گھر میں نہیں ہیں۔

سلا ربخش : حضور، وہ ہے مومن تیلی۔

وکیل : کہہ دو ہم تیل ویل نہ لیں گے۔ رات کو ہمارے یہاں موم جتیاں جلتی ہیں، اور

کھانے میں تیل آتا نہیں۔ پھر تیلی کا یہاں کیا کام؟

سلا ربخش : مقدمہ لایا ہے حضور!

تیلی میٹے گھیلے کپڑے پہنے، ہاتھ میں ایک کٹی لیے آکر بیٹھ گیا۔

وکیل: کیا مانگتا ہے؟

تیلی: ایک آدمی نے ہم پر نالش کر دی ہے حضور! اب آپ ہی بچادیں تو بچ سکتا ہوں۔

وکیل: محنتاً نہ کیا دو گے؟

سلا رہنمائی: ہائے ہائے، پہلے اس کی فریاد تو سنو کہ وہ کہتا کیا ہے! بس، مردہ دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں، آپ کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ بتاؤ بھی، کیا دو گے؟
تیلی: ایک پکی تیل۔

وکیل: نکال دو اسے، نکال دو!

تیلی: اچھا صاحب، تین پکی لے لو۔

سلا رہنمائی: اچھا، آدمی مکی تیل دے دو۔ بس، اتنا کہنا مانو۔

وکیل: جی ہاں، کیوں شرح بگاڑتے ہو؟ تم جاؤ جی!

سلا رہنمائی: پہلے دیکھیے تو! راضی بھی ہوتا ہے؟

تیلی آدمی کئی دینے پر راضی نہ ہوا اور چلا گیا۔ تھوڑ دیر کے بعد سلا رہنمائی دبی زبان سے کہا۔ حضور، شام کو کیا کچے گا؟

وکیل: ابے، شام تو ہو گئی اب کیا کچے گا؟

سلا رہنمائی: خداوند، اس طرح تو میں ٹیس ہو جاؤں گا۔ آپ نہ کھائیں، ہمارے واسطے تو بتلا دیجیے۔

وکیل: اپنے واسطے چھپھڑے لے آ جا کر۔

سلا رہنمائی: (آہستہ سے) دے بھی نیچے پاوے جو آپ سے۔

جوگن کو ہنسی آگئی۔ وکیل نے کہا۔ میری بات پر ہنستی ہوگی؟ میں ایسی ہی کہتا ہوں۔

اس پر جوگن کو اور بھی ہنسی آئی۔

وکیل: اللہ ری شوخی۔

خوب رو جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی،

ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی۔

رات کو جوگن نے اپنے پاس سے پیسے دے کر بازار سے کھانا منگوایا، اور کھا کر سوئی۔

صبح کو وکیل صاحب کی نیند کھلی، تو دیکھا، جو گن کا کہیں پہنچے نہیں۔ گھر بھر میں چھان مارا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بولے — سلا رو، غضب ہو گیا! ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

سلا ربخش: پھوٹ گئی خداوند، آپ کی قسمت پھوٹ گئی۔

وکیل: پھر اب؟

سلا ربخش: کیا عرض کروں حضور!

وکیل: گھر بھر میں تو دیکھ چکے نہ تم؟

سلا ربخش: ہاں، اور تو سب دیکھ چکا، اب ایک پرنا لہ باقی ہے، وہاں آپ جھانک

لیں۔

(63)

زمانہ بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ وہی اللہ رکھی جو ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی، جو جو گن بنی ہوئی ایک گاؤں میں پڑی تھی، آج رتیا بیگم بنی ہوئی سرکس کے تماشے میں بڑے ٹھاٹ سے بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ سب روپے کا کھیل ہے۔

رتیا بیگم: کیوں مہری، روشنی کا ہے کی ہے؟ نہ لیپ، نہ جھاڑ، نہ کنول اور سارا خیرہ جگمگا

رہا ہے۔

مہری: حضور، عقل کام نہیں کرتی، جادو کا کھیل ہے۔ بس، دو انگارے جلا دیے اور دنیا

بھر جگمگا لگی۔

رتیا بیگم: داروغہ کہاں ہیں؟ کسی سے پوچھیں تو کہ روشنی کا ہے کی ہے؟

مہری: حضور، وہ تو چلے گئے۔

رتیا بیگم: کیا باجا ہے واہ، واہ!

مہری: حضور، گورے بجا رہے ہیں۔

رتیا بیگم: ذرا گھوڑوں کو تو دیکھو، ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔ گھوڑے کیا، دیو

ہیں۔ کتنا چوڑا ماتھا ہے اور ذرا سی تھنسی! کتنی تھوڑی سی زمین میں چکر دیتے ہیں! واللہ، عقل

دنگ ہے!

مہری: بیگم صاحب، کمال ہے۔

رثیا بیگم: ان میسوں کا جگر تو دیکھو، اچھے اچھے شہسواروں کو مات کرتی ہیں۔

مہری: سچ ہے حضور، یہ سب جادو کے کھیل ہیں۔

رثیا بیگم: مگر جادوگر بھی پکے ہیں۔

مہری: ایسے جادوگروں سے خدا سمجھے۔

اس پر ایک عورت جو تماشا دیکھنے آئی تھی، چوہ کر بولی۔ اے واہ، یہ بے چارے تو ہم سب کا دل خوش کریں، اور آپ کو سیں! آخر ان کا قصور کیا ہے، یہی نہ کہ تماشا دکھاتے ہیں؟

مہری: یہ تماشے والے تمہارے کون ہیں؟

عورت: تمہارے کوئی ہوں گے۔

مہری: پھر تم چٹکیں تو کیوں چٹکیں؟

عورت: بہن، کسی کو پیٹہ پیچھے برا نہ کہنا چاہیے۔

مہری: اے، تو تم سچ میں بولنے والی کون ہو؟

عورت: تم سب تو جیسے لڑنے آئی ہو۔ بات کی، اور منہ نوچ لیا۔

رثیا بیگم کے ساتھ مہری کے سوا اور بھی کئی لوٹیاں تھیں، ان میں ایک کا نام عباسی تھا۔

وہ نہایت حسین اور بلا کی شوخ تھی۔ ان سبھوں نے مل کر اس عورت کو بیانا شروع کیا۔

مہری: گاؤں کی معلوم ہوتی ہے!

عباسی: گنوارن تو ہے ہی، یہ بھی کہیں چھپا رہتا ہے؟

رثیا بیگم: اچھا، اب بس، اپنی زبان بند کرو۔ اتنی میسیں بیٹھیں ہیں، کسی کی زبان تک

نہ ملی۔ اور ہم آپس میں کئی مرتی ہیں۔

اتنے سامنے ایک زیر لایا گیا۔ رثیا بیگم نے کہا۔ یہ کون جانور ہے؟ کسی ملک کا

گدھا تو نہیں ہے؟ چوں تک نہیں کرتا۔ کان دبائے دوڑا جاتا ہے۔

عباسی: حضور، بالکل بس میں کر لیا۔

مہری: ان فرنگیوں کی جو بات ہے، انوکھی۔ ذرا اس میم کو تو دیکھیے، اچھے اچھے شہسواروں

کے کان کاٹے۔

سوار لیڈی نے گھوڑے پر ایسے ایسے کرتب دیکھائے کہ چاروں طرف تالیاں پڑنے

لگیں۔ شیتا بیگم نے خوب تالیاں بجا ئیں۔ زنانے درجے کے پاس ہی دوسرے درجے میں کچھ اور لوگ بیٹھے تھے۔ بیگم صاحب کو تالیاں بجاتے سنا تو ایک رنگیلے شیخ جی بولے۔
کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔

مرزا صاحب: رگوں میں شوقی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

ہنذت جی: شوقین معلوم ہوتی ہیں۔

شیخ جی: واللہ، اب تماشا دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

مرزا صاحب: ایک صورت نظر آئی۔

ہنذت جی: تم بڑے خوش نصیب ہو۔

یہ لوگ تو یوں چپک رہے تھے۔ ادھر سرکس میں ایک بڑا کٹ گھرا لایا گیا، جس میں تین شیر بند تھے۔ شیروں کے آتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ عباسی بولی۔ دیکھیے حضور، وہ شیر جو چچ والے کٹ گھرے میں بند ہے، وہی سب سے بڑا ہے۔

مہری: اور غصے در بھی سب سے زیادہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آدی کا سر نکل جائے گا۔

شیتا بیگم: کہیں کٹ گھرا توڑ کر نکل بھاگے تو سب کو کھا جائے۔

مہری: نہیں حضور، سدھے ہوئے ہیں۔ دیکھیے، وہ آدی ایک شیر کا کان پکڑ کر کس طور پر اسے اٹھاتا بیٹھاتا ہے۔ دیکھیے دیکھیے حضور، اس آدی نے ایک شیر کو لٹا دیا اور کس طرح پاؤں سے اسے روند رہا ہے۔

عباسی: شیر کیا ہے، بالکل بلی ہے۔ دیکھیے، اب شیر سے اس آدی کی گشتی ہو رہی ہے۔

کبھی شیر آدی کو پچھاڑتا ہے، کبھی آدی شیر کے سینے پر سوار ہوتا ہے۔

یہ تماشا کوئی آدھ گھنٹہ تک ہوتا رہا۔ اس کے بعد چچ میں ایک بڑی میز بچائی گئی اور اس پر بڑے بڑے گوشت کے کٹڑے رکھے گئے۔ ایک آدی نے سج کو ایک کٹڑے میں چمید دیا اور گوشت کو کٹ گھرے میں ڈالا۔ گوشت کا پہنچنا تھا کہ شیر اس کے اذپر ایسا لپکا جیسے کسی زندہ جانور پر شکار کرنے کے لیے لپکتا ہے۔ گوشت کو منہ میں دبا کر بار بار ڈکارتا تھا اور زمین پر پٹک دیتا تھا۔ جب ڈکارتا، مکان گونج جاتا اور سننے والوں کے روتھنے کھڑے ہو جاتے۔ بیگم نے گھبرا کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے، شیر کٹ گھرے سے نکل بھاگا ہے۔ کہاں ہیں داروغہ جی ذرا ان کو بلانا تو!

بیگم صاحب تو یہاں ڈر کے مارے چی رہی تھیں اور ان سے تھوڑی ہی دور پر وکیل صاحب اور مہاں سلا رنچس میں ٹھہرا رہی تھی۔

وکیل: رک کیوں گیا ہے؟ باہر کیوں نہیں چلا؟

سلا رنچس: تو آپ ہی آگے بڑھ جائیے نا!

وکیل: تو اکیلے ہم کیسے جا سکتے ہیں؟

سلا رنچس: یہ کیوں؟ کیا بھڑیا کھا جائے گا؟ یا پیٹھ پر لا کر اٹھا لے جائے گا، ایسے دبلے پتلے بھی تو آپ نہیں ہیں۔ بیٹھے تو کانکھ دے۔

وکیل: بغیر نوکر کے جانا ہماری شان کے خلاف ہے۔

سلا رنچس: تو آپ کا نوکر کون ہے؟ ہم تو اس وقت مالک معلوم ہوتے ہیں۔

وکیل: اچھا، باہر نکل کر اس کا جواب دوں گا، دیکھ تو سہی!

سلا رنچس: اجی، جاؤ بھی، جب یہاں ہی جواب نہیں دیا باہر کیا بناؤ گے؟ اب چپکے ہو رہے۔ ناحق بن ناحق کو بات بڑھے گی۔

وکیل: بس، ہم انھیں باتوں سے تو خوش ہوتے ہیں۔

سلا رنچس: خدا سلامت رکھے حضور کو۔ آپ کی بدولت ہم بھی دو کمال ہنس بول لیتے

ہیں۔

وکیل: یار، کسی طرح اس رٹیا بیگم کا پتہ تو لگاؤ کہ یہ کون ہیں۔ ہتھو جان تو چمکا دے کر چلی گئیں، شاید یہی نکاح پر راضی ہو جائیں۔

سلا رنچس: ضرور! اور خوبصورت بھی آپ ایسے ہی ہیں۔

رٹیا بیگم چپکے چپکے یہ باتیں سنتی اور دل ہی دل میں ہنستی جاتی تھی۔ اتنے میں ایک خوبصورت جوان نظر پڑا۔ ہاتھ پاؤں سانچے کے ڈھلے ہوئے، مسیں بھیکتی ہوئیں، میاں آزاد سے صورت بالکل ملتی تھی۔ رٹیا بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ عبتاسی سے کہا۔ ذری، داروغہ صاحب بلوآؤ۔ عبتاسی نے باہر آکر دیکھا تو داروغہ صاحب ہٹ پٹی رہے ہیں۔ کہا۔ چلیے، نا دری حکم ہے کہ ابھی ابھی بلا لاؤ۔

داروغہ: اچھا اچھا۔ چلتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے! ذرا کھٹ تو پی لینے دو۔

عبتاسی: اچھا، نہ چلیے، پھر ہم کو اُلاہنا نہ دیجیے گا! ہم جتائے جاتے ہیں۔

داروغہ: (ھٹ پٹک کر) چلو صاحب، چلو۔ اچھی نوکری ہے، دن رات غلامی کرو تب بھی جین نہیں۔ یہ مہینہ ختم ہو لے تو ہم اپنے گھر کی راہ لیں۔

داروغہ صاحب جب ٹپٹا بیگم کے پاس پہنچے تو انہوں نے آہستہ سے کہا۔ وہ جو کرسی پر ایک جوان کا لے کپڑے پہن کر بیٹھا ہوا ہے، اس کا نام جا کر دریافت کرو۔ مگر آدمیت سے پوچھنا۔

داروغہ: یا خدا! حضور بڑی کڑی نوکری بولیں غلام کو یہ سب باتیں یاد کیونکر رہیں گی جیسا حکم ہو۔

عباسی: اے، تو باتیں کون ایسی لہی چوڑی ہیں جو یاد نہ رہیں گی؟
داروغہ: ارے بھائی، ہم میں تم میں فرق بھی تو ہے! تم ابھی سترہ اٹھارہ برس کی ہو اور یہاں بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ خیر، حضور، جاتا ہوں۔

داروغہ صاحب نے جوان کے پاس جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان کا نام میاں آزاد ہے۔ بیگم صاحب نے آزاد کا نام سنا تو مارے خوشی کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے داروغہ کو حکم دیا جا کر پوچھ آؤ اللہ رکھی کو بھی آپ جانتے ہیں آج نمک کا حق ادا کرو۔ کسی ترکیب سے ان کو مکان تک لاؤ۔

داروغہ صاحب سمجھ گئے کہ اس جوان پر بی بی کا دل آگیا۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ اگر اللہ رکھی کا ذکر چھیڑا اور یہ بگڑ گئے تو بڑی کڑی ہوگی۔ اور اگر نہ جاؤں تو یہ نکال باہر کریں گی۔ چلے، پر ہر قدم پر سوچتے جاتے تھے کہ نہ جانے کیا آفت آئے۔ جا کر جوان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔ ایک عرض ہے حضور، مگر شرط یہ ہے کہ آپ خفا نہ ہوں۔ سوال کے جواب میں صرف 'ہاں' یا 'نہیں' کہہ دیں۔

جوان: بہت خوب! 'ہاں' کہوں گا یا 'نہیں'۔
داروغہ: حضور کا غلام ہوں۔

جوان: اجی، آپ اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں، آپ کو جو کچھ کہنا ہو، کہیے۔ میں برا نہ مانوں گا۔

داروغہ: ایک بیگم صاحب پوچھتی ہیں کہ حضور اللہ رکھی کے نام سے واقف ہیں؟
جوان: بس، اتنی ہی بات! اللہ رکھی کو میں خوب جانتا ہوں۔ مگر یہ کس نے پوچھا ہے؟

دارودہ: کل صبح کو آپ جہاں کہیں، وہاں آ جاؤں۔ سب ہاتھیں ملے ہو جائیں گی۔
 جوان: حضرت، کل تک کی خبر نہ لیجیے، ورنہ آج رات کو مجھے نیند نہ آئے گی۔
 دارودہ نے جا کر بیگم صاحب سے کہا۔ حضور، وہ تو اسی وقت آنے کہتے ہیں۔ کیا کہہ دوں؟ بیگم پولیس۔ کہہ دو، ضرور ساتھ چلیں۔

اسی جگہ ایک نواب صاحب اپنے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ نواب نے فرمایا۔ کیوں میاں نقو، یہ کیا بات لگائی ہے کہ جس جانور کو دیکھو، بس میں آگیا۔ عقل کام نہیں کرتی۔

نقو: خداوند، بس بات ساری یہ ہے کہ یہ لوگ عقل کے پتلے ہیں۔ دنیا کے پردے پر کوئی ایسی چیز نہیں جس کا علم ان کے یہاں نہ ہو۔ چڑیا کا علم ان کے یہاں، بل چلانے کا علم ان کے یہاں، گانے بجانے کا علم ان کے یہاں۔ کل جو بارہ دری کی طرف سے ہو کر گزرا تو دیکھا، بہت سے آدمی جمع ہیں۔ اتنے میں انگریزی باجا بجنے لگا تو حضور، جو گورے باجا بجاتے تھے، ان کے سامنے ایک ایک کتاب کھلی ہوئی تھی۔ مگر بس، دھونو، دھونو! اس کے سوا کوئی بول ہی سننے میں نہیں آیا۔

مرزا: حضور کے سوال کا جواب تو دو! حضور پوچھتے ہیں کہ جانوروں کو بس میں کیوں لائے؟

نقو: کہا نہ کہ ان کے یہاں ہر بات کا علم ہے۔ علم کے زور سے دیکھا ہوگا کہ کون جانور کس پر عاشق ہے۔ بس، وہی چیز مینا کر لی۔

نواب: تسلی نہیں ہوئی۔ کوئی خاص وجہ ضرور ہے۔
 نقو: حضور، ہندستان کا نٹ بھی وہ کام کرتا ہے جو کسی اور سے نہ ہو سکے۔ بانس گاڑ دیا، اوپر چڑھ گیا اور انگوٹھے کے زور سے کھڑا ہو گیا۔

مرزا: حضور، غلام نے پتہ لگا لیا۔ جو کبھی جھوٹ نکلے تو ناک کنوا ڈالوں! بس، ہم سمجھ گئے۔ حضور آج تک کوئی بڑے سے بڑا پہلوان بھی شیر سے نہیں لڑ سکا۔ مگر اس جوان کی ہمت کو دیکھیے کہ اکیلا تین تین شیروں سے لڑتا رہا۔ یہ آدمی کا کام نہیں ہے، اور اگر ہے تو کوئی آدمی کر دکھائے! حضور کے سر کی قسم، یہ جادو کا کھیل ہے۔ واللہ، جو اس میں فرق ہو تو ناک کنوا ڈالوں۔

نواب: سبحان اللہ، بس یہی بات ہے۔

نحو: ہاں، یہ مانا۔ یہاں پر ہم بھی قائل ہو گئے۔ انصاف شرط ہے۔

نواب: اور نہیں تو کیا، ذرا سا آدمی، اور آدھے درجن شیروں سے کشتی لڑے! ایسا ہو

سکتا ہے بھلا! شیر لاکھ کمزور ہو جائے، پھر شیر ہے۔ یہ سب جادو کے زور سے شیر، رینگھ اور سب جانور دکھا دیتے ہیں۔ اصل میں شیر دیر کچھ بھی نہیں ہیں۔ سب جادو ہی جادو ہے۔

نحو: حضور، ہر طرح سے روپیہ کھینچتے ہیں۔ حضور کے سر کی قسم۔ ہندوستانی اس سے اچھے شیر بنا کر دکھا دیں۔ کیا یہاں جادوگری ہے ہی نہیں؟ مگر قدر تو کوئی کرتا نہیں۔ حضور ذرا غور کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ شیر لڑتے تو تھے، مگر چتلیاں نہیں پھرتی تھیں۔ بس، یہی معلوم ہو گیا کہ جادو کا کھیل ہے۔

زبر خاں: واللہ، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ مہاں نحو میرے منہ سے بات چھین لے گئے۔

نحو: بھلا شیروں کو دیکھ کر کسی کو بھی ڈر لگتا تھا؟ ایمان سے کہیے گا۔

زبر خاں: مگر جب جادو کا کھیل ہے تو شیر سے لڑنے کا کمال ہی کیا ہے؟

نواب: اور سنے، ان کے نزدیک کچھ کمال ہی نہیں! آپ تو ویسے شیر بنا دیجیے! کیا دل لگی بازی ہے؟ کہنے لگے، اس میں کمال ہی کیا ہے۔

مرزا: حضور، یہ ایسے ہی بے پرک اڑایا کرتے ہیں۔

نحو: جادو کے شیروں سے نہ لڑیں تو کیا بچ بچ کے شیروں سے لڑیں؟ واہ ری آپ کی عقل!

نواب: کہیے تو اس سے، جو سمجھدار ہو۔ بے سمجھ سے کہنا فضول ہے۔

نحو: حضور، کمال یہ ہے کہ ہزاروں آدمی یہاں بیٹھے ہیں، مگر ایک کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے۔

نواب: سمجھتے تو ہی سمجھتے!

مرزا: حضور کی کیا بات ہے۔ واللہ، خوب سمجھتے!

اتنے میں ایک کھلاڑی نے ایک رینگھ کو اپنے اوپر لادا اور دوسرے کی پیٹھ پر ایک پاؤں سے سوار ہو کر اسے دوڑانے لگا۔ لوگ دنگ ہو گئے۔ شینا بیگم نے اس آدمی کو پچاس روپے

انعام دیے۔

وکیل صاحب نے یہ کیفیت دیکھی تو رثیا بیگم کا پتہ لگانے کے لیے بے قرار ہو گئے۔
سلاربخش سے کہا۔ بھیا سلاو، اس بیگم کا پتہ لگاؤ۔ کوئی بڑی امیر کبیر معلوم ہوتی ہیں۔
سلاربخش: ہمیں تو یہ افسوس ہے کہ تم بھالو کیوں نہ ہوئے۔ بس، تم اسی لائق ہو کہ
رسوں سے جکڑ کر دوڑائے۔

وکیل: اچھا بچہ، کیا گھر نہ چلو گے؟
سلاربخش: چلیں گے کیوں نہیں، کیا تمہارا کچھ ڈر پڑا ہے؟
وکیل: مالک سے ایسی باتیں کرتا ہے؟ مگر یار، رثیا بیگم کا پتہ لگاؤ۔
میاں آزاد نواب اور وکیل دونوں کی باتیں سن سن کر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔
اتنے میں نواب صاحب نے آزاد سے پوچھا۔ کیوں جناب، یہ سب نظر بندی ہے یا کچھ
اور؟

آزاد: حضرت، یہ سب طلسمات کا کھیل ہے۔ عقل کام نہیں کرتی۔
نواب: سنا ہے، پچاس کوس کے ادھر کا آدمی اگر آئے تو اس پر جادو کا خاک اثر نہ ہو۔
آزاد: مگر ان کا جادو بڑا کڑا جادو ہے۔ دس منزل کا آدمی بھی آئے تو چمکے کھا جائے۔
نواب: آپ کے نزدیک وہ کون انگریز بیٹھا تھا؟
آزاد: جناب، انگریز اور ہندوستانی کہیں نہیں ہیں۔ سب جادو کا کھیل ہے۔
نواب: ان سے جادو سیکھنا چاہیے۔
آزاد: ضرور سیکھیے۔ ہزار کام چھوڑ کر۔

جب تماشہ ختم ہو گیا تو رثیا بیگم نے آزاد کو بہت تلاش کرایا، مگر کہیں ان کا پتہ نہ چلا۔
وہ پہلے ہی ایک انگریز کے ساتھ چل دیے تھے۔ بیگم نے داروغہ جی کو خوب ڈانٹا اور کہا۔ اگر
تم کل انھیں نہ لاؤ گے تو تمہاری کھال کھنوا کر اس میں بھس بھروں گی!

(64)

رثیا بیگم میاں آزاد کی جدائی میں بہت دیر تک رویا کیں، کبھی داروغہ پر جھلاتیں، کبھی
عباسی پر بگڑیں، پھر سوچتیں کہ اللہ رکھی کے نام سے ناحق بلوایا، بڑی بھول ہو گئی، کبھی خیال

کرتیں کہ وعدے کے سچے ہیں، کل شام کو ضرور آئیں گے، ہزار کام چھوڑ کے آئیں گے۔
رات بھیک گئی تھی، مہریاں سو رہی تھیں، محل دار اونگھتا تھا، شہر بھر میں سناٹا تھا، مگر شینا بیگم کی
نیند میاں آزاد نے حرام کر دی تھی۔

بھرے آتے ہیں آنسو آنکھ میں اے یار کیا باعث
نکلتے ہیں صدف سے گوہر شہوار کیا باعث

ساری رات پریشانی میں گزری، دل بے قرار تھا، کسی پہلو چین نہیں آتا تھا، سوچتیں کہ
اگر میاں آزاد وعدے پر نہ آئے تو کہاں ڈھونڈھوں گی، بوڑھے داروغہ پر دل ہی دل میں
جھلاتی تھیں کہ بچہ تک نہ پوچھا۔ مگر آزاد تو پکا وعدہ کر گئے تھے، لوٹ کر ضرور ملیں گے، پھر
ایسے بے درد کیسے ہو گئے کہ ہمارا نام بھی سنا اور پرواہ نہ کی۔ یہ سوچتے سوچتے انھوں نے یہ
غزل گانی شروع کی۔

نہ دل کو چین مر کر بھی ہوائے یار میں آئے،
تڑپ کر خلد سے پھر کوچہ دلدار میں آئے۔
عجب راحت ملی، کچھ دین دنیا کی نہیں پرواہ،
جنوں کے سایہ میں پہنچے بڑی سرکار میں آئے۔
عوض جب ایک دل کے لاکھ دل ہوں میرے پہلو میں،
تڑپنے کا مزہ تب فرقتِ دلدار میں آئے۔
نہیں پرواہ، ہمارا سر جو کٹ جائے تو کٹ جائے،
تھکے بازو نہ قاتل کا نہ بل تلوار میں آئے۔
دمِ آخر وہ پوچھیں اشکِ صدف اپنے دامن سے،
الہی رحم اتنا تو مزاجِ یار میں آئے۔
شینا بیگم کو ساری رات جاگتے گزری۔ سویرے داروغہ نے آکر سلام کیا۔

بیگم: آج کا اقرار ہے نہ؟

داروغہ: ہاں حضور، خدا مجھے سرخرو کرے۔ اللہ رکھی کا نام سن کر تو وہ بے خود ہو گئے۔

کیا عرض کروں حضور!

بیگم: ابھی جاییے اور چاروں طرف تلاش کیجیے۔

داروغہ: حضور، ذرا سویرا تو ہو لے، دو چار آدمیوں سے ملوں، پوچھوں، وہ چھوں، تب تو مطلب نکلے۔ یوں انکڑ لیس کس محلے میں جاؤں اور کس سے پوچھوں؟

عباسی: حضور، مجھے حکم ہو تو میں بھی تلاش کروں۔ مگر بھاری سا جوڑا لوں گی! بیگم: جوڑا؟ اللہ جانتا ہے، سر سے پاں تک زیور سے لدی ہوگی۔

بی عباسی بن ٹھن کر چلیں اور ادھر داروغہ جی میاں نے پر لد کر روانہ ہوئے۔ عباسی تو خوش خوش جاتی تھی اور یہ منہ بنائے سوچ رہے تھے کہ جاؤں تو کہاں جاؤں؟ عباسی لہنگا پھڑکاتی ہوئے چلی جاتی تھی کہ راہ میں ایک نواب صاحب کی ایک مہری ملی۔ دونوں میں مکمل مکمل کر باتیں ہونے لگیں۔

عباسی: کہو بہن، خوش تو ہو؟

بیو: ہاں، بہن،، اللہ کا فضل ہے۔ کہاں چلیں؟

عباسی: کچھ نہ پوچھو بہن، ایک صاحب کا پتہ پوچھتی پھرتی ہوں۔

بیو: کون ہیں، میں بھی سنوں۔

عباسی: یہ تو نہیں جانتی، پر نام ہے میاں آزاد،۔ خاصے گھبرو جوان ہیں۔

بیو: ارے، انھیں میں خوب جانتی ہوں۔ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ مگر ہیں بڑے

نٹ کھٹ، سامنے ہی تو رہتے ہیں۔ کہیں رکبھی تو نہیں ہو؟ ہنے تو جوان ایسا ہے۔

عباسی: اے، ہنو بھی! یہ دل لگی ہمیں نہیں بھاتی۔

بیو: لو، یہ مکان آ گیا۔ بس، اسی میں رہتے ہیں! 'جوڑو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناطہ'

بیو نے تو اپنی راہ گئی، عباسی ایک گلی میں ہو کر ایک بڑھیا کے مکان پر پہنچی۔ بڑھیا نے

پوچھا۔ اب کس سرکار میں ہو جی؟

عباسی: رثیا بیگم کے یہاں۔

بڑھیا: اور ان کے میاں کا کیا نام ہے؟

عباسی: جو تجویز کرو۔

بڑھیا: تو کنواری یا بیوہ! کوئی جان پہچان ملاقاتی ہے یا کوئی نہیں ہے؟

عباسی: ایک بوڑھی سی عورت کبھی کبھی آیا کرتی ہیں۔ اور تو ہم نے کسی کو آتے جاتے

نہیں دیکھا۔

بڑھیا: کوئی دیوڑا بھی آتا جاتا ہے؟
 عباسی: کیا مجال! چڑیا تک تو پر نہیں مار سکتی؟ اتنے دنوں میں صرف کل تماشہ دیکھنے گئی تھیں۔

بڑھیا: اے لو، اور سنو! تماشہ دیکھنے جاتی ہیں تو پھر کہتی ہو کہ ایسی ویسی نہیں ہیں؟ اچھا، ہم ٹوہ لگا لیں گی۔

عباسی: انھوں نے قسم کھائی ہے کہ شادی ہی نہ کروں گی، اور اگر کروں گی بھی تو ایک خوبصورت جوان کے ساتھ جو آپ کا پڑوسی ہے۔ میاں آزاد نام ہے۔

بڑھیا: ارے، یہ کتنی بڑی بات ہے! گو میں وہاں بہت کم آتی جاتی ہوں، پر وہ مجھے خوب جانتے ہیں۔ بالکل گھر کا ساداسطہ ہے۔ تم بیٹھو، میں ابھی آدمی بھیجتی ہوں۔

یہ کہہ کر بڑھیا نے ایک عورت کو بلا کر کہا۔ چھوٹے مرزا کے پاس جاؤ اور کہو کہ آپ کو بلاتیں ہیں۔ یا تو ہم کو بلائیے یا خود آئیے۔

اس عورت کا نام مبارک قدم تھا۔ اس نے جا کر مرزا آزاد کو بڑھیا کا پیغام سنایا۔ حضور، وہ خبر سناؤں کہ آپ بھی پھڑک جائیں۔ مگر انعام دینے کا وعدہ کیجیے۔

آزاد: آزاد نہیں، اگر مالا مال نہ کر دیں۔

مبارک: اچھل پڑیے گا۔

آزاد: کیا کوئی رقم ملے والی ہے؟

مبارک: اجی، وہ رقم ملے کہ نواب ہو جاؤ۔ ایک بیگم صلبہ نے پیغام بھیجا ہے۔ بس،

آپ میری بڑھیا کے مکان تک چلے چلیے۔

آزاد: ان کو یہیں نہ بلا لاؤ۔

مبارک: میں بیٹھی ہوں، آپ بلوا لیجیے۔

تھوڑی دیر میں بڑھیا ایک ڈولی پر سوار آ پہنچی اور بولی۔ کیا ارادے ہیں؟ کب چلیے

کا؟

آزاد: پہلے کچھ باتیں تو بتاؤ۔ حسین ہے نا؟

بڑھیا: اجی، حسن تو وہ ہے کہ چاند بھی مات ہو جائے، اور دولت کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں،

تو کب چلے کا ارادہ ہے؟

آزاد: پہلے خوب پکا پوڑھا کر لو، تو مجھے لے چلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں چل کر جبینہنا پڑے۔

(65)

ہمارے میاں آزاد اور اس مرزا آزاد میں نام کے سوا اور کوئی بات نہیں ملتی تھی۔ وہ جتنے ہی دلیر، ایماندار، سچ آدمی تھے، اتنے ہی یہ فریبی، جالے اور بدنیت تھے۔ بہت مالدار تو تھے نہیں، مگر سوا سو روپے وثیقہ کے ملتے تھے۔ اکیلا دم، نہ کوئی عزیز، نہ رشتہ دار، پلے برے کے بد معاش، چوروں کے پیر، اٹھائی گیری کے لنگوٹے یار، ڈاکوؤں کے دوست، گرہ کنوں کے ساتھی۔ کسی کی جان لینا ان کے بائیس ہاتھ کا کرتب تھا۔ جس سے دوستی کی، اسی کی گردن کاٹی۔ امیر سے مل جل کر رہنا اور اس کی گھڑی بھڑکی سہنا، ان کا خاص پیشہ تھا۔ لیکن جس کے یہاں دخل پایا اس کو یا تو لنگوٹی بندھوا دی یا کچھ لے دے کے الگ ہوئے۔ شہر کے مہاجن اور ساہوکار ان سے تھر تھر کانپتے رہتے۔ جس مہاجن سے جو مانگا، اس نے حاضر کیا اور جو انکار کیا تو دوسرے روز چوری ہو گئی۔ ان کے مزاج کی عجب کیفیت تھی۔ بچوں میں بچے، بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان۔ کوئی بات ایسی نہیں جس کا انھیں تجربہ نہ ہو۔ ایک سال تک فوج میں بھی نوکری کی تھی۔ وہاں آپ نے ایک دن یہ دل لگی کی کہ رسالے کے بیس گھوڑوں کی اگاڑی پچھاڑی کھول ڈالی۔ گھوڑے ہنہا کر لڑنے لگے۔ سب لوگ پڑے سو رہے تھے۔ گھوڑے جو کھلے، تو سب کے سب چونک پڑے۔ ایک بولا— لینا لینا! چور چور! پکڑ لینا، جانے نہ پائے۔ بڑی مشکل سے چند گھوڑے پکڑے گئے۔ کچھ زخمی ہوئے، کچھ بھاگ گئے۔ اب تحقیقات شروع ہوئی۔ مرزا آزاد بھی سب کے ساتھ ہمدردی کرتے تھے اور اس بد معاش پر بگڑ رہے تھے جس نے گھوڑے چھوڑے تھے۔ افسر سے بولے۔ یہاں شیطان کا کام ہے، خدا کی قسم۔

افسر: اس کی گوشالی کی جائے گی۔

آزاد: وہ اسی لائق ہے۔ مل جائے تو چچا ہی بنا کر چھوڑوں۔

خیر، ایک بار ایک دفتر میں آپ کلرک ہو گئے۔ ایک دن آپ کو دل لگی سو جھی، سب عملوں کے جوتے اٹھا کر دریا میں پھینک دیے۔ سرشتے دار اٹھے، ادھر ادھر جوتا ڈھونڈتے

ہیں، کہیں پتہ ہی نہیں۔ ناظر اٹھے، جوتا ندارد۔ پیش کار کو صاحب نے بلایا، دیکھتے ہیں تو جوتا غائب۔

پیش کار: ارے بھائی، کوئی صاحب جوتا ہی اڑا لے گئے۔

چپراسی: حضور میرا جوتا پہن لیں۔

پیش کار: واہ، اچھا لالہ وشنو دیال، ذرا اپنا بوٹ تواتار دو۔

لال وشنو دیال پڑاری تھے۔ ان کا لکھو توڑ جوتا پہن کر پیش کار صاحب بڑے صاحب کے اجلاس پر گئے۔

صاحب: ویل ویل پیش کار، آج بڑا امیر ہو گیا۔ بہت بڑا قیمتی بوٹ پہنا ہے۔

پیش کار: حضور، کوئی صاحب جوتا اڑا لے گئے۔ دفتر میں کسی کا جوتا نہیں بچا۔

بڑے صاحب تو مسکرا کر چپ ہو گئے، مگر چھوٹے صاحب بڑے دل لگی باز آدی تھے۔

اجلاس سے اٹھ کر دفتر میں گئے تو دیکھتے ہیں کہ قہقہے پر قہقہہ پڑ رہا ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے

جوتے تلاش رہے ہیں۔ چھوٹے صاحب نے کہا۔ ہم اس آدی کو انعام دینا چاہتے ہیں جس

نے یہ کام کیا۔ جس دن ہمارا جوتا غائب کر دے، ہم اس کو انعام دیں۔

آزاد: اور اگر ہمارا جوتا غائب کر دے تو ہم پورے مہینے کی تنخواہ دے دیں۔

ایک بار مرزا آزاد ایک ہندو کے یہاں گئے۔ وہ اس وقت روٹی پکا رہے تھے۔ آپ

نے چپکے سے جوتا اتارا اور رسوئی میں جا بیٹھے، ٹھاکر نے ڈانٹ کر کہا۔ ایں، یہ کیا شرارت!

آزاد: کچھ نہیں، ہم نے کہا، دیکھیں، کس تدبیر سے روٹی پکاتے ہو؟

ٹھاکر: رسوئی جوٹھی کر دی!

آزاد: بھئی، بڑا افسوس ہوا۔ ہم یہ کیا جانتے تھے۔ اب یہ کھانا بے کار جائے گا؟

ٹھاکر: نہیں جی، کوئی مسلمان کھا لے گا۔

آزاد: تو ہم سے بڑھ کر اور کون ہے؟

آزاد بسم اللہ کہہ کر قتالی میں ہاتھ ڈالنے کو تھے کہ ٹھاکر نے لٹکارا۔ ہے ہے، رسوئی

تو جوٹھی کر چکے، اب کیا برتوں پر بھی دانت ہے؟

خیر، آزاد نے پتوں میں کھانا کھایا اور دعا دی کہ خدا کرے، ایسا ایک آلو روز پھنس

جائے۔

ڈوم دھاری، طیلے، گوہنے، کلاوت، کھٹک، کوئی ایسا نہ تھا جس سے مرزا آزاد سے ملاقات نہ ہو۔ ایک بار ایک بینکار کو دو سو روپے انعام دیے۔ تب سے اس گروہ میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ ایک بار آپ پولس کے انسپٹر کے ساتھ جاتے تھے۔ دونوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ آزاد کا گھوڑا بڑا تھا اور ان سے بنا مذاق کے رہا نہ جایا چاہے۔ چپکے سے اتر پڑے۔ گھوڑا ہنہاتا ہوا انسپٹر صاحب کے گھوڑے کی طرف چلا۔ انھوں نے لاکھ سنبھالا، لیکن گری پڑے۔ پیٹھ میں بڑی چوٹ آئی۔

اب سینے، بڑھیا اور عنباسی جب بیگم صاحب کے یہاں پہنچی تو بیگم کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ فوراً کمرے کے اندر چلی گئیں۔ بڑھیا نے آکر پوچھا۔ حضور، کہاں تشریف رکھتی ہیں؟ بیگم: عنباسی، کہو کیا خبریں ہیں؟

عنباسی: حضور کے اقبال سے سب معاملہ چوکس ہے۔

بیگم: آتے ہیں یا نہیں؟ بس، اتنا بتا دو۔

عنباسی: حضور، آج تو ان کے یہاں ایک مہمان آ گئے۔ مگر کل ضرور آئیں گے۔

اتنے میں ایک مہری نے آکر کہا۔ داروغہ صاحب آئے ہیں۔

بیگم: آ گئے! جیتے آئے، بڑی بات!

داروغہ: ہاں حضور، آپ کی دعا سے جیتا آیا۔ نہیں تو بچنے کی تو کوئی صورت ہی نہ تھی۔

بیگم: خیر، یہ بتلاؤ، کہیں پتہ لگا؟

داروغہ: حضور کے نمک کی قسم کہ شہر کا کوئی مقام نہ چھوڑا۔

بیگم: اور کہیں پتہ نہ چلا؟ ہے نہ!

داروغہ: کوئی کوچہ، کوئی گلی ایسی نہیں جہاں تلاش نہ کی ہو۔

بیگم: اچھا، نتیجہ کیا ہوا؟ ملے یا نہ ملے؟

داروغہ: حضور، سنا کہ ریل پر سوار ہو کر کہیں باہر جاتے ہیں۔ فوراً گاڑی کرائے کی اور

اسٹیشن پر جا پہنچا، میاں آزاد سے چار آنکھیں ہوئیں کہ اتنے میں سیٹی کوئی اور ریل کھڑکڑاتی

ہو چلی۔ میں لپکا کہ دو دو باتیں کر لوں، مگر ایک انگریز نے ہاتھ پکڑ لیا۔

بیگم: یہ سب سچ کہتے ہو نہ؟

داروغہ: جھوٹ کوئی اور بولا کرتے ہوں گے۔

بیگم: صبح سے کچھ کھایا تو نہ ہوگا؟

داروغہ: اگر ایک گھونٹ پانی کے سوا کچھ اور کھایا ہو تو قسم لے لیجیے۔
عتبائی: حضور، ہم ایک بات بتائیں تو ان کی شیخی ابھی ابھی نکل جائے۔ کہاروں کو یہیں
بلا کر پوچھنا شروع کیجیے!

بیگم صاحب کو یہ صلاح پسند آئی۔ ایک کہار کو بلا کر تحقیقات کرنے لگیں۔

عتبائی: بچہ، جھوٹ بولے تو نکال دیے جاؤ گے۔

کہار: حضور، ہمیں جو سکھایا ہے، وہ کہہ دیتے ہیں۔

عتبائی: کیا کچھ سکھایا بھی ہے؟

کہار: صبح سے اب تک سکھایا ہی کیے یا کچھ اور کیا؟ یہاں سے اپنی سرال گئے۔
وہاں کسی نے کھانے کو بھی نہ پوچھا تو وہاں سے ایک مجلس میں گئے۔ حصے لیے اور چکھ کر
بولے۔ کہیں ایسی جگہ چلو جہاں کسی کی نگاہ نہ پڑے۔ ہم لوگوں نے ناکے کے باہر ایک
تکیے میں میانہ اتارا۔ داروغہ جی نے وہاں نان بائی کی دکان سے سالن اور روٹی منگا کر کھائی۔
ہم لوگوں کو چبینے کے لیے پیسے دیے۔ دن بھر سویا کیے۔ شام کو حکم دیا، چلو۔

عتبائی: داروغہ صاحب، سلام! اجی، ادھر دیکھیے داروغہ صاحب۔

بیگم: کیوں صاحب، یہ جھوٹ! ریل پر گئے تھے آپ؟ بولے!

داروغہ: حضور، یہ نمک حرام ہے، کیا عرض کروں!

داروغہ کا بس چلتا تو کہار کو بیٹا چنوا دیتے، مگر بے بس تھے۔ بیگم نے کہا۔ بس، جاؤ۔
تم کسی مصرف کے نہیں ہو۔

رات کو عتبائی بیگم صاحب سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ گانے کی آواز آئی۔ بیگم

نے پوچھا۔ کون گاتا ہے؟

عتبائی: حضور، مجھے معلوم ہے۔ یہ ایک وکیل صاحب ہیں۔ سامنے مکان ہے۔ وکیل کو
تو نہیں جانتی، مگر ان کے یہاں ایک آدمی نوکر ہے، اس کو خوب جانتی ہوں۔ سلا بخش نام
ہے۔ ایک دن وکیل صاحب ادھر سے جاتے تھے۔ میں دروازے پر کھڑی تھی۔ کہنے لگے۔
مہری صاحب، سلام! کہو، تمھاری بیگم صاحب کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا، آپ اپنا مطلب
کہیے، تو کہنے لگے۔ کچھ نہیں، یوں ہی پوچھتا تھا۔

بیگم: ایسے آدمیوں کو منہ نہ لگایا کرو۔

عباسی: مختار ہے حضور، مہتابی سے مکان دکھائی دیتا ہے۔

بیگم: چلو دیکھیں تو، مگر وہ تو نہ دیکھ لیں گے! جانے بھی دو۔

عباسی: نہیں حضور، ان کو کیا معلوم ہوگا۔ چپکے سے چل کر دیکھ لیجیے۔

بیگم صاحب مہتابی پر گئیں تو دیکھا کہ وکیل صاحب چنگ پر پھیلے ہوئے ہیں اور سلا رو

ٹھٹھ بھر رہا ہے۔ نیچے آئی تو عباسی بولی — حضور، وہ سلا رو بخش کہتا تھا کہ کسی پر مرتے ہیں۔

بیگم: وہ کون تھی؟ ذرا نام تو پوچھنا۔

عباسی: نام تو بتایا تھا، مگر مجھے یاد نہیں ہے۔ دیکھیے، شاید ذہن میں آجائے۔ آپ دس

پانچ نام تو لیں۔

بیگم: نذیر بیگم، زعفری بیگم، حسینی خانم، شہو خانم!

عباسی: (اچھل کر) جی ہاں، یہی، مگر شہو خانم نہیں، شہو جان بتایا تھا۔

شریٹا بیگم نے سوچا، اس پلگے کا پڑوس اچھا نہیں، جل دے کے چلی آئی ہوں، ایسا نہ ہو،

تاک جھانک کرے۔ دروازے تک آ ہی چکا، عباسی اور سلا رو میں بات چیت بھی ہوئی، اب

فقط اتنا معلوم ہوتا باقی ہے کہ یہی شہو جان ہیں۔ کہیں ہمارے آدمیوں پر یہ بھید کھل جائے تو

غضب ہی ہو جائے۔ کسی طرح مکان بدل دینا چاہیے۔ رات کو تو اسی خیال میں سو رہیں۔ صبح

کو پھر وہی دھن سائی کہ آزاد آئیں اور اپنی پیاری پیاری صورت دیکھائیں۔ وہ اپنا حال

کہیں، ہم اپنی بیٹی سنائیں۔ مگر آزاد اب کی میرا یہ ٹھاٹ دیکھیں گے تو کیا خیال کریں گے۔

کہیں یہ نہ سمجھیں کہ دولت پا کر مجھے بھول گئی۔ عباسی کو بلا کر پوچھا۔ تو آج کب جاؤ گی؟

عباسی: حضور، بس کوئی دو گھڑی دن رہے جاؤ گی اور بات کی بات میں ساتھ لے کر

آجاؤ گی۔

ادھر مرزا آزاد بن ٹھن کر جانے ہی کو تھے کہ ایک شاہ صاحب کھٹ پٹ کرتے ہوئے

آپہنچے۔ آزاد نے جھک کر سلام کیا اور بولے — آپ خوب آئے۔ بتلائیے، ہم جس کام کو

جانا چاہتے ہیں وہ پورا ہوگا یا نہیں؟

شاہ: لگن چاہیے۔ دھن ہو تو ایسا کوئی کام نہیں جو پورا نہ ہو۔

آزاد: گستاخی معاف کیجیے تو ایک بات پوچھوں، مگر برا نہ مانے گا!

شاہ گستاخی کیسی، جو کچھ کہنا ہو، شوق سے کہو۔

آزاد: اس ہنگی عورت سے آپ کو کیوں محبت ہے؟

شاہ: اسے ہنگی نہ کہو، میں اس کی صورت پر نہیں، اس کی سیرت پر مرتا ہوں۔ میں نے بہت سے اولیا دیکھے، پر ایسی عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری۔ اللہ رکھنی جج جج جنت کی پری ہے۔ اس کی یاد کبھی نہ بھولے گی۔ اس کا ایک عاشق آپ ہی کے نام کا تھا۔ انھیں باتوں میں شام ہو گئی، آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور زور سے مہرہ برسنے لگا۔ آزاد نے جانا ملتوی کر دیا۔ صبح کو آپ ایک دوست کی ملاقات کو گئے۔ وہاں دیکھا کہ کئی آدمی مل کر ایک آدمی کو بنا رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں۔ وہ دبلا پتلا، مرا پٹا آدمی تھا۔ ان کو قرینے سے معلوم ہو گیا کہ یہ چندوباز ہے۔ بولے۔ کیوں بھی چندوباز، کبھی نوکری بھی کی ہے؟

چندوباز: اجی حضرت، عمر بھر ڈنڈ پیلے اور جوڑیاں ہلائیں۔ شامی میں لبا جان کی بدولت ہاتھی نشین تھے۔ ابھی پار سال تک ہم بھی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے۔ مگر جوئے کی لت تھی، نکلے نکلے کو محتاج ہو گئے۔ آخر، سرائے میں ایک بھٹیاری اللہ رکھنی کے یہاں نوکری کر لی۔

آزاد: کس کے یہاں؟

چندوباز: اللہ رکھنی نام تھا۔ ایسی خوبصورت کہ میں کیا عرض کروں۔

آزاد: ہاں، رات کو بھی ایک آدمی نے تعریف کی تھی۔

چندوباز: تعریف کیسی! تصویر ہی نہ دکھا دوں؟

یہ کہہ کر چندوباز نے اللہ رکھنی کی تصویر نکالی۔

آزاد: او ہو ہو!

عجب ہے کھینچی مصور نے کس طرح تصویر،

کہ شونیوں سے وہ ایک رنگ پر رہے کیونکر!

چندوباز: کیوں، ہے پری یا نہیں؟

آزاد: پری، پری اصل پری!

آزاد: اسی سرائے میں میاں آزاد نام کے ایک شریف بٹکے تھے۔ ان پر عاشق ہو

گئیں۔ بس، کچھ آپ ہی کی صورت تھی۔

آزاد: اب یہ بتاؤ کہ وہ آج کل کہاں ہے؟

چنڈوباز: یہ تو نہیں جانتے، مگر یہیں کہیں ہے۔ سرائے سے تو بھاگ گئی تھیں۔

آزاد نے تاڑ لیا کہ اللہ رکھی اور ثریا بیگم میں کچھ نہ کچھ بعید ضرور ہے۔ چنڈوباز کو اپنے گھر لائے اور خوب چنڈو پلایا۔ جب دو تین مہینے پی چکے تو آزاد نے کہا۔ اب اللہ رکھی کا مفصل حال بتاؤ۔

چنڈوباز: اللہ رکھی کی صورت تو آپ دیکھ ہی چکے، اب ان کی سیرت کا حال سنئے۔ شوخ، چلبلی، چنپل، آگ بھسوکا، تیکھی چتون، مگر ہنس کھ۔ میاں آزاد پر رتجھ گئیں۔ اب آزاد نے وعدہ کیا کہ نکاح پڑھوائیں گے، مگر قول ہار کر نکل گئے۔ انھوں نے ناش کر دی، پکڑ آئے، مگر پھر بھاگ گئے۔ اس کے بعد ایک بیگم حسن آرا تھیں، اس پر رتجھے۔ انھوں نے کہا۔ روم کی لڑائی میں نام پیدا کر کے آؤ تو ہم نکاح پر راضی ہوں۔ بس، روم کی راہ لی۔ چلتے وقت ان کی اللہ رکھی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔ حسن آرا تمہیں مبارک ہو، مگر ہم کو نہ بھول جانا۔ آزاد نے کہا، ہرگز نہیں۔

آزاد: حسن آرا کہاں رہتی ہیں؟

چنڈوباز: یہ ہمیں نہیں معلوم۔

آزاد: اللہ رکھی کو دیکھو تو پہچان لو یا نہ پہچانو؟

چنڈوباز: فوراً پہچان لیں، نہ پہچانتا کیسا؟

میاں چنڈوباز تو پینک لینے لگے۔ ادھر عباسی آزاد مرزا کے پاس آئی اور کہا۔ اگر چلنا ہے تو چلے چلیے، ورنہ پھر آنے جانے کا ذکر نہ کیجیے گا۔ آپ کے ٹال مثل سے وہ بہت چوہ گئی ہیں۔ کہتی ہیں، آنا ہو تو آئیں اور نہ آنا ہو تو نہ آئیں۔ یہ ٹال مثل کیوں کرتے ہیں؟

آزاد نے کہا۔ میں مختار بیٹھا ہوں۔ چلیے۔

یہ کہہ کر آزاد نے گاڑی منگوائی اور عباسی کے ساتھ اندر بیٹھے۔ چنڈوباز کوچ بکس پر بیٹھے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ ثریا بیگم کے محل پر گاڑی پہنچی تو عباسی نے اندر جا کر کہا۔ مبارک، حضور آ گئے۔

بیگم: شکر ہے!

عنای: اب حضور چک کی آڑ بیٹھ جائیں۔

بیگم: اچھا، بلاؤ۔

آزاد برآمدے میں چک کے پاس بیٹھے۔ عنای نے کمرے کے باہر آکر کہا۔ بیگم صاحب فرماتیں ہیں کہ ہمارے سر میں درد ہے، اب آپ تشریف لے جائیے۔

آزاد: بیگم صاحب سے کہہ دیجیے کہ میرے پاس سر کے درد کا ایک نایاب نسخہ ہے۔

عنای: وہ فرماتیں ہیں کہ ایسے لیے مداری ہم نے بہت چنگے کیے ہیں۔

آزاد: اور اپنے سر کے درد کا علاج نہیں ہو سکتا؟

بیگم: آپ کی باتوں سے سر کا درد اور بڑھتا ہے۔ خدا کے لیے آپ مجھے اس وقت آرام کرنے دیجیے۔

آزاد۔

ہم ایسے ہو گئے اللہ۔ اکبر اے تیری قدرت

ہمارا نام سن کر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

یا تو وہ مزے مزے کی باتیں تھیں، اور اب یہ بے وفائی!

بیگم: تو یہ کہیے کہ آپ ہمارے پرانے جاننے والوں میں ہیں۔ کہیے، مزاج تو اچھے

ہیں؟

آزاد: دور سے مزاج پر سی بھلی معلوم نہیں ہوتی۔

بیگم: آپ تو پہیلیاں بکھواتے ہیں۔ اے عنای، یہ کس اجنبی کو سامنے لا کر بیٹھا دیا؟

واہ واہ!

عنای: (مسکرا کر) حضور، زبردستی دھنس پڑے۔

بیگم: محلّے والوں کو اطلاع دو۔

آزاد: تھانے پر رپٹ لکھوا دو اور محکّیں بندھوا دو۔

یہ کہہ کر آزاد نے اللہ رکھی کی تصویر عنای کو دی اور کہا اسے ہماری طرف سے پیش کر

دو۔ عنای نے جا کر بیگم صاحب کو یہ تصویر دی۔ بیگم صاحب تصویر دیکھتے ہی دنگ ہو گئیں۔

ایں، انھیں یہ تصویر کہاں ملی؟ شاید یہ تصویر چھپا کر لے گئے تھے۔ پوچھا۔ اس تصویر کی کیا

قیمت ہے؟

آزاد: یہ بکاؤ نہیں ہے۔

بیگم: تو پھر دکھائی کیوں؟

آزاد: اس کی قیمت دینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

بیگم: کچھ کہیے تو، کس دام کی تصویر ہے۔

آزاد: حضور ملا لیں۔ ایک شہزادے اس تصویر کے دو لاکھ روپے دیتے تھے۔

بیگم: یہ تصویر آپ کو ملی کہاں؟

آزاد: جس کی یہ تصویر ہے اس سے دل مل گیا ہے۔

بیگم: ذری منہ دھو آئیے۔

اس فخرے پر عتاسی کچھ چونکی، بیگم صاحب سے کہا— ذری حضور مجھے تو دیں۔ مگر بیگم نے صندوقچہ کھول کر تصویر رکھ دی۔

آزاد: اس شہر کی اچھی رسم ہے۔ دیکھنے کو چیز لی اور ہنضم! بی عتاسی، ہماری تصویر لا دو۔

بیگم: لاکھوں کدورتیں ہیں، ہزاروں شکایتیں۔

آزاد: کس سے؟

کدورت ان کو ہے مجھ سے نہیں ہے سامنا جب تک،

ادھر آنکھیں ملیں ان سے ادھر دل مل گیا دل سے۔

بیگم: اجی، ہوش کی دوا کرو۔

آزاد: ہم تو اس ضبط کے قائل ہیں۔

بیگم: (ہنس کر) بجا۔

آزاد: اب تو کھلکھلا کر ہنس دیں۔ خدا کے لیے، اب اس چمک کے باہر آؤ یا مجھی کو

اندر بلاؤ۔ نقاب اور گھونگھٹ کا طلسم توڑو۔ دل بے قابو ہے۔

بیگم: عتاسی، ان سے کہو کہ اب ہمیں سونے دیں۔ کل کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے رات

آنکھوں میں کٹ گئی۔

آزاد: دن کو موقع نہ تھا، رات کو مینہ برسنے لگا۔

بیگم: بس، بیٹھے رہو۔

یہ عبث کہتے ہو، موقع نہ تھا اور گھات نہ تھی،

مہندی پاؤں میں نہ تھی آپ کے، برسات نہ تھی۔
 گنج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی،
 دن کو آسکتے نہ تھے آپ تو کیا رات نہ تھی؟
 بس، یہی کہیے کہ منظور ملاقات نہ تھی۔

آزاد—

معشوق پن نہیں اُگرتی گنجی نہ ہوا!

عناسی دنگ تھی کہ یا خدا، یہ کیا ماجرا ہے۔ بیگم صاحب تو جامے سے باہر ہی ہوئی جاتی
 ہیں۔ مہریاں دانتوں انگلیاں دبا رہی تھیں۔ ان کو ہوا کیا ہے۔ داروغہ صاحب کئے جاتے تھے،
 مگر چپ۔

بیگم: کوئی بھی دنیا میں کسی کا ہوا ہے؟ سب کو دیکھ لیا۔ تڑپا تڑپا کر مار ڈالا۔ خیر، ہمارا
 بھی خدا ہے۔

آزاد: پھیلی باتوں کو اب بھول جائیے۔

بیگم: بے مروتوں کو کسی کے درد کا حال کیا معلوم؟ نہیں تو کیا وعدہ کر کے مکر جاتے!

آزاد: ناش بھی تو داغ دی آپ نے!

بیگم: انتظار کرتے کرتے ناک میں دم آگیا۔

راہ ان کی تکتے تکتے یہ مدت گزر گئی،

آنکھوں کو حوصلہ نہ رہا انتظار کا۔

آزاد، بس دل ہی جانتا ہے۔ ٹھان لی تھی کہ جس طرح مجھے جلایا ہے، اسی طرح
 ترساؤں گی۔ اس وقت کلیجہ بانسوں اچھل رہا ہے۔ مگر بے چینی اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اب
 ادھر کا حال تو کہو، گئے تھے!

آزاد: وہاں کا حال نہ پوچھو۔ دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔

شریا بیگم نے سمجھا کہ اب پالا ہمارے ہاتھ رہا۔ کہا— آخر، کچھ تو کرو۔ ماجرا کیا ہے؟

آزاد: اجی، عورت کی بات کا اعتبار کیا؟

بیگم: واہ، سب کو شامل نہ کرو۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اب وہ تھلایئے کہ ہم
 سے جو وعدے کیے تھے، وہ یاد ہیں یا بھول گئے؟

اقرار جو کیے تھے کبھی ہم سے آپ نے،
 کیسے، وہ یاد ہیں کہ فراموش ہو گئے؟

آزاد: یاد ہیں۔ نہ یاد ہونا کیا معنی؟

بیگم: آپ کے واسطے ھٹ بھر لاؤ۔

آزاد: حکم ہو تو اپنے خدمت گار سے ھٹ منگوا لوں۔ عباسی، ذرا ان سے کہو، ھٹ بھر

لائیں۔

عباسی نے جا کر چندوباز سے ھٹ بھرنے کو کہا۔ چندوباز ھٹ لے کر اوپر گئے تو اللہ رکھی کو دیکھتے ہی بولے۔ کیسے اللہ رکھی صاحب، حراج تو ابھی ہیں؟

ثریا بیگم دھک سے رہ گئی۔ وہ تو کہیں، خیر گزری کہ عباسی وہاں پر نہ تھی۔ ورنہ بڑی کرکری ہوتی۔ چپکے سے چندوباز کو بلا کر کہا۔ یہاں ہمارا نام ثریا بیگم ہے۔ خدا کے واسطے ہمیں اللہ رکھی نہ کہنا۔ یہ تو بتاؤ، تم ان کے ساتھ کیسے ہو لیے۔ تم سے ان سے تو دشمنی تھی؟ چلتے وقت کوڑا مارا تھا۔

چندوباز: اس کے بارے میں پھر عرض کروں گا۔

آزاد: کیا خدا کی شان ہے کہ خدمت گار کو اندر بلایا جائے اور مالک ترے!

بیگم: کیوں گھبراتے ہو؟ ذرا باتیں تو کر لینے دو؟ اس موئے مسخرے کو کہاں چھوڑا؟

آزاد: وہ لڑائی پر مارا گیا۔

بیگم: اے ہے، مار ڈالا گیا! بڑا مسوڑ تھا بے چارہ!

ثریا بیگم نے اپنے ہاتھوں سے گلو ریاں بنائیں اور اپنے ہی ہاتھ سے مرزا آزاد کو کھلائی۔ آزاد دل میں سوچ رہے تھے کہ یا خدا، ہم نے کون سا ایسا ثواب کا کام کیا، جس کے بدلے میں تو ہم پر اتنا مہربان ہو گیا ہے! حالانکہ نہ کبھی کی جان، نہ پہچان۔ یقین ہو گیا کہ ضرور ہم نے کوئی نیک کام کیا ہوگا۔ چندوباز کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ اللہ رکھی نے اتنی دولت کہاں پائی۔ ادھر ادھر بھوجتے ہو ہو کر دیکھتے تھے، مگر سب کے سامنے کچھ پوچھنا ادب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اتنے میں آزاد بولے۔ زمانہ بھی کتنے رنگ بدلتا ہے۔

ثریا بیگم: ہاں، یہ تو پرانہ دستور ہے۔ لوگ اقرار کچھ کرتے ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔

آزاد: یوں نہیں کہتیں کہ لوگ چاہتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ اور ہے۔

رُتیا بیگم: دو چار دن اور صبر کرو۔ جہاں اتنے دنوں خاموش رہے، اب چند روز تک اور چپکے رہو۔

چنڈو باز: خداوند، یہ باتیں تو ہوائی کریں گی، اب چلیے، کل پھر آئیے گا۔ مگر پہلے بی اعلیٰ.....

رُتیا بیگم: ذرا سمجھ بوجھ کر!

چنڈو باز: قصور ہوا۔

آزاد: ہم سمجھے ہی نہیں، کیوں قصور ہوا؟

رُتیا بیگم: ایک بات ہے۔ یہ خوب جانتے ہیں۔

آزاد: پھر اب چلوں! مگر ایسا نہ ہو کہ یہ سارا جوش دو چار دن میں ٹھنڈا پڑ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو میں جان دے دوں گا۔

رُتیا بیگم: میں تو یہ خود ہی کہنے کو تھی۔ تم میری زبان سے بات تمہیں لے گئے۔

آزاد: ہماری محبت کا حال خدا ہی جانتا ہے۔

رُتیا بیگم: خدا تو سب جانتا ہے، مگر آپ کی محبت کا حال ہم سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ یا (چنڈو باز کی طرف اشارہ کر کے) یہ جانتے ہیں۔ یاد ہے نا؟ اگر اب کی بھی دیا ہی اقرار ہے تو خدا ہی مالک ہے۔

آزاد: اب ان باتوں کا ذکر ہی نہ کرو۔

رُتیا بیگم: ہمیں اس حالت میں دیکھ کر تمہیں تعجب تو ضرور ہوا ہوگا کہ اس درجے پر یہ

کیسے پہنچ گئی۔ وہ بوڑھا یاد ہے جس کی طرف سے آپ نے خط لکھا تھا؟

آزاد مرزا کچھ جانتے ہوتے تو سمجھتے، ہاں ہاں کہتے جاتے تھے۔

آخر اتنا کہا۔ تم بھی تو وکیل کے پاس گئی تھیں؟ اور ہم کو پکڑوا بلایا تھا! مگر سچ کہنا، ہم بھی کس چالاک سے نکل بھاگے تھے؟

رُتیا بیگم: اور اس کا آپ کو فخر ہے۔ شرماؤ نہ شرمانے دو۔

آزاد: اجی، وہ موقع ہی اور تھا۔

رُتیا بیگم نے اپنا سارا حال کہہ سنایا۔ اپنا جوگن بنا، شہسوار کا آنا، تھانے دار کے گھر سے بھاگنا، پھر وکیل صاحب کے یہاں پھنسنا، غرض ساری باتیں کہہ سنائیں۔

آزاد: افوہ، بہت مصیبتیں اٹھائیں!

ثریا بیگم: اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ شہہ گھڑی نکاح ہو تو سارا غم بھول جائے۔

چنڈوباز: ہم بیگم صاحب کی طرف ہوں گے۔ آپ ہی نے تو کوڑا بھجایا تھا؟

آزاد: کوڑا ابھی تک نہ بھولے! ہم تو بہت سی باتیں بھول گئے۔

ثریا بیگم: اب تو رات بہت زیادہ گئی، کیوں نہ نیچے جا کر داروغہ صاحب کے کمرے

میں سو رہو۔

آزاد اٹھنے ہی کو تھے کہ آذان کی آواز کان میں آئی۔ باتوں میں تڑکا ہو گیا۔ آزاد

یہاں سے چلے تو راستے میں ثریا بیگم کا حال پوچھنے لگے۔ کیوں جی، بیگم صاحب ہم کو وہی

آزاد سمجھتی ہیں؟ کیا ہماری ان کی صورت بالکل ملتی ہے؟

چنڈوباز: جناب، آپ ان سے بیس ہیں، انیس نہیں۔

آزاد: تم نے کہیں کہہ تو نہیں دیا کہ اور آدمی ہے؟

چنڈوباز: واہ، واہ، میں کہہ دیتا تو آپ وہاں دھسنے بھی پاتے؟ اب کہیے تو جا کر جز

دوں۔ بس، ایسی ہی باتوں سے تو آگ لگ جاتی ہے؟

یہ باتیں کرتے ہوئے آزاد گھر پہنچے اور گاڑی سے اترنے ہی کو تھے کہ کئی کانسلہوں

نے ان کو گھیر لیا، آزاد نے پیئترا بدل کر کہا۔ ایں، تم لوگ کون ہو؟

جعدار نے آگے بڑھ کر وارنٹ دیکھایا اور کہا۔ آپ میرے حراست میں ہیں۔

چنڈوباز دیکے دیکے گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ایک سپاہی نے ان کو بھی نکالا۔ آزاد نے غصے میں

آکر دو کانسلہوں کو تھپڑ مارے، تو ان سمسوں نے مل کر ان کی منٹکیں کس لیں اور تھانے کی

طرف لے چلے۔ تھانے دار نے آزاد کو دیکھا تو بولے۔ آئیے مرزا صاحب، بہت دنوں

کے بعد آپ نظر آئے۔ آج آپ کہاں بھول پڑے؟

آزاد: کیا مرے ہوئے سے دل لگی کرتے ہو! حوالات سے باہر نکال دو تو حزا

دیکھاؤں، اس وقت جو چاہو، کہہ لو، مگر اجلاس پر ساری قلعی کھول دوں گا۔ جس جس آدمی سے

تم نے رشوت لی ہے، ان کو پیش کروں گا، بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟

تھانے دار: رتی جل گئی، مگر رتی کا بل نہ گیا۔

آزاد تو ڈینگیں مار رہے تھے اور چنڈوباز کو چنڈو کی دھن سوار تھی۔ بولے۔ ارے

یارو، ذری چنڈو پلوا دو بھی! آخر اتنے آدمیوں میں کوئی چنڈوباز بھی ہے، یا سب کے سب روکے ہی ہیں؟

تھانے دار: اگر آج چنڈو نہ ملے تو کیا ہو؟

چنڈوباز: مر جائیں اور کیا ہو؟

تھانے دار: اچھا دیکھیں، کیسے مرتے ہو؟ کوئی شرط بتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اگر اس کو چنڈو نہ ملے تو یہ مر جائے۔

انسپکٹر: اور ہم کہتے ہیں کہ یہ کبھی نہ مرے گا۔

چنڈوباز: واہ ری تقدیر، کبھے تھے، اللہ رکھی کے یہاں اب چین کریں گے، چین تو رہا دور، قسمت یہاں لے آئی۔

تھانے دار: اللہ رکھی کون؟ یہ بتا دو، تو چنڈو منگا دوں۔

چنڈوباز: صاحب، ایک عورت ہے جو سرائے میں رہتی تھی۔

اب سنے، شام کے وقت رتیا بیگم بن ٹھن کر بیٹھی آزاد کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر آزاد تو حوالات میں تھے۔ یہاں آتا کون؟ عتاسی کو آزاد کے گرفتار ہونے کی خبر تو مل گئی، مگر اس نے رتیا بیگم سے کہا نہیں۔

(66)

شہزادہ ہمایوں فرکئی مہینے تک نیپال کی ترائی میں شکار کھیل کر لوٹے، تو حسن آرا کی مہری عتاسی کو بلوا بھیجا۔ عتاسی نے شہزادہ کے آنے کی خبر سنی تو چمکتی ہوئی آئی۔ شہزادے نے دیکھا تو پھڑک گئے۔ بولے — آئیے، بی۔ مہری صاحب، حسن آرا بیگم کا مزاج تو اچھا ہے؟ عتاسی: ہاں، حضور!

شہزادہ: اور دوسری بہن؟ ان کا نام تو ہم بھول گئے۔

عتاسی: بے شک، ان کا نام تو آپ ضرور ہی بھول گئے ہوں گے۔ کوٹھے پر سے دھوپ میں آئینہ دکھائے، گھورا گھوری کیے اور لوگوں سے پوچھے — بڑی بہن زیادہ حسین ہیں یا چھوٹی؟ ہے تعجب کی بات کی نہیں؟

شہزادہ: ہمیں تو تم حسین معلوم ہوتی ہو۔

عباسی : اے حضور، ہم غریب آدمی، بھلا ہمیں کون پوچھتا ہے؟
شہزادہ : ہمارے گھر بڑا جاؤ۔

عباسی : حضور تو مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے، کیا مزاج پایا ہے! یہی ہنسنا بولنا رہ جاتا ہے حضور!

شہزادہ : اب کسی ترکیب سے لے چلو۔

عباسی : حضور، بھلا میں کیسے ملے چلوں! رئیسوں کا گھر، شریفوں کی بہو بیٹیوں میں پرانے مرد کا کیا کام۔

شہزادہ : کوئی ترکیب سوچو، آخر کس دن کام آؤ گی؟

عباسی : آج تو کسی طرح ممکن نہیں۔ آج ایک مس آنے والی ہیں۔

شہزادہ : پھر کسی ترکیب سے مجھے وہاں پہنچا دو۔ آج تو آنکھیں سینے کا خوب موقع

ہے۔

عباسی : اچھا، ایک تدبیر ہے۔ آج باغ ہی میں بیٹھک ہوگی۔ آپ چل کر کسی درخت پر بیٹھے رہیں۔

شہزادہ : نہیں بھائی، یہ ہمیں پسند نہیں۔ کوئی دیکھ لے تو ناحق آلو بنوں۔ بس، تم باغبان کو گانٹھ لو۔ یہی ایک تدبیر ہے۔

عباسی نے جا کر مالی کو لالچ دیا۔ کہا۔ اگر شہزادہ کو اندر پہنچا دو تو دو اشرفیاں انعام دلوادوں۔ مالی راضی ہو گیا۔ تب عباسی نے آکر شہزادے سے کہا۔ لیجیے حضرت، فتح ہے مگر دیکھیے، دھوٹی اور مرزائی پہننی پڑے گی اور سونے کپڑے کی بھڑی سی ٹوپی دیجیے، تب وہاں پہنچ پائیے گا۔

شام کو ہمایوں نے مالی کا بھیس بنایا اور مالی کے ساتھ باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ باغ کے پتھر ایک پکا اور اونچا چبوترہ ہے اور چاروں بہنیں کرسیوں پر بیٹھی مس فیرنگٹن سے باتیں کر رہی ہیں۔ مالی نے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر دیا اور کہا۔ جا کر میز پر رکھ دو۔ ہمایوں نے مس صاحب کو جھک کر سلام کیا اور ایک کونے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔

پہر آرا : ہیرا ہیرا، یہ کون ہے؟

ہیرا : حضور، غلام ہے آپ کا۔ میرا بھانجہ ہے۔

پہر آرا: کیا نام ہے؟

ہیرا: لوگ ہمایوں کہتے ہیں حضور!

پہر آرا: آدمی تو سلیقے دار معلوم ہوتا ہے۔ ارے ہمایوں، تھوڑے پھول توڑ لے اور مہری کو دے دے کہ میرے سر ہانے رکھ دے۔

شہزادہ نے پھول توڑ کر مہری کو دیے اور پھولوں کے ساتھ رومال میں ایک رقعہ باندھ دیا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

’میری جان،

اب صبر کی طاقت نہیں۔ اگر جلانا ہو تو جلا لو، ورنہ کوئی حکمت کام نہ آئے گی!

ہمایوں فر

جب شہزادہ ہمایوں فر چلے گئے تو پہر آرا نے مالی سے کہا۔ اپنے بھانجے کو نوکر رکھ لو۔

مالی: حضور، سرکار ہی کا نمک تو کھاتا ہے! یوں بھی نوکر ہے، وہ بھی نوکر ہے۔

پہر آرا: مگر ہمایوں تو مسلمانوں کا نام ہوتا ہے۔

مالی: ہاں حضور، وہ مسلمان ہو گیا ہے۔

دوسرے دن شام کو پہر آرا اور حسن آرا باغ میں آئیں تو دیکھا، چبوترے پر شطرنج کے دو نقشے کھینچے ہوئے ہیں۔

پہر آرا: کل تک تو یہ نقشے نہیں تھے، آہا، ہم سمجھ گئے۔ ہمایوں مالی نے بنائے ہوں گے۔

مالی: ہاں حضور، اسی نے بنایا ہے۔

پہر آرا: بہن، جب جانیں کہ نقشہ حل کر دو۔

حسن آرا: بہت ٹیڑھا نقشہ ہے۔ اس کا حل کرنا مشکل ہے (مالی سے) کیوں جی،

تمہارے بھانجے کو شطرنج کھیلنا کس نے سکھایا؟

مالی: حضور، اس کو شوق ہے، لڑکپن سے کھیلتا ہے۔

حسن آرا: اس بے پوچھو، اس نقشے کو حل کر دے گا؟

مالی: کل بلوا دوں گا حضور!

پہر آرا: اس کا بھانجہ بڑا منجلا معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا: ہاں، ہوگا۔ اس ذکر کو جانے دو۔

پہر آرا: کیوں کیوں، باجی جان! تمہارے چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا؟

حسن آرا: کل اس کا جواب دوں گی۔

پہر آرا: نہیں، آخر بتاؤ تو؟ تم اس وقت خفا کیوں ہو؟

حسن آرا: یہ مرزا ہمایوں فر کی شرارت ہے۔

پہر آرا: افوہ! یہ ہتھکنڈے!

حسن آرا: (مالی سے) سچ سچ بتا، یہ ہمایوں کون ہے؟ خبردار جو جھوٹ بولا!

پہر آرا: بھانجہ ہے تیرا؟

مالی: حضور، حضور!

حسن آرا: حضور حضور لگائی ہے، بتاتا نہیں۔ تیرا بھانجہ اور یہ نقشے بنائے؟

مالی: حضور، میں مالی نہیں ہوں، ذاتی کا کاتھ ہوں، مگر گھر بار چھوڑ کر باغ والی کرنے

لگا۔ ہمارا بھانجہ پڑھا لکھا ہو تو کون تعجب کی کون بات ہے!

حسن آرا: چل جھوٹے، سچ سچ بتا۔ نہیں اللہ جانتا ہے، کھڑے کھڑے نکلوا دوں گی۔

پہر آرا اپنے دل میں سوچنے لگی کہ ہمایوں، فر نے بطور چیمپا کیا۔ اور پھر اب تو ان کو خبر

پہنچی ہی گئی ہے تو پھر مالی بننے کی کیا ضرورت ہے!

حسن آرا: خدا گواہ ہے۔ سزا دینے کے قابل آدمی ہے۔ بھل منسی کے یہ مانی نہیں ہے

کہ کسی کے گھر میں مالی یا چار بن کر گھسے۔ یہ ہیرا نکال دینے لائق ہے۔ اس کو کچھ چنایا

ہوگا، جیسی پھسل پڑا۔

مالی کے ہوش اڑ گئے بولا۔ حضور مالک ہیں۔ میں برس سے اس سرکار کا نمک کھاتا

ہوں مگر کوئی قصور غلام سے نہیں ہوا۔ اب بڑھاپے میں حضور یہ داغ کھائیں۔

حسن آرا: کل اپنے بھانجے کو ضرور لانا۔

پہر آرا: اگر قصور ہوا ہے تو سچ سچ کہہ دے۔

مالی: حضور، جھوٹ بولنے کی تو میری عادت نہیں۔

دوسرے دن شہزادہ نے مالی کو پھر بلوایا اور کہا۔ آج ایک بار اور دکھا دو۔

مالی: حضور، لے چلنے میں تو غلام کو عذر نہیں، مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں بڑھاپے میں داغ نہ

لگ جائے۔

شہزادہ: اجی وہ موقوف کر دیں گی تو ہم نوکر رکھ لیں گے۔

مالی: سرکار، میں نوکری کو نہیں، عزت کو ڈرتا ہوں۔

شہزادہ: کیا مہینہ پاتے ہو؟

مالی: 6 روپے ملتے ہیں حضور!

شہزادہ: آج سے 6 روپے یہاں سے تمہاری زندگی بھر ملا کریں گے۔ کیوں، ہمارے

آنے کے بعد عورتیں کچھ کہتی نہیں تھیں؟

مالی: آپس میں کچھ باتیں کرتی تھیں، مگر میں سن نہیں سکا۔ تو میں شام کو آؤں گا؟

شہزادہ: تم ڈرو نہیں، تمہارا نقصان نہیں ہونے پائے گا۔

مالی تو سلام کر کے روانہ ہوا اور ہمایوں فر دعا مانگنے لگے کہ کسی طرح شام ہو۔ بار بار

کمرے کے باہر جاتے، بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے۔ سوچے، آؤ ذرا سو رہیں۔ سونے میں

وقت بھی کٹ جائے گا اور بے قراری بھی کم ہو جائے گی۔ لیکن، مگر بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔

کھانا کھانے کے بعد لیٹے تو ایسی نیند آئی کہ شام ہو گئی۔ ادھر سپہر آرانے ہیرا مالی کو اکیلے

میں بلا کر ڈانٹنا شروع کیا۔ ہیرا نے رو کر کہا۔ ناحق اپنے بھانجے کو لایا۔ نہیں تو یہ لتھاڑ کیوں

سنی پڑتی۔

سپہر آرا: کچھ دیوانہ ہوا ہے بڑھا! تیرا بھانجہ اور اتنا سلیقہ دار؟ اتنا حسین؟

ہیرا: حضور، اگر میرا بھانجہ نہ ہو تو ناک کٹوا ڈالوں۔

سپہر آرا: (مہری سے) ذرا تو اسے سمجھا دے کہ اگر سچ بتلا دے تو کچھ انعام دوں۔

مہری نے مالی کو الگ لے جا کر سمجھانا شروع کیا۔ ارے بھلے آدمی، بتا دے۔ جو تیرا

رتی بھر نقصان ہو تو میرا ذمہ۔

ہیرا: اس بڑھوتی میں کلک کا ٹپکا لگوانا چاہتی ہو؟

مہری: اب مجھ سے تو بہت اڑو نہیں، شہزادہ ہمایوں فر کے سوا اور کسی کی اتنی ہمت نہیں

ہو سکتی۔ بتا، تھے وہی کہ نہیں؟

ہیرا: ہاں، آئے تو وہیں تھے۔

مہری: (سپہر آرا سے) لیجئے حضور، اب اسے انعام دیجیے۔

پہر آرا: اچھا ہیرا، آج جب وہ آئیں تو یہ کاغذ دے دیتا۔
 اتفاق سے حسن آرا بیگم بھی شہلی ہوئی آئیں۔ وہ بھی دفی پر ایک شعر لکھ لائی تھیں۔
 پہر آرا کو دیکھ کر بولیں۔ ہیرہ سے کہہ دو، جس وقت ہمایوں فرمائیں، یہ دفی دکھا دے۔
 پہر آرا: اے تو باجی جب ہمایوں فرہوں بھی؟
 حسن آرا: کتنی سادی ہو؟ جب ہوں بھی؟
 پہر آرا: اچھا، ہمایوں فرہی سہی! یہ شعر تو سناؤ۔
 حسن آرا: ہم نے یہ لکھا ہے۔

اسیر حرص و شہوت ہر کہ خد ناکام می باشد
 دریں آتش کے گر پختہ باشد خام می باشد
 (جو آدمی حرص اور شہوت میں قید ہو گیا، وہ ناکام رہتا ہے۔ اس آگ میں اگر کوئی پکا
 بھی ہو تو کچا رہتا ہے۔)

ہیرا نے جھک کر سلام کیا اور شام کو ہمایوں فر کے مکان پہنچا۔
 ہمایوں: آگئے؟ اچھا، ٹھہرو۔ آج بہت سوئے۔
 ہیرا: خداوند، بہت خفا ہوئیں اور کہا کہ ہم تم کو موقوف کر دیں گے۔
 ہمایوں: تم اس کی فکر نہ کرو۔
 ہیرا: حضور، مجھے آدھ سیر آئے سے مطلب ہے۔
 تھٹ پئے وقت ہمایوں ہیرا کے ساتھ باغ میں پہنچے۔ یہاں ہیرہ نے دونوں بہنوں
 کے لکھے ہوئے شعر ہمایوں فر کو دیکھائے۔ ابھی وہ پڑھ ہی رہے تھے کہ حسن آرا باغ میں آگئی
 اور ہیرہ کو بلا کر کہا۔ تمہارا بھانجہ آیا؟

ہیرا: حاضر ہے حضور!
 حسن آرا: بلاؤ۔
 ہمایوں نے آکر سلام کیا اور گردن جھکا لی۔
 حسن آرا: تمہارا کیا نام ہے جی؟
 ہمایوں: ہمایوں۔
 حسن آرا: کیوں صاحب، مکان کہاں ہے؟

ہمایوں—

گھر بار سے کیا فقیر کو کام،

کیا لیجے چھوڑے گاؤں کا نام۔

حسن آرا: اخواہ، آپ شاعر بھی ہیں؟

ہمایوں: حضور، کچھ بک لیتا ہوں۔

حسن آرا: کچھ سناؤ۔

ہمایوں: حکم ہو تو زمین پر بیٹھ جاؤں۔

سپہر آرا: بڑے گستاخ ہو تم۔ کہیں نوکر ہو؟

ہمایوں: جی ہاں حضور، آج کل شہزادہ ہمایوں فرکی بہن کے یہاں نوکر ہوں۔ اتنے میں

بڑی بیگم آگئیں۔ ہمایوں فرمارے خوف کے بھاگ گئے۔

(67)

ثریا بیگم نے آزاد مرزا کے قید ہونے کی خبر سنی تو دل پر بجلی سی گر پڑی۔ پہلے تو یقین نہ رہا، مگر جب خبر سچی نکلی تو ہائے ہائے کرنے لگی۔

عباسی: حضور، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر ان کے ایک عزیز ہیں۔ وہ بیروی کرنے والے ہیں۔ روپے بھی خرچ کریں گے۔

ثریا بیگم: روپیہ نکھڑا کیا چیز ہے۔ تم جا کر کہو کہ جتنے روپیوں کی ضرورت ہو، ہم سے لیں۔

عباسی آزاد مرزا کے چچا کے پاس جا کر بولی۔ بیگم صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ روپے کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہے۔ جتنے روپے کہیے، بھیج دیں۔ یہ بڑے مرزا آزاد سے بھی بڑھ کر بگڑے باز تھے۔ ثریا بیگم کے پاس آکر بولے۔ کیا کہوں بیگم صاحب، میری تو عزت خاک میں مل گئی۔

ثریا بیگم: یا میرے اللہ، یہ کیا غضب ہو گیا؟

بڑے مرزا: کیا کروں، سارا زمانہ تو ان کا دشمن ہے۔ پولس سے عداوت، عملوں سے نکھرا۔ میرے پاس اتنے روپے کہاں کہ بیروی کروں۔ وکیل بغیر لیے دیے مانتے نہیں۔

جان عذاب میں ہے۔

شریتا بیگم: اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ سب بندوبست ہو جائے گا۔ سو دو سو، جو کہیے، حاضر ہے۔

بڑے مرزا: فوجداری کے مقدمے میں اونچے وکیل ذرا لیتے بہت ہیں۔ میں کل ایک بارسٹر کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایک پوشی کے دو سو لوں گا۔ اگر آپ چار سو روپے دے دیں تو امید ہے کہ شام تک آزاد تمہارے پاس آ جائیں۔

بیگم صاحب نے چار سو روپے دلوا دیے۔ بڑے مرزا روپے لے کر باہر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد آکر ایک چارپائی پر دھم سے گر پڑے اور بولے — آج تو عزت ہی گئی تھی، مگر خدا نے بچالیا۔ میں جو یہاں سے گیا تو ایک صاحب نے آکر کہا — آزاد مرزا کو تمہانے دار ہتھکڑی پہنا کر چوک سے لے جائے گا، بس، میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اتفاق سے ایک رسالہ دار مل گئے۔ انھوں نے میری یہ حالت دیکھی تو کہا — دو سو روپے دو تو پولس والوں کو گانٹھ لوں۔ میں نے فوراً دو سو روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھے۔ اب دو سو اور دلوائے تو دکیوں کے پاس جاؤں۔ بیگم نے دو سو روپے اور دلوا دیے۔ بڑے مرزا دل میں خوش ہوئے، اچھا شکار بھنسا۔ روپے لے کر چلتے ہوئے۔

ادھر شریتا بیگم رو رو کر آنکھیں پھوڑے ڈالتی تھی، مہریاں سمجھاتیں، دن رات رونے سے کیا فائدہ، اللہ پر بھروسہ رکھیے، اس کی مرضی ہوئی تو آزاد مرزا دو چار دن میں گھر آئیں گے۔ مگر یہ نصیحتیں بیگم صاحب پر کچھ اثر نہ کرتی تھیں۔ ایک دن ایک مہری نے آکر کہا — حضور، ایک عورت ڈیوڑھی پر کھڑی ہے۔ کہیے تو بلاؤں! بیگم نے کہا — بلا لو۔ وہ عورت پردہ اٹھا کر آگن میں داخل ہوئی اور جبکہ کر بیگم کو سلام کیا۔ اس کی جج دھج ساری دنیا کی عورتوں سے زلی تھی۔ گلن بدن کا چست پاجامہ، بانگہ ممامہ، مخمل کا دھلا، اس پر ہلکا کار چوبی کا کام، ہاتھ میں آنسو کا بیجرا، اس میں ایک چڑیا بیٹھی ہوئی۔ سارا گھر اسی کی اور دیکھنے لگا۔ سب کی سب دنگ تھیں کہ یا خدا، یہ اٹھتی جوانی، گلاب سا رنگ، اور یوں گلی کوچوں کی سیر کرتی پھرے! مٹاسی بولی — کیوں بی بی، تمہارا مکان کہاں ہے؟ اور یہ پہناوا کس ملک کا ہے؟ تمہارا نام کیا ہے بی بی؟

عورت: ہمارا گھر من چلے جوانوں کا دل ہے اور نام معشوق ہے۔

یہ کہہ کر اس نے پنجرہ سامنے رکھ دیا اور یوں چپکنے لگی۔ حضور، آپ کو یقین نہ آئے گا۔ کل میں پرستان میں بیٹھی ہوا کی سیر دیکھ رہی تھی کہ پہاڑ پر بڑے زوروں کی آندھی آئی اور اتنی گرد اڑی کہ آسمان کے نیچے ایک اور آسمان نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آئی اور ایک اڑن کھنولہ آسمان سے اتر پڑا۔

عباسی : ارے، اڑن کھنولہ! اس کا ذکر تو کہانیوں میں سنا کرتے تھے۔

عورت : بس حضور، اس اڑن کھنولے میں سے ایک بچہ کی پری اتری اور دم میں کھنولہ غائب ہو گیا۔ وہ پری، اصل میں پری نہ تھی، وہ ایک انسان تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ اب سنا ہے کہ وہ بے چارہ کہیں قید ہو گیا ہے۔

رثیا بیگم : کیا، قید ہے! بھلا، اس جوان کا نام بھی تمہیں معلوم ہے؟

عورت : جی ہاں حضور، میں نے پوچھ لیا ہے۔ اسے آزاد کہتے ہیں۔

رثیا بیگم : ارے! یہ تو کچھ اور بی غل کھلا۔ کسی نے تمہیں بہکا تو نہیں دیا؟

عورت : حضور، وہ آپ کے یہاں بھی آئے تھے۔ آپ بھی ان پر رنجھی ہوئی ہیں۔

رثیا بیگم : مجھے تو تمہاری سب باتیں دیوانوں کی بک جھک معلوم ہوتی ہیں۔ کہاں

پری، کہاں آزاد، کہاں اڑن کھنولہ! سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔

عورت : ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ذرا عقل چاہیے۔

یہ کہہ کر اس نے پنجرہ اٹھایا اور چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں داروغہ صاحب نے اندر آ کر کہا۔ دروازے پر تھانے دار اور سپاہی

کھڑے ہیں۔ مرزا آزاد جیل سے بھاگ نکلے ہیں۔ اور وہی آج عورت کے بھیس میں آئے

تھے۔ بیگم صاحب کے ہوش حواس غائب ہو گئے! ارے، یہ آزاد تھے!

(68)

آزاد اپنی فوج کے ساتھ ایک میدان میں پڑے ہوئے تھے کہ ایک سوار نے فوج میں

آ کر کہا۔ ابھی دگل دو۔ دشمن سر پر آ پہنچا۔ دگل کی آواز سنتے ہی افسر، پیادے، سوار سب

چوک پڑے۔ سوار اٹھتے ہوئے چلے، پیادے اکڑتے ہوئے بڑھے۔ ایک بولا۔ مار لیا ہے۔

دوسرے نے کہا۔ بھگا دیا ہے۔ مگر ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ دشمن کہاں ہے۔ مگر دوڑائے

گئے تو پتہ چلا کہ روس کی فوج دریا کے اس پار پیر جمائے کھڑی ہے۔ دریا پر پل بنایا جا رہا ہے اور انوکھی بات یہ تھی کہ روسی فوج کے ساتھ ایک لیڈی، شہسواروں کی طرح ران پڑی جمائے، کمر سے تلوار لٹکائے، چہرے کو نقاب سے چھپائے، عجب شوخی اور بانکپن کے ساتھ لڑائی ایسے شریک ہونے کے لیے آئی ہے۔ اس کے ساتھ دس جوان عورتیں گھوڑیوں پر سوار چلی آ رہی ہیں۔ منجر نے ان عورتوں کی کچھ ایسی تعریف کی کہ لوگ سن کر دنگ رہ گئے۔ بولا۔ اس رئیس زادی نے قسم کھائی ہے کہ عمر بھر کنواری رہوں گی۔ اس کا باپ ایک مشہور جنرل تھا، اس نے اپنی پیاری بیٹی کو شہسواری کا فن سکھایا تھا۔ روس میں بس یہی ایک عورت ہے جو ترکوں سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئی ہے۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ آزاد کا سر لے کر زار کے قدموں پر رکھ دوں گی۔

آزاد: بھلا، یہ تو بتلاؤ کہ اگر وہ رئیس کی لڑکی ہے تو اسے میدان سے کیا سروکار؟ پھر میرا نام اس کو کیونکر معلوم ہوا؟

منجر: اب یہ تو حضور، وہی جانے، ان کا نام مس کلاریا ہے۔ وہ آپ سے تلوار کا مقابلہ کرنا چاہتی ہیں۔ میدان میں اکیلے آپ سے لڑیں گی، جس طرح پرانے زمانے میں پہلوانوں میں لڑائی کا رواج تھا۔

آزاد پاشا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ افسروں نے ان کو بنانا شروع کیا۔ آزاد نے سوچا، اگر قبول کیے لیتا ہوں تو نتیجہ کیا! جیتا، تو کوئی بڑی بات نہیں۔ لوگ کہیں گے، لڑنا بھڑنا عورتوں کا کام نہیں۔ اگر چوٹ کھائی تو جگ ہنسائی ہوگی۔ مس معیذا طعنے دیں گی۔ اللہ رکھی آڑے ہاتھوں لیں گی کہ ایک چھوکری سے چمکا کھا گئے۔ ساری ڈبک خاک میں مل گئی۔ اور اگر انکار کرتے ہیں تو بھی تالیاں بجیں گی کہ ایک نازک بدن عورت کے مقابلے سے بھاگے۔ جب خود کچھ فیصلہ نہ کر سکے تو پوچھا۔ دل لگی تو ہو چکی، اب بتلائیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ جنرل: صلاح یہی ہے کہ اگر آپ کو بہادری کا دعویٰ ہے تو قبول کر لیجیے، ورنہ چپکے ہو رہیے۔

آزاد: جناب، خدا نے چاہا، تو ایک چوٹ نہ کھاؤں اور بے داغ لوٹ آؤں۔ عورت لاکھ دلیر ہو، پھر بھی عورت ہے!

جنرل: یہاں مونچھوں پر تاؤ دے لیجیے، مگر وہاں قلعی کھل جائے گی۔

انور پاشا: جس وقت وہ حسینہ تلوار سج کر سامنے آئے گی، ہوش اڑ جائیں گے۔ غش پر غش آئیں گے۔ ایسی حسین عورت سے لڑنا کیا کچھ ہلکی ہے؟ ہاتھ نہ اٹھے گا۔ منہ کی کھاؤ گے۔ اس کی ایک نگاہ تمہارا کام نام کر دے گی۔

آزاد: اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ یہاں تو دلی آرزو ہے کہ کسی نازنین کی نگاہوں کے شکار ہوں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک آدمی نے آکر کہا۔ کوئی صاحب حضرت آزاد کو ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں۔ اگر حکم ہو، تو بلا لاؤں۔ بڑے تیکھے آدمی ہیں۔ مجھ سے لڑ پڑے تھے۔ آزاد نے کہا اے اندر آنے دو۔ سپاہی کے جاتے ہی میاں خوبی اگڑتے ہوئے آ پہنچے۔ آزاد: مدت کے بعد ملاقات ہوئی، کوئی تازہ خبر کہیے۔

خوبی: کمر تو کھولنے دو، افیم گھولوں، چسکی لگاؤں تو ہوش آئے۔ اس وقت تھکا ماندہ، مرا مچا آ رہا ہوں۔ سانس تک نہیں ساتی ہے۔ آزاد: مس میڈا کا حال تو کہو!

خوبی: روز کیت گھوڑے پر سوار دریا کے کنارے جاتی ہیں۔ روز اخبار پڑھتی ہے۔ جہاں تمہارا نام آیا، بس رونے لگیں۔

آزاد: ارے، یہ انگلی میں کیا ہوا ہے جی! جل گئی تھی کیا؟

خوبی: جل نہیں گئی تھی جی، یہ اپنی صورت گلے کا ہار ہوئی۔

آزاد: اے، یا ماجرا کیا ہے؟ ایک کان کون کتر لے گیا ہے؟

خوبی: نہ ہم اتنے حسین ہوتے، نہ پریاں جان دیتیں!

آزاد: ناک بھی کچھ چھٹی معلوم ہوتی ہے۔

خوبی: صورت، صورت! یہی صورت بلائے جان ہو گئی۔ اسی کے ہاتھوں یہ دن دیکھنا

پڑا۔

آزاد: صورت، صورت نہیں، آپ کہیں سے پٹ کر آئیں ہیں۔ کمزور، مار کھانے کی

نشانی، کسی سے بھڑ پڑے ہوں گے۔ اس نے ٹھونک ڈالا ہوگا! یہی بات ہوئی ہے نا؟

خوبی: اجی، ایک پری نے پھولوں کی چھڑیوں سے سزا دی تھی۔

آزاد: اچھا، کوئی خط و ت بھی لائے ہو؟ یا چلے آئے یوں ہی ہاتھ جھلاتے؟

خوبی : دو دو خط ہیں۔ ایک مس میڈا کاڈ، دوسرا ہرنج جی کا۔
 آزاد اور خوبی نہر کے کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اب جو آتا ہے، خوبی کو دیکھ کر ہنستا ہے۔ آخر خوبی بگڑ کر بولے۔ کیا بھیڑ لگائی ہے؟ چلو، اپنا کام کرو۔
 آزاد : تم کو کسی سے کیا واسطہ، کھڑے رہنے دو۔
 خوبی : اجی نہیں، آپ سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ نظر لگا دیں گے۔
 آزاد : ہاں، آپ کا کلا ٹھلا دیکھ کر نظر لگ جائے تو تعجب بھی نہیں۔
 خوبی : اجی، وہ ایک صورت ہی کیا کم ہے! اور قسم لے لو کہ کسی مردک کو اب تک معلوم ہوا ہو کہ ہم اتنے حسین ہیں! اور ہمیں اس کا کچھ غرور بھی نہیں۔
 مطلق نہیں غرور جمال و کمال پر۔

آزاد : جی ہاں، باکمال لوگ کبھی غرور نہیں کرتے، سیدھے سادے ہوتے ہی ہیں۔
 اچھا، آپ انیم گھولے، ساتھ ہے یا نہیں؟
 خوبی : جی نہیں، اور کیا! آپ کے بھروسے آتے ہیں؟ اچھا، لاؤ، نکلواؤ۔ مگر ذرا عمدہ ہو۔ کسریٹ کے ساتھ تو ہوتی ہوگی؟

آزاد : اب تم مرے۔ بھلا یہاں انیم کہاں؟ اور کسریٹ میں؟ کیا خوب!
 خوبی : تب تو بے موت مرے۔ بھئی کسی سے مانگ لو۔
 آزاد : یہاں انیم کا کسی کو شوق ہی نہیں۔
 خوبی : اتنے شریف زادے ہیں اور اپنی ایک بھی نہیں؟ واہ!
 آزاد : جی ہاں، سب گنوار ہیں۔ مگر آج دل لگی ہوگی، جب انیم نہ ملے گی اور تم تڑپو گے، بلبلاؤ گے۔

خوبی : یہ تو ابھی سے جہانیاں آنے لگیں۔ کچھ تو فکر کرو یار!
 آزاد : اب یہاں انیم نہ ملے گی۔ ہاں، کرولیاں جتنی چاہو، منگا دوں۔
 خوبی : (انیم کی ڈبیا دکھا کر) یہ بھری ہے انیم! کیا انکو سمجھے تھے! آنے کے پہلے ہی میں نے ہرنج جی سے کہا کہ حضور، انیم منگوا دیں۔ اچھا، یہ لیجیے، ہرنج جی کا خط۔
 آزاد نے خط کھولا تو یہ لکھا تھا۔
 'مائی ڈیر آزاد،'

ذرا خوبی سے خیر و عافیت تو پوچھیے، اتنا پٹے کہ دو دانت ٹوٹ گئے، کان کٹ گئے اور گھونے اور ملے کھائے۔ آپ ان سے اتنا پوچھیے کہ لالہ رخ کون ہیں؟
تمھارا ہرنج۔

آزاد: کیوں صاحب، یہ لالہ رخ کون ہیں؟
خوبی: افوہ، ہم پر چکر چل گیا۔ واہ رے ہرنج جی، واللہ! اگر نمک نہ کھائے ہوتا تو جا کر ابھی کرولی بھونک دیتا۔

آزاد: نہیں، تمھیں واللہ، بتاؤ تو، یہ لالے رخ کون ہیں؟
خوبی: اچھا ہرنج جی، سمجھیں گے!

سودا کریں گے دل کا کسی دل رخصا کے ساتھ،

اس باوفا کو پیچیں گے ایک بے وفا کے ہاتھ۔

ہائے لالہ رخ جان جاتی ہے، مگر موت بھی نہیں آتی۔

آزاد: پٹے ہوئے ہو، کچھ حال تو بتاؤ۔ حسین ہے؟

خوبی: (چھلکا کر) جی نہیں، حسین نہیں ہے۔ کالی کلونی ہے۔ آپ بھی واللہ، نرے چونج

ہی رہے! بھلا، کسی ایسی ویسی کی جرأت کیسے ہوتی کہ ہمارے ساتھ بات کرتی! یاد رکھو، حسین

پر جب نظر پڑے گی، حسین ہی کی پڑے گی۔ دوسرے کی مجال نہیں۔

غالب

ان سیکی تنوں کے واسطے،

چاہنے والا بھی اچھا چاہیے۔

آزاد: اچھا، اب لالے رخ کا تو حال بتاؤ۔

خوبی: اجی، اپنا کام کرو، اس وقت دل قابو میں نہیں ہے۔ وہ حسن ہے کہ آپ کے

بابا جان نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ مگر ہاتھوں میں چل ہے۔ گھسنے بھر میں پانچ سات بار ضرور

چپتیاتی تھیں۔ کھوپڑی پلپلی کر دی۔ بس، ہم کو اسی بات سے نفرت تھی۔ ورنہ، تک سک سے

درست! اور چہرہ چمکتا ہوا، جیسے آبنوس! ایک دن دل لگی میں اٹھ کر ایک پچاس جوتے

لگا دیے، تڑ تڑنا! ہیں، ہیں، یہ کیا حماقت ہے، ہمیں یہ دل لگی پسند نہیں، مگر وہ سنتی کس کی

ہیں! اب فرمائیے، جس پر پچاس جوتے پڑے، اس کی کیا گت ہوگی۔ ایک روز ہنسی ہنسی میں

کان کاٹ لیا۔ ایک دن دکان پر کھڑا ہوا سودا خرید رہا تھا۔ پیچھے سے آکر دس جوتے لگا دیے۔ ایک مرتبہ ایک حوض میں ہم کو ڈھکیل دیا۔ ناک ٹوٹ گئی، مگر ہے لاکھوں میں لا جواب! طرز نگاہ نے چھین لیے زاہدوں کے دل، آنکھیں جوان کی اٹھ گئیں دست دعا کے ساتھ۔

آزاد: تو یہ کہیے، ہنسی ہنسی میں خوب جوتیاں کھائیں آپ نے!
خوبی: پھر یہ تو ہے ہی، اور عشق کہتے کسے ہیں؟ ایک دفعہ میں سو رہا تھا، آنے کے ساتھ ہی اس زور سے چابک جمائی کہ میں تپ کر چیخ اٹھا۔ بس، آگ ہو گئی کہ ہم بیٹھیں، تو تم روؤ کیوں؟ جاؤ، بس، اب ہم نہ بولیں گی۔ لاکھ منایا مگر بات تک نہ کی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ سرے بازار وہ ہمیں چپتیاں اور ہم سر جھکائے کھڑے رہیں۔
لب نے جو جھلایا تو تیری آنکھ نے مارا،

قاتل بھی رہا ساتھ مسیحا کے ہمیشہ
پردہ نہ اٹھایا کبھی چہرہ نہ دیکھایا

مشتاق رہے ہم ربخ زیا کے ہمیشہ
آزاد: کسی دن ہنسی میں آپ کو زہر نہ کھلا دے؟

خوبی: کیوں صاحب، کھلا دیں کیوں نہیں کہتے؟ کوئی کنڈے والی مقرر کی ہے۔ وہ بھی نہیں زادی ہیں! آپ کی مس میڈا پر گر پڑے تو یہ کچل جائیں۔ اچھا ہماری داستان تو سن چکے، اپنی بنتی کہو۔

آزاد: ایک نازنین ہم سے تلوار لڑنا چاہتی ہے۔ کیا رائے ہے؟ پیغام بھیجا ہے کہ کسی دن آزاد پاشا سے اور ہم سے اکیلے توار چلے۔

خوبی: مگر تم نے پوچھا تو ہوتا کہ سن کیا ہے؟ شکل و صورت کیسی ہے؟
آزاد: سب پوچھ چکے ہیں۔ روس میں اس کا مانی نہیں ہے۔ مس میڈا یہاں ہوتیں تو خوب دل لگی رہتی۔ ہاں، تم نے تو ان کا خط دیا ہی نہیں۔ تمہاری باتوں میں ایسا الجھا کہ اس کی یاد ہی نہ رہی۔

خوبی نے میڈا کا خط نکال کر دیا۔ یہ مضمون تھا۔

’پیارے آزاد،

آج کل اخباروں ہی میں میری جان بستی ہے۔ مگر کبھی کبھی تو خط بھی بھیجا کرو۔ یہاں جان پر بن آئی ہے، اور تم نے وہ چٹی سادھی ہے کہ خدا کی پناہ۔ تم سے اس بے وفائی کی امید نہ تھی۔

یوں تو منہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو،
جب میں جانوں کہ میرے بعد میرا دھیان رہے۔
تمھاری، میڈا۔؟

(69)

دوسرے دن آزاد کا اس روی نازنین سے مقابل تھا۔ آزاد کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ سویرے اٹھ کر باہر آئے تو دیکھا کہ دونوں طرف کی فوجیں آسنے سانسے کھڑی ہیں اور دونوں طرف سے توپیں چل رہی ہیں۔

خوبی دور سے ایک اونچے درخت کی شاخ بیٹھے لڑائی کا رنگ دیکھ رہے تھے اور چلا رہے تھے، ہوشیار، ہوشیار! یارو، کچھ خبر بھی ہے؟ ہائے! اس وقت اگر توڑے دار بندوق ہوتی تو پرے کے پرے صاف کر دیتا۔ اتنے میں آزاد پاشانے دیکھا کہ روی فوج کے سانسے ایک حینہ کمر میں تلوار لٹکائے، ہاتھ میں نیزہ لیے، گھوڑے پر شان سے بیٹھی سپاہیوں کو آگے بڑھنے کے لیے لٹکار رہی ہے۔ آزاد کی اس پر نگاہ پڑی تو دل میں سوچے، خدا اسے بری نظر سے بچائے۔ یہ تو اس قابل ہے کہ اس کی پوجا کرے۔ یہ، اور میدان جنگ! ہائے ہائے، ایسا نہ ہو کہ اس پر کسی کا ہاتھ پڑ جائے۔ غضب کی چیز ہے یہ حسن، انسان لاکھ چاہتا ہے، مگر دل گھنچ ہی جاتا ہے، طبیعت آہی جاتی ہے۔ اس حینہ نے جو آزاد کو دیکھا تو یہ شعر پڑھا۔

سنبل کے رکھو قدم راو عشق میں مجنوں،

کہ اس دیار میں سودا برہنہ پائی ہے۔

یہ کہہ کر گھوڑا بڑھایا۔ آزاد کے گھوڑے کے طرف جھکی اور جھکتے ہی ان پر تلوار کا دار کیا۔ آزاد نے دار خالی دیا اور تلوار کو چوم لیا۔ ترکوں نے اس زور سے نعرہ مارا کہ کوسوں تک میدان گونجنے لگا۔ مس کلاریا نے جھلا کر گھوڑے کو پھیرا اور چاہا کہ آزاد کو دو کلڑے کر دے، مگر جیسے ہی ہاتھ اٹھایا، آزاد نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور تلوار کو اپنی تلوار سے روک کر

ہاتھ سے اس پری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ترکوں نے پھر نعرہ مارا اور روسی جھینپ گئے۔ مس کلاریا بھی لجائیں اور مارے غصے کے جھلا کر واد کرنے لگیں۔ بار بار چوٹ آتی تھی، مگر آزاد کی یہ کیفیت تھی کہ کچھ چوٹیں تلوار پر روکیں اور کچھ خالی دیں۔ آزاد اس سے لڑ تو رہے تھے، مگر واد کرتے دل کانپتا تھا۔ ایک دفعہ اس شیر دل عورت نے ایسا ہاتھ جمایا کہ کوئی دوسرا ہوتا، تو اس کی لاش زمین پر پھڑکتی نظر آتی، مگر آزاد نے اس طرح بچایا کہ ہاتھ بالکل خالی گیا جب اس خاتون نے دیکھا کہ آزاد نے ایک چوٹ بھی نہیں کھائی تو پھر جھنجھلا کر اتنے واد کیے کہ دم لینا بھی مشکل ہو گیا۔ مگر آزاد نے ہنس کر چوٹیں بچائیں۔ آخر اس نے ایسا تلا ہوا ہاتھ گھوڑے کی گرد پر جمایا کہ گردن کٹ کر دور جا گری۔ آزاد فوراً کود پڑے اور چاہتے تھے کہ اچھل کر مس کلاریا کے ہاتھ سے تلوار چھین لیں کہ اس نے گھوڑے کو چابک جمائی اور اپنی فوج کی طرف چلی۔ آزاد سنہلنے بھی نہ پائے تھے کہ گھوڑا ہوا ہو گیا۔ آزاد گھوڑے پر لٹکے رہ گئے۔

جب گھوڑا روس کی فوج میں داخل ہوا تو روسیوں نے تین بار خوشی سے آوازیں لگائیں اور کوئی چالیں پچاس آدمیوں نے آزاد کو گھیر لیا۔ دس آدمیوں نے ایک ہاتھ پکڑا، پانچ نے دوسرا ہاتھ۔ دو چار نے ٹانگ لی۔ آزاد بولے۔ بھئی، اگر میرا ایسا ہی خوف ہے تو میرے ہتھیار رکھ لو اور قید کر دو۔ دس آدمیوں کا پہرہ رہے۔ ہم بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ اگر تمہارے یہی ہتھکنڈے ہے تو دس پانچ دن میں ترک جوان آپ ہی آپ بندھے چلے جائیں گے۔ مس کلاریا کی طرح پندرہیں پریاں مورچے پر جائیں تو شاید ترکی کی طرف گولندازی بھی بند ہو جائے!

ایک سپاہی: شکے ہوئے چلے آئے، ساری دلیری دھری رہی گئی!

دوسرا سپاہی: واہ ری کلاریا؟ کیا بھڑکتی ہے!

آزاد: اس میں تو شک نہیں کہ اس وقت ہم شکار ہو گئے۔ مس کلاریا کی ادا نے مار

ڈالا۔

ایک افسر: آج ہم تمہاری گرفتاری کا جشن منائیں گے۔

آزاد: ہم بھی شریک ہوں گے۔ بھلا، کلاریا بھی ناچیں گی؟

افسر: اجی، وہ آپ کو انگلیوں پر نچائیں گی۔ آپ ہیں کس بھروسے؟

آزاد: اب تو خدا ہی بچائے تو نہیں۔ برے بچنے۔
 تیری گلی میں ہم اس طرح سے ہیں آئے ہوئے
 شکار ہو کوئی جس طرح چوٹ کھائے ہوئے
 افسر: آج تو ہم پھولے نہیں ساتے۔ بڑے نوڑھ کو پھانسا۔
 آزاد: ابھی خوش ہو لو، مگر ہم بھاگ جائیں گے۔ مس کلاریا کو دیکھ کر طبیعت لہرائی،
 ساتھ چلے آئے۔

افسر: واہ، اچھے جواں مرد ہو! آئے لڑنے اور عورت کو دیکھ کر پھسل پڑے۔ سورما کہیں
 عورت پر پھسلا کرتے ہیں؟

آزاد: بوڑھے ہو گئے ہونہ! ایسا تو کہا ہی چاہو۔
 افسر: ہم تو آپ کی شہسواری کی بڑی دھوم سنتے تھے! مگر بات کچھ اور ہی نکلی۔ اگر آپ
 میرے مہمان نہ ہوتے تو ہم آپ کے منہ پر کبھی دیتے کہ آپ شہدے ہیں۔ بھلے آدمی، کچھ تو
 غیرت چاہیے۔

اتنے میں ایک روسی سپاہی نے آکر افسر کے ہاتھ میں ایک خط رکھ دیا۔ اس نے پڑھا
 تو یہ مضمون تھا۔

(1) حکم دیا جاتا ہے کہ میاں آزاد کو سائبیریا کے ان میدانوں میں بھیجا جائے، جو سب
 سے زیادہ سرد ہے۔
 (2) جب تک یہ آدمی زندہ رہے، کسی سے بولنے نہ پائے۔ اگر کسی سے بات کرے تو
 دونوں پر سوسو پینٹ پڑے۔

(3) کھانا صرف ایک وقت دیا جائے۔ ایک دن آدھ سیر ابالا ہوا ساگ اور دوسرے
 دن گڑ اور روٹی۔ پانی کے تین کٹورے رکھ دیے جائیں، چاہے ایک ہی بار پی جائے چاہے
 دس بار پیے۔

(4) دس سیر آٹا روز پیے اور دو گھنٹے روز دلیل بولی جائے۔ چلی کا پاٹ سر پر رکھ کر چکر
 لگائے۔ ذرا دم نہ لینے پائے۔

(5) غنٹے میں ایک بار برف میں کھڑا کر دیا جائے اور باریک کپڑا پہننے کو دیا جائے۔
 آزاد: بات تو اچھی ہے، گرمی نکل جائے گی۔

افسر: اس بھروسے بھی نہ رہتا۔ آدمی رات کو سر پر پانی کا تڑیڑا روز دیا جائے گا۔
 آزاد منہ سے تو ہنس رہے تھے، مگر دل کانپ رہا تھا کہ خدا ہی خیر کرے۔ اوپر سے حکم
 آ گیا تو فریاد کس سے کریں اور فریاد کریں بھی تو سنتا کون ہے؟ بولے، ختم ہو گیا یا اور کچھ
 ہے۔

افسر: تمہارے ساتھ اتنی رعایت کی گئی ہے کہ اگر مس کلاریا رحم کریں تو کوئی ہلکی سزا
 دی جائے۔

آزاد: تب تو وہ ضرور ہی معاف کر دیں گی۔

یہ کہہ کر آزاد نے نے یہ شعر پڑھا۔

کھول دی ہے زلف کس نے پھول سے رخسار پر

چھا گئی کالی گھٹا ہے آن کر گلزار پر

افسر: اب تمہارے دیوانہ پن میں ہمیں کوئی شک نہ رہا۔

آزاد: دیوانہ کہو، چاہے پاگل بناؤ۔ ہم تو مر گئے۔

سختیاں ایسی اٹھائیں ان بتوں کے ہجر میں

رنج سہتے سہتے پتھر کا کلیجہ ہو گیا۔

(70)

شام کے وقت ہلکی پھلکی اور صاف ستھری چھول داری میں مس کلاریا بناؤ چٹاؤ کر کے
 ایک نازک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ چاندنی نکھری ہوئی تھی، پیڑ اور پتے دودھ میں نہائے ہوئے
 اور ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ادھر میاں آزاد قید میں پڑے ہوئے حسن آرا کو یاد کر کے سر
 دھننے تھے کہ ایک آدمی نے آکر کہا۔ چلیے، آپ کو مس صاحب بلاتی ہیں۔ آزاد چھول داری
 کے قریب پہنچے تو سوچنے لگے، دیکھیں، یہ کس طرح پیش آتی ہے۔ اگر کہیں سائبریا بھیج دیا تو
 بے موت ہی مر جائیں گے۔ اندر جا کر سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کلاریا
 نے ٹیکسی چتون کر کہا۔ کیسے، مزاج ٹھنڈا ہوا یا نہیں؟

آزاد: اس وقت تو حضور کے پنچے میں ہوں، چاہے قتل کیجیے، چاہے سولی دیجیے۔

کلاریا: جی تو نہیں چاہتا کہ تمہیں سائبریا بھیجوں، مگر وزیر کے حکم سے مجبور ہوں

دور نے مجھے اختیار تو دے دیا ہے کہ چاہوں تو تمہیں چھوڑ دوں، لیکن بدنامی سے ڈرتی ہوں۔ جاؤ، رخصت!

فوج کے افسر نے حکم دیا کہ سو سوار آزاد کو لے کر سرحد پر پہنچا آئیں ان کے ساتھ کچھ دور چلنے کے بعد آزاد نے پوچھا۔ کیوں یارو، اب جان بچنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

ایک سپاہی: بس، ایک صورت ہے کہ جو سوار تمہارے ساتھ جائیں وہ تمہیں چھوڑ دیں۔

آزاد: بھلا، وہ لوگ کیوں چھوڑنے لگے؟

سپاہی: تمہاری جوانی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہم ساتھ چلے تو ضرور چھوڑ دیں گے۔ تیسرے دن آزاد پاشا سائبیریا جانے کو تیار ہوئے۔ سو سپاہی پرے جمائے ہوئے، ہتھیاروں سے لیس، ان کے ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ جب آزاد گھوڑے پر سوار ہوئے تو ہزار ہا آدمی ان کی حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ کتنی ہی عورتیں رومال سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ایک عورت اتنی بے قرار ہوئی کہ جا کر افسر سے بولی۔ حضور، یہ آپ بڑا غضب کرتے ہیں۔ ایسے بہادر آدمی کو آپ سائبیریا بھیج رہے ہیں۔

افسر: میں مجبور ہوں۔ سرکاری حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔

دوسری استری: اس بے چارے کی جان کا خدا حافظ ہے۔ بے قصور جان جاتی ہے۔ تیسری استری: آؤ۔ سب کو سب مل کر چلیں اور مس صاحب سے سفارش کریں۔ شاید دل پہنچ جائے۔

یہ باتیں کر کے وہ کئی عورتوں کے ساتھ مس کلاریا کے پاس جا کر بولی۔ حضور، یہ کیا غضب کرتی ہیں! اگر آزاد مر گئے تو آپ کی کتنی بڑی بدنامی ہوگی؟ کلاریا: ان کو چھوڑنا میرے امکان سے باہر ہے۔

وہ استری: کتنی ظالم! کتنی بے رحم ہو! ذرا آزاد کی صورت تو چل کر دیکھ لو۔

کلاریا: کچھ نہیں جانتے!

اب تک تو آزاد کو امید تھی کہ شاید مس کلاریا مجھ پر رحم کریں، لیکن جب ادھر سے کوئی امید نہ رہی اور معلوم ہو گیا کہ بنا سائبیریا گئے جان نہ بچے گی تو رونے لگے۔ اتنے زور سے

چنے کہ مس کلاریا کے بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے اور تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ گھوڑے سے گر پڑے۔

ایک سپاہی: ارے یارو، اب یہ مر جائے گا۔
 دوسرا سپاہی: مرے یا جیے، سائیریا تک پہنچنا ضروری ہے۔
 تیسرا سپاہی: بھئی، چھوڑ دو۔ کہہ دیتا، راستے میں مر گیا۔
 چوتھا سپاہی: ہماری فوج میں ایسا خوبصورت اور کڑیل جوان دوسرا نہیں ہے۔ ہماری سرکار کو ایسے بہادر افسر کی قدر کرنی چاہیے تھی۔
 پانچواں سپاہی: اگر آپ سب لوگ ایک رائے ہوں تو ہم اس کی جان بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالیں۔ مگر تم لوگ ساتھ نہ دو گے۔
 چھٹا سپاہی: پہلے اسے ہوش میں لانے کی فکر تو کرو۔
 جب پانی کے خوب چھیننے دیے گئے تو آزاد نے کروٹ بدلی۔ سواروں کی جان میں جان آئی۔ سب ان کو لے کر آگے بڑھے۔

(71)

آزاد تو سائیریا کی طرف روانہ ہوئے، ادھر خوبی نے درخت پر بیٹھے بیٹھے افیم کی ڈبیا نکالی۔ وہاں پانی کہاں؟ ایک آدمی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ آپ نے اس سے کہا— بھائی جان، ذرا پانی پلا دو۔ اس نے اوپر دیکھا، تو ایک بوتلا بیٹھا ہوا ہے۔ بولا— تم کون ہو؟ دل لگی یہ ہوئی کہ وہ فرانسسی تھا۔ خوبی اردو میں بات کرتے تھے، وہ فرانسسی میں جواب دیتا تھا۔
 خوبی: افیم گھولیں گے میاں! ذرا سا پانی دے ڈالو بھائی!
 فرانسسی: واہ، کیا صورت ہے! پہاڑ پر نہ جا کر بیٹھو؟
 خوبی: بھئی واہ رے ہندستان! واللہ، اس فصل میں سیلوں پر پانی ملتا ہے، کیڑے کا بسا ہوا۔ ہندو پوسرے بیٹھتے ہیں اور تم ذرا پانی بھی نہیں دیتے۔
 فرانسسی: کہیں اوپر سے گر نہ پڑنا۔
 خوبی: (اشارے سے) ارے میاں پانی پانی!
 فرانسسی: ہم تمہاری بات نہیں سمجھتے۔

خوبی : اترنا پڑا ہمیں! اے، اوگیدی، ذرا سا پانی کیوں نہیں دے جاتا؟ کیا پاؤں کی مہندی گر جائے گی؟

فرانسیسی نے جب اب بھی پانی نہ دیا تو خوبی اوپر سے بچے توڑ توڑ پھینکنے لگے۔ فرانسیسی حملہ کر بولا۔ بچے، کیوں شائیں آئی ہیں۔ اوپر آکر اتنے میں گھونے لگاؤں گا کہ ساری شرارت نکل جائے گی۔ خوبی نے اوپر سے ایک شاخ توڑ کر پھینکی۔ فرانسیسی نے اتنے ڈھیلے مارے کہ خوبی کی کھوپڑی جانتی ہوگی۔ اتنے میں ایک ترک آ نکلا۔ اس نے سمجھا بھا کر خوبی کو نیچے اتارا۔ خوبی نے انیم گھولی، چسکی لگائی اور پھر درخت پر جا کر ایک سوئی شاخ سے تک کر پینک لینے لگے۔ اب سینے کے ترکوں اور روسیوں میں اس وقت خوب گولے چل رہے تھے۔ ترکوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا، مگر فرانسیسی توپ خانے نے ان کے جھٹکے جھڑا دیے اور ان کا سردار آصف پاشا گولی کھا کر گر پڑا۔ ترک تو ہار کر بھاگ نکلے۔ روسیوں کی ایک پلٹن نے اس میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ خوبی پینک سے چونک کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک روسی جوان کی نظر ان پر پڑی۔ بولا — کون؟ تم کون ہو؟ ابھی اتر جاؤ۔

خوبی نے سوچا، ایسا نہ ہو کہ پھر ڈھیلے پکڑنے لگیں۔ نیچے اتر آئے۔ ابھی زمین پر پاؤں بھی نہ رکھا تھا کہ روسی نے ان کو گود میں اٹھا کر پھینکا تو دھم سے زمین پر گر گئے۔

خوبی : اوگیدی، خدا تم سے اور تمہارے باپ سے سمجھے!

ایک روسی : بھئی، یہ پاگل ہے کوئی۔

دوسرا : اس کو فوج کے ساتھ رکھو۔ خوب دل لگی رہے گی۔

روسیوں نے کئی ترک سپاہیوں کو قید کر لیا تھا۔ خوبی بھی انہی کے ساتھ رکھ دیے گئے۔ ترکوں کو دیکھ کر انھیں ذرا تسکین ہوئی۔ ایک ترک بولا — تم تو آزاد کے ساتھ آئے تھے نا؟ تم ان کے کون ہو؟

خوبی : میرا لڑکا ہے جی، تم نوکر بتاتے ہو۔

ترک : ایس، آپ آزاد پاشا کے باپ ہیں!

خوبی : ہاں، ہاں، تو اس میں تعجب کی کون بات ہے۔ میں نے ہی تو آزاد کو مار مار کر لڑنا سکھایا۔

ترکوں نے خوبی کو آزاد کا باپ سمجھ کر فوجی قاعدے سے سلام کیا۔ جب خوبی رونے

لگے۔ ارے یارو، کہیں سے تو ہمیں لڑکے کی صورت دیکھا دو۔ کیا تم کو اسی دن کے لیے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا؟ اب تمہاری ماں کو کیا صورت دکھاؤں گا؟
 ترک: آپ زیادہ بے یقینی نہ ہوں۔ آزاد ضرور چھوٹیں گے۔
 خوجی: بھئی، مجھے تو بڑھاپے میں داغ دے گئے۔
 ترک: حضور، اب دل کو سنبھالیں۔
 خوجی: بھئی، میری اتنی عزت نہ کرو نہیں تو روسیوں کو شک ہو جائے گا کہ یہ آزاد پاشا کے باپ ہیں۔ تب بہت تنگ کریں گے۔
 ترک: خدا نے چاہا تو افسر لوگ آپ کو ضرور چھوڑ دیں گے۔
 خوجی: جیسی مولا کی مرضی!

(72)

بڑی بیگم کا باغ پری خانہ بنا ہوا ہے۔ چاروں بہنیں روشوں میں اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ نازوں ادا سے تول تول کر قدم دھرتی ہیں۔ عباسی پھول توڑ توڑ کر جمولیاں بھر رہی ہیں۔ اتنے میں سپہر آرا نے شوخی کے ساتھ گلاب کا پھول توڑ کر کیتی آرہ کی طرف پھینکا۔ کیتی آرہ نے اچھالا تو سپہر آرا کی زلف کو چھوتا ہوا نیچے گرا۔ حسن آرا نے کئی پھول توڑے اور جہان آرہ بیگم سے گیند کھیلنے لگیں۔ جس وقت گیند پھینکنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھیں، ہتم ڈھاتی تھیں۔ وہ کمر کا چکنا اور گیسو کا بکھرتا، پیارے پیارے ہاتھوں کی لوچ اور مسکرا مسکرا کر نشانے بازی کرنا عجب لطف دکھاتا تھا۔

عباسی: ماشا اللہ، حضور کس صفائی کے ساتھ پھینکتی ہیں!
 سپہر آرا: بس عباسی، اب بہت خوشامد کی نہ لو۔ کیا جہاں آرہ بہن صفائی سے نہیں پھینکتی؟ باجی ذرا جمپشی زیادہ ہیں۔ مگر ہم سے نہ جیت پائیں گی۔ دیکھ لینا۔
 عباسی: جس صفائی سے حسن آرا بیگم گیند کھیلتی ہیں، اس صفائی سے جہان آرہ بیگم کا ہاتھ نہیں جاتا۔

سپہر آرا: میرے ہاتھ سے بھلا پھول گر سکتا ہے! کیا مجال!
 اتنے میں جہاں آرہ بیگم نے پھول کو نوچ ڈالا اور اف کہہ کر بولیں۔ اللہ جانتا ہے،

ہم تو تھک گئے۔

پہرہ آرا: اے واہ، بس اتنے میں ہی تھک گئیں؟ ہم سے کہیے، شام تک کھیا کریں۔
اب سنے کہ ایک دوست نے مرزا ہمایوں فرکو جا کر اطلاع دی کہ اس وقت باغ میں
پریاں ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں۔ اس وقت کی کیفیت دیکھنے قابل ہے۔ شہزادے نے یہ خبر سنی تو
بولے۔ بھئی، خوش خبری تو سنا، مگر کوئی تدبیر تو بتاؤ۔ ذرا آنکھیں ہی سینک لیں۔ ہاں، ہیرا
مالی کو بلواؤ۔ ذرا دیکھیں۔

ہیرا نے آکر سلام کیا۔

شہزادہ: بھئی، اس وقت کسی حکمت سے اپنے باغ کی سیر کراؤ۔

ہیرا: خداوند، اس وقت تو محاف کریں، سب وہیں ہیں۔

شہزادہ: آلو ہی رہے، ارے میاں، وہاں سناٹا ہوتا تو جا کر کیا کرتے! سنا ہے، چاروں
پریاں وہیں ہیں۔ باغ پرستان ہو گیا ہوگا! ہیرا، لے چل، تجھے اپنے ناراین کی قسم! جو مانگ،
فوراً دوں۔

ہیرا: حضور ہی کا نمک کھاتا ہوں یا کسی اور کا؟ مگر اس وقت موقع نہیں ہے۔

شہزادہ: اچھا، ایک شعر لکھ دوں، وہاں پہنچا دو۔

یہ کہہ کر شہزادہ نے یہ شعر لکھا۔

چھکایا تو نے ایک عالم کو ساقی جامِ مٹکو سے

ہمیں بھی کوئی ساغر، ہم بھی ہیں امید داروں میں

ہیرا یہ رقعہ لے کر چلا۔ شہزادے نے سمجھا دیا کہ پہرہ آرا کو چپکے سے دے دینا۔ ہیرا گیا
تو دیکھا کہ مہاسی اور بوڑھی مہری میں ٹکراؤ ہو رہی ہے۔ صبح کے وقت مہاسی حسن آرا کے
لپے کھارن کے یہاں سے دو جھنجھریاں لائی تھی۔ دام ایک آتا بتایا۔ بڑی بیگم نے جو یہ
جھنجھریاں دیکھیں تو مہری کو حکم دیا کہ ہمارے واسطے بھی لاؤ۔ مہری ویسی ہی جھنجھریاں دو آنے
کی لائی۔ اس وقت مہاسی ڈپک مارنے لگی کہ میں جتنی سستی لاتی ہوں، کوئی دوسرا بھلا لا تو
دے۔ مہری اور مہاسی میں پرانی چٹک تھی۔ بولی۔ ہاں بھئی، تم کیوں نہ سستی چیز لاؤ۔ ابھی
کم سن ہو نہ؟

مہاسی: تم بھی تو کسی زمانے میں جوان تھیں۔ بازار بھر کو لوٹ لائی ہوئی۔ میرے منہ

نہ لگتا۔

مہری : ہوش کی دوا کر چھو کری! بہت بڑھ کر باتیں نہ بنا موئی! زمانے بھر کی آوارہ! اور سنو!

عہاسی : دیکھیے حضور، یہ لام قاف زبان سے نکالتی ہیں۔ اور میں حضور کا لحاظ کرتی ہوں۔ جب دیکھو، طعنے کے سوا بات ہی نہیں کرتیں۔

مہری : منہ پکڑ کر مجلس دیتی مراد کا!

عہاسی : منہ مجلس اپنے ہوتوں سوتوں کا۔

مہری : حضور، اب ہم نوکری چھوڑ دیں گے۔ ہم سے یہ باتیں نہ سنی جائیں گی۔

عہاسی : ایں، تم تو بے چاری نضی ہو۔ ہی گردن مارنے کے قابل ہیں! سچ ہے، اور کیا! سپہر آرا : سارا قصور مہری کا ہے۔ یہی روز لڑا کرتی ہے عہاسی سے۔

مہری : اے حضور، سچ پی ہزار نعمت پائی! جو میں ہی جھگڑا لو ہوں تو بسم اللہ، حضور لونڈی کو آزاد کر دیں۔ کوئی بات نہ چیت، آپ ہی گالی گفٹے پر آمادہ ہو گئی۔

جہاں آرا : لڑیں گے جوگی جوگی اور جائے گی کھپڑوں کے ماتھے! اماں جان سن لیں گی تو ہم سب کی خبر لیں گی۔

عہاسی : حضور ہی انصاف سے کہیں۔ پہل کس کی طرف سے ہوئی؟

جہاں آرا : پہل تو مہری نے کی۔ اس کے کیا معنی کہ تم جوان ہو، اس سے سستی چیز مل جاتی ہے؟ جس کو گالی دوگی، وہ برا مانے گی ہی۔

حسن آرا : مہری، تمہیں یہ سوجھی کیا؟ جوانی کا کیا ذکر تھا بھلا!

عہاسی : حضور، میرا قصور ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

مہری : میرے اللہ، عورت کیا، بش کی گانٹھ ہے۔

عہاسی : جو چاہو سو کہہ لو، میں ایک بات کا بھی جواب نہ دوں گی۔

مہری : ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر لگایا کرتی ہے۔ میں تو اس کی نس نس سے واقف

ہوں۔

عہاسی : اور میں تو تیری قبر تک سے واقف ہوں!

مہری : ایک کو چھوڑا، دوسرے کے گھر بیٹھی، اس کو کھایا، اب کسی اور کو چٹ کرے گی۔

اور باتیں کر رہی ہے!

ستر..... کے بعد کچھ کہنے ہی کو تھی کہ عنباسی نے سینکڑوں گالیاں سنائی اور ایسی جاے سے باہر ہوئی کہ دوپٹہ ایک طرف اور خود دوسری طرف۔ ہیرا مالی نے بڑھ کر دوپٹہ دیا تو کہا۔ چل ہٹ، اور سنو! اس موئے بوڑھے کی باتیں! اس پر قہقہہ پڑا۔ شور سنتے ہی بڑی بیگم صاحب، لاشی ٹپکتی ہوئی آ پہنچی، مگر یہ سب چہل میں مست تھیں۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ بڑی بیگم: یہ کیا شہدہ پن مچا تھا؟ بڑے شرم کی بات ہے۔ آخر کچھ کہو تو؟ یہ کیا دھما چوڑی مچی تھی؟ کیوں مہری، یہ کیا شور مچا تھا؟

مہری: اے حضور، بات منہ سے نکل اور عنباسی نے ٹینوا لیا۔ اور کیا بتاؤں۔

بڑی بیگم: کیوں عنباسی، سچ سچ بتاؤ! خبردار!

عنباسی: (رو کر) حضور!

بڑی بیگم: اب ٹیسوئے پیچھے بنانا پہلے ہماری بات کا جواب دو۔

عنباسی: حضور، جہاں آرا بیگم سے پوچھ لیں، ہمیں آوارہ کہا، بیسوا کہا، کوسا، گالیاں دیں، جو زبان پر آیا، کہہ ڈالا۔ اور حضور، ان آنکھوں کی ہی قسم کھاتی ہوں، جو میں نے ایک بات کا بھی جواب دیا ہو۔ چپ سنا کی۔

بڑی بیگم: جہاں آرا کیا بات ہوئی تھی؟ بتاؤ صاف صاف۔

جہاں آرا: اماں جان، عنباسی نے کہا ہم دو جھنجھریاں ایک آنے کو لائے اور مہری نے دو آنے دیے، اسی بات پر تکرار ہو گئی۔

بڑی بیگم: کیوں مہری، اس کے کیا معنی؟ کیا جوانوں کو بازار والے مفت اٹھا دیتے ہیں؟ بال سفید ہو گئے، مگر ابھی تک آوارہ پن کی بو نہیں گئی۔ ہم نے تم کو موقوف کیا مہری! آج ہی نکل جاؤ۔

اتنے میں موقع پا کر ہیرا نے سپہر آرا کو شہزادے کا خط دیا۔ سپہر آرا نے پڑھ کر یہ جواب لکھا۔ بھئی، تم تو غضب کے جلد باز ہو۔ شادی میاہ بھی گھوڑا منہ کا نوالہ ہے! تمہاری طرف سے تو پیغام آتا ہی نہیں۔ ہیرا خط لے کر چل دیا۔

کوشے پر چوکا بچا ہے اور ایک نازک پلنگ پر رثیا بیگم سادی اور ہلکی پوشاک پہنے آرام سے لیٹی ہیں۔ ابھی حمام سے آئی ہیں۔ کپڑے عطر میں بے ہوئے ہیں۔ ادھر ادھر پھولوں کے ہار اور گجرے رکھے ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ مگر تب بھی مہری پکھا لیے کھڑی ہے۔ اتنے میں ایک مہری نے آکر کہا۔ داروغہ جی حضور سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ بیگم صاحب نے کہا۔ اب اس وقت کون اٹھے۔ کہو، صبح کو آئیں۔ مہری بولی۔ حضور، کہتے ہیں، بڑا ضروری کام ہے۔ حکم ہوا کہ دو عورتیں چادر تانے رہیں اور داروغہ صاحب چادر کے اس پار بیٹھیں۔ داروغہ صاحب نے آکر کہا۔ حضور، اللہ نے بڑی خبر کی، خدا کو کچھ اچھا ہی کرنا منظور تھا۔ ایسے بڑے پھنسنے تھے کہ کیا کہیں!

بیگم: ایں، تو کچھ کہو گے بھی؟

داروغہ: حضور، بدن کے روئیں کھڑے ہوتے ہیں۔

اس پر عباسی نے کہا۔ داروغہ جی، گھاس تو نہیں کھا گئے ہو! دوسری مہری بولی۔ حضور، سٹھیا گئے ہیں۔ تیسری نے کہا۔ بوکھلائے ہوئے آئے ہیں۔ داروغہ صاحب بہت جھلکے۔ بولے۔ کیا قدر ہوتی ہے، واہ! ہماری سرکار تو کچھ بولتیں ہی نہیں اور مہریاں سر چڑھی جاتی ہیں۔ حضور اتنا بھی نہیں کہتیں کہ بوڑھا آدمی ہے۔ اس سے نہ بولو۔

بیگم: تم تو جج دیوانے ہو گئے ہو۔ جو کہنا ہے، وہ کہتے کیوں نہیں؟

داروغہ: حضور، دیوانہ سمجھیں یا گدھا بنائیں، غلام آج کانپ رہا ہے۔ وہ جو آزاد ہیں، جو یہاں کئی بار آئے بھی تھے، وہ بڑے معارف، شاعری، چور، نامی ذکیت، پرلے سرے کے بگڑے باز، کالے جواہری، دھات شرابی، زمانے بھر کے بدمعاش، چھٹے ہوئے گرگے، ایک ہی شریر اور بد ذات آدمی ہیں۔ طوطی کا پنجڑا لے کر وہی عورت کے بھیش میں آیا تھا۔ آج سنا، کسی نواب کے یہاں بھی گئے تھے۔ وہ آزاد، جن کے دھوکے میں آپ ہیں، وہ تو روم گئے ہیں۔ ان کا اُن کا مقابلہ کیا! وہ عالم، فاضل، یہ بے ایمان بدمعاش۔ یہ بھی اس نے غلط کہا کہ حسن آرا بیگم کا میاں ہو گیا۔

بیگم: داروغہ، بات تو تم پتے کی کہتے ہو، مگر یہ باتیں تم سے بتائی کس نے؟

داروغہ: حضور، وہ چندوباز جو آزاد مرزا کے ساتھ آیا تھا۔ اسی نے مجھ سے بیان کیا۔

بیگم: اے ہے، اللہ نے بہت بچایا۔

مہری: اور باتیں کیسی چکنی چڑی لرتا تھا؟

داروغہ صاحب چلے گئے تو بیگم نے چندوباز کو بلایا۔ مہریوں نے پردہ کرنا چاہا تو بیگم

نے کہا۔ جانے بھی دو۔ بوڑھے کھوٹ سے پردہ کیا؟

چندوباز: حضور، کچھ اوپر سوئرس کا سن ہے۔

بیگم: ہاں، آزاد مرزا کا تو حال کہو۔

چندوباز: اس کے کالے کا منتر ہی نہیں۔

بیگم: تم سے کہاں ملاقات ہوئی؟

چندوباز: ایک دن راستے میں مل گئے۔

بیگم: وہ تو قید نہ تھے! بھاگے کیوں کر؟

چندوباز: حضور، یہ نہ پوچھیے، تین تین پہرے تھے۔ مگر خدا جانے، کس جادو منتر سے

تینوں کو ڈھیر کر دیا اور بھاگ نکلا۔

بیگم: اللہ بچائے ایسے موذی سے۔

چندوباز: حضور، مجھے بھی خوب سبز باغ دیکھایا۔

مہری: اللہ جانتا ہے، میں اس کی آنکھوں سے تازگئی تھی کہ بڑا نٹ کھٹ ہے۔

چندوباز: حضور، یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ قید سے بھاگ کر تھانے دار کے مکان پر

گیا اور اسے بھی قتل کر دیا۔

بیگم: سب آدمیوں میں سے نکل بھاگا؟

مہری: آدی ہے کہ جکات؟

عنہاسی: حضور، ہمیں آج ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو، ہمارے یہاں بھی چوری

کرے۔

چندوباز رخصت ہو کر گئے تو رشتا بیگم سو گئیں۔ مہریاں بھی بیٹھیں، مگر عنہاسی کی آنکھوں

میں نیند نہ تھی۔ مارے خوف کے اتنی ہمت بھی نہ باقی رہی کہ اٹھ کر پانی تو پیتی۔ پیاس سے

تالو میں کانٹے پڑے تھے۔ مگر دہکی پڑی تھی۔ اسی وقت ہوا کے جھونکوں سے ایک کاغذ اڑ کر

اس کی چارپائی کے قریب کھڑکھڑایا تو دم نکل گیا۔

سپاہی نے آواز دی۔ ”سونے والے جاگتے رہو“ اور یہ کانپ اٹھی۔ ڈر تھا، کوئی چٹ نہ جائے۔ لاشیں آنکھوں تلے پھرتی تھیں۔ اتنے میں بارہ کا مگر ٹھنٹھن بجا۔ تب عباسی نے اپنے دل میں کہا، ارے، ابھی بارہ ہی بجے۔ ہم سمجھے تھے کہ سویرا ہو گیا۔ ایک ایک کوئی دھاگ کی دھن میں گانے لگا۔

سپاہیا جاگت رہیو،

اس نگری کے دس دروازے نکل گیا کوئی اور۔

سپاہیا جاگت رہیو۔

عباسی سنتے سنتے سو گئی، مگر تھوڑی ہی دیر میں ٹھنا کے کی آواز آئی تو جاگ اٹھی۔ آدمی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ ہاتھ پاؤں کاپنے لگے۔ اتنے میں بیگم صاحب نے پکارا۔ ”عباسی، پانی پلا۔ عباسی نے پانی پلایا اور بولی۔ حضور، اب کبھی لاشوں واشوں کا ذکر نہ کیجیے گا۔ میرا تو عجب حال تھا۔ ساری رات آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔

بیگم: ایسا بھی ڈر کس کام کا، دن کو شیر، رات کو بھیڑ۔

بیگم صاحب سونے کو ہی تھیں کہ ایک آدمی نے پھر گانا شروع کیا۔

بیگم: اچھی آواز ہے۔

عباسی: پہلے بھی گا رہا تھا۔

مہری: ایں، یہ وکیل ہیں!

کچھ دیر تک تینوں باتیں کرتے کرتے سو گئیں۔ سویرے منہ اندھیرے مہری اٹھی تو دیکھا کہ بڑے کمرے کا تالا ٹوٹا پڑا ہے۔ دو صندوق ٹوٹے پھوٹے ایک طرف رکھے ہوئے ہیں اور اسباب سب تتر بتر۔ غل مچا کر کہا۔ ارے! لٹ گئی، ہائے لوگوں، لٹ گئی! گھر میں کہرام مچ گیا۔ داروغہ صاحب دوڑ پڑے۔ ارے، یہ کیا غضب ہو گیا۔ بیگم کی بھی نیند کھلی۔ یہ حالت دیکھی تو ہاتھ مل کر کہا۔ لٹ گئی! یہ شور غل سن کر پڑوسن غل مچاتی ہوئی کوشے پر آئیں اور بولیں۔ بہن، یہ ہم چیخ کیسی ہے! یہ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے!

بیگم: بہن، میں تو مر رہی۔

پڑوسن: کیا چوری ہو گئی؟ دو بجے تک تو میں آپ لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ یہ چوری

کس وقت ہوئی؟

عباسی: بہن، کیا کہوں، ہائے!

پڑوسن: دیکھیے تو اچھی طرح۔ کیا کیا لے گیا، کیا کیا چھوڑ گیا؟

بیگم: بہن، کس کے ہوش ٹھکانے ہیں۔

عباسی: مجھ جلم جلی کو پہلے ہی کھٹکا ہوا تھا۔ کان کھڑے ہو گئے، مگر پھر کچھ سنا ہی نہ دیا۔

میں نے کچھ خیال نہ کیا۔

داروغہ: حضور، یہ کسی شیطان کا کام ہے۔ پاؤں تو کھا ہی ڈالوں۔

مہری: جس ہاتھ سے صندوق توڑے، وہ کٹ کر گر پڑیں۔ جس پاؤں سے آیا اس میں

کیزے پڑیں۔ مرے گا بلک بلک کر۔

عباسی: اللہ کرے، اٹھو اے ہی میں کھنیا نچپاتی نکلے۔

مہری: مگر عباسی، تم بھی ایک ہی کل ڈھکی ہو۔ وہی ہوا۔

ثریا: بیگم نے اسباب کی جانچ کی تو آدھے سے زیادہ غائب پایا۔ رو کر بولیں۔

لوگوں، میں کہیں کی نہ رہی۔ ہائے میرے ابا، دوڑو۔ تمہاری لاڈلی بیٹی آج لٹ گئی۔ ہائے

میری اماں جان! ثریا بیگم اب فقیرن ہو گئی۔

پڑوسن: بہن، ذرا دل کو ڈھارس دو۔ رونے سے اور ہلکان ہوگی۔

بیگم: قسمت ہی پلٹ گئی۔ ہائے!

پڑوسن: اے! کوئی ہاتھ پکڑ لو۔ سر پھوڑے ڈالتی ہیں۔ بہن، بہن! خدا کے واسطے سنو

تو! دیکھو، سب مال ملا جاتا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔

اتنے میں ایک مہری نے غل مچا کر کہا۔ حضور، یہ جوڑی کڑے کی پڑی ہیں۔

عباسی: بھاگتے بھوت کی لنگونی ہی سہی۔

لوگوں نے صلاح دی کہ تھانے دار کو بلایا جائے، مگر ثریا بیگم تو تھانے دار سے ڈری

ہوئی تھیں، نام سننے ہی کانپ اٹھیں اور بولیں۔ بہن، مال چاہے یہ بھی جاتا رہے، مگر تھانے

والوں کو میں اپنی ڈیوڑھی نہ مانگنے دوں گی۔ داروغہ جی نے آنکھ اوپر اٹھائی تو دیکھا، چھت کئی

ہوئی ہے۔ سمجھ گئے کہ چور چھت کاٹ کر آیا تھا۔ ایک ایک کئی کاسٹنبل باہر آ پہنچے۔ کب واردات

ہوئی؟ نو دفعے تو ہم پکار گئے۔ بھیتر باہر سے تو برابر آواز آئی۔ پھر یہ چوری کب ہوئی؟

داروغہ جی نے کہا۔ ہم کو اس ٹائیں ٹائیں سے کچھ واسطہ نہیں ہے جی! آئے وہاں سے رعب جمائے! نکلے کا آدمی اور ہم سے زبان ملاتا ہے۔ پڑے پڑے سوتے رہے اور اس وقت تحقیقات کرنے چلے ہیں؟ ساٹھ ہزار کا مال گیا ہے۔ کچھ خبر بھی ہے! کانسٹبل نے جب سنا کہ ساٹھ ہزار کی چوری ہوئی تو ہوش اڑ گئے۔ آپس میں یوں باتیں کرنے لگے۔

- 1۔ ساٹھ ہزار! پچاس اور دوئی ساٹھ؟ کا ہے؟
- 2۔ پچاس دوئی ساٹھ نہیں، پچاس اور دس ساٹھ!
- 3۔ اجی خدا خدا کرو۔ ساٹھ ہزار۔ کیا زے جواہرات ہی تھے؟ ایسے کہاں کے سینہ ہیں!

داروغہ: سمجھا جائے گا، دیکھو تو سہی! تم سب کی سازش ہے۔

- 1۔ داروغہ، ترکیب تو اچھی کی۔ شاباش!
- 2۔ بیگم صاحب کے یہاں چوری ہوئی تو بلا سے۔ تمہاری تو ہانڈیاں چڑھ گئیں۔ کچھ ہمارا بھی حصہ ہے؟

اتنے میں تھانے دار صاحب آپہنچے اور کہا، ہم موقع دیکھیں گے۔ پردہ کرایا گیا۔ تھانے دار صاحب اندر گئے تو بولے۔ اخواہ، اتنا بڑا مکان ہے! تو کیوں نہ چوری ہو؟ داروغہ: کیا؟ مکان اتنا بڑا دیکھا اور آدمی رہتے ہیں سو نہیں دیکھتے؟ تھانے دار: رات کو یہاں کون کون سویا تھا؟ داروغہ: عبتاسی، سب کے نام لکھوا دو۔

تھانے دار: بولو عبتاسی مہری، رات کو کس وقت سوئی تھیں تم؟ عبتاسی: حضور، کوئی گیارہ بجے آنکھیں لگیں۔

تھانے دار: ایک ایک بوٹی پھڑکتی ہے۔ صاحب کے سامنے نہ اتنا چمکنا۔ عبتاسی: یہ باتیں میں نہیں سمجھتی۔ چمکنا ملٹنا بازاری عورتیں جانیں۔ ہم ہمیشہ بیگموں میں رہا کیے ہیں۔ یہ اشارے کسی اور سے کیجیے۔ بہت تھانے داری کے بل پر نہ رہیے گا۔ دیکھا کہ گھر میں عورتیں ہی عورتیں تو پیٹ سے پاؤں نکالے۔ تھانے دار: تم تو جاے سے باہر ہوئی جاتی ہو۔

یتیم صاحب کمرے میں کھڑی کانٹا، رہی تھیں۔ ایسا نہ ہو، کہیں مجھے دیکھ لے۔ تھانے دار نے صہاسی سے پھر کہا۔ اپنا بیان لکھواؤ۔

صہاسی: ہم چار پائی پر سو رہے تھے کہ ایک بار آنکھ کھلی۔ ہم نے صراحی سے پانی اٹھایا اور یتیم صاحب کو پلایا۔

تھانے دار: جو چاہو، لکھوا دو۔ تم پر دروغ خلقی کا جرم نہیں لگ سکتا۔

صہاسی: کیا ایمان چھوڑنا ہے؟ جو ٹھیک ٹھیک ہے وہ کیوں چھپائیں؟

صہاسی نے اٹھکیاں مٹکا مٹکا کر تھانے دار کو اتنی کھری کھوٹی سنائیں کہ تھانے دار صاحب کی شنی کرکری ہو گئی۔ داروغہ صاحب سے بولے۔ آپ کو کسی پر شک ہو تو بیان کیجیے۔ بے بیداری کے چوری نہیں ہو سکتی۔ داروغہ نے کہا۔ ہمیں کسی پر شک نہیں۔ تھانے دار نے دیکھا کہ یہاں رنگ نہ جسے گا تو چپکے سے رخصت ہوئے۔

(74)

خوبی آزاد کے باپ بن گئے تو ان کی عزت ہونے لگی۔ ترکی قیدی ہر دم ان کی عزت کرنے کو مستعد رہتے تھے۔ ایک دن ایک روسی فوجی افسر نے ان کی انوکھی صورت اور ماشے ماشے بھر کے ہاتھ دیکھے تو جی چاہا کہ ان سے باتیں کریں۔ ایک فارسی داں ترک کو مترجم بنا کر خوابہ صاحب سے باتیں کرنے لگا۔

افسر: آپ آزاد پاشا کے باپ ہیں؟

خوبی: باپ تو کیا ہوں، مگر خیر، باپ ہی سمجھیے۔ اب تو تمہارے بچے میں پڑ کر چکے چھوٹ گئے۔

افسر: آپ بھی کسی لڑائی میں شریک ہوئے تھے؟

خوبی: واہ، اور زندگی بھر کرتا کیا رہا؟ تم جیسا گوکھا افسر آج ہی دیکھا۔ ہمارا کینڈا ہی گواہی دیتا ہے کہ ہم فوج کے جوان ہیں۔ کینڈے سے نہیں پہچانتے؟ اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ دھگے والی پلٹن کے رسال دار تھے۔ آپ ہم سے پوچھتے ہیں، کوئی لڑائی دیکھی ہے؟ جناب، یہاں وہ وہ لڑائیاں دیکھیں ہیں کہ آدمی کی بھوک پیاس بند ہو جائے۔ افسر: آپ گولی چلا سکتے ہیں۔

خوبی : اجی حضرت، اب فصد کھلوائے۔ پوچھتے ہیں، گولی چلائی ہے! ذرا سامنے آ جائیے تو بتاؤں۔ ایک بار ایک کتے سے اور ہم سے لاگ ڈاٹ ہو گئی۔ خدا کی قسم، ہم سے کتنا گیارہ بارہ قدم پر پڑا تھا۔ دھر کے داغٹا ہوں تو پوں پوں کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

افسر : او ہوا! آپ خوب گولی چلاتا ہے۔

خوبی : اجی، تم ہم کو جوانی میں دیکھتے!

افسر نے ان کی بے نگاہ باتیں سن کر حکم دیا کہ دو نالی بندوق لاؤ۔ جب تو میاں خوبی چکرائے۔ سوچے کہ ہماری سات بیڑھیوں تک تو کسی نے بندوق چلائی نہیں اور نہ ہم کو یاد آتا ہے کہ بندوق کبھی عمر بھر چھوئی بھی ہو، مگر اس وقت تو آبرو رکھنی چاہیے۔ بولے۔ اس بندوق میں گزر تو نہیں ہوتا؟

افسر : اڑتی چڑیا پر نشانہ لگا سکتے ہو؟

خوبی : اڑتی چڑیا کیسی! آسمان تک کے جانوروں کو بھون ڈالوں۔

افسر : اچھا تو بندوق لو۔

خوبی : تاک کر نشانہ لگاؤں تو درخت کی پتیاں گرا دوں۔

یہ کہہ کر آپ ٹہلنے لگے۔

افسر : آپ نشانہ کیوں نہیں لگاتا؟ اٹھائیے بندوق۔

خوبی نے زمین میں خوب زور سے ٹھوکر ماری اور ایک غزل گانے لگے۔ افسردہ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ یہ آدمی محض ڈینگیں مارنا جانتا ہے۔ بولا۔ اب بندوق لیتے ہو یا اسی بندوق سے تم کو نشانہ بتاؤں؟

خیر، بڑی دیر تک دل لگی رہی۔ افسر خوبی سے اتنا خوش ہوا کہ پہرے والوں کو حکم دے دیا کہ ان پر بہت سختی نہ رکھنا۔ رات کو خوبی نے سوچا کہ اب بھاگنے کی تدبیر سوچنی چاہیے ورنہ لڑائی ختم ہو جائے گی اور ہم نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے۔ آدمی رات کو اٹھے اور خدا سے دعا مانگنے لگے کہ اے خدا! آج رات کو تو مجھے اس قید سے نجات دے دے۔ ترکوں کا لشکر نظر آئے اور میں غل مچا کر کہوں کہ ہم آپہنچے آپہنچے۔ آزاد سے بھی ملاقات ہو اور خوش خوش وطن چلیں۔

یہ دعا مانگ کر خوبی رونے لگے۔ ہائے، اب وہ دن کہاں نصیب ہوں گے کہ نوابوں

کے دربار میں کپ اڑا رہیں ہوں۔ وہ دل لگی، وہ چہل اب نصیب ہو چکی۔ کس حرے سے کئی جاتی تھی اور کسی لطف سے گنڈیریاں چوستے تھے! کوئی کھلیاں خریدتا ہے، کوئی قطارے چکاتا ہے۔ شور غل کی یہ کیفیت ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، کھیموں کی بھن بھن ایک طرف، چھٹکوں کا ڈیر دوسری طرف، کوئی عورت چنڈو خانے میں آگئی تو اور بھی چہل ہونے لگی۔

دو بچے خوجی باہر نکلے تو ان کی نظر چھوٹے سے تو پر پڑی۔ پہرے والے سو رہے تھے۔ خوجی تو کے پاس گئے اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ بیٹا، کہیں دغا نہ دینا۔ مانا کہ تم چھوٹے موٹے تو ہو اور خولجہ صاحب کا بوجھ تم سے نہ اٹھ سکے گا، مگر کچھ پرواہ نہیں، ہمّت مرदाں مددے خدا۔ تو کو کھولا اور اس پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ کپ سے باہر کی طرف چلے۔ بدن کانپ رہا تھا، مگر جب کوئی سو قدم کے فاصلے پر نکل گئے تو ایک سوار نے پکارا۔ کون جاتا ہے؟ کھڑا رہ!

ہم ہیں جی گراس کٹ، سرکاری گھوڑوں کی گھاس چھیلے ہیں۔

سوار: اچھا تو چلا جا۔

خوجی جب ذرا دور نکل آئے تو دو چار بار خوب غل مچایا۔ مار لیا، مار لیا! خولجہ صاحب دو کروڑ روپیوں میں سے بے داغ نکل آتے ہیں۔ لو بھیڑی ترکوں، خولجہ صاحب آپہنچے۔

اپنی فتح کا ڈنکا بجا کر خوجی گھوڑے سے اترے اور چادر بچھا کر سوئے تو ایسی میٹھی نیند آئی کہ عمر بھر نہ آئی تھی۔ گھڑی بھر رات باقی تھی کہ ان کی نیند کھلی۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور آگے چلے۔ دن نکلنے لگتے انہیں ایک پہاڑ کے نزدیک ایک فوج ملی۔ آپ نے سمجھا، ترکوں کی فوج ہے۔ چلا کر بولے۔ آپہنچے، آپہنچے! ارے یارو، دوڑو۔ خولجہ صاحب کے قدم دھو دھو کر پیو، آج خولجہ صاحب نے وہ کام کیا کہ رستم کے دادا سے بھی نہ ہو سکتا۔ دو کروڑ روپی چہرہ دے رہے تھے اور میں پیترے بدلتا ہوا دن سے غائب، لکڑی ٹنکی اور اڑا۔ دو کروڑ روپی دوڑے، مگر مجھے پکڑ پانا دل لگی نہیں۔ کہہ دیا، لو ہم لیے ہوتے ہیں، چوری سے انہیں چلے، ڈنکے کی چوٹ کہہ کر چلے۔

ابھی وہ یہ ہانک ہی لگا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور گھوڑے

سے اتار لیا۔

خوبی : ایں، کون ہے بھی؟ میں سمجھ گیا میاں آزاد ہیں۔

مگر آزاد وہاں کہاں، یہ روسیوں کی فوج تھی۔ اسے دیکھتے ہی خوبی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ روسیوں نے انھیں دیکھ کر خوب تالیاں بجانیں۔ خوبی دل ہی دل میں کسے جاتے تھے، مگر بچنے کی کوئی تدبیر نہ سوچتی تھی۔ سپاہیوں نے خوبی کو چپتے جمانی شروع کیں۔ اُدھر دیکھا، اُدھر پڑی۔ خوبی گڑ کر بولے۔ اچھا گیدی، اس وقت تو بے بس ہوں، اب کی پھنساؤ تو کہوں۔ قسم ہے اپنے قدموں کی، آج تک کبھی کسی کو نہیں ستایا۔ اور سب کچھ کیا، چنگ اڑائے، بنیر لڑائے، چندو پیا، انیم کھائی، جس کے دم لگائے، مذک کے چھینے اڑائے مگر کس مردود نے کسی غریب کو ستایا ہو۔

یہ سوچ کر خوبی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

ایک سپاہی نے کہا۔ بس، اب اس کو دق نہ کرو۔ پہلے پوچھ لو کہ یہ ہے کون آدمی۔ ایک بولا۔ یہ ترکی ہے، کپڑے کچھ بدل ڈالے ہیں۔ دوسرے نے کہا۔ یہ گوندہ ہے، ہماری ٹوہ میں آیا ہے۔

ادوروں کو بھی یہی شبہ ہوا۔ کئی آدمیوں نے خوبی کی تلاشی لی۔ اب خوبی اور سب اسباب تو دکھاتے ہیں مگر انیم کی ڈیبا نہیں کھولتے۔

ایک روی : اس میں کون چیز ہے؟ کیوں تم اس کو کھولنے نہیں دیتے؟ ہم ضرور دیکھیں گے۔

خوبی : او گیدی، ماروں گا بندوق، دھواں اس پار ہو جائے گا۔ خبردار جو ڈیبا ہاتھ سے چھوئی! اگر تمھارا دشمن ہوں تو میں ہوں۔ مجھے چاہے مارو، چاہے قید کرو، پر میری ڈیبا میں ہاتھ نہ لگاتا۔

روسیوں کو یقین ہو گیا کہ ڈیبا میں ضرور کوئی قیمتی چیز ہے۔ خوبی سے ڈیبا چھین لی۔ مگر اب ان میں آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ ایک کہتا تھا، ڈیبا ہماری ہے، دوسرا کہتا تھا، ہماری ہے۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ ڈیبا میں جو کچھ نکلے وہ سب آدمیوں میں برابر بانٹ دی جائے۔ غرض ڈیبا کھولی گئی تو انیم نکل۔ سب کے سب شرمندہ ہوئے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ اس ڈیبا کو دریا میں پھینک دو۔ اسی کے لیے ہم سے تلوار چلتے چلتے بچی۔ دوسرا بولا۔ اسے آگ میں جلا دو۔

خوجی : ہم کہہ دیتے ہیں ڈیٹا ہمیں واپس کر دو، نہیں ہم بگڑ جائیں تو قیامت آ جائے گی۔ ابھی تم ہمیں نہیں جانتے!

سپاہیوں نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی دیوانہ ہے، پاگل خانے سے بھاگ آیا ہے۔ انھوں نے خوجی کو ایک بڑے ہنجرے میں بند کر دیا۔ اب میاں خوجی کی سٹی پٹی بھول گئی۔ چلا کر بولے۔ ہائے آزاد! اب تمھاری صورت نہ دیکھیں گے! خیر، خوجی نے نمک کا حق ادا کر دیا۔ اب وہ بھی قید کی مصیبتیں جھیل رہا ہے اور صرف تمھارے لیے۔ ایک بار ظالموں کے پٹنجے سے کسی طرح مار کوٹ کر نکل بھاگے تھے، مگر تقدیر نے پھر اسی قید میں لا پھنسا یا۔ جواں مردوں پر ہمیشہ مصیبت آتی ہے، اس کا تو غم نہیں، غم تو اسی کا ہے کہ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہوگی۔ خدا تمھیں خوش رکھے، میری یاد کرتے رہنا۔

شاید وہ آئیں میرے جنازے پہ دوستوں
آنکھیں کھلی رہیں میری دیدار کے لیے

(75)

میاں آزاد قازقوں کے ساتھ سائبیریا چلے جا رہے تھے۔ کئی دن کے بعد وہ ڈینیوب ندی کے کنارے جا پہنچے۔ وہاں ان کی طبیعت اتنی خوش ہوئی کہ ہری ہری دوب پر لیٹ گئے اور بڑی حسرت سے یہ غزل پڑھنے لگے۔

رکھ دیا سر کو تنہا قاتل پر
ہم گرے بھی تو جا کے منزل پر
آنکھ جب بسملوں میں اونچی ہو
سر گرے کٹ کے پائے قاتل پر
ایک دم بھی تڑپ سے چین نہیں
دیکھ لو ہاتھ رکھ کے تم دل پر

یہ غزل پڑھتے پڑھتے انھیں حسن آردہ کی یاد آگئی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ کاسک لوگوں نے سمجھایا کہ بھئی، اب وے باتیں بھول جاؤ، اب یہ سمجھو کہ تم وہ آزاد ہی نہیں ہو۔ آزاد کھل کھلا کر بنے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ آپے میں نہیں ہو۔ قازقوں نے گھبرا کر انھیں

سنجھالو اور سمجھانے لگے کہ یہ وقت صبر سے کام لینے کا ہے۔ اگر ہوش و حواس ٹھیک رہے تو شاید کسی تدبیر سے واپس جاسکے ورنہ خدا ہی حافظ ہے۔ سائبیریا سے کتنے ہی قیدی بھاگ آتے ہیں، مگر تم تو ابھی سے ہمت ہارے دیتے ہو۔

اتنے میں وہ جہاز جس پر سوار ہو کر آزاد کو ڈینیوب کے پار جانا تھا، تیار ہو گیا۔ تب تو آزاد کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایسا تار بندھا کہ قازقوں کے بھی رومال تر ہو گئے۔ جس وقت جہاز پر سوار ہوئے دل قابو میں نہ رہا۔ رو رو کر کہنے لگے۔ حسن آرا، اب آزاد کا پتہ نہ ملے گا۔ آزاد اب دوسری دنیا میں ہیں، اب خواب میں بھی اس آزاد کی صورت نہ دیکھو گی جسے تم نے روم بھیجا۔

یہ کہتے کہتے آزاد بے ہوش ہو گئے۔ قازقوں نے ان کو عطر سونگھایا اور خوب پانی کے چھینٹے دیے تب جا کر کہیں ان کی آنکھیں کھلیں۔ اتنے میں جہاز اس پار پہنچ گیا تو آزاد نے روم کی طرف منہ کر کے کہا۔ آج سب جھگڑا ختم ہو گیا۔ اب آزاد کی قبر سائبیریا میں بنے گی اور کوئی اس پر رونے والا نہ ہوگا۔

قازقوں نے شام کو ایک باغ میں پڑاؤ ڈالا اور رات بھر وہیں آرام کیا۔ لیکن جب صبح کو کوچ کی تیاریاں ہونے لگی تو آزاد کا پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف ہلوچ گیا، ادھر ادھر سوار چھوئے، پر آزاد کا پتہ نہ پایا۔ وہ بے چارے ایک نئی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔

سویرے میاں آزاد کی آنکھ جو کھلی تو اپنے کو عجیب حالت میں پایا۔ زور کی پیاس لگی ہوئی تھی، تالو سوکھا جاتا تھا، آنکھیں بھاری، طبیعت ست، جس چیز پر نظر ڈالتے تھے، دھندھلی دیکھائی دیتی تھی۔ ہاں، اتنا البتہ معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا سر کسی کے زانو پر ہے۔ مارے پیاس کے ہونٹ سوکھ گئے تھے، گو آنکھیں کھولتے تھے، مگر بات کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اشارے سے پانی مانگا اور جب پیٹ بھر پانی پی چکے تو ہوش آیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک حسین عورت سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ عورت کیا حور تھی۔ آزاد نے کہا، خدا کے واسطے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ ہمیں کیسے یہاں چھانسل لائی، میری تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا، قازق کہاں ہیں؟ ڈینیوب کہاں ہے؟ میں یہاں کیوں چھوڑ دیا گیا؟ کیا سائبیریا اسی مقام کا نام ہے؟ حسین نے آنکھوں کے اشارے سے کہا۔ صبر کرو، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ آپ ترکی ہیں یا فرانسیسی؟

آزاد: میں ہندی ہوں۔ کیا یہ آپ ہی کا مکان ہے؟

حینہ: نہیں، میرا مکان پولینڈ میں ہے، مگر مجھے یہ جگہ پسند ہے۔ آئیے آپ کو مکان کی سیر کراؤں۔

آزاد نے دیکھا کہ پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی پر قیمتی پتھروں کی ایک کوٹھی بنی ہے۔ پہاڑ ڈھالو تھا اور اس پر ہری ہری گھاس لہرا رہی تھی۔ ایک میل کے فاصلے پر ایک پرانا گر جا کا سنہلا مینار چمک رہا تھا۔ اتر کی طرف ڈینیوب ندی عجب شان سے لہریں مارتی تھی۔ کشتیاں دریا میں آتی ہیں۔ روس کی فوجیں دریا کے پار جاتی ہیں۔ میڈھا ہوا سے اہل رہا ہے۔ کوٹھی کے اندر گئے تو دیکھا کہ پہاڑ کو کاٹ کر دیواریں بنی ہیں۔ اس کی سجاوٹ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ چھت پر گئے تو ایسا معلوم ہوا کہ آسمان پر جا پہنچے۔ چاروں طرف پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں ہری ہری دوب سے لہرا رہی تھیں۔ قدرت کا یہ تماشا دیکھ کر آزاد مست ہو گئے اور یہ شعر ان کی زبان سے نکلا۔

لگی ہے مینہ کی جھڑی باغ میں چلو جھولیں
کہ جھولنے کا مزہ بھی اسی بہار میں ہے
یہ کون پھوٹ کے رویا کہ درد کی آواز
رچی ہوئی جو پہاڑوں کے آبشار میں ہے

حینہ: مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ میں نے زندگی بھر یہیں رہنے کا ارادہ کیا ہے، اگر آپ بھی یہیں رہتے تو بڑے مزے سے زندگی کتنی۔
آزاد: یہ آپ کی مہربانی ہے! میں تو لڑائی ختم ہو جانے کے بعد اگر جھوٹ سکا تو وطن چلا جاؤں گا۔

حینہ: اس خیال میں نہ رہیے گا، اب اسی کو اپنا وطن سمجھیے۔
آزاد: میرا یہاں رہنا کئی جانوں کا گاہک ہو جائے گا۔ جس خاتون نے مجھے لڑائی میں شریک ہونے کے لیے یہاں بھیجا ہے، وہ میرے انتظار میں رو رہ کر جان دے دے گی۔
حینہ: آپ کی رہائی اب کسی طرح ممکن نہیں۔ اگر آپ کو اپنی جان کی محبت ہے تو وطن کا خیال چھوڑ دیجیے، ورنہ ساری زندگی سائبریا میں کاٹنی پڑے گی۔
آزاد: اس کا کوئی غم نہیں، مگر قول جان کے ساتھ ہے۔
حینہ: میں پھر سمجھائے دیتی ہوں۔ آپ سمجھتا نہیں گے۔

آزاد: آپ کو اختیار ہے۔

یہ سنتے ہی اس عورت نے آزاد کو پھر قید خانے میں بھجوا دیا۔

اب میاں خوبی کا حال سنئے۔ روسیوں نے انہیں دیوانہ سمجھ کر جب چھوڑ دیا تو آپ ترکوں کی فوج میں پہنچ کر دون کی لینے لگے۔ ہم نے یوں روسیوں سے مقابلہ کیا اور یوں نچا دیکھایا۔ ایک روسی پہلوان سے میری کشتی بھی ہو گئی، بہت بھر رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ لنگوٹ کسا اور خدا کا نام لے کر تال ٹھونک کے اکھاڑے میں اتر پڑا، وہ بھی داؤں بیچ میں برق تھا اور ہاتھ پاؤں ایسے کہ کیا کہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں سے بھی بڑے۔

ایک سپاہی: ایس، اجی ہم نہ مانیں گے۔ آپ کے ہاتھ پاؤں سے ہی ہاتھ پاؤں تو دیو کے بھی نہ ہوں گے!

خوبی: بس، جیوں ہی اس نے ہاتھ بڑھایا، میں نے ہاتھ باندھ لیا۔ پھر جو زور کرتا ہوں تو ہاتھ کھٹ سے الگ!

سپاہی: ارے، ہاتھ ہی توڑ ڈالے! بے چارے کو کہیں کا نہ رکھا!

خوبی: بس، پھر دوسرا آیا، میں نے گردن پکڑی اور انہی دی، دھم سے گرا۔ تیسرا آیا، چپت جمائی اور دھر دبا۔ چوتھا آیا، اڑٹکا مارا اور دھم سے گرا دیا۔ پانچواں آیا اور میں نے مارے کرو لیوں کے کچھم نکال لیا۔

سپاہی: آپ نے برا کیا۔ طاقتور لوگ کمزوروں پر رحم کیا کرتے ہیں۔

خوبی: تب کئی سوار تو ہیں لیے ہوئے آئے، مگر میں نے سب کو پٹکا۔ آخر کوئی ستر آدمی مل کر مجھ پر ٹوٹ پرے تب جا کے کہیں میں گرفتار ہوا۔

سپاہی: بس، ستر ہی! ستر آدمیوں کو تو آپ پیس کر دھر دیتے۔ کم سے کم کوئی دو سو تو ضرور ہوں گے!

خوبی: جھوٹ نہ بولوں گا، مجھے سبھوں نے رکھا بڑی عزت کے ساتھ، رات بھر تو میں وہیں رہا، سویرا ہوتے ہی کرولی لے کر لٹکارا کہ آ جاؤ جس کو آنا ہو، بندہ چلتا ہے۔ بس کوئی دو کروڑ روسی نکل پڑے۔ لینا لینا! ارے میں نے کہا کہ کس کا لینا اور کس کا دینا، آ جا جسے آنا ہو۔ خدا کی قسم جو کسی نے چوں بھی کی ہو۔ سب کے سب ڈر گئے۔

ترک سمجھ گئے کہ زرا جانگلو ہے۔ خوبی نے یہی سمجھا کہ میں نے ان سبھوں کو اتلو بنایا۔

دن بھر تو پیک لیتے رہے، شام کے وقت ہوا کھانے لگے۔ اتفاق سے راہ میں ایک گدھ مال گیا۔ آپ فوراً گدھے پر سوار ہوئے اور تک تک کرتے چلے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک آدمی نے لکارا۔ روک لے گدھا، کہاں لیے جاتا ہے؟

خوبی: ہٹ جا سائے۔

جوان: اتر گدھے سے۔ اترتا ہے یا میں دوں کھانے بھر کو؟

خوبی: تو نہیں چھوڑے گا، نکالوں کرولی پھر؟

آخر، اس جوان نے خوبی کو گدھے سے ڈھکیل دیا، تب آپ چور چور کا غل مچانے لگے۔ یہ غل سن کر دو چار آدمی آگئے اور خوبی کو چپتے جمانے لگے۔

خوبی: تم لوگوں کی قضا آئی ہے، میں دھن کے رکھ دوں گا۔

جوان: چپکے سے گھر کی راہ لو، ایسا نہ ہو، مجھے تمہاری کھوپڑی سہلانی پڑے۔

اتفاق سے ایک ترکی سوار کا اس طرف سے گزر ہوا۔ خوبی نے چلا کر کہا۔ دوہائی ہے سرکار کی! یہ ڈاکو مارے ڈالتے ہیں۔

سوار نے خوبی کو دیکھ کر پوچھا۔ تم یہاں کہاں؟

خوبی: یہ لوگ مجھے ترکوں کا دوست سمجھ کر مارے ڈالتے ہیں۔

سوار نے ان آدمیوں کو ڈانٹا اور اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ خوبی شیر ہو گئے۔ ایک کے کان پکڑے اور کہا، آگے چل، دوسرے پر چپت جمانی اور کہا، پیچھے چل۔

اس طرح خوبی نے ان بے چاروں کو بری گتی بنائی، مگر پڑاؤ پر پہنچ کر انہیں چھوڑ دیا۔

جب سب لوگ کھا کر لیٹے تو خوبی نے پھر ڈیک مارنی شروع کی۔ ایک بار میں دریا نہانے گیا تو بیچ میں جا کر ایسا غوطہ لگایا کہ تین دن پانی سے باہر نہ ہوا۔

ایک سپاہی: تب تو آپ یوں کہیے کہ آپ غوطہ خوروں کے استاد ہیں! کل ذرا ہمیں بھی غوطہ لے کر دیکھائیے۔

خوبی: ہاں ہاں، جب کہو۔

سپاہی: اچھا تو کل کی رہی۔

خوبی نے سمجھا، یہ سب رعب میں آجائیں گے۔ مگر وے ایک چھٹے ٹر گے۔ دوسرے

دن ان سسوں نے خوبی کو ساتھ لیا اور دریا نہانے کو چلے۔ پڑاؤ سے دریا صاف نظر آتا تھا۔ خوبی کے بدن کے دو گٹھے کھڑے ہو گئے۔ بھاگنے ہی کو تھے کہ ایک آدمی نے روک لیا اور دو ترکوں نے ان کے کپڑے اتار لیے۔ خوبی کی یہ کیفیت تھی کہ کلیجہ قمر قمر کانپ رہا تھا، مگر زبان سے نہ بات نکلتی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اب گلانہ چھوٹنے کا تو نہیں کرنے لگے۔ بھائیوں، میری جان کے کیوں دشمن ہوئے ہو؟ ارے یارو، میں تمہارا دوست ہوں، تمہارے سبب سے اتنی زحمت اٹھائی، قید ہوا اور اب تم لوگ ہنسی ہنسی میں مجھے ڈبا دینا چاہتے ہو۔ غرض خوبی بہت گڑگڑائے مگر ترکوں نے ایک نہ مانی۔ خوبی نہیں کرتے کرتے تھک گئے تو کوسنے لگے۔ خدا تمہ سے کبھی! یہاں کوئی افسر بھی نہیں۔ نہ ہوئی کرولی، نہیں اس وقت جیتا چنوا دیتا۔ خدا کرے، تمہارے اوپر بجلی گرے۔ سب کے سب کپڑے اتار لیے، گویا ان کے باپ کا مال تھا۔ اچھا گیدی، اگر جیتا پچا تو سمجھ لوں گا۔ مگر دل لگی بازوں نے اتنے غوطے دیے کہ بے دم ہو گئے اور ایک غوطہ کھا کر ڈوب گئے۔

(76)

آزاد کو سائبیریا بھیج کر مس کلاریا اپنے وطن کو روانہ ہوئی اور راستے میں ایک ندی کے کنارے پڑاؤ کیا۔ وہاں کی آب و ہوا اس کو ایسی پسند آئی کہ کئی دن تک اسی پڑاؤ پر شکار کھیلتی رہی۔ ایک دن مس کلاریا نے صبح کو دیکھا کہ اس کے خیمے کے سامنے ایک دوسرا بہت بڑا خیمہ لگا ہوا ہے۔ حیرت ہوئی کہ یا خدا، یہ کس کا سامان ہے۔ آدھی رات کا سناٹا تھا، ایک ایک خیمے کہاں سے آ گئے، ایک عورت کو بھیجا کہ جا کر پتہ لگائے کہ یہ لوگ کون ہیں۔ وہ عورت جو اس کھیمے میں گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک جواہر نگار تخت پر ایک حوروں کو شرماتے والی شہزادی بیٹھی ہوئی ہے۔ دیکھتے ہی دمک ہو گئی۔ جا کر مس کلاریا سے بولی۔ حضور، کچھ نہ پوچھیے، جو کچھ دیکھا، اگر خواب نہیں تو جادو ضرور ہے۔ ایسی عورت دیکھی کہ پری بھی اس کی بلائیں لیں۔

کلاریا: تم نے کچھ پوچھا بھی کہ ہیں کون؟

لوٹھی: حضور، مجھ پر تو ایسا رعب چھایا کہ منہ سے بات ہی نہ نکلی۔ ہاں، اتنا معلوم ہوا کہ ایک رئیس زادی ہیں اور سیر کرنے کیے لیے آئی ہیں۔

اتنے میں وہ عورت خیمے سے باہر نکل آئی۔ کلاریا نے جبک کر اس کو سلام کیا اور چاہا کہ بڑھ کر ہاتھ ملائے۔ مگر اس نے کلاریا کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ کوہ قاف کی پری میڈا تھی۔ جب سے اسے معلوم ہوتا تھا کہ کلاریا نے آزاد کو سائبیریا بھیجا دیا ہے، وہ اس کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ اس وقت کلاریا کو دیکھ کر اس کے دل نے کہا کہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا، مگر پھر سوچی کہ پہلے نرمی سے پیش آؤں۔ باتوں باتوں میں سارا ماجرا کہہ سناؤں، شاید کچھ پیچھے۔

کلاریا: تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟

میڈا: مصیبت سمجھ لائی ہے، اور کیا کہوں۔ لیکن آپ یہاں کیسے آئی؟

کلاریا: میرا بھی وہی حال ہے۔ وہ دیکھیے، سامنے جو قبر ہے اسی میں وہ دفن ہے جس کی موت نے میری زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا ہے۔ ہائے! اس کی پیاری صورت میری نگاہ کے سامنے ہے، مگر میرے سوا کسی کو نظر نہیں آتی۔

میڈا: میں بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ جس جوان کو دل دیا، جان دی، ایمان دیا، وہ اب نظر نہیں آتا، اس کو ایک ظالم باغبان نے باغ سے جدا کر دیا، خدا جانے، وہ غریب کن جنگلوں میں ٹھوکر میں کھاتا ہوگا۔

کلاریا: مگر تمہیں یہ تسکین تو ہے کہ تمہارا یار زندہ ہے اور کبھی نہ کبھی اس سے ملاقات ہوگی۔ میں تو اس کے نام کو رو چکی۔ میرے اور اس کے ماں باپ شادی کرنے پر راضی تھے، ہم خوش تھے کہ دل کی مرادیں پوری ہوں گی، مگر شادی کے ایک ہی دن پہلے آسمان ٹوٹ پڑا، میرے پیارے کو فوج میں شریک ہونے کا حکم ملا۔ میں نے سنا تو جان سی نکل گئی۔ لاکھ سمجھایا، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ جس روز یہاں سے روانہ ہوا، میں نے خوب ماتم کیا اور رخصت ہوئی۔ یہاں رات دن اس کی جدائی میں تڑپا کرتی تھی، مگر اخباروں میں لڑائی کے حال پڑھ کر دل کو تسلی دیتی تھی۔ ایک ایک اخبار میں پڑھا کہ اس کی ایک ترکی پاشا سے تلوار چلی، دونوں زخمی ہوئے، پاشا تو فوج گیا، مگر وہ بے چارہ جان سے مارا گیا۔ اس پالش کا نام آزاد ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا، دل میں ٹھان لیا کہ اپنے پیارے کے خون کا بدلہ آزاد سے لوں گی۔ یہ طے کر کے یہاں سے چلی اور جب آزاد میرے ہاتھوں سے بچ گیا تو میں نے اسے سائبیریا بھیجوا دیا۔

بیڑا یہ سن کر بے ہوش ہو گئی۔

(77)

جس وقت خوبی نے پہلا غوطہ کھایا تو ایسے الجھے کہ ابھرنا مشکل ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر میں ترکوں نے غوطے لگا کر انہیں ڈھونڈ لگایا۔ آپ کسی قدر پانی پی گئے تھے۔ بہت دیر تک تو ہوش ہی ٹھکانے نہ تھے۔ جب ذرا ہوش آگیا تو سب کو ایک سرے سے گالیاں دینا شروع کیں۔ سوچے کہ دو ایک روز میں ذرا ٹانخا ہولوں تو ان سے خوب سمجھوں۔ ڈیرے پر آکر آزاد کے نام خط لکھنے لگے۔ ان سے ایک آدمی نے کہہ دیا تھا کہ اگر کسی آدمی کے نام خط بھیجتا ہو اور پتہ نہ ملتا ہو تو خط کو پتوں میں لپیٹ دریا کے کنارے کھڑا ہو اور تین بار 'بھجیو، بھجیو' کہہ کر خط کو دریا میں ڈال دے، خط آپ ہی آپ پہنچ جائے گا۔ خوبی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ آزاد کے نام ایک خط لکھ کر دریا میں ڈال آئے۔ اس خط میں آپ نے اپنی بہادری کے کاموں کی خوب ڈیٹگیں ماری تھیں۔

رات کا وقت تھا، ایسے اندھریا چھایا ہوا تھا، گویا تاریکی کا دل سویا ہو۔ غنڈی ہوا کے جھونکے اتنے زور سے چلتے تھے کہ روح تک کانپ جاتی تھی۔ ایک ایک روس کی فوج کے نقارے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ دونوں طرف کے لوگ لڑنے کو تیار ہیں۔ خوبی گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور سوچنے لگے کہ یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں؟ اتنے میں ترکی فوج بھی تیار ہو گئی اور دونوں فوجیں دریا کے کنارے جمع ہو گئیں۔ خوبی نے دریا کی صورت دیکھی تو کانپ اٹھے۔ کہا: اگر خشکی کی لڑائی ہوتی تو ہم بھی آج جوہر دکھاتے۔ یوں تو سب افسر اور سپاہی لٹکار رہے تھے، مگر خوبی کی امتگیں سب سے بڑھی ہوئی تھیں۔ چلا چلا کر دریا سے کہہ رہے تھے کہ اگر تو خشک ہو جائے تو میں پھر مزہ دکھلاؤں۔ ایک ہاتھ میں پرے کے پرے کاٹ کر رکھ دوں۔

گولہ چلنے لگا۔ ترکوں کی طرف سے ایک انجھیر نے کہا کہ یہاں سے آدھ میل کے فاصلے پر کشتیوں کا ہل باندھنا چاہیے۔ کئی آدمی دوڑائے گئے کہ جا کر دیکھیں، روسیوں کی فوجیں کس کس مقام پر ہیں۔ انھوں نے آکر بیان کیا کہ ایک کوس تک روسیوں کا نام و نشان نہیں ہے۔ فوراً ہل بنانے کا انتظام ہونے لگا۔ یہاں سے ڈیڑھ کوس پر پینتیس کشتیاں موجود

قصیں۔ افسر نے حکم دیا کہ ان کشتیوں کو یہاں لایا جائے۔ اسی دم دو سوار گھوڑے کڑکڑاتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک خوبی تھے۔

خوبی: پینتیس کشتیاں یہاں۔ بے آدمے کس مستعد ہیں۔ میں نے سوچا، جب تک سوار تمہارے پاس پہنچیں گے اور تم حکم دو گے کہ کشتیاں آئیں تو جب تک یہاں خدا جانے کیا ہو جائے، اس لیے ایک سوار کو لے کر ذرا کشتیوں کو ادھر لے آیا۔

فوج کے افسر نے یہ سنا تو خوبی کی پیٹھ ٹھونک دی اور کہا۔ شاباش اس وقت تو تم نے ہماری جان بچا دی۔

خوبی اڑ گئے۔ بولے۔ جناب، ہم کچھ ایسے ویسے نہیں! آج ہم دکھا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔ ایک ایک کو جن جن کر ماروں!

اتنے میں انجمنیروں نے پھرتی کے ساتھ کشتی کا ہل باندھنے کا انتظام کیا۔ جب ہل تیار ہو گیا تو افسر نے کچھ سواروں کو اس پار بھیجا۔ خوبی بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ جب ہل کے چمچ میں پیچھے تو ایک دفع غل مچایا۔ اور گیدی، ہم آپہنچے۔

ترکوں نے ان کا منہ دبایا اور کہا۔ چپ!

اتنے میں ترکوں کا دستہ اس پار پہنچ گیا۔ روسیوں کو کیا خبر تھی کہ ترک لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ ادھر خوبی جوش میں آکر تین چار ترکوں کو ساتھ لے دریا کے کنارے کنارے گھنٹوں کے بل چلے۔ جب ان کو معلوم ہو گیا کہ روسی فوج تھک گئی تو ترکوں نے ایک دم سے دھاوا بول دیا۔ روسی گھبرا اٹھے۔ آپس میں صلاح کی کہ اب بھاگ چلیں۔ خوبی بھی گھوڑے پر سوار تھے، روسیوں کو بھاگتے دیکھا تو گھوڑے کو ایک ایڑ دی اور بھاگتے سپاہیوں میں سے سات آدمیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ ترکی فوج میں واہ واہ کا شور مچ گیا۔ خواجہ صاحب اپنی تعریف سن کر ایسے خوش ہوئے کہ پرے میں گھس گئے اور گھوڑے بڑھا بڑھا کر تلواریں بھینکنے لگے۔ دم کے دم میں روسی سواروں سے میدان خالی کر دیا۔ ترکی فوج میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ خواجہ صاحب کے نام فتح لکھی گئی۔ اس وقت ان کے دماغ ساتویں آسمان پر تھے۔ اڑے کھڑے تھے۔ بات بات پر بگڑتے تھے۔ حکم دیا۔ فوج کے جزل سے کہو، آج ہم ان کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ کھانا کھانے بیٹھے تو منہ ہٹایا، واہ! اتنے بڑے افسر اور یہ کھانا! نہ بیٹھے چاول، نہ فرنی، نہ پولاؤ۔ کھانا کھاتے وقت اپنی بہادری کی کھٹا کہنے لگے۔ واللہ، سمجھوں

کے حوصلے پست کر دیے۔ خواجہ صاحب ہیں کہ باتیں! میرا نام سنتے ہی دشمنوں کے کلیجے کانپ گئے۔ ہمارا دار کوئی روک لے تو جانیں۔ برسوں مصیبتیں جھیلیں ہیں تب جا کے اس قابل ہوئے کہ روسیوں کے لشکر میں اکیلے گھس پڑے! اور ہمیں ڈر کس کا ہے؟ بہشت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

افسر: ہم نے وزیر جنگ سے درخواست کی ہے کہ تم کو اس بہادری کا انعام ملے۔

خوجی: اتنا ضرور لکھنا کہ یہ آدمی دھگلے والی پلٹن کا رسال دار تھا۔

افسر: دھگلے والی پلٹن کیسی؟ میں نہیں سمجھا۔

خوجی: تمہارے مارے ناک میں دم ہے اور تم ہندی کی چندی نکالتے ہو۔ اودھ کا حال معلوم ہے یا نہیں؟ اودھ سے بڑھ کر دنیا میں اور کون بادشاہت ہوگی؟

افسر: ہم نے اودھ کا نام نہیں سنا۔ آپ کو کوئی خطاب ملے تو آپ پسند کریں گے؟

خوجی: واہ، نیکی اور پوچھ پوچھ!

اس دن سے ساری فوج میں خوجی کی دھوم مچ گئی۔ ایک دن روسیوں نے ایک پہاڑی پر سے ترکوں پر گولے اتارنے شروع کیے۔ ترک لوگ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ ایک ایک توپ کی آواز سنی تو گھبرا گئے۔ جب تک مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں تب تک ان کے کئی آدمی کام آئے۔ اس وقت خوجی نے اپنے سپاہیوں کو لٹکارا، تلوار کھینچ کر پہاڑی پر چڑھ گئے اور کئی آدمیوں کو زخمی کیا، اس سے ان کی اور بھی دھاک بیٹھ گئی۔ جسے دیکھو، انہیں کی تعریف کر رہا تھا۔

ایک سپاہی: آپ نے آج وہ کام کیا ہے کہ رستم سے بھی نہ ہوتا۔ اب آپ کے واسطے کوئی خطاب تجویز آجائے گا۔

خوجی: میرا آزاد آجائے تو میری محنت ٹھکانے لگے، ورنہ سب بچ ہے۔

افسر: جس وقت تم گھوڑے سے گرے، میرے ہوش اڑ گئے۔

خوجی: مگر تے ہی سنبھل بھی گئے تھے۔

افسر: چت گرے تھے؟

خوجی: جی نہیں۔ پہلوان جب گرے گا، ہٹ گرے گا۔

افسر: ذرا سا تو آپ کا قد ہے اور اتنی ہمت!

خوجی: کیا کہا، ذرا سادہ، کسی پہلوان سے پوچھیے۔ کتنی ہی کشتیاں جیت چکا ہوں۔
افسر: ہم سے لڑیے گا؟

خوجی: آپ ایسے دس ہوں تو کیا پروا؟
فوج کے افسر نے اسی دن وزیر جنگ کے پاس خوجی کی سفارش لکھ بھیجی۔

(78)

خوجی تھے تو مسخرے، مگر وفادار تھے۔ انھیں ہمیشہ آزاد کی دھن سوار رہتی تھی۔ بار بار یاد کیا کرتے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ آزاد کو پولینڈ کی شہزادی نے قید کر دیا ہے تو وہ آزاد کو کھوجنے لگے۔ پوچھتے پوچھتے کسی طرح آزاد کے قید خانے تک پہنچ ہی تو گئے۔ آزاد نے انھیں دیکھتے ہی گود میں اٹھا لیا۔

خوجی: آزاد، آزاد، ارے میاں، تم کون ہو؟

آزاد: او ہو ہو!

خوجی: بھائی جان، تم بھوت ہو یا پریت، ہمیں چھوڑ دو۔ میں اپنے آزاد کو ڈھونڈنے

جاتا ہوں۔

آزاد: پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کیسے پہنچے؟

خوجی: سب بتلائیں گے، مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمہاری یہ گئی کیسی ہو گئی۔

آزاد نے ساری باتیں خوجی کو سمجھائیں، تو آپ نے کہا۔ واللہ، زے گاؤ دی ہو۔

ارے بھائی جان، تمہاری جان کے لالے پڑے ہیں، تم کو چاہیے کہ جس طرح ممکن ہو،

شہزادی کو خوش کرو، تم کو تو یہ دکھانا چاہیے کہ شہزادی کو چھوڑ کر کہیں جاؤ گے ہی نہیں۔ خوب

عشق جتاؤ، تب کہیں تمہارا اعتبار ہوگا۔

آزاد: ہو سڑی تو کیا ہوا، مگر بات ٹھکانے کی کرتے ہو، مگر یہ تقریر کون کرے؟

خوجی: اور ہم آئے کیا کرنے ہیں؟

یہ کہہ کر آپ شہزادی کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ان کی صورت دیکھی تو

ہنس پڑی۔ میاں خوجی سمجھے کہ ہم پر سمجھ گئی۔ بولے۔ کیا لڑواؤ گی کیا؟ آزاد سنے گا تو بگڑ

اٹھے گا۔ مگر واہ رے میں! جس نے دیکھا، وہی سمجھا اور یہاں یہ حال ہے کہ کسی سے بولتے

نک نہیں۔ ایک ہو تو بولوں، چار نکاح تک تو جائز ہے، مگر جب اندر کا اکھاڑا پیچھے پڑ جائے تو کیا کروں؟

شہزادی : ذرا بیٹھ تو جائیے۔ یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں بیٹھی رہوں اور آپ کھڑے رہیں۔

خوبی : پہلے یہ بتاؤ کہ جہیز کیا دوگی؟

عربن : اور اکڑتے کس برتے پر ہو۔ سوکھی ہڈیوں پر یہ غرور؟

خوبی : تم پہلوانوں کی باتیں کیا جانو۔ یہ چور بدن کہلاتا ہے، ابھی اکھاڑے میں اتر پڑوں تو پھر کیفیت دیکھو۔

عربن : ٹہنی مرغ کے برابر تو آپ کا قد ہے اور دعویٰ اتنا لمبا چوڑا!

خوبی : تم گنوارن ہو، یہ باتیں کیا جانو۔ تم قد کو دیکھا چاہو اور یہاں لمبے آدمی کو لوگ بیوقوف کہتے ہیں۔ شیر کو دیکھو، اور اونٹ کو دیکھو۔ مصر میں ایک بڑے گرانڈیل جوان کو چلنی بتائی۔ مارا چاروں شانے چت۔ اٹھ کر پانی بھی نہ مانگا۔

خیر، بہت کہنے سننے سے آپ کرسی پر بیٹھے تو دونوں ٹانگیں کرسی پر رکھ لی اور بولے—
اب جہیز کا حال بتاؤ۔ لیکن میں ایک شرط سے شادی کروں گا، ان سب لوٹریوں کو محل بنواؤں گا اور ان کے اچھے اچھے نام رکھوں گا۔ طاؤس محل، گلاب محل.....

شہزادی : تو آپ اپنی شادی کے پھیر میں ہیں، یہ کہیے۔

خوبی : ہنستی آپ کیا ہیں۔ اگر ہمارا کرب دیکھنا ہو تو کسی پہلوان کو بلاؤ۔ اگر ہم کشتی نکالیں تو شادی منظور؟

شہزادی نے ایک موٹی تازی جھن کو بلایا۔ خوبی نے آنکھ اوپر اٹھائی تو دیکھتے ہیں کہ ایک کالی کھوٹی دیوینی ہاتھ میں ایک موٹا سوتا لیے چل آتی ہے۔ دیکھتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے۔ جھن نے آتے ہی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ان کی جان نکل گئی۔ بولے— ہاتھ ہٹاؤ۔

جھن : دم ہو تو ہاتھ ہٹا دو۔

خوبی : میرے منہ نہ لگتا، خبردار!

جھن نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور مروڑنے لگی۔ خوبی جھلا جھلا کر کہتے تھے، ہاتھ چھوڑ

دے۔ ہاتھ ٹوٹا تو بری طرح پیش آؤں گا، مجھ سے برا کوئی نہیں۔
 جھٹن نے ہاتھ چھوڑ کر ان کے دونوں کان پکڑے اور اٹھایا تو زمین سے چھ انگلی اونچے؟

جھٹن: کہو، شادی پر راضی ہو یا نہیں؟

خوبی: عورت سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس کے منہ کون گئے!

اس پر جھٹن نے خواجہ صاحب کو گود میں اٹھایا اور لے چلی۔ انھوں نے سینکڑوں گالیاں دیں۔ خدا تیرا گھر خراب کرے، تم پر آسمان ٹوٹ پڑے، دیکھو، میں کہے دیتا ہوں کہ پیس ڈالوں گا۔ میں صرف اس سبب سے نہیں بولتا کہ مرد ہو کر عورت ذات سے کیا بولوں۔ کوئی پہلوان ہوتا تو میں ابھی سمجھ لیتا، اور سمجھاتا کیا؟ مارتا چاروں شانے چت۔

عربن: خیر، دل لگی تو ہو چکی، اب یہ بتاؤ کہ آزاد سے تم نے کیا کہا؟ وہ تو آپ کے دوست ہیں۔

خوبی: اوں ہوں، تم کو کسی نے بہکا دیا، وہ دوست نہیں، لڑکے ہیں۔ میں نے اس کے نام ایک خط لکھا ہے، لے جاؤ اور اس کا جواب لاؤ۔

عربن آپ کا خط لے کر آزاد کے پاس پہنچی اور بولی۔ حضور، آپ کے والد نے اس خط کا جواب مانگا ہے۔

آزاد: کس نے مانگا ہے؟ تم نے یہ کون لفظ کہا؟

عربن: حضور کے والد نے..... وہ جو ٹھیکے سے آدی ہیں۔

آزاد: وہ سور، میرے گھر کا غلام ہے۔ وہ مسخرہ ہے۔ ہم اس کے خط کا جواب نہیں دیتے۔

عربن نے آکر خوبی سے کہا۔ آپ کا خط پڑھ کر آپ کے لڑکے بہت ہی خفا ہوئے۔

خوبی: نالائق ہے کہوت، جی چاہتا ہے، اپنا سر پیٹ لوں۔

شہزادی نے کہا۔ جا کر آزاد پاشا کو بلا لاؤ۔ اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔

ذرا دیر میں آزاد آ پہنچے۔ خوبی انھیں دیکھ کر شپٹا گئے۔

ادھر تو شہزادی خوبی کے ساتھ یوں مذاق کر رہی تھی۔ ادھر ایک لوٹھی نے آکر کہا۔

حضور، دو سوار آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہزادی کو بلاؤ۔ ہم نے بہت کہا کہ شہزادی صاحب کو آج فرصت نہیں ہے، مگر وہ نہیں سنتے۔

شہزادی نے خوبی سے کہا کہ باہر جا کر ان سواروں سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ خوبی نے جا کر ان دونوں کو خوب غور سے دیکھا اور بولے۔ حضور، مجھے تو رئیس زادے معلوم ہوتے ہیں۔ شہزادی نے جا کر شہزادوں کو دیکھا تو آزاد بھول گئے۔ انھیں ایک دوسرے محل میں ٹھہرایا اور نوکروں کو تاکید کر دی کہ ان مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ آزاد تو اس خیال میں بیٹھے کہ شہزادی آتی ہوگی اور شہزادی نئے مہمانوں کی خاطر داری کا انتظام کر رہی تھی۔ لونڈیاں بھی چل دیں، خوبی اور آزاد اکیلے رہ گئے۔

آزاد: معلوم ہوتا ہے، ان دونوں لونڈوں کو دیکھ کر لگو ہو گئی۔

خوبی: تم سے تو پہلے ہی کہتے تھے، مگر تم نے نہ مانا۔ اگر شادی ہو گئی ہوتی تو مذاق تھی کہ غیردوں کو اپنے گھر میں ٹھہراتی۔

آزاد: جی چاہتا ہے، اسی وقت چل کر دونوں کے سراڑا دوں۔

خوبی: یہی تو تم میں بری عادت ہے۔ ذرا صبر سے کام لو، دیکھو کیا ہوتا ہے۔

(79)

ان دونوں شہزادوں میں ایک نام مسٹر کلارک تھا اور دوسرے کا ہنری۔ دونوں کی انصافی جوانی تھی۔ نہایت خوبصورت۔ شہزادی دن کے دن انھیں کے پاس بیٹھی رہتی، ان کی باتیں سننے سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ میاں آزاد تو مارے جلن کے اپنے محل سے نکلتے ہی نہ تھے۔ مگر خوبی ٹوہ لینے کے لیے دن میں کئی بار یہاں آ بیٹھتے تھے۔ ان دونوں کو بھی خوبی کی باتوں میں بڑا مزہ آتا۔

ایک دن خوبی دونوں شہزادوں کے پاس گئے، تو اتفاق سے شہزادی وہاں نہ تھی۔ دونوں

شہزادوں نے خوبی کی بڑی خاطر کی۔ ہنری نے کہا۔ خوبہ صاحب، ہم کو پہچانا؟

یہ کہہ کر اس نے ٹوپ اتار دیا۔ خوبی چونک پڑے۔ یہ معیذا تھیں۔ بولے۔ مس

معیذا، خوب ملیں۔

معیذا: چپ چپ! شہزادی نہ جان نے پائے۔ ہم دونوں اسی لیے آئے ہیں کہ آزاد کو

یہاں سے چھڑا لے جائیں۔

خوجی: اچھا، کیا یہ بھی عورت ہے؟

میڈا: یہ وہی عورت ہیں جو آزاد کو پکڑ لے گئی تھیں۔

خوجی: خواہ، مس کلاریا! آپ تو اس قابل ہیں کہ آپ کا بایاں قدم لے۔

میڈا: اب یہ بتاؤ کہ یہاں سے چھٹکارا پانے کی بھی کوئی تدبیر ہے؟

خوجی: ہاں، وہ تدبیر بتاؤں کہ کبھی پٹ ہی نہ پڑے۔ یہ شہزادی بڑی پیٹنے والی ہے،

اسے خوب پلاؤ اور جب بے ہوش ہو جائے تو لے اڑو۔

خوجی نے جا کر آزاد سے یہ قصہ کہا۔ آزاد بہت خوش ہوئے۔ بولے۔ میں تو دونوں

کی صورت دیکھتے ہی تازہ کیا تھا۔

خوجی: مس کلاریا کہیں تمہیں دغا نہ دے۔

آزاد: اجی نہیں، یہ محبت کی گھاتیں ہیں۔

خوجی: ابھی ذرا دیر میں محفل جے گی۔ نہ کہو گے، کیسی تدبیر بتائی!

خوجی نے ٹھیک کہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں شہزادی نے ان دونوں آدمیوں کو بلا بھیجا۔ یہ

لوگ وہاں پہنچے تو شراب کے دور چل رہے تھے۔

شہزادی: آج ہم شرط لگا کر میٹیں گے۔

ہنری: منظور۔ جب تک ہمارے ہاتھ سے جام نہ چھوٹے تک تم بھی نہ چھوڑو۔ جو

پہلے چھوڑ دے وہ ہارا۔

کلارک: (آزاد سے) تم کون ہو میاں، صاف بولو!

آزاد: میں آدمی نہیں ہوں، دیوزاد ہوں۔ پر یاں مجھے خوب جانتی ہیں۔

کلاریا۔

اڑتا ہے مجھ سے او ستم ایجاد کس لیے

بنتا ہے آدمی سے پری زاد کس لیے

کلاریا نے شہزادی کو اتنی شراب پلائی کہ وہ مست ہو کر جھومنے لگی۔ تب آزاد نے

کہا۔ خواجہ صاحب، آپ سچ کہنا، ہمارا عشق سچا ہے یا نہیں۔ میڈا، خدا جانتا ہے، آج کا

دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ کسے امید تھی کہ اس قید میں تمہارا دیدار ہوگا؟

خوجی : بہت بہکو نہ بھائی، کہیں شہزادی سن رہی ہو تو آفت آ جائے۔

آزاد : وہ اس وقت دوسری دنیا میں۔

خوجی : شہزادی صاحب، یہ سب بھاگے جا رہے ہیں، ذرا ہوش میں تو آئیے۔

آزاد : اسے چپ رہ نالائق۔ میڈا بتاؤ، کس تدبیر سے بھاگو گی؟ مگر تم نے تو وہ روپ بدلا کہ خدا کی پناہ! میں یہی دل میں سوچتا تھا کہ ایسے حسین شہزادے یہاں کیسے آ گئے، جنہوں نے ہمارا رنگ پھینکا کر دیا۔ واللہ، جو ذرا بھی پہچانا ہو۔ مس کلا ریبا، تم نے تو غضب ہی کر دیا۔ کون جانتا تھا کہ سائبر یا بھیج کر تم مجھے چھڑانے آؤ گی!

میڈا : اب تو موقع اچھا ہے، رات زیادہ آگئی ہے۔ پہرے والے بھی سوتے ہوں گے، دیر کیوں کریں۔

آزاد اصطبل میں گئے اور چار تیز گھوڑے چھانت کر باہر لائے۔ دونوں عورتیں تو گھوڑے پر سوار ہو گئیں، مگر خوجی کی ہمت جھوٹ گئی، ڈرے کہ کہیں گر پڑیں تو بڑی پہلی چور ہو جائے۔ بولے۔ بھائی، تم لوگ جاؤ مجھے یہیں رہنے دو۔ شہزادی کو تسلی دینے والا بھی تو کوئی چاہیے۔ میں اسے باتوں میں لگائے رکھوں گا۔ جس میں اسے کوئی شک نہ ہو۔ خدا نے چاہا تو ایک ہفتے کے اندر قسطنطنیہ میں تم سے ملیں گے۔

یہ کہہ کر خوجی تو ادھر چلے اور وہ تینوں آدمی آگے بڑھے۔ قدم قدم پر پیچھے پھر پھر کر دیکھتے تھے کہ کوئی پکڑنے آ نہ رہا ہو۔ صبح ہوتے ہوتے یہ لوگ ڈینیوب کے کنارے آ پہنچے اور گھوڑوں سے اتر کر ہری ہری گھاس پر ٹہلنے لگے۔ ایک ایک پیچھے سے کئی سوار گھوڑے دوڑاتے آتے دیکھائی پڑے۔ ان لوگوں نے اپنے گھوڑے چرنے کو چھوڑ دیے تھے۔ اب بھائیں کیسے؟ دم کے دم میں سب کے سب سوار سر پر آ پہنچے اور ان تینوں آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اکیلے آزاد بھلاتیں آدمیوں کا کیا مقابلہ کرتے!

دوپہر ہوتے ہوتے یہ لوگ شہزادی کے یہاں جا پہنچے۔ شہزادی تو غصے میں بھری بیٹی تھی۔ اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ آزاد کو قید کر دو۔ یہ حکم دے کر شہزادوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکلی تو شہزادوں کی جگہ دو شہزادیاں کھڑی نظر آئیں۔ دھک سے رہ گئی۔ یا خدا، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں!

کلا ریبا : بہن، مرد کے بھیس میں تو تمہیں پیار کر چکے۔ اب آؤ، ہمیں ہمیں مل کر پیار

کریں۔ ہم وہی ہیں جن کے ساتھ تم شادی کرنے والی ہو۔

شہزادی: ارے کلاریا، تم یہاں کہاں؟

کلاریا: آؤ گلے ملیں۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تمہارے اوپر کوئی آفت نہ آجائے۔

ایسے نامی سرکاری قیدی کو اڑانا قصص مناسب نہ تھا۔ وزیر جنگ کو یہ خبر مل گئی ہے۔ اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ اس ترکی جوان کو ہمارے خوالے کر دو۔

شہزادی سمجھ گئی کہ اب آزاد کو رخصت کرنا پڑے گا۔ آزاد سے جا کر بولی۔ پیارے آزاد، میں نے تمہارے ساتھ جو برائیاں کی ہیں، انہیں معاف کرنا۔ میں نے جو کچھ کیا، دل کی جلن سے مجبور ہو کر کیا۔ تمہاری جدائی مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ جاؤ، رخصت۔

یہ کہہ کر اس نے کلاریا سے کہا۔ شہزادی، خدا کے لیے انہیں سائبیریا نہ بھیجنا۔ وزیر جنگ سے تمہاری جان بچان ہے! وہ تمہاری بات مانتے ہیں، اگر تم معاف کر دوگی، تو وہ ضرور معاف کر دیں گے۔

(80)

ادھر جب آزاد فوج سے غائب ہوئے تو چاروں طرف ان کی تلاش ہونے لگی۔ دو سپاہی گھومتے گھومتے شہزادی کے محل کی طرف آئے۔ اتفاق سے خوبی بھی انہی کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ ان دونوں سپاہیوں نے خوبی کو آزاد کے ساتھ پہلے دیکھا تھا۔ خوبی کو دیکھتے ہی پکڑ لیا اور آزاد کا پتہ پوچھنے لگے۔

خوبی: میں کیا جانوں کہ آزاد پاشا کون ہے۔ ہاں، نام لہنتہ سنا ہے۔

ایک سپاہی: تم آزاد کے ساتھ ہندستان سے آئے ہو اور تم کو خوب معلوم ہے کہ آزاد پاشا کہاں ہیں۔

خوبی: کون آزاد کے ساتھ آیا ہے؟ میں پٹھان ہوں، پیشاورد سے آیا ہوں، مجھ سے آزاد سے واسطہ؟

مگر وہ دونوں سپاہی بھی چھپے ہوئے تھے، خوبی کے جھانسنے میں نہ آئے۔ خوبی نے جب دیکھا کہ ان خالوں سے پتہ مشکل ہے تو سوچے کہ سڑی بن جاؤ۔ اور کچھ کا کچھ جواب دو۔ مرنے ہے تو دوسرے کو لے کر مرو۔ مرنے نہ ہوتا تو اپنا وطن چھوڑ کر اتنی دور آتے ہی کیوں۔

خاصے مزے میں نواب کے یہاں دندناتے تھے۔ آلو بنا بنا کر مزے اڑاتے تھے۔ چینی کے پیالیوں میں مالوے کی افیم گھلتی تھی، چندو کے چھینے اڑتے تھے، چرس کے دم لگتے تھے۔ وہ سب مزے چھوڑ چھاڑ کر آلو بنے، مگر پھنسنے سو پھنسنے!

سپاہی: تمہارا نام کیا ہے؟ جج جج بنا دو۔

خوجی: کل تک دریا چڑھا تھا، آج چڑیا دانہ چھلے گی۔

سپاہی: تمہارے باپ کا کیا نام تھا؟

خوجی: ہم کو اپنا نام تو یاد ہی نہیں۔ باپ کے نام کو کون کہے؟

سپاہی: تم یہاں کس کے ساتھ آئے؟

خوجی: شیطان کے ساتھ۔

سپاہیوں نے جب دیکھا کہ یہ اول جلول بک رہا ہے تو ایک مولے سے درخت میں باندھا اور بولے۔ ٹھیک ٹھیک بتلاتے ہو تو بتلا دو ورنہ ہم تمہیں پھانسی دے دیں گے۔

خوجی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ خدا سے دعا مانگتے لگے کہ اے خدا، میں تو اب دنیا سے جا رہا ہوں، مگر مرتے وقت دعا مانگتا ہوں کہ آزاد کا بال بھی بانکا نہ ہو۔

آخر، سپاہیوں کو خوجی کے سڑی ہونے کا یقین آ ہی گیا۔ چھوڑ دیا۔ خوجی کے سر سے یہ بلا نلی تو چپکنے لگے۔ تم لوگ زندگی کے مزے کیا جانو، ہم نے وہ وہ مزے لوٹے ہیں کہ سنو تو پھڑک جاؤ۔ نواب صاحب کی بدولت بادشاہ بنے پھرتے تھے، صبح سے دس بجے تک چندو کے چھینے اڑے، پھر کھانا کھایا، سوئے تو چار بجے کی خبر لائے، چار بجے سے افیم گھلنے لگی، پونڈے چھیلے اور گڑیریاں چوسیں، اتنے میں نواب صاحب نکل آئے۔ ویسے رئیس یہاں کہاں؟ وہاں کے ایک ادنیٰ کھار نے بیس لاکھ کی شراب اپنی برادری والوں کو ایک رات میں پلا دی۔ ایک کھار نے سونے چاندی کی کچیوں میں شراب پلائی۔ اس پر ایک بوڑھے خراث نے کہا۔ نہ بھائی بچو، اپنا مرچا نہ چھوڑو۔ ہمارے باپ یہی کچی ماں جھین۔ ہمارے دادا جھین، اب ہم کہاں کہ بڑے رئیس ہوئی گئیں! مہرا نے سونے چاندی کی پیالیاں منگوائی اور فقیروں کو بانٹ دیں۔ دس ہزار پیالیاں چاندی کی تھیں اور دس ہزار سونے کی۔ جب بادشاہ کو یہ خبر ملی تو حکم دیا کہ جتنے کھار آئے ہوں، سب کو ایک ایک لہنگا دلوا دیا جائے۔ اب اس گنی گزری حالت پر بھی جو بات وہاں ہے وہ کہیں نہیں ہے۔

سپاہی : آپ کے ملک میں سپاہی تو اچھے اچھے ہوں گے؟
 خوجی : ہمارے ملک میں ایک سے ایک سپاہی موجود ہیں۔ جو بے اپنے وقت کا رسم۔
 سپاہی : آپ بھی تو وہاں کے پہلوان ہی معلوم ہوتے ہیں۔
 خوجی : اس وقت تو سردی نے مار ڈالا ہے، اب بڑھاپا آیا، جوانی میں البتہ میں بھی
 ہاتھی کا دم پکڑ لیتا تھا تو ہنس نہیں سکتا تھا۔ اب نہ وہ شوق، نہ وہ دل، اب تو فقیری اختیار
 کی۔

سپاہی : آپ کی شادی بھی ہوئی ہے؟
 خوجی : آپ نے بھی وہی بات پوچھی! فقیر آدمی، شادی ہوئی نہ ہوئی، برابر کے لڑکے
 ہیں۔

سپاہی : آپ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں؟
 خوجی : اوہ، پوچھتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ یہاں بلا پڑھے لکھے ہی عالم فاضل ہیں،
 پڑھنے کا مرض نہیں پالتے، یہ عارضہ تو نہیں دیکھا، اپنے یہاں تو چنڈو، چرس، مک کے
 چرچے رہتے ہیں۔ ہاں، اگلے زمانے میں پڑھنے لکھنے کا بھی رواج تھا۔
 سپاہی : تو آپ کا ملک جاہلوں ہی سے بھرا ہوا ہے؟

خوجی : تم خود گنوار ہو۔ ہمارے یہاں ایک ایک پہلوان ایسے پڑے ہیں جو تین تین
 ہزار ہاتھ جوڑی کے ہلاتے ہیں۔ ڈنڈوں پر جھک گئے تو چار پانچ ہزار ڈنڈ چیل ڈالے۔ کلچلے
 ایسے کہ اندھیری رات میں صرف آواز پر تیر لگایا اور نشانہ خالی نہ گیا۔

یہ باتیں کر کے، خوجی نے اُفیم گھولی اور روسیوں سے پینے کے لیے کہا۔ اور سمسوں
 نے انکار کیا، مگر ایک مسافر کی شامت جو آئی تو اس نے ایک چسکی لگائی ذرا دیر میں نشے نے
 رنگ جمایا تو جھومنے لگا۔ ساتھیوں نے قہقہہ لگایا۔

خوجی : ایک دن کا ذکر ہے کہ نواب صاحب کے یہاں ہم بیٹھے تھے ازار بے تھے۔
 ایک مولوی صاحب آئے۔ یہاں اس وقت سرور ڈٹا ہوا تھا، ہم نے عرض کی، مولوی صاحب،
 اگر حکم ہو تو ایک پیالی حاضر کروں۔ مولوی نے آنکھیں نیلی پیلی کیں اور کہا۔ کوئی مسخرہ ہے
 بے تو! میں نے کہا۔ یار، ایمان سے کہہ دو کہ تم نے کبھی اُفیم پی ہے یا نہیں؟ مولوی صاحب
 اتنے جاے سے باہر ہوئے کہ مجھے ہزاروں گالیاں سنائیں۔ آج بڑی سردی ہے، ہم ٹھٹھرے

جاتے ہیں۔

سپاہی: یہ وقت ہوا کھانے کا ہے۔

خوجی: خدا کی مار اس مغل پر۔ یہ وقت ہوا کھانے کا ہے؟ یہ وقت آگ تاپنے کا ہے۔ ہمارے ملک کے رئیس اس وقت کھڑکیاں بند کر کے بیٹھے ہوں گے۔ ہوا کھانے کی اچھی کمی، یہاں تو روح کانپ رہی ہے اور آپ کو ہوا کھانے کی سوجھتی ہے۔

سپاہی: ایک مسافر نے ہم سے کہا تھا کہ ہندستان میں لوگ پرانی رسوں کے بہت پابند ہیں۔ اب تک پرانی لکیریں پیٹتے جاتے ہیں۔

خوجی: تو کیا ہمارے باپ دادا بے وقوف تھے؟ ان کی رسوں کو جو نہ مانے وہ کھوت، جو رسم جس طرح چلی آتی ہے اسی طرح رہے گی۔

سپاہی: اگر کوئی رسم خراب ہو تو کیا اس میں ترمیم کی ضرورت نہیں؟

خوجی: لاکھ ضرورت ہو تو کیا، پرانی رسوں کو کبھی ترمیم نہ کرنی چاہیے۔ کیا وہ لوگ احمق تھے؟ ایک آپ ہی بڑے عقلمند پیدا ہوئے!

روسیوں کو خوجی کی باتوں میں بڑا حشرہ آیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ کوئی دوسرا آدمی ہے۔ آزاد کا دوست نہیں۔ خوجی کو چھوڑ دیا اور کئی دن کے بعد یہ قسط خفیہ پہنچ گئے۔

(81)

ایک دن دو گھنٹی دن رہے چاروں پریاں بناؤ چناؤ کر کے ہنس کھیل رہی تھیں۔ سپہر آرا کا دوپٹہ ہوا کے جھونکوں سے اڑا جاتا تھا۔ جہاں آرا موہے کے عطر میں بسی تھی۔ کیتی آرا کا سیاہ ریشمی دوپٹہ خوب کھل رہا تھا۔

حسن آرا: بہن، یہ گرمی کے دن اور کالا ریشمی دوپٹہ! اب کہنے سے تو برا مایہ گا، جہاں آرا بہن نکھریں تو آج دولہا بھائی آنے والے ہیں، یہ آپ نے ریشمی دوپٹہ کیا سمجھ کے پہن رکھا!

عباسی: آج چھوڑے پر اچھی طرح چھڑکاؤ نہیں ہوا۔

ہیرا: ذرا بیٹھ کر دیکھیے تو، کوئی دس ٹھکیں تو چھوڑے ہی پر ڈالی ہوں گی۔

ایکا ایک مہری کی چھوڑی پیاری دوڑتی ہوئی آئی اور بولی۔ حضور، ہم نے یہ آج

گھٹی پالی ہے۔ بڑی سرکار نے خرید دی اور دو آنے مہینہ باندھ دیا۔ صبح کو ہم حلوا کھلائیں گے۔ شام کو پیڑا۔ ادھر پہر آرا اور کیتی آ رہ گیند کھیلنے لگیں تو حسن آرا نے کہا، اب روز گیند ہی کھیلا کرو گی؟ ایسا نہ ہو، آج بھی لٹاں جان آ جائیں۔

عتاسی: حضور، گیند کھیلنے میں کون سا عیب ہے؟ دو گھڑی دل بہلتا ہے۔ بڑی سرکار کی نہ کہیے، وہ بوڑھی ہوئیں، بگڑی ہی چاہیں۔

بہی باتیں ہو رہی تھیں کہ شہزادہ ہمایوں فرہاتھی پر سوار بانچے کی دیوار سے جھانکتے ہوئے نکلے۔ پہر آرا بیگم کو گیند کھیلنے دیکھا تو مسکرا دیے۔ ہاتھی تو آگے بڑھ گیا مگر حسن آرا کو شہزادے کا یوں جھانکنا برا لگا۔ داروغہ کو بلا کر کہا، کل اس دیوار پر دو رڈے اور چڑھا دو، کوئی ہاتھی پر ادھر سے نکل جاتا ہے تو بے پردگی ہوتی ہے۔ سو کام چھوڑ کر یہ کام کرو۔

جب داروغہ چلے گئے تو جہاں آرا نے کہا۔ پہر آرا بہن نے ان کو اتنا ڈھیٹ کر دیا، نہیں شہزادے ہوں یا خود بادشاہ ہوں، ایسی اندھیر فکری نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے، چلا آئے۔

پھر وہی چہل پہل ہونے لگی۔ پہر آرا اور عتاسی بچپنی کھیلنے لگیں۔

عتاسی: حضور، اب کی ہاتھ میں یہ گوٹ نہ پیڑوں تو عتاسی نام نہ رکھوں۔

پہر آرا: واہ! کہیں چٹنی نہ ہو۔

عتاسی: یا اللہ، بچپن پڑیں۔ ارے، دیے بھی تو تین کانے؟ بازی خاک میں مل گئی۔

حسن آرا: لے کے ہروا نہ دی ہماری بازی! بس اب دور ہو۔

عتاسی: اے بی بی، میں کیا کروں لے بھلا۔ پانسا وہی ہے لیکن وقت ہی تو ہے۔

حسن آرا: اچھا بازی ہو لے، تو ہم پھر آئیں۔

پہر آرا: اب میں داؤں بولتی ہوں۔

حسن آرا: ہم سے کیا مطلب، وہ جانے، تم جانو۔ بولو عتاسی۔

عتاسی: حضور، جب بازی سیتا ناس ہو گئی تب تو ہم کو ملی اور اب حضور نکلی جاتی ہیں۔

حسن آرا: ہم نہیں جانتے۔ پھر کھیلنے کیوں بیٹھی تھیں؟

عتاسی: اچھا منظور ہے، بھیکے پانسا۔

پہر آرا: دو پیچے کی تحفہ ہے اتنا سوچ لو۔

عتاسی : اے حضور، آپ کی جوتیوں کا صدقہ، کون بڑی بات ہے۔ مہیکے تین کانے۔
 سپہر آرا نے جو پانسا پھیکا تو پچیس! دوسرا پچیس، تیس، پھر پچیس، غرض سات پچیس
 ہوئیں۔ بولی۔ لے اب روپے بائیں ہاتھ سے ڈھیلے کیجیے۔ مہری، باجی کی صندوقچی تو لے
 آؤ، الماری کے پاس رکھی ہے۔

حسن آرا نے مہری کو آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ مہری کمرے سے باہر آکر بولی۔
 اے حضور، کہاں ہے؟ وہاں تو نہیں ملتی۔

سپہر آرا: بس جاؤ بھی، ہاتھ جھلاتی آئیں، چلو ہم بتا دیں کہاں ہے۔
 مہری : جو حضور بتا دیں تو اور تو لوٹڈی کی حیثیت نہیں ہے، مگر سیر بھر مٹھائی حضور کی نظر
 کروں۔

سپہر آرا مہری کو ساتھ لے کر کمرے کی طرف چلیں۔ دیکھا تو صندوقچی ندارد! ہیں، یہ
 صندوقچی کون لے گیا؟ مہری نے لاکھ ہنسی ضبط کی مگر ضبط نہ ہو سکی۔ تب تو سپہر آرا جھلاتی، یہ
 بات ہے! میں بھی کہوں، صندوقچی کہاں غائب ہو گئی۔ تمہیں قسم ہے، دے دو۔

سپہر آرا پھر ناک سکڑتی ہوئی باہر آئی تو سب نے مل کر تہقہہ لگایا۔ ایک نے پوچھا۔
 کیوں، صندوقچی ملی؟ دوسری بولی۔ ہمارا حصہ نہ بھول جانا۔ حسن آرا نے کہا۔ بہن، دس ہی
 روپیہ نکالنا۔ عتاسی نے کہا۔ حضور، دیکھیے، ہسی نے جتوڑ دیا، اب کچھ رشوت دیجیے۔

مہری : اور بی بی، میں بھلا کا ہے کو چھپا دیتی، کچھ میری گرہ سے جاتا تھا۔
 سپہر آرا: بس بس بیٹھو، چلیں وہاں سے بڑی وہ بن کے۔
 مہری : اپنی ہنسی کو کیا کروں، مجھی پر دھوکہ ہوتا ہے۔

اتنے میں دربان نے آواز دی، سواریاں آئی ہیں، اور ذرا دیر میں دو عورتیں ڈولیوں
 سے اتر کر اندر آئیں۔ ایک کا نام نظیر بیگم، دوسری کا جانی بیگم۔

حسن آرا : بہت دن بعد دیکھا۔ مزاج اچھا رہا بہن؟ دہلی کیوں ہو اتنی؟
 نظیر : ماندی تھی، ہارے خدا خدا کر کے، اب سنبھل ہوں۔

حسن آرا : ہم نے تو سنا بھی نہیں۔ جانی بیگم ہم سے کچھ خفا سی معلوم ہوتی ہیں، خدا
 خیر کرے!

جانی : بس، بس ذری میری زبان نہ کھلوانا، اگلے چور کو تو دل کو ڈانٹے۔ یہاں تک آتے

مہندی کھس جاتی۔

جانی بیگم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ نظیر بیگم بھولی بھالی تھیں۔ جانی بیگم نے آتے ہی آتے کہا، حسن آرا آؤ، آنکھ موندی دھپ کھیلیں۔

جہاں آرا: کیا یہ کوئی کھیل ہے؟

جانی: اے ہے، کیا تعھی بنی جاتی ہیں!

نظیر: بس ہم تمہاری انھیں باتوں سے گھبراتے ہیں۔ اچھی باتیں نہ کرو گی۔

جانی: اے، وہ ٹھوڑی اچھی باتیں کون سی ہوتی ہیں، سنے تو سہی۔

نظیر: اب تمہیں کون سمجھائے۔

جانی بیگم سپر آرا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر باغیچے کی طرف لے گئیں تو حسن آرا نے کہا۔ ان کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔

بڑی بیگم: بڑی کلا دراز چھو کر ہے۔ اس کے میاں کی جان عذاب میں ہے، ہم تو ایسے کو اپنے پاس بھی نہ آنے دیں۔

حسن آرا: نہیں لتاں جان، یہ نہ فرمائیے، ایسی نہیں ہے، مگر ہاں، زبان نہیں رکتی۔

ایکا ایک جانی بیگم نے آکر کہا۔ اچھا بہن، اب رخصت کرو۔ گھر سے نکلی بڑی دیر ہوئی۔

حسن آرا: آج تم دونوں نہ جانے پاؤ گی۔ ابھی آئے کتنی دیر ہوئی؟

جانی: نظیر بیگم کو چاہے نہ جانے دو، میں تو جاؤں گی ہی۔ میاں کے آنے کا یہی وقت ہے۔ مجھے میاں کا جتنا ڈر ہے، اتنا اور کسی کا نہیں۔ نظیر کی آنکھوں کا تو پانی مر گیا ہے۔

نظیر: اس میں کیا شک، تم بے چاری بڑی غریب ہو۔

اسی طرح آپس میں بہت دیر تک ہنسی دل لگی ہوتی رہی۔ مگر جانی بیگم نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ ٹھوڑی ہی دیر میں وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

(82)

ڑپا بیگم چوری کے بعد بہت غمگین رہنے لگیں۔ ایک دن عباسی سے بولیں۔ عباسی، دل کو ذرا تسکین نہیں ہوتی۔ اب ہم سمجھ گئے کہ جو بات ہمارے دل میں ہے وہ حاصل نہ

ہوگی۔

شیشہ ہاتھ آیا نہ ہم نے کوئی ساگر پایا
ساقیا لے تیری محفل سے چلے بھر پایا

ساری خدائی میں ہمارا کوئی نہیں۔

عباسی نے کہا۔ بی بی، آج تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ، جس کے لیے آپ رویا کرتی ہیں، کون ہیں؟ اور یہ جو آزاد آئے تھے، یہ کون ہیں۔ ایک دن باگی عورتوں کے بھیس میں آئے، ایک دن گوسائی بن کے آئے۔

ثریا بیگم نے کچھ جواب نہ دیا۔ دل ہی دل میں سوچی کہ جیسا کیا دیا پایا۔ آخر حسن آرا میں کون سی بات ہے جو ہم میں نہیں۔ فرق یہی ہے کہ وہ نیک چلن ہیں اور میں بدنام۔ یہ سوچ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں، جی بھاری ہو گیا۔ گاڑی تیار کرائی اور ہوا کھانے چلیں۔ راستے میں سلارو اور اس کے وکیل صاحب نظر پڑے۔ سلارو کہہ رہا تھا۔ جناب، ہم وہ نوکر ہیں جو باپ بن کے مالک کے یہاں رہتے ہیں۔ آپ کو ہماری عزت کرنی چاہیے۔ اتفاق سے وکیل صاحب کی نظر اس گاڑی پر پڑی۔ بولے۔ خیر، باپ پیچھے بن لیتا، ذری جا کر دیکھو تو، اس گاڑی میں کون سوار ہے؟ سلارو نے کہا، حضور، میں پچھنے حالوں ہوں، کیا جاؤں! آپ بھاری بھر کم آدمی ہیں، کپڑے بھی اچھے اچھے پہنے ہیں۔ آپ ہی جائیں۔ وکیل صاحب نے نزدیک آکر کوچوان سے پوچھا۔ کس کی گاڑی ہے؟ کوچوان پنجاب کا رہنے والا پنہان تھا۔ حملہ کر بولا۔ تم سے کیا واسطہ، کسی کی گاڑی ہے!

سلارو بولے۔ ہاں جی، تم کو اس سے کیا واسطہ کہ کس کی گاڑی ہے؟ ہٹ جاؤ راستے سے۔ دیکھتے ہیں کہ سواریاں ہیں، مگر ڈٹے کھڑے ہیں۔ ابھی جو کوئی ان کا عزیز ساتھ ہوتا تو اتر کے اتنا ٹھوکتا کہ شئی پٹی بھول جاتی۔ تم وہاں کھڑے ہونے والوں کون ہو؟ وکیل صاحب کو ایک تو یہی غصہ تھا کہ کوچوان نے ڈنپا، اس پر سلارو نے پاجی بتایا۔ لال لال آنکھوں سے گھور کر رہ گئے، پاتے تو کھا ہی جاتے۔

سلارو: یہ تو نہ ہوا کہ کوچوان کو ایک ڈنڈا رسید کرتے۔ اگلے مجھ پر بگڑ رہے ہو۔ کوچوان چاہتا تھا کہ اتر کر وکیل صاحب کی گردن ناپے، مگر ثریا بیگم نے کوچوان کو روک لیا اور کہا۔ گھر لوٹ چلو۔

بیگم صاحب جب گھر پہنچی تو داروغہ جی نے آکر کہا کہ حضور، گھر سے آدمی آیا ہے۔ میرا پوتا بہت بیمار ہے۔ مجھے حضور رخصت دیا۔ یہ لالہ خوش وقت رائے میرے پرانے دوست ہیں، میری عوض کام کریں گے۔

ثریا بیگم نے کہا۔ جائیے، مگر جلد آئیے گا۔

دوسرے دن ثریا بیگم نے لالہ خوش وقت رائے سے حساب مانگا۔ لالہ صاحب پرانے فیشن کی دستار باندھے، چمکن پہنے ہاتھ میں قلمدان لیے آ پہنچے۔

ثریا بیگم: لالہ، کیا سردی معلوم ہوتی ہے، یا جوڑی آتی ہے، لحاف دوں!

لالہ صاحب: حضور، بارہوں مہینے اسی پوشاک میں رہتا ہوں۔ نواب صاحب کے وقت میں ان کے درباریوں کی یہی پوشاک تھی۔ اب وہ زمانہ کہاں، وہ بات کہاں، وہ لوگ کہاں۔ میرے والد 6 روپیہ ماہواری طلب پاتے تھے۔ مگر برکت ایسی تھی کہ ان کے گھر کے سب لوگ بڑے آرام سے رہتے تھے۔ دروازے پر دو دستے مقرر تھے۔ بیس جوان۔ اصطبل میں دو گھوڑے۔ فیل خانے میں ایک مادہ ہاتھی! ایک زمانہ وہ تھا کہ دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ اب ایک کونے میں جان بچائے بیٹھے ہیں۔

یہ کہتے کہتے لالہ صاحب، نواب صاحب کی یاد کر کے رونے لگے۔

یہاں ایک مہری نے آکر کہا۔ حضور، آج پھر ٹٹ گئے۔ لالہ صاحب بھی گھڑی سنبالاتے ہوئے چلے۔ ثریا بیگم جھپٹیں کہ چل کر دیکھیں تو، مگر مارے رنخ کے چلنا مشکل ہو گیا۔ جس کوٹھری میں لالہ صاحب سوئے تھے اس میں سیند لگی ہے۔ سیند دیکھتے ہی روئیں کھڑے ہو گئے۔ رو کر بولیں۔ بس اب کمر ٹٹ گئی۔ محلے میں ہلچل مچ گئی۔ پھر تھانے دار صاحب آ پہنچے، تحقیقات ہونے لگی۔

تھانے دار: رات کو اس کوٹھری میں کون سویا تھا؟

لالہ صاحب: میں! گیارہ بجے سے صبح تک۔

تھانے دار: تمہیں کس وقت معلوم ہوا کہ سیند لگی؟

لالہ صاحب: دن چڑھے۔

تھانے دار: بڑے تعجب کی بات ہے کہ رات کو کوٹھری میں آدمی سوئے، اس کے کپڑے پر سیند دی جائے اور اس کو ذرا بھی خبر نہ ہو۔ آپ کتنے دنوں سے یہاں نوکر ہیں؟ آپ کو پہلے

کبھی نہ دیکھا۔

لالہ صاحب : میں ابھی دو ہی دن کا نوکر ہوں۔ پہلے کیسے دیکھتے۔

ثریا بیگم کی روح کانپ رہی تھی کہ خدا ہی خیر کرے۔ مال کا مال ہو گیا اور یہ کم بخت عزت کا الگ گاہک ہے۔ خیر، تھانے دار صاحب تو تحقیقات کر کے لے ہوئے۔ ادھر ثریا بیگم مارے غم کے بیمار پڑ گئی۔ کئی دن تک علاج ہوتا رہا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک دن گھبرا کر حسن آرا کو ایک خط لکھوایا جس میں اپنی بے قراری کا رونا رونے کے بعد آزاد کا پتہ پوچھا تھا اور حسن آرا کو اپنے یہاں ملاقات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ حسن آرا بیگم کے پاس یہ خط پہنچا تو دنگ ہو گئیں۔ بہت سوچ سمجھ کر خط کا جواب لکھا۔

’بیگم صاحب کی خدمت میں آداب !

آپ کا خط آیا، افسوس! تم بھی اسی مرض میں گرفتار ہو۔ آپ سے ملنے کا شوق تو ہے، مگر آنہیں سکتی، اگر تم آ جاؤ تو دو گھنٹی غم غلط ہو۔ آزاد کا حال اتنا معلوم ہے کہ روم کی فوج میں افسر ہیں۔ ثریا بیگم، سچ کہتی ہوں کہ اگر بس چلتا تو اسی دم تمہارے پاس جا پہنچتی۔ مگر خوف ہے کہ کہیں مجھے لوگ ڈھیٹ نہ سمجھنے لگیں۔

تمہاری، حسن آرا

یہ خط لکھ کر عباسی کو دیا۔ عباسی خط لے کر ثریا بیگم کے مکان پر پہنچی، تو دیکھا کہ وہ بیٹھی رو رہی ہیں۔

اب سنے کہ وکیل صاحب نے ثریا بیگم کی نوہ لگا لی۔ دنگ ہو گئے کہ یا خدا، یہ یہاں کہاں۔ گھر جا کر سلا رو سے کہا۔ سلا رو نے سوچا، میاں پاگل تو ہیں ہی، کسی عورت پر نظر پڑی ہوگی، کہہ دیا ہتھو جان ہیں۔ بولا۔ حضور، پھر کچھ فکر کیجیے۔ وکیل صاحب نے فوراً خط لکھا۔

’ہتھو جان، تمہارے چلے جانے سے دل پر جو کچھ گزری، دل ہی جانتا ہے۔ افسوس، تم بڑی بے مروت نکلیں۔ اگر جانا ہی تھا تو مجھ سے پوچھ کر گئی ہوتیں۔ یہ کیا کہہ بلا کیے سنے چل دیں، اب خیر اسی میں ہے کہ چپکے سے چلی آؤ۔ جس طرح کسی کو کانوکان خبر نہ ہوئی اور تم چل دیں، اسی طرح اب بھی کسی سے کہو نہ سنو، چپ چاپ چلی آؤ۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں نامی گرامی وکیل ہوں۔

تمہارا، وکیل

سلارو نے کہا۔ میاں، خوب غور کر کے لکھنا اور نہیں ہم ایک بات بتاویں۔ ہم کو بھیج دیجیے، میں کہوں گا، بی بی، وہ تو مالک ہیں، پہلے ان کے غلام سے تو بحث کر لو۔ گو پڑھا لکھا نہیں ہوں، مگر عمر بھر لکھنؤ میں رہا ہوں!

وکیل صاحب نے سلارو کو ڈانٹا اور خط میں اتنا اور بڑھا دیا، اگر چاہوں تو تم کو پھنسا دوں۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ ہاں، اگر تم نے بات نہ مانی تو ہم بھی وق کریں گے۔

یہ خط لکھ کر ایک عورت کے ہاتھ ثریا بیگم کے پاس بھیج دیا۔ بیگم نے لالہ صاحب سے کہا۔ ذرا یہ خط پڑھیے تو۔ لالہ صاحب نے خط پڑھ کر کہا، یہ تو کسی پاگل کا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو خط پڑھ کر باہر چلے گئے اور ثریا بیگم سوچنے لگیں کہ اب کیا کیا جائے؟ یہ موزی بے طرح پیچھے پڑا۔ سویرے لالہ خوش و منت رائے ثریا بیگم کی ڈیوڑھی پر آئے تو دیکھا کہ یہاں کہرام مچا ہوا ہے۔ ثریا بیگم اور عباسی کا کہیں پتہ نہیں۔ سارا محل چھان ڈالا گیا، مگر بیگم صاحب کا پتہ نہ چلا۔ لالہ صاحب نے گھبرا کر کہا۔ ذرا اچھی طرح دیکھو، شاید دل لگی میں کہیں چھپ رہی ہوں۔ غرض سارے گھر میں تلاش کی، مگر بے فائدہ۔

لالہ صاحب: یہ تو عجیب بات ہے، آخر دونوں چلی کہاں گئیں؟ ذرا اسباب و سباب تو دیکھ لو، ہے یا سب لے دے کے چل دیں۔

لوگوں نے دیکھا کہ زیور کا نام بھی نہ تھا۔ جواہرات اور قیمتی کپڑے سب نداد۔

(83)

شہزادہ ہمایوں فر بھی شادی کی تیاریاں کرنے لگے۔ سوداگروں کی کوٹھیوں میں جا جا کر سامان خریدنا شروع کیا۔ ایک دن ایک نواب صاحب سے ملاقات ہو گئی۔

بولے — کیوں حضرت، یہ تیاریاں!

شہزادہ: آپ کے مارے کوئی سودا نہ خریدے؟

نواب: جناب،

چوتنوں سے تازہ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے۔

شہزادہ: آپ کو یقین ہی نہ آئے تو کیا علاج؟

نواب: خیر، اب یہ فرمائیے، حیدر کو پٹنہ سے بلوایئے گا یا نہیں؟ بھلا دو ہفتے تک تو دھا

چوڑی رہے۔ مگر استاد، طائفے نوک کے ہوں۔ روٹی کلاوت ہوں گے تو ہم نہ آئیں گے۔ بس، یہ انتظام کیا جائے کہ دو محفلیں ہوں۔ ایک رئیسوں کے لیے اور ایک قدروں کے لیے۔ ادھر تو یہ تیاریاں ہو رہی تھیں، ادھر بڑی بیگم کے یہاں یہ خط پہنچا کہ شہزادہ ہمایوں فر کو گردے کے درد کی بیماری ہے اور دمہ بھی آتا ہے۔ کئی بار وہ جوئے کی علت میں سزا پا چکا ہے۔ اس کو کسی نشے سے پرہیز نہیں۔

بڑی بیگم نے یہ خط پڑھا کر سنا تو بہت گھبرائیں۔ مگر حسن آرا نے کہا، یہ کسی دشمن کا کام ہے۔ آج تک کبھی تو سنتے کہ ہمایوں فر جوئے کی علت میں پکڑے گئے۔ بڑی بیگم نے کہا۔ اچھا، ابھی جلدی نہ کرو۔ آج ڈومیاں نہ آئیں۔ کل پرسوں دیکھا جائے گا۔ دوسرے دن عتاسی یہ خط لے کر شہزادہ ہمایوں فر کے پاس گئی۔ شہزادہ نے خط پڑھا تو چہرہ سرخ ہو گیا۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ تب اپنے صندوق سے ایک خط نکال کر دونوں کی لکھاوٹ ملائی۔

عتاسی: حضور نے دستخط پہچان لیا تا؟

شہزادہ: ہاں، خوب پہچانا، پر یہ بد معاش اپنی شرارت سے باز نہیں آتا، اگر ہاتھ لگا تو ایسا ٹھیک بناؤں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔ لو، تم یہ خط بھی بیگم صاحب کو دکھا دینا اور دونوں خط واپس لے آنا۔ یہ وہی خط تھا جو شہزادے کی کوٹھی میں آگ لگنے کے بعد آیا تھا۔

رات بھر شہزادہ کو نیند نہیں آئی، طرح طرح کے خیال دل میں آتے تھے۔ ابھی چارپائی سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ بھانڈوں کا غول آپہنچا۔ لالہ کالی چرن نے جو ڈیوڑھی کا حساب لکھتے تھے، کھڑکی سے گردن نکال کر کہا۔ ارے بھائی، آج کیا.....

اتنا کہنا تھا کہ بھانڈوں نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک بولا۔ ہمیں تو سوس معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا۔ لکھنؤ کے کہاروں کے ہاتھ چوم لینے کے قابل ہیں۔ سچ بچ کا بن مائس بنا کر کھڑا کر دیا۔ تیسرے نے کہا۔ استاد، دم کی کسر رہ گئی۔ چوتھا بولا۔ پھر خدا اور انسان کے کام میں اتنا فرق بھی نہ رہے۔ لالہ صاحب تھلے تو ان لوگوں نے اور بھی بنانا شروع کیا۔ چوٹ کرتا ہے، ذرا سنہلے ہوئے۔ اب اٹھا ہی چاہتا ہے۔ ایک بولا۔ بھلا بتاؤ تو، یہ بن مائس یہاں کیوں آیا؟ کسی نے کہا۔ چڑی مار لایا ہے۔ کسی نے کہا۔ راستہ بھول کر بستی کی طرف نکل آیا ہے۔ آخر ایک اثرنی دے کر بھانڈوں سے نجات ملی۔

دوسرے دن شہزادہ صبح کے وقت اٹھے تو دیکھا کہ ایک خط سرہانے رکھا ہے۔ خط پڑھا تو دنگ ہو گئے۔

’سنو جی، تم بادشاہ کے لڑکے ہو اور ہم بھی رئیس کے بیٹے ہیں۔ ہمارے راستے میں نہ پڑو، نہیں تو برا ہوگا۔ ایک دن آگ لگا چکا ہوں، اگر سپہر آرا کے ساتھ تمہاری شادی ہوئی تو جان لے لوں گا۔ جس روز میں نے یہ خبر سنی ہے، یہی جی چاہ رہا ہے کہ چھری لے کر پہنچوں اور دم کے دم میں کام تمام کر دوں۔ یاد رکھو کہ میں بے چوٹ کیے نہ رہوں گا۔‘

شہزادہ ہمایوں فراسی وقت صاحبِ ضلع کی کوٹھی پر گئے اور سارا قصہ کہا۔ صاحب نے خفیہ پولس کے ایک افسر کو اس معاملے کی تحقیقات کرتے کا حکم دیا۔

صاحب سے رخصت ہو کر وہ گھر آئے تو دیکھا کہ ان کے پرانے دوست حاجی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ حضرت ایک ہی گھاگھ تھے، عالموں سے بھی ملاقات تھی، بانکوں سے بھی ملتے جلتے رہتے تھے۔ شہزادہ نے ان سے بھی اس خط کا ذکر کیا۔ حاجی صاحب نے وعدہ کیا کہ ہم اس بد معاش کا ضرور پتہ لگائیں گے۔

شہسوار نے ادھر تو ہمایوں فر کو قتل کرنے کی دھمکی دی، ادھر ایک تحصیل دار صاحب کے نام سرکاری پروانہ بھیجا۔ آدی نے جا کر دس بجے رات کو تحصیل دار کو جگایا اور یہ پروانہ دیا۔ ’آپ کو قلمی ہوتا ہے کہ مبلغ پانچ ہزار روپیہ اپنی تحصیل کے خزانے سے لے کر، آج رات کو کالی ڈیہہ کے مقام پر حاضر ہوں۔ اگر آپ کو فرصت نہ ہو تو پیش کار کو بھیجیے، تاکید جائے۔‘

تحصیل دار نے خزانچی کو بلایا، روپیہ لیا، گاڑی پر روپیہ لدوایا اور چار چہرہ سیوں کو ساتھ لے کر کالی ڈیہہ چلے۔ وہ گاؤں یہاں سے دو کوس پر تھا۔ راستے میں ایک گھٹا جنگل پڑتا تھا۔ بستی کا کہیں نام نہیں۔ جب اس مقام پر پہنچے تو ایک چھول داری ملی۔ وہاں جا کر پوچھا۔ کیا صاحب سوتے ہیں؟

سپاہی: صاحب نے ابھی جائے پی ہے۔ آج رات بھر نکھیں گے۔ کسی سے مل نہیں سکتے۔

تحصیل دار: تم اتنا کہہ دو کہ تحصیل دار روپیہ لے کر حاضر ہے۔
چہرہ سی نے چھول داری میں جا کر اطلاع کی۔ صاحب نے کہا، بلاؤ۔ تحصیل دار صاحب

اندر گئے تو ایک آدمی نے ان کا منہ زور سے دبا دیا اور کئی آدمی ان پر ٹوٹ پڑے۔ سامنے ایک آدمی انگریزی کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ تحصیل دار خوب جکڑ دیے گئے تو مسکرا کر بولا۔ ویل تحصیل دار! تم روپیہ لایا، اب مت بولنا۔ تم بولا اور میں نے گولی ماری۔ تم ہم کو اپنا صاحب سمجھو۔

تحصیل دار: حضور کو اپنے صاحب سے بڑھ کر سمجھتا ہوں، وہ اگر ناراض ہوں گے تو درجہ گھٹا دیں گے۔ آپ تو چھری سے بات کریں گے۔

شہسوار نے تحصیل دار کو چمکے دے کر رخصت کیا اور اپنے ساتھیوں میں ڈینگ مارنے لگا۔ دیکھا، اس طرح یار لوگ چمکے دیتے ہیں۔ ساتھی لوگ ہاں میں ہاں ملا رہے تھے کہ اتنے میں ایک گندھی تیل کی کیتیاں اور بوتلیں لٹکائے چھول داری کے پاس آیا اور بولا۔ حضور، سلام کرتا ہوں۔ آج سودا بیچنے ذرا دور نکل گیا تھا، لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ آگے گھٹا جنگل ہے، اگر حکم ہو تو یہیں رہ جاؤں؟

شہسوار: کس کس چیز کا عطر ہے؟ ذرا موٹے کا تو دیکھاؤ

گندھی: حضور، اڈل نمبر کا موتیا ہے، ایسا شہر میں ملے گا نہیں۔

شہسوار نے جیوں ہی عطر لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، گندھی نے سیٹی بجائی اور سیٹی کی آواز سنتے ہی پچاس ساٹھ کانشبل ادھر ادھر سے نکل پڑے اور شہسوار کو گرفتار کر لیا۔ یہ گندھی نہ تھا، انسپکٹر تھا، جسے حاکم ضلع نے شہسوار کا پتہ لگانے کے لیے تعینات کیا تھا۔

میاں شہسوار جب انسپکٹر کے ساتھ چلے تو راستے میں انھیں للکارنے لگے۔ اچھا بچہ، دیکھو تو سہی، جاتے کہاں ہو۔

انسپکٹر: ہس! چور کے پاؤں کتنے، چودہ برس کو جاؤ گے۔

شہسوار: سنو میاں، ہمارے کانٹے کا منتر نہیں، ذرا زبان کو لگام دو، ورنہ آج کے دسویں دن تمہارا پتہ نہ ہوگا۔

انسپکٹر: پہلے اپنی فکر تو کرو۔

شہسوار: ہم کہہ دیں گے کہ اس انسپکٹر کی ہم سے صداقت ہے۔

انسپکٹر: اجی، کڑھ کڑھ کر جیل خانے میں مرو گے۔

ادھر بڑی بیگم کے یہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ڈومینوں کا گانا ہو رہا تھا۔ ادھر شہزادہ ہمایوں فر ایک دن دریا کی سیر کرنے گئے۔ گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ہوا زوروں کے ساتھ چل رہی تھی۔ شام ہوتے ہوتے آندھی آگئی اور کشتی دریا میں چکر کھا کر ڈوب گئی۔ ملاح نے کشتی کے بچانے کی بہت کوشش کی، مگر موت سے کسی کا کیا بس چلتا ہے۔ گھر پر یہ خبر آئی تو کہرام مچ گیا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ دروازے پر بھانڑ مبارکباد گا رہے تھے، آج بین ہو رہے ہیں، کل ہمایوں فر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے کہ ودلہا بنیں گے، آج دریا میں غوطے کھاتے ہیں۔ کسی طرف سے آواز آتی ہے۔ ہائے میرے بچے! کوئی کہتا ہے۔ میں، میرے لال کو کیا ہوا! رونے والا گھر بھر اور سمجھانے والا کوئی نہیں۔ ہمایوں فر کی ماں رو رو کر کہتی تھیں، ہائے! میں دکھیا اسی دن کے لیے اب تک جیتی رہی کہ اپنے بچے کی میت دیکھوں۔ ابھی تو مسیں بھی نہیں بھیگنے پائی تھیں کہ تمام بدن دریا میں بھیگ گیا۔ بہن روتی تھی، میرے بھیا، ذری آنکھیں تو کھولو۔ ہائے، جن ہاتھوں سے میں نے مہندی رچی تھی ان سے اب سراور چھاتی پینتی ہوں۔ کل سمجھتے تھے کہ پرسوں برات بچے گی، خوشیاں منائیں گے اور آج ماتم کر رہے ہیں۔ اٹھو، اماں جان تمہارے سر ہانے کھڑی رو رہی ہیں۔

یہاں تو رونا پیننا مچا ہوا تھا، وہاں بڑی بیگم نے جیوں ہی خبر پائی، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عبا سی سے کہا۔ جا کر لڑکیوں سے کہہ دے کہ نیچے باغ میں مجلس۔ کوٹھے پر نہ جائیں۔ عبا سی نے جا کر یہ بات کچھ اس طرح کہی کہ چاروں بہنوں میں کوئی یہ نہ سمجھ سکیں۔ مگر جہاں آرا تازہ گئی۔ اٹھ کر اندر گئی تو بڑی بیگم کو روتے دیکھا۔ بولی۔ اماں جان، صاف صاف بتاؤ۔

بڑی بیگم: کیا بتاؤں بیٹی، نہایتیوں فر چل بے۔

جہاں آرا: ارے!

بڑی بیگم: چپ چپ، سپہ آرا نہ سننے پائے۔ میں نے گاڑی تیار ہونے کا حکم دیا ہے، چلو باغ کو چلیں، تم ذرا بھی ذکر نہ کرنا۔

جہاں آرا: ہائے امی جان، یہ کیا ہوا؟

بڑی بیگم : خدا کے واسطے بیٹی، چپ رہو، بڑا برا وقت جاتا ہے۔
 جہاں آرا: اف، جی گھبراتا ہے، ہم کو نہ لے چلیے، نہیں سپہر آرا سمجھ جائیں گی۔ ہم سے
 رونا ضبط نہ ہو سکے گا، کہا مایہ، ہم کو نہ لے چلیے۔
 بڑی بیگم: یہاں اتنے بڑے مکان میں اکیلی کیسی رہو گی؟
 جہاں آرا: یہ منظور ہے، مگر ضبط ممکن نہیں۔

سب کی سب دل میں خوش تھیں کہ باغ کی سیر کریں گے، مگر یہ خبر ہی نہ تھی کہ بڑی
 بیگم کس سبب سے باغ لیے جاتی ہیں۔ چاروں بہنیں پاکی گاڑی پر سوار ہوئی اور آپس میں
 مزے مزے کی باتیں کرتی ہوئی چلیں۔ مگر عتابی اور جہاں آرا کے دل پر بجلیاں گرتی تھیں۔
 باغ میں پہنچ کر جہاں آرا نے سر درد کا بہانہ کیا اور لیٹ رہیں، چاروں بہنیں چمن کی سیر کرنے
 لگیں۔ سپہر آرا نے موقع پا کر کہا— عتابی، ایک دن ہم اور شہزادے اس باغ میں ٹہل رہے
 ہوں گے۔ نکاح ہوا اور ہم ان کو باغ میں لے آئے۔ ہم پانچ روز یہاں ہی رہیں گے۔
 عتابی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ دل میں کہنے لگیں، کدھر خیال ہے، کیا
 نکاح اور کیسی شادی؟ وہاں جنازے اور کفن کی حتمیاں ہو رہی ہوں گی۔
 یکا یک سپہر آرا نے کہا— بہن، ہچکیاں آنے لگیں۔
 حسن آرا: کوئی یاد کر رہا ہوگا۔

اب سنے کہ اسی باغ کے پاس ایک شاہ صاحب کا ٹکیہ تھا جس میں کئی شہزادوں اور
 رئیسوں کی قبریں تھیں۔ ہمایوں فر کا جنازہ بھی اسی ٹکیے میں گیا، ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ باغ
 کے ایک برج سے بہنوں نے اس جنازے کو دیکھا تو سپہر آرا بولی— باجی جان، کس سے
 پوچھیں کہ یہ کس بے چارے کا جنازہ ہے۔ خدا اس کو بخشے۔

حسن آرا: افوہ! سارا شہر ساتھ ہے۔ اللہ، یہ کون مر گیا، کس سے پوچھیں؟
 عتابی: حضور، جانے بھی دیں، رات کے وقت لاش نہ دیکھیں۔
 حسن آرا: نہیں، گلاب مالی سے کہو، ابھی ابھی پوچھے۔

عتابی قمر قمر کا پنے لگی۔ گلاب مالی کے کان میں کچھ کہا۔ وہ باغ کا پھاٹک کھول کر باہر
 گیا، لوگوں سے پوچھا۔ پھر دونوں میں کانا پھوسی ہوئی۔ اس کے بعد عتابی نے اوپر جا کر
 کہا۔ حضور، کوئی رئیس تھے۔ بہت دنوں سے بیمار تھے۔ یہاں قضا آ پہنچی۔

کیتی آره: کچھ ٹھکانہ ہے! آدمیوں کا کہاں سے کہاں تک تانتا لگا ہوا ہے۔

سپر آرا: خدا جانے، جوان تھا یا بوڑھا؟

عباسی نے بڑی بیگم سے جا کر جنازے کا حال کہا تو انھوں نے سر پیٹ کر کہا۔
تھیں ہماری قسم ہے جو اگلے پاؤں نہ چلی جاؤ۔

حسن آرا: اماں جان، آپ ناحق گھبراتی ہیں، آخر یہاں کھڑے رہنے میں کیا ڈر ہے؟
بڑی بیگم: اچھا، تم کو اس سے کیا مطلب۔

سپر آرا: کسی کا جنازہ جاتا ہے۔ لاکھوں آدمی ساتھ ہیں۔

حسن آرا: خدا جانے، کون تھا بے چارہ۔

بڑی بیگم: اللہ کے واسطے چلی جاؤ!

جہاں آرا: اتنی قسمیں دیتی جاتی ہیں اور کوئی سنتا ہی نہیں۔

سپر آرا: بابی، سنیے، کیسی دردناک غزل ہے! خدا جانے کون گا رہا ہے۔

فہم فراق ہے اور آندھیاں ہیں آہوں کی

چراغ کو میرے ظلمت کدے میں بار نہیں

زمین پیار سے مجھ کو گلے لگاتی ہے

عذاب ہے یہ دلا گور میں فشار نہیں

پس از فنا بھی کسی طور سے قرار نہیں

ملا بہشت تو کہتا ہوں کوئے یار نہیں

عباسی: کوئی بوڑھا آدمی تھا۔

سپر آرا: تو پھر کیا غم!

بڑی بیگم: تو پھر جتنے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہوں، سب کو مر جانا چاہیے؟

سپر آرا: ایسی باتیں نہ کیجیے، اماں جان!

حسن آرا: بوڑھے اور جوان سب کو مرنا ہے ایک دن۔

بڑی بیگم اور سپر آرا نیچے چلی گئیں۔ حسن آرا بھی جا رہی تھیں کہ قبرستان سے آواز

آئی۔ ہائے ہمایوں فر، تم سے اس دعا کی امید نہ تھی۔

حسن آرا: ایں عباسی، یہ کس کا نام لیا؟

عباسی: حضور، بہادر مرزا کہا، کوئی بہادر مرزا ہوں گے۔
 حسن آرا: ہاں، ہی کو دھوکا ہوا۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔
 جب تینوں بہنیں نیچے پہنچ گئیں، تو بڑی بیگم نے کہا۔ آخر تمہارے مزاج میں اتنی ضد
 کیوں ہیں؟

حسن آرا: لٹاں جان، وہاں بڑی ٹھنڈی ہوا تھی۔
 بڑی بیگم: مردہ وہاں آیا ہوا ہے اور اس وقت، بھلا سوچو تو۔
 پہرہ آرا: پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟
 بڑی بیگم: چلو بیٹھو، ہوتا کیا ہے!
 تینوں بہنیں لیٹیں تو پہرہ آرا کو تو نیند آگئی، مگر حسن آرا اور کیتی آرہ کی آنکھ نہ لگی۔ باتیں
 کرنے لگیں!

حسن آرا: کیا جانے، کون بے چارہ تھا؟
 کیتی آرہ: کوئی اس کے گھر والوں کے دل سے پوچھے۔
 حسن آرا: کوئی بڑا شہزادہ تھا۔!
 کیتی آرہ: ہمیں تو اس وقت چاروں طرف موت کی شکل نظر آتی ہے۔
 حسن آرا: کیا جانے، اکیلے تھے یا لڑکے بالے بھی تھے۔
 کیتی آرہ: خدا جانے، مگر تھا ابھی جوان۔
 حسن آرا: دیکھو بہن، سینکڑوں آدمی جمع ہیں، مگر کیسا سناٹا ہے! جو ہے، ٹھنڈی سانسیں
 بھرتا ہے!

اتنے میں پہرہ آرا بھی جاگ پڑیں۔ بولیں — کچھ معلوم ہوا باجی جان، اس بے چارے
 کی شادی ہوئی تھی کہ نہیں؟ جو شادی ہوئی ہوگی تو ستم ہے۔
 حسن آرا: خدا نہ کرے کہ کسی پر ایسی مصیبت آئے۔
 پہرہ آرا: بے چاری بیوہ اپنے دل میں جانے کیا سوچتی ہوگی؟
 حسن آرا: اس کے سوا اور کیا سوچتی ہوگی کہ مرئے!
 رات کو پہرہ آرا نے خواب میں دیکھا کہ ہمایوں فریٹھے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔
 ہمایوں: خدا کا ہزار شکر ہے کہ آج یہ دن دکھایا، یاد ہے، ہم تم سے گلے ملے تھے؟

سہرآرا: بہرہ پہ کے بھی کان کانے!
 ہمایوں: یاد ہے، جب ہم نے مہتابی پر کنگوا ڈھایا تھا؟
 سہرآرا: ایک ہی ذات شریف ہیں آپ۔
 ہمایوں: اچھا، تم یہ بتاؤ کہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب کون ہے؟
 سہرآرا: ہم!

ہمایوں: اور جو میں مر جاؤں تو تم کیا کرو؟
 اتنا کہتے کہتے ہمایوں فر کے چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھیں الٹ گئیں۔ سہرآرا
 ایک چیخ مار کر رونے لگیں۔ بڑی بیگم اور حسن آرا چیخ سنتے ہی گھبرائی ہوئی سہرآرا کے پاس
 آئیں۔ بڑی بیگم نے پوچھا۔ کیا ہے بیٹی، تم چلائی کیوں؟
 عنباسی: اے حضور، ذری آنکھ کھولے۔
 بڑی بیگم: بیٹا، آنکھ کھول دو۔

بڑی مشکل سے سہرآرا کی آنکھیں کھلیں۔ مگر ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائی تھیں کہ کسی نے
 باغیچے کی دیوار کے پاس رو کر کہا۔ ہائے شہزادہ ہمایوں فر!
 سہرآرا نے رو کر کہا۔ امی جان، یہ کیا ہو گیا! میرا تو کلیجہ الٹا جاتا ہے۔
 دیوار کے پاس سے پھر آواز آئی۔ ہائے ہمایوں فر! کیا موت کو تم پر ذرا بھی رحم نہ
 آیا؟

سہرآرا: ارے، کیا یہ میرے ہمایوں فر ہیں!! یا خدا، یہ کیا ہوا امی جان!
 بڑی بیگم: بیٹی صبر کرو، خدا کے واسطے صبر کرو۔
 سہرآرا: ہائے، کوئی ہمیں پیارے شہزادے کی لاش دکھا دو۔
 بڑی بیگم: بیٹا، میں تمہیں سمجھاؤں کہ اس سن میں تم پر یہ مصیبت پڑی اور تم مجھے سمجھاؤ
 کہ اس بوڑھا پے میں یہ دن دیکھنا پڑا۔

سہرآرا: ہائے، ہمیں شہزادے کی لاش دیکھا دو۔ امی جان، اب صبر کی طاقت نہیں
 رہی، مجھے جانے دو، خدا کے لیے مت روکو، اب شرم کیسا اور حجاب کس کے لیے؟
 بڑی بیگم: بیٹی، ذرا دل کو مضبوط رکھو، خدا کی مرضی میں انسان کو کیا دخل؟
 سہرآرا: کیا کہتی ہیں آپ امی جان، دل کہاں ہے، دل کا تو کہیں پتہ ہی نہیں۔ یہاں

تو روح تک پکھل گئی۔

بڑی بیگم: بیٹی، خوب کل کر رو لو۔ میں نصیبوں جلی یہی دن دیکھنے کے لیے بیٹھی تھی!
سپہر آرا: آنسو نہیں ہے امی جان، روؤں کیسے؟ بدن میں جان ہی نہیں رہی، باجی جان
کو بلا دو۔ اس وقت وہ بھی مجھے چھوڑ کر چل دیں؟
حسن آرا الگ جا کر رو رہی تھیں۔ آئیں، مگر خاموش۔ نہ روئی، نہ سر پٹا، آکر بہن کے
پٹک کے پاس بیٹھ گئیں۔

سپہر آرا: باجی، چپ کیوں ہو! ہمیں تسکین تک نہیں دیتیں، واہ!
حسن آرا خاموش بیٹھی رہیں، ہاں، سر اٹھا کر سپہر آرا پر نظر ڈالی۔
سپہر آرا: باجی، بولے، آخر چپ کب تک رہے گا؟
اتنے میں روح افزا بھی آگئیں، انھوں نے مارے غم کے دیوار پر سر پٹک دیا تھا۔
سپہر آرا نے پوچھا۔ بہن، یہ پٹی کیسی بندھی ہے؟
روح افزا: کچھ نہیں، یوں ہی۔

سپہر آرا: کہیں سر در تو نہیں پھوڑا؟ اتنا جان، اب دل نہیں مانتا، خدا کے لیے ہمیں
لاش دکھا دو۔ کیوں اتنا جان، شہزادے کی ماں کی کیا حالت ہوگی؟
بڑی بیگم: کیا بتاؤں بیٹا۔

اولاد کسی کی نہ جدا ہوئے کسی سے
بیٹی، کوئی اس داغ کو پوچھے میرے جی سے
اتنے میں ایک آدمی نے آکر کہا کہ ہمایوں فر کی ماں رو رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ دلہن کو
لاش کے قریب لاؤ۔ ہمایوں فر کی روح خوش ہوگی۔ بڑی بیگم نے کہا۔ سوچ لو، ایسا کبھی ہوا
نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ میری بیٹی ڈر جائے، اس کا تو اور دل بہلانا چاہیے، نہ کہ لاش دکھانا۔
اور لوگوں سے پوچھو، ان کی کیا رائے ہے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔
آخر یہ رائے طے پائی کہ دلہن لاش پر ضرور جائیں۔
سپہر آرا چلنے کو تیار ہو گئیں۔

بڑی بیگم: بیٹا، اب میں کیا کہوں، تمہاری جو مرضی ہو وہ کرو۔
سپہر آرا: بس، ہمیں لاش دیکھا دو، پھر ہم کوئی تکلیف نہ دیں گے۔

بڑی بیگم: اچھا جاؤ، مگر اتنا یاد رکھنا کہ جو مرا وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

سپہر آرا نے عتابی کو حکم دیا کہ جا کر صندوق لاؤ۔ صندوق آیا تو سپہر آرا نے اپنا قیمتی جوڑا نکالا، سہاگ کا عطر ملا، قیمتی دوپٹہ اوڑھا جس میں موتیوں کی تیل لگی ہوئی تھی۔ سر پر جڑاؤ چھپکا، جڑاؤ نیکا، چوٹی میں سیس پھول، ناک میں نتھ، جس کے موتیوں کی قیمت اچھے اچھے جوہری نہ لگا سکے، کانوں میں پتے، بالیاں، کرن پھول، گلے میں موتیوں کی مالا، طوق، چندن ہار، چمپا کلی، ہاتھوں میں ننگن، چوڑیاں، پور پور جھلے، پاؤں میں پازیب، چھاگل۔ اس طرح سولہویں سنگار کر کے وہ بڑی بیگم اور عتابی کے ساتھ پاکلی میں گاڑی میں سوار ہوئیں۔ شہر میں دھوم مچ گئی کہ دلہن دولہا کے لاش پر جاتی ہیں۔ شہزادے کی ماں کو اطلاع دی گئی کہ دلہن آتی ہیں۔ ذرا دیر میں گاڑی پہنچ گئی۔ ہزاروں آدمیوں نے چھاتی پھینا شروع کیا۔ سپہر آرا نے گاڑی سے اترتے ہی لاش کو چھاتی لگایا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اونچی آواز سے کہا۔

پیارے شہزادے، ذری آنکھ کھول کر مسکرا دو۔ بس، دو دن ہنسا کر عمر بھر رلاؤ گے؟ ذری اپنی دلہن کو تو آنکھ بھر کے دیکھ لو۔ کیوں جی، یہی محبت تھی، اسی دن کے لیے دل ملایا تھا؟

شہزادہ کی ماں نے سپہر آرا کو چھاتی سے لگا کر کہا۔ بیٹی، ہمایوں فرتمہارے بڑے دشمن نکلے۔ ہائے، یہ اندھیر بھی کہیں ہوتا ہے کہ دلہن لاش پر آئے۔ نکاح کے وقت وکیل اور گواہ تو دور رہے، دوسرا مقدمہ چھڑ گیا۔

سپہر آرا نے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ امان جان، آپ نے ہمارے ساتھ بڑی دشمنی کی۔ پہلے ہی شادی کر دیتیں تو یوں نامراد تو نہ جاتی۔

ادھر تو یہ کہرام مچا ہوا تھا، ادھر شہر کے بے فکر اپنی کچھڑی الگ ہی پکاتے تھے۔ ایک عورت: آج جب گھر سے نکلی تھی تو کانے آدی کا منہ دیکھا تھا۔ ادھر ذولی میں پاؤں گیا اور ادھر ہٹ سے چھینک پڑی۔

دوسرا آدی: ابی بی بی، نہ کچھ چھینک سے ہوتا ہے، نہ کسی سے، 'کرم' لیکھ نہیں مئے کڑے کوئی لاکھن چڑائی! قسمت کے لیکھے کو کوئی بھی آج تک مٹا سکا ہے؟ دیکھیے، کرڑوں روپے گھر میں بھرے ہیں، مگر کس کام کے!

مولوی: میاں، دنیا کے یہی کارخانے ہیں، انسان کو چاہیے کہ کسی سے نہ جھگڑے، نہ کسی سے فساد کرے، بس، خدا کی یاد کرتا رہے۔

ایک بڑھیا: سنتے ہیں کہ دو تین دن سے رات کو برے برے خواب دیکھتے تھے۔

مولوی: ہم اس کے قائل نہیں، خواب کیا چیز ہے!

سپہر آرا کو اس وقت وہ دن آیا، جب شہزادہ ہمایوں فراہی بہن بن کر ان سے گلے ملنے گئے۔ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے۔ ہم نے اس ہمایوں فر کو برا بھلا کیوں کہا تھا! بڑی بیگم نے کہا۔ بیٹی، اب ذری بیٹھ جاؤ، دم لے لو۔

عباسی: حضور، اس مرض کا تو علاج ہی نہیں ہے۔

سپہر آرا: دوا ہر مرض کی ہے۔ اس مرض کی دوا بھی مبر ہی ہے۔ مبر ہی نے ہمیں اس قائل کیا کہ ہمایوں فر کی لاش اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں! جب لوگوں نے دیکھا کہ سپہر آرا کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے تو انھیں لاش کے پاس سے ہٹا لے گئے۔ گاڑی پر سوار کیا اور گھر لے گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر سپہر آرا رونے لگیں اور بڑی بیگم سے بولیں — اتنا جان، اب ہمیں کہاں لیے چلتی ہو؟

بڑی بیگم: بیٹی، میں کیا کروں، ہائے!

سپہر آرا: اماں جان، کروگی کیا، میں نے کیا کر لیا؟

عباسی: ہماری قسمت پھوٹ گئی، شادی کا دن دیکھنا نصیب میں لکھا ہی نہ تھا۔ آج کے دن اور ہم ماتم کریں!

سپہر آرا: اتنا جان، اس وقت بے چارہ کہاں ہوگا؟

بڑی بیگم: بیٹی، خدا کے کارخانے میں کس کو دخل ہے،

(85)

ایک پرانی، مگر اجازتہی میں کچھ دنوں سے دو عورتوں نے رہنا شروع کیا ہے۔ ایک نام فروزہ ہے، دوسری کا فرخندہ۔ اس گاؤں میں کوئی ڈیڑھ ہزار گھر آباد ہوں گے، مگر ان سب میں دو ٹھاکروں کے مکان عالی شان تھے۔ فروزہ کا مکان چھوٹا تھا، مگر بہت خوشنما۔ وہ جوان عورت تھی، کپڑے لٹے بھی صاف ستھرے پہنتی تھی، لیکن اس کی بات چیت سے اداسی پائی جاتی تھی۔ فرخندہ اتنی حسین تو نہ تھی، مگر خوش مزاجی تھی۔ گاؤں والوں کو حیرت تھی کہ یہ دونوں

عورتیں اس گاؤں میں کیسے آئیں اور کوئی مرد بھی ساتھ نہیں! ان کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ گاؤں کی صرف دو عورتیں ان کے پاس جاتیں تھیں، ایک تنبلن، دوسری بیلدارن۔ یار لوگ، نوہ میں تھے کہ یہاں کا کچھ بھید کھلے، مگر کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ تنبلن اور بیلدارن سے پوچھتے تھے تو وہ بھی آئیں بائیں سائیں اڑا دیتی تھیں۔

ایک دن اس گاؤں میں ایک کانشیل آ نکلا۔ آتے ہی ایک پیسے سے شکر مانگی۔ اس نے کہا۔ شکر نہیں، گڑ ہے۔ کانشیل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گالی دے بیٹھا۔ پیسے نے کہا۔ زبان پر لگام دو۔ گالی نہ زبان سے نکالو۔ اتنا سنا تھا کہ کانشیل نے بڑھ کر دو گھوسے لگائے اور دکان کی چیزیں پھینک پھاٹک دیں۔ سامنے والا دکاندار مارے ڈر کے شکر لے آیا، تب حضرت نے کہا۔ کالی مرچ لاؤ۔ وہ بے چارہ کالی مرچ بھی لایا۔ تب آپ نے دو لوٹے شربت کے پیسے اور کنویں کی جگت پر لیٹ کر ایک لالہ جی کو پکارا۔ او لالہ، صرانی پیچھے کرتا، پہلے ایک چادر تو دے جاؤ۔ لالہ بولے۔ ہمارے پاس اور کوئی بچھونا نہیں ہے، بس ایک بسترا ہے۔ کانشیل اٹھ کر دکان پر گیا۔ چادر اٹھالی اور کنویں کی جگت پر بچھا کر لیٹا۔ لالہ بے چارے منہ تانکنے لگے۔ ابھی حضرت سو رہے تھے کہ ایک عورت پانی بھرنے آئی۔ آپ نے پاؤں کی آہٹ جو پائی تو چونک اٹھے اور غل چا کر بولے۔ الگ ہٹ، چلی وہاں سے گھڑا سر پر لیے پانی بھرنے! سوچتا نہیں کون لیٹا ہے کون بیٹھا ہے اس پر ایک آدمی نے کہا، واہ! تم تو کنویں کے مالک بن بیٹھے؟ اب تمہارے مارے کوئی پانی نہ بھرے؟ دوسرا بولا۔ صرف کی دکان سے چادر لائے، مفت میں شکر لی اور ڈپٹ رہے ہیں۔

ایک ٹھاکر صاحب تنو پر سوار چلے جاتے تھے۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر بولے۔ صاحب کو ایک عرضی دے دو، بس ساری شینی کرکری ہو جائے۔

کانشیل نے لکارا۔ روک لے تو۔ ہم چالان کریں گے۔

ٹھاکر: کیوں روک لیں، ہم اپنی راہ جا رہے ہیں، تم سے مطلب؟

کانشیل: کہہ دیا، روک لو، یہ تو زخمی ہے۔ چلو، تمہارا چالان ہوگا۔

ٹھاکر: تو زخمی کہاں ہے؟ ہم ایسے ویسے ٹھاکر نہیں ہیں، ہم سے بہت رعب نہ بھانا۔

اتنے میں دو ایک آدمیوں نے آکر دونوں کو سمجھایا، بھائی، جونا جھوڑ دو، عزت دار آدمی

ہیں۔ اس گاؤں کے ٹھاکر ہیں، ان کو بے عزت نہ کرو۔

ادھر ٹھاکر کو سمجھایا کہ روپیہ اصل لی دے کر الگ کرو، کہاں کی جمنیٹ لگائی ہے۔
مفت میں چالا کر دے گا تو گاؤں بھر میں ہنسی ہوگی۔ کچھ یہ سمجھے، کچھ وہ سمجھے۔ اٹھنی نکال کر
کانشیل کی نظر کی، تب جا کر پیچھا چھوٹا۔

اب تو گاؤں میں اور بھی دھاک بندھ گئی۔ پن بھرنیاں مارے ڈر کے پانی بھرنے نہ
آئیں، یہ ادھر ادھر لٹکانے لگے۔ غلے کی چند گاڑیاں سامنے سے گزریں۔ آپ نے لٹکارا،
روک لے گاڑی۔ کیوں بے، پڑی سے نہیں جاتا، سڑک تو صاحب لوگوں کے لیے ہے۔ ایک
گاڑی دان نے کہا۔ اچھا صاحب، پڑی پر کیے دیتے ہیں۔ آپ نے اٹھ کر ایک طمانچہ لگا
دیا اور بولے، اور سنو، ایک تو جرم کریں، دوسرے ترائیں۔ سب کے سب دنگ ہو گئے کہ تڑایا
کون، اس بے چارے نے تو ان کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ حلوائی سے کہا۔ ہم کو سیر بھر پوری
تول دو۔ وہ بھی کانپ رہا تھا کہ دیکھیں، کب شامت آتی ہے، کہا، ابھی لایا۔ تب آپ بولے
کہ آلو کی ترکاری ہے؟ وہ بولا۔ آلو تو ہمارے پاس نہیں ہے، مگر اس کھیت سے کھدوا لاؤ تو
سب معاملہ ٹھیک ہو جائے۔ کہنے بھر کی دیر تھی۔ آپ جا کر کسان سے بولے۔ ارے، ایک
آدھ سیر آلو کھود دے۔ اس کی شامت جو آئی تو بولا۔ صاحب، چار آنے سیر ہوئی، چاہے لیو
چاہے نہ لیو۔ سمجھ لو۔ آپ نے کہا، اچھا بھائی، لاؤ، مگر بڑے بڑے ہوں۔

کسان آلو لایا۔ ترکاری بنی، جب آپ چلنے لگے تو کسان نے پیسے مانگے۔ اس کے
جواب میں آپ نے اس غریب کو پینٹا شروع کیا۔

کسان : سیر بھر آلو لی جس، اور اوپر سے مارتا ہے۔

مُرائن : اور الٹی گئے پلوا بکت ہے، رام کرے، دیوی بھوانی کھا جائیں۔

لوگوں نے کسان کو سمجھایا کہ سرکاری آدمی کے منہ کیوں لگتے ہو۔ جو کچھ ہوا سو ہوا،
اب انھیں دو سیر آلو لا دو۔ کسان آلو کھود لایا۔ آپ نے اسے رومال میں باندھا اور 8 پیسے
نکال کر حلوائی کو دینے لگے۔

حلوائی : یہ بھی رہنے دو، پان کھا لینا۔

کانشیل : خوشی تمھاری۔ آلو تو ہمارے ہی تھے۔

حلوائی : بس، اب سب آپ ہی کا ہے۔

کانشیل نے کھانپ کر لمبی تانی تو دو گھنٹے تک سویا کیے۔ جب اٹھے تو پیسے میں تر تھے۔

ایک گنوار کو بلا کر کہا۔ پنکھا مجھل۔ وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔ جب آپ غافل ہوئے تو اس نے ان کی لٹیا اور لکڑی اٹھائی اور چلتا دھندا کیا۔ یہ ان کے بھی استاد نکلے۔

جمعدار کی آنکھ کھلی تو پنکھا جھل، والے کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو لٹیا غائب۔ لٹھی ندارد۔ لوگوں سے پوچھ، دھمکایا ڈرایا مگر کسی نے نہ سنا۔ اور بتائے کون؟ سب کے سب تو جملے بیٹھے تھے۔ تب آپ نے چوکیداروں کو بلایا اور دھمکانے لگے۔ پھر سبوں کو لے کر گاؤں کے ٹھاکر کے پاس گئے اور کہا۔ اسی دم دوڑ آئے گی۔ گاؤں بھر پھونک دیا جائے گا، نہیں تو اپنے آدمیوں سے پتہ لگواؤ۔

ٹھاکر: لے اب ہم کس کس اپاؤ کریں۔ چور کا کہاں ڈھونڈھی؟
 جمعدار: ہم نہیں جانتا۔ ٹھاکر ہو کر کے ایک چور کا پتہ نہیں لگا سکتا۔
 ٹھاکر: تم ہو تو پولس کے نوکر ہو۔ ڈھونڈ نکالو۔

ٹھاکر صاحب سے لوگوں نے کہا۔ یہ سپاہی بڑا شیطان ہے۔ صاحب کو لکھ بھیجئے کہ ہماری رعایا کو ستاتا ہے۔ بس، یہ متوقف ہو جائے۔ ٹھاکر بولے۔ ہم سرکاری آدمیوں سے بت بڑھاؤ نہیں کرتے۔ کانسٹیبل کو تین روپے دے کر دروازے سے مالا۔

جمعدار صاحب یہاں سے خوش خوش چلے تو ایک گھوڑی کی لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ اس نے جا کر اپنے باپ سے کہہ دیا۔ وہ پہلوان تھا، لنگوٹ باندھ کر آیا اور جمعدار صاحب کو پتک کر خوب پیٹا۔

بہت سے آدمی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جمعدار نے چوں تک نہ کی، چپکے سے جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور گاؤں کی دوسری طرف چلے۔ اتفاق سے فروزہ اپنی چھت پر کھڑی بال سلجھا رہی تھی۔ جمعدار کی نظر پڑی تو حیرت ہوئی۔ بولے۔ ارے، یہ کس کا مکان ہے؟ کوئی ہے اس میں؟

پڑوسی: اس مکان میں ایک بیگم رہتی ہے۔ اس وقت کوئی مرد نہیں ہے۔
 جمعدار: تو کون ہے؟ بتا اس میں کون رہتا ہے؟ اور مکان کس کا ہے؟
 پڑوسی: مکان تو ایک اہیر کا ہے، مگر اس میں ایک بیگم نکلی ہیں۔
 جمعدار: کہو، دروازے پر آویں۔ بلا لاؤ۔

پڑوسی: واہ، وہ پردے والی ہیں۔ دروازے پر نہ آئیں گی۔

جعدار: کیا! پردہ کیا؟ بلاتا ہے کہ گھس جاؤں گھر میں؟ پردہ لیے بھرتا ہے!
 فروزہ کے ہوش اڑ گئے۔ فرخندہ سے بولی۔ اب غضب ہو گیا۔ بھاگ کے یہاں آئی
 تھی، مگر یہاں بھی وہی بلا سر پر آئی۔

فرخندہ اس کو کہاں سے خبر ہوئی؟

فروزہ: کیا بتاؤں! اس وقت کون اس سے سوال جواب کرے گا؟

فرخندہ: دیکھیے، پڑوسن کو بلاتی ہوں۔ شاید وہ کام آئیں۔

دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو کاشٹیل نے دروازے پر لات ماری اور کہا۔ کھول دو
 دروازہ، ہم دوڑ لائے ہیں۔ محلّے والوں نے کہا۔ بھائی، تمہارے پاس نہ سمن، نہ سفینہ۔ پھر
 کس کے حکم سے دروازہ کھلواتے ہو؟ ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔ ان بے چاریوں کا جرم تو بتاؤ۔
 جعدار: جرم چل کے صاحب سے پوچھو۔ جن کے بیچھے ہم آئے ہیں۔ سمن سفینہ دیوانی
 کے مذکوری جاتے ہیں۔ ہم پولس کے آدمی ہیں۔

دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔ سنو بھئی جوان، تم اس وقت بڑا بھاری ظلم کر
 رہے ہو۔ بھلا اس طرح کوئی کاہے کو رہنے پائے گا۔

جعدار نے اکڑ کر کہا۔ تم کون ہو؟ اپنا نام بتاؤ! تم سرکاری آدمی کو اپنا کام کرنے سے
 روکتے ہو۔ ہم رہٹ بولیں گے۔

یہ سن کر وہ حضرت چکرائے اور چپکے سے لمبے ہوئے۔ تب جعدار نے غل مچا کر کہا،
 مجبوروں نے ہمیں خبر دی ہے کہ تمہارے لڑکا ہونے والا ہے۔ ہم کو حکم ہے کہ دروازے پر چہرہ
 دیں۔

پڑوسن نے جو یہ بات سنی تو دانتوں تلے انگلی دبائی۔ اے ہے، یہ غضب خدا کا، ہمیں
 آج تک معلوم ہی نہ ہوا، ہم بھی سوچتے تھے کہ یہ جوان جہان عورت شہر سے بھاگ کر گاؤں
 میں کیوں آئی! یہ معلوم ہی نہ تھا کہ یہاں کچھ اور غل کھلنے والا ہے۔

اتنے میں فرخندہ نے گوشے پر جا کر پڑوسن سے کہا۔ ذری اپنے میاں سے کہو کہ اس
 سپاہی سے گل حال پوچھیں۔ ماجرا کیا ہے؟

پڑوسن کچھ سوچ کر بولی۔ بھئی، ہم اس معاملے میں دخل نہ دیں گے۔ اوہو، تمہاری
 بیگم نے تو اچھا جال پھیلایا تھا، ہمارے میاں کو معلوم ہو جائے کہ یہ ایسی ہیں تو محلتے سے

کھڑے کھڑے لکھوا دیں۔

اتنے میں پڑوں کے میاں بھی آئے۔ فرخندہ ان سے بولیں، خاں صاحب، ذری اس سپاہی کو سمجھائیے، یہ ہمارے بڑی مصیبت کا وقت ہے۔

خاں صاحب: کچھ نہ کچھ تو اسے دینا ہی پڑے گا۔

فرخندہ: اچھا، آپ فیصلہ کرا دیں۔ جو مانگے وہ ہم سے اسی دم لے۔

خاں صاحب: ان پاجیوں نے ناک میں دم کر دیا ہے اور اس طرف کی رعایا ایسی بودی ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ سرکار ان پیادوں کو انتظام کے لیے رکھا ہے اور یہ لوگ زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔ سرکار کو معلوم ہو جائے تو کھڑے کھڑے نکال دیے جائیں۔

پڑوں: پہلے بیگم سے یہ تو پوچھو کہ شہر سے یہاں آکر کیوں رہی ہیں؟ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

فرخندہ نے دو روپے دیے اور کہا، جا کر یہ دے دیجیے۔ شاید مان جائے۔ خاں صاحب نے روپے دیے تو سپاہی بگڑ کر بولا۔ یہ روپیہ کیسا؟ ہم رشوت نہیں لیتے!

خاں صاحب: سنو میاں، جو ہم سے ٹراؤ گے، تو ہم ٹھیک کر دیں گے۔ نکلے کا پیادہ، مزاج ہی نہیں ملتا۔

سپاہی: میاں، کیوں شامتیں آئی ہیں، ہم پولس کے لوگ ہیں، جس وقت چاہیں، تم جیسوں کو ذلیل کر دیں۔ بتلاؤ تمہاری گزر بسر کیسی ہوتی ہے۔ بچہ، کسی بھلے گھر کی عورت بھگا لائے ہو اور اوپر سے ٹراتے ہو!

خاں صاحب: یہ دھمکیاں دوسروں کو دینا۔ یہاں تم جیسے کواٹلیوں پر نچاتے ہیں۔ سپاہی نے دیکھا کہ یہ آدمی کڑا ہے تو آگے بڑھا۔ ایک نان بائی کی دکان پر بیٹھ کر مزے سے پلاؤ اڑایا اور سڑک پر جا کر ایک گاڑی پکڑی۔ گاڑی دان کی لڑکی بیمار تھی۔ بے چارہ گڑگڑانے لگا، مگر سپاہی نے ایک نہ مانی۔ اس پر ایک بابو جی بول اٹھے۔ بڑے بے رحم آدمی ہو جی چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

سپاہی: کپتان صاحب نے منگولیا ہے، چھوڑ کیسے دوں؟ یہ اسی طرح کے بہانے کیا کرتے ہیں، زمانے بھر کے جھوٹے!

آخر گاڑی دان نے سات پیسے اور ایک کدو دے کر گلا چھڑوایا۔ تب آپ نے ایک

چوتے پر بستر جمایا اور چوکیدار سے ہٹ بھر دیا کر پینے لگے۔ جب ذرا اندھیر ہوا، تو چوکیدار نے آکر کہا۔ حوالدار صاحب، بڑا اچھا شکار چلا جات ہے۔ ایک مہاجن کی مہریا تیل گاڑی پر بیٹھی چلی جات ہے۔ گھبن سے لدی ہے۔

سپاہی: یہاں سے کتنی دور ہے،
چوکیدار: کچھ دور ناہن، گھڑی بھر میں پہنچ جیہو۔ بس ایک گاڑی وان ہے اور ایک چھوکر۔ تیسرا کوڑ نہیں۔

سپاہی: تب تو مار لیا ہے۔ آج کسی بھلے آدمی کا منہ دیکھا ہے۔ ہمارے ساتھ کون کون چلے گا۔

چوکیدار: آدمی سب ٹھیک ہیں، کہے بھر کی دیر ہے۔ حکم ہوئے تو ہم جا کے سب ٹھیک کری۔

سپاہی: ہاں ہاں اور کیا؟

اب سینے کہ مہاجن کی گاڑی بارہ بجے رات کو ایک باغ کی طرف سے گزری جاری تھی ایک ایک چھ سات آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔ گاڑی وان کو ایک ڈنڈا مارا۔ کہار کو بھی مار کے گرا دیا۔ عورت کے زیور اتار لیے اور چور چور کا شور مچانے لگے۔ گاؤں میں شور مچ گیا کہ ڈاکہ پڑ گیا۔ کانسٹیبل نے جا کر تھانے میں اطلاع کی۔ تھانے دار نے چوکیدار سے پوچھا، تمہارا کس پر شک ہے! چوکیدار نے کئی آدمیوں کا نام لکھایا اور فروزہ کے پڑوسی خاں صاحب بھی انھی میں تھے۔ دوسرے دن اسی سپاہی نے خاں صاحب کے دروازے پر پہنچ کر پکارا۔ خاں صاحب نے باہر آکر سپاہی کو دیکھا تو مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے، کیا ہے صاحب، کبرا حکم ہے؟

سپاہی: چلیے، وہاں برآمد کے تلے تحقیقات ہو رہی ہے۔ داروغہ جی بلاتے ہیں۔

خاں: کیسی تحقیقات؟ کچھ سنیں تو۔

سپاہی: معلوم ہو جائے گی! چلیے تو سہی۔

خاں: سنو جی، ہم پٹھان ہیں۔ جب تک چپ ہیں تب تک چپ ہیں۔ جس دم غصہ

آیا، پھر یا تم نہ ہو گے یا ہم نہ ہوں گے۔ کہاں چلیں، کہاں؟

سپاہی: مجھے آپ سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں، مگر داروغہ جی کے حکم سے مجبور ہوں۔

چوکیدار: لودھے کو بلایا ہے، گھوسی کو اور تم کو۔

خاں: ایں، وہ تو سب ڈاکو ہیں۔

سپاہی: اور آپ بڑے ساہو ہیں! بڑی شیخی۔

خاں: کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو؟

سپاہی: اب چلیے گا یا وارنٹ آئے۔

خاں صاحب گھر میں کپڑے پہنے گئے تو بی بی نے کہا، کیسے پٹھان ہو؟ موئے پیادے کی کیا حقیقت ہے کہ دروازے پر کھوٹی کھری کہے۔ بھلا دیکھوں تو ٹگوزا تمہیں کیوں کر لے جاتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ دروازے پر آکر بولیں، کیوں رے، تو انہیں کہاں لیے جاتا ہے؟ بتا، کس بات کی تحقیقات ہوگی؟ کیا تیرا باپ قتل کیا گیا ہے،

سپاہی: آپ خاں صاحب کو بھیج دیں۔ اجی خاں صاحب، آئیے گا یا وارنٹ آئے؟

بیوی: وارنٹ لے جا اپنے ہوتوں سوتوں کے یہاں۔

سپاہی: یہ عورت تو بڑی کلتہ دراز ہے۔

بیوی: میرے منہ لگے گا تو منہ پکڑ کے مجلس دوں گی۔ وارنٹ اپنے باپ دادا کے نام

لے جا!

اتنے میں خاں صاحب ڈھانٹا باندھ کر باہر نکلے اور بولے۔ لے تجھے دائیں ہاتھ کھانا حرام ہے جو نہ لے چلے۔

سپاہی: بس، بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کیجیے، چپکے سے میرے ساتھ چلیے۔

خاں صاحب اکڑتے ہوئے چلے تو سپاہی نے فروزہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا،

انہیں تو لیے جاتے ہیں، اب تمہاری باری بھی آئے گی۔

خاں صاحب برگد کے نیچے پہنچے تو دیکھا، گاؤں بھر کے بدمعاش جمع ہیں اور داروغہ جی

چارپائی پر بیٹھے ہٹے پی رہے ہیں۔ بولے، کیوں جناب، ہمیں کیوں بلایا؟

داروغہ: آج گاؤں بھر کے بدمعاشوں کی دعوت ہے۔

خاں صاحب نے ڈنڈے کو تول کر کہا، تو پھر دو ایک بدمعاشوں کی ہم بھی خبر لیں

گئے۔

داروغہ: بہت گراما پئے نہیں، چوکیداروں نے ہم سے جو کہا وہ ہم نے کیا۔

خاں: اور جو چوکیدار آپ کو کنوئیں میں کود پڑنے کی صلاح دے؟
داروغہ تو ہم کو دہرائیں۔

خاں: تو ہماری نسبت آخر کیا جرم لگایا گیا ہے؟

داروغہ: کل رات کو تم کہاں تھے؟

خاں: اپنے گھر پر اور کہاں۔

چوکیدار: حضور، بکھری میں تھی اور ایک مٹی ان کا وہی باغ کے بھیڑ دیکھیں

رہا۔

خاں صاحب نے چوکیدار کو ایک چائٹا دیا، سور، اے ہم چور ہیں؟ رات کو ہم گھر پر نہ تھے؟ داروغہ نے کہا، کیوں جی، ہمارے سامنے یہ مار پیٹ! تم بھی پٹھان ہو اور ہم بھی پٹھان ہیں۔ اگر اب کی ہاتھ اٹھایا تو تمہاری خیرت نہیں۔

اتنے میں ایک انگیر گھوڑے پر سوار ادھر سے آ نکلا۔ یہ جھگھٹ دیکھ کر داروغہ سے بولا کیا بات ہے؟ داروغہ نے کہا، غریب پرور، ایک مقدمے کی تحقیقات کرنے آئے ہیں۔ اس پٹھان کی نسبت ایک چوری کا شک ہے، مگر یہ تحقیقات نہیں کرنے دیتا۔ چوکیدار کو کئی مرتبہ پیٹ چکا ہے۔ چوکیدار نے کہا، دہائی ہے صاحب کی! دہائی ہے مارے ڈارت ہے۔
صاحب نے کہا۔ ویل، چلان کرو۔ ہماری گواہی لکھو دو، ہمارا نام بھجور کر اس ہے۔

لیجیے، چوری اور ڈاکہ تو دور رہا، ایک نیا، جرم ثابت ہو گیا۔

اب داروغہ جی نے گواہوں کے بیان لکھنے شروع کیے۔ پہلے ایک تنبولن آئی۔ بھڑکیلا لہنگا پہنے ہوئے، مانگ چوٹی سے لیس، منہ میں گلدوری دبی ہوئی، ہاتھ میں پان کے بیڑے، آکر داروغہ جی کو بیڑے دے کر کھڑی ہو گئی۔

داروغہ: تم نے خاں صاحب کو رات کے وقت کہاں دیکھا تھا؟

تنبولن: اس پورے کے پاس۔ ان کے ساتھ تین چار آدمی اور تھے۔ سب لٹھ بند۔ ایک آدمی نے کہا، چھین لو ساس سے، میں بولی کہ بوٹیاں کوچ لوں گی، میں کوئی گنوارن نہیں ہوں۔ خاں صاحب نے مجھ سے کہا، تنبولن، کہو فتح ہے۔

خاں: اری تنبولن۔

تنبولن: ذری، اری تری نہ کرنا مجھ سے، میں کوئی پھارن نہیں ہوں۔

خاں: تم نے ہم کو چور کے ساتھ دیکھا تھا؟
 تمبولن: دیکھا ہی تھا۔ کیا کچھ اندھے ہیں، چور تو تم ہو ہی۔
 خاں: خدا اس جھوٹ کی سزا دے گا۔
 تمبولن: اس کا حال تو جب معلوم ہوگا جب بڑے گھر میں چلی پیو گے۔
 خاں: اور وہاں گیت گانے کے لیے تم کو بلا لیں گے۔
 دوسرے گواہ نے بیان کیا، میں رات کو گیارہ بجے اس پورے کی طرف جاتا تھا تو خاں صاحب مجھے ملے تھے۔
 خاں: قسم خدا کی، کوئی آدمی میری ہی شکل کا رہا ہوگا۔
 داروغہ: آپ نے ٹھیک کہا۔
 کالے خاں: جب پٹھان ہو کے ایسی حرکتیں کرنے لگے تو اس گاؤں کا خدا ہی مالک ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سفید پوش آدمی ڈاکہ ڈالے گا۔
 خاں: خدا کی قسم، جی چاہتا ہے سر پیٹ لوں، مگر خیر، ہم بھی اس کا مزہ چکھا دیں گے۔
 داروغہ: پہلے اپنے گھر کی تلاشی تو کروائیے، مزہ پیچھے چکھوایئے گا۔
 یہ کہہ کر داروغہ جی خاں صاحب کے گھر پہنچے اور کہا، جلدی پردہ کرو، ہم تلاشی لیں گے۔ خاں صاحب کی بیوی نے سینکڑوں گالیاں دیں، مگر مجبور ہو کر پردہ کیا۔ تلاشی ہونے لگی۔ دو بالیاں نکلیں، ایک جگنو اور ایک چھپکا! خاں صاحب کی بیوی ہڈ بٹکا ہو کر رہ گئی، یہ زیور یہاں کہاں سے آئے؟ یا خدا، اب ہماری آمد و تیرے ہی ہاتھ ہے!

(86)

فروزہ بیگم اور فرخندہ رات کے وقت سو رہی تھی کہ دھماکے کی آواز ہوئی۔ فرخندہ کی آنکھ کھل گئی۔ یہ دھماکہ کیسا؟ منہ پر سے چادر اٹھائی، مگر اندھیر دیکھ کر اٹھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اتنے میں پاؤں کی آہٹ ملی۔ روئیں کھڑے ہو گئے۔ سوچی، اگر بولی تو یہ سب حلال کر ڈالیں گے۔ دہکی پڑی رہی۔ چور نے اسے گود میں اٹھایا اور باہر لے جا کر بولا۔ سنو عتاسی، ہم کو تم خوب پہچانتی ہو؟ اگر نہ پہچان سکی ہو، تو اب پہچان لو۔
 پہچانتی کیوں نہیں، مگر یہ بتاؤ کہ یہاں کس غرض سے آئے ہو؟ اگر ہماری آمد و تیرے ہی ہاتھ ہے!

چاہتے ہو تو قسم کھا کر کہتی ہوں، زہر کھا لوں گی۔

چور: ہم تمہاری آبر نہیں چاہتے، صرف تمہارے زور چاہتے ہیں۔ تم اپنی بیگم کو جگاؤ، ذرا ان سے ملو گا۔ ناحق ادھر ادھر ماری ماری پھرتی ہیں، ہمارے ساتھ نکاح کیوں نہیں کر لیتیں؟

یگانہ فروزہ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو مرزا آزاد کھڑے ہیں۔ بولی، آزاد مرزا، اگر ہمیں دق کرنے سے تمہیں کچھ ملتا ہو تو تم کو اختیار ہے۔ ناحق کیوں ہماری جان کے دشمن ہوئے ہو؟ اس مصیبت کے وقت تم سے مدد کی امید تھی اور تم اُلے گلا ریتے کو موجود! عباسی: بیگم آپ کو ہمیشہ یاد کیا کرتی ہیں۔

آزاد: میرے لائق جو کام ہو، اس کے لیے حاضر ہوں، تمہارے لیے جان تک حاضر ہے۔

رثیا: آپ کو جان آپ کو مبارک رہے، ہم صرف ایک کام کو کہتے ہیں۔ یہاں ایک کانسٹیبل نے ہمیں بہت دق کیا ہے، تم کسی تدبیر سے ہمیں اس کے پنجے سے چھڑاؤ، (آزاد کے کان میں کچھ کہہ کر) مجھے اس بات کا بڑا رنج ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ آزاد: وہی کانسٹیبل تو نہیں ہے جو خاں صاحب کو پکڑ لے گیا ہے۔

فیروزہ: ہاں، ہاں، وہی۔

آزاد: اچھا، سمجھا جائے گا۔ کھڑے کھڑے اس سے سمجھ لوں تو سہی۔ اس نے اچھے گھر بیٹا دیا۔

رثیا: کجنت نے میری آبرو لے لی، کہیں مجھ دکھانے لائق نہ رکھا۔ یہاں بھی بلا کی طرح سر پر سوار ہو گیا۔ تم نے بھی اتنے دنوں کے بعد آج خبر لی۔ دوسروں کا درد تم کیا سمجھو گے۔ جو بے عزتی کبھی نہ ہوئی تھی وہ آج ہو گئی۔ ایک دن وہ تھا کہ اچھے اچھے آدمی سلام کرنے آتے تھے اور آج ایک کانسٹیبل میری آبرو مٹانے پر تالا ہوا ہے اور تمہارے ہوتے!

آزاد: رثیا بیگم، خدا کی قسم مجھے بالکل خبر نہ تھی، میں اسی وقت جا کر داروغہ اور کانسٹیبل دونوں کو دیکھتا ہوں۔ دیکھ لینا، صبح تک ان کی لاش پھڑکتی ہوگی، ایسے ایسے کتنوں کو جہنم کے گھاٹ اتار چکا ہوں۔ اس وقت رخصت کرو، کل پھر ملوں گا۔

یہ کہہ کر آزاد مرزا باہر نکلے۔ یہاں ان کے کئی ساتھی کھڑے تھے، ان سے بولے،

بھائی جوانوں! آج کتوال کے گھر ہماری دعوت ہے، سمجھ گئے، تیار ہو جاؤ۔ اسی وقت آزاد مرزا اور لکشمی ڈاکو، گل باز، رامو اور یہ سب کے سب داروغہ کے مکان پر جا پہنچے رامو کو تو بیشک میں رکھا اور محلے بھر کے مکانوں کی کنڈیاں بند کر کے داروغہ جی کے گھر میں سیند لگانے کی فکر کرنے لگے۔

دربان: کون! تم لوگ کون ہو، بولتے کیوں نہیں؟
 آزاد: کیا بتائیں، معصیت کے مارے ہیں، ادھر سے کوئی لاش تو نہیں نکلی؟
 دربان: ہاں، نکلی تو ہے، بہت سے آدمی ساتھ تھے۔
 آزاد: ہمارے بڑے دوست تھے، افسوس!
 لکشمی: حضور، مبر کیجیے، اب کیا ہو سکتا ہے۔
 دربان: ہاں بھائی، پرمیشور کی مایا کون جانتا ہے، آپ کون ٹھا کر ہیں؟
 لکشمی: قوجیا براہمن ہیں، بے چارے کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، کون ان کی پرورش کرے گا۔

دربان کو باتوں میں لگا کر ان لوگوں نے اس کی مشکلیں کس لیں اور کہا، بولے اور ہم نے قتل کیا۔ بس، منہ بند کیے پڑے رہو۔
 دیوار میں سیند پڑنے لگی۔ رامو کہیں سے سرکہ لایا۔ سرکہ چھڑک چھڑک کر دیوار میں سیند دی۔ اتنے میں ایک کانسٹبل نے ہانک لگائی۔ جاگتے رہو، اندھیری رات ہے۔
 آزاد: ہمارے لیے اندھیری رات نہیں، تمہارے لیے ہوگی۔

چوکیدار: تم لوگ کون ہو؟
 آزاد: تیرے باپ۔ پہچانتا ہے یا نہیں؟
 یہ کہہ کر آزاد نے کروٹی سے چوکیدار کا کام تمام کر دیا۔
 لکشمی: بھائی، یہ تم نے برا کیا۔ کتنی بے رحمی سے اس بے چارے کی جان لی!
 آزاد: بس، معلوم ہو گیا کہ تم نام کے چور ہو، بالکل کچے!
 اب یہ تجویز پائی کہ مرزا آزاد سیند کے اندر جائیں۔ آزاد نے پہلے سیند میں پاؤں ڈالے، ڈالتے ہی کسی آدمی نے اندر سے تلوار جھائی، دونوں پاؤں کھٹ سے الگ۔
 آزاد: ہائے! ارے دوڑو۔

لکشی: بڑا دھوکہ ہوا، کہیں کے نہ رہے!

چاروں نے مل کر آزاد مرزا کا دھڑاٹھایا اور روتے پیٹتے لے چلے، مگر راستے ہی میں پکڑ لیے گئے۔

محلے بھر میں جاگ ہو گئی۔ اب جو دروازہ کھولتا ہے، بند پاتا ہے۔ یہ دروازہ کون بند کر گیا؟ دروازہ کھولو! کوئی سختی ہی نہیں۔ چاروں طرف یہی آوازیں آرہی تھیں۔ صرف ایک دروازے میں باہر سے کھڑی نہ تھی۔ ایک بوڑھا سپاہی ایک ہاتھ میں مشال، دوسرے میں سروی لیے باہر نکلا۔ دیکھا تو داروغہ جی کے گھر میں سینہ پڑی ہوئی ہے! چور چور! ایک کاشٹیل: خون بھی ہوا ہے۔ جلد آؤ۔

سپاہی: مار لیا ہے، جانے نہ پاوے۔

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولنے شروع کیے۔ لوگ فوراً لٹھ لے لے کر نکلے، دیکھا تو چوروں کا سہلوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ ان آدمیوں کو دیکھتے ہی چور تو بھاگ نکلے! آزاد مرزا اور چھٹی رہ گئے۔ آزاد کی ٹانگیں کٹی ہوئی۔ چھٹی زخمی۔ تھانے پر خبر ہوئی۔ داروغہ جی بھاگے ہوئے اپنے گھر آئے۔ معلوم ہوا کہ ان کے گھر کی بارن نے چوروں کو سینہ دیتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً جا کر کٹھری میں بیٹھ رہی۔ جیوں ہی آزاد مرزا نے سینہ میں پاؤں ڈالا، تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔

آزاد پر مقدمہ چلایا گیا۔ جرم ثابت ہو گیا۔ کالے پانی بھیج دیے گئے۔

جب جہاز پر سوار ہوئے تو ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ آزاد نے پوچھا، کہو بھائی، کیا کیا تھا؟ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا، بھائی کیا بتاؤں؟ بے قصور ہوں۔ فوج میں نوکر تھا، عشق کے پھیر میں پڑ کر نوکری چھوڑی، مگر معشوق تو نہ ملا، ہم خراب ہو گئے۔ یہ شہسوار تھا۔

(87)

خاں صاحب پر مقدمہ تو دائر ہو ہی گیا تھا، اس پر داروغہ جی دشمن تھے۔ دو سال کی سزا ہو گئی۔ تب داروغہ جی نے ایک عورت کو رٹیا بیگم کے مکان پر بھیجا۔ عورت نے آکر سلام کیا اور بیٹھ گئی۔

ثریا: کون ہو؟ کچھ کام ہے یہاں؟

عورت: اے حضور، بھلا بغیر کام کے کوئی بھی کسی کے یہاں جاتا ہے؟ حضور سے کچھ کہنا ہے، آپ کے حسن کا دور دور تک شہرہ ہے۔ اس کا کیا سبب ہے کہ حضور اس عمر میں، اس حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں؟

ثریا: بہن، میں ایک مصیبت کی ماری عورت ہوں۔

عورت: اے حضور، مجھے بہن نہ کہیں، میں لونڈی، حضور شہزادی ہیں۔ حضور پر ایسی کیا مصیبت ہے؟ حضور تو اس قابل ہیں کہ بادشاہوں کے محل میں ہوں۔

ثریا: خدا دشمن پر بھی ایسی مصیبت نہ ڈالے۔ میں تو زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔

عورت: اللہ مالک ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ دنیا میں عزت کے ساتھ رہے اور کسی کا ہو کے رہے۔

ثریا: مگر جب خدا کو بھی منظور ہو۔ ہم نے تو بہت چاہا کہ شادی کر لیں، مگر خدا کو منظور ہی نہ تھا۔ قسمت کا لکھا کون مناسکتا ہے؟

عورت: حضور کا حکم ہو تو کہیں فکر کروں؟

ثریا: ہم کو محاف کیجیے۔ ہم اب شادی نہ کریں گے۔

عورت: حضور سے میں ابھی جواب نہیں چاہتی۔ خوب سوچ لیجیے۔ دو تین دن میں جواب دیجیے گا۔ یہاں ایک رئیس زادے رہتے ہیں، بہت ہی خوبصورت، خوش مزاج اور شوقین۔ دل بہلانے کے لیے نوکری کر لی ہے۔ حکومت کی نوکری ہے۔

ثریا: حکومت کی نوکری کیسی ہوتی ہے؟

عورت: ایسی نوکری، جس میں سب پر حکومت کریں۔ کتوال ہیں۔

عباسی: اچھا، انھی تھانے دار کا پیغام لائی ہوگی۔

عورت: اے، تھانے دار کا ہے کو ہیں، برائے نام نوکری کر لی، ورنہ ان کو نوکری کی کیا ضرورت ہے، وہ ایسے ایسے دس تھانے داروں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔

عباسی: حضور کو تو شادی کرنا منظور ہی نہیں ہے۔

عورت: واہ! کیسی باتیں کرتی ہو۔

ثریا: تم ان کی سکھائی پڑھائی آئی ہو، ہم سمجھ گئے۔ ان سے کہہ دینا کہ ہم بے کس

عورت ہیں، ہم پر رحم کرو، کیوں ہماری جان کے دشمن ہوئے ہو، ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو۔
بچے جھاڑ کے ہمارے پیچھے پڑے ہو؟

عورت: حضور کی قسم، انہوں نے نہیں بھیجا ہے۔

رثیا: اچھا تو اس میں زبردستی کا ہے کی ہے۔

عورت: آپ کے اور ان کے دونوں کے حق میں یہی اچھا ہے کہ حضور انکار نہ کریں۔

وہ انفر پولس ہیں، ذرا سی دیر میں بے آمد کر سکتے ہیں۔

رثیا: ہمرا بھی خدا ہے۔

عورت: خیر، نہ مانو۔

عورت دو چار باتیں سنا کر چلی گئی، تو عتاسی اور رثیا بیگم صلاح کرنے لگیں۔

رثیا: اب یہاں سے بھی بھاگنا پڑا، اور آج ہی کل میں۔

عتاسی: اس موئے کو ایسی ضد پڑ گئی کہ کیا کہیں! مگر اب بھاگ کے جائیں گے کہاں؟

رثیا: جدھر خدا لے جائے۔ کہیں سے لالہ خوش وقت رائے کو لاؤ، بڑا نمک حلال بڑھا

ہے۔ کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ کل صبح تک یہاں آ جائے۔

عتاسی: کہیے تو کفو کو بھیجوں، بلا لائے۔

کفو قوم کا لوہار تھا۔ اوپر سے تو ملا ہوا تھا مگر دل میں ان کا دشمن تھا۔ عتاسی نے اس کو

بلا کے کہا، تم جا کے لالہ خوش وقت رائے کو لولا لاؤ۔ کفو نے کہا، تم ساتھ چلو تو کیا مضائقہ

ہے، مگر اکیلا تو میں نہ جاؤں گا۔ آخر یہی طے ہوا کہ عتاسی بھی ساتھ جائے۔ شام کے وقت

دونوں وہاں سے چلے۔ عتاسی مردانہ ہمیں میں تھی۔ کچھ دور چل کر کفو بولا، عتاسی، برا نہ مانو

تو ایک بات کہوں! تم اس بیگم کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کرتی ہو؟ ان کی جمع جتن لے

کر چلی آؤ اور میرے گھر پڑو۔

عتاسی: تم مردوں کا اعتبار کیا۔

کفو: ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں۔

عتاسی: بھلا اب لالہ صاحب کا مکان کتنی دور ہوگا؟

کفو: یہی کوئی دو کوس، کہو تو سواری کرائے کر لوں یا گود میں لے چلوں۔

عتاسی: ایس، یا تو گھر بیٹھاتے تھے، یا گود بٹھانے لگے۔

کلو: بھئی، بہت کہی، ایسی کہی کہ ہماری زبان بند ہو گئی۔
 عتاسی: اے، تم ایسے گنواروں کو بند کرنا کون بات ہے۔
 تھوڑی دیر میں دونوں ایک مکان میں پہنچے۔ یہ کلو کے دوست شیو دین کا مکان تھا۔
 شیو دین نے کہا، آؤ یار، حراج اچھے؟

کلو: سب چھین ہی چھین ہے۔ ان کو لے آیا ہوں جو کچھ صلاح کرنی ہو، کر لو۔ سنو
 عتاسی، شیو دین کی اور ہماری یہ رائے ہے کہ تم کو اب یہاں سے نہ جانے دیں۔ بس ہمیں
 اپنی بیگم کے مال ٹال کا پتہ بتلا دو۔

عتاسی: بڑی دعا دی کلو، بڑی دعا دی تم نے۔
 کلو: اب تم رات بھر یہیں رہو۔ ہم لوگ ذرا ٹیٹا بیگم سے ملاقات کرنے جائیں گے۔
 عتاسی: بڑا دھوکہ دیا، کہیں کے نہ رہے۔

عتاسی تو یہاں روتی رہی، ادھر وہ چور کئی آدمیوں کے ساتھ ٹیٹا بیگم کے مکان پر جا
 پہنچے اور دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ ٹیٹا بیگم کا آنکھ کھل گئی، بے چاری اکیلی مکان میں
 مارے ڈر کے دہکی پڑی تھی۔ بولی— کون ہے؟ عتاسی!
 کلو: عتاسی نہیں ہے، ہم ہیں، عتاسی کے میاں۔
 ٹیٹا: ہائے میرے اللہ، غضب ہو گیا!

شیو: چپے چپے بولو، بتاؤ روپیہ کہاں ہے؟ سب بتا دو، نہیں ماری جاؤ گی۔
 کلو: بتائیں تو اچھا، نہ بتائیں تو اچھا، ہم گھر بھر تو ڈھونڈ ہی مرے گے۔ سنا ہے کہ
 تمہارے پاس جواہر کے ڈھیر ہیں۔

ٹیٹا: امیر جب تھی تب تھی، اب تو مصیبت کی ماری ہوں۔
 کلو: تم یوں نہ بتاؤ گی، اب ہم کچھ اور ہی اپائے کریں گے، اب بھی بتاتی ہے کہ
 نہیں؟

ٹیٹا نے مارے خوف کے ایک ایک چیز کا پتہ بتلا دیا۔ جب ساری جمع جتھالے کر وہ
 سب چلے گئے، تو کلو ٹیٹا نے بولا، چل ہمارے ساتھ، اٹھ۔
 ٹیٹا: خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ رحم کرو۔
 شیو: چل، چل اٹھ، رات جاتی ہے۔

ثریا بیگم نے ہاتھ جوڑے، پاؤں پڑی، رو رو کر کہا، خدا کے واسطے میری عزت نہ لو۔ مگر کلو نے ایک نہ سنی۔ کہنے لگا، تجھے کسی رئیس امیر کے ہاتھ پیچیں گے، تم بھی چین کرو گی، ہم بھی چین کریں گے۔

ثریا: میرا مال لیا، زیور لیا، اب تو چھوڑو۔

کلو: چلو، سیدھے سے چلو، نہیں تو دھکیلائی جاؤ گی۔ دیکھو منہ سے آواز نہ نکلے، ورنہ ہم جبری بھونک دیں گے۔

ثریا: (رو کر) یا خدا میں نے کون سا گناہ کیا تھا، اس کے عوض یہ مصیبت پڑی!

کلو: چلتی ہے کہ بیٹھی روتی ہے؟

آخر ثریا بیگم کو اندھیری رات میں گھر چھوڑ کر ان کے ساتھ جانا پڑا۔

(88)

آدھ کوس چلنے کے بعد ان چوروں نے ثریا بیگم کو دو اور چوروں کے حوالے کیا۔ ان میں ایک کا نام بدھ سنگھ تھا، دوسرے کا نکلاس۔ یہ دونوں ڈاکو دور دور تک مشہور تھے، اچھے اچھے ذکیت ان کے نام سن کر اپنے کان پکڑتے تھے۔ کسی آدمی کی جان لینا ان کے لیے دل لگی تھی۔ ثریا بیگم کانپ رہی تھی کہ دیکھیں آبرو بچتی ہے یا نہیں۔ نکلاس بولا، کہو بدھ سنگھ اب کیا کرنا چاہیے؟

بدھ سنگھ: اپنی تو یہی مرضی ہے کہ کوئی منجھلا ل جائے تو اسی دم ٹھیل ڈالو۔

نکلاس: میں تو سمجھتا ہوں، یہ ہمارے ساتھ رہے تو اچھے اچھے شکار پھنسے۔ سنو بیگم، ہم ذکیت ہے، بد معاش نہیں۔ ہم تمہیں کسی ایسے جوان کے ہاتھ پیچیں گے، جو تمہیں امیر زادی بنا کر رکھے۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلی آؤ۔

چلتے چلتے تینوں آسموں کے ایک باغ میں پہنچے۔ دونوں ڈاکو تو جس پینے لگے، ثریا بیگم سوچنے لگی۔ خدا جانے، کس کے ہاتھ پیچیں، اس سے تو یہی اچھا ہے کہ قتل کر دیں۔ اتنے ہی میں دو آدمی باتیں کرتے نکلے۔

ایک: مرزا جی، دو بد معاشوں سے یہ شہر پاک ہو گیا۔ آزاد اور شہسوار۔ دونوں ہی کالے پانی گئے۔ اب دو ٹمہ اور باقی ہیں۔

مرزا: وہ دو کون ہیں؟

پہلا: وہی ہلاس اور بدھ سنگھ۔ ارے، وہ دونوں تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیوں یارو، جس کے دم اڑ رہے ہیں؟ تم لوگوں کے نام وارنٹ جاری ہے۔

ہلاس: میر صاحب، آپ بھی بس وہی رہے۔ پڑوس میں رہتے ہو، پھر بھی وارنٹ سے ڈراتے ہو؟ ایسے ایسے کتنے وارنٹ روز ہی جاری ہوا کرتے ہیں۔ ہم سے اور پولس سے تو جانی دشمنی ہے، مگر قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اگر پچاس آدمی بھی گرفتار کرنے آئیں تو ہماری گرد تک نہ پائیں۔ ہم دونوں ایک پلٹن کے لیے کافی ہیں۔ کیسے، آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔

مرزا: اجی، ہم بھی کسی شکاری کی تلاش میں نکلے ہیں۔

جب میر اور مرزا چلے گئے تو دونوں چور بھی شریا بیگم کو لے کر چلے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک سوار آ نکلا۔ بدھ سنگھ نے سائیکس کو تو مار گرایا اور مسافر سے کہا، اگر آبرو کے ساتھ گھوڑا نذر کرو تو بہتر ہے، نہیں تو تم بھی زمین پر لوٹ رہے ہو گے۔ سوار بے چارہ اتر پڑا۔

حلاس نے تب شریا بیگم کو گھوڑے پر سوار کیا اور لگام لے کر چلنے لگا۔

شریا بیگم دل میں سوچتی تھی کہ اتنی ہی عمر میں ہم نے کیا کیا دیکھا۔ یہ نوبت آپہنچی ہے کہ جان بھی بچتی دیکھائی نہیں دیتی۔

ہلاس: بی بی کیا سوچتی جاتی ہو؟ کچھ گانا جاتی ہو تو گاؤ۔ اس جنگل میں منگل ہو۔

بدھ سنگھ: اس سے کہو کہ کوئی بچن گائے۔

ہلاس: ان کو غزلیں یاد ہوں گی یا غمیری ٹھپا۔ یہ بچن کیا جانیں!

شریا: نہیں مہیاں، ہمیں کچھ نہیں آتا، ہم بہو بیٹیاں گانا کیا جانیں۔

اتنے میں کسی کی آواز آئی۔ ہلاس نے بدھ سنگھ سے پوچھا، یہ کس کی آواز آئی؟

بدھ سنگھ: ارے کون سا آدمی بولا تھا؟

آواز: ذرا ادھر تک آ جاؤ۔ میں مرزا ہوں، ذرا سن لو۔

ہلاس اور بدھ سنگھ دونوں آواز کی طرف چلے، ادھر ادھر دیکھا کوئی نہ ملا۔ شریا بیگم کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ مارے ڈر کے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ دونوں کو پکارنے لگیں۔

ہائے! خدا کسی کو مصیبت میں نہ ڈالے۔ یہ دونوں ڈاکو اس کو پیچنے کی فکر میں تھے، اور اس نے مصیبت کے وقت انھیں دونوں کو پکارا۔ وہ آواز کی طرف کان لگائے ہوئے چلے تو دیکھا کہ

ایک بوڑھا آدمی گھاس پر پڑا سسک رہا ہے۔ ان کو دیکھ کر بولا، بابا، مجھ فقیر کو ذرا سا پانی پلاؤ۔ بس، میں پانی پی کر اس دنیا سے کوچ کر جاؤں گا۔ پھر کسی کو اپنا منہ نہ دکھاؤں گا۔

تھلاس نے اسے پانی پلایا، پانی پی کر وہ بولا، بابا، خدا تمہیں اس کا بدلہ دے۔ اس کے عوض تمہیں کیا دوں۔ خیر، اگر دو کھٹے بھی زندہ رہا تو اپنی کچھ حال تم سے بیان کروں گا اور تمہیں کچھ دوں گا بھی۔

تھلاس: آپ کے پاس جو کچھ جمع تھا وہ ہم کو بتا دیجیے۔

بوڑھا: کہا نا کہ دو کھٹے بھی زندہ رہا تو سب باتیں بتا دوں گا۔ میں سپاہی ہوں، لڑکپن سے یہی میرا پیشہ ہے۔

تھلاس: آپ نے تو ایک قصہ چھیڑ دیا، مجھے خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ آپ کی جان نکل جائے تو پھر وہ روپیہ وہیں کا وہیں پڑا رہے۔

بوڑھا: (گا کر) بچہجی نہ راحت ہم سے کسی کو.....

تھلاس: جناب، آپ کو گانے کو سوجھتی ہے اور ہم ڈر رہے ہیں کہ کہیں آپ کا دم نہ نکل جائے۔ روپے بتا دو، ہم بڑی دھوم دھام سے تمہارا تیج کریں گے۔

بدھ سنگھ: پانی اور پلوا دو تو پھر خوب ٹھنڈا ہو کر بتائے گا۔

بوڑھا: میرا ایک لڑکا ہے، دنیا میں اور کوئی نہیں۔ بس یہی ایک لڑکا، جوان، خوبصورت، گھوڑے پر خوب سوار ہوتا تھا۔

ثریا: پھر اب کہاں ہے وہ؟

بوڑھا: فوج میں نوکر تھا۔ کسی بیگم پر عاشق ہوا، تب سے پتہ نہیں۔ اگر اتنا معلوم ہو جائے کہ اس کی جان نکل گئی تو قبر بنوا دوں۔

ثریا: لمبے ہیں یا ٹھنٹے؟

بوڑھا: لمبا ہے۔ چوڑا سینہ، اونچی پیشانی، گورا رنگ۔

ثریا: ہائے ہائے! کیا بتاؤں بڑے میاں، میرا ان کا بدسوں ساتھ رہا ہے۔ میرے ساتھ نکاح ہونے کو تھا۔

بوڑھا: بیٹا، ذرا ہمارے پاس آ جاؤ۔ کچھ اس کا حال بتاؤ۔ زندہ تو ہے؟

ثریا: ہاں، اتنا تو میں کہہ سکتی ہوں کہ زندہ ہے۔

بوڑھا: اب وہ ہے کہاں؟ ذرا دیکھ لیتا تو آرزو پوری ہو جاتی۔

ہلاس: آپ کا سردہا دوں، تگڑے ٹوں، جو خدمت کہیے کروں۔

بوڑھا: نہیں، موت کا علاج نہیں ہے۔ میں نے اپنے لڑکے کو لڑائی کے فن خوب سکھائے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ مرؤت سے پیش آتا تھا۔ بس، اتنا بتا دو کہ زندہ ہے یا مر گیا؟

ثریا: زندہ ہیں اور خوش ہیں۔

بوڑھا: اب میں اپنی ساری تکلیفیں بھول گیا۔ خیال بھی نہیں کہ کبھی تکلیف ہوئی تھی۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پچاس آدمیوں نے آکر ان لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دونوں ڈاکوؤں کی مشکلیں کس لی گئیں۔ بدھ سنگھ مضبوط آدمی تھاری توڑ کر تین سپاہیوں کو زخمی کیا اور بھاگ کر جمیل میں کود پڑا، کسی کی ہمت نہ پڑی کہ جمیل میں کود کر اسے پکڑے۔ ہلاس بندھا رہ گیا۔

یہ پولس کا انسپکٹر تھا

ثریا بیگم حیران تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ان لوگوں کو ڈاکوؤں کی خبر کیسے مل گئی۔ چپ چاپ کھڑی تھی کہ سپاہیوں نے اس سے ہنسی دل لگی کرنی شروع کی۔ ایک بولا، واہ واہ، یہ تو کوئی پری ہے بھائی۔ دوسرا بولا، اگر ایسی صورت کوئی دکھا دے تو مہینے کی تنخواہ ہار جاؤں۔ ہلاس: سنتے ہو جی، اس عورت سے نہ بولو، تم کو ہم سے مطلب ہے یا اس سے۔ انسپکٹر: اس کا جواب تو یہ ہے کہ تیرے ایک بیس لگائیں اور بھول جائے تو پھر سے گئے۔ آنکھیں پٹی کر، نہیں کھود کے گاڑ دوں گا۔

صبح کے وقت شہر میں داخل ہوئے تو ثریا بیگم نے چادر سے منہ چھپا لیا۔ اس پر ایک چوکیدار بولا، ستر چوہے کھا کر بلی جج کو چلی۔ اوزنی منہ پر ڈھانپتی ہے، ہناؤ اوزنی۔ ثریا بیگم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے دل پر جو گزرتی تھی، اسے کون جان سکتا ہے۔ راستے میں تماشائیوں میں باتیں ہونے لگیں!

رنگرین: بھئی، یہ دوپٹہ کتنا اچھا رنگا ہوا ہے!

نان بائی: کہاں سے آتے ہو جوانوں؟ کیا کہیں ڈاکہ پڑا تھا؟

شیخ جی: ارے یارو، یہ نازنین کون ہے؟ کیا کھڑا ہے، قسم خدا کی، ایسی صورت کبھی نہ

دیکھی تھی۔ بس، یہی جی چاہتا ہے کہ اس سے نکاح پڑھوا لیں۔ یہ تو شبو جان سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہ شیخ جی وکیل صاحب تھے جن کے یہاں اللہ رکھی شبو جان بن کر رہی تھی۔ سلاو بھی ساتھ تھا۔ بولا، میاں، آنکھوں والے تو بہت دیکھے، مگر آپ کی آنکھ زالی ہے۔ وکیل: کیوں بے بد معاش، پھر تو نے گستاخی کی۔ سلاو: جب کہیں گے، کھری کہیں گے۔ آپ تھالی کے بیگن ہیں۔

وکیل صاحب اس پر تھلا کر دوڑے۔ سلاو بھاگا، آپ منہ کے بل گرے۔ اس پر لوگوں نے تھقہ مارا۔ ثریا بیگم سوچ رہی تھی کہ میں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے، پر یاد نہ آتا تھا۔

یہ لوگ اور آگے چلے تو طرح طرح کی افواہیں اڑنے لگیں۔ یہ ایک محلے میں یہ خبر اڑی کہ دریا سے ایک گھوڑ موٹھا آدمی نکالا گیا ہے اسی کے ساتھ ایک پری بھی نکلی ہے۔ دو تین محلوں میں یہ افواہ اڑی کہ ایک عورت اپنے گھر سے زیور لے کر بھاگ گئی تھی، اب پکڑی گئی ہے۔ نو بجتے بجتے یہ لوگ تھانے میں جا پہنچے۔ ٹلاس اور ثریا بیگم حالات میں بند کر دیے گئے۔ رات کو طرح طرح کے خواب دیکھائی دیے۔ پہلے دیکھا کہ اس کا بوڑھا شوہر قبر سے گردن نکال کر کہتا ہے، ثریا، وہ کیسی بری گھڑی تھی، جب تیرے ساتھ نکاح کیا اور اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملائی۔ پھر دوسرا خواب دیکھا کہ آزاد ایک درخت کے سائے میں لیٹے اور سو گئے۔ ایک سانپ ان کے سر ہانے آ بیٹھا اور کاٹا ہی چاہتا تھا کہ ثریا بیگم کی آنکھ کھل گئی۔

سویرے اٹھ کر بیٹھی تھی کہ ایک سپاہی نے آکر کہا، تمہارے بھائی تم سے ملنے آئے ہیں۔ ثریا بیگم نے سوچا، میرا بھائی تو کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا، یہ کون بھائی بن بیٹھا۔ سوچی، شاید کوئی دور کے رشتے دار ہوں گے، بلا لیا۔ جب وہ آیا تو اس کو دیکھ کر ثریا بیگم کے ہوش اڑ گئے۔ یہ وہی وکیل صاحب تھے۔ آپ نے آتے ہی آتے کہا، بہن، خیر تو ہے، یہ کیا، ہوا کیا؟ ہم سے بیان تو کرو! کچھ دوڑ دوپ کریں؟ حکام سے مل کر کوئی سبیل نکالیں۔

ثریا: میاں، میری تقدیر میں یہی لکھا تھا، تو تم کیا کرو گے اور کوئی کیا کرے گا۔ وکیل: خیر، اب ان باتوں کا ذکر ہی کیا۔ سچ کہتا ہوں شبو جان، تمہاری یاد دل سے کبھی

نہیں اتری، مگر انہوں نے تم نے میری محبت کی قدر نہ کی۔ جس دن تم میرے گھر سے نکل بھاگیں، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بدن سے جان نکل گئی۔ اب تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہاری طرف سے بیرونی کریں گے۔ تم جانتی ہی ہو کہ ہم کیسے مشہور وکیل ہیں اور کیسے کیسے مقدمے بات کی بات میں جیت لیتے ہیں۔

ثریا: اس وقت آپ آگئے، اس سے دل کو بڑی تسکین ہوئی۔ تمہارے گھر سے نکل تو پہلے ایک مصیبت میں پھنس گئی۔ بارے خدا خدا کر کے اس سے نجات پائی اور کچھ دولت بھی ہاتھ آئی تو تمہارے ہی محلے میں مکان لیا اور بیگموں کی طرح رہنے لگی۔

وکیل: ارے، وہ ثریا بیگم آپ ہی تھیں،

ثریا: ہاں میں ہی تھی۔

وکیل: افسوس، اتنے قریب رہ کر بھی کبھی مجھے نہ بلایا! مگر وہ آپ کی دولت کیا ہوئی اور یہاں حالات میں کیوں کر آئی؟

ثریا: ہوا کیا، دو بار چوری ہو گئی، اوپر سے تھانے دار بھی دشمن ہو گیا۔ آخر ہم اپنی مہری کو لے کر چل دیے۔ ایک گاؤں میں رہنے لگی۔ مگر وہاں بھی چوری ہوئی اور ڈاکوؤں کے پھندے میں پھنسی۔

اتنے ہی میں ایک تھانے دار نے آکر وکیل صاحب سے کہا، اب آپ تشریف لے جائیے۔ وقت ختم ہو گیا۔ ثریا بیگم نے اس تھانے دار کو دیکھا، تو پہچان گئی۔ یہ وہی آدمی تھا جس کے پاس ایک بار وہ آزاد پر رہت کرنے گئی تھی۔ بولی — کیوں صاحب، پہچانا؟ اب کیوں پہچانے گا۔

تھانے دار: اللہ رکھی، خدا کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ اس وقت مارے خوشی کے رونا آتا ہے۔ میں تو بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ مجھے اب تمہاری بھی ویسی ہی محبت جو پہلے تھی۔

رات کے وقت تھانے دار نے حوالات میں آکر اسے جگایا اور آہستہ سے کان میں کہا، بہت اچھا موقع ہے، چلو، بھاگ چلیں، میں نے چوکیداروں کو ملا لیا ہے۔

ثریا بیگم: نے تھانے دار کو سمجھایا کہ کہیں پکڑ نہ لیے جائیں۔ مگر جب وہ نہ مانا، تو وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ باہر آکر تھانے دار نے ثریا بیگم کو مردانہ کپڑے پہنائے اور گاڑی پر سوار کرا کے چلا۔ جب دو کوس نکل گئے تو سویرا ہوا۔ تھانے دار نے گاڑی سے درمی

نکالی اور آرام سے لیٹ کر کھپنے لگے کہ ایک مسافر سوار نے آکر پوچھا۔ کیوں بھائی مسافر، ہندو ہو یا مسلمان؟ مسلمان ہو تو کھپلاؤ۔

تھانے دار نے خاطر سے بیٹھایا۔ لیکن جب مسافر کے چہرے پر غور سے نظر ڈالی تو کچھ شک ہوا۔ کہا۔ جناب میرے دل میں آپ کی طرف سے ایک شک پیدا ہوا ہے۔ کیسے عرض کروں۔ کیسے خاموش رہوں؟ آپ ہی تو جبل پور میں ایک سوداگر کے یہاں مٹی جھے۔ وہاں آپ نے دو ہزار روپے کا غنیم کیا اور سال بھر کی سزا پائی۔ کیسے غلط کہتا ہوں؟

مسافر: جناب، آپ کو دھوکہ ہوا ہے، یہاں خاندانی رئیس ہیں۔ غنیم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ تھانے دار: یہ چمکے کسی اور کو دیجیے گا۔ دائی سے پیٹ نہیں چھپتا۔

مسافر: اچھا مان لیجیے، آپ ہی کہنا درست ہے۔ بھلا ہم پھنس جائیں تو آپ کو کیا ملے؟

تھانے دار: پانچ سو روپے نقد، ترقی اور نیک نامی الگ۔

مسافر: بس! ہم سے ایک ہزار لے لیجے، ابھی ابھی گنا لیجیے۔ لیکن گرفتار کرنے کا ارادہ ہو تو میرے ہاتھ میں بھی تلوار ہے۔

تھانے دار: حضرت، یہ رقم بہت تھوڑی ہے ہمیں جتنی نہیں۔

مسافر: آخر دو ہی ہزار تو میرے ہاتھ لگے تھے۔ اس کا آدھا آپ کو نذر کرتا ہوں۔ مگر گستاخی معاف ہو تو میں بھی کچھ کہوں۔ مجھے آپ کے ان دوست پر کچھ شک ہوتا ہے۔ کیسے، کیسے بھانپا۔

تھانے دار نے دیکھا کہ پردہ کھل گیا، تو جھکڑا بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ ڈرے، کہیں جا کر افسروں سے جڑ دے، تو راستے ہی میں دھر لیے جائیں۔ بولے، حضرت، اب آپ کو اختیار ہے، ہماری لاج اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مسافر: میری طرف سے آپ اطمینان رکھیے۔

دونوں آدمیوں میں دوستی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تینوں یہاں سے روانہ ہوئے، شام ہوتے ہوتے ایک ندی کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچے۔ وہاں ایک صاف ستھرا مکان اپنے لیے ٹھیک کیا اور زمین دار سے کہا کہ اگر کوئی آدمی ہمیں پوچھے تو کہنا، ہمیں نہیں معلوم۔ تینوں دن بھر کے تھکے تھے، کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہی۔ سوئے تو سویرا ہو گیا۔ صبح کے وقت

تھانے دار صاحب باہر آئے تو دیکھا کہ زمین دار ان کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ان کو دیکھتے ہی بولا، جناب، آپ نے اٹھتے اٹھتے نو بجا دے۔ ایک اجنبی آدمی یہاں آپ کی تلاش میں آیا ہے۔ وردی تو نہیں پہنے ہیں، ہاں سر پر پگڑی باندھے ہیں۔ پنجابی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے کہ نہ جانے کیا آفت آئے۔

تھانے دار: کسی بہانے سے ہم کو اپنے مکان پر لے چلو اور ایسی جگہ بیٹھاؤ، جہاں سے ہم سن سکیں کہ کیا باتیں کرتا ہے۔

زمین دار: چلیے، مگر آپ کا چلنا اچھا نہیں۔ اندر ہی بیٹھیے، اگر کوئی کھلنے کی بات ہوگی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔

تھانے دار: جناب، میں نے پولس میں نوکری کی ہے، چلنے کا ڈر آپ کو ہوگا۔ میں ابھی داڑھی حجام کی نذر کرتا ہوں اور مونچھیں کتر وا ڈالتا ہوں۔ چلیے، چھٹی ہوئی۔

ثریا بیگم نے سمجھایا کہ کہیں پھنس گئے تو کہیں کے نہ رہو گے۔ آپ بھی جاؤ گے اور مجھے بھی لے ڈوبو گے۔ مگر تھانے دار صاحب نے ایک نہ سنی۔ فوراً تائی کو بلایا، داڑھی مڑوائی، سیاہ کنارے کی دھوتی پہنی، انگرکھا ڈانا، کالی مندریل سر پر رکھی اور آدھے ہندو اور آدھے مسلمان بنے ہوئے زمین دار کے پاس جا پہنچے، سلام بندگی کے بعد باتیں ہونے لگیں۔ تھانے دار نے اپنا نام شیخ بدھو بتلایا اور گھر بنگال میں۔ زمین دار کے پاس ایک پنجابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سمجھ گئے کہ یہی حضرت ہمیں گرفتار کرنے آئے ہیں! نام پوچھا تو اس نے بتلادیا شیر سنگھ۔

تھانے دار: آپ تو پنجاب کے رہنے والے ہوں گے؟

شیر سنگھ: جی ہاں، ہم خاص امبر سر میں رہتے ہیں۔

تھانے دار: آپ کہاں نوکری ہیں؟

شیر سنگھ: ہم زمین دار ہیں۔ امبر سر کے پاس ہمارے علاقہ ہے، اس کو ہمارا بھائی دیکھتا

ہے، ہم کھو جتے رہتے ہیں۔ آپ یہاں کس غرض سے آئے ہیں؟ اور بچے آپ کہاں ہیں؟

تھانے دار: اسی گاؤں میں میں بھی ٹھہرا ہوں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ہمارے ساتھ گھر

نک چلیے۔

تھانے دار ان کو لے کر ڈیرے پر آئے۔ ثریا بیگم دوڑ کر چھپنے کو تھیں، مگر تھانے دار

نے منع کیا اور کہا کہ یہ میرے بھائی ہیں۔ ان سے پردہ کرنا فضول ہے۔

شیر سنگھ: یہ آپ کی کون ہیں۔

تھانے دار: جی میرے گھر پڑ گئی ہیں۔

ثریا بیگم: اے ہو بھی، کیا داہیات باتیں کرتے ہو۔ حضرت یہ میرے بھائی ہیں۔ اس

پر شیر سنگھ نے قہقہہ لگایا اور تھانے دار جھینپے۔

شیر سنگھ: آپ نے سنا نہیں، ایک مسلمان تھانے دار کسی بیڑن کو حوالات سے لے کر

بھاگے۔ بڑی تحقیقات ہو رہی ہے، مگر پتہ نہیں چلتا۔

تھانے دار: کہہ تو نہیں سکتا کہ وہ تھانے دار ہی تھا یا کوئی اور، مگر پرسوں رات کو جب

ہم اور یہ آرہے تھے تو دیکھا کہ ایک گاڑی پر کوئی فوجی آدمی سوار ہے اور کسی عورت سے

باتیں کرتا جاتا ہے۔ عورت کا نام ثریا بیگم تھا۔ جو مجھے معلوم ہو کہ وہی حضرت ہیں تو کچھ لے

مردوں۔

شیر سنگھ: ضرور وہی تھا، اس عورت کا نام ثریا بیگم ہی تھا۔ کیا کہوں میں اس وقت نہ

ہوا۔

تینوں میں بڑی دیر تک ہنسی دل لگی ہوتی رہی۔ شیر سنگھ جب چلنے لگے تو کہا، کل سے

ہم بھی یہیں ٹھہریں گے، دوسرے دن تڑکے شیر سنگھ اپنا پوریا بدھنا لے کر آچینچے۔ تھانے دار

نے کہا، حضرت، آپ ہندو اور ہم مسلمان۔ آپ کی گنگا اور ہمارا قرآن۔ آپ گنگا کی قسم اور

ہم قرآن کی قسم کھائیں کہ مرتے دم تک کبھی ساتھ نہ چھوڑیں گے، ہمیشہ دوستی کا دم بھرتے

رہیں گے۔ ایسے نہ ہو کہ پیچھے سے نکل جاؤ؟

شیر سنگھ: ہم اپنے ایمان کی قسم کھاتے ہیں کہ مرتے دم تک تمھاری دوستی کا دم بھریں

گے۔

تھانے دار: میری کچھ شرط ہیں، ان کو قبول کیجیے۔

(1) ایک دوسرے کی بات کسی سے نہ کہیں۔ اگر ہم کسی کو مار بھی ڈالیں تو آپ نہ

کہیے۔ چاہے لوکری جائے۔ چاہے آبد جائے۔

(2) ہمارے آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔

(3) ہم اپنا حال آپ سے کہیں اور آپ اپنا حال ہم سے بیان کریں۔

شیر سنگھ: آپ کی سب باتیں منظور ہیں ہاتھ پر ہاتھ مارے اور ٹوپی بدلے۔ بس، ہم

اور آپ بھائی بھائی ہوئے۔ بھابھی صاحب، ہم غریبوں پر بھی مہربانی کی نظر رہے۔

رثیا بیگم: اے، تھوڑی دیر میں ہم آپ کو جک کے سلام کریں گے۔

شیر سنگھ: کیوں، تھوڑی دیر میں کیا ہوگا صاحب، بتائے!

رثیا بیگم: (انس کر) گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

تھانے دار: اچھا تو اب سنے بھائی صاحب، ہم خونی ہیں۔ اب آپ چاہے انپکڑ کی

حیثیت میں قید کیجیے۔ چاہے دوست کی حیثیت میں معاف کیجیے۔

شیر سنگھ: (دنگ ہو کر) کیا خونی؟

تھانے دار: جی ہاں، میں بنگالی نہیں ہوں۔ لکھنوی ہوں۔ چند ہی روز ہوئے، شہزادہ

ہمایوں فرکو قتل کیا اور بھاگ آیا۔ اب فرمائیے؟

شیر سنگھ: خدا تجھے غادر کرے، کبخت؟ تو تو اس قابل ہے کہ تجھ کو کھود کے دفن کر

دے۔

تھانے دار: اچھا، اب ہماری کیا سزا تجویز ہوئی؟ صاف بتا دو۔

شیر سنگھ: موئے پر سوڈڑیں اور گدھے کی سواری۔ بس، اب میں یہاں سے بھاگ

جاؤں گا اور عمر بھر تمہاری صورت نہ دیکھوں گا۔ خدا تجھ سے سبھے۔

تھانے دار: سنو بھائی جان، یہ فقط چمکہ تھا۔ ہم آزماتے تھے کہ دیکھیں، تم قول کے

کہاں تک سچے ہو۔ اب ہم صاف کہتے ہیں کہ ہم قاتل نہیں ہیں، لیکن مجرم ہیں۔ اب کیسے۔

شیر سنگھ: اچی، جب اتنے بڑے جرم کی سزا نہ دی تو اب کیا خوف ہے؟ کیا کہیں سے

مال مار لائے ہو؟

تھانے دار: بھئی، معاف کرو تو بتا دیں۔ سنے، ہم وہی تھانے دار ہیں جس کی تلاش

میں تم لکھے ہو۔ اور یہ وہی بیڑن ہیں۔ اب چاہے باندھ لے چلو، چاہے دوستی کا حق ادا کرو۔

شیر سنگھ: آف، بڑا جھانسا دیا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم سے میرے پاس آیا کیونکر گیا۔

میں پنجاب سے خاص اسی کام کے لیے بلوایا گیا تھا۔ یہاں دو دن سے تمہیں بھی دیکھ رہا

ہوں اور بیڑن سے لوک جھونک بھی ہو رہی ہے۔ مگر ٹائیس ٹائیس غس۔

رثیا: حضور، لے ذرا منہ سنبھال کر بات کیجیے۔ بیڑن کوئی اور ہوگی۔ بیڑن کی صورت

نہیں دیکھی!

تھانے دار: یہ بیگم ہیں۔ خدا کی قسم۔ ثریا بیگم نام ہے۔

شر سنگھ: وہ تو بات چیت سے ظاہر ہے۔ اچھا بیگم صاحب، برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ اگر اپنی اور ان کی رہائی چاہتی ہو، تو ان کو استعفیٰ دو اور ہم سے وعدہ کرو۔

تھانے دار: ان کو راضی کیجیے۔ ہم سے کیا واسطہ۔ ہم کو اپنی جان پیاری ہے۔

ثریا: اے واہ! اچھے ملے۔ تم تھانے داری کیا کرتے تھے! اچھا، دل لگی تو ہو چکی۔ اب مطلب کی بات کہو۔ ہم دونوں بھاگیں، تو بھاگ کے جائیں کہاں؟ اور بھاگیں تو رہیں کہاں؟

شر سنگھ: ایک کام کرو۔ ہم کو واپس جانے دو۔ ہم وہاں جا کر آئیں بائیں سائیں اڑا دیں گے۔ اس کے بعد آکر تم کو پنجاب لے جائیں گے۔

تھانے دار: اچھا تو ہے۔ ہم سب مل کر پنجاب چلیں گے۔

ثریا: تم جاؤ، ہم تو نہ جائیں گے۔ اور سنیے، واہ!

تھانے دار: ہماری بات مایہ۔ آپ گھر گھر تحقیقات کیجیے اور ۱۰ دن تک یہاں نکلے رہیے اور وہاں جا کر کہیے کہ لازم ترائی کی طرف نکل گیا۔

شر سنگھ: ہاں، ملاحظہ تو اچھی ہے۔ تو آپ یہاں رہیں، میں جاتا ہوں۔

شر سنگھ نے دن بھر سارے قصبے میں تحقیقات کی۔ زمین داروں کو بلا کر خوب ڈانٹ پھٹکار سنائی۔ شام کو آکر تھانے دار کے ساتھ کھانا کھایا اور صبح کو روانہ ہوئے۔ شر سنگھ چلے گئے تو تھانے دار صاحب بولے۔ دنیا میں رہ کر اگر چالاک نہ کریں تو دم بھر گزارہ نہ ہو۔ دنیا میں آنکھوں کاٹھ کیت ہو تب کام چلے۔

ثریا: واہ! آدمی کو نیک ہونا چاہیے، نہ کہ چالاک۔

تھانے دار: نیکی سے کچھ نہیں ہوتا چالاک بڑی چیز ہے۔ اگر ہم شر سنگھ سے چالاک نہ کرتے تو ان سے گلا کیسے چھوٹتا۔

دوسرے دن تھانے دار صاحب بھی روانہ ہوئے۔ دن بھر چلنے کے بعد گاڑی وان سے کہا۔ بھائی، یہاں سے میر ڈیہ کتنی دور ہے؟

گاڑی وان نے کہا۔ حضور یہی میر ڈیہ ہے۔

تھانے دار: یہاں ہم کس کے مکان میں ٹھکیں گے؟

گاڑی وان: حضور، آدمی بھیج دیا گیا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے ننھا ننھا پکارا۔ بڑی دیر کے بعد ننھا آیا اور گاڑی کو ایک ٹیل کی طرف لے چلا۔ وہیں ایک مکان میں اس نے دونوں آدمیوں کو اتارا اور تہہ خانے میں لے گیا۔

تھانے دار: کیا کچھ نیت کھوئی ہے بھی؟

رثیا: ہم تو اس میں نہ جانے کے۔ اللہ رے اندھیرا!

ننھا آپ چلیں تو سہی۔

تھانے دار نے تلواریں میان سے کھینچ لی اور رثیا بیگم کے ساتھ چلے۔

تھانے دار: ارے ننھا، روشن دان تو ذرا کھول دے جا کے۔

ننھا: اجی، کیا جانے، کس وقت کے بند پڑے ہیں۔

رثیا: ہے ہے! خدا جانے، کتنے برسوں سے یہاں چراغ نہیں جلا۔ یہ زینے تو ختم ہی ہونے نہیں آتے۔

ننھا: کوئی ایک سو دس زینے ہیں۔

رثیا: آف، بس اب میں مر گئی۔

ننھا: اب نکچائے آئے۔ کوئی بچیس ٹھو اور ہیں۔

بڑی مشکوں سے زینے طے ہوئے۔ مگر تہہ میں پہنچے تو ایسی ٹھنڈک ملی کہ گلابی جاڑے کا مزہ آیا۔ دو پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ دونوں آرام سے بیٹھے۔ کھانا بھی پہلے سے ایک باورچی نے پکا رکھا تھا۔ دونوں نے کھانا کھایا اور آرام کرنے لگے۔ یہ مکان چاروں طرف سے پہاڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ باہر نکلنے پر پہاڑوں کی کال چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ ان پر ہرن کلیلیں بھرتے تھے۔ تھانے دار نے کہا۔ بہت مقاموں کی سیر کی ہے، مگر ایسی جگہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ بس، اسی جگہ ہمارا اور تمہارا نکاح ہونا چاہیے۔

رثیا: بھئی، سنو، برا ماننے کی بات نہیں۔ میں نے دل میں ٹھان لی ہے کہ کسی سے نکاح نہ کروں گی۔ دل کا سودا صرف ایک بار ہوتا ہے۔ اب تو اسی کے نام پر بیٹھی ہوں۔ کسی اور کے ساتھ نکاح کرنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

تھانے دار: آخر وہ کون صاحب ہیں جن پر آپ کا دل آیا ہے؟ میں بھی تو سنوں۔

رثیا: تم ناحق مجھڑتے ہو۔ تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیے ہیں، ان کا احسان میرے سر پر ہے، لیکن یہ دل دوسرے کا ہو چکا۔

تھانے دار: اگر یہ بات تھی تو میری نوکری کیوں لی؟ مجھے کیوں مصیبت میں گرفتار کیا؟
 پہلے ہی سوچی ہوئی۔ اب سے بہتر ہے، تم اپنی راہ لو، میں اپنی راہ لوں۔
 ثریا: یہ تم نے لاکھ روپے کی بات کہی ہے۔ چلیے، سستے چھوٹے۔
 تھانے دار: تم نہ ہوگی تو کیا زندگی نہ ہوگی؟
 ثریا: اور تم نہ ہوگے تو کیا سویرا نہ ہوگا؟
 تھانے دار: نوکری کی نوکری گئی اور مطلب کا مطلب نہ نکلا۔
 غیر آنکھیں سینکیں اس بت سے دل مضطرب،
 ہائے بیدردی کوئی تاپے کسی کا گھر چلے
 ثریا: آنکھیں سینکنے والیاں اور ہوتی ہیں۔
 تھانے دار: اتنے دنوں سے دنیا میں آوارہ پھرتی ہو اور کہتی ہو، ہم نیک ہیں۔ واہ ری
 نیکی!

ثریا: تم سے نیکی کی سند تو نہیں مانگتی؟
 تھانے دار: اب اس وقت تمہاری صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا!
 ثریا: اچھا، آپ الگ رہیں۔ ہماری صورت نہ دیکھیے، بس چھٹی ہوئی۔
 تھانے دار: ہم کو ملال یہ ہے کہ نوکری مفت گئی۔
 ثریا: مجبوری!!

(89)

ثریا بیگم نے اب تھانے دار کے ساتھ رہنا مناسب نہ سمجھا۔ رات کو جب تھانے دار کھا
 پی کر لیٹا ثریا بیگم وہاں سے بھاگی۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ایک چوکیدار ملا۔ ثریا بیگم کو دیکھ
 کر بولا— آپ کہاں؟ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ ہی تو تھانے دار صاحب کے
 ساتھ اس مکان میں ٹھہری تھیں۔ معلوم ہوتا ہے، روٹھ کر چلی آئی ہو۔ میں خوب جانتا ہوں۔
 ثریا: ہاں، ہے تو یہی بات، مگر کسی سے ذکر نہ کرتا۔
 چوکیدار: کیا مجال، میں نوابوں اور رئیسوں کی سرکار میں رہا ہوں۔
 بیگم: اچھا، میں اس وقت کہاں جاؤں؟

چوکیدار: میرے گھر۔

بیگم: مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، ورنہ ہماری عزت جائے گی۔

بیگم صاحب چوکیدار کے ساتھ چلیں اور تھوڑی دیر میں اس کے گھر جا پہنچی۔ چوکیدار کی بیوی نے بیگم کی بڑی خاطر کی اور کہا۔ کل یہاں میلہ ہے، آج تک جاؤ! دو ایک دن میں چلی جانا۔

ثریا بیگم نے رات وہیں کاٹی۔ دوسرے دن پہر دن چڑھے میلہ جمع ہوا۔ چوکیدار کے مکان کے پاس ایک پادری صاحب کھڑے وعظ کہہ رہے تھے۔ سینکڑوں آدمی جمع تھے۔ ثریا بیگم بھی کھڑی ہو کر وعظ سننے لگی۔ پادری صاحب اس کو دیکھ کر بھانپ گئے کہ یہ کوئی پردہسی عورت ہے۔ کہیں سے بھول بھٹک کر یہاں آ گئی ہے۔ جب وعظ ختم کر کے چلنے لگے تو ثریا بیگم سے بولے۔ بیٹی، تمہارا گھر یہاں تو نہیں ہے؟

ثریا: جی نہیں، بد نصیب عورت ہوں۔ آپ کا وعظ سن کر کھڑی ہو گئی۔

پادری: تم یہاں کہاں ٹھہری ہو؟

ثریا: سوچ رہی ہوں کہ کہاں ٹھہروں؟

پادری: میرا مکان حاضر ہے، اسے اپنا گھر سمجھو۔ میری عمر اتنی ورش سے زیادہ ہے۔

اکیلے پڑا رہتا ہوں۔ تم میری لڑکی بن کر رہنا۔

دوسرے دن جب پادری صاحب گرجا گھر میں آئے، تو ان کے ساتھ ایک نازک بدن مس، قیمتی انگریزی کپڑے پہنے آئی اور شان سے بیٹھ گئی۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ یا خدا، اس بڑھے کے ساتھ یہ پری کون ہے! پادری صاحب نے اسے بھی پاس کی کرسی پر بیٹھایا۔ اس عورت کی چال ڈھال سے پایا جاتا تھا کہ کبھی صحبت میں نہیں بیٹھی ہے۔ ہر چیز کو اجنبیوں کی طرح دیکھتی تھی۔

رتیلے جوانوں میں چپکے چپکے باتیں ہونے لگیں۔

نام: کپڑے انگریزی ہیں، رنگ گورا، مگر زلف سیاہ ہے اور آنکھیں بھی کالی! معلوم ہوتا ہے، کسی ہندوستانی عورت کو انگریزی کپڑے پہنائے ہیں۔

ڈپوس: اس قابل ہے کہ جو روٹے۔

نام: پھر آؤ، ہم تم ڈورے ڈالیں، دیکھیں، کون خوش نصیب ہے۔

ڈیوس : نہ بھئی، ہم یوں ڈورے ڈالنے والے آدمی نہیں۔ پہلے معلوم تو ہو کہ ہے کون؟
چال چلن کا بھی تو کچھ حال معلوم ہو۔ پادری صاحب کی لڑکی تو نہیں ہے۔ شاید کسی عورت کو
بچہ سما دیا ہے۔

تین ہندستانی آدمی بھی گر جا گئے تھے۔ ان میں یوں باتیں ہونے لگیں۔

مرزا : استاد، کیا مال ہے، سچ کہنا؟

لالہ : اس پادری کے تو کوئی لڑکا بالائیں تھا۔

غشی : وہ تھا یا نہیں تھا، مگر سچ کہنا، کیسی خوبصورت ہے!

نماز کے بعد جب پادری صاحب گھر پہنچے تو رٹیا سے بولے۔ بیٹی، ہم نے تمہارا نام
مس پالین رکھا ہے۔ اب تم انگریزی پڑھنا شروع کرو۔

رٹیا : ہمیں کسی چیز کے سیکھنے کی آرزو نہیں ہے۔ بس، یہی جی چاہتا ہے کہ جان نکل
جائے۔ کس کا پڑھنا اور کیا لکھنا۔ آج سے ہم گرجہ گھر نہیں جائیں گے۔

پادری : یہ نہ کہو بیٹی! خدا کے گھر میں جانا اپنی عاقبت بنانا ہے۔ یہ خدا کا حکم ہے۔

رٹیا : اگر آپ مجھے اپنا بیٹی سمجھتے ہیں تو میں بھی آپ کو اپنا باپ سمجھتی ہوں، مگر میں
صاف صاف کہہ دیتی ہوں کہ میں عیسائی مذہب نہ قبول کروں گی۔

رات کو جب رٹیا بیگم سوئی، تو آزاد کی یاد آئی اور یہاں تک روئی کہ ہچکیاں بندھ
گئیں۔

پادری صاحب چاہتے تھے کہ یہ لڑکی کسی طرح عیسائی مذہب اختیار کر لے، مگر رٹیا بیگم
نے ایک نہ سنی۔ ایک دن وہ بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ جانسن نام کا ایک انگریز آیا اور

پوچھنے لگا۔ پادری صاحب کہاں ہیں؟

رٹیا : میں انگریزی نہیں سمجھتی۔

جانسن : (اردو میں) پادری صاحب کہاں ہے؟

رٹیا : کہیں گئے ہیں۔

جانسن : میں نے کبھی تم کو یہاں نہیں دیکھا تھا۔

رٹیا : جی ہاں، میں یہاں نہیں تھی۔

جانسن : یہ کون سی کتاب ہے؟

رثنا: سید کا کی نصیحتیں ہیں۔ پادری صاحب مجھے یہ کتاب پڑھاتے ہیں۔
 جانسن: معلوم ہوتا ہے، پادری صاحب تمہیں بھی 'نن' بنانا چاہتے ہیں۔
 رثنا: نن کسے کہتے ہیں؟

جانسن: نن ان عورتوں کو کہتے ہیں جو زندگی بھر کنواری رہ کر مسیح کی خدمت کرتی ہیں۔
 ان کا سر مڑا دیا جاتا ہے اور آدمیوں سے الگ ایک جگہ میں رکھ دی جاتی ہیں۔
 رثنا: یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ انہیں میں شامل ہو جاؤں اور
 تمام عمر شادی نہ کروں۔

جانسن نے یہ باتیں سنی تو اور زیادہ بیٹھنا فضول سمجھا۔ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔
 رثنا بیگم یہاں آ تو پھنسی تھی، مگر بھاگ نکلنے کا موقع ڈھونڈتی تھی۔ اس طرح تین مہینے
 گزر گئے!

(90)

نیپال کی ترائی میں ریاست خبری گڑھ کے پاس ایک لٹ و دق جنگل ہے۔ وہاں کئی
 شکاری شیر کا شکار کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ایک ہاتھی پر دو نوجوان بیٹھے ہوئے ہیں۔
 ایک کا سن بیس بائیس برس کا ہے، دوسرے کا مشکل سے اٹھارہ کا۔ ایک کا نام ہے وجاہت
 علی، دوسرے کا معشوق حسین۔ وجاہت علی دہرے بدن کا مضبوط آدمی ہے۔ معشوق حسین دبلا
 پتلا چمڑا آدمی ہے۔ اس کی شکل و صورت اور چال ڈھال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر
 اسے زنانے کپڑے پہنا دیے جائیں، تو بالکل عورت معلوم ہو۔ پیچھے پیچھے 6 ہاتھی اور آتے
 تھے۔ جنگل میں پہنچ کر لوگوں نے ہاتھ روک لیے تاکہ شیر کا حال دریافت کر لیا جائے کہ کہاں
 ہے۔ معشوق حسین نے کانپ کر کہا۔ کیا شیر کا شکار ہوگا؟ ہمارے تو ہوش اڑ گئے۔ اللہ کے
 لیے ہمیں بچاؤ۔ میری تو شیر کے نام ہی سے جان نکل جاتی ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ہرنی اور
 پاڑھے کا شکار کھیلنے چلتے ہیں۔

وجاہت علی: واہ، اسی پر کہتی تھیں کہ ہم بن بن بھرے یں۔ بھوت پریت سے نہیں
 ڈرتے۔ اب کیا ہو گیا کہ ذرا سا شیر کا نام سنا اور کانپ اٹھیں!
 معشوق حسین: شیر ذرا سا ہوتا ہے! اے، وہ اسی ہاتھی کا کان پکڑ لے تو چنگھاڑ کر بیٹھ

جائے۔ ٹھوڑا ہاتھی بس دیکھنے ہی بھر کو ہوتا ہے۔ اس کے بدن میں خون کہاں۔ بس، پانی ہی پانی ہے۔

دجاہت علی : اول تو شیر کا شکار نہیں ہے، اور اگر شیر آیا بھی تو ہم اس مقابلہ کر سکیں گے۔ اتھارہ اتھارہ نشانے باز ساتھ ہیں۔ ان میں دو تین آدمی تو ایسے بڑے ہوئے ہیں کہ رات کے وقت آواز پر تیر لگاتے ہیں۔ کیا مجال کہ نشانہ خالی جائے۔ تم گھبراؤ نہیں، ایسا لطف آئے گا کہ ساری عمر یاد کر دو گی۔

معشوق حسین : تمہیں قسم ہے، ہمیں یہاں سے کہیں بھیج دو۔ اللہ! کب یہاں سے چھٹکارا ہوگا۔ ایسی بری پھنسی کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔

نواب صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔ کس سے؟

معشوق حسین : اے، ہنو بھی! تمہیں دل لگی سوچھی ہے اور ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ شیر ایسا جانور، ایک تھپڑ میں دیو کو سلا دے۔ آدمی ذری سا بھنگا، چلے ہیں شیر کے شکار کو! ہاتھی روک لو! نہیں اللہ جانتا ہے، ہم ہاتھی پر سے کود پڑیں گے۔ بلا سے جان جائے یا رہے۔

نواب : ہیں ہیں۔ جان تمہارے دشمنوں کی جائے۔ آخر اتنے آدمیوں کو اپنی جان پیاری ہے یا نہیں؟ کوئی اور بھی چوں کرتا ہے؟

معشوق : اتنے آدمی جائیں چولہے میں۔ ان موڑوں کو جان بھاری ہوئی ہے۔ یہ گھر سے لڑ کر آئے ہیں۔ جو رو نے جوتیاں مار مار کر نکل دیا ہے۔ ان کی اور میری کون سی برابری۔ ہمیں اتار دو، ہم اب جائیں گے۔

نواب : ذرا ٹھہر دو تو، میں بندوبست کیے دیتا ہوں۔ کسی بڑے درخت پر ایک بچان باندھ دیں گے۔ بس، وہیں سے بیٹھ کے دیکھنا۔

معشوق : واہ، ذرا سا بچان اور جنگل کا واسطہ۔ اکیلی ڈر نہ جاؤں گی؟ ہاں، تم بھی جینھو تو البتہ!

نواب : یہ تو بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم مرد ہو کر بچان پر بیٹھیں اور لوگ شکار کھیلیں۔ معشوق : ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہمارے دوست کی یہی رائے ہے۔ ڈر کس بات کا ہے؟ صاف صاف کہہ دو کہ یہ عورت ہیں اور ہمارا ان کے ساتھ نکاح ہونے والا ہے۔

نواب : یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ مشہور کرنا کہ ایک کس عورت کو مردانہ کپڑے پہنا کر یہاں

لائے ہیں، مناسب نہیں۔

اتنے میں آدمیوں نے آکر کہا۔ حضور، سامنے ایک کچار ہے۔ اس میں ایک شیرنی بچوں کے پاس بیٹھی ہے۔ اسی دم ہاتھی کو پیل دیجیے۔

اتنا سنتا تھا کہ نواب صاحب نے خدمت گار کو حکم دیا۔ ان کو ایک شالی رومال اور پچاس اشرفیاں آج ہی دینا۔ ہاتھی کے لیے پیل کا لفظ خوب لائے! سبحان اللہ۔

اس پر مصاحبوں نے نواب صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔

1۔ سبحان اللہ، واہ میرے شہزادے! کیوں نہ ہو۔

2۔ خدا آپ کو ایک ہزار برس کی عمر دے۔ حاتم کا نام منادیا۔ ریاست اسے کہتے

ہیں۔

نواب: اچھا، اب سب حیار ہو اور کچار کی طرف ہاتھی لے چلیں۔

معشوق: ارے لوگوں، یہ کیا اندھیر ہے۔ آخر اتوں میں کسی کے جوڑو جانتا بھی ہے یا سب نہنگ لاڈلے، بے فکرے، اٹھاؤں، چولہے ہی جمع ہیں۔ خدا کے لیے ان کو سمجھاؤ۔ اتنی سی جان، گولی لگی اور آدمی میں سے رہ گیا۔ آدمی میں ہیں کیا! اللہ کرے، شیر نہ ملے۔ موئی بنی سے تو ڈر لگتا ہے۔ شیر کی صورت کیونکر دیکھوں گی۔ بھلا اتنا بتاؤ کہ بندھا ہوگا یا کھلا۔ تماشے میں ہم نے شیر دیکھے تھے، مگر سب کٹ گھروں میں بند تھے۔

ایک ایک دو پاسیوں نے آکر کہا کہ شیرنی کچار سے چلی گئی۔ نواب صاحب نے وہیں ڈیرا ڈال دیا اور معشوق حسین کے ساتھ اندر آ بیٹھے۔

نواب: یہ بات بھی یاد رہے گی کہ ایک بیگم صاحب بہادری کے ساتھ شیر کا شکار کھیلنے کو گئیں۔

معشوق: اے واہ! جو شریف زادی سنے گی، اپنے دل میں یہی کہے گی کی لڑکی اور اتنی ڈھیٹ۔ بھلے مانس کی بہو بنی ہے کہ جنگل کے کتنے کا نام سننے ہی بدن کے روئیں کھڑے ہو جائیں۔ اکیلے کمرے میں بنی آئے تو تھر تھر کاپنے لگے۔ خواب میں بھی رتی دیکھے تو چونک پڑے۔ اچھی مٹی پڑھاتے ہو!

دوسرے دن نواب صاحب نے شکاری لباس پہنا۔ خیمے سے نکلے۔ معشوق حسین بھی پیچھے سے نکلے، مگر اس وقت بیگموں کی پوشاک میں تھے اور بیگم بھی کون؟ وہی رٹیا، جو س

پالین بنی ہوئی پادری صاحب کے ساتھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا، کوئی پری پر کھولے چلی آتی ہے۔ نواب صاحب نے کہا۔

آغاز عشق ہی میں ہمیں موت آگئی

آگاہ بھی نہ حال سے وہ بے خبر ہوا

شریٹا بیگم نے تھک کے کہا۔ بس، یہ منحوس باتیں ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ مرنے جینے کا کون ذکر ہے،

نواب: سنیے حضور! جو آپ آنکھیں دیکھائیں گی تو ہم بھی مجڑ جائیں گے۔ اتنا یاد رکھیے۔

شریٹا: خدا کے لیے ذرا حیا سے کام لو۔ ان سب کے سامنے ہمیں رسوا نہ کرو۔ وہ شریف زادی کیا، جو شرم سے منہ موڑے۔ اتنے آدمی کھڑے ہیں اور تم کچھ خیال ہی نہیں۔

خدا کا قہر بتوں کا عتاب رہتا ہے

اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

شریٹا: بس، ہم نہ جائیں گے۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔

نواب صاحب نے قدموں پر ٹوپی رکھ دی، اور کہا۔ مار ڈالو، مگر ساتھ چلو، ورنہ گھٹ گھٹ کے جان جائے گی۔

بارے خدا خدا کر کے بیگم صاحبہ اٹھیں۔ اتنے میں چوکیدار نے آکر کہا۔ خداوند، دو شیر جنگل میں دیکھائی دیے ہیں۔ اب بھی موقع ہے، ورنہ شیرنی کی طرح وہ بھی بھاگ جائیں گے اور پھر شکار نہ ملے گا۔

بیگم: آدمی کیسے موئے جان کے دشمن ہیں!

نواب صاحب نے حکم دیا کہ ہاتھی بیٹھاؤ۔ چل وان نے بری بری کہہ کر ہاتھی کو بیٹھایا۔ تب زینہ لگایا گیا۔ بیگم صاحب نے زینے پر قدم رکھا، مگر جھجک کر اتر گئیں۔

نواب: پہلی بار تو بے جھجک بیٹھ گئیں تھیں، اب کی ڈرتی ہو۔

بیگم: اے لو، اس بار کہا تھا کہ مرغابی کا شکار ہوگا۔

نواب: شیر کا شکار آسان ہے، مرغابی کا شکار مشکل ہے۔

بیگم: چلیے، رہنے دیجیے۔ ہم نے کئی گولیاں نہیں کھلی ہیں۔ یہاں روح کانپ رہی

ہے کہ یا خدا، کیا ہوگا؟

نواب: ہوگا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔

آخر بیگم صاحب بھی بیٹھیں۔ نواب صاحب بھی بیٹھے۔ ہوالی ہوالی بھی دوسرے ہاتھیوں پر بیٹھے اور ہاتھی جھومتے ہوئے چلے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگ ایک جمیل کے پاس پہنچے۔ شکاری نے کہا۔ جمیل میں پانی کم ہے ہاتھی نکل جائیں گے۔

بیگم: کیا کہا! کیا اس سمندر میں سے جانا ہوگا؟

نواب: ابھی دم کے دم میں نکل جاتے ہیں۔

بیگم: کہیں لکھ نہ؟ ہمیں یہاں ڈبوئے لائے ہو؟ ذرا ہاتھی کا پاؤں پھسلا اور چلیے، پانی کے اندر غوطے کھانے لگے۔

نواب صاحب نے بہت سمجھایا، تب بیگم صاحب اپنے ہاتھی کو جمیل کے اندر ڈالنے پر راضی ہوئیں۔ مگر آنکھیں بند کر لیں اور غل مچایا کہ جلدی نکل چلو۔ پانچ ہاتھی تو ساتھ ساتھ چلے، دو پیچھے تھے۔ نواب صاحب نے کہا۔ اب آنکھیں کھول دو، آدمی دور چلے آئے ہیں، آدمی دور چلے آئے ہیں، آدمی دور اور باقی ہے۔ بیگم نے آنکھیں کھولیں تو جمیل کے کیفیت دیکھ کر کھل اٹھیں۔ کناروں پر اونچے اونچے درخت جھوم رہے تھے۔ کوئی جمیل کے پانی کو چومتا تھا، کسی کی شاخیں جمیل کی طرف جھکی تھیں۔ بیگم نے کہا۔ اب ہمیں ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اللہ کرے، کوئی شیر آج نہ ملے۔

نواب: خدا نہ کرے۔

بیگم: واہ! آجائے کیا مجال ہے۔ ہم منتر پڑھ دیں گے۔

نواب: بھلا آپ اتنی ہوئیں تو۔

بیگم: اجی، میں تم سب کو بتاتی ہوں، ڈر کیسا! مگر کہیں شیر چمچ نکل آئے، تو غضب ہی ہو جائے۔ سنتے ہی روئیں کھڑے ہوتے ہیں۔

اس جمیل کے اس پار کچھار تھا اور کچھار میں ایک شیرنی اپنے بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔ کھیدے کے آدمیوں نے کہا۔ حضور، اب ہاتھی روک لیے جائیں۔ شریا بیگم کانپ اٹھیں۔ ہائے! یہ کیا ہوا۔ یہ شیرنی کہاں سے نکل آئی۔ یا تو اس کو قضا لائی یا ہم کو۔

نواب صاحب نے حکم دیا، کھیدا کیا جائے۔ تیس آدمی بڑے بڑے کتے لے کر کچھار کی

طرف دوڑے۔ ثریا بیگم بہت سہی ہوئی تھیں۔ پھر شکار میں ایک قسم کا لطف بھی آتا تھا۔ ایک ایک دور سے روشنی دیکھائی دی۔ بیگم نے پوچھا۔ وہ روشنی کیسی ہے؟ نواب بولے۔ شیرنی نکل ہوگی اور شاید حملہ کیا ہو۔ اسی لیے روشنی کی گئی کہ ڈر سے بھاگ جائے۔

شیرنی نے جب آدمیوں کی آواز سنی، تو گھبرائی۔ بچوں کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں آدمی کا گزر محال تھا۔ کھیدے کے لوگ سمجھے کہ شیرنی بھاگ گئی۔ ثریا بیگم یہ خبر سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ لو، اب کیلو شکار، بڑے وہ بن کر چلے تھے! ہماری دعا اور قبول نہ ہو؟

نواب: آج بے شکار کیے نہ جائیں گے۔ لو، قسم کھائی۔

نواب صاحب رئیس تو تھے ہی، قسم کھا بیٹھے۔ ایک مصاحب نے کہا۔ حضور، ممکن ہے کہ شیر آج نہ ملے۔ قسم کھانا ٹھیک نہیں ہے۔

نواب: ہم ہرگز کھانا نہ کھائیں گے جب تک شیر کا شکار نہ کریں گے۔ اس میں چاہے رات ہو جائے، شیر کا جنگل میں نہ ملنا کیسا! بیگم: خدا تمہاری بات رکھ لے۔

مصاحب: جیسی حضور کی مرضی۔

بیگم: خدا کے لیے اب بھی چلے چلو۔ کیا تم پر کوئی جن سوار ہے یا کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اب دن کتنا باقی ہے؟

نواب: دن کتنا ہی ہو، ہم شکار ضرور کریں گے۔

بیگم: تمہیں بائیں ہاتھ کا کھانا حرام ہے جو شیر کا شکار کھیلے بغیر جاؤ۔

نواب: منظور! جب تک شیر کا شکار نہ کریں گے، کھانا نہ کھائیں گے۔

بیگم: بات تو یہی ہے، خدا تمہاری بات رکھ لے۔ اُو لوگوں، کوئی ان کو سمجھاؤ، یہ کسی کا کہنا نہیں مانتے، کوئی صلاح دینے والا بھی ہے یا نہیں؟

ایک مصاحب: حضور نے تو قسم کھالی، لیکن ساتھ کے سب آدمی بھوکے پیاسے ہیں، ان کے حال پر رحم کیجیے، ورنہ سب ہلاک ہو جائیں گے۔

نواب: ہم کو کسی کا غم نہیں ہے، کچھ پرواہ نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ ہمارے ساتھی ہیں تو ہمارا حکم ملے۔

بیگم: شام ہونے آئی، اور شکار کا کہیں پتہ نہیں، پھر اب یہاں ٹھہرنا بے وقوفی ہے یا

اور کچھ؟

برکت: حضور ہی کے سب کانٹے بوئے ہیں۔

اتنے میں کھیدے والوں نے کہا۔ خداوند اب ہوشیار رہے۔ شیرنی آتی ہے۔ اب دیر نہیں ہے۔ کچھار چھوڑ کر پورب کی طرف بھاگی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر اس زور سے گرجی کہ ہوش اڑ گئے، اٹھائیس آدمی ساتھ تھے، اٹھائیسوں بھاگ گئے۔ اس وقت قدم بھانا محال تھا۔ شیر کا قاعدہ ہے کہ جب گولی لگتی ہے تو آگ ہو جاتا۔ پھر گولی کے باپ کو نہیں بانٹا۔ اگر ہم کا گولہ بھی ہو تو وہ اس طرح آئے گا جیسے توپ کا گولہ آتا ہے۔ اور شیرنی کا قاعدہ ہے کہ اگر اپنے بچوں کے پاس ہو اور ساری دنیا کے گولے کوئی لے کر آئے تو بھی ممکن نہیں کہ اس کے بچوں پر آج آ سکے۔

بنیم: بندھی ہے یا کھلی ہوئی ہے؟ تماشے والے شیروں کی طرح کٹ گھرے میں بند ہے نا،

مصاحب: ہاں ہاں، صاحب، بندھی ہوئی ہے۔

بنیم: بھلا اس کو باندھا کس نے ہوگا؟

اب ایک دل لگی سیے۔ ایک ہاتھی پر دو بنگالی تھے۔ انھوں نے اتنا ہی سنا تھا کہ نواب صاحب شکار کے لیے جاتے ہیں۔ اگر معلوم ہوتا کہ شیر کے شکار کو جاتے ہیں تو بکروڑ برس نہ آتے۔ سمجھتے تھے کہ جھیلوں میں چڑیوں کا شکار ہوگا۔ جب یہاں آئے اور سنا کہ شیر کا شکار ہے تو جان نکل گئی۔ ایک کا نام کالی چرن گھوش، دوسرے کا شیودیو بوس تھا۔ ان دونوں میں یوں باتیں ہونے لگیں۔

بوس: نواب ہم کو بڑا دھوکا دیا۔ ہم نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ ہمارا دشمن ہے۔

گھوش: ہم ان سے سمجھے گا۔ او شالا فیل بان، ہمارے کو کدھر لے جائے گا۔

فیل وان نے ہاتھی کو اور بھی تیز کیا تو دونوں صاحب چلائے۔

بوس: او شالا!

گھوش: او شالا فیل کا وان، اچھا ہم شاحب کے یہاں تمھارا ناش کرے گا۔ ارے بابا،

ہم لوگ جانے نہیں مانگتا۔ شیر شالا کا مقابلہ کون کرنے سکتا؟

فیل وان: بابو جی، ڈرو نہیں۔ ابھی تو شیر دور ہے۔ جب ہودا پکڑ لے گا تب دل لگی

ہوگی، ابھی شالا شالا کہتے جاؤ۔

بوس : ارے بھائی، تم ہمارے کا باپ، ہمارے باپ کا باپ، ہم ہاتھی کو پھیرنے مانتے۔
او شالا، تم آرام زادہ۔

فیل وان : اچھا بابو، دیتے جاؤ گالیاں۔ خدا کی قسم، شیر کے منہ میں ہاتھی نہ لے جاؤں
تو پاجی۔

بوس : باپ رے باپ، ہمارے کو بچاؤ۔ ہم رشوت دے گا۔ ہمارا باپ ہے، ماں ہے،
سب تم ہے۔

جتنے آدمی ساتھ تھے، سب ہنس رہے تھے۔ ان دونوں کی گھبراہٹ دیکھنے قابل تھی۔ کبھی
فیل وان کے ہاتھ جوڑتے، ٹوپی اتار کر خدا سے دعا مانتے تھے، کبھی جنگل کی طرف دیکھ کر
کہتے تھے۔ بابا، ہمارا جان لینے کو ہم یہاں آیا۔ ہمارا موت ہم کو یہاں لایا۔ ارے بابا، ہم
لوگ لکھنے پڑھنے میں اچھا ہوتا ہے۔ ہم لوگ ولایت جا کر انگریزی سیکھتا ہے۔ ہم کبھی شیر کا
شکار نہیں کرتا، ہمارا اپنا جان سے بیر نہیں ہے۔ او فیل کا بان، ہم خبر کے کاغذ میں تمہارا
تعریف چھاپے گا۔

فیل وان : آپ اپنی تعریف رہنے دیں۔

گھوش : نہیں، تمہارا نام ہو جائے گا۔ بڑا بڑا لوگ تمہارا نام پڑھے گا تو بولے گا، یہ فیل
کا بان بڑا ہوشیار ہے، تم پچاس ساٹھ کا نوکر ہو جائے گا۔ ہم تم کو نوکر رکھا دے گا۔
فیل وان : پچاس ساٹھ! اتنے روپے میں کہاں رکھوں گا کہاں؟ اچھا دوسری شادی کر
لوں گا، مگر تعریف کس بات کی لکھیے گا۔ ذرا ہاتھی دوڑاؤں؟

بوس : تم بڑا نکٹھ ہو۔ او شالا، تم پھر دوڑا لیا؟

جب جمیل کے قریب پہنچے، تو دونوں بنگالی اور بھی، ڈرے۔ گھوس نے پوچھا۔ او فیل کا
بان، اس جمیل میں کتنا گہرا؟

فیل وان نے کہا۔ ہاتھی ڈوباؤ ہے۔

گھوش : اور اس جمیل کے اندر سے ہم لوگ کو جانے ہوگا بھی۔

فیل وان : جی ہاں، اسی میں سے جانے ہوگا بھی۔

گھوش : اور جو ہاتھی کا پاؤں پھسل گئی تو ہم لوگ کا کیا۔

فیل وان : اگر ہاتھی کا پاؤں پھسل گئی تو تم لوگ کا ٹانگ اور ناک ٹوٹ جائے گا۔ بس اور کچھ نہ ہوگا، اور منہ بگڑ جائے گی تم لوگ کی۔

گھوش : اور تم شالا کہاں سے بچنے سکے گا؟

فیل وان : ہم مر بھر ہاتھی پر چڑھا کیے ہیں۔ ہاتھی پھسلے تو ڈر نہیں اور بہہ جائے تو خوف نہیں۔

گھوش : بابا، تمہاری ہاتھی پانی سے ڈرتی ہے یا نہیں؟ ہم سے شاج شاج کہہ دو۔

فیل وان : تم اتنا ڈرتا تھا تو آیا کیوں؟

گھوش : ارے بابا، گولی لگنے سے تو سب کوئی ڈرتا ہے۔ جان پھیر کے آنے سکے گا نہیں۔

فیل وان نے ہاتھی کو جمیل میں ڈالا، تو ان دونوں نے وہ چل پوں چائی کہ کچھ نہ پوچھو۔ ایک بولا۔ ہم ڈوب گیا، تو ہمارا جاگیر کس کے پاس جائے گا۔

فیل وان مسکرا کر بولا۔ وہیں سے سب لکھ کے بھیج دیجیے گا۔

گھوش : او شالا، تم ہمارا جان لے گا! تم جان لے گا شالا!

فیل وان : بابو، گول مال نہ کرو، خدا کو یاد کرو۔

گھوش : ہاتھی ہلے گی، ہم تم کو ڈھکیل دے گا، تم مر جائے گا۔

گھوش : ارے بابا، گھوس لے لے، ہم بہت سے روپے دینے سکتا۔

فیل وان : اچھا، ایک ہزار روپیہ دیجیے تو ہم ہاتھی کو پھیر دیں۔ پھلے آدی، اتنا نہیں

شوچتے کہ پانچ ہاتھی تو اس پار نکل گئے اور ایک ہاتھی پیچھے آ رہا ہے۔ کسی کا بال بالٹا نہیں ہوا تو کیا آپ ہی ڈوب جائے گے؟ کیا جان آپ ہی کو پیاری ہے،

گھوش : ارے بابا، تم بات نہ کرے۔ تم ہاتھی کا دھیان کرے، جو پاؤں پھسلے گی تو بڑی غضب ہو جائے گا۔

فیل وان : اجی، نہ پاؤں پھسلے گی، نہ بڑی غضب ہوگا۔ بس چپ چاپ بیٹھے رہیے۔

بولیے، چالیے نہیں۔

گھوش : کس مافق نہیں بولے گا، ضرور کر کے بولے گا۔ او شالا! تمہارا باپ آج ہی مر

جائے۔

فیل وان : ہمارا باپ تو کب کا مر چکا، اب تمہاری مانی مرنے کی باری ہے۔
 فیل وان نے مارے شرارت کے ہاتھی کو دو تین بار آٹکس لگایا، تو دونوں آدی سمجھے کہ
 بس، اب جان گئی۔ آپس میں ہاتھی کرنے لگے۔

گھوش : آدی دوئی جانی ڈوپی جاہو۔

پوس : ای، ہاتھی بالا بڑو بورو۔

گھوش : جونی آئے بچی آج، جیکھے دلی کورا آم آر شکار کھیلنے جاوے نا۔

پوس : جمنی امائے جاہر دتی ہے انچھو۔

گھوش : ہمارا پران بھوائے آپے۔

گھوش : ہاتھی روک لے او شالا۔

فیل وان : بابو جی، اب ہاتھی ہمارے مان کا نہیں۔ اب اس کا پاؤں پھسلا چاہتا ہے،
 ذرا سنبھلے رہیے گا۔

نواب صاحب نے ان دونوں آدمیوں کا رونا چننا سنا تو مہاوت سے بولے۔ خبردار
 جو ان کو ڈرائے گا تو جانے گا۔

گھوش : نواب شاب، ہمارا مدد کرو، اب ہم جاتا ہے بیکٹھ۔

مہاوت نے آہستہ سے کہا۔ بیکٹھ جا چکے، زک میں جاؤ گے۔

اس پر گھوش بابو بہت مجڑے اور گالیاں دینے لگے۔ تم شالا کو پانی کے باہر جا کے ہم
 مار ڈالے گا۔

مہاوت نے کہا۔ جو پانی کے باہر جا سکو نا۔

گھوش : نواب شاب، یہ شالا ہمارے کو گالی دیتا۔

نواب : گالی کیسی بابو، آپ اتنا گھبراتے کیوں ہیں؟

گھوش : ہمارے کو یہ شالا گالی دیتے ہیں۔

نواب : کیوں بے، خبردار جو گالی گوج کی۔

فیل وان : حضور، میں ایسی سواری سے درگزرا، ان کو چاروں طرف موت ہی موت نظر
 آتی ہے۔ انھیں آپ شکار میں کیوں لائے ہیں؟

پوس : ارے شالے کا شالا، تم بات کرے گا، یا ہاتھی کو دیکھے گا، ارے بابا، اب ہم ایسی

سواری پر نہ آئے گا۔

بارے ہاتھی اس پار پہنچا، تو ان دونوں کی جان میں جان آئی۔ بوس بابو بولے۔
نواب شاب، ہم اس کا ساتھ بڑا تکلیف پایا۔ یہ مہادت ہمارا اس جنم کا میری ہے بابا، ہم ایسا
شکار نہیں کیلنا چاہتا۔ اب ہم ہاتھی پر سے اتر جائے گا۔

نواب صاحب نے فیل دان کو حکم دیا کہ ہاتھی کو بیٹھاؤ اور بابو لوگوں سے کہا۔ اگر
آپ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے تو اتر جایئے۔ اس پر گھوش اور بوس دونوں سر پٹنے لگے۔
ارے بابا، اس جنگل کے چمچ میں تم ہم کو چھوڑ کر بھاگنا مانگتا۔ ہم جائے گا کہاں؟ ادھر جنگل
ادھر جنگل۔ ہمارے کو گھر پہنچا دو۔

نواب صاحب نے کہا۔ اگر ایک ہاتھی کو اکیلا بھیج دوں تو شاید شیر یا سور یا کوئی جانور
حملہ کر بیٹھے، ہاتھی کا ہاتھی زخمی ہو جائے تو مہادت کی جان پر آئے۔ آپ لوگ گولی چلانے
سے رہے، پھر کیا ہو؟

گھوش: آپ کو اپنا ہاتھی پیارا، فیل کا بان پیارا، ہمارا جان پیارا نہیں۔ فیل کا بان سات
آٹھ روپے کا نوکر، ہم لوگ ہیڈ کلر کی کرتا اور کیا بات کرے گا۔ ہم جان نہیں رکھتا، وہ جان
رکھتا ہے؟

نواب: اچھا، پھر بیٹھے رہو، مگر ڈرو نہیں۔

گھوش: اچھا، اب نہ بولے گا۔

بوس: کیسے نہ بولے گا، تم نہ بولے گا؟ تم نہ بولے گا تو ہم بولے گا۔

گھوش: تم شالا سور ہے۔ تم کیا بولے گا؟ بولے گا تو ہم تم کو قتل کر ڈالے گا۔ شالا
ہمارے کو پھانس کے لایا اور اب جان لینا مانگتا ہے۔

بوس: (دھوتی سنہال کر) تم دوشٹ چپ رہے۔ تم بچ قوم ہے۔

گھوش: بولے گا تو ہم حلال کرے گا۔

بوس: (دانت دکھا کر) ہم تم کو دانت کاٹ لے گا۔

گھوش: ارے تم کبے جائے شالا، بود ذات، دوشٹ۔

بوس: تم بچ قوم، چھوٹا قوم، بھیک مانگنے والا سور۔

دونوں میں خوب ٹھکرار ہوئی۔ کبھی گھوش نے گھونسا تانا، کبھی بوس نے پیٹیرا بدلا، مگر

دونوں میں کوئی وار نہ کرتا تھا۔ دونوں کندے تول تول کر رہ جاتے تھے۔ نواب صاحب نے یہ حال دیکھا تو چاہا کہ دونوں کو الگ الگ ہاتھیوں پر بیٹھائیں، مگر گھوٹ نے منظور نہ کیا، بولے۔ یہ ہمارے دلش کا، ہم اس کے دلش کا، اور کوئی ہمارا دلش کا نہیں۔

اتنے میں آدمیوں نے لٹکار کر کہا۔ خبر دار، شیرنی نکل جاتی ہے۔ حکم ہوا کہ ہاتھی اس طرف بڑھاؤ۔ سب ہاتھی بڑھائے گئے۔ ایک درخت کی آڑ میں شیرنی دو بچے لیے ہوئے دہکی کھڑی تھی۔ نواب صاحب نے فوراً گولی سرکی، وہ خالی گئی۔ نواب نے پھر بندوق سرکی، اب کی گولی شیرنی کے کٹے پر جا پڑی۔ گولی کھانا تھا کہ وہ جھلا کر پلٹ پڑی اور توپ کے گولے کی طرح جھٹی۔ آتے ہی اس نے ایک ہاتھی کو تھپڑ لگایا تو وہ چنگھاڑ کر بھاگا۔ نواب صاحب نے پھر بندوق چلائی، مگر نشانہ خالی گیا۔ شیرنی اسی ہاتھی کو جسے تھپڑ مارا تھا، کان پکڑ کر بیٹھا دیا۔ بارے چوتھا نشانہ ایسا پڑا کہ شیرنی تڑپ کر گر پڑی۔

ادھر تو یہ کیفیت ہو رہی تھی، ادھر دونوں بنگالی بابو ہودے کے اندر اوندھے پڑے تھے۔ آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کر لی تھیں۔ بیگم صاحب نے انھیں حودے میں بیٹھے نہ دیکھا تو پوچھا۔ کیا وہ دونوں بابو بھاگ گئے؟

فل وان: نہیں خداوند، میں ہاتھی بڑھائے لاتا ہوں۔
ہاتھی قریب آیا تو نواب صاحب دونوں بنگالیوں کو دیکھ کر اتنا منے کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

نواب: اب اٹھو گے بھی یا سوتے ہی رہو گے؟ بابو جی تو بولتے ہی نہیں۔
بیگم: کیا اچھے آدمی تھے بے چارے!
نواب: مگر چلے جے۔ ابھی باتیں کر رہے تھے۔
بیگم: اب کچھ کفن دفن کی فکر کرو گے یا نہیں۔

فل وان نے کندھا پکڑ کر ہلایا تو بوس بابو اٹھے۔ اٹھتے ہی شیرنی کی لاش دیکھی، تو کانپ کر بولے۔ نواب شاب، شاج شاج بولو کہ یہ مٹی کا شیر ہے یا ٹھیک ٹھیک شیر ہے؟
ہم سمجھ گیا کہ مٹی کا ہے۔

نواب: آپ تو ہیں پاگل۔
گھوٹ: آپ لوگ جان کو کچھ نہیں سمجھتے؟

بوس : یہ لوگ گنوار ہیں۔ ہم لوگ ایم۔ اے۔ لی۔ اے۔ پاس کرتا ہے۔ ہم لوگ بہت
 سابات ایسا کرتا ہے کہ آپ لوگ نہیں کرنے سکتا۔
 نواب : اچھا، اب ہاتھی سے تو اترو۔
 فیل وان : ہابو صاحب، شیرنی تو مرگئی، اب کیا ڈر ہے۔
 دونوں ہابوؤں نے ہاتھی سے اتار کر شیرنی کی طرف دیکھنا شروع کیا، مگر آگے کوئی نہیں
 بڑھتا۔

بوس : آگے بڑھو مہاشائی۔
 مکھوش : تمہیں بڑھو، تم بڑا مرد ہے تو تم بڑھے۔
 نواب : بڑھنا نہیں۔ خبردار، بڑھے اور شیر کھا گیا۔
 مکھوش : بابا، اب چاہے جان جاتا رہے، پر ہم اس کے پاس ضرور کر کے جائے گا۔
 یہ کہہ کر آپ آگے بڑھے، مگر پھر اٹلے پاؤں بھاگے اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

(91)

جب رات کو سب لوگ کھاپی کر لیئے، تو نواب صاحب نے، دونوں بنگالیوں کو بلایا اور
 بولے۔ خدا نے آپ دونوں صاحبوں کو بہت بچایا، ورنہ شیرنی کھا جاتی۔
 بوس : ہم ڈرتا نہیں تھا، ہم شالا ایش فیل کا بان کو مارنا چاہتا تھا کہ ہم ایش دیش کا
 آدمی نہیں ہے۔ اس مافق ہمارے کو ڈرانے سکتا اور ہاتھی کو بود جاتی سے ہلانے مانگے۔ جب تو
 ہم لوگ بڑا غصہ ہوا کہ ارے سب لوگوں کا ہاتھی ہٹے نہیں مانگتا۔ تم کیوں ہٹنے مانگتا ہے اور
 ہم سے بولا کہ ہابو شاب، اب تو مرے گا۔ ہاتھی کا پاؤں پھسلے گی اور تم مرجائیں گے۔ ہم
 بولا۔ ارے، جو ہاتھی کی پاؤں پھسل جائے گی تو تم شالے کا شالا کہاں بچ جائے گا؟ تم بھی تو
 ہمارا ایک ساتھ مرے گا۔

نواب : اچھا، جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب یہ بتلائیے کہ کل شکار کھیلنے جائے گا یا نہیں؟
 بوس : جائے گا تو ضرور کر کے، مگر فیل کا بان بود جاتی کرے گا، تو ہم آپ کا برائی
 چھپوا دے گا۔ ہمارے ہاتھی پر بیگم شاب بیٹھے تو ہم چلا جائے گا۔
 شریا : بیگم صاحب تو تجھ ایسوں کو اپنا سایہ تک نہ چھونے دیں۔ پہلے منہ تو بنوا!

یوس : اب ہمارے کو ڈر پاس نہیں آتے، ہم خوب سمجھ گیا کہ جان جانے والا نہیں ہے۔

نواب : اچھا جائیے، کل آئیے گا۔

جب نواب اور ثریا اکیلے رہ گئے تو نواب نے کہا۔ دیکھو ثریا بیگم، اس زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ شہزادہ ہمایوں فرار کے نکاح کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور آج ان کی قبر بن رہی ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ زندگی کے دن بلی خوشی سے کاٹ دے۔ یہاں تو صرف یہی خواہش ہے کہ ہم ہوں اور تم ہو۔ مجھے کسی سے مطلب نہ سروکار۔ اگر تم ساتھ رہو تو خدا گواہ ہے، بادشاہی کی حقیقت کو نہ سمجھوں۔ اگر یقین نہ آئے تو آزما لو۔

بیگم : آپ صاف صاف اپنا خفا بتائیے۔ میں آپ کی بات کچھ نہیں سمجھی۔

نواب : صاف صاف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

بیگم : نہیں یہ کیا بات ہے، آپ کہیں تو۔

نواب : (دلی زبان سے) نکاح!

بیگم : سنیے، مجھے نکاح میں کوئی عذر نہیں۔ آپ ازل تو کم سن، دوسرے رئیس زادے، تیسرے خواہصورت، پھر مجھے نکاح میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ عرض کروں گی کہ کس سبب سے مجھے منظور نہیں۔

نواب : ہائے، ہائے! تم نے یہ کیا ستم ڈھایا؟

بیگم : میں مجبور ہوں اس کی وجہ پھر بیان کروں گی۔

نواب : اگر منظور نہیں تو ہمیں قتل کر ڈالو۔ بس چمٹی ہوئی۔ اب زندگی اور موت

تمہارے ہاتھ ہے۔

دوسرے دن نواب صاحب سو ہی رہے تھے کہ خدمت گار نے آکر کہا۔ حضور، اور سب

لوگ بڑی دیر سے تیار ہیں، دیر ہو رہی ہے۔

نواب صاحب نے شکاری لباس پہنا اور ثریا بیگم کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو چلے۔

بیگم : وہ بابو آج کہاں ہیں؟ مارے ڈر کے نہ آتے ہوں گے۔

یوس : ہم تو آج شہو سے ہی سات ساتھ ہے گا۔ اب ہمارے کو کچھ خوف لگتی نہیں۔

بیگم : تمہارے کو ہاتھی تو نہیں ملتی؟

گھوٹ : نہ، آج ہاتھی نہیں بلی۔ کل کا بات کل کے ساتھ گیا۔

ہاتھی چلے۔ تھوڑی دور جانے پر لوگوں نے اطلاع دی کہ شیر یہاں سے آدھ میل پر ہے اور بہت بڑا شیر ہے۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ ہاتھیوں کو دوڑا دو۔ بابوؤں کے فیل بان نے جو ہاتھی تیز کیا، تو بابو منہ کے بل زمین پر آ رہے۔

گھوٹ : ارے شالا، زمین پر گرا دیا۔

فیل بان : چپ چپ، غل نہ چاہیے، میں ہاتھی روکے لیتا ہوں۔

گھوٹ : غل نہ چاہیے تو پھر کیا چاہیے؟

فیل بان : وہ دیکھیے، بابو صاحب اٹھ بیٹھے، چوٹ نہیں آئی۔

گھوٹ : مہاشائی، لاگے نے تو؟

بوس : بڑے بود لوگ۔

گھوٹ : اپنا سا چار بولو۔

بوس : اپنا سا چار کی بول بو بابا!

مسٹر بوس جھاڑ پونچھ کر اٹھے اور مہاوت کو ہزاروں گالیاں دیں۔

بوس : مہاشائی، تم ایش کو مارو، مارو ایش دوشٹ کو۔

گھوٹ : او شالا، تمہارا شر پر بال نہیں، ہم پتے پکڑ کر تم کو مار ڈالنے مانگتا۔

فیل بان ہنس دیا۔ اس پر بوس آگ ہو گئے۔ اور کئی ڈھیلے چلائے، مگر کوئی ڈھیلا فیل

بان تک نہ پہنچا۔ فیل بان نے کہا۔ حضور، اب ہاتھی پر بیٹھ لیں، تو ہم نواب صاحب کے

ہاتھیوں سے ملا دیں۔ بوس بولے۔ ہم ڈرپوک آدمی نہیں ہیں۔ ہم مہاراجہ بڑودا کے یہاں قسم

قسم کا جانور دیکھ چکا ہے۔

گھوٹ : اب باتیں کب تک کرے گا۔ آکے بیٹھ جا۔

فیل بان : حضور، قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میرا قصور نہیں۔ آپ کبھی ہاتھی پر سوار

تو ہوئے نہیں۔ ہودے پر لٹک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھی جو ہلاتا تو آپ بھد سے گر پڑے۔

بوس : ہمارا دل میں آئی کہ تمہارا کان نوچ ڈالیں۔ ہم کبھی ہاتھی پر نہیں چڑھا۔ تم بولتا

ہے۔ تمہارا باپ کے سامنے ہم ہاتھی پر چڑھا تھا۔ تم کیا جانے گا۔

جب شیر تھوڑی دور پر رہ گیا اور نواب صاحب نے دیکھا کہ بابو والا ہاتھی نہیں ہے تو

ڈرے کہ نہ جانے ان بے چاروں کی کیا حالت ہوگی۔ حکم دیا کہ سب ہاتھی روک لیے جائیں اور دھرتی دھک کو دوڑا کر لے جاؤ۔ دیکھو، ان بے چاروں پر کیا حاوی آئی۔

دھرتی دھک روانہ ہوا اور کوئی دس بارہ منٹ میں بابو صاحبوں کا ہاتھی دور سے نظر آیا۔ جب ہاتھی قریب آیا تو نواب صاحب نے پوچھا۔ بابو صاحب، خیریت تو ہے؟ ہاتھی کہاں رہ گیا تھا؟ بابو صاحبوں نے کچھ جواب نہ دیا، مگر ٹیل بان بولا۔ حضور، یہ دونوں بابو لوگ آپس میں لڑتے تھے، اسی سے دیر ہو گئی۔

اب بوس بابو سے نہ رہا گیا۔ مجز کر بولے۔ او شالا، تم ہمارے منہ پر جھوٹ بولتا ہے۔ تم شالا بتا کہے ہاتھی کو دوڑا دیے، ہم تو غافل پڑا تھا۔

اتنے میں آدمیوں نے اطلاع دی کہ شیر سامنے کی جمیل کے کنارے لیٹا ہوا ہے۔ لوگ بندوقیں سنبال سنبال کر آگے بڑھے تو دیکھا، ایک ہینلا سور اونچی اونچی گھاس میں چھپا بیٹھا ہے۔ سب کی صلاح ہوئی کہ چاروں طرف سے خالی نشانے لگائے جائیں تاکہ گھبرا کر نکلے، مگر نواب صاحب کے دل میں ضمن گئی کہ ہم اس پتار میں ہاتھی ضرور لے جائیں گے۔ رٹیا بیگم اب نیک تو سیر دیکھتی تھیں، مگر پتار میں جانا بہت اکھرا۔ پولیس۔ نواب، تمہارے سر کی قسم، اب ہم نہ جائیں گے۔ پتار تلوار کی دھار سے بھی زیادہ حیر ہوتی ہے۔ ہمیں کسی اور ہاتھی پر بیٹھا دو۔

نواب نے دو شکاریوں کو اپنے ہاتھی پر بیٹھا لیا اور رٹیا بیگم کو دوسرے ہاتھی پر بیٹھا دیا گیا۔ ایک اور ہاتھی ان کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ تب نواب صاحب پتار میں پہنچے۔ جب سور نے دیکھا کہ دشمن چلا آرہا ہے تو اٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ نواب صاحب نے گولی چلائی۔ پھر اور شکاریوں نے بھی بندوقیں سرکیں۔ سور تڑپ کر جمیل کی طرف جھپٹا۔ اتنے میں تیسری گولی آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ اب کام تمام ہو گیا۔ نواب صاحب کو شوق چڑیا کہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کریں۔ ہاتھی نے اتر کر تلوار میان سے نکالی اور ساتھیوں کو جمیل کے کنارے سے ادھر ادھر ہٹا دیا کہ سور کبھے، سب چل دیے ہیں۔ جب سور نے دیکھا کہ میدان خالی ہے تو آہستہ آہستہ جمیل سے نکلا۔ نواب صاحب گھات میں تھے ہی، تاک کر ایسا ہاتھ دیا کہ ہینلا بول گیا۔ لوگوں نے چاروں طرف سے واہ۔ واہ کا شور مچانا شروع کیا۔

(1) حضور، یہ کرامات ہے۔

(2) سبحان اللہ، کیا ٹلا ہوا ہاتھ لگایا کہ بولا تک نہیں۔

(3) تلوار کے دھنی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایک ہی ہاتھ میں چورنگ کر دیا۔ کیا ہاتھ پڑا

ہے، واہ!

(4) دھوم پڑ گئی، دھوم پڑ گئی۔ کیا کمال ہے، ایک ہی بار میں ٹھنڈا ہو گیا!

نواب: ارے بھی، دیکھتے ہو۔ برسوں شکار کی نوبت نہیں آتی، مگر لڑکپن سے شکار کھیلا ہے۔ وہ بات کہاں جاسکتی ہے۔ ذرا کسی صورت سے بیگم صاحب کو یہاں لاتے اور ان کو دکھاتے کہ ہم نے کیسا شکار کیا ہے۔

بیگم صاحب کا ہاتھی آیا تو بیٹلے کو دیکھ کر ڈر گئی۔ اللہ جانتا ہے، تم لوگوں کو جان کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ اور جو پھر پڑتا تو کیسی ٹھرتی!

نواب: تعریف نہ کی، کتنی جواں مردی سے اکیلے آدمی نے شکار کیا۔ لاش تو دیکھو، کہاں سے کہاں تک ہیں!

ایک مصاحب: حضور نے وہ کام کیا جو ساری دنیا میں کسی سے نہیں ہو سکتا۔ دس پانچ آدمی ملا کر تو جسے چاہے مار لیں۔ مگر ایک آدمی کا تلوار لے کر بیٹلے سے بھیڑنا ذرا مشکل ہے۔ بیگم: اے ہے، تم اکیلے شکار کرنے گئے تھے۔ قسم خدا کی، بڑے ڈھیٹ ہو۔ میرے تو روئیں کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔

نواب: اب تو ہماری بہادری کا یقین آیا کہ اب بھی نہیں؟

یہاں سے پھر شکار کے لیے روانہ ہوئے۔ بیٹلے کا شکار تو گھاتے میں تھا۔ جمیل کے قریب پہنچے، تو ہاتھی زور زور سے زمین پر پاؤں پکٹنے لگا۔

فیل بان: شیر یہاں سے میں قدم پر ہے۔ بس یہی سمجھیے کہ اب نکلا، اب نکلا۔ کاشی سنگھ، ہاتھی پر آ جاؤ۔ دل رام سے بھی کہو، بہت آگے نہ بڑھو۔

کاشی سنگھ: ہنہ، سہر کے مٹی، ننلا دیکھے ڈر جائے، ہم کا راہ دیکھاوت ہیں۔ وہ سیر تو ہم سوا سیر۔

نواب: یہ اجڑپن اچھا نہیں۔ کاشی سنگھ، آ جاؤ۔ دلا رام، تم بھی کسی اور ہاتھی پر چلے جاؤ۔ مانو کہنا۔

دلارام : حضور، چار برس کی عمر سے ہاگھ مارتا چلا آوت ہو، کھا جائی، سر کھا جائے۔

یتیم : اے ہے، بڑے ڈھیٹ ہیں۔ نواب، تم اپنا ہاتھی سب ہاتھیوں کے بچ میں رکھو۔ ہمارے کیچے کی دھڑکن کو تو دیکھو۔

اب سینے کی اتفاق سے ایک شکاری نے شیر دیکھ لیا۔ ایک درخت کے نیچے چت سو رہا تھا۔ انھوں نے کسی سے نہ کچھ کہا، نہ سنا، بندوق داغ ہی تو دی۔ گولی پیٹھ پر پڑی۔ شیر آگ ہو گیا اور گرجتا ہوا لپکا، تو کھلبلی مچ گئی۔ آتے ہی کاشی سنگھ کو ایک تھپڑ دیا، دوسرا تھپڑ دینے ہی کو تھا کہ کاشی سنگھ سنبھلا اور تلوار لگائی۔ تلوار ہاتھ پر پڑی۔ تلوار کھاتے ہی ہاتھی کی طرف جھپٹا، اور نواب صاحب کے ہاتھی کے دونوں کان پکڑ لیے۔ ہاتھی نے ٹھوکر دی تو شیر 5-6 قدم پر گرلا۔ ادھر ہاتھی، ادھر شیر، دونوں گرے۔ بابو صاحبوں نے دوہائی دینی شروع کی۔

بوس : ارے، ہمارا نانی مر گیا۔ ارے بابا، ہم تو کال ہی سے روتا تھا کہ ہم نہیں جائے گا۔ گھوٹ : او بھائی، تم شیر کو روک لینا جلدی سے۔

بوس : ہم نیچے ہوتا تو ضرور کر کے روک لیتا۔ دو ہاتھی تو شیر کی گرج سن کر بھاگے، مگر بابو کا ہاتھی ڈٹا کھڑا تھا۔ اس پر بوس نے روک کر کہا۔ او شالا ہمارا ہاتھی، ارے تم کس مافق بھاگتا نہیں! تمہارا بھائی لوگ بھاگے جاتا ہے، تم کیوں کھڑا ہے؟

شیر نے جھپٹ کر نواب صاحب کے ہاتھی کے مستک پر ایک ہاتھ دیا تو گوشت کھینچ آیا۔ نواب صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک شکاری جو ان کے پیچھے بیٹھا تھا، نیچے گر پڑا۔ شیر نے پھر تھپڑ دیا۔ اتنے میں ایک چوکی دار نے گولی چلائی۔ گولی سر توڑ کر باہر نکل گئی اور شیر گر پڑا۔ مگر نواب صاحب ایسے بدحواس تھے کہ اب تک گولی نہ چلائی۔ لوگ سمجھے، شیر مر گیا۔ دو آدمی نزدیک گئے اور دیکھ کر بولے، حضور اب اس میں جان نہیں ہے، مر گیا۔ نواب صاحب ہاتھی سے اترنے ہی کو تھے کہ شیر گرج اٹھا اور ایک چوکیدار کو چھاپ بیٹھا۔ چاروں طرف ہول مچ گیا۔ کوئی بندوق چھتیاتا ہے، کوئی لٹکارتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ تلوار لے کر دس بارہ آدمی بچنے جاؤ، اب شیر نہیں اٹھ سکتا۔

نواب : کیا کوئی گولی نہیں لگا سکتا!

(1): حضور، شیر کے ساتھ آدمی کی بھی جان جائے گی۔

نواب: تم تو اپنی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اب وہ نشانے بازی کہاں گئی؟ لگاؤ گولی۔ گولی پیچہ کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ شکاری نے ایک اور گولی لگائی تو شیر کا کام تمام ہو گیا۔ مگر یہ گولی اس استادی سے چلائی تھی کہ چوکیدار پر آنچ نہ آنے پائی۔ سب لوگوں نے تعریف کی۔ شیر اوپر تھا اور چوکیدار نیچے۔ سات آدمی تلواریں لے کر جھپٹے اور شیر پر وار کرنے لگے۔ جب خوب یقین ہو گیا کہ شیر مر گیا تو لاش کو ہٹایا۔ دیکھا کہ چوکیدار مر رہا ہے۔

نواب: غضب ہو گیا یارو، ہاں! افسوس۔

بیگم: ہاتھی یہاں سے ہٹا لے چلو۔ کہتے تھے کہ شکار کو نہ چلو۔ تم نے میرا کہنا نہ مانا۔

نواب: فیل بان، ہاتھی بیٹھا دے، ہم اتریں گے۔

بیگم: اترنے کا نام بھی نہ لینا۔ ہم نہ جانے دیں گے۔

نواب: بیگم، تم تو ہم کو بالکل ڈرپوک ہی بنایا چاہتی ہو۔ ہمارا آدمی مر رہا ہے، مجھے دور سے تماشہ دیکھنا مناسب نہیں۔

بیگم نے نواب کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ اچھی بات ہے، جاییے، اب یا تو ہم تم دونوں گریں گے یا یہیں رہیں گے۔

نواب دل میں بہت خوش ہوئے کہ بیگم کو مجھ سے اتنی محبت ہے۔ آدمیوں سے کہا۔ ذرا دیکھو، اس میں کچھ جان باقی ہے۔ آدمیوں نے کہاں۔ حضور، اتنا بڑا شیر، اتنی دیر تک چھاپے بیٹھا رہا۔ بے چارا گھٹ گھٹ کے کبھی مر گیا ہوگا۔

بیگم: اب پھر تو کبھی شکار کو نہ آو گے۔ ایک آدمی کی جان مفت میں لی۔

نواب: ہم نے کیوں جان لی، جو ہمیں کو شیر مار ڈالتا۔

بیگم: کیا منحوس باتیں زبان سے نکالتے ہو، جب دیکھو، اپنے کو کوسا کرتے ہو۔

خیمہ بچھ کر نواب صاحب نے واپسی کی تیاریاں کیں اور راتوں راتوں گھر پہنچ گئے۔

(92)

آج تو قلم کی باجیس کھلی جاتیں ہیں۔ نوجوانوں کے مزاج کی طرح انکھیلیوں پر ہے۔ ریتا بیگم خوب کھر کے بیٹھی ہیں۔ لونڈیاں مہریاں بناؤ چناؤ کیے گھیرے کھڑی ہیں۔ کھر

میں جشن ہو رہا ہے۔ نہ جانے ثریا بیگم اتنی دولت کہاں سے لائیں۔ یہ غمٹا تو پہلے بھی نہیں تھا۔

مہری: اے بی سیدانی، آج تو مزاج ہی نہیں ملے۔ اس گلابی جوڑے پر اتنا اترا گئی۔
سیدانی: ہاں، کبھی بابا راج کا ہے کو پہنا تھا۔ آج پہلے پہل ملے۔ تم اپنے جوڑے کا حال تو کہو۔

مہری: تم تو بگڑنے لگیں۔ چلو، تمہیں سرکار یاد کرتی ہیں۔
سیدانی: جاؤ، کہہ دو، ہم نہیں آتے، آئی وہاں سے چودھرائن بن کے۔ اب گھورتی کیا ہو، جاؤ، کہہ دو نہ۔

مہری نے آکر ثریا بیگم سے کہا۔ حضور، وہ تو ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ میں نے اتنا کہا کہ سرکار نے یاد کیا ہے کہ مجھے سیکڑوں باتیں سنائی۔
ثریا بیگم نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو مہری کے پیچھے سیدانی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مہری پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

سیدانی: ہاں، ہاں کہو، اور کیا کہتی ہو۔ میں نے تمہیں گالیاں دیں، کوسا اور بھی کچھ!
ثریا بیگم کی ماں بیٹھی ہوئی شادی کا انتظام کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے ثریا بیگم کی بہن جعفری بیگم بھی بیٹھی تھیں۔ مگر یہ ماں اور بہن آئیں کہاں سے۔ ان دونوں کا تو کہیں پتا ہی نہ تھا۔ ماں تو کب کی مرچکی۔ بہنوں کا ذکر ہی نہیں سنا۔ مزایہ کہ ثریا بیگم کے ہاتھ جان بھی باہر بیٹھے شادی کا انتظام کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ماں، باپ، بہن کہاں سے نکل پڑے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ نواب و جاحت علی نے ثریا بیگم سے کہا۔ اگر یوں ہی نکاح پڑھوا لیا گیا تو ہمارے رشتہ دار لوگ تم کو حقیر سمجھیں گے کہ کسی بیسوا کو گھر ڈال لیا ہوگا۔ بہتر ہے کہ کسی بھلے آدمی کو تمہیں اپنی لڑکی بنانے پر راضی کر لیا جائے۔

ثریا بیگم کو یہ بات پسند آئی۔ دوسرے دن ثریا بیگم ایک سید کے مکان پر گئی۔ سید صاحب کو مفت کے روپے ملے، انہیں نواب صاحب کے سر بننے میں کیا انکار ہوتا۔ قسمت کھل گئی۔ پڑوسی حیرت میں تھے کہ یہ سید صاحب ابھی کل تک تو جوتیاں چٹکاتے پھرتے تھے۔ آج اتنا روپیہ کہاں سے آیا کہ ڈونیاں بھی ہیں، ناچ رنگ بھی، نوکر چاکر بھی اور سب کے سب نئے جوڑے پہنے ہوئے۔ ایک پڑوسی نے سید صاحب سے یوں بات چیت کی۔

پڑوسی: آج تو آپ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ مگر آپ چاہے آدمی بات نہ کریں، میں تو بھیڑ کے بولوں گا۔

گو نہیں بچتے ہرگز وہ مزاج

ہم تو کینے ہیں دعا کرتے ہیں

سید: حضرت، بڑے فکر میں ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ شادی جھنجھٹ سے خالی نہیں۔ خدا کرے، خیریت سے کام پورا ہو جائے۔

پڑوسی: جناب، خدا بڑا کارساز ہے۔ کہاں شادی ہو رہی ہے؟

سید: نواب وجاحت علی کے یہاں، یہی سامنے محل ہے، بڑی کوشش کی، جب میں نے منظور کیا۔ میرا تو مشا یہی تھا کہ کسی شریف اور غریب کے یہاں بیاہوں۔

پڑوسی: کیوں؟ غریب کے یہاں کیوں بیاہتے؟ آپ کا خاندان مشہور ہے۔ باقی رہا روپیہ۔ یہ ہاتھ کا میل ہے۔ مگر اب یہ فرمائیے کہ سب بندوبست کر لیا ہے نا، میں آپ کا پڑوسی ہوں، میرے لائق جو خدمت ہو اس کے لیے حاضر ہوں۔

سید: اسے حضرت، آپ کی مہربانی کافی ہے۔ آپ کی دعا اور خدا کی عنایت سے میں نے حیثیت کے موافق بندوبست کر لیا ہے۔

ادھر تو یہ باتیں ہوتی تھیں۔ ادھر نواب کے دوست بیٹھے آپس میں چہل کر رہے تھے۔

ایک دوست: حضرت، اس بارے میں تو آپ قسمت کے دشمنی ہیں۔

نواب: بھئی، خدا کی قسم، آپ نے بہت ٹھیک کہا، اور سید صاحب کو تو بالکل فقیر ہی سمجھیے۔ ان کی دعا میں تو ایسا اثر ہے کہ جس کے واسطے جو دعا مانگی، فوراً قبول ہو گئی۔

دوست: جیسی تو آپ جیسے عالی خاندان شریف زادے کے ساتھ لڑکی کا نکاح ہو رہا ہے۔ اس وقت شہر میں آپ کا ساریس اور کون ہے؟

میر صاحب: اجی، شہزادوں کے یہاں سے جو نہ نکلے وہ آپ کے یہاں ہے۔

لالا: اس میں کیا شک، لیکن یہاں ایک ایک شہزادہ ایسا پڑا ہے جس کے گھر میں دولت لوٹڑی بنی پھرتی ہے۔

میر صاحب: کچھ بیدھا ہو کے تو نہیں آیا ہے۔ بڑھ کر دوسرا کون رئیس ہے شہر میں، جس کے یہاں ہے یہ ساز سامان؟

لالا: تم خوشامد کرتے ہو اور بندہ صاف صاف کہتا ہے۔
 میر صاحب: جا، پہلے منہ بنا، چلا وہاں سے بڑا صاف گو بن کے۔
 دوست: ایسے آدمی کو تو کھڑے کھڑے لکھا دے، تمیز تو چھو ہی نہیں گئی۔ گو کھے پن
 کے سوا اور کوئی بات نہیں۔

نواب: بدتمیز آدمی ہے، شریفوں کی صحبت میں نہیں بیٹھا۔
 میر صاحب: بڑا کھرا بنا ہے، کھرا کا بچا۔
 نواب: اجی، سخت بدتمیز ہے۔
 گھر میں شریا بیگم کی بھولیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ فیروزہ بیگم نے چھیڑنا شروع کیا۔
 آج تو حضور کا دل اسٹکوں پر ہے۔

شری بیگم: بہن، چپ بھی رہو، کوئی بڑی بوڑھی آجائیں تو اپنے دل میں کیا کہیں، آج
 کے دن معاف کرو، پھر دل کھول کے ہنس لینا۔ مگر تم مانو گی کا ہے کو!
 فیروزہ: اللہ جانتا ہے، ایسا دولہا پایا ہے کہ جسے دیکھ کر بھوک پیاس بند ہو جائے۔
 اتنے میں ڈومنیوں نے یہ غزل گائی شروع کی۔

دل کسی طرح چھین پا جائے،
 غیر کی آئی ہم کو آ جائے۔
 دیدہ و دل ہیں کام کے دونوں،
 وقت پر جو مزہ دکھا جائے
 شیخ صاحب برائیاں سے کی
 اور جو کوئی چیت جما جائے
 جان تو کچھ گزر گئی اس پر،
 منہ چھپاکے جو کھستا جائے
 لاش اٹھے گی جیسی کہ ناز کے ساتھ،
 پھیر کر منہ وہ مسکرا جائے۔
 پھر نشان لہ رہے نہ رہے،
 آکے دشمن بھی خاک اڑا جائے۔

وہ ملیں گے گلے سے خلوت میں،

مجھ کو ڈر ہے حیا نہ آ جائے۔

فیروزہ بیگم نے یہ غزل سن کر کہا۔ کتنا پیارا گلا ہے۔ لیکن لے اچھا نہیں۔

شریٹا بیگم نے ڈومنیوں کو اشارہ کر دیا کہ یہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہیں۔ ذرا ان کی خبر لیتا۔ اس پر ایک ڈومنی بولی۔ اب حضور ہم لوگوں کو لے سکھا دیں۔

دوسری: یہ تو مجھے کو چلایا کریں تو کچھ پیدا کر لائیں۔

تیسری: بہن، ایسی کڑی نہ کہو۔

اتنے میں ایک عورت نے آکر کہا۔ حضور، کل بارات نہ آئے گی۔ کل کا دن اچھا نہیں۔

اب پرسوں بارات نکلے گی۔

(93)

شریٹا بیگم کے یہاں وہی دھما چکوڑی مچی تھی۔ پریوں کا جھرمٹ، حسینوں کا جم گھٹ آپس کی چہل اور ہنسی سے مکان گلزار بنا ہوا تھا۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ مہری نے آکر کہا۔ حضور، رام نگر سے اصغر میاں کی بی بی آئی ہیں۔ ابھی ابھی بھلی سے اتری ہیں۔ جانی بیگم نے پوچھا۔ اصغر میاں کون ہیں؟ کوئی دیہاتی بھائی ہیں؟ اس پر حشمت بہو نے کہا، بہن وہ کوئی ہوں۔ اب تو ہمارے مہمان ہیں۔ فیروزہ بیگم بولیں۔ ہاں ہاں، تیز سے بات کرو، مگر وہ جو آئی ہیں، ان کا نام کیا ہے؟ مہری نے آہستہ سے کہا۔ فیض۔ اس پر دو تین بیگموں نے ایک دوسرے کے طرف دیکھا۔

حشمت بہو: واہ، کیا پیارا نام ہے۔ فیض، کوئی میراثن ہے کیا؟

شریٹا بیگم: تم آج لڑواؤ گی۔ جانی بیگم کون سا اچھا نام ہے۔

فیروزہ: دیہات کے تو یہی نام ہیں، کوئی زینب ہے، کوئی زینت، کوئی فیض۔

شریٹا بیگم: فیض بڑی اچھی عورت ہے۔ نہ کسی کے لینے میں، نہ دینے میں۔

اتنے میں بی فیض تشریف لائیں اور مسکرا کر بولیں۔ مبارک ہو۔

یہاں جتنی بیگم بیٹھی تھیں سب منہ پھیر پھیر مسکرائیں۔ بی فیض کے پہنارے سے ہی

دیہاتی پن برستا تھا۔

فیض : بہن، آج ہی بارات آئے گی نا، کون کون رسم ہوئی؟ ہم تو پہلے ہی آتے، مگر ہمارے دیور کی طبیعت اچھی نہ تھی۔

فیروزہ : بہن، تمہارا نام کیا ہے؟
فیض : فیض۔

فیروزہ : اور تمہارے میاں کا نام؟

فیض : ہمارے یہاں میاں کا نام نہیں لیتے۔ تم اپنے میاں کا نام بتاؤ۔

فیروزہ بیگم نے تڑ سے کہا۔ اصغر میاں۔ اس پر وہ فرمائشی قہقہہ پڑا کہ دور تک آواز گئی۔ فیض دنگ ہو گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگیں کہ اس شہر کی عورتیں بڑی ڈھیٹ ہیں۔ میں ان سے پیش نہ پاؤں گی۔

حشمت بہو : تو اصغر میاں بی فیض کے میاں ہیں یا تمہارے میاں، پہلے اس کا فیصلہ ہو جائے۔

فیروزہ : اے ہے، اتنا بھی نہ سمجھیں، پہلے ان سے نکاح ہوا تھا، پھر ہم سے ہوا اور اب اصغر میاں کے دوکل ہیں۔ ایک تو یہ بیگم، دوسرے ہم۔

اس پر پھر قہقہہ پڑا، فیض کے رہے سبے حواس بھی غائب ہو گئے۔ اب اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ زبان کھول سکیں۔ جانی بیگم نے کہا۔ کیوں فیض، بہن، تمہارے یہاں کون کون رسمیں ہوتی ہیں؟ ہمارے یہاں تو دوہلا لڑکے کے گھر جا کر دیکھ آتا ہے، بس پھر بات طے ہو جاتی ہے۔

فیض : کیا یہاں میاں پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں؟ ہمارے یہاں تو نو برس بھی ایسا نہ ہو۔

فیروزہ : یہ نو برس کیا، کیا یہ بھی کوئی ٹوکا ہے؟ نو برس کی قید موئی کیسی!

فیض : بہن، ہم موئی ٹوٹی کیا جانیں۔

یہ سن کر ہجولیاں اور بھی ہنسی۔

فیروزہ : یہ مہری موئی ٹوٹی کہاں چلی گئی؟ ایک بھی موئی ٹوٹی دیکھائی نہیں دیتی۔

حشمت بہو : ہم کا معلوم ہے، مگر ہم نہ بتاؤں۔

فیروزہ : ارے موئی ٹوٹی پتکیاں کہاں غائب ہو گئی؟

حشمت بہو : جس موئی ٹوٹی کو گرمی معلوم ہو وہ ڈھونڈ لے۔

اتنے میں جلوس سجا اور دہن کے ہاتھ دولہا کے لیے سہرہ گیا۔ چاندی کی خوشنا کشتیوں میں پھولوں کے ہار، بدھیاں اور جڑاؤں سہرا، اس کے بعد ڈومنیوں کا گانا ہونے لگا۔ فینس نے کہا۔ ہم نے تو یہاں کی ڈومنیوں کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اس پر ایک بوڑھی عورت نے پوچھے منہ سے کہا۔ اے حضور، اب تو نام ہی نام ہے، نہیں تو ہمارے لڑکپن میں ڈومنیوں کا محلہ بڑی رونق پر تھا۔ یہ عجوبہ جو سامنے بیٹھی ہیں۔ ان کی دادی کا وہ دور دورہ تھا کہ اچھے اچھے شہزادے سر ہلک کر آتے تھے۔ ایک بار بادشاہ تک ان کے یہاں آئے تھے۔ ہاتھی وہاں تک نہیں جاسکتا تھا۔ حکم دیا کہ مکان گرا دیے جائے اور چوگنا روپیہ مالکوں کو دیا جائے۔ ایک بوڑھی عورت جس کی بھویں تک سفید تھی، ہاتھی کی سوڑ بکر کر کھڑی ہو گئی اور کہا۔ میں ہاتھی کو آگے نہ بڑھنے دوں گی۔ میرے بزرگوں کی ہڈیاں کھود کے پھینک دی گئی۔ یہ مکان میرے بزرگوں کی ہڈی ہے۔ بادشاہ نے اس کے بزرگوں کے نام سے ایک خیرات خانہ جاری کر دیا۔ جب بادشاہ کا گھوڑا محبوبین کی دادی کے مکان پر پہنچا، تو دس بارہ ہزار آدمی گلی میں کھڑے تھے۔ مگر واہ ری ظہورن! اتنا سب کچھ ہوتے بھی غرور چھو نہ گیا تھا۔ برسات کے دن تھے، بادشاہ نے کہاں۔ ظہورن، جب جانیں کی مینہ برسا دو۔ مسکرا کر کہا۔ حضور، لوٹنی ایک ادنیٰ سی ڈومنی ہے۔ مگر خدا کے نزدیک کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ کہہ کر تان لی۔

”آپو بدرا کارے، کارے رہی بجلی چک مورے آگن میں“

بس، بچھم طرف کے جموتی ہوئی گھٹا اٹھی۔ سیاہی چھلکنے لگی۔ ظہورن کو خدا بخشنے، پھر تان لگائی اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا، ایسا برسا کہ دریا بڑھ گیا اور تالاب سے دریا تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ جب تو یہاں کی ڈومنیاں مشہور ہیں۔ اور اب تو خدا کا نام ہے۔ اتنی ڈومنیاں بیٹھی ہیں، کوئی گائے تو؟

خدا راجد جلد لے آکر خبر تو اے میرے عینی

تیرے بیمار کا اب کوئی دم میں دم لگتا ہے

نصیحت دوستوں کرتے ہو پر اتنا تو بتلاؤ،

کہیں آیا ہوا دل بھی سنبھالے سے سنبھلتا ہے۔

محبوب: بڑی گلے باز ہیں آپ، اور کیوں نہ ہو، کن کی کن کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ہم

کیا جانیں۔

حیدری : ہم لوگوں کے گلے اسی سن میں کام نہیں کرتے، جب ان کی عمر کو پہنچنے کے تو خدا جانے، کیا حال ہوگا۔

بڑھیا قبر میں ایک پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ سر ہٹا تھا، لٹھیا ٹیک کے چلتی تھی، مگر طبیعت ایسی رنگین کہ جوانوں کو مات کرتی تھی۔ سویرے ابٹنا نہ ملے تو جین نہ آئے۔ پنیاں ضرور جمتی تھی، یوں تو بہت ہی خوش مزاج اور ہنس کھتی تھی، مگر جہاں کسی نے اس کو بوڑھی کہا، بس، پھر اپنے آپ میں نہیں رہتی تھی۔ فیروزہ نے چیمیزنے کے لیے کہا۔ تم نے جو زمانہ دیکھا ہے ہم لوگوں کو کہاں نصیب ہوگا۔ کوئی سو برس کا سن ہوگا، کیوں؟

بڑھیا نے پوچھے منہ سے کہا۔ اب اس کا میں کیا جواب دوں، بوڑھی میں کا ہے سے ہو گئی، بالوں پر نزلہ گرا، سفید ہو گئے، اس سے کوئی بڑھا ہو جاتا ہے۔

شام سے آدمی رات تک یہی کیفیت، یہی مزاق، یہی چہل پہل رہی۔ نئی دہن گوری گوری گردن جھکائے، پیارا پیارا کھڑا چھپائے، ادب اور حیا کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ہجولیاں چپکے چپکے چھیڑتی جاتی تھیں۔ آدمی رات کے وقت دہن کو مین مل مل کر نہلایا گیا۔ حنا کا عطر، سہاگ، کیوڑا اور گلاب بدن میں ملا گیا۔ اس کے بعد جوڑا پہنایا گیا۔ ہرے بانٹے کا پاجاما، سوہے کی کرتی، سوہے کی اڑھنی، بنستی رنگ کا کاشمیری دوشالا اڑھایا گیا۔ بھاجوں نے میزبیاں کو سختی تھیں، اب زیور پہنانے بیٹھیں۔ سونے کے پازیب، چھاگل اور کڑے، دسوں پوروں میں چھلے، ہاتھوں میں چوہے دنتیاں، جڑاؤں کنگن، سونے کے کڑے، گلے میں موتیوں کا ہار، کانوں میں کرن پھول اور بالے، سر پر چھپکا اور سیس پھول، مانگ میں موتیوں کی لڑی دیکھ کر نظر کا پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ جواہرات کی چمک دمک سے گمان ہوتا تھا کہ زمین پر چاند نکل آیا ہے۔

جانی بیگم : چوتھی کے دن اور ٹھاٹ ہوں گے، آج کیا ہے۔

فیض : آج کچھ ہوئی نہیں۔ ایسا مہکوا عطر کبھی نہیں سونگھا۔

اس پر سب کلککلا کر ہنس پڑیں۔

حشمت بہو : بی فیض کی باتوں سے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

فیروزہ : کیسی کچھ اور چمچل کیسی ہیں، رگ رگ میں شوخی بھری ہے۔

جانی بیگم : بہن فیض، ہم تمہارے میاں کے ساتھ نکاح پڑھوا لیں، برا تو نہ مانوگی؟

فیروزہ: دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

حشمت بہو: بہن، تمہاری آنکھوں کا پانی بالکل دھل گیا۔ حیا بخون کھائی۔

مہری: حضور، یہی تو دن ہمیں مذاق کے ہیں۔ جب ہم ان رسوں کے تھے تو ہماری بھی یہی کیفیت تھی۔

اسنے میں ایک بھولی نے آکر کہا۔ فیروزہ بیگم، وہ آئی ہیں مبارک محل۔ ان کے سامنے ذری ایسی باتیں نہ کرنا، وہ بڑی نازک مزاج ہیں۔ اتنی بے لحاظی اچھی نہیں ہوتی۔

فیروزہ: تو تم جا کے ادب سے بیٹھو۔ تمہارا وظیفہ آج سے بندھ جائے گا۔

مبارک محل آئیں اور سب سے گلے مل کر ثریا بیگم کے پاس جا بیٹھیں۔

مبارک محل: ہم نے ثریا بیگم کو آج ہی دیکھا، خدا مبارک کرے۔

فیروزہ: اے ثریا بیگم، ذرا گردن اونچی کرو، واہ یہ تو اور جھکی جاتی ہیں۔ ہم تو سینہ تان کے بیٹھے تھے، کیا کسی کا ڈر پڑا ہے۔

حشمت: تم تو اندھیر کرتی ہو، نئی دلہن کہیں اکڑ کر بیٹھتی ہے؟

مہری: اے ہاں حضور، دلہن کہیں تن کر بیٹھتی ہے۔ کیا کچھ نئی ریتی ہے!

فیروزہ: اچھا صاحب، یوں ہی سہی، ذری اور جھک جاؤ۔

ایک ایک باجے کی آواز آئی۔ دولہا کے یہاں سے دلہن کا سہرہ بڑے ٹھاٹ سے آرہا

تھا۔ جب سہرہ اندر آیا تو ثریا بیگم کی ماں نے کہاں، اب اس وقت کوئی چھیکے، میکے نہیں، سہرہ اندر آتا ہے۔

سہرہ اندر آیا۔ دولہا کے بہنوئی نے سالی کے سر پر سہرہ باندھا اور ساس نے نیگ مانگا۔

ساس: ہاں، ہاں باندھ لو، اس وقت تمہارا حق ہے۔

بہنوئی: ان چکمو میں نہ جاؤں گا۔ لائیے، نیگ لائیے۔

حشمت: ہاں، بے جھگڑے نہ ماننا دولہا بھائی۔

بہنوئی: مان چکا، توڑوں کے منہ کھولیے۔ اب دیر نہ کیجیے۔

ثریا بیگم کی ماں نے پانچ اشرفیاں دیں۔ وہ تو لے کر باہر گئے۔ ادھر دولہا کے یہاں کی

اودھی دلہن کو اڑھائی گئی۔ پا بجائے کی ناڑے کی اکیس گرہیں دی گئی۔ پردا ڈالا گیا۔ دلہن ایک

پنگ پر بیٹھی۔ پھولوں کے طوق اور بدھیاں پہنائی گئیں۔ پھولوں کا طرہ باندھا گیا۔ اب

بارات کے آنے کا انتظار تھا۔

فیروزہ: کیوں بہن فیض، کچ کہنا، اس وقت دلہن پر کیسا جوین ہے!
فیض: وہ تو یوں ہی خوبصورت ہے۔

فیروزہ: بارات بڑے دھوم دھام سے آئے گی۔ ہم نے چاہا تھا کہ منے میاں کے
یہاں سے بارات کا ٹھٹھا دیکھیں۔
حشمت بہو: اے تو بارات یہیں سے کیوں نہ دیکھو۔ مہری، جا کے دیکھو، چکیں سب
درست ہیں نا۔

مہری: حضور، سب سامان لیس ہے۔
فیروزہ بیگم اس کمرے کی طرف چلیں جہاں سے بارات دیکھنے کا بندوبست تھا۔ لیکن
جب کمرے میں گئیں اور نیچے جھانک کے دیکھا تو سہم کر بولیں، اٹھا اونچا کرہ، میں تو
مارے ڈر کے گر پڑی ہوتی۔ جانی بیگم نے جب سنا کہ وہ ڈر گئیں تو آڑے ہاتھوں لیا۔ ہم
نے سنا آپ، اس وقت سہم گئیں، واہ!

فیروزہ: خدا گواہ ہے، دل لگی نہ کرو، میرے ہوش ٹھکانے نہیں۔

جانی بیگم: چلو، بس زیادہ منہ نہ کھلاؤ۔

فیروزہ: اچھا، جا کے جھانکو تو معلوم ہو۔

جانی بیگم: چلو جھانکے چل کے، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

حشمت بہو: ہم بھی چلتے ہیں۔ ہم بھی جھانکیں گے۔

مہری: نہ بی بی، میں جھانکنے کو نہ کہوئی گی۔ ایک بار کا ذکر سنو کہ میں تاج بی بی کا
روزہ دیکھنے گئی۔ اللہ ری تیاری، تو روزہ کیا کچ کچ بہشت ہے۔ فرنگی تک جب آتے ہیں تو
مارے رعب کے ٹوپی اتار لیتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک بیگم بھی تھیں، جب روزہ کے پھانک
پر پہنچے تو مجاور باہر چلے گئے۔ مایوں کو حکم ہوا کہ پیٹھ پھر کر کام کریں۔ گنواروں سے پردا کیا۔
فیروزہ: اونہ، پردا دل کا۔

حشمت: پھر مجاوروں کو کیوں ہٹایا؟

مہری: وہ آدمی ہیں اور مالی چالور، بھلا ان مزدوروں سے کون پردا کرتا ہے۔ اچھا، یہ تو
بتاؤ کہ دلہن کو کہاں سے بارات دکھاؤ گی؟

حشمت : ہمارے یہاں کی دلہنیں بارات نہیں دیکھا کرتیں۔

فیروزہ : واہ، کیا انوکھی دلہن ہیں۔

جانی بیگم : جس دن تم دلہن بنی تھیں۔ اس دن بارات دیکھی ہوگی۔

فیروزہ : ہاں ہاں، نہ دیکھنا کیا معنی۔ ہم نے لٹاں جان سے کہا کہ ہم کو دولہا دکھا دو، نہیں ہم شادی نہ کریں گے۔ انھوں نے کہا، اچھا جھروکے سے بارات دیکھو، ہم نے دیکھی۔ ہمارے میاں گھوڑے پر اڑے بیٹھے تھے۔ ایک پھول ان کے سر پر مارا۔

حشمت : کیوں نہیں شاباش، کیا کہنا۔

جانی بیگم : پھول ناحق مارا، ایک جوتا کھینچ مارا ہوتا۔

فیروزہ : خوب یاد دلایا، اب سہی۔

جانی بیگم : اچھا مہری، تم نے ان بیگم صاحب کا ذکر چھیڑا تھا جن کے ساتھ تاج بی بی کا روضہ دیکھنے گئی تھی۔ پھر کیا ہوا؟

مہری : ہاں، خوب یاد آیا۔ ہم لوگ ایک برج پر چڑھ گئے، میں کیا کہوں حضور، کم سے کم ہوں گے تو کوئی سات آٹھ سوزینے ہوں گے۔

فیروزہ : اٹو، اتنا جھوٹ اچھا پھر کیا ہوا کہتی جاؤ۔

مہری : خیر، دم لے لے کر پھر چڑھے، جب دھر پر پہنچے تو دم نہیں باقی رہا کہ ذرا بل بھی سکیں۔ بیگم صاحب نے اوپر سے نیچے کو جھانکا تو غش آگیا۔ دھم سے گریں۔

حشمت بہو : ہائے، ہائے! مریں کہ بھیں؟

مہری : بچ جانے کی ایک ہی کمی۔ ہڈی پہلی چور ہو گئی۔

فیروزہ : میں نے کہا تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ اللہ جانتا ہے، اتنے اونچے پر سے جو سڑک دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔

جانی بیگم : جانے دو بھی، اب اس کا ذکر نہ کرو، چلو دلہن کے پاس بیٹھو۔

خبریں آنے لگیں کہ آج تک اس شہر میں ایسی بارات کسی نے نہیں دیکھی تھی ایک نئی بات یہ ہے کہ گوروں کا باجا ہے۔ ہزاروں آدمی گوروں کا باجا سننے آئے ہیں۔ چھتیس پھٹی پڑتی ہیں، ایک ایک کرہ چوک میں آج دو دو اشرفیاں کراے پر نہیں ملتا۔ سنا کہ بارات کے ساتھ نئی روشنی ہے جس کو گیس لائٹ بولتے ہیں۔

فیروزہ: اُس روشنی اور اس روشنی میں کیا فرق ہے؟
مہری: اسے حضور، زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن ہے۔

(94)

آزاد پولینڈ کی شہزادی سے رخصت ہو کر راتوں رات بھاگے۔ راستے میں روسیوں کی کئی فوجیں ملیں۔ آزاد کو گرفتار کرنے کی زوروں سے کوشش ہو رہی تھی، مگر آزاد کے ساتھ شہزادی کا جو آدمی تھا وہ انھیں سپاہیوں کی نظریں بچا کر ایسے انجان راستوں سے لے گیا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ دونوں آدمی رات کو چلتے تھے اور دن کو کہیں چھپ کر پڑے رہتے تھے۔ ایک ہفتے تک بھاگا بھاگ چلنے کے بعد آزاد پلونا پہنچ گئے۔ اس مقام کو روسی فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آزاد کے آنے کی خبر سنتے ہی پلونا والوں نے کئی ہزار سوار روانہ کیے کہ آزاد کو روسی فوجوں سے بچا کر نکال لائیں۔ شام ہوتے ہوتے آزاد پلونا والوں سے جا ملے۔

پلونا کی حالت یہ تھی کہ قلعے کے چاروں طرف روسی فوج کے پیچھے ترکوں کی فوج تھی۔ رات کو قلعے سے توپیں چلنے لگیں۔ ادھر روسیوں کی فوج بھی دونوں طرف گولے اتار رہی تھی۔ قلعے والے چاہتے تھے کہ روسی فوج دو طرف سے گھر جائے، مگر یہ کوشش کارگر نہ ہوئی۔ روسیوں کی فوج بہت زیادہ تھی۔ گولوں سے کام نہ چلتے دیکھ کر آزاد نے ترکی جنرل سے کہا۔ اب تو تلوار سے لڑنے کا وقت آ پہنچا، اگر آپ اجازت دیں تو میں روسیوں پر حملہ کروں۔

افسر: ذرا دیر اور ٹھہریے، اب مار لیا ہے۔ دشمن کے جھلکے چھوٹ گئے ہیں۔

آزاد: مجھے خوف ہے کہ روسی توپوں سے قلعے دیواریں نہ ٹوٹ جائیں۔

افسر: ہاں، یہ خوف تو ہے۔ بہتر ہے، اب ہم لوگ تلوار لے کر بڑھیں۔

حکم کی دیر تھی۔ آزاد نے فوراً تلوار نکال لی۔ ان کی تلوار کی چمک دیکھتے ہی ہزاروں تلوار میان سے نکل پڑیں۔ ترکی جوانوں نے دائرہ حیاں منہ میں دبائیں اور اللہ اکبر کہہ کر روسی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ روسی بھی تنگی تلواریں لے کر مقابلے کے لیے نکل آئے۔ پہلے دو ترکی کپنیاں بڑھیں، پھر کچھ فاصلے پر 6 کپنیاں اور تھیں۔ سب سے پیچھے خاص فوج کی چودہ کپنیاں تھیں۔ ترکوں نے یہ چالاکی کی تھی کہ صرف فوج کے ایک حصے کو آگے بڑھایا تھا، باقی

کالموں کو اس طرح آڑ میں رکھا کہ روسیوں کو خبر نہ ہوئی۔ قریب تھا کہ روسی بھاگ جائیں، مگر ان توپ خانے نے ان کی آبرو رکھ لی۔ اس کے سوا ترکی فوج منزلیں مارے چلی آتی تھیں اور روسی فوج تازہ تھی۔ اتفاق سے روسی فوج کا سردار ایک گولی کھا کر گرا، اس کے گرتے ہی روسی فوج میں کھلبلی مچ گئی، آخر روسیوں کو بھگانے کے سوا کچھ نہ بن پڑی۔ ترکوں نے 6 ہزار روسی گرفتار کر لیے۔

جس وقت ترکی فوج پلونا میں داخل ہوئی، اس وقت کی خوشی بیان نہیں کی جاسکتی۔ بوڑھے اور جوان سبھی پھولے نہ ساتے تھے۔ لیکن یہ خوشی دیر تک قائم نہ رہی۔ ترکوں کے پاس نہ رسد کا امان کافی تھا، نہ گولا بارود۔ روسی فوج نے پھر قلعے کو گھیر لیا۔ ترک حملوں کا جواب دیتے تھے، مگر بھوکے بھوکے سپاہی کہاں تک لڑتے۔ روسی غالب آتے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کو پلونا چھوڑنا پڑے گا۔ پچیس ہزار روسی تین گھنٹے تک قلعے کی دیواروں پر گولے برساتے رہے۔ آخر دیوار پھٹ گئی اور ترکوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آپس میں صلاح ہونے لگی۔

فوج کا افسر: اب ہمارا قدم نہیں ٹھہر سکتا، اب بھاگ چلنا ہی مناسب ہے۔
آزاد: ابھی نہیں، ذرا اور صبر کیجیے، جلدی کیا ہے۔
افسر: کوئی نتیجہ نہیں۔

قلعے کی دیوار پھٹنے ہی روسیوں نے ترکی فوج کے پاس پیغام بھیجا، اب ہتھیار رکھ دو، ورنہ مفت میں مر جاؤ گے۔

لیکن اب بھی ترکوں نے ہتھیار رکھنا منظور نہ کیا۔ ساری فوج قلعے سے نکل کر روسی فوج پر ٹوٹی پڑی۔ روسیوں کے دل بڑھے ہوئے تھے کہ اب میدان ہمارے ہاتھ میں رہے گا، اور ترک کو جان پر کھیل گئے تھے۔ مگر مجبور ہو کر ترکوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسی طرح ترکوں نے تین دھادے کیے اور تینوں مرتبہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ ترکی جنرل پھر دھادا کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ بادشاہی حکم ملا۔ فوجیں ہٹا لو، صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ دوسرے دن ترکی فوجیں ہٹ گئیں اور لڑائی ختم ہو گئی۔

جس دن آزاد قسطنطنیہ پہنچے، ان کی بہت عزت ہوئی۔ بادشاہ نے ان کی دعوت کی اور انہیں پاشا کا خطاب دیا۔ شام کو آزاد ہوٹل میں پہنچے اور گھوڑے سے اترے ہی تھے کہ یہ آواز آئی، بھلا گیدی، جاتا کہاں ہے۔ آزاد نے کہا۔ ارے بھائی، جانے دو۔ آزاد کی آواز سن کر خوشی بے قرار ہو گئے۔ کمرے سے باہر آئے اور ان کے قدموں پر ٹوپی رکھ کر کہا۔ آزاد خدا گواہ ہے، اس وقت تمہیں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا، منہ مانگی مراد پائی۔

آزاد: خیر، یہ تو تھلاؤ۔ مس میڈا کہاں ہے؟

خوجی: آگئی، اپنے گھر پر ہیں۔

آزاد: اور بھی کوئی ان کے ساتھ ہے؟

خوجی: ہاں، مگر اس پر نظر نہ ڈالیے گا۔

آزاد: اچھا یہ کہیے۔

خوجی: ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ آزاد بھابھ بھی ٹھیک کر لائے، مگر اب یہاں

سے چلنا چاہیے۔

آزاد: اس پری کے ساتھ شادی تو کر لو۔

خوجی: اجی، شادی جہاز پر ہوگی۔

مس میڈا اور کلاریا کو آزاد کے آنے کی جیوں ہی خبر ملی، دونوں ان کے پاس آ

پہنچی۔

میڈا: خدا کا ہزار شکر ہے، یہ کس کو امید تھی کہ تم جیتے جاگتے لوٹو گے۔ اب اس خوشی

میں ہم تمہارے ساتھ ناچیں گے۔

آزاد: میں ناچتا کیا جانوں۔

کلاریا: ہم تم کو سیکھا دیں گے۔

خوجی: تم ایک ہی استاد ہو۔

آزاد: مجھے بھی وہ ٹر یاد ہیں کہ چاہوں تو پری کو اتار لوں۔

خوجی: بھئی، کہیں شرمندہ نہ کرنا۔

تین دن تک آزاد قسطنطنیہ میں رہے۔ چوتھے دن دونوں لیڈیوں کے ساتھ جہاز پر سوار ہو کر ہندستان چلے۔

(96)

آزاد، میڈا، کلاریا اور خوبی جہاز پر سوار ہیں۔ آزاد لیڈیوں کا دل بہلانے کے لیے لطیفے اور چٹکے کہہ رہے ہیں۔ خوبی بھی سچ سچ میں اپنا ذکر چھینر دیتے ہیں۔
 خوبی: ایک دن کا ذکر ہے، میں ہولی کے دن بازار سے نکلا۔ لوگوں نے منع کیا کہ آج باہر نہ نکلے، رو نہ رنگ پڑ جائے گا۔ میں ان دنوں بالکل گینڈا بنا ہوا تھا۔ ہاتھی کی دم پکڑ لی تو ہمس نہ سکا۔ چیس سے بول کر چاہا کہ بھاگے، مگر کیا مجال! جس نے دیکھا، دانتوں انگلی دبائی کہ واہ پٹھے۔

آزاد: ایس، تب تک آپ پٹھے ہی تھے۔

خوبی: میں آپ سے نہیں بولتا۔ سنو مس میڈا، ہم بازار میں آئے تو دیکھا، ہڑبونگ مچا ہوا ہے۔ کوئی سو آدمی کے قریب جمع تھے اور رنگ اچھل رہا تھا۔ میرے پاس پیش قبض اور طمنچہ بس کا کہوں۔

آزاد: مگر کرو لی نہ تھی۔

خوبی: بھئی، میں نے کہہ دیا، میری بات نہ کاٹو۔ لکار کر بولا، یارو، دیکھ بھال کے، مردوں پر رنگ ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔ ایک پٹھان نے آگے بڑھ کے کہاں۔ خاں صاحب آپ سپاہی آدمی ہیں، اتنا غصہ نہ کیجیے، ہولی کے دن رنگ کھیلنا معاف ہے۔ میں نے کہاں، سنو بھائی تم مسلمان ہو کے ایسی باتیں کہتے ہو؟ پٹھان بولا، حضرت ہمارا ان لوگوں سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اتنے میں دو لونڈوں نے پچکاری تانی اور رنگ ڈال دیا، اوپر سے اسی پٹھان نے پیچھے سے تان کے ایک جوتا دیا تو کھوپری پلپلی ہو گئی۔ پھر کے دیکھتا ہوں تو ڈبل جوتا، سمجھاؤں بوجھاؤں مسکرا کر آگے بڑھ۔

آزاد: ایس، جوتا کھا کے آگے بڑھے۔

میڈا: اور اس زمانے میں سپاہی بھی تھے۔ اور بات بھی دل لگی کی تھی۔ مسکراتے نہ تو

کیا روتے؟

خوبی : میں تو سپاہی ہوں، تلوار سے بات کرتا ہوں، جوتے سے کام نہیں لیتا۔ کہاں تلوار، کہاں جوتی پیزار۔

کلاریا : ایک حاکم نے گواہ سے پوچھا کہ بدی کی ماں تمہارے سامنے روتی تھی یا نہیں؟ گواہ نے کہا، جی ہاں، ہائی آنکھ سے روتی تھی۔

خوبی : یہ تو کوئی لطیفہ نہیں، مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے اس آدمی نے ہولی میں بے ادبی کی تھی۔ اسے پا جاؤں تو خوب مرمت کروں۔

آزاد : اچھا، اب گھر پہنچ کر سب سے پہلے اس کی مرمت کیجیے گا۔ یہ لیجیے سوتج کی نمبر۔

مس میڈا نے کہا : ہم ذرا یہاں کی سیر کریں گے۔ آزاد کو بھی یہ بات پسند آئی۔ اسکندر یہ کے اسی ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں پہلے نکلے تھے۔ خوبی اڑتے ہوئے ان کے پاس آئے اور کہا، اب یہاں ذرا ہمارے ٹھاٹ دیکھیے گا۔ پہلے تو لوگوں سے دریافت کر لو کہ ہم نے کشتی نکالی تھی یا نہیں؟ مارا چاروں شانے چت، اور کس کو؟ اس پہلوان کو جو سارے مصر میں ایک تھا۔ جس کا نام لے کر مصر کے پہلوانوں کے استاد کان پکرتے تھے۔ اس کو دیکھو تو آنکھ کھل جائے۔ کسی کا بدن چور ہوتا ہے۔ اس کا قد چور ہے۔ پہلے تو مجھے ریتنا ہوا اکھاڑے کے باہر لے گیا اور میں بھی چپ چاپ چلا گیا، بس بھائی، پھر تو میں نے قدم جما کے جو ریتا دیا تو بول گیا۔ اب میں چپیں ہونے لگیں، مگر وہ استاد تو میں جگت استاد! اس نے پتچ کیا، میں نے توڑ کیا۔ اس نے دتی کھینچی، میں بغلی ہوا۔ اس نے ڈنڈا لگایا، میں نے اچک کے کاٹ کھایا۔

آزاد : سبحان اللہ، یہ سچ سب سے بڑھ کر ہے۔ آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی، بیٹھ کے کونسا کیوں نہ شروع کر دیا؟

دونوں لیڈیاں ہنسنے لگیں تو خوبی بھی مسکرائے، سمجھے کہ میری بہادری پر دونوں خوش ہو رہی ہیں۔ بولے بس جناب، دو گھنٹے تک برابر کی لڑائی رہی، وہ کڑیل جوان، موٹا تازہ، بچہ سمٹا۔ اس کا قد کیا بتاؤں۔ بس جیسے حسین آباد کا ست کھنڈا۔ اس میں قوت اور یہاں استادی کرتب، میں نے اسے ہپا ہپا کے مارا، جب اس کا دم ٹوٹ گیا تو چر مڑ کر ڈالا۔ بس جناب،

کلا جنگ کے پہنچ پر مارا تو چاروں شانے چت۔ کوئی پچاس ہزار آدمی دیکھ رہے تھے۔ تمام شہر میں مشہور تھا کہ ہند کا پہلوان آیا۔

آزاد : بھائی جان، سنو، اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی سند نہیں۔ جب جائیں گے ہمارے سامنے پلکئی دو اور پہلے اس پہلوان کو بھی دیکھ لیں کہ کیسا ہے۔ تمہاری اس کی جوڑ ہے یا نہیں۔

خوبی : کچھ عجب آدمی ہیں آپ، کہتا جاتا ہوں کہ گرانڈیل بیچ مٹھا جوان ہے، آپ کو یقین ہی نہیں آتا، ہم اس کو کیا کریں۔

اتنے میں ہوٹل کے دو ایک آدمی خوبی کو دیکھ کر جمع ہو گئے۔ خوبی نے پوچھا، کیوں بھائی، ہم نے یہاں ایک کشتی نکالی تھی یا نہیں؟

ایک آدمی : واہ، ہمارے ہوٹل کے بونے نے تو اٹھا دے پٹکا تھا، چلے وہاں سے کشتی نکالنے!

خوبی : او گیدی، جھوٹ بولنا اور سورا کھانا برابر ہے۔

دوسرا آدمی : ہاتھ پاؤں توڑ کے دھر دے گا۔ آپ اور کشتی!

خوبی : جی ہاں، ہم اور کشتی! کوئی آئے تب نہ! (تال ٹھوک کر) بلواؤ اس پہلوان کو۔

اتنے میں بونا سامنے آکھڑا ہوا اور آتے ہی خوبی کو چڑھانے لگا۔ خوبہ صاحب نے کہا۔ یہی پہلوان ہے جس کو ہم نے پٹکا تھا۔ آزاد بہت ہنسے، بس! ٹائے ٹائیں فس۔ بونے سے کشتی نکالی تو کیا۔ کسی برابر والے سے کشتی نکالتے تو جانتے۔ اسی پر گھمنڈ تھا۔

خوبی : صاحب، کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے، اگر اس سے ہاتھ ملائیں تو ظاہر ہو جائے۔

بونا تال ٹھوک کے سامنے آکھڑا ہوا اور خوبی بھی پینترے بدل کر پہنچے۔ آزاد، معیذا اور ہوٹل کے بہت سے آدمی ان دونوں کے گرد ٹھٹ لگا کے کھڑے ہو گئے۔

خوبی : آؤ، آؤ بچا۔ آج بھی کڈا دوں گا۔

بونا : آج تمہاری کھوپڑی ہے اور میرا جوتا۔

خوبی : ایسا کڈا دوں کہ عمر بھر یاد رہے۔

بونا : انعام تو ملے گا ہی، پھر ہمارا کیا ہرج ہے؟

اب سینے کے دونوں پہلو ان ٹکٹھ گئے۔ خوبی نے گھونسا تانا، بونے نے منہ چڑھایا۔ خوبی نے چیت جمائی، بونے نے دھول لگائی۔ دونوں کی چاند گھٹی گھٹائی، چکنی تھی۔ اس زور کی آواز آتی تھی کہ سننے والوں اور دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جاتی تھا۔

میڈا: خوب آواز آئی، شراق! ایک اور!

کلاریسا: آف، مارے ہنسی کے پیٹ مین بل پڑ گئے۔

خوبی: ہنسی کیوں نہ آئے گی۔ جس کی کھوپڑی پر پڑتی ہے اسی کا دل جانتا ہے۔

آزاد: ارے یار، ذرا زور سے چپت بازی ہو۔

خوبی: دیکھیے تو، دم کے دم میں بے دم کیے دیتا ہوں کہ نہیں۔

آزاد: مگر یار، یہ تو بالکل ہوتا ہے۔

خوبی: ہائے افسوس، تم ابھی بالکل لوٹے ہو۔ ارے کجبت، اس کا قد چور ہے، یوں دیکھنے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا، مگر اکھاڑے میں چٹ اور لنگوٹ باندھ کر کھڑا ہوا، بس پھر دیکھیے، بدن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ بالکل گینڈا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ہے، دم کتنا بھینسا ہے، کوئی کہتا ہے، ہاتھی کا پانھا ہے، کوئی ناگوری بتاتا ہے، کوئی کہتا ہے، جتنا پارہ بکرا ہے، مگر مجھے اس کا غم نہیں۔ جانتا ہوں کہ کوئی بولا اور میں نے اٹھا کے دے مارا۔

خوبی نے کئی بار جھلکا جھلکا کر چپتیں لگائیں۔ ایک بار اتفاق سے اس کے ہاتھ ان کی گردن آگئی، خواجہ صاحب نے بہت ہاتھ بیز مارے، بہت کچھ زور لگائے، مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے گردن پکڑ لی اور لٹک گیا۔ خوبی کچھ جھکے، ان کا جھلکا تھا کہ اس نے زور سے مٹکا دیا اور دو تین لپڑ لگا کے بھاگا۔ خوبی اس کے پیچھے دوڑے، اس نے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ خوبی نے چپت کھائیں تو لوگ ہنسے اور مس کلاریسا نے تالیاں بجائیں۔ تب تو آپ بہت ہی جھلکے، آسمان سر پر اٹھا لیا، اویگیدی، اگر شریف کا بچہ ہے تو باہر آ جا۔ گرا تو بھاگ کھڑا ہوا؟

آزاد: ارے میاں، یہ ہوا کیا؟ کون گرا، کون جیتا؟ ہم تو اس طرف دیکھ رہے تھے!

معلوم نہیں ہوا، کس نے دے مارا۔

خوبی: ایسی بات آپ کا ہے کہ دیکھنے لگے تھے؟ انجربنجر ڈھیلے کر دیے گیدی کے، واللہ، کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔ میں نے ایک نیا پتھ کیا تھا۔ اس کے گرنے کے وقت ایسی آواز

آئی کہ یہ معلوم ہوتا تھا، جیسے پہاڑ پھٹ پڑا، آپ نے سنا ہی ہوگا۔
 آزاد: وہ ہے کہاں؟ کیا کھود کے زمین میں گاڑ دیا آپ نے؟
 خوجی: نہیں بھائی، ہارے ہوئے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا، اور قسم ہے، پورا زور نہیں کیا، ورنہ
 میرے مقابلے میں کیا ٹھہرتا۔ ہاتھ پاؤں توڑ کے چر مرکز ڈالتا۔ بانی ہی تو مر گئی کجوت کی،
 بس روتا ہوا بھاگا۔

آزاد: مگر خوجہ صاحب، مگر تو وہ اور یہ آپ کی پیٹھ پر اتنی گرد کیوں لگی ہے؟
 خوجی: بھئی، یہاں پر ہم بھی قائل ہو گئے۔
 کلاریا: اسی طرح اس دفعہ بھی تم نے کشتی نکالی تھی؟
 میڈا: بڑے شرم کی بات ہے کہ ذرا سا بونا تم سے نہ گرایا گیا۔

خوجی: جی چاہتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹوں۔ کہتا جاتا ہوں کہ اس گیدی کا
 قد چور ہے۔ آخر میرا بدن چور ہے یا نہیں، اس وقت میرے بدن پر انگرکھا نہیں ہے۔ خاصا
 دیو بنا ہوا ہوں، ابھی کپڑے پہن لوں تو پڑی معلوم ہونے لگوں۔ بس یہی فرق سمجھو۔ اول تو
 میں گرا نہیں، اپنے ہی زور میں آپ آگیا۔ دوسرے اس کا قدر چور ہے، پھر آپ کیسے کہتے
 ہیں کہ ذرا سا بونا تھا؟

دوسرے دن آزاد دونوں لیڈیوں کو لے کر بازار کی ایک کونٹھی سے باہر آتے تھے، تو کیا
 دیکھتے ہیں کہ خوجی افیم کی پینک میں اوگھتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ سامنے سے ساتھ ستر
 دُبے جاتے تھے۔ دُبے والے نے پکارا۔ ہنو ہنو، بچو بچو وہ آپے میں ہوں تو بچیں۔ نتیجہ یہ ہوا
 کہ ایک دُبے سے دھکا لگا تو دھم سے سڑک پر آ رہے اور گرتے ہی چونک کر غل مچایا۔ کوئی
 ہے؟ لانا کرولی۔ آج اپنی جان اور اس جان ایک کروں گا۔ خدا جانے، اس کو میرے ساتھ کیا
 عداوت پڑ گئی۔ ارے واہ بے بہرہ دُبے، آج ہمارے مقابلے کے لیے سانٹیاں لایا ہے۔ اے،
 یہاں ہر وقت چوکنے رہتے ہیں۔ اس دفعہ بزاز کی دوکان پر آئے تو مصٹائی کھانے میں آئی،
 آج یہ ہاتھ پاؤں توڑ ڈالنے سے کیا ملا۔ گھٹنے لہو لہان ہو گئے۔ اچھا بچا، اب تو میں ہوشیار ہو
 گیا ہوں، اب کی سمجھوں گا۔

ثریا بیگم کا مکان پری خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں وزیر ڈومنی ناچ رہی تھی۔ دوسرے میں شہزادی کا بھرا ہوتا تھا۔

فیروزہ: کیوں فیض بہن، تم کو اس اجڑے ہوئے شہر کی ڈومنیوں کا گانا کاہے کو اچھا لگتا ہوگا؟

جانی بیگم: ان کے لیے دیہات کی میرا نہیں بلوا دو۔
فیض: ہاں، پھر دیہاتی تو ہم ہیں ہی، اس کا کہنا کیا؟
اس فقرے پر وہ قہقہہ پڑا کہ گھر بھر گونج اٹھا اور فیض بہت شرمائیں۔
جانی بیگم نے کہا: بس یہی بات تو ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ ایک تو بے چاری اتنی دیر کے بعد بولی، اس پر بھی سب نے مل کر ان کو بنا ڈالا۔
فہمین ڈومنی بھرا کرنے لگی۔ اس کے ساتھ دو عورتیں سارنگی لیے تھیں۔ ایک طبلہ بجا رہی تھی اور ایک مجیرے کی جوڑی۔ اس کے گانے کی شہر میں دھوم تھی۔

بندروار باندھو سب مل کے مایلیاں

اس کو اس نے اس طرح ادا کیا کہ جس نے سنا، لٹو ہو گیا۔

جانی بیگم: چوتھی کے دن تیس چالیس طوائفوں کا ناچ ہوگا۔

نظیر بیگم: کشمیری نہیں آتے، ہمیں ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا ہے۔

حشمت بہو: نواب صاحب کو زمانے میں ناچ کرانے کی چڑھ ہے۔

فیروزہ: سنو بہن۔ جو عورت ہدی پر آئے تو اس کی بات ہی اور ہے، نہیں تو شریف زادی کے لیے سب سے بڑا پردہ دل کا ہے۔

فیض: فہمین، یہ گیت گاؤ۔

”ڈال گھو کوڈ ٹوٹا رے۔“

فیروزہ: کیا گاؤ گیت! گیت کنڈے والیاں گاتی ہیں۔

جانی: اور ان کو شمیری، بٹے، غزل سے کیا مطلب۔ نکلا گاؤ۔

فیروزہ اور جانی بیگم کی باتیں سن کر مبارک محل بگڑ گئی۔

فیروزہ : بہن، ہماری باتوں سے برا نہ ماننا۔

مبارک : برا مان کر کر ہی کیا لوں گی۔

جانی : ایسی باتوں سے آپس میں فساد ہو جاتا ہے۔

فیروزہ : یہ لڑوائی ہیں بہن، کچ کبتی ہوں۔

مبارک : تم دونوں ایک سی ہو۔ جیسے تم دیے وہ، نہ تم کم، نہ وہ کم، شریفوں میں بیٹھے

لائق نہیں ہو۔ پڑھ لکھ کر بھی یہ باتیں سیکھیں۔

جانی : دیکھیے تو سہی، اب دل میں کٹ گئی ہوں گی۔

مبارک : میں ایسوں سے بات تک نہیں کرتی۔

فیروزہ : (نکک کر) جتنا دبو، اتنا اور دباتی ہیں، تم بات نہیں کرتیں، یہاں کون تم سے

بات کرنے کے لیے بے قرار ہے۔

مبارک : مہری، ہماری پاکی منگواؤ، ہم جائیں گے۔

بیگم صاحب کو خبر ہوئی تو انھوں نے دونوں کو سمجھا بھرا کر راضی کر دیا۔ شام ہوئی، روشنی

کا انتظام ہوتے لگا۔ بیگم نے کہا۔ فزاشوں کو حکم دو کہ بارہ دری کو جھاڑ کنول سے سجائیں،

کمرے اور دلاؤں میں صاف چاندنیاں چھیں، ان پر ادنی اور چینی غالجھیں ہوں۔ مہری نے

باہر جا کر آغا صاحب سے یہ باتیں کہیں۔ بولے، ہاں ہاں صاحب سنا۔ بیگم صاحب سے کہو

کہ یہ تو ہم کو انتظام کرنے دیں یا خود ہی باہر چلی آئیں۔ آخر ہم کو کوئی گنوار بھی ہیں۔ کل

سے انتظام کرتے کرتے ہم شل ہو گئے اور جب بارات آنے کا وقت آیا تو حکم دینے لگیں کہ

یہ کرو، وہ کرو۔ جا کر کہہ دو کہ باہر کا انتظام ہمارے تعلق ہے۔ آپ کیوں دخل دیتی ہیں۔ ہم

اپنے بندوبست کر لیں گے۔

مہری نے اندر جا کر بیگم صاحب سے کہا۔ حضور، باہر کا سب انتظام ٹھیک ہے۔ بارہ

دری کے پھانک پر نوبت خانہ ہے، اس پر کارچوبی جھول پڑی ہے، کہیں کنول اور گلاس ہیں،

کہیں ہری اور لال ہاڈیاں۔ رنگ برنگ کے قمقمے بڑی بہار دکھاتے ہیں۔

حشمت بہو : دروازے پر یہ شور کیسا ہو رہا ہے؟

مہری : حضور، شور کی نہ پوچھیں، آدمیوں کی اتنی بھیڑ لگی ہوئی ہے کہ شانے سے شانے

چھلتا ہے۔ دکانیں بھی بہت سے آئی ہیں۔ طنبوئی لال کپڑے پہنے دکانوں پر بیٹھے ہیں۔

ہاتھوں میں چاندی کے کڑے، تھالیوں میں سفید پان، ایک تھالی میں چھوٹی الائچیاں، ایک میں ڈلیاں، سکھا عطر میں بٹا ہوا، صفائی کے ساتھ گھوریاں بنا رہا ہے۔ ایک طرف ساکنوں کی دکانیں ہیں۔ بگڑے دل دموں پر دم لگاتے ہیں، بے فکرے ٹوٹے پڑتے ہیں۔

فیروزہ: سستی ہو فیض بہن، چلو ذرا باہر کی بہار دیکھ آئیں، یہ ناک بھوں کیوں چڑھائے بیٹھی ہو۔ کیا گھر سے لڑکر آئی ہو؟

فیض: ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہو، ہم نہ کسی سے بولیں، نہ چالیں۔

حشمت بہو: ہاں فیروزہ، یہ تم میں بڑی بری عادت ہے۔

فیروزہ: لڑواؤ، وہ تو سیدھی سادی ہیں، شاید تمہارے بھروسے میں آجائیں۔

جانی: فیروزہ بیگم جس محفل میں نہ ہوں وہ بالکل سونی معلوم ہو۔

فیروزہ: ہمیں افسوس یہی ہے کہ ہم سے مبارک محل بہن خفا ہو گئیں۔ اب کوئی میل کروا

دے۔

مبارک: بہن، تم بڑی منہ پھٹ ہو۔

فیروزہ: اب صاف صاف کہوں تو برا مانو، ذرا ذرا سی بات میں چپکتی ہو۔ آپس میں ہنسی، دل لگی ہوا ہی کرتی ہے۔ اس میں بگڑنا کیا؟ فیض برا مانیں تو ایک بات بھی ہے، یہ بے چاری دیہات میں رہتی ہیں، یہاں کے راہ رسم کیا جانیں، مگر تم شہر کی ہو کر بات بات میں روئے دیتی ہو۔ رہی میں، میں تو حاضر جواب ہوں ہی۔ ہاں، جانی بیگم کی طرح زبان دراز نہیں۔

جانی: اب میری طرف جھکیں۔

حشمت: چوکھا لڑتی ہیں، اف ری شوخی!

اب دولہا کے یہاں کا ذکر سنئے۔ وہاں اس سے بھی زیادہ دھوم دھام تھی۔ نوجوان شہزادے اور نواب زادے جمع تھے۔ دل لگی ہو رہی تھی۔

ایک: یار، آج تو بے سرور جمائے جانا مناسب نہیں۔

دوسرا: معلوم ہوتا ہے، آج پی کے آئے ہو۔

پہلا: ارے میاں، خدا سے ڈرو، پینے والے کی ایسی تھیں۔

دولہا: ضرور پی کے آئے ہو۔ آپ ہماری بارات کے ساتھ نہ چلیے۔

دیوان خانے میں بزرگ لوگ بیٹھے پرانے زمانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب بولے۔ نہ اب وہ لوگ ہیں، نہ زمانہ۔ اب کس کے پاس جائیں، کوئی ملنے کے قابل ہی نہیں۔ علم کی تو اب قدر ہی نہیں۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ گالی کھائے، مگر جواب نہ دے۔ خواجہ صاحب: اب آپ دیکھیں کہ اس زمانے میں دس، بیس، تیس کی تیاریاں تھیں، مگر واہ رے برکت۔ ایک بھائی گھر میں نوکر ہے اور دس بھائی چین کر رہے ہیں۔

رات کے دس بجے نواب صاحب محل میں نہانے گئے۔ چاروں طرف بند نواریں بندھی ہوئی تھیں۔ آم، امرود اور نارنگیاں لٹک رہی تھیں۔ نیچے ایک سو ایک کورے گھڑے تھے، ایک سٹکے پر اکیس ٹوٹی کا بدھنا رکھا تھا اور بدھنے میں جو لگے ہوئے تھے۔ دولہا کی ماں نے کہا۔ کوئی چھینکے دینکے نہیں، خبردار کوئی چھینکے نہ پائے۔ گھر بھر میں بچوں کو منع کر دو کہ جس کو چھینک آئے، ضبط کرے۔ اب دل لگی دیکھیے کہ اس نوکنے سے سب کو چھینک آنے لگی۔ کسی نے ناک کو انگلی سے دبایا، کوئی لپکت کے باہر چلا گیا۔ دولہا نے لنگی باندھی، بدن میں اٹن ملا گیا۔ بہنیں سر پر پانی ڈالنے لگیں۔

دولہا: کتنا سرد پانی ہے۔ ٹھٹھرا جاتا ہوں۔

مہری: پھر حضور، شادی کرنا کچھ دل لگی ہے

بہن: دل میں تو خوش ہوں گے۔ آج تمہیں بھلا سردی لگے گی۔

نہا کر دولہا نے کھڑاؤں پہنی۔ کمرے میں آئے، کپڑے پہنے مشرو پانچاما، جامدانی کا انگرکھا، سر پر گچڑی کے ارد گرد موتی نکلے ہوئے، بچ میں گکھر اچ کا رنگین جکینہ، کمر میں شالی پنکا، گچڑی پر پھولوں کا سہرہ، ہاتھ میں لال ریشمی رومال اور کندھے پر ہرا دوشلا، پیروں میں پھندے دار بوٹ۔

جب دولہا باہر گیا تو بیگم صاحب نے لڑکیوں سے کہا۔ اب چلنے کی تیاری کرو۔ ہم کو بارات سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔ دولہا کی بہنیں اپنے اپنے جوڑے پہننے لگیں۔ مہریوں لونڈیوں کو بھی حکم ہوا کہ کپڑے بدلو۔ ذرا دیر میں سکھ پال اور جھپان دروازے پر لا کر لگا دیے گئے۔ دونوں بہنیں چلیں۔ دائیں بائیں مہریاں، مشالچوں کے ہاتھ میں مشالیں، سپاہی اور خدمت لال پھندے دار گچڑیاں باندھے ساتھ چلے۔ جس طرف سے سواری نکل گئی، گالیاں عطر کی مہک سے بس گئیں۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ پریوں کا اڑن کھولا ہے۔

جب دو بہنیں سرھیانے پہنچ گئیں، تو نواب صاحب کی ماں بھی چلیں۔ وہاں دہن کی ماں نے ان کی پیشوائی کی۔ عطر پان سے خاطر ہوئی اور ڈومنیوں کا ناچ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد دولہا کے یہاں سے بارات چلی، سب کے آگے ہاتھی پر نشان تھا۔ ہاتھی کے سامنے آناڑ اور ہزارے چھوٹ رہے تھے۔ ہاتھیوں کے پیچھے انگریزی باجے والوں کی دھوم تھی۔ پھر سجے ہوئے گھوڑے سر سے پاؤں تک زیور سے لدے چلے جاتے تھے۔ سائیں ان کی باگ پکڑے ہوئے تھے اور دو سپاہی ادھر ادھر قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ دولہا کے سامنے شہنائی بج رہی تھی۔ تماشا دیکھنے والے یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دنگ ہو رہے تھے۔

ایک : بھئی، اچھی بارات سجائی، اور خوب آتش بازی بنائی ہے۔ آتش بازی کیا بنوائی ہے، یوں کہیے کہ چاندی گلوائی ہے۔

دوسرا : اتار تو آسمان کی خبر لاتا ہے، مگر دھواں آسمان کے بھی پار ہو جاتا ہے۔

تخت ایسے تھے کہ جو دیکھتا، دانتوں انگلی دباتا۔ ایک ہاتھی ایسا نادر بنا تھا کہ نقل کو اصل کر دکھایا تھا۔ بعض بعض تخت آدمیوں کو مغالطہ دیتے تھے، خاص کر چند بازوں کا تخت تو ایسا بنایا تھا کہ چند والوں کو شرمایا۔ ایک چند باز نے جھلا کر کہا۔ ان کہاروں کو ہم سے عداوت ہے۔ خدا ان سے سبھے۔ ایک محفل کی تصویر بہت ہی خوبصورت تھی۔ فرش پر بیٹھے لوگ ناچ دیکھ رہے ہیں، سچ میں مسند بچھی ہے، دولہا نیکے لگائے بیٹھا ہے اور سامنے ناچ ہو رہا ہے۔ سب کے پیچھے ایک آدمی ہاتھی پر بیٹھا روپے لٹاتا آتا تھا اور شہدے غل مچاتے تھے۔ ایک ایک روپے پر دس دس گرے پڑتے تھے۔ جان پر کھیل کر پلے پڑتے تھے۔

یہ وہی شریا بیگم ہیں جو ابھی کل تک ماری ماری پھرتی تھیں۔ جن کو ساری دنیا میں کہیں ٹھکانہ نہ تھا، وہی شریا بیگم آج شان سے دہن بنی بیٹھی ہیں اور اس دھوم دھام سے ان کی بارات آتی ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن سبھی مفت میں مل گئے۔ اس وقت ان کے دل میں طرح طرح کے خیال آتے تھے۔ یہاں کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ یہی سرائے میں رہتی تھی، اسی کا نام اللہ رکھی بھیری تھا، پھر تو کہیں کی نہ رہوں۔ اس خیال سے انھیں اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ ادھر دروازے پر بارات آئی اور ادھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ سب نے دہن کو گھیر لیا۔ ارے، خیر تو ہے۔ یہ ہوا کیا، کسی نے پانی کے چھینٹے دیے، کسی نے مٹی پر پانی ڈال کر تنگھایا۔ دہن کی ماں ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔

حشمت : اے، یہ ہوا کیا لٹاں جان؟

فیروزہ : ابھی اچھی خاصی بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے غش آ گیا۔

باہر دلہا نے یہ خبر سنی تو اپنی مہری کو بلوایا اور سمجھایا کہ جا کے پوچھو، اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر کو بلوا لوں۔ مہری نے آکر کہا۔ حضور، اب طبیعت بحال ہے، مگر پسینہ آ رہا ہے اور پانی پانی کرتی ہیں۔ نواب صاحب کی جان میں جان آئی۔ بار بار طبیعت کا حال پوچھتے تھے۔ جب دلہن کی حالت درست ہو گئی تو بھولیوں نے دق کرنا شروع کیا۔

جانی : آخر اس غش کا سبب کیا تھا؟ ہاں، اب سمجھی۔ ابھی صورت دیکھی نہیں اور غش آنے لگے۔

فیروزہ : اے نہیں، کیا جانے اگلی پچھلی کون بات یاد آگئی۔

جانی : صورت سے تو خوشی برسی ہے، وہ ہنسی آئی۔ اے، لو وہ پھر گردن جھکا لی۔

حشمت : یہاں تو پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔

فیروزہ : مزہ تو جب آتا کہ نکاح کے وقت غش آتا، میاں کو بناتے تو، کہ اچھے سبز قدم ہو۔ اب سینے کے محل سے برابر خبریں آرہی ہیں کہ طبیعت اچھی ہے، مگر نواب صاحب کو چین نہیں آتا۔ آخر ڈاکٹر صاحب کو بلوایا۔ ان کا محل میں داخل ہونا تھا کہ بھولیوں نے ان پر آوازیں کسنے شروع کیں۔

ایک : موائسٹس ہے کہ آدی، اچھے بھد بھد کو بلایا۔

دوسری : تو نہ کیا، چار آنے والا فروخ آبادی تربوز ہے؟

تیسری : تمباکو کا پنڈا ہے یا آدی ہے؟

چوتھی : کہہ دو، کوئی اچھا حکیم بلاویں، اس جنگلی ہوش کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔

پانچویں : خدا کی مار ایسے موئے پر۔

ڈاکٹر صاحب کرسی پر بیٹھے، نئے آدی تھے، اردو واجبی ہی واجبی سمجھتے تھے۔ بولے۔

دارود ہوتے کون جاگو؟

مہری : نہیں ڈاکٹر صاحب، درود تو نہیں بتاتیں، مگر دیکھتے دیکھتے غش آ گیا۔

ڈاکٹر : گھاس کس کو بولتے؟

مہری : حضور میں سمجھتی نہیں۔ گھاس کیا؟

ڈاکٹر: کس کس کو بولتے؟ تم لوگ کیا گول مال کرنے مانگتا ہم زبان دیکھتے۔
فیروزہ: نوج ایسا حکیم ہو۔ ڈاکٹر کی دم بتا ہے۔

جانی: کہو نبض دیکھتے۔

ڈاکٹر: نابوض کیا بات ہے۔ ہم لوگ نابوض دیکھنا نہیں مانگتا، زبان دکھائے، زبان اس موافق۔

ڈاکٹر صاحب نے منہ کھول کر زبان باہر نکالی۔

فیروزہ: منہ کا بے کو گھنٹہ بیک کی گڑھیا ہے

جانی: ارے مہری، دیکھتی لیا ہے، منہ میں دھول جھونک دے۔

حشمت: ایک دفعہ پھر منہ کھولے تو میں پتکھے کی ٹھنڈی حلق میں ڈال دوں۔

ڈاکٹر: جس موافق ہم زبان دکھایا، اس موافق ہم دیکھنا مانگتا۔ سب مائی لوگ ہنسی کرتا۔
زبان دیکھانے میں کیا بات ہے۔

فیروزہ: نواب صاحب سے کہو، پہلے اس کے دماغ کا علاج کریں۔

ثریا بیگم جب کسی طرح زبان دکھانے پر راضی نہ ہوئیں تو ڈاکٹر صاحب نے نبض دیکھ کر نسخہ لکھا اور چلتے ہوئے۔ ثریا کا جی کچھ ہلکا ہوا۔ مگر اسی وقت مہمانوں کے ساتھ انھوں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا جو ان سے خوب واقف تھی، وہ میکے میں ان کے ساتھ برسوں رہ چکی تھی۔ ہوش اڑ گئے کہ کہیں یہ پورا حال سب سے کہہ دے تو کہیں کی نہ رہوں۔ اس عورت کا نام مولہ تھا۔ وہ ایک ہی شریر، آوازیں کسنے لگی۔ ایک لڑکے کو گود میں لے کر اس کے ساتھ کھیلنے لگی اور باتوں باتوں میں ثریا بیگم کو ستانے لگی ہم خون پہچانتے ہیں۔ سرائے میں بھی دیکھا تھا۔ محل میں بھی دیکھا تھا۔ اللہ رکھی نام تھا۔ ان فقروں نے ثریا بیگم کو اور بھی بے چین کر دیا، چہرے پر زردی چھا گئی۔ کمرے میں جا کر لیٹ رہیں۔ ادھر مولہ نے بھی سمجھا کی اگر زیادہ چھیڑتی ہوں تو دلہن دشمن ہو جائے گی۔ چپ ہو رہی۔

باہر محفل جی ہوئی تھی۔ دولہا جیوں ہی مسند پر بیٹھا، ایک حسینہ نزاکت کے ساتھ قدم اٹھاتی محفل میں آئی۔ یاروں نے منہ مانگی مراد پائی۔ ایک بوڑھے میاں نے پوچھے منہ سے کہا۔ خدا خیر کریں۔ اس پر محفل بھر نے قہقہہ لگایا اور وہ پری بھی مسکرا کر بولی۔ بوڑھے منہ منہا سے، اس بڑھوتی میں چھیڑ چھاڑ کی سوچھی۔ آپ نے ہنس کر جواب دیا۔ بی بی، ہم بھی

کبھی جوان تھے، بوڑھے ہوئے تو کیا، دل تو وہی ہے۔

یہ پری ناچنے کھڑی ہوئی تو ایسا ستم ڈھایا کہ ساری محفل لوٹ پوٹ ہو گئی۔ تو جوانوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں۔

ایک: بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس کے قدموں پر سر رکھ دوں۔

دوسرا: کل ہی پرسوں ہمارے گھر نہ پڑ جائے تو اپنا نام بدل ڈالوں، دیکھ لینا۔

تیسرا: قسم خدا کی، میں تو اس کی غلامی کرنے کو حاضر ہوں، پوچھو تو کہاں سے آئی

ہے۔

چوتھا: شین قاف سے درست ہے۔

پانچواں: ہم سے پوچھو۔ مراد آباد سے آئی ہے۔

حسینہ نے سریلی آواز میں ایک غزل گائی۔ اس غزل نے محفل کو مست کر دیا۔ ایک صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ چلے، یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم اسے گھر ڈال لیں گے۔ لوگوں نے سمجھایا۔ بھئی، اس رونے دھونے سے کیا مطلب نکلے گا۔ یہ کوئی شریف کی بہو بیٹی تو ہے نہیں ہم کل ہی چٹا لڑا دیں گے۔ مگر اس وقت تو خدا کے واسطے آنسو نہ بہاؤ، ورنہ لوگ نہیں گے۔ انھوں نے کہاں بھائی، دل کو کیا کروں، میں تو خود چاہتا ہوں کہ دل کا حال ظاہر نہ ہو، مگر وہ مانتا ہی نہیں تو میرا کیا قصور ہے۔

یہ حضرت تو رو رہے تھے اور لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ ایک نے کہا یہ ہمارے شہر کی ناک ہیں۔ دوسرا بولا۔ اس میں کیا شک۔ آپ بہت ہی ملنسار، نیک، خوش مزاج ہیں۔ تیسرے صاحب بولے، اے حضرت، دور دور تک شہرت ہے ان کی۔ اب اس شہر میں جو کچھ ہیں یہی ہیں۔

اس جملے میں دو چار دیہاتی بھی بیٹھے تھے۔ ان کو یہ باتیں ناگوار لگیں۔ منے میاں بولے، واہ، اچھا دستور ہے شہر کا، چتریاں کو سامنے بٹھالیا۔

چٹھن: ہمارے دلش میں اگر چتریاں کو کوئی جج میں بٹھائے تو حقہ پانی بند ہو جائے۔ گجراج: چتریاں بیٹھے کا ہے کو، ہمیں نہ کھائے،

نواب: جی ہاں، شہر والے بڑے ہی بے شرم ہوتے ہیں۔

آغا: دیہاتیوں کی لیاقت ہم بے چارے کہاں سے لائیں۔

گمبراج: جی ہے، ہم لوگ عزت دار ہیں۔ کوئی ننگے لٹے نہیں ہیں۔
 آغا: تو جناب، آپ شہر کی مجلس میں کیوں آئے؟
 گمبراج: کاہے کو بلایا، کیا ہم لوگ بن بلائے آئے؟
 آغا: اچھا، اب غصے کو تھوک دیجیے۔

جب یہ لوگ ذرا ٹھنڈے ہوئے، تو اس حسینہ نے ایک فارسی غزل گائی، اس پر ایک کسمن نواب زادے نے جو پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھا، اونچی آواز سے کہا۔ واہ جان من کیوں نہ ہو۔ اس لڑکے کے باپ بھی محفل میں بیٹھے تھے۔ مگر اس لڑکے کو ذرا بھی شرم نہ آئی۔

اس کے بعد طائفہ بدلی گئی۔ یہ آکر محفل میں بیٹھ گئی اور اس کے پیچھے سازندے بھی بیٹھ گئے۔

نواب: اے، خیریت تو ہے؟ اے صاحب، ناچے گائیے۔
 حسینہ: کل سے طبیعت خراب ہے۔ دو ایک چیزیں آپ کی خاطر سے کہیے تو گا دوں۔
 نواب: مزہ کر کر کر دیا، تمہارے ناچ کی بڑی تعریف سنی ہے۔
 حسینہ: کیا عرض کروں۔ آج تو ناچنے کے قابل نہیں ہوں۔
 یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھمری شروع کر دی۔ ادھر بڑے نواب صاحب محل میں گئے اور جہاں دہن کا پلنگ تھا، وہاں بیٹھے۔ خواص نے چکنی ڈلی، الاپچی، گوریاں پیش کیں۔ عطر کی شیشیاں سامنے رکھیں۔ بڑے نواب صاحب حقہ پینے لگے۔
 ثریا کی ماں پردے کی آڑ سے بولیں۔

بڑے نواب: بندگی، خدا کرے، اس کی اولاد دیکھو۔
 بیگم: خدا آپ کی دعا قبول کریں۔ شکر ہے کہ اس شادی کی بدولت آپ کی زیارت ہوئی۔

بڑے نواب: دہن سے پوچھوں: کیوں بیٹی، میرے لڑکے سے تمہارا نکاح ہوگا۔ تم اسے منظور کرتی ہو؟

ثریا بیگم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بڑے نواب صاحب نے کئی مرتبہ یہی سوال پوچھا، مگر دہن نے سراو پر نہ اٹھایا۔ آخر جب حشمت بہو نے آکر کہا۔ کیا سب کو دق کرتی ہو،

جی تو چاہتا ہوگا کہ بے نکاح ہی چل دو، مگر غروں سے باز نہیں آتی ہو۔ تب شریا بیگم نے آہستہ سے کہا۔ ہوں۔

بڑی بیگم: آپ نے سنا؟

بڑے نواب: جی نہیں ذرا بھی نہیں سنا۔

بڑی بیگم نے کہا۔ آپ لوگ ذرا خاموش ہو جائیں تو نواب صاحب لڑکی کی آواز سن لیں۔ جب سب خاموش ہو گئیں تو دلہن نے پھر آہستہ سے کہا۔ ہوں۔

ادھر نوشا کے دوست اس سے مذاق کر رہے تھے۔

ایک: آپ سے جو پوچھا جائے کہ نکاح منظور ہے یا نہیں، تو آپ گھٹے بھر تک جواب نہ دیجیے گا۔

دوسرا: اور نہیں تو کیا، ہاں کہہ دیں گے؟

تیسرا: جب لوگ ہاتھ حیر جوڑنے لگیں، تب آہستہ سے کہنا، منظور ہے۔

چوتھا: ایسا نہ ہو، تم فوراً منظور کر لو اور ادھر والے ہماری ہنسی اڑائیں۔

دولہا: دولہا تو نہیں بنے، مگر باراتیں تو بہت دیکھی ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی یہی مرض ہے تو میں دو گھنٹے میں منظور کروں گا۔

اب مہر پر تکرار ہونے لگی۔ دلہن کے بھائی نے کہا۔ مہر چار لاکھ سے کم نہ ہوگا۔ بڑے نواب صاحب بولے۔ بھائی، اور بھی بڑھا دو، چار لاکھ میری طرف سے پورے آٹھ لاکھ کا مہر بندھے۔

نکاح کے بعد کشتیاں آئیں۔ کسی میں دو شالا، کسی میں بھاری بھاری بار، طشتریوں میں چکنی ڈلی، الاپچی، پان، شیشیوں میں عطر۔ کسی کشتی میں مضائیاں اور مصری کے کوزے۔ جب قاضی صاحب رخصت ہو گئے تو دولہا نے پانچ اشرفیاں نذر دکھائی۔ نواب صاحب باہر آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد محل سے شربت آیا۔ نواب صاحب نے اکیس اشرفیاں دیں۔ دلہن کے خدمت گار نے پانچ اشرفیاں پاکیں۔ پہلے تو دو شالا مانگتا رہا، مگر لوگوں کے سمجھانے سے انعام لے لیا۔ دلہن کے لیے جھوٹا شربت بھیجا گیا۔ محفل والوں نے شربت پیا، ہار گلے میں ڈالا، عطر لگایا اور پان کھا کر گانا سننے لگے۔ اتنے میں اندر سے آدمی دولہا کو بلانے آیا۔ دولہا یہاں سے خوش خوش چلا۔ جب ڈیوڑھی میں پہنچا تو اس کی بہنوں نے آنچل ڈالا اور لے جا کر دلہن

کے پاس مسند پر بیٹھا دیا۔ ڈومینوں نے ریت رسم شروع کی۔ پہلے آرسی کی رسم ادا کی۔
فیروزہ: کیسے، بی بی منہ کھولو! میں تمہارا غلام ہوں۔

نواب: بی بی منہ کھولو، میں تمہارے غلام کا غلام ہوں۔
حشمت: جب تک ہاتھ نہ جوڑو گے، منہ نہ کھولے گی۔

مبارک محل: اوپر کے دل سے غلام بنتے ہو، دل سے کہو تو آنکھیں کھول دیں۔

نواب: یا خدا، اب اور کیوں کر کہوں، بی بی تمہارا غلام ہوں۔ خدا کے لیے ذرا صورت دکھا دو۔

دولہا نے ایک دفعہ جھوٹ موٹ غل مچا دیا، وہ آنکھیں کھولیں۔ سکھیوں نے کہا جھوٹ کہتے ہو، کون کہتا ہے آنکھ کھولی۔

ڈومنی: بیگم صاحب، اب آنکھیں کھولیں، بے چارے غلام بنتے بنتے تھک گئے۔ آپ فقط آنکھ کھول دیں۔ وہ آپ کو دیکھیں۔ آپ چاہے انہیں نہ دیکھیں۔

فیروزہ: واہ، دولہا تو چاہے پیچھے دیکھے، یہ پہلے ہی گھور لیں گی۔

آخر ثریا بیگم نے ذرا سراخا اور نواب سے چار آنکھیں ہوتے ہی شرما کر گردن نیچے کر

لی۔

نواب: کیسے۔ اب آنکھیں کھولیں یا اب بھی نہیں کھولیں۔

فیروزہ: ابھی ناحق آنکھیں کھولیں، جب قدموں پر ٹوپی رکھتے تب آنکھیں کھولتیں۔

دولہا نے اکیس پان کی بیڑا کھایا، پانچاے میں ایک ہاتھ سے ازار بند ڈالا اور تب

ساس کو سلام کیا۔ ساس نے دعا دی اور گلے میں موتیوں کا ہار ڈال دیا۔ اب مصری چنوانے

کی رسم ادا ہوئی۔ دلہن کے کندھے، گھٹنے، ہاتھ وغیرہ پر مصری سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے

رکھے گئے اور دولہا نے جھک جھک کر کھائے۔ ثریا بیگم کو گدگدی معلوم ہو رہی تھی۔ سالیوں

دولہا کو چھیڑ رہی تھیں۔ کسی نے چٹکی لی، کسی نے گدی پر ہاتھ پھیرا، یہ بے چارے ادھر ادھر

دیکھ کر رہ جاتے تھے۔

جانی: فیروزہ بیگم جیسی چربانک سالی بھی نہ دیکھی ہوگی۔

نواب: ایک چربانک ہو تو کہوں یہاں تو جو ہے آفت کا پر کالا ہے اور فیروزہ بیگم کا تو

کہنا ہی کیا، سوار کو گھوڑے پر سے اتار لیں۔

فیروزہ: کیا تعریف کی ہے، واہ۔ واہ!
 جانی: کیا کچھ جھوٹ ہے؟ تمہاری زبان کیا کترنی ہے۔
 فیروزہ: اور تم اپنی کہو، دولہا کو تو اسی وقت سے گھور رہی ہو۔ ان کی نظر بھی پڑتی ہے
 تمہیں پر۔

جانی: بھڑ پڑا ہی جا ہے، پہلے اپنی صورت تو دیکھو۔
 فیروزہ: شیا بیگم گاتی خوب ہیں اور بتانے میں تو استاد ہیں، کوئی کھٹک ان کے سامنے
 کیا ناچے گا۔ کہو ایک ہتھکڑی بولے، کہو دونوں بولیں اور تلوار پر تو ایسا ناچتی ہیں کہ بس کچھ نہ
 پوچھو۔

جانی: سنا، کسی کھٹک نے دل لگا کے ناچنا سکھا ہے۔ نواب صاحب کی چاندی ہے، روز
 مفت کا ناچ دیکھیں گے۔
 حشمت: بھئی، اتنی بے حیائی اچھی نہیں، ہنسی دل لگی کا بھی ایک موقع ہوتا ہے۔

فیروزہ: ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کون سا موقع ہوتا ہے، بارات کے دن نہ ہنسے
 بولیں تو پھر کس دن ہنسے بولیں؟

اس طرح ہنسی دل لگی میں رات کٹ گئی۔ سویرے چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دلہن
 کی ماں بہنیں سب کی سب رونے لگیں۔ ماں نے سہن سے کہا۔ بہن لوٹنی دیتی ہوں، اس
 پر مہربانی کی نگاہ رہے۔ وہ بولیں، کیا کہتی ہو؟ اولاد سے زیادہ ہے۔ جس طرح اپنے لڑکوں کو
 سمجھتی ہوں اسی طرح اس کو بھی سمجھوں گی اس کے بعد دولہا نے دلہن کو گود میں اٹھا کر
 سکھپال پر سوار کیا۔ سہن گلے مل کر رخصت ہوئی۔

جب بارات دولہا کے گھر پر آئی، تو ایک بکرا چڑھایا گیا، اس کے بعد کہاریاں پالکی کو
 اٹھا کر زنانی ڈیوڑھی پر لے گئیں۔ تب دولہا کی بہن نے آکر دلہن کے پاؤں دودھ سے
 دھوئے اور تلوے میں چاندی کے ورق لگائے۔ اس کے بعد دولہا نے دلہن کے دامن پر نماز
 پڑھی پھر کھیر آئی۔ پہلے دلہن کے ہاتھ پر رکھ کر دولہا کو کھلائی گئی، پھر دولہا کے ہاتھ پر کھیر رکھی
 گئی اور دلہن سے کہا گیا کہ کھاؤ، تو وہ شرمانے لگی۔ آخر دولہا کی بہنوں نے دولہا کا ہاتھ دلہن
 کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس طرح یہ رسم ادا ہوئی، پھر منہ دکھاوے کی رسم پوری ہوئی اور
 دولہا باہر آیا۔

شہزادہ ہمایوں فرکی موت جس نے سنی، کلیجہ ہاتھوں سے تمام لیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سپہر آرا یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے گی اور سسک سسک کر شہزادے کی یاد میں جان دے دیں گی۔ مگر میں کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ سپہر آرا کو سمجھائے یا تسکین دے۔ اگر کسی نے ڈرتے ڈرتے سمجھایا بھی تو وہ اور رونے لگتیں اور کہتیں۔ کیا اب تمہاری یہ مرضی ہے کہ میں روؤں بھی نہ، دل ہی میں گھٹ گھٹ مروں۔ دو تین دن تک وہ قبر پر جا کر پھول چنتی رہی۔ کبھی قبر کو چومتی، کبھی خدا سے دعا مانگتی کہ اے خدا، شہزادے بہادر کی صورت دکھا دے، کبھی آپ ہی آپ مسکراتی، کبھی قبر کی چٹ چٹ بلائیں لیتی۔ ایک آنکھ سے ہنستی، ایک آنکھ سے روتی۔ چوتھے دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ وہاں گئیں۔ چمن میں ٹہلنے ٹہلنے اے آزاد کی یاد آ گئی۔ حسن آرا سے بولی۔ بہن، اگر دوہرا بھائی آجائیں تو ہمارے دل کو تسکین ہو۔ خدا نے چاہا تو وہ دو چار دن میں آتا ہی چاہتے ہیں۔

حسن آرا: اخباروں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی ختم ہو گئی۔

سپہر آرا: کل میں اماں جان کو بھی لاؤں گی۔

ایک استانی جی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ استانی جی سے کسی فقیر نے کہا تھا کہ جمعرات کے دن شہزادہ جی اٹھے گا اور کسی کو تو اس بات کا یقین نہ آیا تھا مگر استانی جی کو اس کا پورا یقین تھا بولیں۔ کل نہیں پرسوں بیگم صاحب کو لانا۔

سپہر آرا: استانی جی اگر میں یہیں دس پانچ دن رہوں تو کیا ہو؟

استانی: بیٹا، تم ہو کس فکر میں؟ جمعرات کے دن دیکھو تو، اللہ کیا کرتا ہے، پرسوں ہی تو جمعرات ہے، دو دن تو بات کرتے کلتے ہیں۔

سپہر آرا: خوشی کا تو ایک مہینہ بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا، مگر رنج کی ایک رات پہاڑ ہو جاتی ہے۔ خیر دو دن اور سہی، شاید آپ ہی کا کہنا سچ نکلے۔

حسن آرا: استانی جی جو کہیں گی۔ سمجھ بوجھ کر کہیں گی۔ شاید اللہ کو اس غم کے بعد خوشی دکھانی منظور ہو۔

سپہر آرا نے قبر پر چڑھانے کے لیے پھول توڑتے ہوئے کہا۔ پھول تو دو ایک دن ہنس

بھی لیتے ہیں، مگر کلیاں بن کھلے مرجھا جاتی ہیں، ان پر ہمیں ترس آتا ہے۔
 استانی: جو کھلے دے بھی مرجھا گئے، جو نہیں کھلے وہ بھی مرجھا گئے۔ انسان کا بھی یہی حال ہے، آدمی سمجھتا ہے کہ موت کبھی آئے گی ہی نہیں۔ مکان بنواوے گا تو سوچے گا کہ ہزار برس تک اس کی بنیاد ایسی ہی رہے لیکن یہ خبر ہی نہیں کہ 'سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بجارا' سب سے اچھے وہ لوگ ہے جن کو نہ خوشی سے خوشی ہوتی ہے نہ غم سے غم۔
 حسن آرا: کیوں استانی جی، آپ کو اس فقیر کی بات کا یقین ہے؟
 استانی: اب صاف صاف کہہ دوں، آج کے دوسرے دن ہمایوں فر یہاں نہ بیٹھے ہوں تو کسی۔

حسن آرا: تمہارے منہ میں کتنی شکر، کل بھی کچھ دور نہیں ہیں، کل کے بعد ہی تو پرسوں آئے گا۔

سپر آرا: باجی جان، مجھے تو ذرا بھی یقین نہیں آتا۔ بھلا آج تک کسی نے یہ بھی سنا ہے کہ مردہ قبر سے نکل آیا؟
 یہ بات ہوتی ہی تھی کہ قبر کے پاس ہنسی کی آواز آئی، سب کو حیرت تھی کہ یہ قہقہہ کس نے لگایا۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔

دس بجتے بجتے سب کی سب گھر لوٹ آئیں۔ یہاں پہلے ہی سے ایک شاہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں بہنوں کو دیکھتے ہی مہری نے آکر کہا۔ حضور، یہ بڑے پینچے ہوئے فقیر ہیں، یہ ایسی باتیں کہتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ صاحب کے بارے میں لوگوں کو دھوکا ہوا تھا۔ وہ مرے نہیں ہے بلکہ زندہ ہیں۔ استانی جی نے شاہ صاحب کو اندر بلایا اور بولی۔ آپ کو اس وقت بڑی تکلف ہوئی، مگر ہم ایسی مصیبت میں گرفتار ہیں کہ خدا ساتویں دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

شاہ صاحب: خدا کی کارسازی میں دخل دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شہزادہ ہمایوں فر زندہ ہیں۔ یوں تو یہ بات محال معلوم ہوتی ہے، لیکن انسان کیا، اور اس کو سمجھ کیا۔ اتنا تو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ ہم کون ہیں، پھر کوئی خدا کی باتوں کو کیا سمجھے گا؟

استانی: آپ ابھی تو نہیں رہیں گے؟

شاہ صاحب : میں اس وقت یہاں سے جاؤں گا، جب دولہا کے ہاتھ میں دلہن کا ہاتھ ہوگا۔

استانی : مگر دلہن کو تو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا۔ آپ کچھ کمال دکھائیں تو یقین آئے۔

شاہ صاحب : اچھا تو دیکھیے۔

شاہ صاحب نے تھوڑی سی ارد منگوائی اور اس پر کچھ بڑھ کر زمین پر پھینک دی۔ آدھ کھٹے بھی نہ گزرا تھا کہ وہاں کی زمین پھٹ گئی۔

بڑی بیگم : اب اس سے بڑھ کر کیا کمال ہو سکتا ہے۔

سپہر آرا : اماں جان، اب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شاید شاہ صاحب ٹھیک کہتے ہوں۔ (حسن آرا سے) باجی، اب تو آپ فقیروں کے کمال کی قائل ہوئی۔

استانی : ہاں بیٹھا اس میں شک کیا ہے۔ فقیروں کا کوئی آج تک مقابلہ کر سکا ہے؟ وہ لوگ بادشاہی کی کیا حقیقت سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب : فقیروں پر شک انھیں لوگوں کو ہوتا ہے جو کامل فقیروں کی حالت سے واقف نہیں۔ ورنہ فقیروں نے مردوں کو زندہ کر دیا ہے۔ منزلوں سے آپس میں باتیں کی ہیں اور آگے کا حال بتا دیا ہے۔

بیگم صاحب نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا اور یہ خبر سنائی۔ اس پر لوگ طرح طرح کے شبہ کرنے لگے۔ انھیں یقین ہی نہ تھا کہ مردہ کبھی زندہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن بیگم صاحب نے خوب تیاریاں کیں۔ گھر بھر میں صرف حسن آرا کے چہرے سے رنج ظاہر ہوتا تھا باقی سب خوش تھے کہ منہ مانگی مراد پائی۔ حسن آرا کو خوف تھا کہیں سپہر آرا کی جان کے لالے نہ پڑ جائیں۔

تمام شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی اور جمعرات کو چار گھڑی دن رہے سے میلہ جمع ہونے لگا۔ وہ بھیڑ ہو گئی کہ کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ لوگوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔

ایک : مجھے تو یقین ہے کہ شہزادے آج زندہ ہو جائیں گے۔

دوسرا : بھلا فقیروں کی بات کہیں غلط ہوتی ہے؟

تیسرا : اور ایسے کامل فقیروں کی۔

چوتھا: وعدہ یا پھل پہار کی چوٹی پر برسوں نیم کی چپاں ابال کر نمک کے ساتھ کھائی ہیں۔ قسم خدا کی، اس میں ذرا جھوٹ نہیں۔

پانچواں: سلطان علی کی بہو تین ن تیک خون تھوکا کیں، ویدھ بھی آئے، حکم بھی آئے، پر کسی سے کچھ نہ ہوا۔ تب میں جا کے امیں شاہ صاحب کو بلا لایا۔ جا کر ایک نظر اس کو دیکھا اور بولے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سب لوگ یہاں سے ہٹ جائیں، صرف میں اور یہ لڑکی رہے۔ لڑکی کے باپ کو شاہ صاحب پر پورا بھروسہ تھا۔ سب آدمیوں کو ہٹانے لگا۔ یہ دیکھ کر شاہ صاحب ہنسنے اور کہا، اس لڑکی کو خون نہیں آتا۔ یہ تو بالکل اچھی ہے۔ یہ کہہ کر شاہ صاحب نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا، تب سے آج تک اسے خون نہیں آیا۔ فقیروں ہی سے دنیا قائم ہے۔

اسنے میں خبر ہوئی کہ دلہن گھر سے روانہ ہو گئی ہیں۔ تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ اور بھی زیادہ ہو گئی۔ ادھر پہرہ آرانے گھر سے باہر پاؤں نکالا تو بڑی بیگم نے کہا۔ خدا نے چاہا تو آج فتح ہے، اب ہمیں ذرا بھی شک نہیں رہا۔

پہرہ آرا: اماں جان بس اب ادھر یا ادھر یا تو شہزادہ کو لے کے آؤں گی، یا وہیں میری بھی قبر بنے گی۔

بیگم: بیٹی، اس وقت بد شکونی کی باتیں نہ کرو۔

پہرہ آرا: اماں جان، دودھ تو بخش دو، یہ آخری دیدار ہے۔ بہن کہا سنا معاف کرنا، خدا کے لیے میرا ماتم نہ کرنا۔ میری تصویر آبنوس کے صندوق میں ہے، جب تم سب ہنسو بولو تو میری تصویر بھی سامنے رکھ لیا کرنا۔ اے اماں جان، تم روتی کیوں ہو؟

بہار بیگم: کیسی باتیں کرتی ہو پہرہ آرا واہ!

روح افزا: بہن، جو ایسا ہی ہے تو نہ جاؤ۔

بڑی بیگم: حسن آرا، بہن کو سمجھاؤ۔

حسن آرا کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ مشکل سے بولی۔ کیا سمجھاؤں۔

پہرہ آرا: اماں جان آپ سے ایک عرض ہے، میری قبر بھی شہزادے کی قبر کے پاس ہی بنوانا۔ جب تک تم اپنے منہ سے نہ کہو گی، میں قدم باہر نہ رکھوں گی۔

بڑی بیگم: بھلا بیٹی، میرے منہ سے یہ بات نکلے گی! لوگوں، اس کو سمجھاؤ، اسے کیا ہو

گیا ہے۔

استانی: آپ اچھا کہہ دیں، بس۔

سپہر آرا: میں اچھا اچھا نہیں جانتی، جو میں کہوں وہ کیسے۔

استانی: پھر دل کو مضبوط کر کے کہہ دو صاحب۔

بڑی بیگم: نا، ہم سے نہ کہا جائے گا۔

حسن آرا: بہن، جو تم کہتی ہو وہی ہوگا۔ اللہ وہ گھڑی نہ دیکھائے، اب ہٹھ نہ کرو۔

سپہر آرا: میری قبر پر کبھی کبھی آنسو بہا لیا کرنا باجی جان۔ میں سوچتی ہوں کہ تمہارا دل

کیسے بہلے گا۔

یہ کہہ کر سپہر آرا بہنوں سے گلے ملی اور سب کی سب روانہ ہوئیں۔ اب سواریاں قلعے

کے پھاٹک پر پہنچی تو شاہ صاحب نے حکم دیا کہ دلہن گھوڑے پر سوار ہو کر اندر داخل ہو۔ بیگم

صاحب نے حکم دیا، گھوڑا لایا جائے۔ سپہر آرا گھوڑے پر سوار ہوئی اور گھوڑے کو اڑاتی ہوئی قبر

کے پاس پہنچ کر بولی۔ اب کیا حکم ہوتا ہے؟ خود آؤ گے یا ہم کو بھی یہیں سلاؤ گے۔ ہم ہر

طرح راضی ہیں۔

سپہر آرا کا اتنا کہنا تھا کہ سامنے روشنی نظر آئی۔ ایسی تیز روشنی تھی کہ سب کی نظر جھپک

گئی اور ایک لمحے میں شہزادہ ہمایوں فر گھوڑے پر سوار آتے ہوئے دکھائی دیے۔ انھیں دیکھتے

ہی لوگوں نے اتنا غل چپایا کہ سارا قلعہ گونج اٹھا۔ سب کو حیرت تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ

مردہ جس کی قبر بن گئی ہو اور جس کو مرے ہوئے ہفتوں گزر گئے ہوں۔ وہ کیوں کر جی اٹھا۔

حسن آرا اور شہزادہ کی بہن خورشید میں باتیں ہونے لگیں۔

حسن آرا: کیا کہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا!

خورشید: ہماری عقل بھی کچھ کام نہیں کرتی۔

حسن آرا: تم اچھی طرح کہہ سکتی ہو کہ ہمایوں فر یہی ہیں؟

خورشید: ہاں صاحب، یہی ہیں۔ یہی میرا بھائی ہے۔

اور لوگوں کو بھی یہی حیرت ہو رہی تھی۔ اکثر آدمیوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ شہزادہ

ہیں۔

ایک آدمی: بھائی، خدا کی ذات سے کوئی بات بعید نہیں۔ مگر یہ ساری کرامات شاہ

صاحب کی ہے۔

تیسرا: جیسی تو دعا میں اتنی طاقت ہے۔

(99)

نواب وجاحت حسین صبح کو جب دربار میں آئے تو نیند سے آنکھیں جھکی پڑتی تھیں۔ دوستوں میں جو آتا تھا، نواب صاحب کو دیکھ کر پہلے مسکراتا تھا۔ نواب صاحب بھی مسکرا دیتے تھے۔ ان دوستوں میں رونق الدولہ اور مبارک حسین بہت بے تکلف تھے۔ انھوں نے نواب صاحب سے کہا۔ بھائی، آج چوتھی کے دن ناچ نہ دکھاؤ گے؟ کچھ ضروری ہے کہ جب کوئی طائفہ بلوایا جائے تو بدی ہی دل میں ہو؟ ارے صاحب، گانا سنئے، ناچ دیکھیے، بنیے، بولے، شادی کو دو دن بھی نہیں ہوئے اور حضور ملا بن بیٹھے۔ مگر یہ مولوی پن ہمارے سامنے نہ چلنے پائے گا۔ اور دوستوں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ یہاں تک کہ مبارک حسین جا کر کئی طائفے بلا لائے، گانا ہونے لگا۔ رونق الدولہ نے کہا۔ کوئی فارسی غزل کہیے تو خوب رنگ جیے۔ حسین: رنگ جمانے کی جس کو ضرورت ہو وہ یہ فکر کرے، یہاں تو آکے محفل میں بیٹھے بھر کی دیر ہے۔ رنگ آپ ہی آپ جم جائے گا۔ گا کر رنگ جمایا تو کیا جمایا؟ رونق: حسن کا بھی بڑا غرور ہوتا ہے، کیا کہنا۔

حسین: ہوتا ہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، حسن سے بڑھ کر کون دولت ہے۔
گجڑے دل: اب آپس ہی میں دانہ بدلول ہو گا یا کسی کی سنوگی بھی، اب کچھ گاؤ۔
رونق: یہ غزل شروع کر دو۔

بہار آئی ہے بھر بے بادہ گلگوں سے پیانہ
رہے ساقی تیرا لاکھوں برس آباد سے خانہ
اتنے میں محل سرا سے دولہا کی طلبی ہوئی۔ نواب صاحب محل میں گئے تو دلہن اور دولہا کو
آمنے سامنے بیٹھایا گیا۔ دسترخوان بچھا، چاندی کی لگن رکھی گئی۔ ڈوئیاں آئیں اور انھوں نے
دلہن کو دونوں ہاتھوں میں دولہا کے ہاتھ سے ترکاری دی، پھر دلہن کے ہاتھوں سے دولہا کو
ترکاری دی، تب گانا شروع کیا۔
اب ترکارپاں اچھلنے لگیں۔ دولہا کی سالی نے نارنگی کھینچ ماری، حشمت بہو اور جانی بیگم

حے دولہا کو بہت دق کیا۔ آخر دولہا نے بھی حملہ کر ایک چھوٹی سی تاریکی بیگم کو تاک کر لگائی۔
جانی بیگم: تو تھپ کا ہے کی ہے۔ شرماتی کیا ہو؟
مبارک محل: ہاں، شرمانے کی کیا بات ہے، اور ہے بھی تو تم کو شرم کا ہے کی۔ شرمائے تو وہ جس کو کچھ حیا ہو۔

حشمت بہو: تم بھی پھینکو فیروزہ بہن! تم تو ایسی شرمائی کہ اب ہاتھ ہی نہیں اٹھتا۔
فیروزہ: شرماتا کون ہے، کیوں جی پھر میں بھی ہاتھ چلاؤں؟
دولہا: شوق سے حضور ہاتھ چلائے، ابھی تک تو زبان ہی چلتی تھی۔
فیروزہ: اب کیا جواب دوں، جاؤ چھوڑ دیا تم کو۔

اب چاروں طرف سے میوے اچھلنے لگے۔ سب دولہے پر تاک تاک کر نشانہ مارتی تھیں۔ مگر دولہا نے بس ایک فیروزہ کو تاک لیا تھا۔ جو میوہ اٹھایا انھیں پر پھینکا۔ تاریکی پر تاریکی پڑنے لگی۔

تھوڑی دیر تک چہل پہل رہی۔

فیروزہ: ایسے ڈھیٹ دولہا بھی نہیں دیکھے۔

دولہا: اور ایسی چنچل بیگم بھی نہیں دیکھی۔ اچھا یہاں اتنی ہیں کوئی کہہ دے کہ تم جیسی شوخ اور چنچل عورت کسی نے آج تک دیکھی ہے؟

فیروزہ: ارے، یہ تم ہمارا نام کہاں سے جان گئے صاحب؟

دولہا: آپ مشہور عورت ہیں یا ایسی ویسی۔ کوئی ایسا بھی ہے جو آپ کو نہ جانتا ہو؟

فیروزہ: تمہیں قسم ہے، بتاؤ ہمارا نام کہاں سے جان گئے؟

مبارک محل: بڑی ڈھیٹ ہیں۔ اس طرح باتیں کرتی ہیں، جیسے برسوں کی بے تکلفی ہو۔

فیروزہ: اے تو تم کو اس سے کیا اس کی فکر ہوگی تو ہمارے میاں کو ہوگی تم کا ہے تو کانپتی جاتی ہو۔

دولہا: آپ کے میاں سے اور ہم سے بڑا یارانہ ہے۔

فیروزہ: یارانہ نہیں وہ ہے۔ وہ بے چارے کسی سے یارانہ نہیں رکھتے، اپنے کام سے

کام ہے۔

دولہا: بھلا بتاؤ تو ان کا نام کیا ہے۔ نام لو تو جانیں کہ بڑی بے تکلف ہو۔

فیروزہ: ان کا نام، ان کا نام ہے نواب و حاجت حسین۔

دولہا: بس، اب ہم ہار گئے، خدا کی قسم ہار گیا۔

مبارک محل: ان سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا۔ جب مردوں سے ایسی بے تکلفی ہیں تو ہم لوگوں کی بات ہی کیا، مگر اتنی شوفی نہیں چاہیے۔

فیروزہ: اپنی اپنی طبیعت، اس میں بھی کسی کا اجارہ ہے۔

دولہا: ہم تو آپ سے بہت خوش ہوئے، بڑی ہنس کھ ہو۔ خدا کرے، روز دو دو باتیں

ہو جایا کریں۔

جب سب رسمیں ہو چکیں تو اور عورتیں رخصت ہوئیں۔ صرف دولہا اور دلہن رہ گئے۔

نواب: فیروزہ بیگم تو بڑی شوخ معلوم ہوتی ہیں۔ بعض بعض موقع پر میں شرما جاتا تھا، پر وہ نہ شرماتی تھیں۔ جو میری بی بی ایسی ہوتی تو مجھ سے دم بھر نہ بنتی۔ غضب خدا کا۔ غیر مرد سے اس بے تکلفی سے باتیں کرنا برا ہے۔ تم نے تو پہلے انھیں کاہے کو دیکھا ہوگا۔

ثریا: جیسے مفت کی ماں مل گئی اور مفت کی بنائیں بن بیٹھیں، ویسے ہی یہ بھی مفت مل گئیں۔

نواب: مجھے تو تمہاری ماں پر ہنسی آتی تھی کہ بالکل اس طرح پیش آتی تھیں جیسے کوئی خاص اپنے داماد کے ساتھ پیش آتا ہے۔

ثریا: آپ بھی تو فیروزہ بیگم کو خوب گھور رہے تھے۔

نواب: کیوں مفت میں الزام لگاتی ہو، بھلا تم نے کیسے دیکھ لیا؟

ثریا: کیوں؟ کیا مجھے کم سو جھتا ہے؟

نواب: گردن جھکائے دلہن بنی تو بیٹھی تھیں، کیسے دیکھ لیا کہ میں گھور رہا تھا، اور ایسی خوبصورت بھی تو نہیں ہیں۔

ثریا: مجھ سے خود اس نے قسمیں کھا کر یہ بات کہی۔ اب سنے، اگر میں نے سن پایا کہ آپ نے کسی سے دل ملایا، یا ادھر ادھر سیر پائے کرنے لگے تو مجھ سے دم بھر بھی نہ بنے گی۔

نواب: کیا مجال، ایسی بات ہے بھلا!

ثریا: ہاں خوب یاد آیا، بھول ہی گئی تھی۔ کیوں صاحب، یہ نارنگیاں کھینچ مارنا کیا حرکت

تھی؟ ان کی شوخی کا ذکر کرتے ہو اور اپنی شرارت کا حال نہیں کہتے۔

نواب: جب اس نے دق کیا تو میں بھی مجبور ہو گیا۔

ثریا: کس نے دق کیا؟ وہ بھلا بے چاری کیا دق کرتی تم کو! تم مرد اور وہ عورت

ذات۔

نواب: اجی، وہ سوا مرد ہے۔ مرد اس کے سانے پانی بھرے۔

ثریا: تم بھی چھپے ہوئے ہو۔

اسی کمرے میں کچھ اخبار پڑے تھے، ثریا بیگم کی نگاہ ان پر پڑی تو بولی۔ ان اخباروں

کو پڑھتے پڑھاتے بھی ہو یا یوں ہی رکھ چھوڑے ہیں؟

نواب: کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں۔ یہ دیکھو، تازہ اخبار ہے۔ اس میں آزاد نام کے ایک

آدمی کی خوب تعریف چھپی ہے۔

ثریا: ذرا مجھے تو دینا، ابھی دے دوں گی۔

نواب: پڑھ رہا ہوں ذرا ٹھہر جاؤ۔

ثریا: اور ہم چھین لیں تو۔ اچھا زور زور سے پڑھو، ہم بھی سنیں۔

نواب: انھوں نے لڑائی میں ایک بڑی فتح پائی ہے۔

ثریا: سناؤ، سناؤ۔ خدا کریں، وہ سرخرو ہو کر آئیں۔

نواب: تم ان کو کہاں سے جانتی ہو۔ کیا کبھی دیکھا ہے؟

ثریا: واہ، دیکھنے کی اچھی کمی۔ ہاں، اتنا سنا ہے کہ ترکوں کی مدد کرنے کے لیے روم

گئے تھے۔

(100)

شہزادہ ہمایوں فر کے جی اٹھنے کی خبر گھر گھر مشہور ہو گئی۔ اخباروں میں اس کا ذکر

ہونے لگا۔ ایک اخبار نے لکھا، جو لوگ اس معاملے میں کچھ شک کرتے ہیں انھیں سوچنا

چاہیے کہ خدا کے لیے کسی مردے کو جلا دینا کوئی مشکل بات نہیں۔ جب ان کی ماں اور بہنوں

کو پورا یقین ہے تو پھر شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

دوسرے اخبار نے لکھا..... ہم دیکھتے ہیں کہ سارا زمانہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ اگر سرکار ہمارا

کہنا مانے تو ہم اس کو صلاح دیں گے کہ ایک سرے سے پاگل خانے بھیج دے۔ غضب خدا کا، اچھے اچھے پڑھے آدمیوں کو پورا یقین ہے کہ ہمایوں فرزندہ ہو گئے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں، یاروں، کچھ عقل بھی رکھتے ہو۔ کہیں مردے بھی زندہ ہوتے ہیں؟ بھلا کوئی عقل رکھنے والا آدمی یہ بات مانے گا کہ ایک فقیر کی دعا سے مردہ جی اٹھا۔ قبر بنی کی بنی ہی رہی اور ہمایوں فرماہر موجود ہو گئے۔ جو لوگ اس پر یقین کرتے ہیں ان سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سرکار اس معاملے میں پوری تحقیقات کریں۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی آدمی شہزادی بیگم کو بہکا کر ہمایوں فر بن بیٹھا ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شہزادی بیگم کی جائداد کا مالک ہو گیا۔

ضلع کے حکام کو بھی اس معاملے میں شک پیدا ہوا۔ کلکٹر نے پولس کے کپتان کو بلا کر صلاح کی کہ ہمایوں فر سے ملاقات کی جائے۔ یہ فیصلہ کر کے دونوں گھوڑے پر سوار ہوئے اور دن سے شہزادی بیگم کے مکان پر جا پہنچے۔ ہمایوں فر کے بھائی نے سب سے ہاتھ ملایا اور عزت کے ساتھ بیٹھایا۔ زنانے میں خبر ہوئی تو شہزادی بیگم نے کہا۔ ہم شاہ صاحب کے حکم کے بغیر ہمایوں فر کو باہر نہ جانے دیں گے۔

لیکن جب شاہ صاحب سے پوچھا گیا تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہمایوں فر محل سرا سے باہر نہیں نکل سکتے۔ وہ باہر آئے اور میں نے اپنا راستہ لیا۔ ہاں، صاحب کو جو کچھ پوچھنا ہو، لکھ کر پوچھ سکتے ہیں۔ آخر ہمایوں فر نے صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیجا۔ صاحب نے اپنی جیب سے ہمایوں فر کا ایک پرانا خط نکالا اور دونوں خطوں کو ایک سا پا کر بولے۔ اب تو مجھے بھی یقین آ گیا کہ یہ شہزادہ ہمایوں فر ہی ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا، وہ فقیر کیوں انھیں ہم سے ملنے نہیں دیتا۔ آخر انھوں نے ہمایوں فر کے بھائی سے پوچھا، آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمایوں فر ہیں یہیں؟ لڑکا ہنس کر بولا۔ آپ کو یقین ہی نہیں آتا تو کیا کیا جائے۔ آپ خود چل کر دیکھ لیجیے۔

شہزادی بیگم نے جب دیکھا کہ حکام ٹالے نہ ٹالیں گے تو انھوں نے شہزادہ کو ایک کمرے میں بیٹھا دیا۔ حکام برآمدے میں بیٹھائے گئے۔ صاحب نے پوچھا۔ ویل شہزادہ ہمایوں فر، یہ سب کیا بات ہے؟

شہزادہ : خدا کے کارخانے میں کسی کو دخل نہیں۔

صاحب : آپ شہزادہ ہمایوں فری ہیں یا کوئی اور ؟

شہزادہ : کیا خوب، اب تک شک ہے ؟

صاحب : ہم نے آپ کو کچھ دیا تھا، آپ نے پایا یا نہیں ؟

شہزادہ : مجھے یاد نہیں۔ آخر وہ کون چیز تھی ؟

صاحب : یاد کیجیے۔

صاحب نے ہمایوں فر سے اور کئی باتیں پوچھیں، مگر وہ ایک کا بھی جواب نہ دے

سکے۔ تب تو صاحب کو یقین ہو گیا کہ یہ ہمایوں فر نہیں ہے۔

(101)

آزاد پاشا کو اسکندریہ میں کئی دن رہنا پڑا۔ پیسے کی وجہ سے جہازوں کا آنا جانا بند تھا۔

ایک دن انھوں نے خوجی سے کہا۔ بھائی، اب تو یہاں سے رہائی پانی مشکل ہے۔

خوجی : خدا کا شکر کرو کہ بچ کے چلے آئے، اتنی جلدی کیا ہے ؟

آزاد : مگر یار، تم نے وہاں نام نہ کیا، افسوس کی بات ہے۔

خوجی : کیا خوب، ہم نے نام نہیں کیا تو کیا تم نے نام کیا ؟ آخر آپ نے کیا کیا، کچھ

معلوم تو ہو، کون گڑھ فتح کیا، کون لڑائی لڑے، یہاں تو دشمن کو کھدڑ کھدڑ کے مارا۔ آپ

بس مسوں پر عاشق ہوئے، اور تو کچھ نہیں کیا۔

آزاد : آپ بھی تو بوا زعفران پر عاشق ہوئے تھے ؟

میڈا : اجی، اب باتوں کو جانے دو، کچھ اپنے ملک کے رئیسوں کا حال بیان کرو، وہاں

کیسے رئیس ہیں ؟

خوجی : بالکل تباہ، پھٹے حال، ان پڑھ، ان کے شوق دنیا سے نرالے ہیں۔ پتنگ بازی

پر مئے ہوئے، طرح طرح کے پتنگ بنتے ہیں، گوٹ، مائی جال، مانگ دار، بھیڑیا، توکیہ،

خر بوزیا، لنگوٹیا، نکل، لال پٹا، کل پٹا۔ دس دس اشرفیوں کے پیچے ہوتے ہیں۔ تماشائیوں کی وہ

بھیڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ ! پتنگ باز اپنے فن کے استاد۔ کوئی ڈھیل لڑانے کا استاد ہے، کوئی

تھکیت لڑانے کا ایکتا۔ ادھر پیچ پڑا، ادھر غوطہ دیتے ہی کہا، وہ کاٹا ! لوٹنے والوں کی چاندی

ہے۔ ایک ایک دن میں دس دس سیر ڈور لوٹتے ہیں۔

آزاد: کیوں صاحب، یہ کوئی اچھی عادت ہے؟
 خوجی: تم کیا جانو، تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ جک کہنا، چنگ لڑایا ہے کبھی؟
 آزاد: ہم نے چنگ کی اتنی قسمیں بھی نہیں سنی تھیں۔
 خوجی: اسی سے تو کہتا ہوں، جاگلو ہو۔ بھلا پٹیا جانتے ہو، کسے کہتے ہیں؟
 آزاد: ہاں، ہاں، جانتا کیوں نہیں، پٹیا اسی کو کہتے ہیں نہ کہ کسی کی ڈور توڑ لی جائے۔
 خوجی: بھئی، نرے گاؤ دی ہو۔

میڈا: اچھا بولو، کرتے کیا ہیں، کیا سارا دن چنگ ہی اڑایا کرتے ہیں؟
 خوجی: نہیں صاحب، ایم اور چند و کثرت سے پیتے ہیں۔
 آزاد: اور کبوتر بازی کا تو حال بیان کرو۔
 کلاریسا: ہم نے سنا ہے کہ ہندستان کی عورتیں بالکل جاہل ہوتی ہیں۔
 آزاد: مگر حسن آرا کو دیکھو تو خوش ہو جاؤ۔
 کلاریسا: ہم تو بے شک خوش ہوں گے، مگر خدا جانے، وہ ہم کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں یا نہیں۔

میڈا: نہیں، امید نہیں کہ ہم دونوں کو دیکھ کر خوش ہوں۔ جب ہم کو اور تم کو دیکھیں گی تو ان کو بڑا رنج ہوگا۔

کلاریسا: مجھے کیوں ناحق بدنام کرتی ہو، مجھے آزاد سے مطلب؟ میں تمہاری طرح کس پر پھسل پڑنے والی نہیں۔

میڈا: ذرا ہوش کی باتیں کرو۔ جب انھوں نے کروڑوں بار ناک رگڑی تب میں نے منظور کیا۔ رونہ ان میں ہے کیا؟ نہ حسین، نہ جوان، نہ رنگیلے۔

خوجی: اور ہم؟ ہم کو کیا سمجھتی ہو آخر؟

میڈا: تم بڑے طرح دار جوان ہو، اور تو اور، ڈیل ڈول میں تو کوئی تمہارا ثانی نہیں۔
 آزاد: ہم بھی کسی زمانے میں خواجہ صاحب ہی کی طرح شر زور تھے، مگر اب وہ بات کہاں، اب تو مزے بوزھے آدمی ہیں۔

خوجی: اچی، ابھی کیا ہے، جوانی میں ہم کو دیکھیے گا۔

آزاد: آپ کی جوانی شاید قبر میں آئے گی۔

خوجی: اجی، کیا جکتے ہو، ابھی ہمیں شادی کرنی ہے بھائی!

میڈا: تم مس کلاریا کے ساتھ شادی کرلو۔

کلاریا: آپ ہی کو مبارک رہے۔

آزاد: بھئی، یہاں تمہاری شادی ہو جائے تو اچھی بات ہے، نہیں تو لوگوں کو شک ہوگا کہ انہیں کسی نے نہیں پوچھا۔

خوجی: واللہ، یہ تو تم نے ایک ہی سنائی۔ اب ہمیں شادی کی ضرورت آپڑی۔

آزاد: مگر تمہارے لیے تو کوئی خوبصورت چاہیے جس پر سب کی نگاہ پڑے۔

خوجی: جی ہاں، جس میں آپ کو بھی گھورا گھاری کرنے کا موقع ملے۔ یہاں ایسے احمق

نہیں ہیں۔ جو روکے معاملے میں بندہ کسی سے یارانا نہیں رکھتا۔

آزاد تو سیر کرنے چلے گئے۔ خوجی نے مس کلاریا سے کہا۔ ہمارے لیے کوئی ایسی

بی بی ڈھونڈو جس پر ساری دنیا کے شہزادے جان دیتے ہوں۔ آزاد کا کھٹکا ضرور ہے، یہ آدمی

بھانجی مارنے سے باز نہ آئے گا۔ یہ تو اس کی عادت میں داخل ہے کہ جو عورت ہمارے اوپر

ریختھے گی اس کو بہکائے گا! لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو عورت ایک بار ہمیں دیکھ لے گی، اسے

آزاد کیا، آزاد کے باپ بھی نہ بہکاسکیں گے۔ مجھے دیکھ دیکھ کر یہ حضرت جلا کرتے ہیں۔

کلاریا: تمہاری سی جوانی کہاں سے لائیں؟

خوجی: بس بس، خدا تم کو سلامت رکھے۔ خدا کرے، تم کو میرا سا شوہر ملے۔ اس سے

زیادہ اور کیا دعا دوں۔

کلاریا: کہیں تمہاری شامت تو نہیں آئی ہے؟

خوجی: کیوں، کیا ہوا؟ آخر ہم میں کون بات نہیں ہے، کچھ معلوم ہو، اندھا ہوں، کانٹا

ہوں، لولہ ہوں، لنگڑا ہوں۔ آخر مجھ میں کون سی بات نہیں ہے؟

کلاریا: پہلے جا کر منہ بنواؤ۔ چلے ہمارے ساتھ شادی کرنے، کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے

ہو؟

خوجی: پاگل! ٹھیک، میرے پاگل پنے کا حال مصر، عدن، روس، ہندستان کی عورتوں

سے جا کر پوچھ لو، آخر کچھ دیکھ کر ہی تو وہ سب مجھ پر عاشق ہوئی تھیں۔

اتنے میں میاں آزاد نے آکر پوچھا۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ کلاریا، تم ان کے پھیر

میں نہ آتا۔ یہ بڑے چالاک آدمی ہیں۔ یہ باتوں ہی باتوں میں اپنا رنگ جمالیتے ہیں۔
 خوجی: خیر، اب تو تم نے ان سے کہہ ہی دیا، ورنہ آج ہی شادی ہوتی۔ خیر، آج نہیں،
 کل سہی۔ بنا شادی کیے تو اب مانتا نہیں۔

کلاریا: تو آپ اپنے کو اس قابل سمجھنے لگے؟

خوجی: قابل کے بھروسے نہ رہیے گا۔ میری زبان میں جادو ہے۔

آزاد: تمہارے لیے تو بوا زعفران کی سی عورت چاہیے۔

خوجی: اگر مس کلاریا نے منظور کیا تو اور کہیں چٹا لگائیں گے۔ مگر مجھے تو امید ہے کہ
 مس کلاریا آج کل میں ضرور منظور کر لیں گی۔

آزاد: اجی، میں نے تمہارے لیے وہ عورت تلاش کر رکھی ہے کہ دیکھ کر پھڑک اٹھو، وہ
 تم پر جان دیتی ہے۔ بس، کل شادی ہو جائے گی۔

خوجی بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن آزاد نے ایک گاڑی منگوائی۔ آپ دونوں مسوں
 کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے، خوجی کو کوچ بکس پر بیٹھایا اور شادی کرنے چلے۔ خوجی اوپر سے ہٹو
 بچو کی ہانک لگاتے جاتے تھے۔ ایک جگہ ایک بہرا گاڑی کے سامنے آگیا۔ یہ غل مچاتے ہی
 رہے اور گاڑی اس کے کٹے پر پہنچ گئی۔ آپ بہت ہی بگڑے، بھلا بے گیدی، جب اور کچھ
 بس نہ چلا تو آج جان دینے آگیا۔

آزاد: کیا ہے بھائی، خیریت تو ہے؟

خوجی: اجی، آج وہ بہر و پیا ہمیش بدل کر آیا، ہم گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں اور وہ
 سنتا ہی نہیں۔ تب میں سمجھا کہ ہو نہ ہو بہر و پیا ہے۔ گاڑی کے سامنے اڑ جانے سے اس کا
 مطلب تھا کہ ہمیں پکڑا دے۔ وہ تو دو چار دن میں لوٹ پوٹ کے چنگا ہو جاتا، مگر ہماری
 گاڑی پکڑ جاتی۔ اب پوچھو کہ تم کو کیا فکر ہے، ہم لوگ بھی تو سوار ہیں۔ اس کا جواب ہم
 سے سینے۔ میں تو عورت بن کر چھوٹ جاتیں، رہے ہم اور تم۔ تو جس کی نظر پڑتی، ہمیں پر
 پڑتی۔ تم کو لوگ خدمت گار سمجھتے، ہم رئیس کے دھوکے میں دھر لیے جاتے ہیں۔ بس، ہمارے
 ماتھے جاتی۔

اتنے میں دس بارہ دیہے سامنے سے آئے۔ خوجی نے چرواہے کو اس نیکی چتون سے
 دیکھا کہ کھا ہی جائیں گے۔ اسے ان کا کینڈا دیکھ کر ہنسی آگئی۔ بس آپ آگ ہی تو ہو گئے۔

کوچ جن کو ڈانٹ بتائی۔ روک لے، روک لے۔

آزاد: اب کیا مصیبت پڑی

خوبی: اس بدمعاش سے کہو، باگ روک لے، میں اس چرواہے کو سز دے آؤں تو بات کروں۔ بدمعاش مجھے دیکھ کر ہنس دیا، کوئی مسخرہ سمجھا ہے۔

آزاد: کون تھا کون، ذرا نام تو سنوں۔

خوبی: اب راہ چلتے کا نام میں کیا جانوں۔ کیسے، اظہر لیس کوئی نام بتا دوں۔ مجھے دیکھا تو ہنسے آپ، میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

آزاد: ارے یار، تھمیں دیکھ کر مارے خوشی کے ہنس پڑا ہوگا۔

خوبی: بھئی، تم نے سچ کہا، یہی بات ہے۔

آزاد: اب بتاؤ، ہو گدھے کہ نہیں، جو میں نہ سمجھتا تو پھر؟

خوبی: پھر کیا، ایک بے گناہ کا خون میری گردن پر ہوتا۔

ایکا ایک کو چران نے گاڑی روک لی۔ خوبی گھبرا کر کوچ بکس سے اترے تو پائیدان سے دامن اٹکا اور منہ کے بل گرے، مگر جلدی سے جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آزاد اور دونوں عورتیں ہنسنے لگیں۔

آزاد: اچی، گرد ورد پونچھو، ذرا آدی بنو۔ جو دلہن والے دیکھ لیں تو کیسی ہو؟

خوبی: ارے یار، گرد ورد تو جھاڑ چکا، مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ کس کی شرارت ہے، میں تو سمجھتا ہوں، وہی بہرہ رپا میری آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے کھیٹ لے گیا۔ خیر، شادی ہو لے۔ پھر بی بی کی صلاح سے بدمعاش کو نیچے دیکھاؤں گا۔

آزاد تو دونوں مسوں کے ساتھ گاڑی سے اترے اور خوبی کی سرسراہ کے دروازے پر آئے خوبی گاڑی کے اندر بیٹھے رہے۔ جب اندر سے آدی انھیں بلانے آیا تو انھوں نے کہا۔ ان سے کہہ دو کہ میری اغوانی کرنے کے لیے کسی کو بھیج دیں۔

آزاد نے اندر جا کر ایک بچہ ہتھی موٹی تازی عورت بھیج دی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، خوبی کو گاڑی سے اتارا اور گود میں اٹھ کر اندر لے چلی۔ خوبی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے انھیں لے جا کر آگن میں دے مارا اور اوپر سے دہانے لگی۔ خوبی چلا چلا کر کہنے لگے۔ اماں جان، معاف کرو، ایسی شادی پر خدا کی مار، میں کنوارا ہی رہوں گا۔

آزاد: کیا ہے بھئی، یہ روکیوں رہے ہو؟
 خوجی: کچھ نہیں بھائی جان، ذرا دل لگی ہو رہی تھی۔
 آزاد: اماں جان کا لفظ کسی نے کہا تھا؟
 خوجی: تو یہاں تمہارے سوا ہندوستانی اور کون ہے؟
 آزاد: اور آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟
 خوجی: میں ترک ہوں۔

آزاد: اچھا، جا کر دلہن کے پاس بیٹھو۔ وہ کب سے گردن جھکائے بیٹھی ہے بے چاری، اور آپ سننے ہی نہیں۔

خوجی اوپر گئے تو دیکھا، ایک کونے میں دو شالا اڑھے دلہن بیٹھی ہے۔ آپ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ کلاریا اور میڈا بھی ذرا فاصلے پر بیٹھی تھیں۔ خواجہ صاحب دون کی لینے لگے۔ ہمارے ابا جان سید تھے اور اماں جان کابل کے ایک امیر لڑکی تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں اگر آپ دیکھتیں تو ڈر جاتیں۔ اچھے اچھے پہلوان ان کا نام سن کر کان پکڑتے تھے۔ سینڈ شیر کا ساتھ، کمر چھیتے کی سی، رنگ بالکل جسے سلجھ، آنکھوں میں خون برستا تھا۔ ایک دفعہ رات کو گھر میں چور آیا، میں تو مارے ڈر کے سٹاٹا کھینچے پڑا رہا۔ مگر واہ ری اماں جان، چور کی آہٹ پاتے ہی اس بدمعاش کو جا پکڑا۔ میں نے پکار کر کہا، اتنا جان جانے نہ پائے، میں بھی آپہنچا۔ اتنے میں ابا جان کی آنکھ کھل گئی۔ پوچھا۔ کیا ہے؟ میں نے کہا۔ اماں جان سے اور ایک چور سے پکڑ ہو رہی ہے۔ ابا جان بولے۔ تو پھر دیکے پڑے رہو، اس نے چور کو قتل کر ڈالا ہوگا۔ میں جو جا کے دیکھتا ہوں تو لاش پھڑک رہی ہے۔ جناب، ہم ایسوں کے لڑکے ہیں۔

آزاد: جی تو ایسے دلیر ہو، سوروں کے سور ہی ہوتے ہیں۔
 خوجی: (ہنس کر) مس کلاریا ہماری باتوں پر ہنس رہی ہیں۔ ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں جھنچے۔

آزاد: دلہن آج بہت ہنستی ہے۔ بڑی ہنس کھ بی بی پائی۔
 خوجی: اردو تو یہ کیا سمجھتی ہوگی۔
 آزاد: آپ بھی بس چونکا ہی رہے۔ ارے بے وقوف انہیں ہندی اردو سے کیا تعلق۔

خوبی : بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں جس گلی کو بچے میں نکل جائیں، سب کی نظر پڑا چاہے اور لوگ مجھ سے جلا ہی چاہیں، اس کو میں کیا کروں۔ اگر ان کو سیر کرانے ساتھ نہ لے چلوں تو نہیں بنتی۔ کہیں مجھ پر کسی پر تکم کی نگاہ پڑے اور وہ مہور مہور کر دیکھے، تو یہ سمجھیں کہ کوئی خاص وجہ ہے۔ اب کہیے، کیا کیا جائے؟

آزاد : دلہن منہ بند کیے کیوں بیٹھی ہیں، ناک کو تو خیر ہے؟
خوبی : کیا بکتے ہو میاں، مگر اب مجھے بھی شک ہو گیا۔ تم لوگ ذرا سمجھا دو بھائی کہ ناک تو دیکھا دیں۔

مس کلاریا نے دلہن کو سمجھایا، تو اس نے چہرے کو چھپا کر ذرا سی ناک دکھا دی۔ خوبی نے جا کر ناک کو چھونا چاہا تو اس نے اس زور سے چپت دی کہ خوبی بلبلاتا ٹھے۔
آزاد : خدا کی قسم، بڑے بے ادب ہو۔

خوبی : ارے میاں، جاؤ بھی۔ یہاں ہوش بگڑ گئے تم کو ادب کی پڑی ہے، مگر یار، یہ برا سکن ہوا۔

آزاد : ارے گاؤ دی، یہ نخرے ہیں، سمجھا۔
خوبی : (ہنس کر) واہ رے نخرے!
آزاد : اچھا بھائی، تم کبھی لڑائی پر بھی گئے ہو؟

خوبی : ادبہ، کبھی کی ایک ہی کمی، کیا ننھے بنے جاتے ہیں؟ ارے میاں، شاہی میں گل چلے مشہور تھے، اب بھی جو چاند ماری ہوئی، اس میں ہی میں رہے۔
آزاد : مس میڈا ہنس رہی ہیں، گویا تم جھوٹے ہو۔

خوبی : یہ ابھی چھو کری ہیں، یہ باتیں کیا جانیں۔ ابا جان کو خدا بخشے۔ دو ایسے گر بتا گئے ہیں جو ہر جگہ کام آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کسی سے لڑائی ہو تو پہلا وار خود کرنا، بات کرتے ہی چاٹا دینا۔

آزاد : آپ تو کئی جگہ اس نصیحت کو کام میں لا چکے ہیں۔ ایک تو بوا زعفران پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ دوسرے زمین کی ناک میں دم کر دیا تھا۔

خوبی : اب میں اپنا سر پیٹ لوں، کیا کروں! جس جس جگہ اپنی بھل منسی سے شرمندہ ہوا تھا، انھیں کا ذکر کرتے ہو۔ وہ تو کہیے، خیریت ہے کہ دلہن اردو نہیں سمجھتیں، ورنہ نظروں

سے مگر جاتا۔

یہ فقرہ سن کر دلہن مسکرائی تو خواجہ صاحب اکڑ کر بولے۔ واللہ، وہ ہنس کھ بی بی پائی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ بات نہیں سمجھتی، مگر ہنسنے لگت ہے۔ بھئی، ذرا آنکھیں دیکھ لینا۔

آزاد: جناب، دونوں آنکھیں ہیں اور بالکل ہاتھی کی سی!

خوجی: بس یہی میں بھی چاہتا ہوں، وہ کیا جس کی بڑی بڑی آنکھیں ہوں۔ تعریف یہ ہے کہ ذرا ذرا سی آنکھیں ہوں اور ہنسنے کے وقت بالکل بند ہو جائیں، مگر یار، گلا کیسا ہے؟

آزاد: ایں کیا ہندستان میں گانے کی تعلیم دو گئے؟

خوجی: اے ہے، سمجھتے تو ہو ہی نہیں، مطلب یہ کہ گردن لمبی ہے یا چھوٹی، پہلے سمجھ لو

پھر اعتراض جڑو۔

آزاد: گردن، سر اور دھڑ سب سپاٹ ہے۔

خوجی: یہ کیا، تو کیا چھوٹی گردن کی تعریف ہے؟

آزاد: اور کیا، سنا نہیں چھوٹی گردن، تنک پیشانی، حسین عورت کی یہی نشانی۔ کیا

محاورے بھی بھول گئے؟

خوجی: محاورے کوئی ہم سے سیکھے، آپ کیا جانیں، مگر خدا کے لیے ذرا مجھ سے ادب سے باتیں کیجیے، ورنہ یہاں میری کرکری ہوگی، اور یہ آپ ان کے قریب کیوں بیٹھے ہیں، ہٹ کے بیٹھیے ذرا۔

آزاد: کیوں صاحب، آپ اپنی سسرال میں ہماری بے عزتی کرتے ہیں؟ اچھا! خیر،

دیکھا جائے گا۔

خوجی: آپ تو دل لگی میں برا مان جاتے ہیں اور میری عادت کمبخت ایسی خراب ہے کہ بے چہل کیے رہا نہیں جاتا۔

آزاد: خیر چلو، ہو گا کچھ۔ مگر یار، یہاں ایک عجیب رسم ہے، دلہن اپنے دلہا کے دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے۔

خوجی: یہ تو بری بات ہے، قسم خدا کی، اگر تم نے ان سے ایک بات بھی کی ہوگی تو کردلی لے کر ابھی ابھی کام تمام کر دوں گا۔

آزاد: سن تو لو، ذرا سنو تو سہی۔

خوبی : اجی بس، سن چکے۔ اس وقت آنکھوں میں خون اتر آیا، ایسی دلہن کی ایسی عیسیٰ، اور کیسی دہکی دہکائی بیٹی ہیں، گویا کچھ جانتی ہی نہیں۔

آزاد : ہر ملک کی رسم الگ الگ ہے۔ اس میں آپ خواہ مخواہ بگڑ رہے ہیں۔

خوبی : تو آپ آنکھیں کیا دکھاتے ہیں؟ کچھ آپ کا محتاج یا غلام ہوں؟ لوٹ کا روپیہ میرے پاس بھی ہے، یہاں سے ہندستان تک اپنی بی بی کے ساتھ جاسکتا ہوں۔ اب آپ تو جائیں۔ میں ذرا ان سے دو دو باتیں کر لوں، پھر شادی کی رائے پیچھے دی جائے گی۔

آزاد اٹھنے ہی کو تھے کہ دلہن نے پاؤں سے دامن دبا دیا۔

آزاد : اب بتاؤ، اٹھنے نہیں دیتیں، میں کیا کروں۔

خوبی : (ڈپٹ کر) چھوڑ دو۔

آزاد : چھوڑ دو صاحب، دیکھو تمہارے میاں خفا ہوتے ہیں۔

خوبی : ابھی مجھے میاں نہ کہیے، شادی بیاہ نازک معاملہ ہے۔

آزاد : پہلے آپ کی ان سے شادی ہو جائے، پھر اگر بندہ آنکھ اٹھا کے دیکھے تو گناہ

گار۔

خوبی : اچھا منظور، مگر اتنا سمجھا دینا کہ یہ بڑے کڑے خاں ہے، ناک پر کھسی بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ مگر آپ کیوں سمجھائیں گے۔ میں خود ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ سنو بی صاحب، ہمارے ساتھ چلتی ہو تو دو شرطیں مانی ہوں گی۔ ایک یہ کہ کسی غیر آدمی کو صورت نہ دیکھاؤ۔ دوسری یہ کہ مجھے جو کوئی عورت دیکھتی ہے، پہروں گھورا کرتی ہے، ہنسنکی بندھ جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں سوتیہ ڈاھ ہونے لگے۔ بھی آزاد، ذرا ان کو ان کی زبان میں سمجھا دو۔

آزاد : آپ ذرا ایک منٹ کے لیے باہر چلے جائیے تو میں سب باتیں سمجھا دوں۔

خوبی : جی، درست، یہ بھڑے لوٹروں کو دیجیے گا، آپ ایسے چھوڑے میری جیب میں

پڑے ہیں، اور سنیے، کیا آؤ سمجھا ہے۔ اب تم جاؤ، ہم ان سے دو دو بات کر لیں۔

آزاد باہر چلے گئے تو خوبی پٹنگ پر دلہن کے پاس بیٹھے اور بولے۔

بھئی، اب تو گھونگٹ اٹھا لو، جب ہم تمہارے ہو چکے تو ہم سے کیا شرم، کیوں ترساتی ہو۔

جب دلہن نے اب بھی گھونگٹ نہ کھولا تو خوبی ذرا اور آگے کھسک گئے۔ جان من اس

وقت شرم کو بھون کھاؤ، کیوں ترساتی ہو۔ اے، اب کب لگ ترسائے رکھو جی! کب لگ

ترسائے رکھو جی!

دو تین منٹ تک خوبی نے کھا کر رکھایا، مگر جب یوں بھی دلہن نے نہ مانا تو آپ نے اس کے گھونگھٹ کی طرف ہاتھ نہ عایا۔ یکا یک دلہن نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب آپ لاکھ زور مارتے ہیں، مگر ہاتھ نہیں چھوڑے۔ تب آپ خوشام کی باتیں کرنے لگے۔ چھوڑ دو بھائی، بھلا کسی غریب کا ہاتھ توڑنے سے قصیل کیا ملے گا، اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میں تم سے زور نہ کروں گا۔ پھر کیوں دق کرتی ہو، میرا تو کچھ نہ بگڑے گا، مگر تمہارے ملائم ہاتھ دکھنے لگیں گے۔

یہ کہہ کر خوبی دلہن کے پیروں پر گر پڑے اور ٹوپی اتار کر اس کے قدموں پر رکھ دی۔ ان کی حرکت پر دلہن کو ہنسی آگئی۔

خوبی: وہ ہنسی آئی، ناک پر آئی، بس اب مار لیا ہے، اب اسی بات پر گلے لگ جاؤ۔
دلہن نے ہاتھ پھیلا دیے۔ خوبی گلے ملے تو دلہن نے اتنے زور سے دبایا کہ آپ چیخ پڑے۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو، دیکھو، چوٹ آ جائے گی۔ مگر اب کی دلہن نے انہیں اٹھا کر دے مارا اور چھاتی پر سوار ہو گئی۔ میاں خوبی اپنی بد نصیبی پر رونے لگے۔ ان کو روتے دیکھ کر اس نے چھوڑ دیا، تب آپ سوچے کی بلا اپنی جواں مردی دیکھائے، اس پر رعب نہ بنے گا۔ بہت ہوگا، مار ڈالے گی، اور کیا۔ آپ نے کپڑے اتارے اور پینترا بدل کر بولے۔ سنو جی، ہم شہزادے ہیں۔ سکوار کے دہنی، بات کے شور، ناک پر کبھی بیٹھ جائے تو سکوار سے ناک اڑا دیں، کبھی؟ اب تک میں دل لگی کرتا تھا۔ تم عورت، میں مرد، اگر اب کی تم نے ذرا بھی گستاخی کی تو آگ ہو جاؤں گا۔ لے اب گھونگھٹ اٹھا دو، ورنہ خیریت نہیں ہے۔ یہ کہیں اونچا تو نہیں سنتی؟ (تالیاں بجا کر) اجی سنتی ہو، برقع اٹھاؤ۔

خوابہ صاحب بکا کیے، مگر وہاں کچھ اثر نہ ہوا۔ تب آپ بگڑ گئے اور پھر پینترا بدلنے لگے۔ اب کی دلہن نے انہیں بغل میں دبایا، اب آپ تڑپ رہے ہیں، دانت پیستے ہیں، مگر گردن نہیں چھوٹی۔ تب آپ نے حملہ کر دانت کاٹ کھایا۔ کاٹا تھا کہ اس نے زور سے ایک تھپڑ دیا۔ خوابہ صاحب کا منہ بھر گیا۔ تب آپ کو سننے لگے۔ خدا کرے، تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ ہائے، اگر اس وقت خدا ایک منٹ کے لیے زور دے دے تو سرمہ بنا ڈالوں۔

مس کلاریا اور معیڈا ایک جھروکے سے یہ کیفیت دیکھ رہیں تھیں، جب خوبی پٹ پٹا

کر باہر نکلے تو کلاریا نے کہا۔ مبارک ہو۔

آزاد: کیسے، لہن کیسی ہے؟ یار، ہو خوش نصیب!

خوجی: خدا کرے آپ بھی ایسے ہی خوش نصیب ہوں۔

آزاد: ہم نے تو بڑی تعریف سنی تھی، مگر تم کچھ رنجیدہ معلوم پڑتے ہو، اس کا کیا

سبب؟

خوجی: بھائی جان، وہاں تو فوج داری ہو گئی۔ عورت کیا، دیونی ہے، واللہ، کچھ نکل

گیا۔

آزاد: آپ تو ہیں پاگل، یہ اس ملک کا رواج ہے کہ پہلے دن دو گھنٹے تک لہن میاں

کو مارتی ہے، کاٹ کھاتی ہے، پھر میاں باہر آتا ہے اور پھر جاتا ہے۔

خوجی: اجی، وہاں تو مار پیٹ تک ہو گئی، جی میں تو آیا تھا کہ اٹھا کر دے ماروں، مگر

عورت کے منہ کون لگے۔ دیکھیں، اب کی کیسی گزرتی ہے، یا تو وہی نہیں یا ہی نہیں۔

آزاد: کیا بچ بچ فوج داری ہی پر آمادہ ہو؟ بھائی، کرولی اپنے ساتھ نہ لے جاتا، اور جو

ہو سو ہو۔

خوجی: اجی، یہاں ہاتھ کیا کم ہیں! کرولی مرد کے لیے ہے، عورت کے لیے کرولی

کی کیا ضرورت؟

آزاد: بس، اب کی جا کے میٹھی میٹھی باتیں کرو۔ ہاتھ جوڑو، پیر دباؤ، پھر دیکھیے، کیسی

خوش ہوتی ہیں۔ اب دیر ہوتی ہے، جائیے۔

خوجہ صاحب کمرے میں گئے اور لہن کے پاؤں دبائے گئے۔

لہن: ہم کو چھوڑ کر چلے تو نہ جاؤ گے؟

خوجی: ارے، یہ تو اردو بول لیتی ہیں، یہ کیا ماجرا ہے!

لہن: میاں، کچھ نہ پوچھو۔ ہم کو ایک جیٹی بھکا کر بیچنے کے لیے لیے جاتا تھا۔ بارے

خدا خدا کر کے یہ دن نصیب ہوا۔

خوجی اب تک تم ہم سے صاف صاف نہ بولیں؟ خواہ خواہ کسی بھلے آدمی کو دق کرنے

سے فائدہ؟

لہن: تمہارے ساتھی آزاد نے ہمیں جیسا سکھایا ویسا ہم نے کیا۔

خوبی : اچھا آزاد! ٹھہر جاؤ بچہ، جاتے کہاں ہو۔ دیکھو تو کیسا بدلا لیتا ہوں۔
یہ کہہ کر خوبی نے اپنی ٹوپی دہن کے قدموں پر رکھ دی اور بولے۔ بی بی، بس اب یہ سمجھو کہ میاں نہیں، خدمت گار ہیں۔ مگر اب تک؟ جب تک ہماری ہو کر رہو۔ ادھر آپ نے تہور بدلے، ادھر ہم بگڑ کھڑے ہوئے۔ مجھ سے بڑھ کر مروت دار کوئی نہیں، مگر مجھ سے بڑھ کر شریر بھی کوئی نہیں، اگر کسی نے مجھ سے دوستی کی تو اس کا غلام ہو گیا، اور اگر کسی نے ہیکڑی جتائی تو مجھ سے زیادہ پاجی کوئی نہیں۔ ڈنڈے سے بات کرتا ہوں۔ دیکھنے میں دبلا ہوں، مگر آج تک کسی نے مجھے زیر نہیں کیا۔ سیکڑوں پہلوانوں سے لڑا، اور ہمیشہ کشتیاں نکالیں۔

دہن : تمہارے پہلوان ہونے میں شک نہیں، وہ تو ڈیل ڈول ہی سے ظاہر ہے۔
خوبی : اسی بات پر اب گھونگھٹ ہٹا دو۔
دہن : یہ گھونگھٹ نہیں ہے جی، کل سے ہماری مونچھ میں درد ہے۔
خوبی : کاہے میں درد ہے، کیا کہا؟
دہن : اے، مونچھ تو کہا، کانوں کی ٹھنڈیاں نکال!
خوبی : مونچھ کیا! بکتی کیا ہو؟ عورت ہو یا مرد؟ خدا جانے، تم مونچھ کس کو کہتی ہو۔
دہن : (خوبی کی مونچھ پکڑ کر) اسے کہتے ہیں، یہ مونچھ نہیں ہے؟
خوبی : اللہ جانتا ہے، بڑی دل لگی باز ہو، میں بھی سوچتا تھا کہ کیا کہتی ہیں۔
دہن : اللہ جانتا ہے، میری مونچھوں میں درد ہے۔
خوابہ صاحب نے غور کر کے دیکھا تو ذرا ذرا سی مونچھیں۔ پوچھا۔ آخر بتاؤ تو جان من، یہ مونچھ کیا ہے؟

دہن : دیکھتے نہیں، آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں کیا؟
خوبی : ایک تو بی بی، آخر یہ مونچھ کیسی؟ کہتا تو کہتا، سنتا سیری ہو جاتا ہے۔ عورت ہو یا مرد؟ خدا جانے، تم مونچھ کسے کہتی ہو؟
دہن : تو تم اتنا گھبراتے کیوں ہو؟ میں مردانی عورت ہوں۔
خوبی : بھلا عورت اور مونچھ سے کیا واسطہ؟
دہن : اے ہے، تم تو بالکل اناڑی ہو، ابھی تم نے عورتیں دیکھیں کہاں؟

خوبی: ایسی عورتوں سے باز آئے۔

یکایک دلہن نے گھونگھٹ اٹھا دیا تو خوبی کی جان نکل گئی۔ دیکھا تو وہی بہروپیا۔
بولے۔ جی چاہتا ہے کہ کرولی بھونک دوں، قسم خدا کی، اس وقت یہی جی چاہتا ہے۔
بہروپیا: پہلے اس پارسل کے روپے لائیے جس کا لفافہ آپ نے اپنے نام لکھوا لیا تھا۔
بس، اب دائیں ہاتھ سے روپے لائیے۔

خوبی: او گیدی، بس الگ ہی رہنا، تم ابھی میرے غصے سے واقف نہیں ہو۔

بہروپیا: خوب واقف ہوں۔ کمزور، مار کھانے کی نشانی۔

خوبی: ہم کمزور ہیں؟ ابھی چاہوں تو گردن توڑ کے رکھ دوں۔ جا کر ہوٹل والوں سے
تو پوچھو کہ کس جوان مردی کے ساتھ مصر کے پہلوانوں کو اٹھا کے دے مارا۔

بہروپیا: اچھا، اب تمہاری قضا آئی ہے۔ خواہ مخواہ ہاتھ پاؤں کے دشمن ہوئے ہو۔

خوبی: سچ کہتا ہوں، ابھی تم نے میرا غصہ نہیں دیکھا، مگر ہم تم پر دیسی ہیں، ہم کو مل
جل کر رہنا چاہیے۔ تم نہ جانے کیسے ہندوستانی ہو کہ ہندوستانی کا ساتھ نہیں دیتے۔

بہروپیا: پارسل کا روپیہ داہنے ہاتھ سے دلوائیے تو خیر۔

خوبی: اجی، تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، 'حساب دوستاں در دل اگر وہ بے وفا سمجھے'،
پارسل کا ذکر کیسا، بزاز کی دوکان پر ہم بھی تو تمہاری طرف سے کچھ پونج آئے تھے؟ کچھ تم
سمجھے، کچھ ہم سمجھے۔

اتنے میں آزاد دونوں لیڈیوں کے ساتھ اندر آئے۔

آزاد: بھائی، شادی مبارک ہو۔ یار، آج ہماری دعوت کرو۔

خوبی: زہر کھلاؤ اور دعوت مانگو۔ یہ جو ہم نے آپ کو لاکھوں خطروں سے بچایا اس کا
یہ نتیجہ نکلا۔ اب ہم یا تو یہیں نوکری کر لیں گے۔ یا پھر روم واپس جائیں گے۔ وہاں کے
لوگ قدر داں ہیں، دو چار شعر بھی کہہ لیں گے تو کھانے بھر کو بہت ہے۔ خیر، آدی کچھ کھو کر
سیکھتا ہے۔ ہم بھی کھو کر سیکھے، اب دنیا میں کسی کا بھروسہ نہیں رہا۔

کلاریا: یہ مٹھائیاں نہ دینے کی باتیں ہیں، یہ چکے کسی اور کو دینا، ہم بے دعوت لیے
نہ رہیں گے۔

خوبی: ہاں صاحب، آپ کو کیا۔ خدا کرے، جیسی بی بی ہم نے پائی، ویسا ہی شوہر تم

پاؤ، اب اس کے سوا اور کیا دعا دوں۔

میڈا: ہم نے تو بہت سوچ سمجھ کر تمہاری شادی تجویز کی تھی۔

خوبی: اچھی، رہنے بھی دو۔ ہمیں آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں، مگر آزاد نے بڑی دعا دی، ہندستان سے اتنی دور آئے۔ جب موقع پڑا، ان کے لیے جان لڑا دی۔ پولینڈ کی شہزادی کے یہاں ہی کام آئے، ورنہ پڑے پڑے سڑ جاتے۔ ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا کہ ہمیں پر چکے چلنے لگے۔ اب چاہے جو ہو، ہم آزاد کی صورت نہ دیکھیں گے۔

(102)

چوتھی کے دن رات کو نواب صاحب نے رُٹیا بیگم کو چھینرنے کے لیے کئی بار فیروزہ کی تعریف کی۔ رُٹیا بیگم مجڑونے لگیں اور بولیں۔ عجب بے ہودہ باتیں ہیں تمہاری، نہ جانے کن لوگوں میں رہے ہو کہ ایسی باتیں زبان سے نکلتی ہیں۔

نواب: تم ناحق مجڑتی ہو، میں تو صرف ان کے حسن کی تعریف کرتا ہوں۔

رُٹیا: اے، تو کوئی دھوڑھ کے ویسی ہی کی ہوتی۔

نواب: تمہارے یہاں کبھی کبھی آیا جایا کرتی ہیں؟

رُٹیا: مجھے اس گھر کا حال کیوں کر معلوم ہو۔ مگر جو تمہارے یہی لچھن ہیں تو خدا ہی مالک ہے۔ آج ہی سے یہ باتیں شروع ہو گئیں۔ ہاں سچ ہے، گھر کی مرغی ساگ برابر۔ خبر، اب تو میں آکر پھنس ہی گئی، مگر مجھے وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ ہاں، اب تمہاری محبت البتہ جاتی رہی۔

نواب: تم اتنی سمجھ دار ہو کہ ذرا سی بات پر اتنی روٹھ گئیں۔ بھلا اگر میرے دل میں یہی ہوتا تو تمہارے سامنے ان کی تعریف کرتا، مجھے کوئی پاگل سمجھا ہے؟ مطلب یہ تھا کہ دو گھڑی کی دل لگی ہو، مگر تم کچھ اور ہی سمجھیں۔ خوب یاد رکھنا کہ جب تک میری اور تمہاری زندگی ہے، کسی اور عورت کو بری نظر سے نہ دیکھوں گا۔ اگر دیکھوں تو شریف نہیں۔

رُٹیا: وہ عورت کیا جو اپنے شوہر کے سوا کسی مرد کو بری نظروں سے دیکھے اور وہ مرد کیا جو اپنی بیوی کے سوا پرانی بہو بیٹی پر نظر ڈالے۔

نواب: بس، یہی ہماری بھی رائے ہے اور جو لوگ دس دس شادیاں کرتے ہیں ان کو

میں احسن سمجھتا ہوں۔

ثریا: دیکھنا ان باتوں کو بھول نہ جانا۔

صبح کو دلہن کے میکے سے مہری آئی اور عرض کی کہ آج سالی نے دلہا اور دلہن کو بلایا ہے، پہلا چالا ہے۔

بیگم: (نواب صاحب کی ماں) تمہارے یہاں وہ لڑکی تو بڑے غضب کی ہے، فیروزہ، کسی سے دیتی ہی نہیں۔

مہری: حضور، اپنا اپنا مزاج ہے۔

بیگم: ارے، کچھ تو شرم حیا کا خیال ہو۔ بے چاری فیض کو بات بات پر بتاتی تھی۔ وہ لاکھ گنواروں کی سی باتیں کرے، پھر اس سے کیا، جو اپنے یہاں آئے اس کی خاطر کرنی چاہیے، نہ کہ ایسا بتائے کہ وہ کبھی پھر آنے کا نام ہی نہ لے۔

خورشید: (نواب کی بہن) ہم کو تو ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ (دبے دانتوں) نیک نہیں، آگے خدا جانے۔

بیگم: یہ نہ کہو بیٹا، ابھی تم نے دیکھا کیا ہے۔

نواب: (اشارہ کر کے) ان کی مہری بیٹھی ہے، اس کے سامنے کچھ نہ کہو۔

بیگم صاحب نے ثریا بیگم کو اسی وقت رخصت کیا۔ شام کو دلہا بھی چلا۔ مصاحبوں نے اس کی ریاست اور ٹھاٹھ بات کی تعریف کرنی شروع کی۔

برہ علی: حضور اس وقت ایران کے شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔

نور خاں: اس میں کیا شک ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شہزادہ مسند لگائے بیٹھا ہے۔

برہ علی: حضور، آج ذرا چوک کی طرف چلیے گا۔ ذرا ادھر ادھر گھروں سے تعریف کی آواز تو نکلے۔

نواب: کیا فائدہ، جس کے بیوی ہو، اس کو ان باتوں میں نہ پڑنا چاہیے۔

نور خاں: اے حضور، یہ تو ریاست کا تمغہ ہی ہے۔

عمیدو: اے حضور، یہ تو غریب آدمیوں کے لیے ایک سے زیادہ نہ ہو، دوسری بیوی کو کیا کھلائے گا، خاک! مگر امیروں کا تو یہ جوہر ہے۔ بادشاہوں کے آٹھ آٹھ لونو سے زیادہ محل ہوتے تھے، ایک دو کی کون کہے۔ جسے خدا دیتا ہے وہی اس قابل سمجھا جاتا ہے۔

ان لوگوں نے نواب صاحب کو ایسا چمک پر چڑھایا کہ چوک ہی سے لے گئے، مگر نواب صاحب نے گردن جو نیچی کی تو چوک بھر میں کسی کمرے کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اس پر مصاحبوں نے حاشے چڑھائے۔ اے حضور، ایک نظر تو دیکھ لیجیے، کیا کٹاؤ ہو رہا ہے۔ ساری خدائی کا حال تو کون جانے، مگر اس شہر میں تو کوئی جوان حضور کے چہرے کو نہیں پاتا۔ بس، یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیر کچھار سے چلا آتا ہے۔

نواب صاحب دل میں سوچتے جاتے تھے کہ ان خوشامدیوں سے بچتا مشکل ہے۔ ان کے پھندے میں پھنسنے اور داخل جہنم ہوئے۔ ہم نے ٹھان لی ہے کہ اب کسی عورت کو بری نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔ یوں ہنسی دل لگی کی اور بات ہے۔

نواب صاحب سسرال میں پہنچے، تو باہر دیوان خانے میں بیٹھے۔ ناچ شروع ہوا اور مصاحبوں نے طوائفوں کی تعریف کے بل باندھ دیے۔ جناب، ایسی گانے والی اب دوسری شہر میں نہیں ہے، اگر شاہی زمانہ ہوتا، تو لاکھوں روپے پیدا کر لیتی اور اب بھی ہمارے حضور کے سے جو ہر شناس بہت ہیں، مگر پھر بھی کم ہیں۔ کیوں حضور، ہولی گانے کو کہوں؟

نواب: جو جی چاہے، گائیں۔

مصاحب: حضور فرماتے ہیں، یہ جو گائیں گی، اپنا رنگ جمالیں گی، مگر ہولی ہو تو اور بھی اچھا۔

نواب: ہم نے یہ نہیں کہا، تم لوگ ہمیں ذلیل کرا دو گے۔

مصاحب: کیا مجال حضور، حضور کا نمک کھاتے ہیں، ہم غلاموں سے یہ امید؟ چاہے سر جاتا رہے، مگر نمک کا پاس ضرور رہے گا، اور یہ تو حضور، دو گھڑی ہنسنے بولنے کا وقت ہی ہے۔

نقیمت جان اس مل جینے کو

جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

اس کے بعد نواب صاحب اندر گئے اور کھانا کھایا۔ سالی نے ایک بھاری خلعت پہنوائی کو اور ایک قیمت جوڑا بہن کو دیا۔ دوسرے دن دلہا دلہن رخصت ہو کر گھر گئے۔

(103)

کچھ دن تک میاں آزاد مصر میں اس طرح رہے جیسے اور مسافر رہتے ہیں، مگر جب

کونسل کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اس نے انھیں اپنے یہاں بلا کر ٹھہرایا اور ہاتھیں ہونے لگیں۔

کونسل : مجھے آپ سے سخت شکایت ہے کہ یہاں آئے اور ہم سے نہ ملے۔ ایسا کون ہے جو آپ کے نام سے واقف نہ ہو، جو اخبار آتا ہے اس میں آپ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ مسخرہ کون ہے؟ وہ ہونا خوبی؟ آزاد نے مسکرا کر خوبی کی طرف اشارہ کیا۔

خوبی : جناب، وہ مسخرے کوئی اور ہوں گے اور خوبی خدا جانے، کس بھوکے کا نام ہے۔ ہم خواجہ صاحب ہیں اور بونے کی ایک ہی کمی۔ ہائے، میں کس سے کہوں کہ میرا بدن چور ہے!

آزاد : کیا اخباروں میں خواجہ صاحب کا ذکر رہتا ہے؟ کونسل : جی ہاں، ان کی بڑی دھوم ہے مگر ایک مقام پر تو جگجگ انھوں نے بڑا کام کر دکھایا تھا۔ آپ کا دولت خانہ کس شہر میں ہے جناب؟ مجھے حیرت تو یہ ہے کہ اتنے ننھے ننھے تو آپ کے ہاتھ پاؤں لڑائی میں آپ کس برتے پر گئے تھے! خوبی : (مسکرا کر) یہی تو کہتا ہوں حضرت کہ میرا بدن چور ہے، دیکھیے، ذرا ہاتھ ملائیے۔ ہیں فولاد کی انگلیاں یا نہیں؟ اگر ابھی زور کروں تو آپ کی ایک آدھ انگلی توڑ کر رکھ دوں۔

تھوڑی دیر تک وہاں بات چیت کر کے آزاد چلے تو خوبی نے کہا۔ یہ آپ کی عجب عادت ہے کہ غیروں کے سامنے مجھے ذلیل کرنے لگتے ہیں۔ اگر مجھے غصہ آ جاتا اور میں میاں کونسل کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتا تو بتاؤ، کیسی ٹھہرتی؟ میں مارے مروت کے طرح دیتا جاتا ہوں، ورنہ میاں کی کٹی پٹی بھول جاتی۔

آزاد : امی، ایسی مروت بھی کیا جس سے ہمیشہ جوتیاں کھانی پڑیں۔ کئی جگہ آپ پٹے، مگر مروت نہ چھوڑی، ایک دن اس مروت کی بدولت آپ کہیں قاضی ہاؤس نہ بھیجے جائیے۔ اچھا، اب یہ پوچھتا ہوں کہ جب سارے زمانے میں میرا حال سنا تو کیا حسن آرا نے نہ سنا ہوگا؟

خوبی : ضرور سنا ہوگا بھائی، اب آج کے آٹھویں دن شادی لو۔ مگر استاد، دو ایک دن

بہتی میں ضرور رہنا۔ ذرا بیگم صاحب سے باتیں ہوں گی۔
 آزاد: بھائی، اب تو سچ میں ٹھہرنے کا جی نہیں چاہتا۔
 خوبی: یہ نہیں ہو سکتا، اتنی بے وفائی کرنا مناسب نہیں، وہ بے چاری ہم لوگوں کی راہ
 دیکھ رہی ہوں گی۔

آزاد: اچھا تو یہ سوچ لو کہ اگر انھوں نے پوچھا کہ خوبی کے ساتھ کوئی عورت کیوں نہیں
 آئی تو کیا جواب دو گے؟ ہماری تو صلاح ہے کہ کسی کو یہیں سے پھانس لے چلو۔
 خوبی: نہیں جناب، مجھے یہاں کی عورتیں پسند نہیں۔ ہاں، اپنے وطن میں ہو تو مضائقہ
 نہیں۔

آزاد: اچھا، کیسی عورت چاہتے ہو؟
 خوبی: بس یہی کہ عمر زیادہ نہ ہو۔ اور شکل صورت اچھی ہو۔
 آزاد: ایسی عورت تو حسن آرا کے مکان کے پاس ہے۔ اسی درزی کی بیوی ہے جو ان
 کے مکان کے سامنے رہتا ہے۔ رنگ سانولی ہے، مگر ایسی نمکین کہ آپ سے کیا کہوں اور ابھی
 کم سن۔ بہت بہت تو کوئی 40-42 کی ہوگی۔

خوبی: بھلا عیذا میں اور اس میں کیا فرق ہے؟
 آزاد: یہ اس سے دو چار برس کم سن ہے، بس، اور تو کوئی فرق نہیں۔ ہاں، یہ گوری ہیں
 اور اس کا رنگ سانولا ہے۔

خوبی: بھلا نام کیا ہے۔
 آزاد: نام ہے شباب جان۔

خوبی: تب تو بھائی، ہم حاضر ہیں۔ مگر کئی پوڑھی بات تو ہو لے پہلے۔
 آزاد: آپ کو اس سے کیا واسطہ؟ کچھ تو سمجھ کے ہم نے کہا ہے! ہمارے پاس اس کا
 خط آیا تھا کہ اگر خوجہ صاحب منظور کریں تو میں حاضر ہوں۔

خوبی: تب تو بھائی، نئی بنائی بات ہے، خدا نے چاہا تو آج کے آٹھویں دن
 شباب جان ہماری بغل میں ہوں گی۔

آزاد: شام کو کونسل سے مل کر چلے چلو آج ہی۔
 خوبی: کونسل؟ ہم کو شباب جان کی پڑی ہے، ہمارے سامنے خط لکھ کے بھیج دو۔

مضمون ہم بتائیں گے۔

آزاد قلم داوات لے کر بیٹھے۔ خوبی نے خط لکھوایا اور جا کر اسے ڈاکخانے میں چھوڑ آئے۔ تب مس معیذا سے جا کر بولے۔ اب ہماری خوشامد کیجیے۔ آج کے آٹھویں دن ہمارے یہاں آپ کی دعوت ہوگی۔ اچھے سے اچھے قسم کی برائڈی طے کر رکھیے۔ شتاب جان کے ہاتھ پلواؤں گا۔

معیذا: شتاب جان کون! کیا تمہاری بہن کا نام ہے؟
خوبی: ارے تو بہ! شتاب جان سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اس نے مجھے بھیجا تھا کہ روم جا کر نام کرو تو پھر نکاح ہوگا۔ اب میں وہاں سے نام کر کے لوٹا ہوں، پہنچتے پہنچتے شادی ہوگی۔

معیذا: کیا سن ہوگا؟ بیوہ تو نہیں ہیں؟
خوبی: خدا نہ کرے، درزی ابھی زندہ ہے۔
معیذا: کیا میاں والی ہے اور آپ اس کے ساتھ نکاح کریں گے؟ سن کیا ہے؟
خوبی: ابھی کیا سن ہے، کل کی لڑکی ہے، کوئی پینتالیس برس کی ہو شاید!
معیذا: بس، پینتالیس ہی برس کی؟ تب تو اسے پالنا پڑے گا!
خوبی: ہم تو قسمت کے دہنی ہیں۔
معیذا: بھلا شکل صورت کیسی ہے؟

خوبی: یہ آزاد سے پوچھو۔ چاند میں میل ہے، اس میں میل نہیں، میں تو آزاد کو دعائیں دیتا ہوں جن کی بدولت شتاب جان ملیں۔

یہاں سے خوبی ہوٹل والوں کے پاس پہنچے اور ان سے بھی ویسی چرچا کی۔ اجی، بالکل سانچے کی ڈھلی ہے، کوئی دیکھے تو بے ہوش ہو جائے۔ اب آزاد کے سامنے اسے تھوڑا ہی آنے دوں گا، ہرگز نہیں۔

خانساں: تم سے بات چیت بھی ہوئی یا دور ہی سے دیکھا؟
خوبی: جی ہاں، کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ باتیں کیا کرتی ہیں، مصری کی ڈلی گھومتی ہیں۔
ہوٹل والوں نے خوبی کو خوب بتایا۔ اتنی دیر میں آزاد نے جہاز کا بندوبست کیا اور ایک روز دونوں پریوں اور خواجہ صاحب کے ساتھ جہاز پر سوار ہوئے۔ سوار ہوتے ہی خوبی نے

گانا شروع کیا۔

ارے ملاح لگا کشتی میرا محبوب جاتا ہے
شتابوں کی تمنا میں مجھے دل لے کے آتا ہے
مگر چھوڑا ودیشی ہو کے خواجہ نے گئے لڑنے
شتابوں کے لیے جی میرا کل سے تملاتا ہے

آزاد نے شہ کے دے دے کر اور چنگ پر چڑھایا۔ جیوں جیوں ان کی تعریف کرتے
تھے، وہ اور اڑتے تھے۔ جہاز تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ ایک ملاح نے کہا۔ لوگوں، ہوشیار!
طوفان آ رہا ہے۔ یہ خبر سننے ہی کتنوں ہی کے تو ہوش اڑ گئے اور میاں خوبی تو دوہائی دینے
لگے۔ جہاز کی دوہائی! بڑے کی دوہائی! سمندر کی دوہائی! ہاں شتاب جان، ارے میری پیاری
شتاب دعا مانگ۔

یہ کہہ کر آپ نے اڑ کر آزاد کی طرف دیکھا۔ آزاد کچھ تاڑ گئے کہ اس فقرے کی داد
چاہتے ہیں۔ کہاں۔ سبحان اللہ، شتاب جان کے لیے شتاب، کیا خوب۔
خوبی: اس فن میں کوئی میری برابری کیا کرے گا بھلا۔ استاد ہوں، استاد۔
آزاد: اور لطف یہ ہے کہ ایسے نازک وقت میں بھی نہیں چوکتے۔
خوبی: یا خدا، میری سن لے۔ یارو، رو رو کر اس کی درگاہ سے دعا مانگو کہ خواجہ بچ
جائیں اور شتاب جان سے بیاہ ہو۔ خوب روؤ۔

آزاد: جناب، یہ کیا سبب ہے کہ آپ صرف اپنے لیے دعا مانگتے ہیں، اور بے چاروں
کا بھی تو خیال رکھیے۔

اتنے میں آندھی آ گئی۔ آزاد تو جہاز کے کپتان کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ خوبی
نے سوچا، اگر جہاز ڈوب گیا تو شتاب جان کیا کرے گی؟ فوراً انیم کی ڈیپالی اور خوب کس کر
کمر میں باندھ کر بولے۔ لو یاروں، ہم تو تیار ہیں۔ اب چاہے آندھی آئے یا گیولا۔ طوفان
نہیں، طوفان کا باپ آئے تو کیا غم ہے!

جہاز والے تو گھبرائے ہوئے تھے کہ نہیں معلوم طوفان کیا گل کھلائے، مگر خواجہ صاحب
تان لگا رہے تھے۔

شتابوں کی تمنا میں میرا دل تملاتا ہے۔

آزاد: خواجہ صاحب، آپ تو بے وقت کی شہنائی بجاتے ہیں۔ پہلے تو روئے چلائے اور اب تان لگانے لگے۔

ایک ٹھاکر صاحب بھی جہاز پر سوار تھے۔ خوبی کو گاتے دیکھ کر سمجھے کہ یہ کوئی بڑے دلی ہیں۔ قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور بولے۔ سائیں جی، ہمارے حق میں دعا کیجیے۔
خوبی: خوش رہو بابا، بیڑا پار ہے۔

آزاد نے خوبی کے کان میں کہا۔ یار، یہ تو اچھا آلو پھنسا۔ راستے میں خوب دل لگی رہے گی۔

ٹھاکر صاحب بار بار خوبی سے سوال کرتے تھے اور میاں خوبی اناپ شاپ جواب دیتے تھے۔

ٹھاکر: سائیں جی، جمعہ کے دن سفر کرنا کیسا ہے؟

خوبی: بہت اچھا دن ہے۔

ٹھاکر: اور جمعرات؟

خوبی: اس سے بھی اچھا۔

آزاد: ٹھاکر صاحب، آپ کب سے سفر کر رہے ہیں؟

ٹھاکر: جناب، کوئی چالیس برس ہوئے۔

آزاد: چالیس برس سفر کرتے ہو گئے اور ابھی تک آپ اچھے اور برے دن پوچھتے

جاتے ہیں۔

ٹھاکر: سنیچر کے دن آپ سفر کر کے دیکھ لیں۔

خوبی: ہم نے اس بارے میں بہت غور کیا ہے۔ بری ساعت کا سفر کبھی پورا نہیں

ہوتا۔

ٹھاکر: سائیں جی، کچھ اور نصیحت کیجیے، جس سے میرا بھلا ہو۔

خوبی: اچھا سنو، پہلی بات تو یہ ہے کہ جس دن چاہو، سفر کرو، مگر پہر رات رہے سے،

تمھاری منزل دونی ہو جائے گی۔ دوسری نصیحت یہ ہے کہ ایک بیوی سے زیادہ کے ساتھ

شادی نہ کرنا، اگر وہ مر جائے تو دوسری شادی کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ تیسری بات یہ ہے

کہ رات کو دو گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں رہ کر خدا کی یاد کرنا۔ گرمی، جاڑا، برسات تینوں

موسوں میں اس کا خیال رکھنا۔ چوتھی نصیحت یہ ہے کہ اچھے کھانے اور اچھے کپڑے سے پرہیز رکھنا۔ کھانے کو جو کی روٹی اور پینے کو ادا ہوا پانی کافی ہے۔

خوبی نے یہ نصیحتیں کچھ اس طرح کیں، گویا وہ پہنچے ہوئے فقیر ہیں۔ ٹھاکر نے اپنی نوٹ بک پر یہ سب باتیں لکھ لیں اور بولا۔ سائیں جی، آپ سے ملاقات کرنا چاہوں تو کیسے کروں؟

خوبی: بس، لکھنؤ میں شتاب جان کا مکان پوچھتے ہوئے چلے آنا۔

ٹھاکر: شتاب جان کون ہیں؟

خوبی: کوئی ہو، تمہیں اس سے مطلب؟

یوں ہی ٹھاکر صاحب کو بتاتے ہوئے راستہ کٹ گیا اور ممبئی سائے نظر آنے لگا۔ خوبی کی بائیس کھل گئیں، چلا کر کہا۔ یارو، ذرا دیکھنا، شتاب جان کی سواری تو نہیں آئی ہے۔ کریم بخش نامی مہری ساتھ ہوگی۔ اتلس کا لہنگا ہے، کہبادوں کی پگڑیاں رنگی ہوئی ہیں، مچھلیاں ضرور لٹک رہیں ہوں گی۔ ارے مہری! مہری! کیا بہری ہے؟

لوگوں نے سمجھایا کہ صاحب، ابھی بندر گاہ تو آنے دو؟ شتاب جان یہاں سے کیوں کر سن لیں گی؟ بولے۔ اجی، ہٹو بھی، تم کیا جانو۔ کبھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو؟ ارے نادان، عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں، کیا شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی؟ واہ، بھلا کوئی بات ہے! مگر جواب کیوں نہ دیا؟ اس میں ایک لم ہے، وہ یہ کہ اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دیں تو ہماری نظروں سے گر جائیں۔ مزہ جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر ڈھونڈتے اور آواز دیتے ہوں اور وہ ہمیں پیچھے سے ایک دھول بھائیں اور تن کر کہیں۔ مڑی کاٹا، آنکھوں کا اندھا نام نین سکھ، غل چاتا پھرتا ہے، اور ہم دھول کھا کر کہیں کہ دیکھیے سرکار، اب کی دھول لگائی تو خیر، جواب لگائی تو جگڑ جائے گی۔ اس پر وہ جھلا کر اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تراتر دو چار اور جما دیں، تب میں ہنس کر کہوں، تو پھر دو ایک جوتے بھی لگا دو، اس بغیر طبیعت بے چین ہے۔

آزاد: بالفعل! کیسے تو میں ہی لگا دوں۔

خوبی: اجی نہیں، آپ کو تکلیف ہوگی۔

آزاد: واللہ، کس بھکونے کو ذرا بھی تکلیف ہو۔

خوبی : میاں، پہلے منہ دھو آؤ، ان کھوپڑیوں کے سہلانے کے لیے پریوں کے ہاتھ چاہیے، تم جیسے دیوں کے نہیں۔

اتنے میں سمندر کا کنارہ نظر آیا تو خوبی نے غل جھا کر کہا۔ شتاب جان صاحب، آپ کا یہ غلام فرازندانہ آداب عرض.....

آزاد سے پوچھا کہ اس بے موقع ہنسی کا کیا سبب ہے؟ آزاد نے کہا۔ اس کا سبب ہے آپ کی حماقت۔ کیا آپ شتاب کے بیٹے ہیں جو ان کو فرزندانہ آداب بجالاتے ہیں، جو رو کو کوئی اس طرح سلام کرتا ہے؟

خوبی : (گالوں پر تھپڑ لگا کر) ارر، غضب ہو گیا، برا ہوا۔ واللہ اتنا ذلیل ہوا کہ کیا کہوں۔ بھائی، عشق میں ہوش حواس کب ٹھیک رہتے ہیں، اناپ شاپ باتیں منہ سے نکل ہی جاتی ہیں، مگر خیر! اب تو پاکی صاف صاف نظر آتی ہے۔ وہ دیکھیے، مہری سانسے ڈٹی کھڑی ہے۔ اخواہ، اب تو مہری بھی باڑھ پر ہے۔

جہاز نے لنگر ڈالا اور لوگ اترنے لگے۔ خواجہ صاحب دور ہی سے شتاب جان کو ڈھونڈنے لگے۔ آزاد دونوں لیڈیوں کو لے کر خشکی پر آئے تو بمبئی کے مرزا صاحب نے دوڑ کر انھیں گلے لگایا۔ پھر دونوں پریوں کو دیکھ کر تعجب سے بولے۔ ان دونوں کو کہاں سے لائے، کیا پرستان کی پریاں ہیں؟

آزاد نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ خوبی کفن پھاڑ کر بول اٹھے۔ ادھر شتاب جان، ادھر، اوکرم بخش کرم پھوڑ، کبجی کے نشان، یہاں کیوں نہیں آتی دور ہی سے بٹے بتاتی ہے۔ مرزا : کس کو پکارتے ہو خواجہ صاحب، میں بلا لوں۔ کیا میاہ لائے ہو کوئی پری؟ مگر استاد، نام تو ہندستان کا ہے، ذرا دکھا تو دو۔

آزاد نے خیر و عافیت پوچھی اور دونوں آدمیوں سے شہزادہ ہمایوں فر کی چرچا ہونے لگی۔ پھر لڑائی کا ذکر چھڑ گیا۔

ادھر خواجہ صاحب نے افیم گھولی اور چسکی لگا کر غل چھایا۔ شتاب جان پیاری، میں تیرے واری، جلدی سے آری، صورت دکھاری، آنسو ہیں جاری۔ جان من، جس بستر پر تم سوئی تھیں اس کو ہر روز سونگھ لیا کرتا ہوں اور اسی کی خوشبو پر زندگی دارو مدار ہے تیری سی نہ ہو کسی میں پائی

سارے پھولوں کو سونگتا ہوں

مرزا صاحب نے کہا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ جناب خواجہ صاحب، کیا سفر میں عقل بھی کھو آئے، یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ اگر سچے عاشق ہو تو فریاد کیسی؟
خوجی: جناب، کہنے اور کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔
کب اپنے منہ سے عاشق کھوؤ بے داد کرتے ہیں،
دہانے غیر سے وہ مثل نے فریاد کرتے ہیں۔
خوجی: مجھ سے کہیے تو ایسے دو کروڑ شعر پڑھ دوں، عاشقی دوسری چیز ہے، شاعری دوسری چیز۔

مرزا: دو کروڑ شعر تو دس کروڑ برس تک بھی آپ سے نہ پڑھے جائیں گے۔ آپ دو ہی چار شعر فرمائیں۔
خوجی: اچھا تو سنیے اور گنتے جائیے، آپ بھی کیا کہیں گے۔

یہی کہہ کہہ کے ہجر یار میں فریاد کرتے ہیں
وہ بھولے ہم کو بیٹھے ہیں جنہیں ہم یاد کرتے ہیں
اسیران کہن پر تازہ وہ بے داد کرتے ہیں
رہی طاقت نہ جب اڑنے کی تب آزاد کرتے ہیں
رقم کرتا ہوں جس دم کاٹ تیری تیغ ابرو کی
گریباں چاک اپنا جامہ فولاد کرتے ہیں
صفت ہوتی ہے جاناں جس غزل میں تیرے ابرو کی
تو ہم ہر بیت پر آنکھوں سے اپنی صاد کرتے ہیں
اب بھی نہ کوئی شرمائے تو اندھیر ہے، دو کروڑ شعر نہ پڑھ کر سناؤں تو نام بدل ڈالوں۔
ہاں، اور سنیے۔

نہیں ہم یاد سے رہتے ہیں غافل ایک دم ہدم،
جو بت کو بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں۔
آزاد: اس وقت تو مرزا صاحب کو آپ نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔
خوجی: اجی، یہاں کوئی ایک شعر پڑھے تو ہم دس کروڑ شعر پڑھتے ہیں۔ جانتے ہو

کہاں کے رہنے والے ہیں ہم! بمبئی والوں کو ہم سمجھتے کیا ہیں۔
 اتنے میں ایک عورت نے خوجی کو اشارے سے بلایا تو ان کی بانجھیں کل گئیں۔
 بولے۔ کیا حکم ہے حضور؟
 عورت: اے دور حضور کے بچے! کچھ لایا بھی ہے وہاں سے، یا خالی ہاتھ جھلاتا چلا آتا ہے۔

خوجی: پہلے تم اپنا نام تو بتاؤ؟
 عورت: اے لو، پہروں سے نام رٹ رہا ہے اور اب پوچھتا ہے، نام بتا دو۔ (دھپ بجا کر) اور نام پوچھے گا؟
 خوجی: اے تم نے تو دھپ لگانی شروع کی، جو کہیں اب کی ہاتھ اٹھایا تو بہت ہی بے ڈھب ہوگی۔

آزاد: ارے یار، یہ کیا ماجرا ہے؟ بے بھاد کی پڑھنے لگی۔
 خوجی: اجی، محبت کے یہی مزے ہیں بھائی جان۔ تم یہ باتیں کیا جانو۔
 مرزا: یہ آپ کی بیابتا ہیں یا صرف ملاقات ہے؟
 شتاب: ہمارے بزرگوں سے یہ رشتہ چلا آتا ہے۔
 مرزا: تو یہ کہو کہ تم ان کی بہن ہو۔
 خوجی: جناب، ذرا سنبھل کر فرمائیے گا۔ میں آپ کا بڑا لحاظ کرتا ہوں۔
 شتاب: اے، تو کچھ جھوٹ بھی ہے۔ آخر آپ میرے ہیں کون؟ مفت میں میاں بننے کا شوق چڑایا ہے؟
 خوجی: ارے تو نکاح تو ہو لے۔ قسم خدا کی، لڑائی کے میدان میں بھی دل تمھاری ہی طرف رہتا تھا۔

آزاد: ہمیشہ یاد کرتے تھے بے چارے!
 جب آزاد لیڈیوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے تب مرزا نے خوجی سے کہا۔ چلیے، وہ لوگ جا رہے ہیں۔
 خوجی: جا رہے ہیں تو جانے دیجیے۔ اب مدت کے بعد معشوق سے ملاقات ہوئی ہے،
 ذرا باتیں کر لوں۔ آپ چلیے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

وہ لوگ ادھر روانہ ہوئے۔ ادھر شتاب جان نے خوبی کو دوسری گاڑی میں سوار کرایا اور گھر چلیں۔ خواجہ صاحب خوش تھے کہ داگلی میں مشوق ہاتھ آیا۔ گھر پہنچ کر شتاب جان نے خوبی سے کہا: اب کچھ کھلوائیے، بہت ٹوک لگی ہے۔

خوبی: بھئی واہ، میں سپاہی آدمی، میرے پاس سوا ڈھال، تلوار، برجمی، کٹار کے اور کیا ہے؟ یا تنھے ہیں، سو وہ میں کسی کو دے نہیں سکتا۔

شتاب: کمائی کرنے گئے تھے وہاں، یا راستہ ٹاپنے؟ تنھے لے کر چائوں، تلوار سے اپنی گردن مار لوں، چھری بھونک کے مر جاؤں؟ چھری تلوار سے کہیں پیٹ بھرتا ہے؟

خوبی: ابھی کچھ کھلاؤ پلاؤ، جب ہم رسالداری کریں گے تو تم کو مال و مال کر دیں گے۔ اب پروانہ آیا چاہتا ہے۔ لڑائی میں میں نے جو بڑے بڑے کام کیے وہ تو تم سن ہی چکی ہوگی۔ دس ہزار سپاہیوں کی ناک کاٹ ڈالی۔ ادھر دشمن کی فوج نے شکست پائی، ادھر میں نے کردلی اٹھائی اور میدان میں کھٹ سے داخل۔ جس کو دیکھا کہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے، اس کی ناک اڑا دی۔ جب تک لڑائی ہوتی رہتی تھی، بندہ چمپا بیٹھا رہتا تھا، کبھی پیڑ پر چڑھ گیا، کبھی کسی جھونپڑے میں لگ گیا۔ مفت میں جان دینا کون سی عقلندی ہے۔ مگر لڑائی ختم ہوتے ہی میدان میں جا پہنچتا تھا۔ جس شہر میں جاتا تھا، شہر بھر کی عورتیں میرے پیچھے پڑ جاتی تھیں، مگر میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ غرض کی لڑائی میں میں نے بڑا نام کیا، یہ میری ہی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ آزاد پاشا بن بیٹھے۔ یہ تو جانتے بھی نہ تھے کہ لڑائی کس چیز کا نام ہے۔

شتاب: مگر یہ تو بتاؤ کہ بندوق سے ناک کیوں کر کاٹی جاتی ہے؟

خوبی: تم ان باتوں کو کیا جانو، یہ سپاہیوں کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

ادھر آزاد مرزا صاحب کے گھر پہنچے تو بیگم صاحب پھولی نہ سائیں۔ خدمت گار نے آزاد کو جھک کر سلام کیا۔ دونوں دوست کمرے میں جا کر بیٹھے۔ مرزا صاحب نے گھر میں جا کر دیکھا تو بیگم صاحب پٹنگ پر پڑی تھیں۔ مہری سے پوچھا تو معلوم ہوا، آج طبیعت کچھ خراب ہے۔ باہر آکر آزاد سے کہا۔ گھر میں سوتی ہیں اور طبیعت بھی اچھی نہیں۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ آزاد سمجھے کی بیماری محض بہانہ ہے، ہم سے کچھ ناراض ہیں۔

انتے میں ایک چھڑا سی نے آکر مرزا صاحب کو ایک لفافہ دیا۔ یونورٹھی کے رجسٹرار نے

کچھ صلاح کرنے کے لیے انہیں بلایا تھا۔ مرزا صاحب بولے۔ بھائی، اس وقت تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مدت کے بعد ایک دوست آئے ہیں، ان کی خاطر تواضع میں لگا ہوا ہوں۔ مگر جب آزاد نے کہا کہ آپ چاہیے، شاید کوئی ضروری کام ہو، تو مرزا صاحب نے گاڑی تیار کرائی اور رجسٹرار سے ملنے گئے۔

ادھر آزاد کے پاس زمین نے آکر سلام کیا۔

آزاد: کہو زمین، اچھی رہیں؟

زمین: حضور کے جان مال کو دعا دیتی ہوں۔ حضور تو اچھے رہے؟

آزاد: بیگم صاحب کیا ابھی آرام ہی میں ہیں؟ اگر اجازت ہو تو سلام کر آؤں۔

زمین: حضور کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں، چلیے!

آزاد زمین کے ساتھ اندر گئے تو کمرے میں قدم رکھتے ہی مہری نے کہا۔ وہیں بیٹھے،

کرسی آتی ہے۔

آزاد: سرکار کہاں ہیں؟ بیگم صاحب کی خدمت میں آداب عرض ہے۔

بیگم: بندگی۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہیے، مجھے زیادہ باتیں کرنے کی فرصت نہیں۔

آزاد: خدا خیر کرے، آخر کس جرم میں یہ خفگی ہے؟ کون سا گناہ ہوا؟

بیگم: بس زبان نہ کھلوائیے، غضب خدا کا، ایک خط تک بھیجنا قسم تھا، کوئی اس طرح

اپنے عزیزوں کو ترپاتا ہے؟

آزاد: قصور معاف کیجیے، بے شک گناہ تو ہوا، مگر میں نے سوچا کہ خط بھیج کر مفت میں

محبت بڑھانے سے کیا فائدہ، نہ جانے زندہ آؤں یا نہ آؤں، اس لیے ایسی فکر کروں کہ ان

کے دل سے بھول ہی جاؤں۔ اگر زندگی باقی ہے تو چٹکیوں سے گناہ معاف کرا لوں گا۔

اس فقرے نے بیگم صاحب کے دل پر بڑا اثر کیا۔ سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ زمین کو نیچے

بھیجا کہ حقہ بھر لاؤ، خواص کو حکم دیا کہ پان بنواؤ۔ تب میدان خالی پا کر چک اٹھا دی اور

بولیں۔ وہ کہاں گئے ہیں؟

آزاد: کسی صاحب نے بلایا ہے، ان سے ملنے گئے ہیں۔ خدا نے مجھے یہ خوب موقع

دیا۔

بیگم: کیا کہا، کیا کہا! ذرا پھر تو کہیے گا، ذرا سنوں تو کس چیز کا موقع ملا؟

آزاد: یہی حضور کو سلام کرنے کا۔

بیگم: ہاں، یوں باتیں کیجیے، ادب کے ساتھ۔ حسن آرا کے نام تم نے کوئی خط بھیجا تھا؟ مجھے لکھا ہے کہ جس دن آئیں، فوراً تار سے اطلاع دینا۔

آزاد: اب تو یہی دھن ہے کہ کسی طرح وہاں پہنچوں اور زندگی کے ارمان پورے کروں۔

بیگم: جی نہیں، پہلے آپ کا امتحان ہوگا۔ آپ رنگین آدی ٹھہرے، آپ کا اعتبار ہی کیا ہے؟

آزاد: افوہ! یہ بدگمانی۔ خیر صاحب، اختیار ہے، مگر ہمارے ساتھ چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟

بیگم: نہیں صاحب، یہ ہمارے یہاں کا دستور نہیں۔ بہنوئی کے ساتھ جوان سالیاں سفر نہیں کرتیں۔ وقت پر ان کے ساتھ آ جاؤں گی۔

آزاد: خیر، اتنی عنایت کیا کم ہے۔ اب آپ جا کر پردے میں بیٹھیے، میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔

بیگم: کیوں صاحب، یہی آپ کا عشق ہے؟ اسی بوتے پر امتحان دیجیے گا؟ بیگم صاحب نے وہاں زیادہ دیر تک بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ آزاد بھی باہر چلے گئے۔ خدمت گار نے حقہ بھر دیا۔ پتنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پینے لگے تو خیال آیا کہ آج مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، اگر مرزا صاحب مجھے گھورتے دیکھ لیتے تو اپنے دل میں کیا کہتے۔ اب یہاں زیادہ ٹھہرنا غلطی ہے۔ خدا کرے، آج کے چوتھے دن وہاں پہنچ جاؤں۔ بیگم صاحب نے مجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔

وہ ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ زمین نے بیگم صاحب کا ایک خط لا کر انھیں دیا۔ لکھا تھا۔ ابھی ابھی میں نے سنا ہے کہ آپ کے ساتھ دو لیڈیاں آئی ہیں۔ دونوں کسن ہیں اور آپ بھی جوان۔ آگ اور بھوس کا ساتھ کیا؟ اگر واقعی تم نے ان دونوں کے ساتھ شادی کر لی ہے تو بڑا غضب کیا، پھر امید نہ رکھنا کہ حسن آرا تم کو منہ لگائیں گی۔ تم نے ساری کی کرائی محنت خاک میں ملا دی، اور اگر شادی نہیں کی تو یہاں لائے کیوں؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟ حسن آرا غریب تو تمہاری محبت کی آگ میں جلے اور تم سوتوں کے ساتھ لاؤ۔

کیا تھر ہے کیونکہ نہ اٹھے درد جگر میں
میری تو بغل خالی ہے اور آپ کے بر میں
ایک آن بھی مجھ سے نہ ملو آٹھ پہر میں
گھر چھوڑ کے اپنا رہو یوں اور کے گھر میں

تم اور غیروں کو ساتھ لاؤ، تمہاری طرح حسن آرا بھی اب تک شادی کر لیتی تو تم کیا بنا
لیتے؟ تم کو اتنا بھی خیال نہ رہا کہ حسن آرا کے دل پر کیا اثر ہوگا۔ تمہارے ہزاروں چاہنے
والے ہیں تو اس کے گراہک بھی اچھے اچھے شہزادے ہیں۔ میں نے ٹھان لی ہے کہ حسن آرا
کو آپ کے حال سے اطلاع دوں، اور کہہ دوں کہ اب وہ آزاد نہیں رہے، اب دو دو بغل
میں رہتی ہیں، اس پر بہو بیٹیوں پر بری نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر تم نے میرا اطمینان نہ کر دیا تو
پچھتاؤ گے۔

یہ خط پڑھ کر آزاد نے زہین سے کہا۔ کیوں، تم ادھر کی ادھر لگا لگا کر آپس میں لڑواتی
ہو؟ تم نے ان سے جا کے کیا کہہ دیا، مجھ سے بھی پوچھ لیا ہوتا۔

زہین: اے حضور، تو میرا اس میں کیا قصور۔ مجھ سے جو سرکار نے پوچھا، وہ میں نے
بیان کر دیا۔ اس میں بندی نے کیا گناہ کیا؟

آزاد: خیر، جو ہوا سو ہوا، لاؤ قلم دوات۔

آزاد نے اسی وقت اس خط کا جواب لکھا۔ بیگم صاحب کی خدمت میں آداب عرض کرتا
ہوں۔ آپ مجھ پر بے وفائی کا الزام لگاتی ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے گا، مگر اکثر مقاموں
پر ایسی ایسی پرنیاں مجھ پر رہی ہیں کہ اگر حسن آرا کا سچا عشق نہ ہوتا تو میں ہندستان میں
آنے کا نام نہ لیتا، مگر افسوس ہے کہ میری محنت بے کار گئی۔ میرا خدا جانتا ہے، جن جن
جنگلوں، پہاڑوں پر میں گیا، کوئی کم گیا ہوگا۔ ہفتوں ایک اندھیری کٹھری میں قید رہا، جہاں
کسی جاندار کی صورت نظر نہ آتی تھی، اور یہ سب اس لیے کہ ایک پرانی مجھ سے شادی کرنا
چاہتی تھی اور میں انکار کرتا تھا کہ حسن آرا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یہ دونوں لیڈیاں جو میرے
ساتھ ہیں، انھوں نے مجھ پر بڑے بڑے احسان کیے ہیں۔ گاڑھے وقت میں کام آئی ہیں،
ورنہ آج آزاد یہاں نہ ہوتا۔ مگر اتنے پر بھی آپ ناراض ہو رہی ہیں، اسے اپنی بد نصیبی کے
سوا اور کیا کہوں۔ خدا کے لیے کہیں حسن آرا کو نہ لکھ بھیجتا، اور اگر یہی چاہتی ہو کہ میں جان

دو تو صاف صاف کہہ دو۔ حسن آرا کو لکھنے سے کیا فائدہ، اور کیا لکھوں۔ طبیعت بے چین ہے۔

بیگم صاحب نے یہ خط پڑھا تو غصہ ٹھنڈا ہو گیا، جھم جھم کرتی ہوئی پردے کے پاس کھڑی ہوئیں تو دیکھا۔ آزاد سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہے ہیں۔ آہستہ سے پکارا۔ آزاد! زہین: حضور، دیکھیے کون ساٹنے کھڑا ہے۔ ذرا ادھر نگاہ تو کیجیے۔ بیگم: آزاد، جو روئے تو ہمیں کوہے ہے کرے۔ زہین، ذرا صراہی تو اٹھالا، منہ پر دو چھینٹے دے۔

زہین: حضور، کیا غضب کر رہے ہیں، وہ ساٹنے کون کھڑا ہے؟ آزاد: (بیگم صاحب کی طرف رخ کر کے) کیا حکم ہے؟ بیگم: میرا تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ آزاد: کوئی بات نہیں۔ خدا جانے، اس وقت کیا یاد آیا۔ آپ کو تکلیف ہوتی ہے، آپ جائیں، میں بالکل اچھا ہوں۔

بیگم: اب چونچلے رہنے دو، منہ دھو ڈالو۔ واہ، مرد ہو کر آنسو بہاتے ہو؟ تم سے تو جھوکریاں اچھی۔ یہ تم لڑائی میں کیا کرتے تھے؟ آزاد: جلاؤ اور اس پر طعنے دو۔

بیگم: کیا خوب، جلانے کی ایک ہی کمی۔ جلاتے تم ہو یا میں؟ ایک چھوڑ دو وہاں سے لائے، اوپر سے باتیں بناتے ہو، منہ دکھانے قابل نہیں رکھا اپنے کو۔ حسن آرا نے اڑتی خبر پائی تھی کہ آزاد نے کسی عورت کو بیاہ لیا تو پچھاڑے کھانے لگی۔ ایک تم ہو کہ جوڑی کی جوڑی ساتھ لائے اور اوپر سے کہتے ہو، جلاؤ۔ قصیں شرم بھی نہیں آتی؟ آزاد: کیا ٹیڑھی کھیر ہے، نہ کھاتے بنے، نہ چھوڑتے بنے۔

بیگم: تو پھر صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟

آزاد: بیاہتا بیوی ہیں دونوں، اور کیا کہیں۔

بیگم: اچھا صاحب، بیاہتا بیوی نہیں، دونوں آپ کی بیہوش سہی، اب خوش ہوئے؟ بدوسوں بعد آئے تو ایک کاٹا ساتھ لے کے۔ بھلا سوچو، میں چٹکی ہو رہوں تو حسن آرا کیا کہیں گی کہ واہ بہن، تم نے ہم کو لکھا بھی نہیں۔ لیکن دو میں کیا فائدہ ہوگا قصیں۔

آزاد: آپ دل لگی کرتی ہیں اور میں چپ ہوں۔ بھر میری بھی زبان کھلے گی۔
 بیگم: تم ہم کو صرف اتنا بتلا دو کہ یہ دونوں یہاں کس لیے آئی ہیں، تو میں چپ ہو
 رہوں۔

آزاد: تو ان دونوں کو یہاں بلا لاؤں؟
 بیگم: ان کو آنے دو، ان سے صلاح لے کے جواب دوں گی۔
 آزاد: تو کیا آپ ہم میں اور ان میں کوئی فرق سمجھتی ہیں۔ میں تم کو اور حسن آرا کو
 ایک نظر سے دیکھتا ہوں۔

بیگم: بس، اب میں کہہ بیٹھوں گی۔ بڑے بے شرم ہو، چھٹے ہوئے بے حیا۔
 اتنے میں زمین نے آکر کہا۔ مرزا صاحب آگئے۔ بیگم صاحب جھپٹ کر کوشے پر ہو
 رہیں اور آزاد بارہ دری میں آکر لیٹ رہے۔

مرزا: آپ نے ابھی تک حمام کیا یا نہیں؟ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ جس طرف جاتا ہوں،
 لوگ گاڑی روک روک آپ کا حال پوچھنے لگتے ہیں۔ کل شام کو سب لوگ آپ سے ٹاؤن
 ہال میں ملنا چاہتے ہیں۔ ہاں، یہ تو فرمائیے، یہ دونوں پریاں کون ہیں؟ ایک تو ان میں سے
 کسی اور ملک کی معلوم ہوتی ہے۔

آزاد: ایک تو روس کی ہیں اور دوسری کوہ قاف کی۔

مرزا: یار، برا کیا۔ حسن آرا سنے گی تو کیا کہے گی؟

ادھر تو یہ باتیں ہو رہیں تھیں، ادھر شباب جان نے خوبی سے کہا۔ ذرا اکیلے میں چلیے،
 آپ سے کچھ کہنا ہے۔ خوبی نے کہا۔ خدا کی قدرت ہے کہ معشوق تک ہم سے اکیلے میں
 چلنے کو کہتے ہیں۔ جو حکم ہو، بجا لاؤں۔ اگر توپ کے مہرے پر بھیج دو تو ابھی چلا جاؤں۔ یہ تو
 کہو، تمہارے سبب سے چپ ہوں، نہیں اب تک دس پانچ کو قتل کر چکا ہوتا۔

یہ کہہ کر خواجہ صاحب جھپٹ کر باہر نکلے۔ اتفاق سے ایک گاڑی وان آہستہ آہستہ گاڑی
 ہانکتا چلا جاتا تھا۔ خوبی اسے گالیاں دینے لگے۔ بھلا بے گیدی، بھلا، خبردار جو آج سے یہ
 بے ادبی کی۔ تو جانتا نہیں، ہم کون ہیں؟ ہمارے مکان کی طرف سے گاتا ہوا نکلتا ہے۔ ہمیں
 بھی رعایا سمجھ لیا ہے۔ بھلا بی شباب جان گاڑی کی گھر گھڑا ہٹ سنیں گی تو ان کے کانوں کو کتنا
 ٹانگوار لگے گا! گاڑی والا پہلے تو گھبرایا کہ یہ ماجرا کیا ہے! گاڑی روک کر خوبی کی طرف

مکھور نے لگا۔ مگر جب خواجہ صاحب جھپٹ کر گاڑی کے پاس پہنچے، اور چاہا کہ لکڑی جمائیں کہ اس نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اب آپ بسٹ پٹا رہے ہیں اور وہ چھوڑتا ہی نہیں۔

خوبی: کہہ دیا، خیر اسی میں ہے کہ ہمارا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔ میں جو مجڑوں گا تو ایک پلٹن کے منائے بھی نہ مانوں گا۔

گاڑی دان: ہاتھ تو اب تمہارے چھڑائے نہیں چھوٹ سکتا۔
خوبی: لانا تو میری کرولی۔

گاڑی دان: لانا تو میرا ڈھائی تیلے والا چمرو دھا۔
خوبی: شریفوں میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔

گاڑی دان: شریف کبھی تمہارے باپ بھی تھے کہ تمہیں شریف ہوئے؟
خوبی: اچھا، ہاتھ چھوڑ دو۔ ورنہ اتنی کرولیاں بھوکوں گا کہ عمر بھر یاد کرو گے۔

گاڑی دان نے اس پر جھلا کر خوبی کا ہاتھ مروڑنا شروع کیا۔ خوبی کی جان پر بن آئی، مگر کیا کریں! سب سے زیادہ خیال اس بات کا تھا کہ کہیں شتاب جان نہ دیکھ لیں، نہیں تو بالکل نظروں سے گر جاؤں۔

خوبی: کہتا ہوں، ہاتھ چھوڑ دے، میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔

گاڑی دان: میں تو اپنا گاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ آپ نے گالیاں کیوں دیں؟
خوبی: ہمارے گھر کی طرف سے کیوں گاتے جاتے تھے؟

گاڑی دان: آپ منع کرنے والے کون؟ کیا کسی کی زبان بند کر دیجیے گا؟

بارے کئی آدمیوں نے گاڑی دان کو سمجھ کر خوبی کا ہاتھ چھڑایا۔ خوبی جھاڑ پونچھ کر اندر گئے اور شتاب جان سے بولے۔ میں بات پیچھے کرتا ہوں، کرولی پہلے بھونکتا ہوں۔ پاجی گاتا ہوا جاتا تھا۔ میں نے پکڑ کر اتنی چپقتی لگائیں کہ بھرتا ہی بنا دیا۔ میرے منہ سے آگ برقع ہے۔ اچھا، اب یہ فرمائیے کہ جس نیک بخت بد نصیب سے تمہاری شادی پہلے ہوئی تھی وہ اب کہاں ہے اور کیسا آدمی تھا؟

شتاب جان: یہ تو میں پیچھے بتاؤں گی۔ پہلے یہ فرمائیے کہ اس کو نیک بخت کہا تو بد نصیب کیوں کہا؟ جو نیک بخت ہے وہ بد نصیب کیسے ہو سکتا ہے؟

خونجی: قسم خدا کی، میری باتیں جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں۔ نیک بخت اس لیے کہاں کہ تم جیسی بیوی پائی۔ بد نصیب اس لیے کہا کہ یا تو وہ مر گیا یا تم نے اسے نکال باہر کیا۔

شباب جان: اچھا سنئے، پہلے میری شادی ایک خوبصورت جوان کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس کی نظر اس پر پڑی، سمجھ گیا۔

خونجی: یہاں بھی تو وہی حال ہے۔ گھر سے نکلنا مشکل ہے۔

شباب جان: حاضر جواب ایسا تھا کہ بات کی بات میں غزلیں کہہ ڈالتا تھا۔

خونجی: یہ بات مجھ میں بھی ہے۔ دس ہزار شعر ایک منٹ میں کہہ دوں، ایک کم نہ ایک

زیادہ!

شباب جان: میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم اس سے کسی بات میں کم ہو۔ اول تو جوان گبھرو، ابھی مسیں بھیکتی ہیں۔ آدمی کیا، شیر معلوم ہوتے ہو۔ پھر سپاہی آدمی ہو، اس پر شاعر بھی ہو۔ بس ذرا جھلے ہو، اتنی خرابی ہے۔

خونجی: اگر میرا حکم مانتی ہو تو موسم ہو جاؤں گا۔ ہاں، لڑوگی تو ہمارا مزاج بے شک جھلا ہے۔

شباب جان: میاں، میں لوٹھی بن کے رہوں گی۔ مجھ سے لڑائی جھگڑے سے واسطہ؟ مگر یہ بتاؤ کہ رہو گے کہاں؟ میں بسبئی میں رہوں گی۔ تمہارے ساتھ ماری ماری نہ پھروں گی۔ خونجی: تم جہاں رہو گی، وہیں میں رہوں گا، مگر.....

شباب جان: اگر مگر میں کچھ نہیں جانتی۔ ایک تو تم کو افیم نہ کھانے دوں گی۔ تم نے افیم کھائی اور میں نے کسی بہانے سے زہر کھلا دیا۔

خونجی: اچھا نہ کھائیں گے۔ کچھ ضروری ہے کہ افیم کھائے ہی۔ نہ کھائی، پی لی، چلو چھٹی ہوئی۔

شباب جان: پینے بھی نہ دوں گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ نوکری ضرور کرو، بغیر نوکری کے گزارا نہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ میرے دوست اور رشتے دار جو آتے ہیں، بدستور آیا کریں گے۔

خونجی: واہ، کہیں آنے نہ دوں۔ ان بد معاشوں کو پھٹکنے نہ دوں گا۔

شباب جان: اچھا تو کل میرے گھر چلو، وہیں ہمارا نکاح ہوگا۔

دوسرے دن خوبی شباب جان کے ساتھ اس کے گھر چلے۔ بہی کے کئی اسٹیشن کے بعد شباب جان گاڑی سے اتر پڑیں اور خوبی سے کہا۔ اب آپ کے پاس جتنے روپے پیسے ہوں، چپکے سے نکال کر رکھ دو۔ میرے گھر والے بنا نذرانہ لیے شادی نہ کریں گے۔

خوبی نے دیکھا کہ یہاں برے پھنسے۔ اب اگر کہتے ہیں کہ پاس روپے نہیں ہیں تو ہٹھی ہوتی ہے۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ شادی کا دو گھڑی مذاق رہے گا، مگر اب جو دیکھا کہ سچ شادی کرنی پڑے گی تو چوکنے ہوئے۔ بولے۔ میں تو دل لگی کرتا تھا جی۔ شادی کیسی اور بیاہ کیسا؟ کچھ اوپر ساتھ برس کا تو میرا سن ہے، اب بھلا شادی کیا کروں گا۔ تم ابھی جوان ہو، تم کو سینکڑوں جوان مل جائیں گے۔

شباب جان: تم کو اس سے مطلب کیا! اس کی مجھے کتنی فکر ہونی چاہیے۔ جب میرا تم پر دل آیا اور تم بھی نکاح کرنے پر راضی ہوئے تو اب انکار کرنا کیا معنی۔ اچھے ہو تو میرے، برے ہو تو میرے۔

میاں خوبی گھبرائے، سٹی پٹی بھول گئی۔ اپنی عقل پر بہت پچھتائے اور اسی وقت آزاد کے نام خط لکھا۔ میرے بڑے بھائی صاحب، سلامت۔ میری آنکھ سے اب غفلت کا پردہ اٹھ گیا۔ میں کچھ اوپر ساتھ برس کا ہوں گا۔ اس سن میں نکاح کا خیال سرا سر غیر مناسب ہے۔ مگر شباب جان مجھ پر بری طرح عاشق ہو گئیں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس طرح میرا جسم چور ہے اسی طرح میری صورت بھی چور ہے۔ مجھے کوئی دیکھے تو سمجھے کہ ہڈیاں تک گل گئی ہیں، مگر آپ خوب جانتے ہیں کہ انھیں ہڈیوں کے بل پر میں نے مصر کے نامی پہلوان کو لڑا دیا اور بوا زعفران جیسی دیونی کی لائیں کھیں۔ دوسرا ہوتا، تو کچھ مرکل جاتا۔ اسی طرح میری صورت میں بھی یہ بات ہے کہ جو دیکھتا ہے، عاشق ہو جاتا ہے۔ میں خود سوچتا ہوں کہ یہ کیا بات ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر، اب آپ سے یہ عرض ہے کہ خط دیکھتے میری مدد کے لیے دوڑو، ورنہ موت کا سامنا ہے۔ سوچا تھا کہ شادی نہ ہوگی تو لوگ ہنسیں گے کہ آزاد تو دو دو ساتھ لائے اور خواجہ صاحب موچی کے موچی رہے۔ لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ یہ شادی میرے لیے زہر ہوگی۔ ذرا شرطیں سنئے۔ افیم چھوڑ دو اور نوکری کر لو۔ اب بتائیے کہ افیم چھوڑ دوں تو زندہ کیسے رہوں؟ اب رہی نوکری۔ یہاں لڑکپن سے فقرے بازوں کی صحبت میں

رہے۔ کہیں اڑانا، باتیں بنانا، الفم کی چسکی لگانا ہمارا کام ہے۔ بھلا ہم سے نوکری کیا ہوگی، اور کرنا بھی چاہیں تو کس کی نوکری کریں۔ سرکاری نوکری تو ملنے سے رہی، وہاں تو آدمی بچپن سال کا ہوا اور نکالا گیا، اور یہاں بچپن اور دس پینسٹھ برس کے ہیں۔ ہم تو اسی کام کے ہیں کہ کسی نواب زادے کی صحبت میں رہیں اور اس کو ایسا پکا رئیس بنا دیں کہ وہ بھی یاد کرے، چندوں کا قوام ہم سے بنوالیں الفم ایسی پلائیں کہ عمر بھر یاد کریں۔ رہا یہ ہے کہ ہم جمع خرچ لکھیں، یہ ہم سے نہ ہوگا، جس کو اپنا کام غارت کرانا ہو وہ ہمیں نوکر رکھے۔ اس لیے اگر میرا گلا یہاں سے چھڑا دو تو بڑا احسان ہو۔ خدا جانے، تم لوگ مجھے کیوں خاک میں ملا تے ہو، تمہارے ساتھ روم گیا، تمہاری طرف سے لڑا بھڑا، وقت بے وقت کام آیا اور اب تم مجھے ذبح کیے دیتے ہو۔

یہ خط لکھ کر شتاب جان کو دیا کہ آزاد کے پاس جلد پہنچا دو۔ شادی کے معاملے ان سے صلاح کرنی ہے۔

شتاب جان : صلاح کی کیا ضرورت ہے بھلا؟

خوجی : شادی بیاہ کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے، ذرا آدمی کو اس بارے میں اونچ نیچ سوچ لینی چاہیے، میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ تمہاری شرطیں منظور کروں یا نہیں۔

شتاب جان : اچھا جاؤ، میں کوئی شرط نہیں کرتی۔

خوجی : تب منظور، دل سے منظور، مگر یہ خط تو بھیج دو۔

اب سینے کہ شتاب جان کے ساتھ ایک خاں صاحب بھی تھے۔ مالوے کے رہنے والے۔ انھوں نے خوجی کو دو دن میں اتنی الفم پلا دی، جتنی وہ چار دن میں بھی نہ پیتے۔ سفر میں صحت بھی کچھ بگڑ گئی تھی۔ دو ہی دن میں چرمر ہو گئے۔ لیٹے لیٹے خاں صاحب سے بولے۔ جناب، دوسرا اتنی الفم پیتا تو بول جاتا، کیا مجال کہ اس شہر میں کوئی میرا مقابلہ کر سکے، اور اس شہر پر کیا موقوف ہے، جہاں کہیے، مقابلے کے لیے تیار ہوں، کوئی تولے بھر پے تو میں سیر بھر بی جاؤں۔

خان صاحب : مگر استاد، آج کچھ انجربنجر ڈھیلے نظر آتے ہیں، شاید الفم زیادہ ہو گئی۔

خوجی : واہ، ایسا کہیں کہیے گا بھی نہیں۔ جب چاہے، ساتھ بیٹھ کر پی لیجیے۔

شام تک خوجی کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ شتاب جان نے انھیں دق کرنا شروع

کیا۔ اے آگ لگے تیرے سونے پر مردوئے، کب تک سوتا رہے گا۔

خوبی: سونے دو، سونے دو۔

شباب: بھلا خیر، ہم تو سمجھتے تھے، خبر آگئی۔

خان: کہتی کس سے ہو، وہ پنچے خدا گنج۔

شباب: اے پھر پینک آگئی، ابھی تو زندہ ہو گیا تھا۔

خان: (کان کے پاس جا کر) خولجہ صاحب!

خوبی: ذرا سونے دو بھائی۔

شباب: میرے یہاں پینک والوں کا کام نہیں ہے۔

خان: خولجہ صاحب، ارے خولجہ صاحب، اے بولتے ہی نہیں! چل بے!

خولجہ صاحب کی حالت جب بہت خراب ہو گئی، تو ایک حکیم صاحب بلائے گئے۔

انھوں نے کہا۔ زہر کا اثر ہے۔ نسخہ لکھا۔ بارے کچھ رات جاتے جاتے نشہ ٹوٹا۔ خوبی کی آنکھیں کھلیں۔

شباب: میں تو سمجھی تھی، تم چل بے۔

خوبی: ایسا نہ کہو بھائی، جوانی کی موت بری ہوتی ہے۔

شباب: مر مڑی کاٹے، ابھی جوان بنا ہے۔

خوبی: بس زبان سنجالو، ہم سمجھ گئے کہ تم کوئی بھیری ہو۔ میں اگر اپنے حالات بیان

کروں تو آنکھیں کھل جائیں۔ ہم امیر کبیر کے لڑکے ہیں۔ لڑکپن میں ہمارے دروازے پر

ہاتھی بندھتا تھا، تم جیسی بھیریوں کو میں کیا سمجھتا ہوں۔

یہ کہہ کر آپ مارے غصے کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ سمجھتے تھے کہ شباب جان مجھ

پر عاشق ہے ہی، اس سے بھلا کیسا رہا جائے گا، ضرور مجھے تلاش کرنے آئے گی، لیکن جب

بہت دیر گزر گئی اور شباب جان نے خبر نہ لی تو آپ لوٹے۔ دیکھا تو شباب جان کا کہیں پتہ

نہیں، گھر کا کوٹا کوٹا ٹولا، مگر شباب جان وہاں کہاں؟ اسی محلے میں ایک حبشن رہتی تھی۔ خوبی

نے جا کر اس سے اپنا سارا قصہ کہا، تو وہ ہنس کر بولی۔ تم بھی کتنے احمق ہو۔ شباب جان بھلا

کون ہے؟ تم کو مرزا صاحب اور آزاد نے چکھا دیا ہے۔

خوبی کو آزاد کی بے وفائی کا بہت ملال ہوا۔ جس کے ساتھ اتنے دنوں تک جان جو حکم

کر کے رہے، اس نے ہندستان میں لا کے انھیں چھوڑ دیا۔ خوب روئے، جب حبش سے باتیں کرنے لگے۔

خوجی: قسمت کہاں سے ہمیں کہاں لائی؟

حبش: آپ کا گھونسل کس جھاڑی میں ہے؟

خوجی: ہم خوجستان کے رہنے والے ہیں۔

حبش: یہ کس جگہ کا نام لیا؟ خوجستان تو کسی جگہ کا نام نہیں معلوم ہوتا۔

خوجی: تو کیا ساری دنیا تمھاری دیکھی ہوئی ہے؟ خوجستان ایک صوبہ ہے، شکر قد اور

جلپستان کے قریب۔ بتا شاندی اسے سیراب کرتی ہے۔

حبش: بھلا شکر قد بھی کوئی دیس ہے؟

خوجی: ہے کیوں نہیں، سر قد کا چھوٹا بھائی ہے۔

حبش: وہاں آپ کس محلے میں رہتے تھے؟

خوجی: طلوہ پور میں۔

حبش: تب تو آپ بڑے میٹھے آدمی ہیں۔

خوجی: میٹھے تو نہیں، ہیں تو تھکے، ناک پر کھمی نہیں بیٹھنے دیتے، مگر میٹھی نظر کے عاشق

ہیں۔

خواہش نہ قد کی ہے، نہ طالب شکر کے ہیں

چسکے پڑے ہوئے تیری میٹھی نظر کے ہیں

حبش: تو آپ بھی میرے عاشقوں میں ہیں؟

خوجی: عاشق کوئی اور ہوں گے، ہم معشوقوں کے معشوق ہیں۔ ساری دنیا چھان ڈالی،

پر جہاں گیا، معشوقوں کے مارے ناک میں دم ہو گیا۔ بوا زعفران نامی ایک عورت ہم پر اتنی

رنجھی کہ پٹے پکڑ کے دے جوتا دے جوتا مار کے اڑا دیا۔ مگر ہماری بہادری دیکھو کہ آف تک

نہ کی۔

حبش: ہم کو یقین کیونکر آئے؟ ہم تو جب جانیں کہ سر جھکاؤ اور ہم دو چار لگائیں، پھر

دیکھیں، کیسے نہیں آف کرتے۔

خوجی: ہاں، ہم حاضر ہیں، مگر آج ابھی افیم یوں ہی سی پی ہے۔ جب نئے نئے جے تب

البتہ آزادلو۔

جشن : اے ہے، پھر ٹھوڑی افیم کا نام لیا، مرتے مرتے بچے اور اب تک افیم ہی افیم کہتے جاتے ہو؟

خوجی : تم اس کے مرے کیا جانو۔ افیم کھانا فقیری ہے۔ غرور کو تو یہ خاک میں ملا دیتی ہے۔ میں کتنی ہی جگہ پھا، کبھی جوتیاں کھائی، کبھی کوئی کانچی ہاؤس لے گیا، مگر ہم نے کبھی جواب نہ دیا۔

جشن چلی گئی تو خوجی صاحب نے ایک ڈولی منگوائی اور اس میں بیٹھ کر چند خانے پہنچے۔ لوگوں نے انھیں دیکھا تو چکرائے کہ یہ نیا پنچھی کون پھنسا۔

خوجی : سلام علیکم بھائیوں!

امامی : علیکم بھائی، علیکم۔ کہاں سے آتا ہوا؟

خوجی : ذرا ٹکٹے دو، پھر کہوں۔ دو برس لڑائی پر رہا، جب دیکھا مورچا بندی، مر مٹا، مگر نام بھی وہ کیا کہ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

امامی : لڑائی کیسی؟ آج کل تو کہیں لڑائی نہیں ہے۔

خوجی : تم گھر میں بیٹھے بیٹھے دنیا کا کیا حال جانو۔

قادر : کیا روم روس کی لڑائی سے آتے ہو کیا؟

امامی : اجی، یہ نہ کیجیے، ان کو ساری دنیا کا حال معلوم رہتا ہے۔ کوئی بات ان سے چھپی ٹھوڑی ہے۔

قادر : روم والے نے روس کے بادشاہ سے کہا کہ جس طرح تمہارا چچا حکیمی کوڑی دیتا تھا، اسی طرح تم بھی دیا کرو، مگر اس نے نہ مانا۔ اسی بات پر تکرار ہوئی، تو روم والے نے کہا، اچھا، اپنے چچا کی قبر میں چلو اور پوچھ دیکھو، کیا آواز آتی ہے۔ بس جناب، سننے کی بات ہے کہ روم والے نے نہ مانا، روم کے بادشاہ کے پاس حضرت سلیمان کی انگوٹھی تھی۔ انھوں نے جو اسے اہوا میں اچھالا، تو سینکڑوں جن حاضر ہو گئے۔ بادشاہ نے کہاں کہ روم میں چاروں طرف آگ لگا دو۔ چاروں طرف آگ لگ گئی۔ تب روس کے بادشاہ نے وزیروں کو جمع کر کے کہا، آگ بجھاؤ، بس سوا کروڑ ہشتی مشکیں بھر بھر کے دوڑے۔ ایک ایک ملک میں دو دو لاکھ من پانی آتا تھا۔

خوبی : کیوں صاحب، یہ آپ سے کس نے کہا ہے؟

امامی : اجی، یہ نہ پوچھو، ان سے فرشتے سب کہہ جاتے ہیں۔

قادر : بس صاحب، سننے کی باتیں ہیں کہ سوا دو کروڑ جنگیں ملک کے چاروں کونوں پر پڑتی تھیں، مگر آگ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ تب بادشاہ نے حکم دیا کہ دو کروڑ لاکھ بھیجنے کام کریں اور مشکوں میں چھیس چھیس کروڑ من پانی ہو۔

خوبی : او گیدی، کیوں اتنا جھوٹ بولتا ہے؟

شہرانی : میاں سننے دو بھائی، عجب آدمی ہو۔

خوبی : اجی، میں تو سننے سننے پاگل ہو گیا۔

قادر : آپ لکھنؤ کے مہین آدمی، ان ملکوں کا حال کیا جانیں۔ روم، روس، توران،

الوپ شہر کا حال ہم سے سنیے۔

امامی : وہاں کے لوگ بھی دیو ہوتے ہیں دیو!

قادر : روس کے بادشاہ کی خوراک کا حال سنو تو چکرا جاؤ۔ سویرے منہ اندھیرے 6

بکروں کی تختی، چار بکروں کے کباب، دس مرغ کا پلاؤ اور دو مریلے ترکیب سے کھاتے ہیں،

اور 9 بجے کے وقت سو مرغوں کا شوربہ اور دس سیر خنڈا پانی، بارہ بجے جواہرات کا شربت،

کبھی پچاس من، کبھی ساٹھ من، چار بجے دو کچے بکرے، دو کچے ہرن، شام کو شربت کا ایک

پیپا اور پھر رات گئے گوشت کا ایک پھکڑا۔

امامی : جب تو طاقتیں ہوتی ہیں کہ سو سو آدمیوں کو ایک آدمی مار ڈالتا ہے۔ ہندستان کا

آدمی کیا کھا کر لڑے گا۔

شہرانی : ہندستان میں اگر ہانسنے کی طاقت کچھ ہے تو چندو کے سبب سے، نہیں تو سب

کے سب مر جاتے۔

امامی : سنا، روس والے ہاتھی سے اکیلے لڑ جاتے ہیں۔

قادر : ہم سے سنو، دس ہاتھی ہوں اور ایک روسی تو وہ دسوں کو مار ڈالے گا۔

خوبی : آپ روس کبھی گئے ہیں؟

قادر : اجی، ہم گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔

خوبی : ہم تو ابھی لڑائی کے میدان سے آتے ہیں، ہم نے تو وہاں ایک ہاتھی بھی نہ

دیکھا۔

قادر : روم والوں نے جب آگ لگا دی، تو وہ گیارہ برس، گیارہ مہینے، گیارہ دن، گیارہ گھنٹے جلا کی۔ اب جا کے ذری ذری آگ بجھی ہے، نہیں تو عجب نقشہ تھا کہ سارا ملک جل رہا ہے اور پانی کا چمڑکاؤ ہو رہا ہے۔ روم والے جب رات کو سوتے ہیں تو ہر مکان میں دو دیوں کا چہرہ رہتا ہے۔

خوجی : ارے یارو، اس جھوٹ پر خدا کی مار، ہم برسوں رہے، ایک دیو بھی نہ دیکھا۔
قادر : آپ کی تو صورت ہی کہے دیتی ہے کہ آپ ضرور گئے ہوں گے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو گھر کے باہر قدم نہیں رکھا۔

خوجی سمجھے تھے کہ چنڈو خانے میں چل کر اپنے سفر کا حال بیان کریں گے اور سب کو بند کر دیں گے، چنڈو خانے میں ان کی طوطی بولنے لگے گی، مگر یہاں جو آئے تو دیکھا کہ ان کے بھی چچا موجود ہیں۔ جھلا کر پوچھا، بتاؤ تو، روم کے پائے تخت کا کیا نام ہے؟
قادر : واہ، اس میں کیا رکھا ہے، بھلا سا نام تو ہے، ہاں مرض بان۔
خوجی : اس نام کا تو وہاں کوئی شہر ہی نہیں۔

قادر : اجی، تم کیا جانو۔ مرض بان وہ شہر ہے جہاں پہاڑوں پر پریاں رہتی ہیں۔ وہاں پہاڑوں پر بادل پانی پی پی کر جاتے ہیں اور سب کو پانی پلاتے ہیں۔
خوجی : تو وہ کوئی دوسرا روم ہوگا۔ جس روم سے میں آتا ہوں وہ اور ہے۔
قادر : اچھا بتاؤ، روم کے بادشاہ کا کیا نام ہے؟
خوجی : سلطان عبد الحمید خان۔

قادر : بس بس، رہنے دیجیے، آپ نہیں جانتے، اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم روم سے آتے ہیں۔ بھلا لڑائی کا کیا نتیجہ ہوا، یہی بتائیے؟

خوجی : پلوتا کی لڑائی میں ترک ہار گئے اور روسیوں نے فتح پائی۔
قادر : کیا بکتا ہے بے ہودہ، خبردار جو ایسا کہا ہوگا تو اتنے جوتے لگاؤں گا کہ بھرکس ہی نکل جائے گا۔

امامی : ہمارے بادشاہ کے حق میں بری بات نکالتا ہے، بے ادب کہیں کا۔ بچے، یہاں ایسی باتیں کرو گے تو پٹ جاؤ گے۔

خوجی : سنو جی ہم فوجی آدمی ہیں۔

قادر : اب زیادہ بولو گے تو اٹھ کر کچھر ہی نکال دوں گا۔

شیراتی : یہ ہیں کہاں کے، ذرا صورت تو دیکھو، معلوم ہوتا ہے، قبر سے نکل بھاگا ہے۔
خوجی کو سب نے مل کر ایسا ڈنکا کہ بے چارے کروٹی اور طنچہ بھول گئے۔ گئے تو بڑے
زم میں تھے کہ چندو خانے میں خوب ڈیک ہانگیں گے، مگر وہاں لینے کے دینے پڑ گئے۔ چپکے
سے چندو کے چھیننے اڑائے اور لمبے ہوئے۔ راستے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی ایک
جگہ کھڑے ہیں۔ آپ نے گھس کر دیکھا تو ایک پہلوان بچ میں بیٹھا ہے اور لوگ کھڑے اس
کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ خوجی نے سمجھا کہ ہم نے بھی تو مصر کے پہلوان کو پٹکا
تھا، ہم کیا کسی سے کم ہیں؟ اس زم میں آپ نے پہلوان کو للکارا۔ بھائی پہلوان، ہم اس
وقت اتنے خوش ہیں کہ پھولے نہیں ساتے۔ مدت کے بعد آج اپنا جوڑ دار پایا۔

پہلوان : تم کہاں کے پہلوان ہو بھائی صاحب؟

خوجی : یار، کیا بتائیں۔ اپنے ساتھیوں میں اب کوئی رہا ہی نہیں۔ اب تو کوئی پہلوان
چتا ہی نہیں۔

پہلوان : استاد، کچھ ہم کو بتاؤ۔

خوجی : اچی، تم خود استاد ہو۔

پہلوان : آپ کس کے شاگرد ہیں؟

خوجی : شاگرد تو بھائی، کسی کے نہیں ہوئے۔ مگر ہاں، اچھے اچھے استادوں نے لوہا مان

لیا۔ ہندستان سے روم تک اور روم سے روس تک سیر کر آیا۔ تم آج کل کہاں رہتے ہو؟

پہلوان : آج کل ایک نواب صاحب کے یہاں ہیں۔ تین روپیہ روز دیتے ہیں اور

ایک بکرا، آٹھ سیر دودھ اور دو سیر کھجی بندھا ہے۔ نواب امجد علی نام ہے۔

خوجی : بھلا وہاں چندو کی بھی چچا رہتی ہے؟

پہلوان : کچھ مت پوچھیے بھائی صاحب، دن رات۔

خوجی : بھلا وہاں مستیا بیگ بھی ہیں؟

پہلوان : جی ہاں ہیں، آپ کیسے جان گئے؟

خوجی : اچی، وہ کون سا نواب ہے جس کی ہم نے مصاجی نہ کی ہو۔ نواب امجد علی کے

یہاں برسوں رہا ہوں۔ بیروں کا اب بھی شوق ہے یا نہیں؟
 پہلوان: اجی، ابھی تک سف شکر کا ماتم ہوتا ہے۔
 خوبی: تمہارا کب تک جانے، ارادہ ہے؟
 پہلوان: میں تو آج ہی جا رہا ہوں۔

خوبی: تو بھائی، ہم کو بھی ضرور پلٹے چلو۔ ہم اپنا کرایہ دے دیں گے۔
 پہلوان: تو چلیے، میرا اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ہم کو نواب صاحب نے صرف دو دن کی چھٹی دی تھی۔ کل یہاں داخل ہوئے، آج دنگل میں کشتی نکالی اور شام کو ریل پر چل دیں گے۔ ہمارے ساتھ مستیا بیگ بھی ہیں۔

شام کو پہلوان کے ساتھ خوبی اسٹیشن پر آئے۔ پہلوان نے کہا۔ وہ دیکھیے مرزا صاحب کھڑے ہیں، جاکر مل لیجیے، خواجہ آہستہ آہستہ گئے اور پیچھے سے مرزا صاحب کی آنکھیں بند کر لیں۔

مرزا: کون ہے بھائی، مونڈی مسات ہیں کیا؟ ہاتھ تو ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

پہلوان: کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر ہیں کوئی مسات۔

خوبی: بھلا گیدی، بھلا، ابھی سے بھول گیا، کیوں؟

مرزا: اخوا، خواجہ صاحب ہیں! کہو بھائی خوبی، اچھے تو رہے؟

خوبی: خوبی کہیں اور رہتے ہوں گے۔ اب ہمیں خواجہ صاحب کہا کرو۔

مرزا: ارے کجنت، گلے تو مل لے۔

خوبی: سرکار کیسے ہیں، گھر میں تو خیر و عافیت ہے؟

مرزا: ہاں، سب خدا کا فضل ہے، بیگم صاحب پر کچھ آسیب تھا، مگر اب اچھی ہیں۔

کہوں، تم نے تو خوب نام پیدا کیا۔

خوبی: نام، ارے ہم میجر تھے۔

مرزا: سرکار کو اس لڑائی کے زمانے میں اخبار سے بڑا شوق تھا۔ آزاد کو تو سب جانتے

ہیں، مگر تمہارا حال جب سے پڑھا تب سے سرکار کو اخباروں کا اعتبار جاتا رہا۔ کہتے تھے کہ

سمندر کی صورت دیکھ کر اس کا جگر کیوں نہ پھٹ گیا۔ بھلا اسے لڑائی سے کیا واسطہ۔

خوبی: اب اس کا حال تو ان لوگوں سے پوچھو جو مورچوں پر ہمارے شریک تھے۔ تم

مزے سے بیٹھے بیٹھے کھڑے اڑایا کیے، تم کو ان باتوں سے کیا سروکار، مگر بھائی، نشوں میں نشہ شراب کا۔ ادھر ڈنکے پر چوٹ پڑی، ادھر سپاہی کمر کس کر تیار ہو گئے۔
مرزا: اب سرکار کے سامنے نہ کہنا کہ شراب پی تھی، نہیں کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے۔

خوجی: اجی، اب تو سرکار کے باپ کے نکالے بھی نہیں نکل سکتے۔
مرزا: ایک بار تو اخبار میں لکھا تھا کہ خوجی نے شادی کر لی ہے۔
خوجی: ارے یار، اس کا حال نہ پوچھو، اپنی شکل و صورت کا حال تو ہم کو باہر جا کر معلوم ہوتا۔ جس شہر میں نکل گئے، کروڑوں عورتیں ہم پر عاشق ہو گئیں۔ خاص کر ایک کسمن نازنین نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

مرزا: تو آپ کی صورت پر سب عورتیں جان دیتی تھیں؟ کیا کہنا ہے، تم نے بہادری کے کام بھی تو خوب کیے۔

خوجی: بھائی جان، مورچہ پر میری بہادری دیکھتے تو دنگ ہو جاتے۔ خیر، اس پری پر میرے سوا پچاس ترکی افسر بھی عاشق تھے۔ یہ رائے طے پائی کہ جس سے وہ پری راضی ہو اس سے نکاح کرے۔ ایک روز سب بن ٹھن کر آئے، مگر اس شوخ کی نظر آپ کے خادم ہی پر پڑتی تھی۔

مرزا: اے کیوں نہیں، ہزار جان سے عاشق ہو گئی ہوگی۔
خوجی: آد دیکھا نہ تاؤ، اٹھلاتی ہوئی آئی اور میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اب سینے، ان سیوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکی، کہنے لگے، یوں ہم نہ مانیں گے، جو اس سے نکاح کرے وہ پہلے پچاسوں آدمیوں سے لڑے۔ ہم نے کہا، خیر! تلوار کھینچ کر جو چلا، تو وہ وہ چوٹیں لگائیں کہ سب کے سب بلبلائے گئے۔ بس پری ہم کو مل گئی۔ اب دربار کے رنگ ڈنگ بیان کرو۔

مرزا: سب تمھاری یاد کیا کرتے ہیں۔ تھمن نے وہ چغل خوری پر کمر باندھی ہے کہ سینکڑوں خدمت گار اور کتنے ہی معاصیوں کو موقوف کرا دیا۔

خوجی: ایک ہی پاجی آدمی ہے۔ ہم روم گئے، فرانس گئے، ساری دنیا کے رئیس دیکھ ڈالے، مگر نواب سا بھولا بھالا رئیس کہیں نہ دیکھا۔ غضب خدا کا کہ ایک بد معاش نے جو کہہ

دیا، اس کا یقین ہو گیا، اب کوئی لاکھ سمجھائے، وہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔

مرزا: میرا تو اب وہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔

خوجی: اجی، اس جھگڑے کو چولہے میں ڈالو۔ اب ہم تم چل کر اپنا رنگ جمائیں گے۔
تم میری ہوا باندھنا اور ہم دونوں ایک جان دو کا بل ہو کر رہیں گے۔

مرزا: میں کہوں گا، خداوند، اب یہ سب مصائبوں کے سر تاج ہوئے، ساری دنیا میں
حضور کا نام کیا۔ مگر تم ذرا اپنے کو لیے رہنا۔

خوجی: اجی، میں تو ایسا بنوں کہ لوگ دنگ ہو جائیں۔

جب کھنٹی بجی اور مسافر چلے تو خوجی بھی پہلوان کی طرح اکڑ کر چلنے لگے۔ ریل کے
دو چار ملازموں نے ان پر آوازیں کنا شروع کیا۔

1۔ آدمی کیا گینڈا ہے، ماشا اللہ، کیا ہاتھ پاؤں ہیں!

2۔ کیوں صاحب، آپ کتنے ڈنڈ پیل سکتے ہیں؟

خوجی: اجی، بیماری نے توڑ دیا، نہیں تو میں ایک پوری ریل پر لد کے جاتا تھا۔

3۔ اس میں کیا شک ہے، ایک ایک ران دو دو من کی ہے۔

خوجی: قسم کھا کے عرض کرتا ہوں کہ اب آدھا نہیں رہا۔ یہ پہلوان ہمارے اکھاڑے کا
خلیفہ ہے، اور باقی سب شاگرد ہیں۔ سب ملا کے ہمارے چالیس بیالیس ہزار شاگرد ہوں
گے۔

ایک مسافر: دور دور سے لوگ شاگرد کرنے آتے ہوں گے؟

خوجی: دور دور سے۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ہندستان سے لے کر روس تک
میرے لاکھوں شاگرد ہیں۔ مصر میں ایسا ہوا کہ ایک پہلوان کی شامت آئی، ایک میلے میں ہم
کو ٹوک بیٹھا۔ ٹوکنا تھا کہ بندہ بھی چٹ لنگوٹ کس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ لاکھوں ہی آدمی
جمع تھے۔ اس کا سامنے آنا ہی تھا کہ میں اسی دم جٹ گیا، داؤں پٹخ ہونے لگے۔ اس کے
مصری داؤں تھے۔ اور ہمارے ہندستانی داؤں تھے۔ بس دم کی دم میں میں نے اسے اٹھا
پٹکا۔

اتنے میں دوسری کھنٹی ہوئی۔ خوجی ایسے بوکھلائے کہ زمانے درجے میں دھنس پڑے۔
وہاں لینا لینا کا غل مچا۔ بھاگے تو پہلے درجے میں گھس گئے، وہاں ایک انگریز نے ڈانٹ

بتائی۔ بارے نکل کر تیسرے درجے میں آئے۔ تھکے ماندے بہت تھے، سوئے تو ساری رات کٹ گئی۔ آنکھ کھلی تو لکھنؤ آ گیا تھا۔ شام کے وقت نواب صاحب کے یہاں داخل ہوئے۔
خوجی: آداب عرض ہے حضور۔

نواب: اخواہ، خوجی ہے! آؤ بھائی آؤ۔

خوجی: حاضر ہوں خداوند، خدا کا شکر ہے کہ آپ کی زیارت ہوئی۔

غفور: خوجی میاں، سلام۔

خوجی: سلام بھائی، سلام، مگر ہم کو خوجی میاں نہ کہنا، اب ہم فوج کے افسر ہیں۔

جھمن: آپ بادشاہ ہوں یا وزیر، ہمارے تو خوجی ہی ہو۔

خوجی: ہاں بھائی، یہ تو ہے ہی۔ حضور کے نمک کی قسم، ملکوں ملکوں اس دربار کا نام کیا۔

نواب: شاباش! ہم نے اخباروں میں تمھاری بڑی بڑی تقریفیں پڑھیں۔

خوجی: حضور، غلام کس لائق ہے۔

جھمن: بھلا یار، تم سمندر میں جہاز پر کیسے سوار ہوئے؟

خوجی: واہ، تم جہاز کی لیے پھرتے ہو۔ یہ مورچوں پر بڑے بڑے میجروں اور جنرلوں

سے بھڑ بھڑ پڑے ہیں۔ حضور، پلونا کی لڑائی میں کوئی دس لاکھ آدمی ایک طرف تھے اور ستر

سواروں کے ساتھ غلام دوسری طرف تھا، پھر یہ ملاحظہ کیجیے کہ چودہ دن تک برابر مقابلہ کیا اور

سب کے چھکے چھڑا دیے۔

جھمن: اتنا جھوٹ، ادھر دس لاکھ، ادھر ستر بھلا کوئی بات ہے۔

خوجی: تم کیا جانو، وہاں ہوتے تو ہوش اڑ جاتے۔

نواب: بھائی، اس میں تو شک نہیں کہ تم نے بڑا نام کیا۔ خبردار آج سے ان کو کوئی

خوجی نہ کہے۔ پاشا کے لقب سے پکارے جائیں۔

خوجی: آداب حضور! جھمن گیدی نے منہ کی کھائی نہ آخر۔ رئیسوں کی صحبت میں ایسے

پاچیوں کا رہنا مناسب نہیں۔

نواب: کیوں صاحب، ہندستان کے باہر بھی ہم کو کوئی جانتا ہے؟ سچ بتانا بھائی۔

خوجی: حضور، جہاں جہاں غلام گیا، حضور کا نام بادشاہوں سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

آزاد ممبئی سے چلے تو سب سے پہلے زینت اور اختر سے ملاقات کرنے کی یاد آئی۔ اس قصبے میں پہنچے تو ایک جگہ میاں خوبی کی یاد آگئی۔ آپ ہی آپ ہنسنے لگے۔ اتفاق سے ایک گاڑی پر کچھ سواریاں چلی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہنس کر کہا۔ واہ رے بھلے مانس، کیا دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے کیا؟ آزاد رنگین مزاج آدمی تو تھے ہی۔ آہستہ سے بولے۔ آج ایسی ایسی پیاری صورتیں نظر آئیں تو آدمی کے ہوش ہو اس کیوں کر ٹھکانے رہیں۔ اس پر وہ نازنین تک کر بولی۔ ارے، یہ تو دیکھنے ہی کو دیوانہ معلوم ہوتے تھے، اپنے مطلب کے بڑے پکے نکلے۔ کیوں میاں، یہ کیا صورت بنائی ہے، آدھا تیز اور آدھا بیڑ؟ خدا نے تم کو وہ چہرہ مہرا دیا ہے کہ لاکھ میں ایک ہو۔ مگر اس شکل و صورت پر جو لمبے لمبے بال ہوں، بالوں میں سولہ روپے والا تیل پڑا ہو، باریک شربتی کا انگرکھا ہو، جالی لوٹ کے کرتے سے گورے گورے ڈنڈ نظر آئیں، چست گھٹنا ہو، پیروں میں ایک اشرفی کا ٹاٹ بانی بوٹ ہو، انگرکھے پر کام دانی کی صدری ہو، سر سے پیر تک عطر میں بے ہو، مصاحبوں کی ٹوٹی ساتھ ہو، خدمت گاروں کے ہاتھ میں کاکبیں اور بٹریں ہوں اور اس ٹھاٹ کے ساتھ چوک میں نکلو، تو انگلیاں انھیں کہ وہ رئیس جا رہا ہے، تب لوگ کہیں کہ اس جج دج، نکھ سکھ، کٹے ٹھٹے کا گبھرو جوان دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ سب جھوڑے پٹے کتروا کے لٹڈور ہو گئے، اے واہ ری آپ کی عقل!

آزاد : ذرا میں تو جانوں کہ کس کی زبان سے یہ باتیں سن رہا ہوں۔ انسان ہم بھی ہیں، پھر انسان سے کیا پردہ؟

نازنین : اچھا، تو آپ بھی انسان ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ میڈھکی بھی چلی مداروں کو۔ آزاد : خیر صاحب، انسان نہ سہی۔

نازنین : (پردہ ہٹا کر) اے صاحب لیجیے، بس اب تو چار آنکھیں ہوئیں، اب کیلجے میں ٹھنڈک پہنچی؟

آزاد نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ یہ صورت تو کہیں دیکھی ہے اور اب خیال آتا ہے کہ آواز بھی کہیں سنی ہے۔ مگر اس وقت یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا تھا۔

نازنین : پہچانا؟ بھلا آپ کیوں پہچاننے لگے! رتبہ پا کر کون کسے پہچانتا ہے؟

آزاد: اتنا تو یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے، پر یہ خیال نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے۔
 نازنین: اچھا، ایک پتہ دیتے ہیں، اب بھی نہ سمجھو تو خدا تم سے سمجھے۔ یاد ہے، کس
 نے یہ غزل گائی تھی؟

کوئی مجھ سا دیوانہ پیدا نہ ہوگا
 ہوا بھی تو پھر ایسا رسوا نہ ہوگا
 نہ دیکھا ہو جس نے کہے اس کے آگے
 ہمیں لن ترانی سنانا نہ ہوگا

آزاد: اب سمجھ گیا! ظہورن، وہاں کی خیر و عافیت بیان کرو۔ انھیں دونوں بہنوں سے
 ملنے کے لیے ممبئی سے چلا آ رہا ہوں۔

ظہورن: سب خدا کا فضل ہے۔ دونوں بہنیں آرام سے ہیں، اختر کے میاں تو ان کا
 زیور کھاپی کر بھاگ گئے، اب انھوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ زینت بیگم خوش ہیں۔

آزاد: تو اب ہم ان کے میکے جائیں یا سرال؟

ظہورن: سرال نہ جائیے، میکے میں چلیے اور وہاں سے کسی مہری کے زبانی پیغام
 بھیجیے۔ ہم نے تو حضور کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

آزاد: ہم کو ان دونوں بہنوں کا حال بہت دنوں سے نہیں معلوم ہوا۔

ظہورن: یہ تو حضور، آپ ہی کا قصور ہے، کبھی آپ نے یہ پرزہ تک نہ بھیجا۔ جس
 دن زینت بیگم کے میاں نے ان سے کہا کہ لو، آزاد واپس آتے ہیں تو مارے خوشی کے کھل
 انھیں۔ تو اب آنا ہو آئیے، شام ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر میں آزاد زینت بیگم کے مکان پر جا پہنچے۔ ظہورن نے جا کر ان کی چاچی
 سے آزاد کے آنے کی اطلاع کی۔ اس نے آزاد کو فوراً بلا لیا۔

آزاد: بندگی عرض کرتا ہوں۔ آپ تو اتنے ہی دنوں میں بوڑھی ہو گئیں۔

چاچی: بیٹا، اب ہمارے جوانی کے دن تھوڑے ہی ہیں۔ تم تو خیر و عافیت کے ساتھ
 آئے؟ آنکھیں تھیں دیکھنے کو ترس گئیں۔

آزاد: جی ہاں، میں خیریت سے آ گیا۔ دونوں شہزادیوں کو بلوایئے۔ سنا، زینت کی بھی
 شادی ہو گئی ہے۔

چاچی : ہاں، اب تو دونوں بہنیں آرام سے ہیں۔ اختر کی کا پہلا میاں تو بالکل نالائق نکلا۔ زیور، گہنا پاتا، سب بچ کر کھا گیا اور خدا جانے، کدھر نکل گیا۔ اب دوسری شادی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ہیں۔ ساٹھ تنخواہ ہے اور اوپر سے کوئی چار روپیہ روز ملتا ہے۔ زینت کے میاں اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ دوسو کی طلب ہے۔ تمہارے چچا جان تو مجھے چھوڑ کر چل دیے۔ ادھر مہری نے جا کر دونوں بہنوں کو آزاد کے آنے کی خبر دی۔ زینت نے اپنی آیا کو ساتھ لیا اور میکے کی طرف چلی۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی آزاد سے ہاتھ ملا کر بولی۔ واہ رے بے مروت کے بادشاہ! کیوں صاحب، جب سے گئے ایک پرزہ تک بھیجنے کی قسم کھائی؟ آزاد : یہ تو نہ کہوں گی کہ سب سے پہلے تمہارے ہی دروازے پر آیا۔ یہ تو فرمائیے کہ یہ پوشاک کب سے اختیار کی؟

زینت : جب سے شادی ہوئی۔ انھیں انگریزی پوشاک بہت پسند ہے۔ آزاد : زینت، خدا گواہ ہے کہ اس وقت جاے میں پھولا نہیں ساتا۔ ایک تو تم کو دیکھا اور دوسرے یہ خوشخبری سنی کہ تمہارے میاں پڑھے لکھے آدمی ہیں اور تمہیں پیار کرتے ہیں۔ میاں بیوی میں محبت نہ ہو تو زندگی کا لطف ہی کیا۔

اتنے میں اختر بھی آگئی اور آتے ہی کہا۔ مبارک! آزاد : آپ کو بڑی تکلیف ہوئی معاف کرنا۔ اختر : میں نے سنا تھا کہ تم نے وہاں کسی سائینس سے شادی کر لی۔ آزاد : اور تمہیں اس کا یقین بھی ہو گیا؟

اختر : یقین کیوں نہ آتا۔ مردوں کے لیے یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ جب لوگ ایک چھوڑ، چار چار شادیاں کرتے ہیں تو یقین کیوں نہ آتا۔

آزاد : وہ پاجی ہے جو ایک کے سوا دوسری کا خیال بھی دل میں لائے۔ زینت : ایسے میاں بیوی کا کیا کہنا، مگر یہاں تو وہی پاجی نظر آتے ہیں جو بیوی کے ہوتے بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے۔

آزاد : اگر بیوی سمجھدار ہو تو میاں کبھی اس کے قابو سے باہر نہ ہو۔ اختر : یہ تو ہم مان چکے۔ خدا نہ کرے کہ کسی بھلے مانس کا پالا شہدے میاں سے پڑے۔

زینت : جس کے مزاج میں پاجی پن ہو اس سے بیوی کی کبھی نہ پنے گی۔ میاں صبح سے جائیں تو رات کے ایک بجے گھر میں آئے اور وہ بھی کسی روز آئے، کسی روز نہ آئے۔ بیوی بے چاری بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ بعض تو ایسے بے رحم ہوتے ہیں کہ بات ہوئی اور بیوی کو مار بیٹھے۔

آزاد : یہ تو دوضیا، جولاہوں کی بات ہیں۔

زینت : نہیں جناب، جو لوگ شریف کہلاتے ہیں ان میں بھی ایسے مردوں کی کمی نہیں

ہے۔

اختر : اے چولہے میں جائیں ایسے مرد، جہی تو بے چاریاں کنویں میں کود پڑتی ہیں، زہر کھا کے سو رہتی ہیں۔

زینت : مجھے خوب یاد ہے کہ ایک عورت اپنے میاں کو ذرا سی بات پر ہاتھ پھیلا پھیلا کوس رہی تھی کہ کوئی دشمن کو بھی نہ کو سے گا۔

آزاد : جہاں ایسے مرد ہیں وہاں ایسی عورتیں بھی ہیں۔

اختر : ایسی بیوی کا منہ لے کے جھلس دے۔

زینت : میرے تو بدن کے رویں کھڑے ہو گئے۔

آزاد : میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے میاں اور بیوی میں میل جول کیسے ہو جاتا

ہے۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے یورپین لیدیوں کی بات چل پڑی۔ زینت اور اختر نے ہندوستانی عورتوں کی طرف داری کی اور آزاد نے یورپین لیدیوں کی۔

آزاد : جو آرام یورپ کی عورتوں کو حاصل ہے وہ یہاں کی عورتوں کو کہاں نصیب، دھوپ میں اگر میاں بیوی ساتھ چلتے ہوں تو میاں چھتری لگائے گا۔

اختر : یہاں بھی مہاجنوں کو دیکھو۔ عورتیں دس دس ہزار کا زیور پہن کر نکلتی ہیں اور میاں لنگوٹا لگائے دوکان پر کھیاں مارا کرتے ہیں۔

آزاد : یہاں کی عورتوں کو تعلیم سے چڑ ہے۔

زینت : اس کا الزام بھی مردوں ہی کی گردن پر ہے۔ وہ خود عورتوں کو پڑھاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ ان کی برابری نہ کرنے لگیں۔

آزاد : ہمارے مکان کے پاس ایک مہاجن رہتے تھے۔ میں لڑکپن میں ان کے گھر کھیلنے جایا کرتا تھا۔ جیسے ہی میاں باہر سے آتا، بیوی چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھ جاتی۔ اگر تم سے کوئی کہے کہ میاں کے سامنے گھونگٹ کر کے جاؤ تو منظور کرو یا نہیں؟

آخر : واہ، یہاں تو گھر میں قید نہ رہا جائے، گھونگٹ کیسا؟

آزاد : یورپین لیڈیوں کو گھر کے انتظام کا جو سلیقہ ہوتا ہے، وہ ہماری عورتوں کو کہاں؟

زینت : ہندوستانی عورتوں میں جتنی وفا ہوتی ہے وہ یورپین لیڈیوں میں تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہاں ایک پیچھے سی ہو جاتی ہیں، وہاں مرد کے مرتے ہی دوسری شادی کر لیتی ہیں۔

(105)

وہاں دو دن اور رہ کر آزاد ان لیڈیوں کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور انھیں ہوٹل میں چھوڑ کر نواب صاحب کے مکان پر آئے۔ ادھر وہ گاڑی سے اترے، ادھر خدمت گاروں نے غل مچایا کہ خدادند، محمد آزاد پاشا آگئے۔ نواب صاحب مصاحبوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ آہو رہ رہ کر رہے ہوئے ترکی وردی ڈاٹے چلے آتے ہیں۔ نواب صاحب جھٹ کر ان کے گلے لپٹ گئے اور بولے۔ بھائی جان، آنکھیں صحتیں ڈھونڈتی تھیں۔

آزاد : شکر ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔

نواب : اجی، اب یہ باتیں نہ کرو، بڑے بڑے انگریز حکام تم سے ملنا چاہتے ہیں۔

مصاحب : بوا نام کیا۔ واللہ، کروڑوں آدمی ایک طرف اور حضور ایک طرف۔

خوبی : غلام بھی آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد : تم یہاں کب آگئے خواجہ صاحب؟

نواب : سنا، آپ نے تین تین کروڑ آدمیوں سے اکیلے مقابلہ کیا۔

غفور : اللہ کی دین ہے حضور!

نواب : ارے بھائی! گنگا جی ہٹ بھر لاؤ آپ کے واسطے، آزاد پاشا کو ایسا ویسا نہ سمجھتا۔ ان کی تعریف کشتربک کی زبان سے سنی۔ سنا، آپ سے روس کے بادشاہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ بھائی، تم نے وہ درجہ حاصل کیا ہے کہ ہم اگر حضور کہیں تو بجا ہے۔ کہاں روس

کے بادشاہ اور کہاں ہم!

خوجی: خداوند، مورچہ پر ان کو دیکھتے تو دنگ رہ جاتے۔ جیسے شیر کچھار میں ڈکارتا ہے۔
نواب: کیوں بھائی آزاد، انھوں نے وہاں کوئی کشتی نکالی تھی؟

آزاد: میرے سامنے تو سینکڑوں ہی بار چتیاے گئے اور ایک بونے تک نے ان کو اٹھا کے دے مارا۔

مصاحب: بھائی، اس وقت تو ہمہماٹا پھوٹ گیا۔

آزاد: کیا یہ گپ اڑاتے تھے کہ میں نے کشتیاں نکالیں؟

مستیایک: اے حضور، جب سے آئے ہیں، ناک میں دم کر دیا۔ بات ہوئی اور کروٹی نکالی۔

غفور: پرسوں تو کہتے تھے کہ مصر میں ہم نے آزاد کے برابر کے پہلوان کو دم بھر میں آسمان دکھا دیا۔

آزاد: کیا خوب! ایک بونے تک نے تو اٹھا کے دے مارا، چلے وہاں سے دون کی لینے۔

اتنے میں نواب صاحب کے یہاں ایک فحشی صاحب آئے اور آزاد کو دیکھ کر بولے۔
واللہ، آزاد پاشا صاحب ہے، آپ نے تو بڑا نام پیدا کیا، سبحان اللہ۔

نواب: اجی، کمشنر صاحب ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ عزت اور کیا ہوگی۔

خوجی: صاحب، لڑائی کے میدان میں کوئی ان کے سامنے ٹھرتا ہی نہ تھا۔
فحشی: آپ نے بھی بڑا ساتھ دیا خوبصورت صاحب، مگر آپ کی بہادری کا ذکر کہیں سننے کو نہیں آیا۔

خوجی: آپ ایسے گیدیوں کو میں کیا سمجھتا ہوں، میں نے وہ وہ کام کیے ہیں کہ کوئی کیا کرے گا۔ کروٹی ہاتھ میں لے لی اور صفوں کی صفیں صاف کر دیں۔

فحشی: آپ تو نواب صاحب کے یہاں بنے ہیں نا؟

خوجی: بنے ہوں گے آپ، بننا کیسا! کیا میں کوئی چرکنا ہوں۔ قسم ہے حضور کے قدموں کی، ساری دنیا جھان ڈالی، مگر آج تک ایسا بدتمیز دیکھنے میں نہیں آیا۔

آزاد : جناب خواجہ صاحب نے جو باتیں دیکھیں ہیں وہ اوروں کو کہاں نصیب ہوئی۔
آپ جس جگہ جاتے تھے وہاں کی ساری عورتیں آپ کا دم بھرنے لگتی تھیں۔ سب سے پہلے بڑا
زعفران عاشق ہوئیں۔

خوجی : تو پھر آپ کو برا کیوں لگتا ہے؟ آپ کیوں جلتے ہیں؟
نواب : بھی آزاد، یہ قصہ ضرور بیان کرو۔ اگر آپ نے اسے چھپا رکھا تو واللہ، مجھے بڑا
رنج ہوگا، اب فرمائیے، آپ کو میرا زیادہ خیال ہے یا اس گیدی کا؟
خوجی : حضور، مجھ سے سینے۔ جس روز آزاد پاشا اور ہم پلونا کے لیے قلعے میں تھے،
اس روز کی کارروائی دیکھنے کے لائق تھی۔ قلعہ پانچوں طرف سے گھرا ہوا تھا۔
مصاحب : یہ پانچوں کون طرف ہے صاحب؟ یہ نئی طرف کہاں سے لائے؟ جو بات
کہو گے وہی انوکھی۔

خوجی : تم ہو گدھے، کسی نے بات کی اور تم نے کاٹ دی، یوں نہیں وہ، وہ نہیں یوں۔
ایک طرف دریا تھا اور خشکی بھی تھی۔ اب ہوئیں پانچ طرفیں یا نہیں، مگر تم ایسے گوکھوں کا حال
کیا معلوم۔ کبھی لڑائی پر گئے ہو؟ کبھی توپ کی صورت دیکھی ہے؟ کبھی دھواں تک تو دیکھا نہ
ہوگا اور چلے ہیں وہاں سے بڑے سپاہی بن کر! تو بس جناب، اب کریں تو کیا کریں۔ ہاتھ
پاؤں پھولے ہوئے کہ اب جائیں تو کدھر جائیں اور بھاگیں تو کدھر بھاگیں۔
نواب : سچ سچ وقت بڑا نازک تھا۔

خوجی : اور روسیوں کی یہ کیفیت کہ گولے برسا رہے تھے۔ بس آزاد پاشا نے مجھ سے
کہا کہ بھائی جان، اب کیا سوچتے ہو، مردے یا نکل جاؤ گے! میرے بدن میں آگ لگ گئی۔
بولا، نکلنا کسے کہتے ہیں جی! اتنے میں قلعے کی دیواریں چلتی ہو گئیں۔ اب میں نے دیکھا کہ
اب فوج کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی، تو تلوار ہاتھ میں لی اور اپنے عربی گھوڑے پر بیٹھ کر
نکل پڑا اور اسی وقت دو لاکھ روسیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔

مصاحب : اس جھوٹ پر خدا کی مار۔

خوجی : اچھا، آزاد سے پوچھیے، بیٹھے تو ہیں سامنے۔

نواب : حضرت، سچ سچ کہیے گا۔ بس فقط اتنا بتا دیجیے، یہ بات کہاں تک سچ ہے؟
آزاد : جناب، پلونا کا جو کچھ حال بیان کیا وہ تو سب ٹھیک ہے، مگر دو لاکھ آدمیوں کا

سرکٹ لینا محض گپ ہے۔ لطف یہ ہے کہ پلونا کی تو انھوں نے صورت بھی نہ دیکھی۔ ان دنوں تو یہ خاص قسطیہ میں تھے۔

اس پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ بیگم صاحب نے قہقہے کی آواز سنی تو مہری سے کہا۔ جا دیکھ، یہ کیسی ہنسی ہو رہی ہے۔
مہری: حضور، وہ آئے ہیں میاں آزاد، وہ گورے گورے سے آدمی، بس وہی ہنسی ہو رہی ہے۔

بیگم: اخواہ، آزاد آگئے، جا کے خیر و عافیت تو پوچھ! ہماری طرف سے نہ پوچھنا! وہاں کہیں ایسی بات نہ کرنا۔
مہری: واہ حضور، کوئی دیوانی ہوں کیا؟ سستی ہوں، اس ملک میں بڑا نام کیا۔ تم نے کبھی توپ دیکھی ہے غفورن۔

غفورن: اے خدا نہ کرے حضور!
مہری: ہم نے تو توپ دیکھی ہے، بلکہ روز ہی دیکھتی ہوں۔
بیگم: توپ دیکھی ہے! تمہارے میاں سواروں کے سانس ہوں گے۔ توپ نہیں وہ دیکھی ہے۔

مہری: حضور، یہ سامنے توپ ہی لگی ہے یا کچھ اور؟
محل میں رحیم نام کی ایک مہری اور سبھوں سے موٹی تازی تھی۔ مہری نے جو اس کی طرف اشارہ کیا تو بیگم صاحب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔
رحیم: کیا پڑا پایا ہے بہن غفورن؟

غفورن: آج ایک نئی بات دیکھنے میں آئی ہے بہن۔
رحیم: ہم کو بھی دیکھاؤ۔ دیکھیں کوئی بیٹھائی ہے یا کھلونا؟
غفورن: توپ کی توپ اور عورت کی عورت۔
رحیم: (بات سمجھ کر) تمہیں لوگوں نے تول کر ہمیں نظر لگا دی۔

بیگم: اے آگ لگے، اب اور کیا موٹی ہوتی، پھول کے پتا تو ہو گئی ہے!
ادھر خوبی نے دیکھا کہ یار لوگ رنگ نہیں بنے دیتے تو موقع پا کر آزاد کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور کہا۔ بھائی آزاد، برسوں تمہارا ساتھ دیا ہے، تمہارے لیے جان تک دینے کو

تیار رہا ہوں۔ میری دو باتیں سن لو۔

آزاد: میں آپ کا مطلب سمجھ گیا، مگر کہاں تک ضبط کروں؟

خوجی: اس دربار میں ذلیل کرنے سے اگر آپ کو کچھ ملے تو آپ کو اختیار ہے۔

آزاد: جناب، آپ میرے بزرگ ہیں، بھلا میں آپ کو ذلیل کروں گا؟

خوجی: ہائے افسوس، تمہارے لیے جان لڑا دی اور اب اس دربار میں، جہاں روٹیوں کا

سہارا ہے، آپ ہم کو آلو بناتے ہیں، جس میں روٹیوں سے بھی جائیں۔

آزاد: بھائی معاف کرنا، اب تمہاری ہی سی کہیں گے۔

خوجی: مجھے رنگ تو باندھنے دو ذرا۔

آزاد: آپ رنگ جمائیں، میں آپ کی تائید کروں گا۔

خوجہ صاحب کا چہرہ کھل گیا کہ اب گپ کی پل باندھ دوں گا اور جب آزاد میرا کلمہ

پڑھنے لگیں گے تو پھر کیا پوچھنا۔

نواب: خوجہ صاحب یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں ہم سے چھپ چھپا کر؟

خوجی: خداوند، ایک معاملے پر بحث ہو رہی تھی۔

نواب: کیسی بحث، کس معاملے پر؟

خوجی: حضور، میری رائے ہے کہ اس ملک میں بھی نہریں جاری ہونی چاہیے اور آزاد

پاشا کی رائے ہے کہ نہروں سے آب پاشی تو ہوگی، مگر ملک کی آب و ہوا خراب ہو جائے گی۔

مستیابیک: اخوا، تو یہ کہیے کہ آپ شہر کے اندیشے میں دہلے ہیں۔

خوجی: تم گوکھے ہو، یہ باتیں کیا جانو۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ ایک باڑی میں کتنی توپیں

ہوتی ہیں؟ چلے وہاں سے بقراط کی دم بن کے۔

نواب: خوجی ہے تو بڑی میٹری، مگر باتیں کبھی کبھی ٹھکانے کی کرتا ہے۔

آزاد: ان باتوں کا انھیں اچھا تجربہ ہے۔

غفور: حضور، ان کو بڑی بڑی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

آزاد: صاحب، سفر بھی تو اتنا دور دراز کا کیا تھا! کہاں ہندوستان، کہاں روم! خیال تو

کیجیے۔

میر صاحب: کیوں خوجہ صاحب، پہاڑ تو آپ بہت دیکھے ہوں گے؟

خوبی: ایک دو نہیں، کروڑوں آسمان سے باتیں کرنے والے۔
 نواب: بھلا آسمان وہاں سے کتنی دور رہ جاتا ہے۔
 خوبی: حضور، بس ایک دن کی راہ۔ مگر زینہ کہاں؟
 نواب: اور کیوں صاحب، وہاں سے تو خوب معلوم ہوتا ہوگا کہ مینہ کس جگہ سے آتا ہے؟

خوبی: جناب، پہاڑ کی چوٹی پر میں تھا اور مینہ نیچے برس رہا تھا۔
 نواب: کیوں صاحب، یہ سچ ہے؟ عجیب بات ہے بھائی!
 آزاد: جی ہاں، یہ تو ہوتا ہی ہے، پہاڑ پر سے نیچے مینہ کا برسنا صاف دیکھائی دیتا ہے۔

مستیایک: اور جو یہ مشہور ہے کہ بادل تالابوں میں پانی پیتے ہیں؟
 خوبی: یہ تم جیسے گدھوں میں مشہور ہوگا۔
 نواب: بھئی، یہ تجربے کار لوگ ہیں، جو بیان کریں وہ سبھی ہے۔
 خوبی: حضور نے دریا دنیوب کا نام تو سنا ہوگا اتنا بڑا دریا ہے کہ اس کے آگے سمندر بھی کوئی چیز نہیں۔ اتنا بڑا دریا اور ایک رئیس کے دیوان خانے کے احاطے سے نکلا ہے۔
 میر صاحب: ایں، ہمیں تو یقین نہیں آتا۔
 خوبی: آپ لوگ کوئیں کے میڈھک ہیں۔
 نواب: مکان کے احاطے سے! جیسے ہمارے مکان کا یہ احاطے؟
 خوبی: بلکہ اس سے بھی چھوٹا۔ حضور، خدا کی خدائی ہے، اس میں بندے کو کیا دخل۔
 اور خداوند، ہم نے استنبول میں ایک عجائب خانہ دیکھا۔
 میر صاحب: تم کو تو کسی نے دھوکے میں بند نہیں کر دیا۔
 خوبی: بس، ان جنگلوں کو اور کچھ نہیں آتا۔

نواب: اچی، تم اپنا مطلب کہو، اس عجائب خانے میں کوئی نئی بات تھی؟
 خوبی: حضور، ایک تو ہم نے ہمیں سنا دیکھا۔ ہمیں سنا کیا، ہاتھی کا پاٹھا تھا اور ناک کے اوپر ایک سینگ۔ اتفاق سے جس مکان میں وہ بند تھا اس کی تین چھریں ٹوٹ گئیں تھیں۔ اسے راستہ ملا تو سمٹ سمٹ کر نکلا۔ بس جناب، کچھ نہ پوچھیے، دو ہزار آدمی گڑ بڑ ایک کے اوپر ایک

اس طرح گرے کہ بے ہوش۔ کوئی چار پانچ سو آدمی زخمی ہوئے۔ میں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا، اگر تم بھی بھاگتے ہو تو ہنسی ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ فوج میں کیا کرتے تھے۔ ذرا سے بھینسے کو دیکھ کر ڈر گئے۔ بس ایک بار جھپٹ کے جو جاتا ہوں تو گردن ہاتھ آئی، بس بائیں ہاتھ سے گردن دبائی اور دبوچ کے بیٹھ گیا، پھر لاکھ لاکھ زور اس نے مارے، مگر میں نے ہنسنے نہ دیا۔ ذرا گردن ہلائی اور میں نے دبوچا۔ جتنے آدمی کھڑے تھے سب دنگ ہو گئے کہ واہ رے پہلوان! آخر جب میں نے دیکھا کہ اس کا دم ٹوٹ گیا تو گردن چھوڑ دی۔ پھر اس نے بہت چاہا کہ اٹھے، مگر ہنس نہ سکا۔ مجھ سے لوگ خنثی کرنے لگے کہ اسے کھٹکھرے میں میں ڈال دو، ایسا نہ ہو کہ پھرے تو ستم ہی کر ڈالے۔ اس پر میں نے اسے ایک تھپڑ جو لگایا تو چوندا ہوا کرتے سے گرا۔

مستیایک: اس کے کیا مطلب۔ آپ کے خوف کے مارے لوٹا تھا ہی، پھر لیٹے لیٹے کیوں گر پڑا۔

خوجی: واہی ہو۔ بس حضور، میں نے کان پلڑا تو اس طرح ساتھ ہو لیا جیسے بکری۔ اسی کھٹکھرے میں پھر بند کر دیا۔

نواب: کیوں صاحب، یہ قصہ سچ ہے؟

آزاد: میں اس وقت موجود نہ تھا، شاید سچ ہو۔

میر صاحب: بس بس، قلعی کھل گئی، غضب خدا کا، جھوٹ بھی تو کتنا۔ اس وقت جی چاہتا ہے، اٹھ کے ایسا کڑا دوں کہ دس گز زمین میں دھنس جائے۔

خوجی: قسم ہے خدا کی، جو اب کی کوئی بات منہ سے نکالی تو اتنی کرولیا بھوکوں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔ تو اپنے دل میں سمجھتا کیا ہے! یہ سوکھی ہڈیاں لوہے کی ہیں۔

نواب: اتنے بڑے جانور سے انسان کیا مقابلہ کر سکتا ہے؟

آزاد: حضور، بات یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ ادھر جانور کو دیکھا، ادھر اس کی گردن پکڑی۔ خواجہ صاحب کو یہ بھی ترکیب معلوم ہے۔

نواب: بس، ہم کو یقین آ گیا۔

مستیایک: ہاں خداوند، شاید ایسا ہی ہو۔

مصاب: جب حضور کی سمجھ میں ایک بات آگئی تو آپ کس کھیت کے مولیٰ ہیں۔

میر صاحب : اور جب ایک کی لم بھی دریافت ہوگئی تو پھر اس میں انکار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

نواب : کیوں صاحب، لڑائی میں تو آپ نے خوب نام پیدا کیا ہے، بتائیے کہ آپ کے ہاتھ سے کتنے آدمیوں کا خون ہوا ہوگا؟

خوبی : غلام سے پوچھیے، انھوں نے کل ملا کر دو کروڑ آدمیوں کو مارا ہوگا۔
نواب : دو کروڑ۔

خوبی : جیسی تو روم اور شام، توران اور ملتان، آسٹریا اور انگلستان، جرمنی اور فرانس میں ان کا نام ہوا ہے۔

نواب : افوہ، خوبی کو اتنے ملکوں کے نام یاد ہیں!

آزاد : حضور، اب انھیں وہ خوبی نہ سمجھیے۔

خوبی : خداوند، میں نے ایک دریا پر اکیلے ایک ہزار آدمیوں کا مقابلہ کیا۔

نواب : بھائی، مجھے تو یقین نہیں آتا۔

مستی بیگ : حضور، تین حصے جھوٹ اور ایک حصہ سچ۔

میر صاحب : ہم تو کہتے ہیں، سب ڈینگ ہے۔

آزاد : نواب صاحب، اس بات کی تو ہم بھی گواہی دیتے ہیں۔ اس لڑائی میں میں

شریک نہ تھا، مگر میں نے اخباروں میں ان کی تعریف دیکھی تھی اور وہ اخبار میرے پاس موجود ہے۔

نواب : تو اب ہم کو یقین آ گیا، جب جنرل آزاد پاشا نے گواہی دی تو پھر سہی ہے۔

خوبی : وہ موقع ہی ایسا تھا۔

آزاد : نہیں نہیں بھائی، تم نے وہ کام کیا کہ بڑے بڑے جنرلوں نے دانتوں انگلی

دبائی۔ وہیں تو صف شکن بھی تمہیں نظر آئے تھے؟

خوبی : حضور، یہ کہنا تو میں بھول ہی گیا۔ جس وقت میں دشمنوں کو ستھراؤ کر رہا تھا، اسی

وقت صف شکن کو ایک درخت پر بیٹھے دیکھا۔

نواب : لو صاحبوں، سنو، میرے صف شکن روم کی فوج میں بھی جا پہنچے۔

مصاحب : سبحان اللہ، واہ رے صف شکن، بہادر ہو تو ایسا ہو۔

خوجی: خداوند، اس ڈانٹ ڈپٹ کا بیڑ بھی کم دیکھا ہوگا۔
نواب: دیکھا ہی نہیں، کم کیسا؟ ارے میاں غفور، ذرا گھر میں اطلاع کرو کہ صف شکن
خیریت سے ہیں۔

غفور ڈیوڑھی پر آیا۔ وہاں خدمت گار دربان، چہرہ اسی سب نواب کی سادگی پر کھلکھلا کر
ہنس رہے تھے۔

خدمت گار: ایسا آلو کا پنہا بھی کہیں نہ دیکھا ہوگا۔

غفور: زرا پاگل ہے، واللہ، زرا پاگل۔

چہرہ اسی: ابھی دیکھیے تو کیا کیا قصے گڑھے جاتے ہیں۔

مہری نے یہ خبر بیگم صاحب کو دی تو انھوں نے قبچہ لگایا اور کہا۔ ان پاجیوں نے نواب
کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا۔ جا کے کہہ دو کہ ذری کھڑے کھڑے بلاتی ہیں۔

نواب صاحب اٹھے، مگر اٹھتے ہی پھر بیٹھ گئے اور کہا۔ بھائی، جانے کو تو میں جاتا ہوں،
مگر کہیں انھوں نے مسلسل حال پوچھا تو؟

آزاد: خواجہ صاحب سے ان کا حال پوچھیے، انھیں خوب معلوم ہے۔

خوجی: ساتھ تو سچ پوچھیے تو میرا ہی ان کا بہت رہا۔ ان کے انگریزی لباس سے
چکراتے تھے۔

نواب: بھلا کسی مورچہ پر گئے تھے یا نہیں، یا دور ہی سے دعا دیا کیے؟

خوجی: خداوند، غلام جو عرض کرے گا، کسی کو یقین نہ آئے گا، اس پر میں جھلاؤں گا اور
مفت کی ٹھائیں ٹھائے ہوگی۔

نواب: کیا مجال، خدا کی قسم، اب تم میرے خاص مصاحب ہو، تم نے جو تجربہ حاصل
کیا ہے وہ اوروں کو کہاں نصیب۔ تمہارا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟

خوجی: یہ حضور کے اقبال کا اثر ہے، ورنہ میں تو کسی شمار میں نہ تھا۔ بات یہ ہوئی کہ
غلام ایک ندی کے کنارے انیم گھول رہا تھا کہ جس درخت کی طرف نظر ڈالتا ہوں، روشنی
چھائی ہوئی ہے۔ گھبرایا کہ یا خدا، یہ کیا ماجرا ہے، اسی فکر میں پڑا تھا کہ حضور صف شکن نہ
جانے کدھر سے آکر میرے ہاتھ پر بیٹھ گئے۔

نواب: خدا کا شکر ہے، تم تو بڑے خوش ہوئے ہو گے؟

خوبی: حضور، جیسے کر دوڑوں روپے مل گئے۔ پہلے حضور کا حال بیان کیا۔ پھر شہر کا ذکر کرنے لگے۔ دنیا کی سبھی باتیں ان پر روشن تھیں۔ بس حضور، پھر تو یہ کیفیت ہوئی کہ دشمن کسی لڑائی میں جم ہی نہ سکے۔ ادھر روسیوں نے توپوں پر جتنی لگائی، ادھر میرے شیر نے کیل ٹھونک دی۔

نواب: واہ واہ، سبحان اللہ، کچھ سنتے ہو یا رو؟

مستیابیک: خداوند، جانور کیا، جادو ہے!

خوبی: بھلا ان کو کوئی بیڑے کہہ سکتا ہے۔ اور جانور تو آپ خود ہیں۔ آپ ان کی شان میں اتنا سخت اور بے ہودہ لفظ منہ سے نکالتے ہیں۔

نواب: مستیابیک، اگر تم کو رہتا ہے تو اچھی طرح رہو، ورنہ اپنے گھر کا راستہ لو۔ آج تو صف شکن کو جانور بنایا، کل کو مجھے جانور بناؤ گے۔

مصاحب: خداوند، یہ نرے پھو ہڑ ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔

غفور: اچھا تو اب خاموش ہی رہیے صاحب، قصور ہوا۔

خوبی: نہیں، سارا حال تو سن چکے، مگر تب بھی اپنی ہی سی کہے جائیں گے، دوسرا اگر اس وقت جانور کہتا تو گھمبھڑے چہرے پر دھڑکتا، نہ ہوئی کرولی!

نواب: جانے بھی دو، بے شعور ہے۔

خوبی: خداوند، خشکی میں تو سبھی لڑ سکتے ہیں، مگر تری میں لڑنا مشکل ہے۔ سو حضور، تری کی لڑائی میں صف شکن سب سے بڑھ کر رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک چھوٹا سا دریا تھا۔ اس طرف ہم، اس طرف دشمن۔ مورچہ بندی ہو گئی، گولیاں چلنے لگیں، بس کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن نے ایک کنکری لی اور اس پر کچھ پڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ کے ہزار ٹکڑے ہو گئے۔

نواب: کیا پوچھنا ہے، ایک ذرا سی کنکری کی یہ کرامات!

خوبی: اب سنیے کہ دوسری کنکری کو پڑھ کر پھینکی تو ایک اور توپ پھٹی اور بہتر ٹکڑے ہو گئے۔ کوئی تین چار ہزار آدمی کام آئے۔

نواب: اس کنکری کو دیکھیے گا۔ اللہ اللہ! ایک ہزار ٹکڑے توپ کے اور تین تین ہزار آدمی غائب۔ واہ رے میرے صف شکن۔

خوبی : اس طرح کوئی چودہ توپیں اڑا دیں اور جتنے آدمی تھے سب بھن گئے۔ کچھ نہ پوچھیے حضور، آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ اگر ایک گولا بھی پڑا ہوتا تو لوگ سمجھتے، اس میں کوئی ایسا مسالہ رہا ہوگا، مگر کنکری تو کسی کو معلوم بھی نہیں ہوئی۔

نواب : بلا کی کنکرتھی کہ توپ کے ہزاروں ٹکڑے کر ڈالے اور ہزاروں آدمیوں کی جان لی۔ بھی، ذرا کوئی جا کر صف شکن کی کاپک تو لاؤ۔

اتنے میں مہری نے پھر آکر کہا۔ حضور، بڑا ضروری کام ہے، ذرا چل کر سن لیں۔ نواب صاحب خوبی کو لے کر زنان خانے میں چلے۔ خوبی کی آنکھوں میں دہری پٹی باندھی گئی اور وہ ڈیوڑھی میں کھڑے کیے گئے۔

بیگم : کیا صف شکن کا کوئی ذکر تھا، کہاں ہے آج کل؟

نواب : یہ کچھ نہ پوچھو، روم جا بیٹھے۔ وہاں کئی لڑائیوں میں شریک ہوئے اور دشمنوں کا قافیہ تنگ کر دیا۔ خدا جانے، یہ سب کس سے باتیں سیکھا ہے؟

بیگم : خدا کی دین ہے سمجھنے سے بھی کہیں ایسی باتیں آتی ہیں۔

نواب : واللہ، سچ کہتی ہو بیگم صاحب! اس وقت تم سے جی خوش ہو گیا۔ کہاں توپ، کہاں صف شکن، ذرا خیال تو کرو۔

بیگم : اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو صف شکن کو ہزار پردوں میں چھپا کر رکھتی۔ ہاں، خوب یاد آیا، وہ تو ابھی جیتے جاگتے ہیں اور تم نے ان کی قبر بنوا دی۔

نواب : واللہ، خوب یاد دلایا۔ سبحان اللہ!

بیگم : یہ تو کونسا ہوا کسی بے چارے کو۔

نواب : اگر کہیں یہاں آجائیں، اور پڑھے لکھے تو ہیں ہی۔ کہیں قبر پر نظر پڑ گئی، اس وقت یہی کہیں گے کہ یہ لوگ میری موت منا رہے ہیں، کیا جھپا کے سے قبر بنوا دی۔ اس سے

بہتر یہی ہے کہ کھدوا ڈالوں۔

بیگم : جہنم میں جائے۔ اس اچھی کو گھر کے اندر لانے کیا ضرورت تھی۔

نواب : اجی، یہ وہی ہیں جن کو ہم لوگ خوبی خوبی کہتے تھے۔ لڑائی کے میدان میں صف شکن انھیں سے ملے تھے۔ اگر کہو تو یہاں بلا لوں۔

بیگم : اے جہنم میں جائے مواء اور سنو، اس اچھی کو گھر کے اندر لائیں گے۔

نواب : سن تو لو۔ پہلے تو بوڑھا، پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت، دوسرے ماتور، تیسرے دہری پٹی بندھی ہے۔

بیگم : ہاں، اس کا مضائقہ نہیں، مگر میں ان موعے لنگڑوں کے نام سے جلتی ہوں، انہیں کی صحبت میں تمہارا یہ حال ہوا۔

نواب : ایں، کیا خوب!

خوجی : خداوند، غلام حاضر ہے۔

مہری : میں تو سمجھی کہ کنویں میں سے کوئی بولا۔

بیگم : کیا یہ ہر دم چنک میں رہتا ہے؟

نواب : خواجہ صاحب، کیا سو گئے؟

دربان : خواجہ صاحب، دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں؟

خوجی : کیا حکم ہے خدوند!

بیگم : دیکھو، خدا جانتا ہے، اونگہ رہا تھا۔ میں تو کہتی ہی تھی۔

نواب : بھائی، ذرا صف شکن کا حال تو کہہ چلو؟

خوجی : خداوند، تو اب آنکھیں تو کھلوا دیجیے۔

بیگم : کیا کتیا کے پلے کی آنکھ ہے جو اب بھی نہیں کھلتیں۔

نواب : پہلے حال تو بیان کرو۔ ذرا توپ والا ذکر پھر کرنا، وہاں کسی کو یقین ہی نہیں

آتا۔

خوجی : حضور، کیونکر یقین آئے، جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں گے، کبھی نہ مانیں

گے۔

نواب : تو بھائی، ہم نے کیونکر مان لیا، اتنا تو سوچو۔

خوجی : خدا نے سرکار کو دیکھنے والی آنکھیں دی ہیں۔ آپ نہ سمجھیں تو کون سمجھے۔ حضور،

یہ کیفیت ہوئی کہ دریا کے دونوں طرف آنے سے سانسے تو ہیں چڑھیں ہوئی تھیں۔ بس صف شکن

نے ایک کنکری اٹھا کر، خدا جانے کیا جادو پھونک دیا کہ ادھر کنکری چھینکی اور ادھر توپ کے دو

سوکڑے اور ہر گڑے نے سو سو روپیوں کی جان لی۔

بیگم : اس جھوٹ کو آگ لگے۔ الیم پی پی کے گھوڑوں کو کیا کیا سمجھتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے

ایک نکمری سے توپ کے سوکڑے ہو گئے۔ خدا کا ڈر ہی نہیں۔

نواب: قصص یقین ہی نہ آئے تو کیا کرے۔

بیگم: چلو، بس خاموش رہو۔ ذرا سائو بیئر اور نکمری سے اس نے توپ کے دو سو ککڑے کر ڈالے۔ خدا جانتا ہے، تم اپنی فسد کھلواد۔

نواب: اب خدا جانے، ہمیں جنون ہے یا قصص۔

خوجی: خداوند، بحث سے کیا فائدہ! عورتوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ سکتیں۔

بیگم: مہری، ذرا دربان سے کہہ، اس ککڑے انچی کو جوتے مار کر نکال دے۔ خرد دار جو اس کو کبھی ڈیوڑھی میں آنے دیا۔

خوجی: سرکار تو ناحق خفا ہوتی ہیں۔

بیگم: معلوم ہوتا ہے، آج میرے ہاتھوں تم پٹو گے، ارے مہری، کھڑی سنتی کیا ہے، جا کے دربان کو بلا لا۔

حسینی دربان نے آکر خوجی کے کان پکڑے اور چپتیا ہوا لے چلا۔

خوجی: بس بس، دیکھو، کان دان کی دل لگی اچھی نہیں۔

محبوبن: اب چلا ہے یا مچلتا ہے؟

خوجی: (ٹوپی زمین سے اٹھا کر) اچھا، اگر آج جیسے بیچ جاؤ تو کہنا۔ ابھی ایک تھیر دوں تو دم نکل جائے۔

اتنا کہنا تھا کہ دوسری مہری آ پہنچی اور کان پکڑ کر چپتیا نے لگی۔ خوجی بہت بکڑے، مگر سوچے کہ اگر سب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مہریوں کی جوتیاں کھائیں تو بے ذہب ہوگی۔ جھاڑ پونچھ کر باہر آئے اور ایک پلنگ پر لیٹ رہے۔

خوجی کے جانے کے بعد بیگم نے نواب کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ ذرا سوچو تو کہ قصص ہو کیا گیا ہے۔ کہاں بیئر اور کہاں توپ، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بلو کھا گئی ہو۔ یا انھیں معاصیوں میں سے کسی نے نکال کر بیچ لیا ہوگا اور قصص اپنی پڑھا دی کہ وہ صف شکن تھے۔ آخر تم کسی اپنے دوست سے پوچھو، دیکھو، اور لوگوں کی کیا رائے ہے؟

نواب: خدا کے لیے میرے معاصیوں کو نہ کسو، چاہے مجھے برا بھلا کہہ لو۔

بیگم: ان مفت خوروں سے خدا سمجھے۔

نواب : ذرا آہستہ آہستہ بولو، کہیں وہ سب سن لیں، تو سب کے سب چلتے ہوں اور میں اکیلا کھیاں مارا کروں۔

بیگم : اے ہے، ایسے بڑے کھرے ہیں! تم جوتیاں مار کر نکالو تو بھی یہ چوں نہ کریں۔ جو سب نکل جائیں تو ہوگا کیا؟ وہ کل جاتے ہوں تو آج ہی جائیں۔
مہری : حضور تو چوک گئیں، ذری اس مٹے خوجی کی کہانی تو سنی ہوئیں۔ ہنستے ہنستے لوٹ جاتیں۔

بیگم : سچ، اچھا تو اس کو بلاؤ ذری، مگر کہہ دینا کہ جھوٹ بولا اور میں نے خبر لی۔
نواب : یا خدا، یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ جھوٹ ہی بولے گا۔ اتنے دنوں سے دربار میں رہتا ہے، کبھی جھوٹ نہیں بولا تو اب کیوں جھوٹ بولنے لگا؟ اور آخر اتنا تو سمجھو کہ جھوٹ بولنے سے اس کو مل کیا جائے گا؟

بیگم : اچھا، بلاؤ۔ میں بھی ذرا صف شکن کا حال سنوں۔
مہری نے جا کر خوجی کو بلایا۔ خواجہ صاحب جھلائے ہوئے پلنگ پر پڑے تھے۔ بولے۔ جا کر کہہ دو۔ اب ہم وہ خوجی نہیں ہیں جو پہلے تھے، آنے والے اور جانے والے، بلانے والے اور بلوانے والے، سب کو کچھ کہتا ہوں۔

آخر لوگوں نے سمجھایا تو خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں آئے اور بولے۔ آداب عرض کرتا ہوں سرکار، اب کیا پھر کچھ مہربانی کی نظر غریب کے حال پر ہوگی؟ ابھی کچھ انعام باقی ہو تو اب مل جائے۔

بیگم : صف شکن کا کچھ حال معلوم ہو تو ٹھیک ٹھیک کہہ دو۔ اگر جھوٹ بولے تو تم جانو گے۔

خوجی : واہ ری قسمت، ہندستان سے بھیجی گئے، وہاں سب کے سب 'حضور، حضور' کرتے تھے۔ ترکی اور روس میں کوہ قاف کی پریاں ہاتھ باندھے حاضر رہتی تھیں۔ مس روز ایک ایک بات پر جان دیتی تھی، اب بھی اس کی یاد آجاتی ہے تو رات بھر اچھے اچھے خواب دیکھا کرتا ہوں۔

خواب میں ایک نور آتا ہے نظر
یاد میں تیری جو سو جاتے ہیں ہم

بیگم: اب بتاؤ، ہے چکا اچھی یا نہیں، مطلب کی بات ایک نہ کہی۔ واپس جا ہی کہنے لگا۔
خوجی: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پہاڑ کے اوپر تو روی اور نیچے ہماری فوج۔

ہم کو معلوم نہیں کہ روسی موجود ہیں۔ وہیں پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ فوج تو کھانے پینے کا انتظام کرنے لگی اور میں انیم مھولنے لگا کہ یکا یک پہاڑ پر سے تالیوں کی آواز آئی۔ میں پیالی ہونٹوں تک لے گیا تھا کہ اوپر سے روسیوں نے بازہ ماری۔ ہمارے سینکڑوں آدمی گھائل ہو گئے۔ مگر واہ رے میں، خدا گواہ ہے، پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ یکا یک دیکھتا ہوں کہ صف شکن اڑے چلے جاتے ہیں، آتے ہی میرے ہاتھ پیر بیٹھ کر چونچ انیم سے ترکی، اور اس کے دو قطرے پہاڑ پر گرا دیے۔ بس دھماکے کی آواز ہوئی اور پہاڑ پھٹ گیا۔ روس کی ساری فوج اس میں سا گئی۔ مگر ہماری طرف کا ایک آدمی بھی نہ مرا۔ میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا۔

بیگم: بھلا صف شکن باتیں کس زبان میں کرتے ہیں؟
خوجی: حضور، ایک زبان ہو تو کہوں۔ اردو، فارسی، ترکی، انگریزی۔
بیگم: کیا اور زبانوں کے نام نہیں یاد ہیں؟
خوجی: اب حضور سے کون کہے۔

نواب: اب یقین آیا کہ اب بھی نہیں؟ اور کچھ پوچھنا ہو، پوچھ لو۔
بیگم: چلو، بس چپکے بیٹھو رہو۔ مجھے رنج ہوتا ہے کہ ان حرام خوروں کے پاس بیٹھے بیٹھے تم کہیں کے نہ رہے۔

نواب: ہائے افسوس، تمہیں یقین ہی نہیں آتا، بھلا سوچو تو، یہ سب کے سب مجھ سے جھوٹ بولیں گے۔ خوجی کو میں کچھ انعام دیتا ہوں یا کوئی جاگیر لکھ دی ہے اس کے نام؟
خوجی: خداوند، اگر اس میں ذرا بھی شک ہو تو آسمان پھٹ پڑے۔ جھوٹ بات تو زبان سے نکلے گی ہی نہیں، چاہے کوئی مار ڈالے
بیگم: اچھا، ایمان سے کہنا کہ کبھی مورچہ پر بھی گئے یا جھوٹ موٹھ کے فخرے لپی بنوایا کرتے ہو؟

خوجی: حضور، مالک ہیں، جو چاہیں، کہہ دیں، مگر غلام نے جو بات اپنی آنکھوں دیکھی، وہ بیان کی۔ اگر فرق ہو تو پھانسی کا حکم دے دیجیے۔

ایک بوڑھی مہری نے خوجی کی باتیں سننے کے بعد بیگم سے کہا۔ حضور، اس میں تعجب کی کون بات ہے، ہمارے محلے میں ایک بڑا کالا کتا رہا کرتا تھا۔ محلے کے لڑکے اسے مارتے، کان پکڑ کر کھینچتے، مگر وہ چوں بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن محلے کے چوکیدار نے اس پر ایک ڈھیلا پھینکا۔ ڈھیلا اس کے کان میں لگا اور کان سے خون بہنے لگا۔ چوکیدار دوسرا ڈھیلا مارنا ہی چاہتا تھا کہ ایک جوگی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، کیوں جان کا دشمن ہوا ہے بابا۔ یہ کتا نہیں ہے۔ اسی رات کو چوکیدار نے خواب دیکھا کہ کتا اس کے پاس آیا! اور اپنا گھاؤ دکھا کر کہا۔ یا تو ہی نہیں، یا تمھی نہیں۔ سویرے چوکیدار اٹھا تو اس نے پاس پڑوس والوں سے خواب کا ذکر کیا۔ مگر اب دیکھتے ہیں کہ کتے کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ دوپہر کو چوکیدار کنوئیں پر پانی بھرنے گیا تو پانی دیکھتے ہی بھوکنے لگا۔

بیگم: سچ؟

مہری: حضور، ولہد بچائے اس بلا سے، کتے کے بھیس میں کیا جانے کون تھا۔
 نواب: اب اس کو کیا کہو گی بھائی، اب بھی صف شکن کے کمال کو نہ مانو گی؟
 بیگم: ہاں، ایسی باتیں تو ہم نے بھی سنی ہیں، مگر...
 خوجی: اگر مگر کی گنجائش نہیں، غلام آنکھوں دیکھی کہتا ہے۔ ایک قصہ اور سنئے، آپ کو شاید اس کا بھی یقین نہ آئے۔ صف شکن میرے سر پر آکر بیٹھ گئے اور کہا، روسیوں کی فوج میں دھنس پڑو۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ بولا، صاحب آپ ہیں کہاں؟ میری جان جائے گی، آپ کے نزدیک دل لگی ہے، مگر وہ سنتے کس کی ہیں۔ کہا، چلو تو تم! آدھی رات تھی، گھٹا چھائی ہوئی تھی، مگر مجبوراً جانا پڑا۔ بس، روسی فوج میں جا پہنچا۔ دیکھو، کوئی گاتا ہے، کوئی سوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں، مگر ہمیں کوئی نہیں دیکھتا۔ صف شکن اصطبل کی طرف چلے اور پھدک کے ایک گھوڑے کی گردن پر جا بیٹھے۔ گھوڑا دم سے جاگرا، اب جس گھوڑے کی گردن پر بیٹھے ہیں، زمین پر لیٹنے لگتا ہے۔ اس طرح کوئی سات ہزار گھوڑے اسی دم دم دم کر کے لوٹ گئے۔ فوج سے نکلے تو آپ نے پوچھا، کہو، آج کی دل لگی دیکھی، کتنے سوار بیکار ہوئے۔

میں۔ حضور، پورے سات ہزار!
 صف شکن: آج اتنا ہی بہت ہے، کل پھر دیکھی جائے گی، چلو، اپنے پڑاؤ پر چلیں۔
 چلتے چلتے جب تھک جاؤ تو ہم سے کہہ دو۔

میں : کیوں، آپ سے کہہ دوں؟

صف شکن : اس لیے کہ ہم اتر جائیں۔

میں : واہ، مٹھی بھر کے آپ، بھلا آپ کے بیٹھنے سے کیا میں تھک جاؤں گا؟ آپ کیا

اور آپ کا بوجھ کیا؟

اتنا سنا تھا کہ خدا جانے ایسا کون سا جادو کر دیا کہ میرا قدم اٹھانا محال ہو گیا۔ معلوم

ہوتا تھا، سر پر پہاڑ کا بوجھ لدا چوا ہے۔ بولا، حضور، اب تو بہت ہی تھک گیا، چیر ہی نہیں

اٹھتے۔ بس، فر سے اڑ گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سر سے دس میں کروڑ من بوجھ اتر گیا۔

نواب : یہ تو بھائی، نئی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔ واہ رے صف شکن!

خوجی : حضور، خدا جانے، کس اولیا نے یہ مجھیں بدلا ہے۔

بیگم صاحب نے اس وقت تو کچھ نہ کہا، مگر شان لی کہ آج رات کو نواب صاحب

کو خوب آڑے ہاتھ لوں گی۔ نواب صاحب نے سمجھا کہ بیگم صاحب کو صف شکن کے کمال

کا یقین آ گیا۔ باہر آکر بولے۔ واللہ، تم نے ایسا ساں باندھ دیا کہ اب بیگم صاحب کو عمر بھر

ٹھک نہ ہوگا۔

خوجی : حضور، سب آنکھوں دیکھی بات بیان کی ہے۔

نواب : یہی تو مشکل ہے کہ وہ سچی باتوں کو بھی بناوٹ سمجھتی ہیں۔

خوجی : سمجھ میں نہیں آتا، مجھ سے کیوں اتنی ناراض ہیں۔

نواب : ناراض نہیں ہیں جی، مطلب یہ کہ اب اس بات کو سوا پڑھے لکھے آدمی کے اور

کون سمجھ سکتا ہے اور بھی، میں سوچتا ہوں کہ آخر کوئی جھوٹ کیوں بولے گا۔ جھوٹ بولنے

میں کسی کو فائدہ کیا ہے۔

خوجی : اے سبحان اللہ، کیا بات حضور نے پیدا کی ہے! سچ کچ کوئی جھوٹ کیوں بولنے

لگا۔ ایک تو جھوٹا کہلائے، دوسرے بے آبرو ہو۔

نواب : بھائی، ہم انسان کو خوب پہچانتے ہیں۔ آدمی کا پہچانا کوئی ہم سے کیسے۔ مگر دو

کو ہم نے بھی نہیں پہچانا۔ ایک تم کو، دوسرے صف شکن کو۔

خوجی : خداوند، میں یہ نہ بانوں گا، حضور کی نظر بڑی باریک ہے۔

نواب صاحب خوجی کی باتوں سے اتنے خوش ہوئے کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے

باہر آئے۔ مصاحبوں نے جو اتنی بے تعلقی دیکھی تو جل مرے، آپس میں اشارے ہونے لگے۔

مستیابیک: ایس، میاں خوبی نے تو جادو کر دیا یارو۔

غفور: ضرور کسی ملک میں جادو سیکھ آئے ہیں۔

مستیابیک: تجربہ کار ہو گیا نا، اب اس کا رنگ جم گیا۔

غفور: کیسا کچھ، اب تو سولہوں آنے کے مالک ہیں۔

مرزا: ارے میاں، دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر نکلے، واہ ری قسمت! مگر یہ خوش کس

بات پر ہوئے؟

غفور: ان کو ابھی تک یہی نہیں معلوم، بتائیے صاحب!

مستیابیک: میاں، عجب کوڑھ مغز ہو، کہنے لگے، خوش کس بات پر ہوئے۔ صف شکن

کی تعریفوں کے ہلے باندھ دیے۔ سوچ ہی تو ہے، اب لاکھ چاہیں کہ اس کا رنگ پھیکا کر دیں، ممکن نہیں۔

مرزا: اس وقت تو خوبی کا دماغ چوتھے آسمان پر ہوگا۔

مستیابیک: اجی، بلکہ اور اس کے بھی پار، ساتویں آسمان پر۔

غفور: میں باغ میں گیا تھا، دیکھا، نواب صاحب موڑھے پر بیٹھے ہیں اور خوبی تپائی پر

بیٹھا ہوا، خاص سرکار کی گڑگڑی پی رہا ہے۔

مرزا: سچ، تھیں خدا کی قسم!

غفور: چل کر دیکھ لیجیے نا، بس جادو کر دیا۔ یہ وہی خوبی ہیں جو چلمیں بھرا کرتے تھے،

مگر جادو کا زور، اب دوست بنے ہوئے ہیں۔

مرزا: خوبی کو سب کے سب ملا کر مبارک باد دو اور ان سے بڑھیا دعوت لو۔ اب اس

سے بڑھ کر کون درجہ ہے؟

اتنے میں نواب صاحب خوبی کو لیے ہوئے دربار میں آئے، مصاحب اٹھ کھڑے

ہوئے۔ خواجہ صاحب کو سرکار نے اپنے قریب بٹھایا اور آزاد سے بولے۔ حضرت، آپ کی

محبت میں تو خواجہ صاحب پارس ہو گئے۔

آزاد: جناب، یہ سب آپ کی خدمت کا اثر ہے۔ میری محبت میں تو تھوڑے ہی دنوں

سے ہیں، آپ کی شاگردی کرتے برسوں گزر گئے۔

نواب : واہ، اب تو خواجہ صاحب میرے استاد ہیں جناب!

مستیابیک : خداوند، یہ کیا فرماتے ہیں۔ حضور کے سامنے خوبی کی کیا ہستی ہے؟

نواب : کیا کہتا ہے؟ خوبی کی تعریف سے تم سب کیوں جل جاتے ہو؟

مرزا : خداوند، یہ مستیابیک دوسروں کو دیکھ کر ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔

غفور : یہ پرلے سرے کے گستاخ ہیں، بات تو سمجھ نہیں، جو کچھ منہ میں آیا، بک

دیے۔ آخر خواجہ صاحب بے چارے نے ان کا کیا بگاڑا!

نواب : مجھ سے سنو، دل میں پرانی کدورت ہے۔

مصاحب : سبحان اللہ! حضور، بس یہی بات ہے۔

خوبی : حضور اس کا خیال نہ کریں۔ یہ لوگ جو چاہیں، کہیں۔ بھائی غفور، ذرا سا پانی

پئیں گے۔

نواب : ٹھنڈا پانی لاؤ خواجہ صاحب کے واسطے۔

خدمت گار صراحی کا محلہ ٹھنڈا پانی لایا۔ چاندی کے کٹورے میں پانی دیا۔ جب خواجہ

صاحب پی چکے تو نواب صاحب نے پاندان سے دو گھوڑیاں نکال کر خاص اپنے ہاتھ سے ان

کو دیں۔

مرزا : میں نے مستیابیک سے ہزار بار کہا کہ بھائی، تم کسی کو دیکھ کے جلتے کیوں مرتے

ہو، کوئی تمہارا حصہ نہیں چھین لے جاتا، پھر خواہ مخواہ کے لیے اپنے کو کیوں ہلکان کرتے ہو۔

نواب : مجھے اس وقت اس کی باتیں بہت ناگوار معلوم ہوئیں۔

مصاحب : جانتے ہیں کہ اس دربان میں خوشامدیوں کی دال نہیں کھتی، پھر بھی اپنی

حرکت سے باز نہیں آتے۔

مصاحب لوگ تو باہر بیٹھے صلاحیں کر رہے تھے، ادھر دربان میں نواب صاحب، آزاد

اور خوبی میں یولپ کے رئیسوں کا ذکر ہونے لگا۔ آزاد نے یورپ کے رئیسوں کی خوب

تعریف کی۔

نواب : کیوں صاحب، ہم لوگ بھی ان رئیسوں کی طرح کر سکتے ہیں؟

آزاد : بے شک، اگر انہیں کی راہ پر چلیے۔ آپ کی صحبت میں چندو باز، مدیکے، چرے

اس کثرت سے ہیں کہ شاید ہی کوئی ان سے خالی ہو۔ یورپ کے رئیسوں کے یہاں ایسے آدمی پھٹنے بھی نہ پائیں۔

نواب: کہیے تو خواجہ صاحب کے سوا اور سب کو نکال دوں۔

خوجی: نکالے چاہے رہے دیجیے، مگر اتنا حکم ضرور دے دیجیے کہ آپ کے سامنے دربان میں نہ کوئی چنڈو کی چھینٹے اڑائے، نہ مد کے دم لگائے اور نہ انیم گولے۔

آزاد: دوسری بات یہ ہے کہ یہ خوشامدی لوگ آپ کی جموٹی تعریفیں کر کر کے خوش کرتے ہیں۔ ان کو تھڑک دیجیے اور ان کی خوشامد پر خوش نہ ہو جیے۔

نواب: آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ واللہ، آپ کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ یہ سب بھڑے دے دے کر مجھے بلٹائے دیتے ہیں۔

آزاد: آپ کو خدا نے اتنی دولت دی ہے، یہ اس واسطے نہیں کہ آپ خوشامدیوں پر لٹائیں۔ اس کو اس طرح کام میں لائیں کہ ساری دنیا میں نہیں تو ہندستان بھر میں آپ کا نام ہو جائے۔ خیرات خانہ قائم کیجیے، ہسپتال بنوائیے، عالموں کی قدر کیجیے۔ میں نے آپ کے دربار میں کسی عالم فاضل کو نہیں دیکھا۔

نواب: بس، آج ہی سے انہیں نکال باہر کرتا ہوں۔

آزاد: اپنی عادتیں بھی بدل ڈالیے، آپ دن کو گیار بجے سو کر اٹھتے اور ہاتھ منہ دھو کر چنڈو کے چھینٹے اڑاتے ہیں۔ اس کے بعد ان فقرے بازوں سے چہل ہوتی ہے۔ صبح کا کھانا آپ کو تین بجے نصیب ہوتا ہے۔ آپ بھر آرام کرتے ہیں تو شام سے پہلے نہیں اٹھتے۔ پھر وہی چنڈ اور مدک کا بازار گرم ہوتا ہے۔ کوئی دو بجے رات کو آپ کھانا کھاتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ دنیا میں آپ کون سا کام کرتے ہیں۔

نواب: ان بد معاشوں نے مجھے تباہ کر دیا۔

آزاد: سویرے اٹھیے، ہوا کھانے جائیے۔ اخبار پڑھیے، بھلے آدمیوں کی صحبت میں بیٹھیے، اچھی اچھی کتابیں پڑھیے، ضروری کاغذوں کو گنجیے، پھر دیکھیے کہ آپ کی زندگی کتنی سدھر جاتی ہے۔

نواب: خدا کی قسم، آج سے ایسا ہی کروں گا، ایک ایک حرف کی تعمیل نہ ہو تو سمجھ لیجیے گا بڑا جموٹا آدمی ہے۔

خوبی: حضور، مجھے تو برسوں اس دربار میں ہو گئے، جب سرکار نے کوئی بات ٹھان لی تو پھر چاہے زمین اور آسمان ایک طرف ہو جائے، آپ اس کے خلاف کبھی نہ کہیں گے۔ برسوں سے یہی دیکھتا آتا ہوں۔

آزاد: ایک اشتہار دے دیجیے کہ لوگ اچھی اچھی کتابیں لکھیں، انھیں انعام دیا جائے گا۔ پھر دیکھیے، آپ کا کیا نام ہوتا ہے!

نواب: مجھے کسی بات میں عذر نہیں ہے۔

ادھر مصاحبوں میں اور ہی بات ہو رہی تھیں۔

مستیابیک: واللہ، آج تو اپنا خون پی کر رہ گیا یارو!

مرزا: دیکھتے ہو، کس طرح جھڑک دیا؟

مستیابیک: جھڑک کیا دیا، بس کچھ نہ پوچھو، میں جان بوجھ کر چپ ہو رہا، نہیں بے

ڈھب ہو جاتی۔ کسی نے اپنی عزت نہیں بچتی ہے۔ اور اب آپس میں صلاحیں ہو رہی ہیں۔

خوبی نے سب کو بلایا۔

مستیابیک: کوئی لاکھ کہے، ہم نہ مانیں گے، یہ سب جادو کا کھیل ہے۔

غفور: میاں اس میں کیا شک ہے، یہ جادو نہیں تو ہے کیا؟

مرزا: اجی، آلو کا گوشت نواب صاحب کو نہ کھلا دیا ہو، تو ناک کنوا ڈالوں ان سب

لوگوں نے مل کر آلو کا گوشت کھلوا دیا ہے جی تو آلو مین گئے، اب ان سے کہے کون؟

مستیابیک: کہہ کے بہت خوش ہوئے کہ اب کسی دوسرے کو ہمت ہوگی۔

غفور: اب تو کچھ دن خوبی کی خوشامد کرنی پڑے گی۔

مستیابیک: ہماری جوتی اس پاجی کی خوشامد کرتی ہے۔

مرزا: پھر نکالے جاؤ گے، یہاں رہنا ہے تو خوبی کو باپ بناؤ۔ دریا میں رہنا اور مگر سے

بیر؟

مستیابیک: دو چار دن رہ کے یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھتے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو

ہمارا استعفیٰ ہے، ایسی نوکری سے باز آئے۔ برابر والوں کی خوشامد ہم سے نہ ہو سکے گی۔

میر صاحب: برابر والے کون؟ تمہارے برابر والے ہوں گے۔ ہم تو خوبی کو ذلیل

سمجھتے ہیں۔

غفور : ارے صاحب، اب تو یہ سب کے افسر ہیں اور ہم تو انہیں گڑ گڑی پلا چکے۔
آپ لوگ انہیں مانیں یا نہ مانیں، ہمارے تو مالک ہیں۔

مرزا : سو برس بعد گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ بھائی جان، کسی کو اس کا گمان بھی تھا کہ خوبی کو سرکار اس تپاک سے اپنے پاس بیٹھائیں گے، مگر اب آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔
نواب صاحب باہر آئے تو اس ڈھنگ سے کہ ان کے ہاتھ میں سے ایک چھوٹی سی گڑ گڑی اور خواجہ صاحب پی رہے ہیں۔ مصاحبوں کے رہے سبے ہوش بھی اڑ گئے۔ انوہ، سرکار کے ہاتھ میں گڑ گڑی اور یہ نکرچا، رئیس بنا ہوا دم لگا رہا ہے۔ نواب صاحب مند پر بیٹھے تو خوبی کو بھی اپنے برابر بیٹھایا۔ مصاحب ستائے میں آ گئے۔ کوئی چوں تک نہیں کرتا، سب کی نگاہ خوبی پر ہے۔ بارے میر صاحب نے ہمت کر کے بات چیت شروع کی۔

میر صاحب : خداوند، آج کتنی بہار کا دن ہے، چمن سے کیسی بھینی بھینی خوشبو آرہی

ہے۔

نواب : ہاں، آج کا دن اسی لائق ہے کہ کوئی علمی بحث ہو۔

میر صاحب : خداوند، آج کا دن تو گانا سننے کے لیے بہت اچھا ہے۔

نواب : نہیں، کوئی علمی بحث ہونی چاہیے۔ خواجہ صاحب، آپ کوئی بحث شروع کیجیے۔

ستیایک : (دل میں) ان کے باپ نے بھی کبھی علمی بحث کی تھی؟

مرزا : حضور، خواجہ صاحب کی لیاقت میں شک ہے، مگر...

نواب : اگر مگر کے کیا معنی؟ خواجہ صاحب کے عالم ہونے میں آپ لوگوں کو کچھ شک

ہے؟

مرزا : کس علم کی بحث کیجیے گا خواجہ صاحب؟ علم کا نام تو معلوم ہو۔

خوبی : ہم علم زالوجی میں بحث کرتے ہیں، بتلایے، اس علم کا کیا مطلب ہے۔

مرزا : کس علم کا نام لیا آپ نے، زالوجی! یہ زالوجی کیا بلا ہے؟

نواب : جب آپ کو اس علم کا نام تک نہیں معلوم تو بحث کیا خاک کیجیے گا۔ کیوں خواجہ

صاحب، سنا ہے کہ دریا میں جہازوں کے ڈبو دینے کے اوزار بھی انگریزوں نے نکالے ہیں۔

یہ تو خدائی کرنے لگے۔

خوبی : اس اوزار کا نام تار پیڑو ہے۔ دو جہاز ہمارے سامنے ڈبو دیے گئے۔ پانی کے

اندر ہی اندر تار پیڈ چھوڑا جاتا ہے، بس جیسے ہی جہاز کے نیچے پہنچا ویسے ہی پھٹا۔ پھر تو جناب، جہاز کے کروڑوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

مستیابیک: اور کیوں صاحب، یہ بم کا گولا کتنی دور دور کا توڑ کرتا ہے؟
خوجی: بم کے گولے کئی قسم کے ہوتے ہیں، آپ کس قسم کا حال دریافت کرتے ہیں؟
مستیابیک: اجی، یہی بم کے گولے۔

خوجی: آپ تو یہی یہی کرتے ہیں، اس کا نام تو بتلائیے؟
نواب: کیوں جناب، لڑائی کے وقت آدمی کے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہوگی؟

مرزا: میں عرض کروں حضور لڑائی کے میدان میں آکر ذرا ...
نواب: چپ رہو صاحب، تم سے کون پوچھتا ہے، کبھی بندوق کی صورت بھی دیکھی ہے یا لڑائی کا حال ہی بیان کرنے چلے!

خوجی: جناب، لڑائی کے میدان میں جان کا ذرا بھی خوف نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کو یقین نہ آئے گا، مگر میں صحیح کہتا ہوں کہ ادھر فوجی باجا بجا اور ادھر دلوں میں جوش امڑنے لگا۔ کیسا ہی بزدل ہو، ممکن نہیں کہ تلوار کھینچ کر فوج کے بیچ میں دھنسنے جائے۔ ننگی تلوار ہاتھ میں لی اور دل بڑھا۔ پھر اگر دو کروڑ گولے بھی سر پر آئے تو کیا مجال کہ آدمی ہٹ جائے۔

خوجی یہی باتیں کر رہے تھے کہ خدمت گار نے آکر کہا۔ حضور، باہر ایک صاحب آئے ہیں، اور کہتے ہیں، نواب صاحب کو ہمارا سلام دو، ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے۔ نواب صاحب نے کہا۔ خواجہ صاحب، آپ ذرا جا کر دریافت کیجیے کہ کون صاحب ہیں۔ خوجی بڑے غرور کے ساتھ اٹھے اور باہر جا کر صاحب کو سلام کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ پولس کا افسر ہے، ضلع کے حاکم نے اسے آزاد کا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

خوجی: آپ صاحب سے جا کر کہہ دیجیے، آزاد پاشا نواب صاحب کے مہمان ہیں اور ان کے ساتھ خواجہ صاحب بھی ہیں۔

افسر: تو صاحب اس سے ملنے والا ہے۔ اگر آج اس کو فرست ہو تو اچھا، نہیں تو جب اس کا جی چاہے۔

خوجی: میں ان سے پوچھ کر آپ کو لکھ بھیجوں گا۔

انکسٹر صاحب چلے گئے تو مستیا بیک نے کہا۔ کیوں صاحب، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے آزاد پاشا سے اسی وقت کیوں نہ پوچھ لیا۔ ایک مہدے دار کو دق کرنے سے کیا فائدہ؟ خوبی نے تیوریاں بدل کر کہا۔ تم سے ہزار بار منع کیا کہ اس بارے میں نہ بولا کرو، مگر تم سنتے ہی نہیں۔ تم تو ہو عقل کے دشمن، ہم چاہتے ہیں کہ آزاد پاشا جب کسی حاکم سے ملیں تو برابر کی ملاقات ہو۔ اس وقت یہ وردی نہیں پہنے ہیں۔ کل جب یہ فوجی وردی پہن کر اور تمھے لا کر حاکم ضلع سے ملیں گے تو وہ کھڑا ہو کر تعظیم کرے گا۔

نواب: اب سمجھو یا اب بھی گدھے ہی بنے ہو؟ خواجہ صاحب کو تولنے چلے ہیں! واللہ، خواجہ صاحب، آپ نے خوب سوچی۔ اگر اس وقت کہہ دیجئے کہ آزاد وہ کیا بیٹھے ہیں تو کتنی کرکری ہوتی۔

اتنے میں کمانے کا وقت آ پہنچا۔ کمانا چنا گیا، سب لوگ کمانے بیٹھے، اس وقت خوبی نے ایک قصہ چھیڑ دیا۔ حضور، ایک بار جب انگریزوں کی ڈچ لوگوں سے منہ بھیڑ ہوئی تو انگریزی افسر نے کہا، اگر کوئی آدمی دوسری طرف کے جہازوں کو لے آئے تو ہماری فتح ہو سکتی ہے، نہیں تو ہمارا بیڑا تباہ ہو جائے گا۔ اتنا سنتے ہی بارہ ملاح پانی میں کود پڑے۔ ان کے ساتھ پندرہ سال کا ایک لڑکا بھی پانی میں کودا۔

نواب: سمندر میں، اُفوا!

خوبی: خداوند، ان سے بڑھ کر دلیر اور کون ہو سکتا ہے؟ بس افسر نے ملاحوں سے کہا، اس لڑکے کو روک لو۔ لڑکے نے کہا، واہ، میرے ملک پر اگر میری جان قربان ہو جائے تو کیا مضائقہ؟ یہ کہہ کر وہ لڑکا تیرتا ہوا نکل گیا۔

نواب: خواجہ صاحب، کوئی ایسی فکر کیجیے کہ ہماری آپ کی دوستی ہمیشہ اسی طرح قائم

رہے۔

خوبی: بھائی سنو، ہمیں خوشامد کرنی منظور نہیں، اگر صاحب سلامت رکھنا ہے تو رکھیے، ورنہ آپ اپنے گھر خوش اور میں اپنے گھر خوش۔

نواب: یار، تم تو بے وجہ بگڑ کھڑے ہوتے ہو۔

خوبی: صاف تو یہ ہے کہ جو تجربہ ہم کو حاصل ہوا ہے اس پر ہم جتنا غرور کریں، بجا

ہے۔

نواب: اس میں کیا شک ہے جناب۔

خوجی: آپ خوب جانتے ہیں کہ عالم لوگ کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ مجھے دنیا میں کسی سے دب کے چلنا ناگوار ہے، اور ہم کیوں کسی سے دہیں؟ لالچ ہمیں چھو نہیں گیا، ہمارے نزدیک بادشاہ اور فقیر دونوں برابر۔ جوں کہیں گیا، لوگوں نے سرا اور آنکھوں پر بیٹھایا۔ روم مصر، دوس دغیرہ ملکوں میں میری جو قدر ہوئی وہ سارا زمانہ جانتا ہے۔ آپ کے دربار میں مالوں کی قدر نہیں۔ وہ دیکھیے، تالائق مستیابیک آپ کے سامنے چنڈو کا دم لگا رہا ہے۔ ایسے بد معاشوں سے مجھے نفرت ہے۔

نواب: کوئی ہے، اس تالائق کو نکال دو یہاں سے۔

مصاحب: حضور تو آج ناحق خفا ہوتے ہیں، اس دربار میں تو روز ہی چنڈو کے دم لگا کرتے ہیں۔ اس نے کیا تو گناہ کیا؟

نواب: کیا کہتے ہو، ہمارے یہاں چنڈو کا دم کوئی نہیں لگاتا۔

خوجی: ہمیں یہاں آتے اتنے دن ہوئے، ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ چنڈو پینا شریفوں کا کام ہی نہیں۔

مرزا: تم تو غضب کرتے ہو خوجی، زمانہ بھر کے چنڈو باز، اچھی، اب آئے ہو وہاں سے بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے۔ ذرا سرکار نے منہ لگایا تو زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتے۔

نواب: غفور، ان سب بد معاشوں کو نکال باہر کرو۔ خبردار جو آج سے کوئی یہاں آنے

پایا۔

میر صاحب: خداوند! بس، اب کچھ نہ کہیے، ہم لوگوں نے اپنی عزت نہیں ہتھی ہے۔

نواب: نکالو ان سیوں کو، ابھی ابھی نکال دو۔

خواجہ صاحب شہ پاکر اٹھے اور ایک کنارے کر مستیابیک پر بجایا۔ وہ تو جھلایا تھا ہی، خوجی کو ایک چائنا دیا، تو گر پڑے، اتنے میں کئی سپاہی آگئے، انھوں نے مستیابیک کو پکڑ لیا اور باقی سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ خوجی جہاز پونچھ کر اٹھے اور اٹھتے ہی حکم دیا کہ مستیابیک کو ایک درخت میں باندھ کر دو سو کوڑے لگائے جائیں، نیک حرام اپنے مالک کے دوستوں سے لڑتا ہے۔ بدن میں کیڑے نہ پڑیں تو سبھی۔

ادھر مہاں آزاد صاحب سے مل کر لوٹے تو دیکھا کہ دربار میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔

نواب صاحب انہیں دیکھتے ہی بولے حضرت آج سے ہم نے آپ کی صلاحوں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔

آزاد: دربار کے لوگو کہاں غائب ہو گئے؟

خوجی: سب کے سب نکال دیے گئے، اب کوئی یہاں پہنچنے بھی نہ پائے گا۔

نواب: اب ہم حکام سے ملا کریں گے اور کوشش کریں کہ ہر ایک قسم کی کمیٹی میں شریک ہوں۔ وہی جاہی آدمیوں کی صحبت میں آپ دیکھیں تو میرے کان پکڑے گا۔

آزاد: اب آپ ہر قسم کی کتابیں پڑھا کیجیے۔

نواب: آپ جو کچھ فرماتے ہیں، بجا ہے، میرا بچپن داں سال ہے، ابھی مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت موقع ہے، اور مجھے کرنا ہی کیا ہے۔

آزاد: خدا آپ کی نیت میں برکت دے۔

خوجی: بس، آج سے آپ کو عالموں کی صحبت رکھنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو، اس وقت تو سب کچھ تکرار کر لیجیے اور کل سے پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔

نواب: خدا نے چاہا تو یہ سب باتیں اب نام کو بھی نہ دیکھیے گا۔

دوسرے دن آزاد سیر کرنے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جگہ کئی آدمی ایک چھت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آزاد کو دیکھتے ہی ایک آدمی نے آکر ان سے کہا۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو، تو ذرا میرے ساتھ آئیے۔ آزاد اس کے ساتھ چھت پر پہنچے تو ان آدمیوں میں سے ایک کی صورت اپنی صورت سے ملتی جلتی پائی۔ اس نے آزاد کی تعظیم کی اور کہا۔ آئیے، آپ سے کچھ باتیں کروں۔ آپ نے اپنی صورت تو آئینے میں دیکھی ہوگی۔

آزاد: ہاں، اور اس وقت تو بغیر آئینہ کے دیکھ رہا ہوں۔ آپ کا نام؟

آدمی: مجھے آزاد مرزا کہتے ہیں۔

آزاد: جب تو آپ میرے ہم نام بھی ہیں۔ آپ نے مجھے کیوں پہچانا؟

مرزا: میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہیں اور اخباروں میں آپ کا حال پڑھتا رہا ہوں۔

آزاد: اس وقت آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

مرزا: اور ابھی اور بھی خوشی ہوگی۔ رٹیا بیگم کو تو آپ جانتے ہیں؟

آزاد: ہاں ہاں، آپ کو ان کا کچھ حال معلوم ہے؟
 مرزا: جی ہاں، آپ کے دھوکے میں میں ان کے یہاں پہنچا تھا، اور اب تو وہ بیگم
 ہیں۔ ایک نواب صاحب کے ساتھ ان کا نکاح ہو گیا۔
 آزاد: کیا اب دور سے بھی ملاقات نہ ہوگی؟
 مرزا: ہرگز نہیں۔
 آزاد: بے اختیار جی چاہتا ہے کہ مل کر باتیں کروں۔
 مرزا: کوشش کیجیے، شاید ملاقات ہو جائے، مگر امید نہیں۔

(106)

آزاد رتیا بیگم کی تلاش میں لکھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک باغ میں کچھ لوگ ایک رئیس
 کی صحبت میں بیٹھے گئیں اڑا رہے ہیں۔ آزاد نے سمجھا، شاید ان لوگوں سے رتیا بیگم کے نواب
 صاحب کا کچھ پتہ چلے۔ آہستہ آہستہ ان کے قریب گئے۔ آزاد کو دیکھتے ہی وہ رئیس چونک کر
 کھڑا ہو گیا اور ان کی طرف دیکھ کر بولا۔ واللہ، آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ شکر ہے کہ گھر
 بیٹھے مراد پوری ہوئی۔ فرمائیے، آپ کی کیا خدمت کروں؟

مصاحب: حضور، جنڈل صاحب کو کوئی ایسی چیز پلائیے کہ روح تک تازہ ہو جائے۔
 خاں صاحب: مجھے پار سال سبل والیو کا مرض ہو گیا تھا۔ دو مہینے ڈاکٹر کا علاج ہوا۔
 خاک فائدہ نہ ہوا۔ بیس دن تک حکیم صاحب نے نسخے پلائے، مرض اور بھی بڑھ گیا۔ پڑوس
 میں ایک بید راج رہتے ہیں، انھوں نے کہا، میں دو دن میں اچھا کر دوں گا۔ دس دن تک ان
 کا علاج رہا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک دوست نے کہا، بھائی، تم سب کی دوا چھوڑ دو، جو
 ہم کہیں وہ کرو۔ بس حضور، دو بار براٹھی پلائی۔ دو چھٹناک شام کو، دو چھٹناک صبح کو، اس کا
 یہ اثر ہوا کہ چوتھے دن میں بالکل چنگا ہو گیا۔

رئیس: براٹھی کے بڑے بڑے فائدے لکھے ہیں۔
 دیوان: سرکار، پیشاب کے مرض میں تو براٹھی اکسیر ہے۔ جتنی دیتے جائیے اتنی ہی
 فائدہ کرتی ہے۔

خاں صاحب: حضور، آنکھوں دیکھی کہتا ہوں۔ ایک سوار کو مرگی آتی تھی، سینکڑوں علاج

کیے، کچھ اثر نہ ہوا، آخر ایک آدمی نے کہا، حضور حکم دیں تو ایک دوا بتاؤں۔ دھوئی کر کے کہتا ہوں کہ کل ہی مرگئی نہ رہے۔ خداوند، دو چھٹا تک شراب لیجیے اور اس میں اس دوا پانی ملائیے، اگر ایک دن میں فائدہ نہ ہو تو جو چہرہ کی سزا دہ میری سزا۔

نواب: یہ صفت ہے اس میں!

مصاحب: حضور، گنواروں نے اسے جھوٹ موٹ بدنام کر دیا ہے۔ کیوں جھڑیل صاحب، آپ کو کبھی اتفاق ہوا ہے؟

آزاد: واہ، کیا میں مسلمان نہیں ہوں۔

نواب: کیا خوب جواب دیا ہے، سبحان اللہ!

اتنے میں ایک مصاحب جن کو اوروں نے سکھا پڑا کر بیٹھا تھا، چوگا پہنے اور لگام باندھے آہونچے۔ لوگوں نے بڑے تپاک سے ان کی تعظیم کی اور بلا کر بیٹھایا۔

نواب: کیسے مزاج ہے مولانا صاحب؟

مولانا: خدا کا شکر ہے۔

مصاحب: کیوں مولانا صاحب، آپ کے خیال میں شراب حلال ہے یا حرام؟

مولانا: اگر تمہارا دل صاف نہیں تو ہزار بار حج کرو، کوئی فائدہ نہیں۔ ہر ایک چیز نیت

کے لحاظ سے حلال یا حرام ہوتی ہے۔

آزاد: جناب، ہم نے ہر قسم کے آدمی دیکھے۔ کسی صحبت سے پرہیز نہیں کیا، آپ لوگ

شوق سے پیئیں، میرا کچھ خیال نہ کریں۔

نواب: نیت کی صفائی اسی کو کہتے ہیں۔ حضرت آزاد، آپ کی جتنی تعریف سنی تھی، اس

سے کہیں بڑھ کر پایا۔

ایک صاحب نیچے سے شراب، سوڈا کا بوتلیں اور برف لائے اور دور چلنے لگے۔ جب

سرور جاتا تو گھٹیں اڑنے لگیں۔

خاں صاحب، خداوند، ایک بار نیپال کی ترائی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ چودہ آدمی

ساتھ تھے، وہاں جنگل میں شہد بکثرت سے ہے اور شہد کی مکھوں کی عجیب خاصیت ہے کہ بدن

پر جہاں کہیں بیٹھتی ہیں، درد ہونے لگتا ہے۔ میں نے وہاں کے باشندوں سے پوچھا، کیوں

بھائی، اس کی کچھ دوا بھی ہے؟ کہا، اس کی دوا شراب ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں کئی براہمن

بھی تھے۔ وہ شراب کو چھو نہ سکتے تھے۔ ہم نے دوا کے طور پر پی، ہمارا درد تو جاتا رہا اور وہ سب ابھی تک جبینک رہے ہیں۔

نواب: واللہ، اس کے فائدے بڑے بڑے ہیں، مگر حرام ہے، اگر حلال ہوتی تو کیا کہنا تھا۔

مصاحب: خداوند، اب تو سب حلال ہے۔

خاں صاحب: خداوند، پیسنے کی دوا، جینکیش کی دوا، بوا سیر کی دوا، دسے کی دوا، یہاں تک کہ موت کی بھی دوا۔

دیوان: او ہو ہو، موت کی دوا!

نواب: خبردار، سب کے سب خاموش، بس کہہ دیا۔

دیوان: خاموش! خاموش!

خاں صاحب: تپ کی دوا، سردرد کی دوا، بڑھاپے کی دوا۔

نواب: یہ تم لوگ بھکتے کیوں ہو؟ ہم نے بھی تو پی ہے۔ حضرت، مجھے ایک عورت نے نصیحت کی تھی۔ تب سے کیا مجال کہ میری زبان سے ایک بے ہودہ بات بھی نکلے۔ (چراہی کو بلا کر) رمضان، تم خاں صاحب اور دیوان جی کو یہاں سے لے جاؤ۔

دیوان: علم کی قسم، اگر اتنی گستاخی ہماری شان میں کر دے تو ہم سے جوتی پیزار ہو جائے گی۔

نواب: کوئی ہے؟ جو لوگ بہک رہے ہوں انہیں دربار سے نکال دو اور پھر بھول کے بھی نہ آنے دینا۔

لالہ: ابھی نکال دو سب کو!

یہ کہہ کر لالہ صاحب نے رمضان خاں پر ٹیپ بھائی۔ وہ پٹھان آدمی، ٹیپ پڑتے ہی آگ ہو گیا۔ لالہ صاحب کے پٹے پکڑ کر دو چار دھکیں زور زور سے لگا بیٹھا۔ اس پر دو چار آدمی اور ادھر ادھر سے اٹھے۔ لپا لگی ہونے لگی۔ آزاد نے نواب صاحب سے کہا۔ میں تو رخصت ہوتا ہوں۔ نواب صاحب نے کہا۔ آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور باغ میں لا کر بولے۔ حضرت، میں بہت شرمندہ ہوں کہ ان پاجیوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔ کیا کہیں، اس عورت نے ہمیں وہ نصیحت کی تھی کہ اگر ہم آدمی ہوتے تو ساری عمر آرام کے ساتھ بسر

کرتے۔ مگر ان مصاحبوں نے خدا سمجھے، ہمیں پھر گھر گھر کے پسندے میں پھنسا لیا۔

نواب: بھائی، صاحب، یہی باتیں اس عورت نے بھی سمجھائی تھیں۔

آزاد: آخر وہ عورت کون تھی اور آپ سے اس سے کیا تعلق تھا؟

نواب: حضرت، عرض کیا تا کہ ایک دن دوستوں کے ساتھ ایک باغ میں بیٹھا تھا کہ ایک عورت سفید دولائی اوڑھے نکلی۔ دو چار بگڑے دلوں نے اسے چکھا دے کر بلایا۔ وہ تکلفی کے ساتھ آکر بیٹھی تو مجھ سے بات چیت ہونے لگی۔ اس کا نام اللہ رکھی تھا۔

اللہ رکھی کا نام سنتے ہی آزاد نے ایسا منہ بنا لیا گویا کچھ جانتے ہی نہیں، مگر دل میں سوچے کہ واہ ری اللہ رکھی، جہاں جاؤ، اس کے جاننے والے نکل ہی آتے ہیں۔ کچھ دیر بعد نواب صاحب نشے میں چور ہی ہو گئے اور آزاد باہر نکلے تو ایک پرانے جان پہچان کے آدمی سے ملاقات ہو گئی۔ آزاد نے پوچھا کہیے حضرت، آج کل آپ کہاں ہیں؟

آدمی: آج کل تو نواب واجد حسین کی خدمت میں ہوں۔ حضور تو خیریت سے رہے؟ حضور کا نام تو ساری دنیا میں روشن ہو گیا۔

آزاد: بھائی، جب جانیں کہ ایک بار ثریا بیگم سے دو دو باتیں کرا دو۔

آدمی: کوشش کروں گا حضور، کسی نہ کسی حیلے سے وہاں تک آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔ یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک کر کے آزاد ہوٹل میں گئے تو دیکھا کہ خوبی بڑی شان سے بیٹھے گھیس اڑا رہے ہیں اور دونوں پریاں ان کی باتیں سن سن کر کھلکھلا رہی ہیں۔

کلاریا: تم اپنی بیوی سے ملے، بڑی خوشی ہوئی ہوگی؟

خوبی: جی ہاں، محلے میں پہنچتے ہی مارے خوشی کے لوگوں نے تالیاں بجائی۔ لونڈوں نے ڈھیلے مار مار کر غل مچایا کہ آئے آئے۔ اب کوئی گلے ملتا ہے، کوئی مارے محبت کے اٹھا کے دے مارتا ہے۔ سارا محلہ کہہ رہا ہے تم نے تو روم میں وہ کام کیا کہ جھنڈے گاڑ دیے۔ گھر میں جو خبر ہوئی تو لونڈی نے آکر سلام کیا۔ حضور آئیے، بیگم صاحب بڑی دیر سے انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے کہا، کیونکر چلوں؟ جب یہ اتنے بھوت جھوڑے بھی۔ کوئی ادھر کھسٹ رہا ہے، کوئی ادھر اور وہاں جان عذاب میں ہے۔

مہیڑا: گھر کا حال بیان کرو۔ وہاں کیا باتیں ہوئیں؟

خوبی: دلان تک بیوی نکلے پاؤں اس طرح دوڑی آئی کہ ہانپ گئی۔

میڈا: ننگے پاؤں کیوں؟ کیا تم لوگوں میں جوتا نہیں پہنتے؟

خوجی: پہنتے کیوں نہیں، مگر جوتا تو ہاتھ میں تھا۔

میڈا: ہاتھ سے اور جوتے سے کیا واسطہ؟

خوجی: آپ ان باتوں کو کیا سمجھیں۔

میڈا: تو آخر کچھ کہو گے بھی؟

خوجی: اس کا مطلب یہ ہے کہ میاں اندر قدم رکھیں اور ہم کھوپڑی سہلا دیں۔

میڈا: کیا یہ بھی کوئی رسم ہے؟

خوجی: یہ سب ادائیں ہم نے سکھائی ہیں۔ ادھر ہم گھر میں تھے، ادھر بیگم صاحب نے

جو تیاں لگائیں۔ اب ہم چھپے تو کہاں چھپے، کوئی چھوٹا موٹا آدمی ہو تو ادھر ادھر چھپ رہے، ہم

یہ ڈیل ڈول لے کے کہاں جائیں؟

کلاریا: سچ تو ہے، قد کیا ہے، تازہ ہے۔

میڈا: کیا تمھاری بیوی بھی تمھاری ہی طرح اونچے قد کی ہیں؟

خوجی: جناب، مجھ سے پورے دو ہاتھ اونچی ہیں۔ آکر بولیں، اتنے دنوں کے بعد

آئے تو کیا لائے ہو؟ میں نے تمغہ دکھا دیا تو کھل گئیں۔ کہا، ہمارے پاس آج کل باٹ نہ

تھے، اب اس سے ترکاری تو لا کر دوں گی۔

میڈا: کیا پتھر کا تمغہ ہے؟ کیا خوب قدر کی ہے۔

کلاریا: اور تمھیں تمغہ کب ملا؟

خوجی: کہیں ایسا کہنا بھی نہیں۔

اتنے میں آزاد پاشا چپکے سے آگے بڑھے اور کہا۔ آداب عرض ہے۔ آج تو آپ سے

خاصے رئیس بنے ہوئے ہیں؟

خوجی: بھائی جان، وہ رنگ جمایا کہ اب خوجی ہی خوجی ہیں۔

آزاد: ابھی، اس وقت ایک بڑی فکر میں ہوں۔ اللہ رکھی کا حال تو جانتے ہی ہو۔ آج

کل وہ نواب واجد حسین کے محلے میں ہے۔ اس سے ایک بار ملنے کی دھن سوار ہے۔ بتاؤ،

کیا تدبیر کروں؟

خوجی: اجی، یہ لکھے ہم سے پوچھو۔ یہاں ساری زندگی یہی کیا کیے ہیں۔ کسی چوڑی

والی کو کچھ دے دلا کر راضی کر لو۔

آزاد کے دل میں بھی یہ بات جم گئی۔ جا کر ایک چوڑی والی کو بلا لائے۔
آزاد: کیوں بھلے مانس، تمہاری پیٹھ تو بڑے بڑے گھروں میں ہوگی۔ اب یہ بتلاؤ کہ
ہمارے بھی کام آؤ گی؟ اگر کوئی کام نکلے تو کہیں، ورنہ بیکار ہے۔
چوڑی والی: ارے، تو کچھ منہ سے کہیے بھی؟ آدمی کا کام آدمی ہی سے تو نکلتا ہے۔
آزاد: نواب واجد حسین کو جانتی ہو؟

چوڑی والی: اپنا مطلب کہیے۔
آزاد: بس انہیں کے محل میں ایک پیغام بھیجنا ہے۔
چوڑی والی: آپ کا تو وہاں گزر نہیں ہو سکتا۔ ہاں، آپ کا پیغام وہاں تک پہنچا
دوں گی۔ معاملہ جو حکم کا ہے، مگر آپ کے خاطر کر دوں گی۔
آزاد: تم ثریا بیگم سے اتنا کہہ دو کہ آزاد نے آپ کو سلام کہا ہے۔

چوڑی والی: آزاد آپ کا نام یا کسی اور کا؟
آزاد: کسی اور کا نام یا پیغام سے ہمیں کیا واسطہ۔ میری یہ تصویر لے لو، موقع ملے تو
دکھا دینا۔

چوڑی والی نے تصویر نوکرے میں رکھی اور نواب واجد حسین کے گھر چلی۔ ثریا بیگم
کوٹھے پر بیٹھی دریا کی سیر کر رہی تھیں۔ چوڑی والی نے جا کر سلام کیا۔
ثریا: کوئی اچھی چیز لائی ہو یا خالی خولی آئی ہو؟
چوڑی والی: حضور، وہ چیز لائی ہوں کہ دیکھ کر خوش ہو جائیے گا، مگر انعام بھرپور
لوں گی۔

ثریا: کیا ہے، ذرا دیکھوں تو؟
چوڑی والی نے بیگم صاحب کے ہاتھوں میں تصویر رکھ دی۔ دیکھتے ہی چونک کے
بولیں۔ سچ بتانا، کہاں پائی؟
چوڑی والی: پہلے یہ بتلاؤ کہ یہ کون صاحب ہیں اور آپ سے کبھی کی جان پہچان ہے
کہ نہیں؟

ثریا: بس یہ نہ پوچھو، یہ بتلاؤ کہ تصویر کہاں پائی؟

چوڑی والی : جن کی یہ تصویر ہے، ان کو آپ کے سامنے لاؤں تو کیا انعام پاؤں۔
 ثریا : اس بارے میں میں کوئی بات چیت کرنا نہیں چاہتی۔ اگر وہ خیریت سے لوٹ
 آئیں ہیں تو خدا انہیں خوش رکھے اور ان کے دل کی مرادیں پوری ہوں۔
 چوڑی والی : حضور، یہ تصویر انھوں نے مجھ کو دی۔ کہا، اگر موقع ہو تو ہم بھی ایک نظر
 دیکھ لیں۔

ثریا : کہہ دینا کہ آزاد، تمہارے لیے دل سے دعا نکلتی ہے، مگر پچھلی باتوں کو جانے دو،
 ہم پرانے بس میں ہیں اور ملنے میں بدنامی ہے۔ ہمارا دل کتنا ہی صاف ہو، مگر دنیا کو تو نہیں
 معلوم ہے، نواب صاحب کو معلوم ہو گیا، تو ان کا دل کتنا دکھے گا۔
 چوڑی والی : حضور، ایک دفعہ کھڑا تو دکھا دیجیے، ان آنکھوں کی قسم، بہت ترس رہے
 ہیں۔

ثریا : چاہے جو ہو، جو بات خدا کو منظور تھی، وہ ہوئی اور اسی میں اب ہماری بہتری
 ہے۔ یہ تصویر یہیں چھوڑ جاؤ، میں اسے چھپا کر رکھوں گی۔

چوڑی والی : تو حضور، کیا کہہ دوں۔ صاف لگا سا جواب؟
 ثریا : نہیں، تم سمجھا کر کہہ دینا کہ تمہارے آنے سے جتنی خوشی ہوئی، اس کا حال خدا
 ہی جانتا ہے۔ مگر اب تم یہاں نہیں آ سکتے اور نہ میں ہی کہیں جا سکتی ہوں، اور پھر اگر چوری
 چھپے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیا تو کیا فائدہ۔ پچھلی باتوں کو اب بھول جانا ہی مناسب ہے۔
 میرے دل میں تمہاری بڑی عزت ہے۔ پہلے میں تم سے غرض کی محبت کرتی تھی۔ اب تمہاری
 پاک محبت کرتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو شادی کے دن حسن آرا بیگم کے یہاں ملاقات ہوگی۔
 یہ وہی اللہ رکھی ہیں جو سرائے میں چمکتی ہوئی نکلتی تھیں۔ آج انہیں پردے اور حیا کا اتنا
 خیال ہے۔ چوڑی والی نے جا کر یہاں کی ساری داستان آزاد کو سنائی۔ آزاد بیگم کی پاکدامنی
 کی گھنٹوں تعریف کرتے رہے۔ یہ سن کر انہیں بڑی تسکین ہوئی کہ شادی کے دن وہ حسن آرا
 بیگم کے یہاں ضرور آئیں گی۔

(107)

میاں آزاد سیلانی تو تھے ہی، حسن آرا سے ملاقات کرنے کے بدلے کئی دن تک شہر میں

مڑگشت کرتے رہے، گویا حسن آرا کی یاد ہی نہیں رہی۔ ایک دن سیر کرتے کرتے وہ ایک باغ میں پہنچے اور ایک کرسی پر بیٹھے۔ یکا یک ان کے کان میں آواز آئی۔

چلے ہم اے جنوں جب فصل گل میں سیر گلشن کو
عوض پھولوں کے پتھر سے بھرا گلچیں نے دامن کو
سمجھ کر چاند ہم نے یار تیرے روئے روشن کو
کہا بالے کو ہالہ اور مہ نو تا کے گردن کو
جو وہ تلوار کھینچے تو مقابل کر دوں میں دل کو
لڑاؤں دوست سے اپنے میں اس پہلو کے دشمن کو
کروں آہیں تو منہ کو ڈھانپ کر وہ شوخ کہتا ہے
ہوا سے کچھ نہیں ہے ڈر چراغ زیر دامن کو
تواضع چاہتے ہو زاہدوں کیا بدخواروں سے
کہیں جھکتے بھی دیکھا ہے بھلا شے کی گردن کو

آزاد کے کان کھرے ہوئے کہ یہ کون گا رہا ہے۔ اتنے میں ایک کھڑکی کھلی اور ایک چاندی صورت ان کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ مگر اتفاق سے اس کی نظر ان پر نہیں پڑی۔ اس نے اپنا تلمین ہاتھ ماتھے پر رکھ کر کسی بھولی کو پکارا، تو آزاد نے یہ شیر پڑھا۔

ہاتھ رکھتا ہے وہ بت اپنی بھوؤں پر اس طرح
جیسے مہراب پر اللہ لکھا ہوتا ہے

اس نازمین نے آواز سنتے ہی ان پر نظر ڈالی اور دریچہ بند کر لیا۔ ڈوپٹے کو جو ہوانے اڑا دیا تو آدھا کھڑکی کے ادھر اور آدھا ادھر۔ اس پر اس شوخ نے جھلڑ کر کہا، یہ گھوڑا دوپٹہ بھی میرا دشمن ہوا ہے۔

آزاد: اللہ رے غضب، دوپٹے پر بھی غصہ آتا ہے۔

صنم: اخواہ، یہ تو کوئی سزی سا معلوم ہوتا ہے۔

آزاد: یا خدا، یہ آدم زاد ہیں یا کوہ قاف کی پریاں۔

صنم: تم یہاں کہاں سے بھٹک کے آ گئے؟

آزاد: بھٹکتے کوئی اور ہوں گے، ہم تو اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

صنم : منزل پر پہنچنا دل لگی نہیں ہے، ابھی دلی دور ہے۔
 آزاد : یہ کہاں کا دستور ہے کہ کوئی زمین پر ہو، کوئی آسمان پر؟ آپ سوار، میں پیدل،
 بھلا کیونکر بنے!
 صنم : اور سنو، آپ تو پیٹ سے پاؤں نکالنے لگے، اب یہاں سے پوریا بدھنا اٹھاؤ اور
 چلتا دھندھا کرو۔
 آزاد : اتنا حکم دو کہ قریب سے دو دو باتیں کر لیں۔
 صنم : وہ کام کیوں کریں جس میں فساد کا ڈر ہے؟
 سبیلی : اے بلا لو، بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ (آزاد سے) چلے آئیے صاحب، چلے
 آئیے۔

آزاد خوش خوش اٹھے اور کوٹھے پر جا پہنچے۔
 صنم : واہ بہن واہ، ایک اجنبی کو بلا لیا۔ تمہاری بھی کیا باتیں ہیں۔
 آزاد : بھئی، ہم بھی آدمی ہیں۔ آدمی کو آدمی سے اتنا بھاگنا نہیں چاہیے۔
 صنم : حضرت، آپ کے بھلے ہی کے لیے کہتی ہوں، یہ بڑے جو حکم کی جگہ ہے، ہاں،
 اگر سپاہی آدمی ہو تو تم خود تازہ لو گے۔
 آزاد نے جو یہ باتیں سنیں تو چکر میں آئے کہ ہندستان سے روس تک ہو آئے اور کسی
 نے چوں تک نہ کی، اور یہاں سے اس طرح کی دھمکی دی جاتی ہے۔ سوچے کہ اگر یہ سن کر
 یہاں سے بھاگ جاتے ہیں تو یہ دونوں دل کھول کر نہیں گی اور اگر ٹھہر جائیں تو آثار برے
 نظر آتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس نازنین سے پوچھا۔ یہ کیا بھید ہے؟
 صنم : یہ نہ پوچھو بھئی، ہمارا حال بیان کرنے کے قابل نہیں۔
 آزاد : آخر کچھ معلوم تو ہو، تمہیں کیا تکلیف ہے؟ مجھے تو کچھ دال میں کالا ضرور معلوم
 ہوتا ہے۔

صنم : جناب یہ جہنم ہے اور ہماری جیسی کتنی ہی عورتیں اس جہنم میں رہتی ہیں۔ یوں
 کہیے کہ ہمیں سے یہ جہنم آباد ہے۔ ایک کندن نامی بڑھیا برسوں سے یہی پیشہ کرتی ہے خدا
 جانے اس نے کتنے گھر تباہ کیے۔ اگر مجھ سے پوچھو کہ تیرے ماں باپ کہاں ہیں، تو میں کیا
 جواب دوں، مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ بڑھیا مجھے کسی گاؤں سے پکڑ لائی تھی۔ میرے ماں

باپ نے بہت تلاش کی، مگر اس نے مجھے گھر سے نکلنے نہ دیا۔ اس وقت میرا سن چار پانچ سال سے زیادہ نہ تھا۔

آزاد: تو کیا یہاں سب ایسے ہی جمع ہیں۔

صنم: یہ جو میری سہیلی ہیں، کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہیں۔ کندن ان کے یہاں آنے جانے لگی اور ان سبوں سے اس طری کی سانٹھ گاٹھ کی کہ عورتیں اسے بلانے لگیں۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ کندن کے یہ ہتھ کڈے ہیں۔

آزاد: بھلا کندن سے میری ملاقات ہو تو اس سے کیسی باتیں کروں؟

صنم: وہ اس کا موقع ہی نہ دے گی کہ تم کچھ کہو۔ جو کچھ کہنا ہوگا، وہ خود کہہ چلے گی۔ لیکن جو تم سے پوچھے کہ تم یہاں کیونکر آئے؟

آزاد: میں کہہ دوں گا کہ تمہارا نام سن کر آیا۔

صنم: ہاں، اس ترکیب سے بچ جاؤ گے جو ہمیں دیکھتا ہے، سمجھتا ہے کہ یہ بڑی خوش نصیب ہیں۔ پہننے کے لیے اچھے اچھے سے کپڑے، کھانے کے لیے اچھے سے اچھے کھانے، رہنے کے لیے بڑی سے بڑی حویلیاں، دل بہلاوئے کے لیے بھجولیاں، سب کچھ ہیں، مگر دل کو خوشی اور چین نہیں۔ بڑی خوش نصیب وہ عورتیں ہیں جو ایک میاں کے ساتھ تمام عمر کاٹ دیتی ہیں۔ مگر ہم بد نصیب عورتوں کے ایسے نصیب کہاں۔ اس بڑھیا کو خدا غارت کرے جس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

آزاد: مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ یہاں سب چین ہی چین ہے، مگر اب معلوم ہوا کہ معاملہ اس کا الٹا ہے۔

صنم: ہزاروں آدمیوں سے بات چیت ہوتی ہے، مگر ہمارے ساتھ شادی کرنے کو کوئی چٹاتا ہی نہیں۔ کندن سے سب ڈرتے ہیں۔ شہدے لچوں کی بات کا اعتبار کیا، دو ایک نے نکاح کا وعدہ کیا بھی تو پورا نہ کیا۔

یہ کہہ کر وہ نازنین رونے لگی۔

آزاد نے سمجھایا کہ دل کو ڈھارس دو اور یہاں سے نکلنے کی حکمت سوچو۔

صنم: خدا بڑا کارساز ہے، اس کو کام کرتے دیر نہیں لگتی، مگر اپنے گناہوں کو جب دیکھتے ہیں تو دل گواہی نہیں دیتا کہ ہمیں یہاں سے چھٹکارا ملے گا۔

آزاد: میں تو اپنی طرف سے ضرور کوشش کروں گا۔

صنم: تم مردوں کی بات کا اعتبار کرنا فضول ہے۔

آزاد: واہ! کیا پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں؟

اتنے میں ایک اور حسین آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا نام نور جان تھا۔ آزاد نے اس سے

کہا۔ تم بھی اپنی کچھ حال کہو۔ یہاں کیسے آ پہنچی؟

نور: میاں، ہمارا کیا حال پوچھتے ہو، ہمیں اپنا حال خود ہی نہیں معلوم۔ خدا جانے، ہندو

کے گھر جنم لیا یا مسلمان کے گھر پیدا ہوئی۔ اس مکان کی مالک ایک بڑھیا ہے، اس کے کاٹے

کا منتر نہیں، اس کا بھی پیشہ ہے کہ جس طرح ہو، کمسن اور خوبصورت لڑکیوں کو پھسلا کر لے

آئے۔ سارا زمانہ اس کے ہتھ کنڈوں کو جانتا ہے، مگر کسی سے آج تک بندوبست نہیں ہو سکا۔

اچھے اچھے مہاجن اور بیوپاری اس کے مکان پر ماتھا رگڑتے ہیں، بڑے بڑے شریف زادے

اس کا دم بھرتے ہیں۔ شہزادوں تک کے پاس اس کی پہنچ ہے، سنتے تھے کہ برے کام کا نتیجہ

برا ہوتا ہے، مگر خدا جانے، بڑھیا کو ان بڑے کاموں کی سزا کیوں نہیں ملتی؟ اس چڑیل نے

خوب روپے جمع کیے ہیں اور اتنا نام کمایا ہے کہ دور دور تک مشہور ہو گئی ہے۔

آزاد: تم سب کی سب مل کر بھاگ کیوں نہیں جانتی؟

صنم: بھاگ جائیں تو پھر کھائیں کیا، یہ تو سوچو۔

آزاد: اس نے اپنی مکاری سے اس قدر تم سب کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔

صنم: بے وقوف نہیں۔ بنایا ہے، یہ بات سہی ہے، کھانے بھر کا سہارا تو ہو جائے۔

آزاد: تمہاری آنکھ پر غفلت کی پٹی باندھ دی ہے۔ تم اتنا نہیں سوچتی کہ تمہارے

بدولت اس نے اتنا سارا روپیہ پیدا کیا اور تم کھانے کو محتاج رہو گی؟ جو پسند ہو اس کے ساتھ

شادی کر لو اور آرام سے زندگی بسر کرو۔

صنم: یہ سچ ہے، مگر اس کا رعب مارے ڈالتا ہے۔

آزاد: اف رے رعب، یہ بڑھیا بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

صنم: اس طرح کی میٹھی میٹھی باتیں کرے گی تم بھی اس کا کلہ پڑنے لگو گے۔

آزاد: اگر مجھے حکم دیجیے تو میں کوشش کروں۔

صنم: واہ، نیکی اور پوچھ پوچھ؟ آپ کا ہمارے اوپر بڑا احسان ہوگا۔ ہماری زندگی برباد

ہو رہی ہے۔ ہمیں ہر روز گالیاں دیتی ہے اور ہمارے ماں باپ کو کوسا کرتی ہے۔ گو انھیں آنکھوں سے نہیں دیکھا، مگر خون کا جوش کہاں جائے؟

اس فخرے سے آزاد کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں، انھوں نے ٹھان لی کہ اس بڑھیا کی ضرور سزا کرائیں گے۔

اتنے میں سنہلی نے آکر کہا۔ بڑھیا آگنی ہے، دھیرے دھیرے باتیں کرو۔ آزاد نے صنم کے کان میں کچھ کہہ دیا اور دونوں کی دونوں چلی گئیں۔

کندن: بیٹا، آج ایک اور شکار کیا، مگر ابھی بتائیں گے نہیں۔ یہ دروازے پر کون کھڑا تھا؟

صنم: کوئی بہت بڑے رئیس ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔
کندن: اچھا بیٹھو۔ آج کل بے فصل کی بارش سے بڑی تکلیف ہوتی ہے، اچھی وہ فصل کی ہر چیز وقت پر ہو، برسات ہو تو مینہ برے، سردی کے موسم میں سردی خوب ہو اور گرمی میں ٹو پلے، مگر جہاں کوئی بات بے موسم کی ہوئی اور بیماری پیدا ہو گئی۔
آزاد: جی ہاں، قاعدے کی بات ہے۔

کندن: اور بیٹا، ہزار بات کی ایک بات یہ ہے کہ آدمی برائی سے بچے۔ آدمی کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن اس کو منہ دکھانا ہے، جس نے اسے پیدا کیا۔ برا آدمی کس منہ سے منہ دکھائے گا؟

آزاد: کیا اچھی بات آپ نے کہی ہے، ہے تو یہی بات!
کندن: میں نے تمام عمر اسی میں گزاری کہ لاوارث بچوں کی پرورش کروں، ان کو کھلاؤں پلاؤں اور اچھی باتیں سکھاؤں۔ خدا مجھے اس کا بدلا دے تو واہ واہ، ورنہ اور کچھ فائدہ نہ سہی، تو اتنا فائدہ تو ہے کہ ان بیکسوں کو میری ذات سے پرورش ہوئی۔
آزاد: خدا ضروری اس کا ثواب دے گا۔

کندن: تم نے میرا نام کس سے سنا؟
آزاد: آپ کے نام کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

کندن: واہ، میں تو کبھی کسی سے اپنی تعریف ہی نہیں کرتی۔ جولوگیاں میں پالتی ہوں ان کو بالکل اپنے خاص بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں۔ کیا مجال کہ ذرا بھی فرق ہو۔ جب دیکھا کہ

وہ سیانی ہوئیں تو ان کو کسی اچھے گھر بیاہ دیا، مگر خوب دیکھ بھال کے۔ شادی مرد اور عورت کی رضامندی سے ہونی چاہیے۔

آزاد: یہی شادی کے معنی ہیں۔

کندن: تمہاری عمر دراز ہو بیٹا، آدمی جو کام کرے، عقل سے، ہر پہلو کو دیکھ بھال کے۔

آزاد: بغیر اس کے میاں بیوی میں محبت نہیں ہو سکتی اور یوں زبردستی کی تو بات ہی اور ہے۔

کندن: میرا قاعدہ ہے کہ جس آدمی کو پڑھا لکھا دیکھتی ہوں اس کے سوا اور کسی سے نہیں بیاہتی اور لڑکی سے پوچھ لیتی ہوں کہ بیٹا، اگر تم کو پسند ہو تو اچھا، نہیں کچھ زبردستی نہیں ہے۔

یہ کہہ کر اس نے مہری کو اشارہ کیا۔ آزاد نے اشارہ کرتے تو دیکھا، مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ مہری فوراً کوٹھے پر گئی اور تھوڑی ہی دیر میں کوٹھے سے گانے کی آوازیں آنے لگی۔

کندن: میں نے سب کو گانا بھی سکھایا ہے، گو یہاں اس کا رواج نہیں۔

آزاد: تمام دنیا میں عورتوں کو گانا بجانا سکھایا جاتا ہے۔

کندن: ہاں، بس ایک اس ملک میں نہیں۔

آزاد: یہ تو تین کی آوازیں معلوم ہوتی ہے، مگر ان میں سے ایک کا گلا بہت صاف ہے۔

کندن: ایک تو ان کا دل بہلتا ہے، دوسرے جو سنتا ہے اس بھی دل بہلتا ہے۔

آزاد: مگر آپ نے کچھ پڑھایا بھی ہے یا نہیں؟

کندن: دیکھو بلواتی ہوں، مگر بیٹا، نیت صاف دینی چاہیے۔

اس ٹھگوں کو بڑھیا نے سب سے پہلے نور کو بلایا۔ وہ لجاتی ہوئی آئی اور بڑھیا کے پاس اس طرح گردن جھکائے بیٹھی جیسے کوئی شرمیلی دلہن۔

آزاد: اے صاحب، سر اونچا کر کے بیٹھو، یہ کیا بات ہے؟

کندن: بیٹا، اچھی طرح سر اٹھا کر۔ (آزاد سے) ہماری سب لڑکیاں شرمیلی اور حیا دارا

ہیں۔

آزاد: یہ آپ اوپر کیا گاری تھیں؟ ہم بھی کچھ نہیں۔

کندن: بیٹی نور، وہی غزل گاؤ۔

نور: لتاں جان، ہمیں شرم آتی ہے۔

کندن: کہتی ہے، ہمیں شرم آتی ہے، شرم کی کیا بات ہے، ہماری خاطر سے گاؤ۔

نور: (کندن کے کان میں) لتاں جان، ہم سے نہ گایا جائے گا۔

آزاد: یہ نئی بات ہے۔

اکڑتا ہے کیا دیکھ دیکھ آئینہ

نہیں گرچہ ہے تو پر اتنا مہمند

کندن: لو، انھوں نے گاکے سنا دیا۔

مہری: کہیے حضور، دل کا پردہ کیا کم ہے کہ آپ مارے شرم کے منہ چھپائے لیتی ہیں۔

اے بی بی گردن اونچی کرو، جس دن دلہن بنوگی، اس دن اس طرح بیٹھنا تو کچھ مضائقہ نہیں

ہے۔

کندن: ہاں، بات تو یہی ہے، اور کیا؟

آزاد: شکر ہے، آپ نے ذرا گردن تو اٹھائی۔

بات سب ٹھیک ٹھاک ہے، پر ابھی

کچھ سوال و جواب باقی ہیں

کندن: (نہیں کر) اب تم جانو اور یہ جانے۔

آزاد: اے صاحب، ادھر دیکھیے۔

نور: لتاں جان، اب ہم یہاں سے جاتے ہیں۔

کندن نے چنگی لے کر کہا۔ کچھ بولو جس میں ان کا بھی دل خوش ہو، کچھ جواب دو، یہ

کیا بات ہے۔

نور: لتاں جان، کس کو جواب دو؟ نہ جان، نہ پہچان۔

کندن ان کاموں میں آٹھوں گانٹھ گنیت، کسی بہانے سے ہٹ گئی۔ نور نے بھی بناوٹ

کے ساتھ چاہا کہ چلی جائے، اس پر کندن نے ڈانٹ بتائی۔ ہیں ہیں، یہ کیا، بھلے مانس ہیں یا

کوئی بچ قوم؟ شریفوں سے اتنا ڈر! آخر نور شرما کر بیٹھ گئی۔ ادھر کندن نظر سے غائب ہوئی، ادھر مہری بھی چپت۔

آزاد: یہ بڑھیا تو ایک ہی کائیاں ہے۔

نور: ابھی دیکھتے جاؤ، یہ اپنے نزدیک تم کو عمر بھر کے لیے غلام بنائے لیتی ہے، جو ہم نے پہلے سے اس کا حال نہ بیان کر دیا ہوتا تو تم بھی جنگ پر چڑھ جاتے۔

آزاد: بھلا یہ کیا بات ہے کہ تم اس کے سامنے اتنا شرماتی رہیں؟

نور: ہم کو سکھایا ہے وہ کہتے ہیں، کیا کریں؟

آزاد: اچھا، ان دونوں کو کیوں نہ بلایا؟

نور: دیکھتے جاؤ، سب کو بلائے گی۔

اتنے میں مہری پان، الا بچی اور عطر لے کر آئی۔

آزاد: مہری صاحب، یہ کیا اندھیر ہے؟ آدی سے بولتا ہے یا نہیں؟

مہری: اے بی بی، تم نے کیا بولنے کی قسم کھالی ہے؟ لے اب ہم سے تو بہت نہ اڑو۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو بات چیت تک نوبت آچکی ہوگی اور ہمارے سامنے گھونگھٹ کی لیتی ہیں۔

آزاد: گردن تک تو اونچی نہیں کرتیں، بولنا چاہنا کیسا، یا تو بنتی ہیں یا اتناں جان سے ڈرتی ہیں۔

مہری: واہ واہ، حضور واہ، بھلا یہ کاہے سے جان پڑا کہ بنتی ہیں؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آنکھوں کی حیا کے سبب سے لپاتی ہوں؟

آزاد: واہ، آنکھیں کہہ دیتی ہیں کہ نیت کچھ اور ہے۔

نور: خدا کی سنوار جھوٹے پر۔

مہری: شاباش، بس یہ اسی بات کی منتظر تھیں۔ میں تو سمجھے ہی بیٹھی تھی کہ جب یہ زبان کھولیں گی، پھر بند ہی کر چھوڑیں گی۔

نور: ہمیں بھی کوئی منوار سمجھا ہے کیا؟

آزاد: واللہ، اس وقت ان کا تیوری چڑھانا عجیب لطف دیتا ہے۔ ان کے جوہر تو اب کھلے۔ ان کی لتاں جان کہاں چلی گئیں؟ ذرا ان کو بلوایئے تو!

مہری: حضور، ان کا قاعدہ ہے کہ اگر دو دل مل جاتے ہیں تو پھر نکاح پڑھوا دیتی ہیں، مگر مرد بھلا مانس ہو، چار پیسے پیدا کرتا ہو۔ آپ پر تو کچھ بہت ہی مہربان نظر آتی ہیں کہ دو باتیں ہوتے ہی اٹھ گئیں، ورنہ مہینوں جانچ ہوا کرتی ہے، آپ کی شکل و صورت سے ریاست برستی ہے۔

نور: واہ، اچھی سمجھتی کہی، بے شک ریاست برستی ہے۔

یہ کہہ نور نے آہستہ آہستہ گانا شروع کیا۔

آزاد: میں تو ان کی آواز پر عاشق ہوں۔

نور: خدا کی شان، آپ کیا اور آپ کی قدر دانی کیا!

آزاد: دل میں تو خوش ہوئی ہوں گی، کیوں مہری؟

مہری: اب یہ آپ جانیں اور وہ جانیں، ہم سے کیا؟

یہ ایک نور اٹھ کر چلی گئی۔ آزاد اور مہری کے سوا وہاں کوئی نہ رہا، تب مہری نے آزاد سے کہا۔ حضور نے مجھے پہچانا نہیں، اور میں حضور کو دیکھتے ہی پہچان گئی، آپ شریا بیگم کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔

آزاد: ہاں، اب یاد آیا، بے شک میں نے تم کو ان کے یہاں دیکھا تھا۔ کہو، معلوم

ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟

مہری: حضور، اب وہ وہاں ہیں جہاں چیزیاں بھی نہیں جاسکتی، مگر کچھ انعام دیجیے تو دکھا دوں۔ دور ہی سے بات چیت ہوگی۔ ایک رئیس آزاد نام کے تھے، انھیں کے عشق میں جوگن ہو گئی۔ جب معلوم ہوا کہ آزاد نے حسن آرا سے شادی کر لی تو مجبور ہو کر ایک نواب سے نکاح پڑھوا لیا۔ آزاد نے یہ بہت برا کیا۔ جو اپنے اوپر جان دے، اس کے ساتھ ایسی بے وفائی نہ کرتی چاہیے۔

آزاد: ہم نے سنا ہے کہ آزاد انھیں بھڑیاری سمجھ کر نکل بھاگے۔

مہری: اگر آپ کچھ دلائل تو میں بیڑا اٹھاتی ہوں کہ ایک نظر اچھی طرح دکھا دوں گی۔

آزاد: منظور، مگر بے ایمانی کی سند نہیں۔

مہری: کیا مجال، انعام پیچھے دیجیے گا، پہلے ایک کوڑی بھی نہ لوں گی۔

مہری نے آزاد سے یہاں کا سارا کچھا چٹھا کہہ سنایا۔ میاں، یہ بڑھیا جنتی اوپر ہے، اتنی

ہی بیچے ہے، اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ پر آزاد کو شریا بیگم کی دھن تھی۔ پوچھا۔ بھلا ان کا مکان ہم دیکھ سکتے ہیں؟

مہری: جی ہاں، یہ کیا سامنے ہے۔

آزاد: اور یہ جتنی یہاں ہے، سب اسی فیشن کی ہوں گی؟

مہری: کسی کو چرا لائی ہیں، کسی کو مول لیا ہے، بس کچھ نہ پوچھیے؟

اتنے میں کسی نے سیٹی بجائی اور مہری فوراً ادھر چلی گئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں کندن آئی اور کہا۔ ایں، یہاں تم بیٹھے ہو، تو بہ مگر لڑکیوں کو کیا کروں، اتنی شرمیلی ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ (مہری کو پکار کر) اے، ان کو بلاؤ، کہو، یہاں آکر بیٹھیں۔ یہ کیا بات ہے؟ جیسے کوئی کاٹے کھاتا ہے۔

یہ سنتے ہی منم جھم جھم کرتی ہوئی آئی۔ آزاد نے دیکھا تو ہوش اڑ گئے، اس مرتبہ غضب کا نکھار تھا۔ آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ صورت اور یہ پیشہ۔ ٹھان لی کہ کسی موقع پر ضلع کے حاکم کو ضرور لائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ خدا کے لیے ان پریوں کو اس مکار عورت سے بچاؤ۔

کندن نے منم کے ہاتھوں میں ایک پنکھا دے دیا اور جھلنے کو کہا۔ پھر آزاد سے بولی۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیان کر دو۔

آزاد: اس وقت دل وہ مزے لوٹ رہا ہے جو بیان سے باہر ہے۔

کندن: میرے یہاں صفائی کا بہت انتظام ہے۔

آزاد: آپ کے کہنے کی ضرورت نہیں۔

کندن: یہ جتنی ہیں سب ایک سے ایک بڑھی ہوئی ہیں۔

آزاد: ان کے شوہر بھی انھیں کے سے ہوں تو بات ہے۔

کندن: اس میں کسی کے سکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان کے لیے ایسے لوگوں کو چنوں گی جن کا کہیں ثانی نہ ہو۔ ان کو کھلایا، پلایا، گانا سکھایا، اب ان پر ظلم کیسے برداشت کروں گی؟

آزاد: اور تو اور، مگر ان کو تو آپ نے خوب ہی سکھایا۔

کندن: اپنا اپنا دل ہے، میری نگاہ میں تو سب برابر، آپ دلاچار دن یہاں رہیں، اگر

ان کی طبیعت نے منظور کیا تو ان کے ساتھ آپ کا نکاح کر دوں گی، بس اب تو خوش ہوئے۔

مہری: وہ شرطیں تو بتا دیجیے!

کندن: خبردار، سچ میں نہ بول اٹھا کرو، سمجھی؟

مہری: ہاں حضور، خطا ہوئی۔

آزاد: پھر اب تو شرطیں بیان کر دیجیے نہ۔

کندن: اطمینان کے ساتھ بیان کروں گی۔

آزاد ء (صنم سے) تم نے تو ہمیں اپنا غلام ہی بنا لیا۔

صنم نے کوئی جواب نہ دیا۔

آزاد: اب ان سے کیا کوئی بات کرے۔

گوارہ نہیں ہے جنہیں بات کرنا

سنیں گے وہ کاہے کو قصہ ہمارا

کندن: ایک ہاں، یہ تم میں کیا عیب ہے؟ باتیں کرو بیٹا!

صنم: اماں جان، کوئی بات ہو تو کیا مضائقہ اور یوں خواہ مخواہ ایک اجنبی سے باتیں کرنا

کون سی دانائی ہے۔

کندن: خدا گواہ کر کے کہتی ہوں کہ یہ سب کی سب بڑی شرمیلی ہیں۔

آزاد کو اس وقت یاد آیا کہ ایک دوست سے ملنے جانا ہے، اس لیے کندن سے رخصت

مانگی اور کہا کہ آج معاف کیجیے، کل حاضر ہوں گا، مگر اکیلے جاؤں، یا دوستوں کو بھی ساتھ لیتا

آؤں؟ کندن نے کھانا کھانے کے لیے بہت ضد کی، مگر آزاد نے نہ مانا۔

آزاد نے ابھی باغ کے باہر بھی قدم نہیں رکھا تھا کہ مہری دوڑی آئی اور کہا۔ حضور کو بی

بی بلاتی ہیں۔ آزاد اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کندن کے پاس صنم اور اس کی سہیلی کے سوا

ایک اور کاٹنی بیٹھی ہوئی ہے اور آن بان میں ان دونوں سے بڑھ کر ہے۔

کندن: یہ ایک جگہ گئی ہوئی تھیں، ابھی ڈولی سے اتری ہیں۔ میں نے کہا، تم کو ذرا

دکھا دوں کہ میرا گھر سچ سچ پرستان ہے، مگر بدی قریب نہیں آنے پاتی۔

آزاد: یہ تو سیوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

کندن : بیٹا، سبھی گھر گھر ہست کی بہو بیٹیاں ہیں، کہیں آئیں نہ جائیں، نہ کسی سے ہنسی، نہ دل لگی۔

آزاد : بے شک، ہمیں آپ کے یہاں کا قرینہ بے حد پسند آیا۔

کندن : بولو بیٹا، منہ سے کچھ بولو، دیکھو، ایک شریف آدمی بیٹھے ہیں اور تم نہ بولتی ہو، نہ چلتی ہو۔

پری : کیا کروں، آپ ہی آپ بکوں؟

کندن : ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے، وہ تمہاری طرف منہ کر کے بات چیت کریں تب بولو۔

لیجے صاحب، اب تو آپ ہی کا قصور ٹھہرا۔

آزاد : بھلا سینے تو، مہمانوں کی خاطر داری بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟

کندن : ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے، اب بتاؤ بیٹا؟

پری : اماں جان، ہم تو سب کے مہمان ہیں، ہماری جگہ سب کے دل میں ہیں، ہم بھلا

کسی کی خطر داری کیوں کریں؟

کندن : اب فرمائیے حضرت، جواب پایا؟

آزاد : وہ جواب پایا کہ لا جواب ہو گیا۔ خیر صاحب، خاطر داری نہ سہی، کچھ غصہ ہی

کیجیے۔

پری : اس کے لیے بھی قسمت چاہیے۔

میاں آزاد برے بولکڑ تھے، مگر اس وقت شی پٹی بھول گئے۔

کندن : اب کچھ کہیے، چپ کیوں بیٹھے ہیں؟

پری : اماں جان، آپ کی تعلیم ایسی ویسی نہیں ہے کہ ہم بند رہیں۔

کندن : مگر میاں صاحب کی قلمی کھل گئی۔ ارے، کچھ تو فرمائیے حضرت

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج 'غالب' غزل سرا نہ ہوا

آزاد : آپ شعر بھی کہتی ہیں؟

نور : اے واہ، ایسے گہرائے کہ 'غالب' کا تخلص موجود ہے اور آپ پوچھتے ہیں کہ آپ

شعر بھی کہتی ہیں؟

پری : آدمی میں حواس ہی حواس تو ہیں، اور ہے کیا؟
صنم : ہم جو گردن جھکائے بیٹھے تھے تو آپ بہت شیریں تھے، مگر اب ہوش اڑے ہوئے
ہیں۔

سہیلی : تم پر رتھے ہوئے ہیں بہن، دیکھتی ہو، کن آنکھوں سے گھور رہے ہیں۔
پری : اے ہنوبھی، ایزی چوٹی پر قربان کر دوں۔
آزاد : یا خدا، اب ہم ایسے گئے گزرے ہو گئے؟
پری : اور آپ اپنے کو سمجھے کیا ہیں!
کندن : یہ ہم نہ مانیں گے، ہنسی دل لگی اور بات ہے، مگر یہ بھی لاکھ دو لاکھ میں ایک
ہیں۔

پری : اب اماں جان کل تک تعریف کیا کریں گی۔
آزاد : پھر جو تعریف کے قابل ہوتا ہے، اس کی تعریف ہوتی ہی ہے۔
نور : اوں ہوں، گھر کی پلکی باسی ساگ۔
آزاد : جلن ہوگی کہ ان کی تعریف کیوں کی۔
نور : یہاں تعریف کی پرواہ نہیں۔
کندن : یہ تو خوب کہی، اب اس کا جواب دیجیے۔
آزاد : حسینوں کو کسی کی تعریف کب پسند آتی ہیں؟
نور : بھلا خیر، آپ اس قابل تو ہوئے کہ آپ کے حسن سے لوگوں کے دل میں جلن
ہونے لگی۔

کندن : (صنم سے) تم نے ان کو سب کچھ سنایا نہیں بیٹا؟
صنم : ہم کیا کچھ ان کے نوکر ہیں؟
آزاد : خدا کے لیے کوئی پھڑکتی ہوئی غزل گاؤ، بلکہ اگر کندن صاحب کا حکم ہو تو سب
مل کر گائیں۔

صنم : حکم، حکم تو ہم بادشاہ وزیر کا نہ مانیں گے۔
پری : اب اسی بات پر جو کوئی گائے۔
کندن : اچھا، حکم کہا تو کیا گناہ کیا، کتنی ڈھیٹ لڑکیاں ہیں کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے

دیتیں۔

صنم : اچھا بہن، آؤ، مل کر گائیں۔

اے عشق قمر دل کا جلانا نہیں اچھا۔

پری : یہ کہاں سے بوڑھی غزل نکالی؟ یہ غزل گاؤ۔

گیا یار آفت پڑی اس شہر پر

اداسی بدسنے لگی بام و در پر

صبا نے بھری دن کو ایک آہ ٹھنڈی

قیامت ہوئی یا دلِ نوحہ گر پر

میرے بھاویں گلشن کو آتش لگی ہے

نظر کیا پڑے خاک گلہائے تر پر

کوئی دیو تھا یا کہ جن تھا وہ کافر

مجھے غصہ آتا ہے پچھلے پہر پر

یکایک کسی نے باہر سے آواز دی۔ کندن نے دروازے پر جا کر کہا۔ کون صاحب

ہیں؟

سپاہی : داروغہ جی آئے ہیں، دروازہ کھول دو۔

کندن : اے تو یہاں کس کے پاس تشریف لائے ہیں؟

سپاہی : کندن کٹنی کے یہاں آئے ہیں۔ یہی مکان ہے یا اور؟

دوسرا سپاہی : ہاں ہاں جی، یہی ہے، ہم سے پوچھو۔

ادھر کندن پولس والوں سے باتیں کرتی تھی، ادھر آزادیتوں عورتوں کے ساتھ باغ میں

چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔

آزاد : یہ ماجرا کیا ہے بھی؟

صنم : دوڑ آئی ہے میاں، دروازہ بند کرنے سے کیا ہوگا، کوئی تدبیر ایسی بتاؤ کہ اس گھر

سے نکل بھاگیں۔

پری : ہمیں یہاں ایک دم کا رہنا پسند نہیں۔

آزاد : کسی کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟

نور: اے ہے! یہ کیا غضب کرتے ہو، آہستہ سے بولو۔

آزاد: آخر یہ دوڑ کیوں آئی ہے، ہم بھی تو سنیں۔

صنم: کل ایک بھلے مانس آئے تھے۔ ان کے پاس ایک سونے کی گھڑی، سونے کی زنجیر، ایک بیک، پانچ اشرفیاں اور کچھ روپے تھے۔ یہ بھانپ گئی۔ اس کو شراب پلا کر ساری چیزیں اڑا دیں۔ صبح کو جب اس نے اپنی چیزوں کی تلاش کی تو دھمکایا کہ تڑاؤ گے تو پولس کو اطلاع کر دوں گی۔ وہ بے چارہ سیدھا سادہ آدمی، چپ چاپ چلا گیا اور داروغہ سے شکایت کی، اب وہ دوڑ آئی ہے۔

آزاد: اچھا! یہ ہتھکنڈے ہیں۔

صنم: کچھ پوچھو نہ، جان عذاب میں ہے۔

نور: اب خدا ہی جانے، کس کس کا ناش وہ کرے گی، کیا آگ لگائے گی۔

صنم: اجی، وہ کسی سے دہنے والی نہیں ہے۔

پری: وہ نہ دہیں گی صاحب تک سے، یہ داروغہ لیے پھرتی ہیں!

صنم: ذرا سنو تو کیا ہو رہا ہے۔

آزاد نے دروازے کے پاس سے کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا کہ بی بی کندن پولس والوں سے بحث کر رہی ہیں کہ تم میرے گھر بھر کی تلاشی لو۔ مگر یاد رکھنا، کل ہی تو ناش کروں گی۔ مجھے اکیلی عورت سمجھ کے دھمکا لیا ہے۔ میں عدالت چڑھوں گی۔ لینا ایک نہ دینا دو، اس پر یہ اندھیرا! میں صاحب سے کہوں گی کہ اس کی نیت خراب ہے، یہ رعایا کو دق کرتا ہے اور پرانی بہو بیٹی کو تاکتا ہے۔

صنم: سختی ہو، کیسا ڈانٹ رہی ہیں پولس والوں کو۔

پری: چپ چپ، ایسا نہ ہو، سب ادھر آ جائیں۔

ادھر کندن نے مسافر کو کونا شروع کیا۔ اللہ کرے، اس اٹھوارے میں اس کا جنازہ نکلے۔ موئے نہ آکے میری جان عذاب میں کر دی۔ میں نے تو غریب مسافر سمجھ کر مکا لیا تھا۔ موعا الٹا لیے پڑتا ہے۔

مسافر: داروغہ جی، اس عورت نے سینکڑوں کا مال مارا ہے۔

سپاہی: حضور، یہ پہلے غلام حسین کے ہل پر رہتی تھی۔ وہاں ایک اہیرین کی لڑکی کو

پھسلا کر گھبرلائی اور اسی دن مکان بدل دیا۔ اہیر نے تھانے پر رہٹ لکھائی۔ ہم جو جاتے ہیں تو مکان میں تالا پڑا ہوا، بہت تلاش کی، پتا نہ ملا۔ خدا جانے، لڑکی کسی کے ہاتھ بچ ڈالی یا مر گئی۔

کندن: ہاں ہاں، بچ ڈالی، یہی تو ہمارا پیشہ ہے۔
داروغہ: (مسافر سے) کیوں حضرت، جب آپ کو معلوم تھا کہ یہ کتنی ہے تو آپ اس کے یہاں کئے کیوں؟

مسافر: بیدھا تھا، اور کیا، دو ڈھائی سو پر پانی پھر گیا، مگر شکر ہے کہ مار نہیں ڈالا۔
کندن: جی ہاں، صاف بچ گئے۔

داروغہ: (کندن سے) تو ذرا بھی نہیں شرماتی؟

کندن: شرمائوں کیوں؟ کیا چوری کی ہے؟

داروغہ: بس، خیریت اسی میں ہے کہ ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔

کندن: دیکھیے، اب کسی دوسرے گھر کا ڈاکہ ڈالوں تو ان کے روپے ملیں۔

سپاہی: حضور، اسے پکڑ کے تھانے لے چلیے، اس طرح یہ نہ مانے گی۔

کندن: تھانے میں کیوں جاؤں؟ کیا عزت بچتی ہے! یہ نہ سمجھنا کہ اکیلی ہے۔ ابھی

اپنے داماد کو بلا دوں تو آنکھیں کھل جائیں۔

یہ سنتے ہی آزاد کے ہوش اڑ گئے۔ بولے، اس مردار کو سوجھی کیا!

مہری: ذرا دروازہ کھولیے۔

آزاد: خدا کی مارتھ پر۔

کندن: اے بیٹا، ذرا ادھر آؤ۔ مرد کی صورت دیکھ کر شاید یہ لوگ اتنا ظلم نہ کریں۔

داروغہ: اخواہ، کیا توپ ساتھ ہیں؟ ہم سرکاری آدمی اور تمہارے داماد سے دب جائیں!

اب تو بتاؤ، ان کے روپے ملیں یا نہیں؟

کندن ایک سپاہی کو الگ لے گئی اور کہا۔ میں اسی وقت داروغہ جی کو اس شرط پر ستر

روپے دیتی ہوں کہ وہ اس معاملے کو دبا دیں۔ اگر تم یہ کام پورا کر دو تو دس روپیہ تمہیں بھی

دوں گی۔

داروغہ نے دیکھا کہ یہ مکار عورت جھانسا دینا چاہتی ہے تو اسے ساتھ لے کر تھانے

چلے گئے۔

آزاد: بڑی بلا اس وقت ملی۔ عورت کیا، کچ بچ بلا ہے۔

صنم: آپ کو ابھی اس سے کہاں سابقہ پڑا ہے۔

آزاد: میں تو اتنے ہی میں اوب اٹھا۔

صنم: ابھی یہ سمجھنا کہ بلا ٹل گئی، ہم سب باندھے جائیں گے۔

آزاد: ذرا اس شرارت کو تو دیکھو کہ مجھے تھانے دار سے لڑوائے دیتی تھی۔

صنم: خوش تو نہ ہو گے کہ داماد بنا دیا۔

آزاد: ہم ایسی ساس سے باز آئے۔

صنم: اس گلی سے کوئی آدمی بنا لئے نہیں جا سکتا۔ ایک عورت کو تو اس نے زہر دلوا دیا

تھا۔

نور: پڑوس سے کوئی جا کر کہہ دے کہ تم اپنی لڑکی کا کیوں ستیاناس کرتی ہو۔ جو کچھ

روکھا سوکھا اللہ دے وہ کھاؤ اور پڑی رہو۔

مہری: ہاں اور کیا، ایسے پلاؤ سے ڈال دلیا ہی اچھی۔

صنم: تم جا کے بلا لاؤ تو یہ سمجھا دیں چلے سے۔

مہری جا کر پڑوس کو بلا لائی۔ آزاد نے کہا۔ تمھاری پڑوس کو تو سپاہی لے گئے۔ اب یہ

مکان ہمیں سوئپ گئی ہیں۔ پڑوس نے ہنس کر کہا۔ میاں، ان کو سپاہی لے جا کر کیا کریں

گے؟ آج گئیں کل چھوٹ آئیں گی۔

اتنے میں ایک آدمی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ مہری نے دروازہ کھولا تو ایک بوڑھے

میاں دیکھائی دیے۔ پوچھا۔ بی کنڈن کہاں ہیں؟ مہری نے کہا۔ ان کو تھانے کے لوگ لے

گئے۔

صنم: ایک سرے سے اتنے مقدمے، ایک دو تین۔

نور: ہر روز ایک نیا پنچھی پھنساتی ہے۔

بوڑھے میاں: بس، اب پیالہ بھر گیا۔

صنم: روز تو یہی سنتی ہوں کہ پیالہ بھر گیا۔

بوڑھے میاں: اب موقع پائے تم سب کہیں چل کیوں نہیں دیتی ہو؟ اب اس وقت تو

وہ نہیں ہے۔

ضمن : جائیں تو بے سوچے سمجھے کہاں جائیں؟

آزاد : بس اسی اتفاق کو ہم لوگ قسمت کہتے ہیں اور اسی کا نام اقبال ہے۔

بوڑھے میاں : جی ہاں، آپ تو نئے آئے ہیں، یہ عورت خدا جانے، کتنے گھر تباہ کر چکی ہے۔ پولس میں بھی گرفتار ہوئی۔ مجسٹریٹ بھی گئی۔ سب کچھ ہوا، سزا پائی، مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ان میں سے جس کا جی چاہے، میرے ساتھ چلی چلے۔ کسی شریف کے ساتھ نکاح پڑھوا دوں گا، مگر کوئی راضی نہیں ہوتی۔

یکا یک کسی نے پھر دروازے پر آواز دی، مہری نے دروازہ کھولا تو ضمن اور گل باز اندر داخل ہوئے۔ دونوں ڈھانٹے باندھے ہوئے تھے۔ مہری انھیں اشارے سے بلا کر باغ میں لے گئی۔

ضمن : کندن کہاں ہیں؟

مہری : وہ تو آج بڑی مصیبت میں پھنس گئیں۔ پولس والے پکڑ لے گئے۔

ضمن : ہم تو آج اور ہی منصوبے باندھ کر آئے تھے۔ وہ جو مہاجن گلی میں رہتے ہیں، ان کی بہو اجیر سے آئی ہے۔

مہری : ہاں، میرا جانا ہوا ہے۔ بہت سے روپے لائی ہے۔

گل باز : مہاجن گنگا نہانے گیا ہے۔ پرسوں تک آجائے گا۔ ہم نے کئی آدمیوں سے کہہ دیا تھا۔ سب کے سب آتے ہوں گے۔

ضمن : کندن نہیں ہے، نہ سہی! ہم اپنے کام سے کیوں غافل رہیں۔ آؤ ایک آدھ چکر لگائیں۔

اتنے میں باغ کے دروازے کی طرف سیٹی کی آواز آئی۔ گل باز نے دروازہ کھول دیا اور بولا۔ کون ہے، دلبر؟

دلبر : بس اب دیر نہ کرو۔ وقت جاتا ہے بھائی۔

گل باز : ارے یار، آج تو معاملہ بچ گیا۔

دلبر : ایس! ایسا نہ کہو۔ دو لاکھ نقد رکھا ہوا ہے۔ اس میں ایک بھی کم ہو، تو جو جرمانہ کہو،

دوں۔

ممن : اچھا، تو کہیں بھاگا جاتا ہے؟

دلبر : یہ کیا ضروری ہے کہ کندن ضرور ہی ہو۔

ممن : بھائی جان، ایک کندن کے نہ ہونے سے کہیں یار لوگ چوکتے ہیں، اور بھی کئی

سبب ہیں۔

دلبر : ایسے معاملے میں اتنی سستی!

ممن : یہ سارا قصور گل باز کا ہے۔ چندو خانے میں پڑے چھینٹے اڑایا کیے، اور سارا

کھیل بگاڑ دیا۔

دلبر : آج تک اس معاملے میں ایسے لوٹے نہیں بنے تھے۔ وہ دن یاد ہے کہ جب

ظہورن کی گلی میں چھری چلی تھی؟

گل باز : میں اس دن کہاں تھا؟

دلبر : ہاں، تم تو مرشد آباد چلے گئے تھے۔ اور یہاں ظہورن نے ہمیں اطلاع دی کہ

سلطان مرزا چل بے۔ سلطان مرزا کے محلے میں سب موٹے روپے والے، مگر ان کے مارے

کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کے محلے میں جائے۔

ممن : وہ تو اس فن کا استاد تھا۔

دلبر : بس جنتاب، ادھر سلطان مرزا مرے، ادھر ظہورن نے ہمیں بلوایا۔ ہم لوگ جا

پہنچے۔ اب سنیے کہ جس طرف جاتے ہیں، کوئی گارہا ہے، کوئی گھرا یا نہیں، جہاں روشنی اور

جاگ نہ ہو۔

ممن : کسی نے پہلے سے محلے والوں کو ہوشیار کر دیا ہوگا۔

دلبر : جی ہاں، سنتے تو جاییے۔ پیچھے کھلا نہ۔ ہوا یہ کہ جس وقت ہم لوگوں نے ظہورن

کے دروازے پر آواز دی، تو ان کی ماما نے پڑوں کے مکان میں کنکری پھینکی۔ اس پڑوں نے

دوسرے مکان میں۔ اس طرح محلے بھر میں خبر ہو گئی۔

یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر بوڑھے میاں اور آزاد میں کندن کو سزا دلانے کے

لیے صلاحیں ہوتی تھیں۔

آزاد : جن جن لڑکیوں کو اس نے چوری سے بچ لیا ہے، ان سب کو کا پتہ لگائیے۔

بوڑھے میاں : اجی، ایک دو ہوں، تو پتہ لگاؤں۔ یہاں تو شمار ہی نہیں۔

آزاد: میں آج ہی حاکم خلع سے اس کا ذکر کروں گا۔

ان لوگوں سے رخصت ہو کر آزاد بمسٹر کے بیگلے پر آئے۔ پہلے اپنے کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، اور کپڑے بدل کر اس کمرے میں گئے، جہاں صاحب مہمانوں کے ساتھ ڈنر کھانے بیٹھے تھے۔ ابھی کھانا چٹا ہی جا رہا تھا کہ آزاد کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ شام کو آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ 9 بجے پہنچے تو سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔

میم: کیوں صاحب، آپ کے یہاں اب شام ہوئی؟

صاحب: بڑی دیر سے آپ کا انتظار تھا۔

میدیڈا: کہیں شادی تو نہیں طے کر آئے؟

صاحب: ہاں، دیر ہونے سے تو ہم سب کو یہی شک ہوا تھا۔

میم: جب تک آپ دیر کی وجہ نہ بتائیں گے، یہ شک نہ دور ہوگا۔ آپ لوگوں میں تو چار شادیاں ہو سکتی ہیں۔

کلاریا: آپ چپ کیوں ہیں، کوئی بہانہ سوچ رہے ہیں؟

آزاد: اب میں کیا بیان کروں۔ یہاں تو سب لال بو جھڑ ہی بیٹھے ہیں۔ کوئی چہرے سے تازہ جاتا ہے، کوئی آنکھوں سے پہچان لیتا ہے، مگر اس وقت میں جہاں تھا، وہاں خدا کی کو نہ لے جائے۔

صاحب: جواہریوں کا اڈا تو نہ تھا؟

آزاد: نہیں، وہ اور ہی معاملہ تھا۔ اطمینان سے کہوں گا۔

لوگ کھانا کھانے لگے۔ صاحب کے زور دینے پر بھی آزاد نے شراب نہ پی۔ کھانا ہو جانے پر لیڈیوں نے گانا شروع کیا اور صاحب بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے آزاد سے کچھ گانے کو کہا۔

آزاد: آپ کو اس میں کیا لطف آئے گا؟

میم: نہیں، ہم ہندوستانی گانا پسند کرتے ہیں، مگر جو کچھ میں آئے۔

آزاد نے بہت حیلہ کیا، مگر صاحب نے ایک نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کر یہ غزل گائی۔

جان سے جاتی ہیں کیا کیا حسرتیں

کاش وہ بھی دل میں آنا چھوڑ دے

’داغ‘ سے میرے جہنم کو مثال
تو بھی واعظ دل جلانا چھوڑ دے
پردے کی کچھ حد بھی ہے پردہ نشیں
کھل کے مل بس منہ چھپانا چھوڑ دے

میم: ہم کچھ کچھ سمجھے۔ وہ جہنم کا شعر اچھا ہے۔

صاحب: ہم تو کچھ نہیں سمجھے۔ مگر کانوں کو اچھا معلوم ہوا۔

دوسرے دن آزاد تڑکے کندن کے مکان پر پہنچے اور مہری سے بولے۔ کیوں بیٹائی، تم
رٹیا بیگم کو کسی طرح دکھا سکتی ہو؟

مہری: بھلا میں کیسے دکھا دوں؟ اب تو میری وہاں پہنچ ہی نہیں۔

آزاد: خدا گواہ ہے، فقط ایک نظر بھر دیکھنا چاہتا ہوں۔

مہری: خیر، اب آپ کہتے ہی ہیں تو کوشش کروں گی۔ اور آج ہی شام کو یہیں چلے

آئیے گا۔

آزاد: خدا تم کو سلامت رکھے، بڑا کام نکلے گا۔

مہری: اے میاں، میں لوٹتی ہوں۔ تب تمہارا ہی نمک کھاتی تھی، اور اب بھی.....

آزاد: اچھا، اتنا بتا دو کہ کس ترکیب سے ملوں گا؟

مہری: یہاں ایک شاہ صاحب رہتے ہیں۔ رٹیا بیگم ان کی مرید ہیں۔ ان کے میاں

نے بھی حکم دے دیا ہے کہ جب ان کا جی چاہے، شاہ صاحب کے یہاں جائیں۔ شاہ جی کا

سن کوئی دو سو برس کا ہوگا۔ اور حضور، جو وہ کہہ دیتے ہیں، وہی ہوتا ہے۔ کیا مجال جو فرق

پڑے۔

آزاد: ہاں صاحب، فقیر ہیں، نہیں تو دنیا قائم کیسے ہے!

مہری: میں شاہ جی کو ایک اور جگہ بھیج دوں گی۔ آپ ان کی جگہ جا کے بیٹھ جائیے گا۔

شاہ صاحب کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے آپ کو یہ خوف بھی نہیں ہے کہ

رٹیا بیگم پہچان جائیں گی۔

آزاد: بڑا احسان ہوگا۔ عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اچھا، تو شام کو آؤں گا۔

شام کو آزاد کندن کے گھر پہنچ گئے۔ مہری نے کہا۔ لیجیے، مبارک ہو۔ سب معاملہ چوکس

ہے۔

آزاد : جہاں تم ہو، وہاں کس بات کی کمی۔ تم سے آج ملاقات ہوئی تھی؟ ہمارا ذکر تو نہیں آیا؟ ہم سے ناراض تو نہیں ہیں؟

مہری : اے حضور، اب تک روتی ہیں۔ اکثر فرماتی ہیں کہ جب آزاد سنیں گے کہ اس نے ایک امیر کے ساتھ نکاح کر لیا، تو اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

شاہ صاحب شہر کے باہر ایک اہلی کے بیڑ کے نیچے رہتے تھے۔ مہری آزاد کو وہاں لے گئی اور درخت کے نیچے والی کوٹھری میں بیٹھ کر بولی۔ آپ یہیں بیٹھے، بیگم صاحب اب آتی ہی ہوں گی۔ جب وہ آنکھ بند کر کے نظر دکھائیں تو لے لیجیے گا۔ پھر آپ میں اور ان میں خود ہی باتیں ہوں گی۔

آزاد : ایسا نہ ہو کہ مجھے دیکھ کر ڈر جائے۔

مہری : جی نہیں، دل کی مضبوط ہیں۔ بنوں جنگلوں میں پھر آئی ہیں۔ اتنے میں کسی آدمی کے گانے کی آواز آئی۔

بیتِ ظالم نہیں سنتا کسی کی
غریبوں کا خدا فریاد رس ہے

آزاد : یہ اس وقت اس ویرانے میں کون گا رہا ہے؟

مہری : سڑی ہے۔ خبر پائی ہوگی کہ آج یہاں آنے والی ہیں۔

آزاد : بابا صاحب کو اس کا حال معلوم ہے یا نہیں؟

مہری : سبھی جانتے ہیں۔ دن رات یوں ہی بکا کرتا ہے، اور کوئی کام ہی نہیں۔

آزاد : بھلا یہ تو بتاؤ کہ ثریا بیگم کے ساتھ کون کون ہوگا؟

مہری : دو ایک مہریاں ہوں گی، مولائی بیگم ہوں گی اور دس بارہ سپاہی۔

آزاد : مہریاں اندر ساتھ آئیں گی یا باہر ہی رہیں گی؟

مہری : اس کمرے میں کوئی نہیں آسکتا۔

اتنے میں ثریا کی سواری دروازہ پر آچکی۔ آزاد کا دل دھک دھک کرتا تھا۔ کچھ تو اس

بات کی خوشی تھی کہ مدت کے بعد اللہ رکھی کو دیکھیں گے اور کچھ اس بات کا خیال کہ کہیں پردہ نہ کھل جائے۔

آزاد: ذرا دیکھو، پاکی سے اتریں یا نہیں۔
 مہری: باغ میں ٹہل رہی ہیں۔ مولائی بیگم بھی ہیں۔ چل کے دیوار کے پاس کھڑے ہو کر آؤ سے دیکھیے۔

آزاد: ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں دیکھ نہ لیں۔
 آخر آزاد سے نہ رہا گیا۔ مہری کے ساتھ آؤ میں کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ باغ میں کئی عورتیں چمن کی سیر کر رہی ہیں۔
 مہری: جو ذرا بھی ان کو معلوم ہو جائے کہ آزاد کھڑے دیکھ رہے ہیں تو خدا جانے، دل کا کیا حال ہو۔

آزاد: پکارو؟ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ پکاروں۔
 اتنے میں بیگم دیوار کے پاس آئی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔
 ثریا: اس وقت تو گانا سننے کو جی چاہتا ہے۔
 مولائی: دیکھیے، یہ سودائی کیا گا رہا ہے۔
 ثریا: ارے! اس موئے کو اب تک موت نہ آئی؟ اسے کون میرے آنے کی خبر دے دیا کرتا ہے۔ شاہ جی سے کہوں گی کہ اس کو موت آئے۔
 مولائی: اے۔ نہیں۔ کاہے کو موت آئے بے چارے کو۔ مگر آواز اچھی ہے۔
 ثریا: آگ لگے اس کی آواز کو۔

اتنے میں زور سے پانی برسنے لگا۔ سب کی سب ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ آخر ایک مالی نے کہا کہ حضور، سامنے کا بنگلہ خالی کر دیا ہے، اس میں بیٹھیے۔ سب کی سب اس بنگلے میں گئی۔ جب کچھ دیر تک بادل نہ کھلا تو ثریا بیگم نے کہا۔ بھئی، اب تو کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے۔

مولانا م کی ایک مہری ان کے ساتھ تھی۔ بولی۔ شاہ جی کے یہاں سے کچھ لاؤں؟ مگر فقیروں کے پاس دال روٹی کے سوا اور کیا ہوگا۔

ثریا: جاؤ، کچھ ہو طے، لے آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں کوئی بے تکلی بات کہنے لگو۔
 مہری نے ڈوپٹے کو پلیٹ کر اوپر سے ڈولی کا پردہ اوڑھا۔ دوسری مہری نے مشالچی کو حکم دیا کہ مشال جلا۔ آگے آگے مشالچی، پیچھے پیچھے دونوں مہریاں دروازے پر آئیں اور آواز

دی۔ آزاد اور مہری نے سمجھا کہ بیگم صاحب آگئی، مگر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ مہریاں ہیں۔

مہری: آؤ، آؤ۔ کیا بیگم صاحب باغ ہی میں ہیں؟

مولیٰ: جی ہاں۔ مگر ایک کام آئے۔ شاہ صاحب کے پاس بھیجا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت کھانے کو ہے؟

مہری نے شاہ جی کے بارورچی خانے سے چار موٹی موٹی روٹیاں اور ایک پیالہ مسور کی دال لاکر دیا۔ دونوں مہریاں کھانا لے کر بنگلے میں پہنچی تو رثیا بیگم نے پوچھا۔ کہو، بیٹا کہ بیٹی؟ مولیٰ: حضور، فقیروں کے دربار سے بھلا کوئی خالی ہاتھ آتا ہے؟ لیجیے، یہ موٹے موٹے کھڑے ہیں۔

مولیٰ: اس وقت یہی قیمت ہے۔

مولیٰ: بیگم صاحب، آپ سے ایک عرض ہے۔

رثیا: کیا ہے، کہو۔ تمہاری باتوں سے ہمیں الجھن ہوتی ہے۔

مولیٰ: حضور، جب ہم کھانا لے کے آتے تھے تو دیکھا کہ باغ کے دروازے پر ایک بیکس، بے گناہ بے چارہ دبا دبا کھڑا بھیگ رہا ہے۔

رثیا: پھر تم نے وہی پاجی پن کی لی نہ! چلو ہوسانے سے۔

مولیٰ: بہن، خدا کے لیے اتنا کہہ دو کہ جہاں سپاہی بیٹھے ہیں، وہیں اسے بھی بلا لیں۔

رثیا: پھر مجھ سے کیا کہتی ہو؟

سپاہیوں نے دیوانے کو بلا کر بیٹھا لیا۔ اس نے یہاں آتے ہی تان لگائی۔

پس فنا ہمیں گردوں ستائے گا پھر کیا

منے ہوئے کو یہ ظالم مٹائے گا پھر کیا

ضعیف تالاں دل اس کا ہلا نہیں سکتا

یہ جا کے نہ عرش کا پایہ ہلائے گا پھر کیا

شریک جوا نہ ہوا ایک دم کو پھولوں میں

وہ پھول آکے لحد کے اٹھائے گا پھر کیا

خدا کو مالوں نہ بھل کو اپنے ذبح کرد

ثرپ کے سیر وہ تم کو دکھائے گا پھر کیا
 ثریا: دیکھنا۔ یہ کجنت بے غل چجائے کبھی نہ رہے گا۔
 مولائی: بس یہی تو اس میں عیب ہے۔ مگر غزل بھی ڈھونڈ کے اپنے ہی مطلب کی کہی
 ہے۔
 ثریا: کجنت بدنام کرتا پھرتا ہے۔

دونوں بیگموں نے ہاتھ دھویا۔ اس وقت وہاں مسور کی دال اور روٹی پلاؤ اور تورے کو
 مات کرتی تھے۔ اس پر مالی نے کیتھے کی چٹنی تیار کرا کے مہری کے ہاتھ بھجوا دی۔ اس وقت اس
 چٹنی نے وہ مزہ دیا کہ کوئی ثریا بیگم کی زبان سے سنے۔
 مولائی: مالی نے انعام کا کام کیا ہے اس وقت۔
 ثریا: اس میں کیا شک۔ پانچ روپے انعام دے دو۔

جب خدا خدا کر کے مینہ تھا اور چاندنی کھری تو ثریا بیگم نے مہری بھیجی کہ شاہ جی کا حکم
 ہو تو ہم حاضر ہوں۔ وہاں مہری نے کہا۔ ہاں، شوق سے آئے، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔
 ثریا بیگم نے آنکھیں بند کیں اور شاہ جی کے پاس گئیں۔ آزاد نے انھیں دیکھا تو دل کا
 عجب حال ہوا۔ ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔ ثریا بیگم گھبرائی کہ آج شاہ صاحب ٹھنڈی سانسیں
 کیوں لے رہے ہیں۔ آنکھیں کھول دیں تو سامنے آزاد کو بیٹھے دیکھا۔ پہلے سمجھیں کہ آنکھوں
 نے دھوکہ دیا، مگر قریب سے غور کر کے دیکھا تو شک دور ہو گیا۔

ادھر آزاد کی زبان بھی بند ہو گئی۔ لاکھ چاہا کہ دل کا حال کہہ سائیں، مگر زبان کھولنا
 محال ہو گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو پیار اور حسرت کی نظر سے دیکھا، مگر
 باتیں کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ ہاں آنکھوں پر دونوں میں سے کسی کو اختیار نہ تھا۔ دونوں کی
 آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ یکا یک ثریا بیگم وہاں سے اٹھ کر باہر چلی آئیں۔
 مولائی نے پوچھا: بیگم صاحب، آج اتنی جلدی کیوں کی؟

ثریا: یوں ہی۔

مولائی: آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟ شاہ صاحب سے کیا باتیں ہوئی؟

ثریا: کچھ نہیں بہن، شاہ صاحب کیا کہتے، جی ہی تو ہے۔

مولائی: ہاں، مگر خوشی اور رنج کے لیے کوئی سبب بھی تو ہوتا ہے۔

ثریا : بہن، ہم سے اس وقت سب نہ پوچھو۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔
 مولائی : اچھا، کچھ قطر بیوت کر کے کہہ دو۔

ثریا : بہن، بات ساری یہ ہے کہ اس وقت شاہ جی تک نے ہم سے چال کی۔ جی کچھ
 ہم نے اس وقت دیکھا، اس کے دیکھنے کی تمنا برسوں سے تھی، مگر اب آنکھیں پھر پھر کے
 دیکھنے کے سوا اور کیا ہے؟

مولائی : (ثریا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر) کیا آزاد مل گئے کیا؟

ثریا : چپ چپ! کوئی سن نہ لے۔

مولائی : آزاد اس وقت کہاں سے آ گئے۔ ہمیں بھی دکھا دو۔

ثریا : روکتا کون ہے۔ جا کے دیکھ لو۔

مولائی بیگم چلیں تو ثریا بیگم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ خبردار، میری طرف سے کوئی
 پیغام نہ کہنا۔

مولائی بیگم کچھ ہچکچاتی، کچھ جھجھکتی آکر آزاد سے بولیں۔ شاہ جی، کبھی اور بھی اس طرف
 آئے تھے۔

آزاد : ہم فقیروں کو کہیں آنے جانے سے کیا سروکار! جدھر موج ہوئی، چل دیے۔ دن
 کو سفر، رات کو خدا یاد، ہاں، غم ہے تو یہ کہ خدا کو پائیں۔

مولائی : سنو شاہ جی، آپ کی فقیری کو ہم خوب جانتے ہیں۔ یہ سب کانٹے آپ ہی
 کے بوئے ہوئے ہیں۔ اور اب آپ فقیر بن کر یہاں آئے ہیں۔ یہ بتلائیے کہ آپ نے
 انھیں جو اتنا پریشان کیا تو کس لیے؟ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟

آزاد : صاحب صاف تو یہ ہے کہ ہم ان سے فقط دو دو باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

مولائی : واہ، جب آنکھیں چار ہوئیں تب تو کچھ بولے نہیں، اور وہ باتیں ہوئی بھی تو
 نتیجہ کیا؟ ان کے مزاج کو تو آپ جانتے ہیں۔ ایک بار جس کی ہو گئیں، اس کی ہو گئیں۔

آزاد : اچھا، ایک نظر تو دکھا دو۔

مولائی : اب یہ ممکن نہیں۔ کیوں مفت میں اپنی جان کو ہلکان کر دو گے۔

آزاد : تو بالکل دھو ڈالیں؟ اچھا چلیے، باغ میں ذرا دور ہی سے دل کے پھسولے

پھوڑیں۔

مولائی : واہ واہ! جب باغ میں ہوں بھی۔
 آزاد : اچھا صاحب، لیجیے صبر کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔
 مولائی : میں جا کر کہتی ہوں، مگر امید نہیں کہ مانیں۔
 یہ کہہ کر مولائی بیگم انھیں اور رثیا بیگم کے پاس آکر بولیں۔ بہن، اللہ جانتا ہے، کتنا خوبصورت جوان ہے۔

رثیا : ہمارا ذکر بھی آیا تھا؟ کچھ کہتے تھے؟
 مولائی : تمہارے سوا اور ذکر ہی کس کا تھا؟ بے چارے بہت روتے تھے۔ ہماری ایک بات اس وقت مانو گی؟ کہوں؟

رثیا : کچھ معلوم تو ہو، کیا کہو گی؟
 مولائی : پہلے قول دو، پھر کہیں گے، یوں نہیں۔
 رثیا : واہ! بے سمجھے بوجھے قول کیسے دے دوں؟
 مولائی : ہماری اتنی خاطر بھی نہ کرو گی بہن!
 رثیا : اب کیا جانیں، تم کیا اول جلول باتیں کہو۔
 مولائی : ہم کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جس سے نقصان ہو۔
 رثیا : جو بات تمہارے دل میں ہے وہ میرے ناخون میں ہے۔
 مولائی : کیا کہنا ہے۔ آپ ایسی ہی ہیں۔
 رثیا : اچھا، اور سب باتیں مانیں گے سوا ایک بات کے۔
 مولائی : وہ ایک بات کون سی ہے، ہم سن تو لیں۔
 رثیا : جس طرح تم چھپاتی ہو اسی طرح ہم بھی چھپاتے ہیں۔
 مولائی : اللہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں، رو رہا ہے۔ مجھ سے ہاتھ جوڑ کر کہا ہے کہ جس طرح ممکن ہو، مجھ سے ملا دو۔ میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ نظر بھر کر دیکھ لوں۔
 رثیا : کیا مجال، خواب تک میں صورت نہ دکھاؤں۔

مولائی : مجھے بڑا ترس آتا ہے۔
 رثیا : دنیا کا بھی خیال ہے۔
 مولائی : دنیا سے ہمیں کیا کام؟ یہاں ایسا کون آتا جاتا ہے۔ ڈر کا ہے کا ہے، چل کے

ذرا دیکھ لو، اس کا ارمان تو کھل جائے۔

ثریا: نا، ممکن نہیں! اب یہاں سے چلوگی بھی یا نہیں؟

مولائی: ہم تو جب تک نہ چلیں گے، جب تک تم ہمارا کہنا نہ مانوگی۔

ثریا: سنو مولائی بیگم، ہر کام کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ تم کیا سوچی ہو؟

مولائی: ان کا دل خوش ہوگا۔ اس وقت وہ آپے میں نہیں ہیں، مگر جب اس معاملے پر غور کریں گے تو انہیں ضرور رنج ہوگا۔

دونوں پالیوں پر بیٹھ کر روانہ ہوئیں۔ آزاد نے مکان کی دیوار سے ثریا بیگم کو دیکھا اور شخصہی سانس لی۔

(108)

دوسرے دن آزاد یہاں سے رخصت ہو کر حسن آرا سے ملنے چلے۔ بات بات پر بائیس کھلی جاتی تھیں۔ دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ آج خدا نے وہ دن دکھایا کہ روس اور روم کی منزل پوری کر کے یار کے کوچے میں پہنچ۔ کہاں روس، کہاں ہندوستان! کہاں لڑائی کا میدان، کہاں حسن آرا کا مکان! دونوں لیڈیوں نے انہیں چھیڑنا شروع کیا۔

کلاریا: آج بھلا آزاد کے دماغ کا ہے کو ملیں گے۔

میڈا: اس وقت مارے خوشی کے انہیں بات کرنا بھی مشکل ہے۔

آزاد: بڑی مشکل ہے۔ بولوں تو آوازیں کسے جائیں۔

کلاریا: کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے؟ جس کے لیے دنیا بھر کی خاک چھانی، اس سے ملنے کا نشہ ہوا ہی چاہیے۔

کلاریا: آپ اتنے دن تک کہاں تھے خوبہ صاحب؟

خوبی: تھا کہاں، جہاں جاتا ہوں وہاں لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اتنی دعوتیں کھائیں کہ کیا کسی نے کھائی ہوں گی۔ ایک ایک دن میں دو دو سو بلاوے آ جاتے ہیں۔ اگر نہ جاؤں تو لوگ کہیں، غور کرتا ہے۔ جاؤں تو اتنا وقت کہاں! اسی ادھیڑ میں میں پڑا رہا۔

آزاد: اب کچھ ہمارے بھی کام آؤ گے۔

فوجی: اور دوڑا آیا کس لیے ہوں کہو حسن آرا کو بھی خبر ہوئی یا نہیں، نہ ہوئی ہو تو

پہنچوں۔ مجھ سے زیادہ اس کام کے لائق اور کسی کو نہ پاؤ گے۔ میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔
آزاد: اس میں کیا شک ہے بھائی جان! بے شک ہو۔

خوبی: تو پھر میں چلوں؟

آزاد: نکلی اور پوچھ پوچھ؟

خوبی جانے والے ہی تھے ایک آدمی ہوٹل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی شکل و صورت بالکل خوبی سے ملتی تھی۔ وہی نانا قد، وہی کالا رنگ، وہی ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ خوبی کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔

آزاد: واللہ، بالکل خوبی ہی ہیں۔

میڈا: بس، ان کو چھپاؤ، اُن کو دکھاؤ۔ اُن کو چھپاؤ، ان کو دکھاؤ۔ ذرا فرق نہیں۔

خوبی: تو کون ہے بے؟ کہاں چلا آتا ہے؟ کچھ بیدار تو نہیں ہے؟ تم جیسے مسخروں کا یہاں کیا کام؟

مسخرہ: کوئی ہم سے بد کے دیکھ لے۔ بڑا مرد ہو تو آ جائے۔

خوبی: کیا کہتا ہے؟ برس پڑوں؟

مسخرہ: جا، اپنا کام کر۔ جو گر جتا ہے، وہ برستا نہیں۔

خوبی: بچہ، تمہاری تقاضا میرے ہی ہاتھ سے ہے۔

مسخرہ: ماشے بھر کا آدمی، بولوں کے برابر قد اور چلا ہے مجھے لٹکانے!

خوبی: کوئی ہے؟ لانا تو چنڈو کی نگالی۔ لے آئے!

مسخرہ: ہم تو جہاں کھڑے تھے، وہیں کھڑے ہیں، شیر کہیں ہٹا کرتے ہیں۔ جے، سو

جے۔

خوبی: تقاضا کھیل رہی ہے تیری۔ میں اس کو کیا کروں۔ اب جو کچھ کہنا سنا ہو، کہہ سن لو، تھوڑی دیر میں لاش پھڑکتی ہوگی۔

مسخرہ: ذرا زبان سنبھالے ہوئے حضرت! ایسا نہ ہو، میں گردن پر سوار ہو جاؤں۔

ہوٹل میں جتنے آدمی تھے، ان کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ سبھی ان دونوں بولوں کی کشش دیکھنے کے لیے بے قرار تھے۔ دونوں کو چڑھانے لگے۔

ایک: بھئی، ہم سب تو خولجہ صاحب کی طرف ہیں۔

دوسرا: ہم بھی۔ یہ اس سے کہیں ٹھکڑے ہیں۔

تیسرا: کون؟ کہیں ہوں نہ! ان میں اور اس میں ہیں اور سولہ کا فرق ہے۔ بولو، کیا کیا بدتے ہیں۔

مسخرہ: ایک پلوٹے میں بول جائیے تو سہی۔ بات کرتے کرتے پکڑ لاؤں اور چٹکی بجاتے چت کروں، (چٹکی بجا کر) یوں یوں! خوبی: میں اتنی دیر نہیں لگانے کا۔

مسخرہ: ارے چپ بھی رہ! یہ منہ کھائے چلائی۔ ایک انگلی سے وہ بیچ باغیچوں کے ترپے لگا۔

لیا جس نے ہمارا نام، مارا بے گناہ اس کو
نشاں جس نے بتایا، بس، وہ تیروں کا نشانہ تھا
آزاد: بڑھ گئے خواجہ صاحب، یہ آپ سے بڑھ گئے۔ اب کوئی پھڑکتا ہوا شعر کہیے تو عزت رہے۔

خوبی: اجی، اس سے اچھا شعر لیجیے۔

ترپا نہ ذرا خنجر کے تلے
سر اپنی دیا شکوہ نہ کیا،
تھا پاس ادب جو قاتل کا
یہ بھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا

مسخرہ: لے، اب آ۔

خوبی: دیکھ، تیری قضا آگئی ہے۔

مسخرہ: ذرا سامنے آ۔ زمین میں سر کھونس دوں گا۔

خوبی: (تال ٹھوک کر) اب بھی کہا مان، نہ لڑ۔

مسخرہ: یا علی، مدد کر۔

قبر میں جن کو نہ سونا تھا، سلایا ان کو
پر مجھے چرخ ستم گر نے سونے نہ دیا
آزاد: بھئی خوبی، شاعری میں تم بالکل دب گئے۔

خوبی جواب دینے ہی والے تھے کہ اسنے میں مسخرے نے ان کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ قریب تھا کہ زمین پر دے چکے کہ میاں خوبی سنبھلے اور تھک کر مسخرے کی گردن میں دونوں ہاتھ ڈال کر بولے۔ بس، اب تم میرے!

مسخرہ: آج تجھے جیتا نہ چھوڑوں گا۔

خوبی: دیکھو، ہاتھ ٹوٹا تو ہاتھ کر دوں گا۔ کشتی میں ہاتھ پائی کیسی؟

مسخرہ: اپنی بڑھیا کو بلا لاؤ۔ کوئی لاش کو رونے والا تو ہو تمہاری!

خوبی: یا تو قتل ہی کریں گے یا قتل ہوں گے۔

مسخرہ: اور ہم قتل ہی کر کے چھوڑیں گے۔

خولجہ صاحب نے ایک انٹی بتائی تو مسخرہ گرا۔ ساتھ ہی خوبی بھی منہ کے بل زمین پر

آرہے۔ اب نہ یہ اٹھتے ہیں نہ وہ۔ نہ وہ ان کی گردن چھوڑتا ہے، نہ یہ اس کو چھوڑتے ہیں۔

مسخرہ: مار ڈال، مگر گردن نہ چھوڑوں گا۔

خوبی: تو گردن مروڑ ڈال، مگر میں ادھ مرا کر کے چھوڑوں گا۔ ہائے ہائے! گردن مٹی!

پسلیاں چرچہ بول رہی ہیں۔

مسخرہ: جو کچھ ہو سوسو، کچھ پرواہ نہیں ہے۔

خوبی: یہاں کس کو پرواہ ہے، کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔

اب کی خوبی نے گردن چھڑا لی، ادھر مسخرہ بھی نکل بھاگا۔ دونوں اپنی اپنی گردن

سہلانے لگے۔ یار لوگوں نے پھر فخرے چست کیے۔ بھئی، ہم تو خوبی کے دم کے قائل ہیں۔

دوسرا بولا: واہ! اگر کچی آدھ گھڑی اور کشتی رہتی تو وہ مار لیتا۔

تیسرے نے کہا: اچھا، پھر اب کی کسی۔ کسی کا دم تھوڑے ٹوٹا ہے۔

یار لوگ تو ان کو تیار کرتے تھے، مگر ان میں دم نہ تھا۔ آدھ کھینے تک دونوں ہانپا کیے، مگر

زبان چلی جاتی تھی۔

خوبی: ذرا اور دیر ہوتی تو پھر دل لگی دیکھتے۔

مسخرہ: ہاں، بے شک۔

خوبی: تقدیر تھی، فح گئے، ورنہ منہ بگاڑ دیتا۔

مسخرہ: اب تم اس فکر میں ہو کہ میں پھر اٹھوں۔

آزاد: بھئی، اب زیادہ بکھیرا مت بڑھاؤ۔ بہت ہو چکی۔

مسخرہ: حضور، میں بے نیچا دکھائے نہ مانوں گا۔

خوبی: (مسخرے کی گردن پکڑ کر) آؤ، دکھاؤ نیچا۔

مسخرہ: اے، تو گردن تو چھوڑ دے ہماری۔

خوبی: اب کی ہمارا داؤں ہے!

مسخرہ: (تھپڑ لگا کر) ایک دو۔

خوبی: (چپت دے کر) تین۔

مسخرہ: (گدا جما کر) چار پانچ۔

نقرے باز: سو تک گن جاؤ یوں ہی۔ ہاں، پانچ ہوئی۔

دوسرا: ایسے ایسے جوان اور پانچ ہی تک گن کے رہ گئے؟

خوبی: (چپت دے کر) چھ چھ، اور نہیں تو۔ لوگ بڑی دیر سے چھ کا انتظار کر رہے

تھے۔

اب کی وہ گھمسان لڑائی ہوئی کہ دونوں بے دم ہو کر گر پڑے اور رونے لگے۔

خوبی: اب موت قریب ہے۔ بھئی آزاد، ہماری قبر کسی پوتے کے کھیت کے قریب

بنوائے۔

مسخرہ: اور ہماری قبر شاہ فصیح کے بچے میں بنوائی جائے جہاں ہمارے والد خواجہ ولیگ

دفن ہیں۔

خوبی: کون کون؟ ان کے والد کا کیا نام تھا؟

آزاد: خواجہ ولیگ کہتے ہیں۔

خوبی: (رو کر) ارے بھائی، ہمیں پہچانا؟ مگر ہماری تمھاری یوں ہی بدی تھی۔

مسخرے نے جوان کا نام سنا تو سر پیٹ لیا۔ بھئی، یہ کیا غضب ہوا! سگا بھائی لگے

بھائی کو مارے؟

دونوں بھائی گلے مل کر روئے۔ بڑے بھائی نے اپنا نام میان رئیس بتلایا۔ بولے۔ بیٹا،

تم مجھ سے کوئی بیس برس چھوٹے ہو۔ تم نے والد کو اچھی طرح سے نہیں دیکھا تھا۔ بڑی

خوبیوں کے آدمی تھے۔ ہم کو روز دوکان پر لے جایا کرتے تھے۔

آزاد: کاہے کی دوکان بھی حضرت؟
 رئیس: جی، ہال تھی۔ لکڑیاں بیچتے تھے۔
 خوبی نے بھائی کی طرف گھور کر دیکھا۔
 رئیس: کچھ دن کپڑوں میں صاحب لوگوں کے یہاں خانساں رہے تھے۔
 خوبی نے بھائی کی طرف دیکھ کر دانت پیسا۔

آزاد: بس حضرت، قلعی کھل گئی۔ ابا جان خانساں تھے اور آپ رئیس بنتے ہیں۔
 آزاد چلے گئے تو دونوں بھائیوں میں خوب تکرار ہوئی۔ مگر تھوڑے ہی دیر میں میل ہو گیا اور دونوں بھائی ساتھ ساتھ شہر کی سیر کو گئے۔ ادھر ادھر مڑمڑت کر کے میاں رئیس تو اپنے اڈے پر گئے اور خوبی حسن آرا بیگم کے مکان پر جا پہنچے۔ بوڑھے میاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

خوبی: آداب عرض ہے۔ پہچانا یا بھول گئے؟
 بوڑھے میاں: بندگی عرض۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔
 خوبی: تم بھلا ہمیں کیوں پہچانو گے۔ تمہاری آنکھ میں تو چربی چھائی ہوئی ہے۔
 بوڑھے میاں: آپ تو کچھ عجب پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ جان نہ پہچان، تیوریاں بدلنے لگے۔

خوبی: اجی، ہم تو سنائیں بادشاہ کو، تم کیا مال ہو۔
 بوڑھے میاں: اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟
 خوبی: کوئی محل سرا میں حسن آرا بیگم کو اطلاع دو کہ مسافر آئے ہیں۔
 بوڑھے میاں: (کھڑے ہو کر) خواہ خواجہ صاحب تو نہیں ہیں آپ! معاف کیجیے گا۔
 آئیے گلے مل لیں۔

بوڑھے میاں نے آدمی کو حکم دیا کہ حقہ بھر دو، اور اندر جا کر بولے۔ لو صاحب، خوبی داخل ہو گئے۔

چاروں بینیں باغ میں گئیں اور چتی کی آڑ سے خوبی کو دیکھنے لگیں۔
 نازک ادا: او ہو! کیا گراں ذیل جوان ہے۔
 جانی: اللہ جانتا ہے، ایسا جوان نہیں دیکھنے میں آیا تھا۔ اونٹ کی تو کوئی کل شاید درست

بھی ہو، اس کی کوئی کل درست نہیں۔ ہنسی آتی ہے۔
 خوجی ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے۔ اتنے میں بوڑھے میاں آ گئے۔

خوجی: حضرت، اس مکان کی عجیب خاصیت ہے۔
 بوڑھے میاں: کیا کیا؟ اس مکان میں کوئی نئی بات آپ نے دیکھی ہے؟
 خوجی: آوازیں آتی ہیں۔ میں بیٹھا ہوا تھا، ایک آواز آئی، پھر دوسری آواز آئی۔
 بوڑھے میاں: آپ کیا فرماتے ہیں، ہم نے تو کوئی بات ایسی نہیں دیکھی۔
 جانی بیگم کی رنگ رنگ میں شوفی بھری ہوئی تھی۔ خوجی کو بنانے کی ایک ترکیب سوجھی۔
 بولیں۔ ایک بات ہمیں سوجھی ہے۔ ابھی ہم کسی سے کہیں گے نہیں۔
 بہار بیگم: ہم سے تو کہہ دو۔

جانی نے بہار بیگم کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔
 بہار: کیا حرج ہے، بوڑھا ہی تو ہے۔
 سپر آرا: آخر کچھ کہو تو باجی جان! ہم سے کہنے میں کچھ حرج ہے؟
 بہار: جانی بیگم کہہ دیں تو بتا دوں۔
 جانی: نہیں، کسی سے نہ کہو۔

جانی بیگم اور بہار بیگم دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ یہاں ان سب کو حیرت ہو رہی تھی کہ یا خدا! ان سب کو کون ترکیب سوجھی ہے، جو اتنا چھپا رہی ہیں۔ اپنی اپنی عقل دوڑانے لگیں۔

نازک: ہم سمجھ گئے۔ انہی آدمی ہے۔ اس کی ڈیبا چرانے کی فکر ہوگی۔
 حسن آرا: یہ بات نہیں، اس میں چوری کیا تھی؟

اتنے میں بہار بیگم نے آکر کہا۔ چلو، باغ میں چل کر بیٹھیں۔ خوبصورت صاحب پہلے ہی باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکا یک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گہرو جوان سامنے سے اٹھتا اکڑتا چلا آتا ہے۔ ابھی میس بھی نہیں بیٹھیں۔ جالی لوٹ کا کرتا، اس پر شرابی کا کٹاؤ دار انگرکھا، سر پر بانگی پکیہ اور ہاتھ میں کٹار۔

حسن آرا: یہ کون ہے اللہ؟ ذرا پوچھنا تو۔

سہر آرا: افوہ! باجی جان، پچھانوں تو بھلا۔

حسن آرا: ارے! بڑا دھوکا دیا۔

نازک: سچ سچ! بے شک بڑا دھوکا دیا! افوہ!

سہر آرا: میں تو پہلے سمجھی ہی نہ تھی کچھ۔

اتنے میں وہ جوان خوبی کے قریب آیا تو وہ چکرائے کہ اس باغ میں اس کا گزر کیسے ہوا۔ اس کی طرف تاک ہی رہے تھے کہ بہار بیگم نے غل مچا کر کہا۔ اے! یہ کون مردوا باغ میں آگیا۔ خواجہ صاحب، تم بیٹھے دیکھ رہے ہو اور یہ لونڈا بھیت چلا آتا ہے۔ اسے نکال کیوں نہیں دیتے؟

خوبی: اجی حضرت، آخر آپ کون صاحب ہیں؟ پرائے زمانے میں گھسے جاتے ہو، یہ ماجرا کیا ہے؟

جوان: کچھ تمھاری شامت تو نہیں آئی ہے؟ چپ چاپ بیٹھے رہو۔

خوبی: سنے صاحب، ہم اور آپ دونوں ایک ہی پیشے کے آدمی ہیں۔

جوان: (بات کاٹ کر) ہم نے کہہ دیا، چپ رہو، ورنہ ابھی سراڑا دوں گا۔ ہم حسن آرا بیگم کے عاشق ہیں۔ سنا ہے کہ آزاد یہاں ہیں، اور حسن آرا کے پاس نکاح کا پیغام بھیجنے والے ہیں۔ بس، اب یہی دھن ہے کہ ان سے دو دو ہاتھ چل جائے۔

خوبی: آزاد کا مقابلہ تم کیا خاک کرو گے۔ اس نے لڑائیاں سر کی ہیں۔ تم ابھی لونڈے

ہو۔

جوان: تو بھی تو انھیں کا ساتھی ہے۔ کیوں نہ پہلے تیرا ہی کام تمام کر دوں۔

خوبی: (چینترے بدل کر) ہم کسی سے دبنے والے نہیں ہیں۔

جوان: آج ہی کا دن تیری موت کا تھا۔

خوبی: (بیچھے ہٹ کر) ابھی کسی مرد سے پالائیں پڑا ہے۔

جوان: کیوں ناحق غصہ دلاتا ہے۔ اچھا، لے سنبھال۔

جوان نے تلوار گھمائی تو خوبی گھبرا کر بیچھے ہٹے اور گر پڑے۔ بس کربولی کی یاد کرنے لگے۔ عورتیں تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگیں۔

جوان: بس، اسی برتے پر پھولا تھا۔

خوجی: اجی، میں اپنے ذم میں آپ آ رہا۔ ابھی تو قیامت برپا کر دوں۔

جوان: چا کر آزاد سے کہنا کہ ہوشیار رہیں۔

خوجی: بہتوں کا ارمان نکل گیا۔ ان کی صورت دیکھ لو، تو بخار آ جائے۔

جوان: اچھا، کل دیکھوں گا۔

یہ کہہ کر اس نے بہار بیگم کا ہاتھ پکڑا اور بے دھڑک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ چاروں بہنیں بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر چلی گئیں۔

خوجی یہاں سے چلے تو دل میں سوچتے جاتے تھے کہ آزاد سے چل کر کہتا ہوں، حسن آرا کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر ہانک لگاتے تھے، گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ اتفاق سے راستے میں اسی ہوٹل کا خانساں مل گیا، جہاں آزاد ٹہرے تھے۔ بولا۔ ارے بھائی! اس وقت کہاں لپکے ہوئے جاتے ہو؟ خیر تو ہے؟ آج تو آپ غریبوں سے بات ہی نہیں کرتے۔

خوجی: گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

خانساں: بھئی واہ! ساری دنیا گھوم آئے، مگر کینڈا وہیں ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ آدی بن کر آئے ہوں گے۔

خوجی: تم جیسوں سے باتیں کرنا ہماری شان سے خلاف ہے۔

خانساں: ہم دیکھتے ہیں، وہاں سے تم اور بھی گاؤدی ہو کر آئے ہو۔

تھوڑی دیر میں آپ گرتے پڑتے ہوٹل میں داخل ہوئے اور آزاد کو دیکھتے ہی منہ بنا کر سامنے کھڑے ہو گئے۔

آزاد: کیا خبر لائے؟

خوجی: (کرولی کو دائیں ہاتھ سے بائے ہاتھ میں لا کر) ہوں!!

آزاد: ارے بھائی، گئے تھے وہاں؟

خوجی: (کرولی کو بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں لے کر) ہوں!!

آزاد: ارے، کچھ منہ سے بولو بھی تو میاں!

خوجی: گھری دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد: کیا؟ کچھ منک تو نہیں گئے! میں پوچھتا ہوں، حسن آرا بیگم کے یہاں گئے تھے؟

کسی سے ملاقات ہوئی؟ کیا رنگ ڈھنگ ہے؟
 خوجی: وہاں نہیں گئے تھے کیا جہنم میں گئے تھے؟ مگر کچھ دال میں کالا ہے۔
 آزاد: بھائی صاحب، ہم نہیں سمجھے۔ صاف صاف کہو، کیا بات ہوئی؟ کیوں الجھن میں ڈالتے ہو۔

خوجی: اب وہاں آپ کی دال نہیں گلنے کی۔
 آزاد: کیا؟ کیسی دال؟ یہ بکتے کیا ہو؟
 خوجی: بکتا نہیں، سچ کہتا ہوں۔
 آزاد: خوجی، اگر صاف صاف نہ بیان کرو گے تو اس وقت بری ٹھہرے گی۔
 خوجی: اگلے مجھی کو ڈانٹتے ہو۔ میں نے کیا بگاڑا؟
 آزاد: وہاں کا مفصل حال کیوں نہیں بیان کرتے؟
 خوجی: تو جناب صاف صاف یہ ہے کہ حسن آرا کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں باغ کے جنگلے میں بیٹھی تھیں کہ ایک جوان اندر آ پہنچا اور مجھے دیکھتے ہی غصے سے لال ہو گیا۔
 آزاد: کوئی خوبصورت آدمی ہے؟
 خوجی: نہایت حسین، اور کسن۔
 آزاد: اس میں کچھ بعید ہے ضرور۔ قصصیں آلو بنانے کے لیے شاید دل لگی کی ہو۔ مگر ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔
 خوجی: یقین تو ہمیں بھی مرتے دم تک نہیں آتا، مگر وہاں تو اسے دیکھتے ہی قہقہے پڑنے لگے۔

اب ادھر کا حال سنئے۔ سپہر آرا نے کہا۔ اب دل لگی ہو نہ کہ وہ جا کر آزاد سے قصہ کہے۔
 حسن آرا: آزاد ایسے کچے نہیں ہیں۔

سپہر آرا: خدا جانے، وہ سڑی وہاں جا کر کیا کہے۔ آزاد کو چاہے پہلے یقین نہ آئے، لیکن جب وہ قسمیں کھا کر کہنے لگے گا تو ان کو ضرور شک ہو جائے گا۔
 حسن آرا: ہاں، شک ہو سکتا ہے، مگر کیا کیا جائے۔ کیوں نہ کسی کو بھیج کر خوجی کو ہوٹل

سے بلواؤ۔ جو آدمی بلانے جائے وہ ہنسی ہنسی میں آزاد سے یہ بات کہہ دے۔
 حسن آرا کی صلاح سے بوڑھے میاں آزاد کے پاس پہنچے، اور بڑے تپاک سے ملنے
 کے بعد بولے۔ وہ آپ کے میاں خوبی کہاں ہیں؟ ذرا ان کو بلوایئے۔
 آزاد: آپ کے یہاں سے جو آئے تو غصے میں بھرے ہوئے۔ اب مجھ سے بات ہی
 نہیں کرتے۔

بوڑھے میاں: وہ تو آج خوب ہی بنائے گئے۔
 بوڑھے میاں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ آزاد سن کر خوب ہنسے اور خوبی کو بلا کر ان
 کے سامنے ہی بوڑھے میاں سے بولے۔ کیوں صاحب آپ کے یہاں یہ کیا دستور ہے کہ
 کٹار بازوں کو بلا بلا کر شریفوں سے بھڑواتے ہیں۔
 بوڑھے میاں: خوبصورت صاحب کو آج خدا ہی نے بچایا۔
 آزاد: مگر یہ تو ہم سے کہتے تھے کہ وہ جوان بہت دہلا پتلا آدمی ہے۔ ان سے اس
 سے اگر چلتی تو یہ اس کو ضرور نیچا دکھاتے۔

خوبی: اجی، کیسا نیچا دکھانا؟ وہ تلووار چلانا کیا جانے!
 آزاد: آج اس کو بلوائے، تو ان سے مقابلہ ہو جائے۔
 خوبی: ہمارے نزدیک اسے بلوانا فضول ہے۔ مفت کی ٹھائے ٹھائے سے کیا فائدہ
 ہے۔ ہاں، اگر آپ لوگ اس بے چارے کی جان کے دشمن ہوئے ہیں تو بلوا لیجیے۔
 یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میرا نے آکر کہا۔ حضور، ایک گاڑی پر عورتیں آئی ہیں۔
 ایک خدمت گار نے، جو گاڑی کے ساتھ ہے، حضور کا نام لیا اور کہا کہ ذرا یہاں تک چلے
 آئیں۔

آزاد کو حیرت ہوئی کہ عورتیں کہاں سے آگئیں۔ خوبی کو بھیجا کہ جاکر دیکھو۔ خوبی
 اکڑتے ہوئے سامنے پہنچے، مگر گاڑی سے دس قدم الگ۔
 خدمت گار: حضرت، ذرا سامنے یہاں تک آئیے۔
 خوبی: او گیدی، خبردار جو بولا!
 خدمت گار: ایں، کچھ سک گئے ہو گیا؟
 میرا: گاڑی کے پاس کیوں نہیں جاتے بھائی! دور کیوں کھڑے ہو؟

خوجی: (کردلی تول کر) بس خبردار!

بیرا: ایں! تم کو ہوا کیا ہے! جاتے کیوں نہیں سامنے؟

خوجی: چپ رہو جی۔ جانو نہ بوجھو، آئے وہاں سے۔ کیا میری جان فالتو ہے، جو گاڑی کے سامنے جاؤں۔

اتفاق سے آزاد نے بے نگہی ہانک سن لی۔ فوراً باہر آئے کہ کہیں کسی سے لڑ نہ پڑیں۔ خوجی سے پوچھا۔ کیوں صاحب، یہ آپ کس پر بگڑ رہے ہیں؟ جواب ندارد۔ وہاں سے جھپٹ کر آزاد کے پاس آئے اور کردلی گھماتے ہوئے پیئترے بدلنے لگے۔ آزاد: کچھ منہ سے تو کہو۔ خود بھی ذلیل ہوتے ہو اور مجھے بھی ذلیل کرتے ہو۔

خوجی: (گاڑی کی طرف اشارہ کر کے) اب کیا ہوگا؟

خدمت گار: حضور، انھوں نے آتے ہی پیئتر بدلایا، اور یہ کاٹھکا کھلونا نچانا شروع کیا۔ نہ میری سنتے ہیں، نہ اپنی کہتے ہیں۔

خوجی: (آزاد کے کان میں) میاں، اس گاڑی میں عورتیں نہیں ہیں۔ وہی لوڈا تم سے لڑنے آیا ہوگا۔

آزاد: یہ کیسے، آپ کے دل میں یہ بات جی ہوئی تھی۔ آپ میرے ساتھ بہت ہمدردی نہ کیجیے، الگ جا کے بیٹھیے۔

مگر خوجی کے دل میں کھپ گئی تھی کہ اس گاڑی میں وہی جوان چھپ کر آیا ہے۔ انھوں نے رونا شروع کیا۔ اب آزاد لاکھ لاکھ سمجھاتے ہیں کہ دیکھو، ہوٹل کے اور مسافروں کو برا معلوم ہوگا، مگر خوجی چپ ہی نہیں ہوتے۔ آخر آپ نے کہا۔ جو لوگ اس پر سوار ہوں، وہ اتر آئیں۔ پہلے میں دیکھ لوں، پھر آپ چائیں۔ آزاد نے خدمت گار سے کہا۔ بھائی، اگر وہ لوگ منظور کریں تو یہ بوڑھا آدمی جھانک کر دیکھ لے۔ اس سڑی کو شک ہوا ہے کہ اس میں کوئی اور بیٹھا ہے۔ خدمت گار نے جا کر پوچھا، اور بولا۔ سرکار کہتی ہیں، ہاں، منظور ہے۔ چلے، مگر دور ہی سے جھانکیے گا۔

خوجی: (سب سے رخصت ہو کر) لو یارو، اب آخری سلام ہے۔ آزاد، خدا تم کو دونوں جہان میں سرخو رکھے۔

چھٹتا ہے مقام، کوچ کرتا ہوں میں،

رضت اے زندگی کہ مرنا ہوں میں۔
 اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری،
 اوپر کے دم اس واسطے بھرتا ہوں میں۔

خدمت گار: اب آخر مرنے نو جاتے ہی ہو، ذرا قدم بڑھاتے نہ چلو۔ جیسے اب
 مرے، ویسے آدھ گھڑی کے بعد۔

آزاد: کیوں مردے کو پھیرتے ہو گی۔

گنجی سے ہنسی سے آوازیں آرہی تھیں۔ خوبی آنکھوں میں آنسو بھرے چلے جا رہے تھے
 کہ ان کے بھائی نظر پڑے۔ ان کو دیکھتے ہی خوبی نے ہانک لگائی۔ آجئے بھائی صاحب!
 آخری وقت آپ سے خوب ملاقات ہوئی۔

رئیس: خیر تو ہے بھائی! کیا اکیلے ہی چلے جاؤ گے؟ مجھے کس کے بھروسے چھوڑے
 جاتے ہو؟

خوبی بھائی کے گلے مل کر رونے لگے۔ جب دونوں گلے مل کر خوب رو چکے تو خوبی
 نے گاڑی کے پاس جا کر خدمت گار سے کہا۔ کھول دیں۔ جیوں ہی گردن اندر ڈالی تو دیکھا،
 عورتیں بیٹھی ہیں۔ ان کا سر جیوں ہی اندر پہنچا، انھوں نے ان کی گھڑی اتار کر دو چھتیں لگا
 دیں۔ خوبی کی جان میں جان آئی۔ ہنس دیے۔ آکر آزاد سے بولے۔ اب آپ جائیں، کچھ
 مضافتہ نہیں ہے۔ آزاد نے ہونٹ کے آدمیوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور ان عورتوں سے باتیں
 کرنے لگے۔

آزاد: آپ کون صاحب ہیں؟

گنجی میں سے آواز آئی۔ آدی ہیں صاحب! سنا کہ آپ آئے ہیں، تو دیکھنے چلے آئے۔
 اس طرح ملنا برا تو ضرور ہے، مگر دل نے نہ مانا۔

آزاد: اب اتنی عنایت کی ہے تو اب نقاب دور کیجیے اور میرے کمرے تک آئیے۔

آواز: اچھا، پیٹ سے پاؤں نکالے! ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔

آزاد: اگر آپ نہ آئیں گی تو میری دل کھنی ہوگی۔ اتنا سمجھ لیجیے۔

آواز: اے، ہاں! خوب یاد آیا۔ وہ جو دو لیڈیاں آپ کے ساتھ آئی ہیں، وہ کہاں
 ہیں؟ پردہ بکرا دو تو ہم ان سے ملیں۔

آزاد: بہت اچھا، لیکن میں رہوں یا نہ رہوں؟

آواز: آپ سے کیا پردہ ہے۔

آزاد نے پردہ کرا دیا۔ دونوں عورتیں گاڑی سے اتر پڑیں اور کمرے میں آئیں۔ مسوں نے ان سے ہاتھ ملایا، مگر باتیں کیا ہوئیں۔ مسیں اردو کیا جانیں اور بیگمؤں کو فرانسیسی زبان سے کیا مطلب۔ کچھ دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد ان میں سے ایک نے، جو بہت ہی حسین اور شوخ تھی، آزاد سے کہا۔ بھئی، یہاں بیٹھے بیٹھے تو دم گھٹتا ہے۔ اگر پردہ ہو سکے تو چلے، باغ کی سیر کریں۔

آزاد: یہاں تو ایسا کوئی باغ نہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ آپ سے پہلے کب ملاقات ہوئی۔

حسینہ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ہاں صاحب، آپ کو کیوں یاد آئے گا! آپ ہم غریبوں کو کیوں یاد کرنے لگے۔ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں، جہاں کوئی غیر نہ ہو۔ یہاں تو کچھ کہتے سنتے نہیں بنتا۔ چلے، کسی دوسرے کمرے میں چلیں۔

آزاد کو ایک اجنبی عورت کے ساتھ دوسرے کمرے میں جاتے شرم تو آتی تھی، مگر یہ سمجھ کر کہ اسے شاید کوئی پردے کی بات کہنی ہوگی، اسے دوسرے کمرے میں لے گئے اور پوچھا۔ مجھے آپ کا حال سننے کی بڑی تمنا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔ آپ نے مجھے کہا دیکھا تھا؟

آزاد: تم مجھے بے وفا چاہے کہہ لو، پر میری یاد اس وقت دھوکا دے رہی ہے۔

عورت: ہائے افسوس! ایسا ظالم نہیں دیکھا۔

نہ کیوں کر دم نکل جائے کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر

تیرا مسکرانہ کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

آزاد: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

عورت: دل چھین کے باتیں بناتے ہو؟ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ایک بوسہ تو لے لو۔

آزاد: یہ میری عادت نہیں۔

عورت: ہائے! دل سا گھرتو نے عادت کر دیا، اور اب کہتا ہے، یہ میری عادت نہیں۔

آزاد: اب مجھے فرصت نہیں ہے، پھر کسی روز آئیے گا۔

عورت : اچھا، اب کب طو گے؟

آزاد : اب آپ تکلیف نہ کیجیے گا۔

یہ کہتے ہوئے آزاد اس کمرے سے نکل آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ عورت بھی باہر نکل۔ دونوں لینڈیوں نے اسے دیکھ کر کٹ گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، چولی مسکی ہوئی۔ اس عورت نے آتے ہی آزاد کو کوسنا شروع کیا۔ تم لوگ گواہ رہنا۔ یہ مجھے الگ کمرے میں لے گئے اور ایک گھنٹے کے بعد مجھے چھوڑا۔ میری جو حالت ہے، آپ لوگ دیکھ رہی ہیں۔

آزاد : خیریت اسی میں ہے کہ آپ جائیے۔

عورت : اب میں جاؤں! اب کس کی ہو کے رہوں گی؟

کلاریسا : (فرانسیسی میں) یہ کیا ماجرا ہے آزاد :

آزاد : کوئی چٹھی ہوئی عورت ہے۔

آزاد کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے کہ اچھے گھریا نہ دیا اور وہ چمک کر یہی کہتی تھی۔

اچھا تمہیں قسم کھاؤ کہ تم میرے ساتھ اکیلے کمرے میں تھے یا نہیں؟

آزاد : اب ذلیل ہو کر یہاں سے جاؤ گی تم۔ عجیب مصیبت میں جان پڑی

عورت : اے ہے، اب مصیبت یاد آئی! پہلے کیا سمجھتے تھے؟

آزاد : بس، اب زیادہ نہ بڑھنا۔

عورت : گاڑی وان سے کہو۔ گاڑی برآمدے میں لائے۔

آزاد : ہاں، خدا کے لیے تم یہاں سے جاؤ۔

عورت : جاتی تو ہوں مگر دیکھو کیا ہوتا ہے۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو خوجی نے اندر آکر پوچھا۔ ان سے تمہاری کب کی جان

پچچان تھی؟

آزاد : ارے بھائی، آج تو غضب ہو گیا۔

خوجی : منع تو کرتا تھا کہ ان سے دور رہو، مگر آپ سنتے کس کی ہیں۔

آزاد : جھوٹ بکتے ہو۔ تم نے کہہ دیا تھا کہ آپ جائیں، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اور

اب نکلے جاتے ہو۔

خوجی : اچھا صاحب، مجھی سے فطلی ہوئی۔ میں نے گاڑی وان کو چکمہ دے کر سارا حال معلوم کر لیا۔ یہ دونوں کندن کی چھوکریاں ہیں۔ اب یہ سارے شہر میں مشہور کریں گی کہ آزاد کا نام سے نکاح ہونے والا ہے۔

آزاد : اس وقت ہمیں بڑی الجھن ہے بھائی ! کوئی تدبیر سوچو۔

خوجی : تدبیر تو یہی ہے کہ میں کندن کے پاس جاؤں اور اسے سمجھا بجا کر دھرے پر

لاؤں۔

آزاد : تو پھر دیر نہ کیجیے۔ عمر بھر آپ کا احسان مانوں گا۔

خوجی تو ادھر روانہ ہوئے۔ اب آزاد نے دونوں لیڈیوں کی طرف دیکھا تو دونوں کے چہرے غصے سے تھمٹائے ہوئے تھے۔ کلاریا ایک نادل پڑھ رہی تھی اور معیذا سر جھکائے ہوئے تھی۔ ان دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ عورت یا تو آزاد کی بیگم بنی ہوئی ہے یا آشتا۔ اگر جان پہچان نہ ہوتی تو اس کمرے میں جا کر بیٹھنے کی دونوں میں سے ایک کو بھی ہمت نہ ہوتی۔ تھوڑی دیر تک بالکل سناٹا رہا، آخر آزاد نے خود ہی اپنی صفائی دینی شروع کی۔ بولے۔ کسی نے سچ کہا ہے، نہ کرو تو ڈر، نہ کرو تو ڈر میں نے اس عورت کی آج تک صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ سمجھا کہ کوئی شریف زادی مجھ سے ملے آئی ہوگی۔ مگر ایسی مکار اور بے شرم عورت میری نظر سے نہیں گزری۔

دونوں لیڈیوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ آزاد ہمیں چکمہ دے رہے ہیں۔ اب تو آزاد کے رہے ہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ کچھ دیر تک تو ضبط کیا مگر نہ رہا گیا۔ بولے۔ مس معیذا، تم نے اس ملک کی مکار عورتیں ابھی نہیں دیکھیں۔

معیذا : مجھے ان باتوں سے کیا سروکار ہے۔

آزاد : اس کی شرارت دیکھی؟

معیذا : میرا دھیان اس وقت ادھر نہ تھا۔

آزاد : مس کلاریا، تم کچھ سمجھی یا نہیں۔

کلاریا : میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔

آزاد : مجھ سا حق بھی کم ہوگا۔ ساری دنیا سے آکر یہاں چرکا کھا گیا۔

معیذا : اپنے کیے کا کیا علاج، جیسا کیا، ویسا بھگتو۔

آزاد: ہاں، یہی تو چاہتا تھا کہ کچھ کہو تو سہی۔ میڈا، سچ کہتا ہوں، جو کبھی پہلے اس کی صورت بھی دیکھی ہو۔ مگر اس نے وہ داؤں بیچ کیا کہ بالکل احمق بن گئے۔

میڈا: اگر ایسا تھا تو اسے الگ کمرے میں کیوں لے گئے؟

آزاد: اسی غلطی کا تو رونا ہے۔ میں کیا جانتا تھا کہ وہ یہ رنگ لائے گی۔

میڈا: یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب آگے کے لیے کیا فکر کی ہے؟ اس کی بات چیت سے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور نالش کرے گی۔

آزاد: اسی کا تو مجھے بھی خوف ہے۔ خوبی کو بھیجا ہے کہ جا کر اسے دھمکائیں۔ دیکھو، کیا کر کے آتے ہیں۔

ادھر خوبی گرتے پڑتے کندن کے گھر پہنچے، تو دو تین عورتوں کو کچھ باتیں کرتے سنا۔ کان لگا کر سننے لگے۔

’بیٹا‘ تم تو سمجھتی ہی نہیں ہو، بدنامی کتنی بڑی ہے۔‘

’تو اماں جان، بدنامی کا ایسا ہی ڈر ہو تو کبھی دب جایا کریں؟‘

’دبے ہی ہیں۔ اس فوجی افسر سے نہیں کھڑے کھڑے گنوا لیے؟‘

’اچھا اماں جان، تمہیں اختیار ہے، مگر نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔‘

خوبی سے اب نہ رہا گیا۔ بھٹکا کر بولے۔ او گیدی، نکل تو آ۔ دیکھ تو کتنی کرو لیا بھونکتا ہوں۔ بڑھ بڑھ کر باتیں بناتی ہے۔ نالش کرے گی، اور بدنام کرے گی۔

کندن نے یہ آواز سنی تو کھڑکی سے جھانکا۔ دیکھا، تو ایک ٹھکانا سا آدمی پینٹرے بدل رہا ہے۔ مہری سے کہا کہ دروازہ کھول کر بلا لو۔ مہری نے آکر کہا۔ کون صاحب ہیں؟ آئیے۔

خوبی اکڑتے ہوئے اندر گئے اور ایک موڑے پر بیٹھے۔ بیٹھنا تھا کہ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔ عورتیں ہنسنے لگیں۔ خیر، آپ سنبھل کر دوسرے موڑے پر بیٹھے اور کچھ بولنا ہی چاہتے

تھے کہ کندن سامنے آئی اور آتے ہی خوبی کو ایک دھمکا دے کر بولی۔ چولہے میں جائے ایسے میاں۔ برسوں بعد آج صورت دکھائی تو مجھیں بدل کر آیا۔ گھوڑے، تیرا جنازہ نکلے۔ تو

اب تک/تھا کہاں؟

خوبی: یہ دل لگی ہم کو پسند نہیں۔

کندن: (دھپ لگا کر) تو شادی کیا سمجھ کر کی تھی؟

شادی کا نام سن کر خوبی کی بانجھیں کھل گئیں۔ سمجھے کہ مفت میں عورت ہاتھ آئی۔
بولے۔ تو شادی اس لیے کی تھی کہ جوتیاں کھائیں؟

کندن: آخر، تو اتنے دن تھا کہاں؟ لا، کیا کما کر لایا ہے۔

یہ کہہ کر کندن نے ان کی جیب ٹٹولی تو تین روپے اور کچھ پیسے نکلے۔ وہ نکال لیے۔ وہ
بے چارہاں ہاں کرتے ہی رہے کہ سبھوں نے انھیں گھر سے نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ خوبی
وہاں سے بھاگے اور روٹی صورت بنائے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوئے۔

آزاد نے پوچھا۔ کہوں بھائی، کیا کر آئے؟ ایں! تو تم پٹے ہوئے سے جان پڑتے ہو۔
خوبی: ذرا دم لینے دو۔ معاملہ بہت نازک ہے۔ تم تو پھنسے ہی تھے، میں بھی پھنس گیا۔
اس صورت کا برا ہو، جہاں جاتا ہوں وہیں چاہنے والے نکل آتے ہیں۔ ایک پنڈت نے کہا
تھا کہ تمہارے پاس موٹی ہے۔ اس وقت تو اس کی بات مجھے کچھ نہ چچی، مگر اب دیکھتا ہوں تو
اس نے بالکل سچ کہا تھا۔

آزاد: تم تو ہوسری۔ ایسے ہی تو بڑے حسین ہو۔ میری بابت بھی کندن سے کچھ بات
چیت ہوئی یا آنکھیں ہی سینکتے رہے؟

خوبی: بڑے گھر کی تیاری کر رکھو۔ بندہ وہاں بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔

آزاد: باز آئے آپ کے ساتھ سے۔ تمہیں کھانا پلانا سب اکارت گیا۔ بہتر ہے، تم
کہیں چلے جاؤ۔

اس پر خوبی بہت گبڑے۔ بولے۔ ہاں صاحب، کام نکل گیا نا؟ اب تو مجھ سے برا کوئی
نہ ہوگا۔

خانساں: کیا ہے خواجہ جی، کیوں گبڑ گئے؟

خوبی: تو چپ رہ قلی، خواجہ جی! اور سنے گا؟

خانساں: میں نے تو آپ کی عزت کی تھی۔

خوبی: نہیں، آپ معاف کیجیے۔ کیا خوب۔ مکے کا آدمی اور ہم سے اس طرح پریش
آئے۔ مگر تم کیا کرو گے بھائی، ہمارا نصیب ہی پھرا ہوا ہے۔ خیر، جو چاہو، سناؤ۔ اب ہم یہاں
سے کوچ کرتے ہیں۔ جہاں ہمارے قدرداں ہیں، وہاں جائیں گے۔

خانساں: یہاں سے بڑھ کر آپ کا کون قدرداں ہوگا؟ کھانا آپ کو دیں، کپڑا آپ کو

دیں، اس پر دوست بنا کر رکھیں، پھر اب اور کیا چاہیے۔

خوبی: سچ ہے بھائی، سچ ہے۔ ہم آزاد کے غلام تو ہیں ہی۔ انھیں سے قسم لو کہ ان کے باپ دادا ہمارے بزرگوں کے گلے کھا کر پلے تھے یا نہیں۔

آزاد: آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔ ذرا ادھر دیکھیے گا۔

خوبی: سوسنار کی، تو ایک لوہار کی۔

آزاد: ہمارے باپ دادا آپ کے گلے خورے تھے؟

خوبی: جی ہاں، کیا اس میں کچھ شک بھی ہے۔

اتنے میں خاناماں نے دور سے کہا۔ خوبہ صاحب، ہم نے تو سنا ہے کہ آپ کے والد اٹلے بیچا کرتے تھے۔

اتنا سننا تھا کہ خوبی آگ ہو گئے اور ایک تو اٹھا کر خاناماں کی طرف دوڑے۔ تو بہت گرم تھا۔ اچھی طرح اٹھا بھی نہ پائے تھے کہ ہاتھ جل گیا۔ جھجک کر توے کو جو پھینکا تو خود بھی منہ کے بل گر پڑے۔

خاناماں: یا علی، بچائیے۔

بیرا: تو اتنا جل رہا تھا، ہاتھ جل گیا ہوگا۔

میڈا: ڈاکٹر کو فوراً بلاؤ۔

خاناماں: اٹھ بیٹھو بھائی، کیسے پہلوان ہوا!

آزاد: خدا نے بچا لیا، ورنہ جان ہی گئی تھی۔

خوبہ صاحب چپ چاپ پڑے ہوئے تھے۔ خاناماں نے برآمدے میں ایک پتنگ بچایا اور دو آدمیوں نے مل کر خوبی کو اٹھایا کہ برآمدے میں جائیں۔ اسی وقت ایک آدمی نے کہا۔ جب بچنا مشکل ہے۔ خوبی عقل کے دشمن تو تھے ہی۔ ان کو یقین ہو گیا کہ اب آخری وقت ہے۔ رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ خاناماں اور ہوٹل کے اور نوکر چاکر ان کو بنانے لگے۔

خاناماں: بھائی، دنیا اسی کا نام ہے۔ زندگی کا اعتبار کیا۔

بیرا: اسی بہانے موت لکھی تھی۔

محرر: اور ابھی نوجوان آدمی ہیں۔ ان کی عمر ہی کیا ہے؟

آزاد: کیا، حال کیا ہے؟ نبض کا کچھ پتہ ہے؟
 خانساں: حضور، اب آخری وقت ہے۔ اب کفن دفن کی فکر کیجیے۔ یہ سن کر خوجی جل
 بھن گئے۔ مگر آخری وقت تھا، کچھ بول نہ سکے۔

آزاد: کسی مولوی کو بلاؤ۔

محرر: حضور، یہ نہ ہوگا۔ ہم نے کبھی ان کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔

آزاد: بھئی، اس وقت یہ ذکر نہ کرو۔

محرر: حضور مالک ہیں، مگر یہ مسلمان نہیں ہیں۔

خوجی کا بس چلتا تو محرر کی بولیاں نوچ لیتے، مگر اس وقت وہ مر رہے تھے۔

خانساں: قبر کھدوائیے، اب ان میں کیا ہے؟

بیرا: اسی سامنے والے میدان میں ان کو توپ دو۔

خوجی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کجنت کہتا ہے، توپ دو۔ یہ نہیں کہتا ہے کہ آپ کو دفن کر

۔۔

آزاد: بڑا اچھا آدمی تھا بے چارہ۔

خانساں: لاکھ سڑی تھے، مگر تھے نیک۔

بیرا: نیک کیا تھے۔ ہاں، یہ کہو کہ کسی طرح بھ گئی۔

خوجی اپنا خون پی کے رہ گئے، مگر مجبور تھے۔

محرر: اب ان کو مل کے توپ ہی دیجیے۔

آزاد: گھڑی دو میں مر لیا باجے گی۔

بیرا: خواجہ صاحب، کہیے، اب کتنی دیر میں مر لیا باجے گی؟

آزاد: اب اس وقت کیا بتائیں بے چارے، افسوس ہے!

خانساں: افسوس کیوں حضور، اب مرنے کے تو دن ہی تھے۔ جوان جوان مرتے

جاتے ہیں۔ یہ تو اپنی عمر تمام کر چکے۔ اب کیا عاقبت کے بورے بنوئیں گے؟

آزاد: ہاں، ہے تو ایسا ہی مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ آدمی چاہے دوسو برس کا

ہو کے مرے، مگر مرتے وقت یہی جی چاہتا ہے کہ دس برس کی اور زندہ رہتا۔

خانساں: تو حضور، یہ تمنا تو اس کو ہو، جس کا کوئی رونے والا ہو۔ ان کے کون بیٹھا

ہے۔

اتنے میں ہوٹل کا ایک آدمی ایک چہرہ اسی کو حکیم بنا کر لایا!

آزاد: کرسی پر بیٹھے حکیم صاحب۔

حکیم: یہ گستاخی مجھ سے نہ ہوگی۔ حضور بیٹھیں۔

آزاد: اس وقت سب معاف ہے۔

حکیم: یہ بے ادبی مجھ سے نہ ہوگی۔

آزاد: حکیم صاحب، مریض کی جان جاتی ہے اور آپ تکلف کرتے ہیں۔

حکیم: چاہے مریض مر جائے، مگر میں ادب کو ہاتھ سے جانے نہ دوں گا۔

خوبی کو حکیم کی صورت سے نفرت ہوگئی۔

آزاد: آپ تکلف تکلف میں مریض کی جان لے لیں گے۔

حکیم: اگر موت ہے تو مرے گا ہی، میں اپنی عادت کیوں چھوڑوں؟

آزاد نے خوبی کے کان میں زور سے کہا۔ حکیم صاحب آئے ہیں۔

خوبی نے حکیم صاحب کو سلام کیا اور ہاتھ بڑھایا۔

حکیم: (نبض پر ہاتھ رکھ کر) اب کیا باقی ہے، مگر ابھی تین چار دن کی نبض ہے، اس

وقت ان کو ٹھنڈا پانی سے نہلایا جائے تو بہتر ہے، بلکہ اگر پانی میں برف ڈال دیجیے تو اور بھی

بہتر ہے۔

آزاد: بہت اچھا۔ ابھی لیجیے۔

حکیم: بس، ایک دو من برف کافی ہوگی۔

اتنے میں مس میڈا نے آزاد سے کہا۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ دو چار ہوٹل والوں کو

لے کر ایک غریب کا خون اپنی گردن پر لیتے ہو۔ خوبی کی چار پائی ہمارے کمرے کے سامنے

بھجوا دو اور ان آدمیوں سے کہہ دو کہ کوئی خوبی کے قریب نہ آئے۔

اس طرح خوبی کی جان بچی۔ آرام سے سوئے۔ دوسرے دن مچھوٹے گھاتے ایک

چنڈو خانے میں جا پہنچے اور پھینٹے اڑانے لگے۔ یکا یک حسن آرا کا ذکر سن کر ان کے کان

کھڑے ہوئے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ حسن آرا پر ایک شہزادے عاشق ہوئے ہیں، جن کا نام

قمر الدولہ ہے۔ خوبی بگڑ کر بولے۔ خبردار، جو اب کسی نے حسن آرا کا نام پھر لیا۔ شریف

زادیوں کا نام بد کرتا ہے بے! ایک چنڈو باز: ہم تو سنی سنائی کہتے ہیں صاحب۔ شہر بھر میں یہ خبر مشہور ہے، آپ کس کس کی زبان روکیے گا۔

خوجی: جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ۔

چنڈو باز: اچھا، ہم جھوٹ کہتے ہیں تو عیدو سے پوچھ لیجیے۔

عیدو: ہم نے تو یہ سنا تھا کہ بیگم صاحب نے اخبار میں کچھ لکھا تو وہ شہزاد نے پڑھا اور عاشق ہو گئے، فوراً بیگم صاحب کے نام سے خط لکھا اور شاید کسی بانکے کو مقرر کیا ہے کہ آزاد کو مار ڈالے۔ خدا جانے، سچ ہے یا جھوٹ۔

خوجی: تم نے کس سے سنی ہے یہ بات؟ اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تمہانے پر چل کر گواہی دینی ہوگی۔

عیدو: حضور کیا آزاد کے دوست ہیں؟

خوجی: دوست نہیں ہوں، استاد ہوں۔ میرا شاگرد ہے۔

عیدو: آپ کے کتنے شاگرد ہوں گے؟

خوجی: یہاں سے لے کر روم اور شام تک۔

خوجی شہزادے کا پتہ پوچھتے ہوئے لال کنویں پر پہنچے۔ دیکھا تو سینکڑوں آدمی پانی بھر

رہے ہیں۔

خوجی: کیوں بھائی، یہ کنواں تو آج تک دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

بہشتی: کیا کہیں باہر گئے تھے؟

خوجی: ہاں بھائی، بڑا لمبا سفر کر کے لوٹا ہوں۔

بہشتی: اسے بنے تو چار مہینے ہو گئے۔

خوجی: اہا ہا! یہ کہو، بھلا کس نے بنوایا ہے؟

بہشتی: شہزادہ قمر الدولہ نے۔

خوجی: شہزادہ صاحب رہتے کہاں ہیں؟

بہشتی: تم تو معلوم ہوتا ہے اس شہر میں آج ہی آئے ہو۔ سامنے انھیں کی برادری تو

ہے۔

خوجی یہاں سے محل کے چوہدار کے پاس پہنچے اور علیک سلیک کر کے بولے۔ بھائی، کوئی نوکری دلاتے ہو۔

دربان : داروغہ صاحب سے کہیے، شاید مطلب نکلے۔

خوجی : ان سے کب ملاقات ہوگی؟

دربان : ان کے مکان پر جاییے، اور کچھ چٹائیے۔

خوجی : بھلا شہزادے تک رسائی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

دربان : اگر کوئی اچھی صورت دکھاؤ تو پو بارہ ہیں۔

اتنے میں اندر سے ایک آدمی نکلا۔ دربان نے پوچھا کدھر چلے شیخ جی؟

شیخ : حکم ہوا ہے کہ کسی رنٹال کو بہت جلد حاضر کرو۔

خوجی : تو ہم کو لے چلے۔ اس فن میں ہم اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

شیخ : ایسا نہ ہو، آپ وہاں چل کر بے وقوف بنیں۔

خوجی : اجی، لے تو چلے۔ خدا نے چاہا تو سرخ رو ہی رہوں گا۔

شیخ صاحب ان کو لے کر برادری میں پہنچے۔ شہزادہ صاحب مسند لگائے بیچ وان پی

رہے تھے اور معاصب لوگ انھیں گھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔ خوجی نے ادب سے سلام کیا اور

فرش پر جا بیٹھے۔

آغا : حضور، اگر حکم ہو تو تارے آسمان سے اتار لوں۔

مئے : حق ہے۔ ایسا ہی رعب ہے ہمارے سرکار کا۔

مرزا : خداوند، اب حضور کی طبیعت کا کیا حال ہے؟

آغا : خدا کا فضل ہے۔ خدا نے چاہا تو صبح شام شپا لڑا ہی چاہتا ہے۔ حضور کا نام سن

کر کوئی نکاح سے انکار کرے گا بھلا!

خوجی : خدا گواہ ہے کہ شہر میں دوسرا رئیس فکر کا نہیں ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے

اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

مرزا : سبحان اللہ! واہ! خان صاحب واہ! بیچ ہے۔

شیخ : خان صاحب نہیں، خوجا صاحب کہیے۔

مرزا : اجی، وہ کوئی ہوں، ہم تو انصاف کے لوگ ہیں۔ خدا کو منہ دکھانا ہے۔ کیا بات

کمی ہے۔ خواجہ صاحب، آپ تو پہلی مرتبہ اس صحبت میں شریک ہوئے ہیں۔ رفتہ رفتہ دیکھیے گا کہ حضور نے کیسا مزاج پایا ہے۔

شیخ: بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان۔

خوجی: مجھ سے کہتے ہو۔ شہر میں کون رکش ہے، جس سے میں واقف نہیں؟

آغا: بھائی مرزا، اب فتح ہے۔ ادھر کا رنگ پھینکا ہو رہا ہے۔ اب تو ادھر ہی جھکی ہوئی

ہیں۔

مرزا: واللہ! ہاتھ لگائے گا۔ مردوں کا وار خالی جائے؟

آغا: یہ سب حضور کا اقبال ہے۔

قمرالدولہ: میں تو تڑپ رہا تھا، زندگی سے بے زار تھا۔ آپ لوگوں کی بدولت اتنا تو ہو

گیا۔

خوجی حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ حسن آرا کو یہ کیا ہو گیا کہ قمرالدولہ پر تبکھی! کبھی

یقین آتا تھا، کبھی شک ہوتا تھا۔

آغا: حضور، کا دور دور تک نام ہے۔

مرزا: کیوں نہیں، لندن تک۔

خوجی: کہہ دیا نا بھائی جان، کہ دوسرا نظر نہیں آتا۔

شہزادہ: (آغا سے) یہ یہاں رہتے ہیں اور کون ہیں؟

خوجی: جی، غریب کا مکان مرغی بازار میں ہے۔

آغا: جیسی آپ کڑک رہے تھے۔

مرزا: ہاں، اٹھے بیچتے تو ہم نے بھی دیکھا تھا۔

خوجی: جیسی آپ صدر بازار میں ٹاپا کرتے ہیں۔

شہزادہ: خواجہ صاحب ضلع میں طاق ہیں۔

خوجی: آپ کی قدر دانی ہے۔

باتوں باتوں میں یہاں کا ٹوہ لے کر خوجی گھر چلے۔ ہوٹل میں پہنچے تو آزاد کو بوڑھے

میاں سے باتیں کرتے دیکھا۔ لکار کر بولے۔ لو، میں بھی آ پہنچا۔

آزاد: غل نہ مچاؤ۔ ہم لوگ نہ جانے کیسی صلاح کر رہے ہیں۔ تم کو کیا، بے فکر ہو۔

کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟ یہاں ایک نیا گل کھلا ہے!
خوجی: اجی، ہمیں سب معلوم ہے۔ ہمیں کیا سکھاتے ہو۔

آزاد: تم سے کس نے کہا؟

خوجی: اجی، ہم سے بڑھ کر ٹوہیا کوئی ہو تو لے۔ ابھی انھیں قمرالدولہ کے یہاں جا پہنچا۔ پورے ایک گھنٹے تک ہم سے ان سے بات چیت رہی۔ آدمی تو ضعیف سا ہے اور بالکل جاہل۔ مگر اس نے حسن آرا کو کہاں سے دیکھ لیا؟ چھو کر ہی ہے چلبلی۔ کوٹھے پر مچی ہوگی، بس اس کی نظر پڑ گئی ہوگی۔

بوڑھے میاں: ذرا زبان سنبھال کر!

خوجی: آپ جب دیکھو، ترجمے ہی ہو کر باتیں کرتے ہیں؟ کیا کوئی آپ کا دیا کھاتا ہے یا آپ کا دہل ہے؟ بڑے عقلمند آپ ہی تو ہیں ایک!
اتنے میں فنن پر ایک انگریز آزاد کو پوچھتا ہوا آ پہنچا۔ آزاد نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ فوجی افسر ہے۔ آزاد کو ایک جلمے کا چیرمین بننے کے لیے کہنے آئے ہیں۔

آزاد: اس کے لیے آپ نے کیوں اتنی تکلیف کی؟ ایک خط کافی تھا۔

صاحب: میں چاہتا ہوں کہ آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔ لکچر کا وقت بہت قریب ہے۔

آزاد صاحب کے ساتھ چلے دیے۔ ٹاؤن ہال میں بہت سے آدمی جمع تھے۔ آزاد کے پہنچتے ہی لوگ انھیں دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اور جب وہ بولنے کے لیے میز کے سامنے کھڑے ہوئے تو چاروں طرف سماں بندھ گیا۔ جب وہ بیٹھنا چاہتے تو لوگ غل مچاتے تھے، ابھی کچھ اور فرمائیے۔ یہاں تک کہ آزاد ہی کے بولتے بولتے وقت پورا ہو گیا اور صاحب بہادر کے بولنے کی نوبت نہ آئی۔ شہزادہ قمرالدولہ بھی مصاحبوں کے ساتھ جلمے میں موجود تھے۔ جیوں ہی آزاد بیٹھے، انھوں نے آغا سے کہا۔ سچ کہنا، ایسا خوبصورت آدمی کبھی دیکھا ہے؟

آغا: بالکل شیر معلوم ہوتا ہے۔

شہزاد: ایسا جوان دنیا میں نہ ہوگا۔

آغا: اور تقریر کتنی پیاری ہے!

شہزادہ: کیوں صاحب، جب ہم مردوں کا یہ حال ہے، تو عورتوں کا کیا حال ہوتا ہوگا؟
آغا: عورت کیا، پری عاشق ہو جائے۔

شہزادہ صاحب جب یہاں سے چلے تو دل میں سوچا۔ بھلا آزاد کے سامنے میری دال کیا گلے گی؟ میرا اور آزاد کا مقابلہ کیا؟ اپنی حماقت پر بہت شرمندہ ہوئے۔ جیوں ہی مکان پر پہنچے، مصاحبوں نے بے پر کی اڑانی شروع کی۔

مرزا: خداوند، آج تو منہ بیٹھا کرایے۔ وہ خوشخبری سناؤں کہ پھڑک جاییے۔ حضور، ان کے یہاں ایک مہری نوکر ہے۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ آج آپ کے سرکار کی تصویر کا آزاد کی تصویر سے مقابلہ کیا اور بولیں۔ میری تو شہزادے پر جان جاتی ہے۔

اور مصاحبوں نے بھی خوشامد کرنی شروع کی، مگر نواب صاحب نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر اندر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مصاحبوں نے آغا سے پوچھا۔ ارے میاں! بتاؤ تو، کیا ماجرا؟ کیا سبب ہے کہ سرکار آج اتنے اداس ہیں؟
آغا: بھئی، کچھ نہ پوچھیے۔ بس، یہی سمجھ لو کہ سرکار کی آنکھیں کھل گئی۔

(109)

آزاد کے آنے کے بعد ہی بڑی بیگم نے شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بڑی بیگم چاہتی تھیں کہ برات خوب دھام دھام سے آئے۔ آزاد دھوم دھام کے خلاف تھے۔ اس پر حسن آرا کی بہنوں سے باتیں ہونے لگیں۔

بہار بیگم: یہ سب دکھانے کی باتیں ہیں۔ کسی سے دو ہاتھی مانگا، کسی سے دو چار گھوڑے، کہیں سے سپاہی آئے، کہیں سے برچھی بردار! لو صاحب، برات آئی ہے۔ مانگیں تاننے کی برات سے فائدہ؟

بڑی بیگم: ہم کو یہ تمنا نہیں ہے کہ برات دھوم ہی سے دروازے پر آئے۔ مگر کم سے کم اتنا تو ضرور ہونا چاہیے کہ جگ ہنسائی نہ ہو۔
جانی بیگم: ایک کام کیجیے، ایک خط لکھ دیجئے۔

کیتی: ہمارے خاندان میں کبھی ایسا ہوا ہی نہیں۔ ہم نے تو آج تک نہیں سنا۔ دھنیے

جولاہوں کے یہاں تک تو انگریزی باجارات کے ساتھ ہوتا ہے۔

بہار: ہاں صاحب، برات تو وہی ہے، جس میں 50 ہاتھی، بلکہ نفل خانے کا نفل خانہ ہو، ساڑھنیوں کی قطار دوختے تک جائیں۔ شہر بھر کے گھوڑے اور ہولدار اور تام دان ہوں اور کئی رسالے، بلکہ توپ خانہ بھی ضرور ہو۔ قدم قدم پر آتش بازی چھوٹی ہو اور گولے دھتے ہوں۔ معلوم ہو کہ برات کیا، قلعہ فتح کیا جاتا ہے۔

نازک: یہ سب بری باتیں ہیں، کیوں؟

بہار: جی نہیں، انھیں بری کون کہے گا بھلا۔

نازک: اچھا، وہ جانیں، ان کا کام جانے۔

حسن آرا نے جب دیکھا کہ آزاد کی ضد سے بڑی بیگم ناراض ہوئی جاتی ہیں تو آزاد کے نام ایک خط لکھا۔

پیارے آزاد،

ماتا کہ تمہارے خیالات بہت اونچے ہیں، مگر راہ رسم میں دخل دینے سے کیا نتیجہ نکلے گا۔ اتناں جان ضد کرتی ہیں، اور تم انکار، خدا ہی خیر کرے۔ ہماری خاطر سے مان لو، اور جو وہ کہے سو کرو۔

آزاد نے اس کا جواب لکھا۔ جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔

حسن آرا نے یہ خط پڑھا تو تسکین ہوئی۔ نازک ادا سے بولیں۔ لو بہن، جواب آ گیا۔

نازک: مان گئے یا نہیں؟

حسن آرا: کیسے نہ مانتے۔

نازک: چلو، اب اتناں جان کو بھی تسکین ہو گئی۔

بہار: بیٹھائیاں بانٹو۔ اب اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہوگی؟

نازک: آخر پھر روپیہ اللہ نے کس کام کے لیے دیا ہے؟

بہار: واہ ری عقل! بس، روپیہ اس لیے ہے کہ آتش بازی میں پھونکے یا سجاوٹ میں

لٹائے۔ اور کوئی کام ہی نہیں؟

نازک: اور آخر کیا کام ہے؟ کیا پرچون کی دوکان کرے؟ چنے بچیں؟ کچھ معلوم تو ہو

کہ روپیہ کس کام میں خرچ کیا جائے؟ دل کا حوصلہ اور کیسے نکالے۔

بہار: اپنی اپنی سمجھ ہے۔

نازک: خدا نہ کرے کہ کسی کی ایسی الٹی سمجھ ہو۔ لو صاحب، اب برات بھی گناہ ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، ہاجا سب صیب میں داخل۔ جو برات نکالتے ہیں، سب گدھے ہیں۔ ایک تم اور دوسرے میاں آزاد دو آدمیوں پر حمل ختم ہو گئی۔ ذرا آنے تو دو میاں کو، ساری شخی نکل جائے گی۔

دوسرے دن بڑی دھوم دھام سے مانجھے کی تیاری ہوئی۔ آزاد کی طرف خوبی مہتمم تھے۔ آپ نے پرانے ڈھنگ کی جامدانی کی اچکن پہنی، جس میں قیمتی تیل مٹی ہوئی تھی۔ سر پر ایک بہت بڑا شملہ۔ کندھے پر کشمیر کا ہرا دوشالا۔ اس فٹاٹ سے آپ باہر آئے تو لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اس پر آپ بہت ہی خفا ہو کر بولے۔ یہ تالیاں ہم پر نہیں بجاتے ہو۔ یہ اپنے باپ داداؤں پر تالیاں بجاتے ہو۔ یہ خاص ان کا لباس ہے۔ کئی لوٹوں نے ان کے منہ پر ہنسا شروع کیا، مگر انتظام کے دھن میں خوبی کو اور کچھ نہ سوچتا تھا۔ کڑک کر بولے۔ ہاتھیوں کو اس طرف رہنے دو۔ بس، اسی لائن میں لا لا کر ہاتھی لگاؤ۔

ایک فیل بان: یہاں کہیں جگہ بھی ہے؟ سب کا بھرتا بنائیں گے آپ؟

خوبی: چپ رہ، بد معاش!

مرزا صاحب بھی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بولے۔ بھئی، اس فن میں تو تم استاد

ہو۔

خوبی: (مسکرا کر) آپ کی قدردانی ہے۔

مرزا: آپ کا رعب سب مانتے ہیں۔

خوبی: ہم کس لائق ہیں بھائی جان! دوستوں کا اقبال ہے۔

غرض اس دھوم دھام سے ماجھا دلہن کے مکان پر پہنچا کہ سارے شہر میں شور مچ گیا۔ سواریاں اتریں۔ میرا شنوں نے سمدھنوں کو گالیاں دیں۔ میاں آزاد باہر سے بلوائے گئے اور ان سے کہا گیا کہ مڑھے کے نیچے بیٹھیے۔ آزاد بہت انکار کرتے رہے، مگر عورتوں نے ایک نہ سنی۔ نازک بیگم نے کہا۔ آپ تو ابھی سے پچکنے لگے۔ ابھی تو مانجھے کا جوڑا پہنانا پڑے گا۔

آزاد: یہ مجھ سے نہیں ہونے کا۔

جانی بیگم: اب چپ چاپ پہن لو، بس!

آزاد: کیا فضول رسم ہے!

جانی: لے، اب پہننے ہو کہ تھرا کرتے ہو، ہم سے جزیلی نہ چلے گی۔

بیگم: بھلا، یہ بھی کوئی بات ہے نہ مانجھے کا جوڑا نہ پہنیں گے؟

آزاد: اگر آپ کی خاطر اسی میں ہے تو لائیے، ٹوپی دے لوں۔

نازک بیگم: جب تک مانجھے کا پورا جوڑا نہ پہنوں گے، یہاں سے اٹھنے نہ پاؤں گے۔

آزاد نے بہت ہاتھ جوڑا، گڑگڑا کر کہا کہ خدا کے لیے مجھے اس پہلے جوڑے سے

بچاؤ۔ مگر کچھ بس نہ چلا۔ سالیوں نے انگرکھا پہنایا، کنگن باندھا۔ ساری باتیں رسم کے مطابق

پوری ہوئیں۔

جب آزاد باہر گئے تو سب بیگمیں مل کر باغ کی سیر کرنے چلیں۔ کیتی آزاد نے ایک

پھول توڑ کر جانی بیگم کی طرف پھینکا۔ اس نے وہ پھول روک کر ان پر تاک کے مارا تو آنچل

سے لگتا ہوا چن میں گرا۔ پھر کیا تھا، باغ میں چاروں طرف پھولوں کی مار ہونے لگی۔ اس

کے بعد نازک ادا کرتے یہ غزل گائی۔

واقف نہیں ہیں قاصد میرے غم نہاں سے

وہ کاش حال میرا سنتے میری زباں سے

کیوں تیوریوں پر بل ہے، ماتھے پر کیوں شکن ہے

کیوں اس قدر ہو برہم، کچھ تو کہو زباں سے

کوئی تو آشیانا صیاد نے جلایا

کالی گھٹائیں رو کر پلٹی ہیں بوستاں سے

جانے کو جاؤ لیکن، یہ تو بتاتے جاؤ

کس طرح بارفرت اٹھے گا ناتواں سے

بہار: جی چاہتا ہے، تمہاری آواز کو چوم لوں۔

نازک: اور میرا جی چاہتا ہے کہ تمہاری تعریف چوم لوں۔

بہار: ہم تمہاری آواز کے عاشق ہیں۔

نازک: آپ کی مہربانی۔ مگر کوئی خوبصورت مرد عاشق ہو تو بات ہے۔ تم ہم پر ہنسی

تو کیا، کچھ بات نہیں۔

بہار: بس، انہیں باتوں سے لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ اور تم نہیں چھوڑتیں۔
جانی: سچی آواز بھی کتنی پیاری ہوتی ہے۔

نازک: کیا کہتا ہے! اب دو ہی چیزوں میں تو اثر ہے، ایک گانا، دوسرے حسن۔ اگر ہم
کو اللہ نے حسن نہ دیا ہوتا، تو ہمارے میاں ہم پر کیوں رہتے۔

بہار: تمہارا حسن تمہارے میاں کو مبارک ہو۔ ہم تو تمہاری آواز پر مٹے ہوئے ہیں۔
نازک: اور میں تمہارے حسن پر جان دیتی ہوں۔ بس میں بھی بناؤ چناؤ کرنا تم سے
سیکھوں گی۔

نازک: بہن، اب تم تھپتی ہو۔ جب کبھی تم ملیں، تمہیں بنتے، اُٹھتے دیکھا۔ مجھ سے دو
تین سال بڑی ہو، مگر بارہ برس کی بنی رہتی ہو۔ ہیں تمہارے میاں قسمت کے دہنی۔
بہار: سنو بہن، ہماری رائے یہ ہے کہ اگر عورت سمجھدار ہو، تو مرد کی طاقت نہیں کہ
اُسے باہر کا چسکا پڑے۔

ساجک کے دن جب چاندی کا پتارہ باہر آیا، تو خوبی بار بار پتارے کا ڈھکنا اٹھا کر
دیکھنے لگا کہ کہیں شیشیاں نہ گرنے لگیں۔ موتیوں کا عطر خدا جانے، کن دقتوں سے لایا ہوں۔
یہ وہ عطر ہے، جو عاصف الدولہ کے یہاں سے بادشاہ کی بیگم کے لیے گیا تھا۔
ایک آدمی نے ہنس کر کہا: اتنا پرانا عطر حضور کو کہاں سے مل گیا؟
خوبی: ہوں! کہاں سے مل گیا! مل کہاں سے جاتا؟ مہینوں دوڑا ہوں، تب جا کے یہ
چیز ہاتھ لگی ہے۔

آدمی: کیوں صاحب، یہ برسوں کا عطر چمک نہ گیا ہوگا؟
خوبی: واہ! عقل بڑی کی بھینس؟ بادشاہی کوٹھوں کے عطر کہیں چمکا کرتے ہیں؟ یہ بھی
ان گندھیوں کا تیل ہوا، جو پھیری لگاتے پھرتے ہیں۔
آدمی: اور کیوں صاحب، کیوڑا کہاں کا ہے؟
خوبی: کیوڑستان ایک مقام ہے، کچلی ون کے پاس۔ وہاں کے کیوڑوں سے کھینچا گیا
ہے۔

آدمی: کیوڑستان! یہ نام تو آج ہی سنا۔
خوبی: ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے؟ کیوڑستان کا نام ہی سن کر گھبرا گئے۔

آدمی: کیوں حضور، یہ کبلی ون کون سا ہے؟ وہی نا، جہاں گھوڑے بہت ہوتے ہیں۔
 خوبی: (ہنس کر): اب بناتے ہیں آپ۔ کبلی ون میں گھوڑے نہیں، خاص ہاتھیوں کا
 جنگل ہے۔

آدمی: کیوں جناب، کیوڑستان سے تو کیوڑا آیا، اور گلاب کہاں کا ہے۔ شاید گلابستان
 کا ہوگا؟

خوبی: شاباش! یہ ہماری صحبت کا اثر ہے کہ اپنے پروں آپ اڑنے لگے۔ گلابستان
 کامرو کچھا کے پاس ہے، جہاں کا جادو مشہور ہے۔
 رات کو جب ساچک کا جلوس نکلا تو خوبی نے ایک پنہانے والی کا ہاتھ پکڑا اور کہا —
 جلدی جلدی قدم بڑھا۔

وہ بگڑ کر بولی: دور موئے! داڑھی جھلس دوں گی، ہاں۔ آیا وہاں سے بارات کا داروغہ
 بن کے، سوا مہرے پن کے دوسری بات نہیں۔

خوبی: نکال دو اس حرام زادی کو یہاں سے۔

عورت: نکال دو اس موڑی کاٹے کو۔

خوبی: اب میں مٹھری بھونک دوں گا، بس!

عورت: اپنے پنہانے سے منہ جھلس دوں گی۔ مٹھا دیوانہ، عورتوں کو راستے میں چھیڑتا

چلتا ہے۔

خوبی: ارے میاں کاٹھیل، نکال دو اس عورت کو۔

عورت: تو خود نکال دے، پہلے۔

جلوس کے ساتھ کئی بگڑے دل بھی تھے۔ انھوں نے خوبی کو چکما دیا — جناب، اگر اس
 نے سزا نہ پائی تو آپ کی بڑی کرکری ہوگی۔ بدری ہو جائے گی۔ آخر، یہ فیصلہ ہوا، آپ کمر
 کس کر بڑے جوش کے ساتھ پنہانے والی کی طرف چھپے۔ جھپٹتے ہی اس نے پنہانہ سیدھا کیا
 اور کہا — اللہ کی قسم! نہ جھلس دوں، تو اپنے باپ کی نہیں۔

لوگوں نے خوبی پر پھبتیاں کنسی شروع کیں۔

ایک: کیوں میجر صاحب، اب تو ہاری مانی!

دوسرا: اے! کرولی اور مٹھری کیا ہوئی۔

تیسرا: ایک پٹھانے والی سے نہیں جیت پاتے، بڑے سپاہی کے دم بنے ہیں۔
 عورت: کیا دل لگی ہے ذرا جگہ سے بڑھا اور میں نے داڑھی اور مونچھ دونوں جھلس
 دیا۔

خوجی: دیکھو، سب کے سب دیکھ رہے ہیں کہ عورت سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا۔ ورنہ کوئی
 دیوبھی ہوتا تو ہم بے قفل کیے نہ چھوڑتے اس وقت۔

جب ساچک لہن کے گھر پہنچی، تو لہن کی بہنوں نے چندن سے سدھن کی مانگ
 بھری۔ حسن آرا کا نکھار آج دیکھنے کے قابل تھا۔ جس نے دیکھا، پھڑک گئی۔ لہن کو پھولوں کا
 گہنہ پہنایا گیا۔ اس کے بعد چھڑیوں کی مار ہونے لگی۔ نازک ادا اور جانی بیگم کے ہاتھ میں
 پھولوں کی چھڑیاں تھیں۔ سدھنوں پر اتنی چھڑیاں پڑیں کہ پچاری گھبرا گئی۔

جب ماجھو اور ساچک کی رسم ادا ہو چکی تو مہندی کا جلوس نکلا۔ لہن کے یہاں محفل بھی
 ہوئی تھیں۔ ڈونیاں گا رہی تھیں۔ کمرے کی دیواریں اس طرح رنگی ہوئی تھیں کہ نظر نہیں ٹھہرتی
 تھیں۔ چھت گیر کی جگہ سرخ زربفت لگایا گیا تھا۔ اس نے سنہری کلاہو کی جھار تھی۔ فرش بھی
 سرخ مخمل کا تھا۔ جھاڑ اور کنول، مردنگ اور ہاڑیاں سب سرخ۔ کمرائش محل ہو گیا تھا۔
 بیگمیں بھاری بھاری جوڑے پہنے چمکتی پھرتی تھیں۔ اتنے میں ایک سکھ پال لے کر مہریاں
 صحن میں آئی۔ اس پر سے ایک بیگم صاحب اتریں، ان کا نام پری بانو تھا۔

سپہر آرا بولی: ہاں، اب نازک ادا بہن کی جواب دینے والی آگئی۔ برابر کی جوڑ ہے۔
 یہ کم نہ وہ کم۔

روح افزا: نام بڑا پیارا ہے۔

نازک: پیارا کیوں نہ ہو۔ ان کے میاں نے یہ نام رکھا ہے۔

پری بانو: اور تمہارے میاں نے تمہارا نام کیا رکھا ہے چرباک محل۔

اس پر بڑی ہنسی اڑی۔ بارہ بجے رات کو مہندی روانہ ہوئی۔ جب جلوس بج گیا تو خواجہ
 صاحب آپہنچے اور آتے ہی غل جپانا شروع کیا۔ سب چیزیں قرینے کے ساتھ لگاؤ اور میرے
 حکم کے بغیر کوئی ایک قدم بھی آگے نہ رکھے۔ ورنہ برا ہوگا۔

سجاوٹ کے تحت بڑے بڑے کاریگروں سے بنوائے گئے تھے۔ جس نے دیکھا، دنگ
 ہو گیا۔

ایک : یوں تو سبھی چیزیں اچھی ہیں، مگر تخت سب سے بڑھ کر ہیں۔

دوسرا : بڑا روپیہ انھوں نے صرف کیا ہے صاحب۔

تیسرا : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچ بچ کے پھول کھلے ہیں۔

چوتھا : ذرا چنڈو بازوں کے تخت کو دیکھئے۔ او ہوا! سب کے سب اونڈھے پڑے ہوئیں ہیں! آنکھوں سے نشہ ٹپکا پڑتا ہے۔ کمال اسے کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، بچ بچ چنڈو خانہ ہی ہے۔ وہ دیکھیے، ایک بیٹھا ہوا کس مزے سے پونڈا جھیل رہا ہے۔

اس کے بعد ترک سواروں کا تخت آیا۔ جوان لال بات کی کرتیاں پہنے، سر پر بانگی ٹوپیاں دیے، بوٹ چڑھائے، ہاتھ میں نقلی تلواریں لیے، بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ رسالے نے اب دھاوا کیا۔

جب جلوس دلہا کے یہاں پہنچا تو بیگمیں پاکلیوں سے اتریں۔ دلہا کی بہنیں اور بھادھیں دروازے تک انھیں لینے آئیں۔ جب سمجھیں بیگمیں تو ڈومبیوں نے مبارکباد گائی۔ پھر گالیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ آزاد کو جب یہ خبر ہوئی تو بہت ہی بگڑے، مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ اب آزاد کے ہاتھوں میں مہندی لگانے کی باری آئی۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک ہی انگلی میں مہندی لگائیں، مگر جب ایک طرف سپہر آرا اور دوسری طرف روح افزا بیگم نے دونوں ہاتھوں میں مہندی لگانی شروع کی تو ان کی ہمت نہ پڑی کہ ہاتھ کھینچ لیں۔ ہنسی ہنسی میں انھوں نے کہا۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ہم لوگوں نے یہ رسم سیکھی ہے۔ نہیں تو عرب میں کون مہندی لگاتا ہے۔

سپہر آرا : جن ہاتھوں سے تلوار چلائی۔ ان ہاتھوں کو کوئی ہنس نہیں سکتا۔ سپاہی کو کون ہنسے گا بھلا؟

روح افزا : کیا بات کہی ہے! جواب دو تو جانیں۔

دو بجے رات کو روح افزا بیگم کو شرارت جو سوجھی تو گیر و محول کر سوتے میں مہریوں کو رنگ دیا اور گلے ہاتھ کئی بیگموں کے منہ بھی رنگ دیے۔ صبح کو جانی بیگم انھیں تو ان کو دیکھ کر سب کی سب ہنسنے لگیں۔ چکرائیں کہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھا۔ ہمیں دیکھ کر ہنس رہی ہو کیا!

روح افزا : گھبراؤ نہیں، ابھی معلوم ہو جائے گا۔

نازک : کچھ اپنے چہرے کی خبر ہے؟

جانی: تم اپنے چہرے کی تو خبر لو۔
 دونوں آئینے کے پاس جا کے دیکھتی ہیں، تو منہ رنگا ہوا۔ بہت شرمندہ ہوئیں۔
 روح افزا: کیوں بہن، کیا یہ بھی کوئی سنگار ہے؟
 جانی: اچھا، کیا مضائقہ ہے، مگر اچھے گھر بیانا دیا۔ آج رات ہونے دو۔ ایسا بدلہ لوں
 کہ یاد ہی کرو۔

روح افزا: ہم دروازے بند کر کے سو رہیں گے۔ پھر کوئی کیا کرے گا۔
 جانی: چاہے دروازہ بند کر لو، چاہے دس من کا تالا ڈال دو، ہم اس سیاہی سے منہ رنگیں
 گے۔ جس سے جوتے صاف کیے جاتے ہیں۔
 روح افزا: بہن، اب تو معاف کرو۔ اور یوں ہم حاضر ہیں۔ جوتوں کا ہار گلے میں
 ڈال دو۔

اس طرح چہل پہل کے ساتھ مہندی کی رسم ادا ہوئی۔

(110)

خوجی نے جب دیکھا کہ آزاد کی چاروں طرف تعریف ہو رہی ہے، اور ہمیں کوئی نہیں
 پوچھتا، تو بہت جھلکے اور کل شہر کے انچپیوں کو جمع کر کے انھوں نے بھی جلسہ کیا اور یوں
 اسیچ دی — بھائیوں! لوگوں کا خیال ہے کہ انیم کھا کر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا ہے۔ میں
 کہتا ہوں، بالکل غلط۔ میں نے روم کی لڑائی میں جیسے جیسے کام کیے، اس پر بڑے سے بڑا
 سپاہی بھی ناز کر سکتا ہے۔ میں نے اکیلے دو دو لاکھ آدمیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ توپوں کے
 سانے بے دھڑک چلا گیا ہوں۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو نیچا دکھا دیا ہے۔ اور میں وہ آدمی
 ہوں، جس کے یہاں ستر پشتوں سے لوگ انیم کھاتے آئے ہیں۔

لوگ: سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

خوجی: رہی عقل کی بات، تو میں دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے
 فلاسفر کو چنوتی دیتا ہوں کہ وہ آکر میرے سامنے کھڑا ہو جائے۔ اگر ایک ڈپٹ میں بھگا نہ
 دوں تو اپنا نام بدل ڈالوں۔
 لوگ: کیوں نہ ہو۔

خوبی: مگر آپ لوگ کہیں گے کہ تم افیم کی تعریف کر کے اسے اور گراں کر دو گے، کیونکہ جس چیز کی مانگ زیادہ ہوتی ہے، وہ مہنگی بنتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس شک کو دل میں نہ آنے دیجیے، کیونکہ سب سے زیادہ ضرورت دنیا میں غلے کی ہے۔ اگر مانگ کے زیادہ ہونے سے چیزیں مہنگی ہو جائیں تو غلہ اب تک دیکھنے کو بھی نہ ملتا۔ مگر اتنا سستا ہے کہ کوری چمار، دھیا جولا ہے سب خریدتے اور کھاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ غلے کی ضرورت زیادہ ہے، تو غلہ زیادہ ہونے لگے۔ اسی طرح جب افیم کی مانگ ہوگی، تو غلے کی طرح بونی جائے گی اور سستی کہے گی۔ اس لیے ہر ایک سچے انجی کا فرض ہے کہ وہ اس کے فائدوں کو دنیا پر روشن کر دے۔

ایک: کیا کہنا ہے! کیا بات پیدا کی!

دوسرا: کمال ہے، کمال!

تیسرا: آپ اس فن کے خدا ہیں۔

چوتھا: میری تسلی نہیں ہوئی۔ آخر، افیم دن دن کیوں مہنگی ہوتی جاتی ہے؟

پانچواں: چپ رہ! نامعقول! خوبصورت صاحب کی بات پر اعتراض کرتا ہے! جا کر خوبصورت صاحب کے پیروں پر گر اور کہو کہ قصور معاف کیجیے۔

خوبی: بھائیوں! کسی بھائی کو ذلیل کرنا میری عادت نہیں۔ گوکہ خدا نے مجھے بڑا رتبہ دیا ہے اور میرا نام ساری دنیا میں روشن ہے، مگر آدمی نہیں، آدمی کا جوہر ہے۔ میں اپنی زبان سے کسی کو کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے یہی کہنا چاہیے کہ میں دنیا میں سب سے نالائق، سب سے زیادہ بد نصیب اور سب سے زیادہ ذلیل ہوں۔ میں نے مصر کے پہلوان کو پکٹی نہیں دی تھی، اسی نے اٹھا کے مجھے دے مارا تھا۔ جہاں گیا، پٹ آیا۔ گو دنیا جانتی ہے کہ خوبصورت صاحب کا جوڑ نہیں، مگر اپنی زبان سے میں کیوں کہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ بوا زعفران نے مجھے پیٹ لیا اور میں نے اف تک نہ کی۔

ایک: خدا بخشے آپ کو۔ کیا کہنا ہے استاد!

دوسرا: پٹ گئے اور اف تک نہ کی؟

خوبی: بھائیوں گو کہ میں اپنی شان میں عزت کے بڑے بڑے خطاب پیش کر سکتا ہوں، مگر جب مجھے کہنا ہوگا تو یہی کہوں گا کہ میں جک مارتا ہوں۔ اگر اپنا ذکر کروں گا تو

یہی کہوں گا کہ پاجی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے ذلیل سمجھیں تاکہ مجھے غرور نہ ہو۔

لوگ : واہ واہ! کتنی عاجزی ہے! جیسی تو خدا نے آپ کو یہ رتبہ دیا۔

خوبی : آج کل زمانہ نازک ہے! کسی نے ذرا ٹیڑھی بات کی اور دھر لیے گئے۔ کسی کو ایک دھول لگائی اور چلان ہو گیا۔ حاکم نے 10 روپیہ جرمانہ کر دیا یا دو مہینے کی قید۔ اب بیٹھے ہوئے چکی پیس رہے ہیں۔ اس زمانے میں اگر نباہ ہے، تو عاجزی میں۔ اور انیم سے بڑھ کر عاجزی کا سبق دینے والی دوسری چیز نہیں۔

لوگ : کیا دلیلیں ہیں! سبحان اللہ!

خوبی : بھائیوں، میری اتنی تعریف نہ کیجیے، ورنہ مجھے غرور ہو جائے گا۔ میں وہ شیر ہوں، جس نے جنگ کے میدان میں کروڑوں کو نیچا دکھایا۔ مگر اب تو آپ کا غلام ہوں۔

ایک : آپ اس قابل ہیں کہ ڈیاس بند کر دیں۔

دوسرا : آپ کے قدموں کی خاک لے کر تعویذ بنائی چاہیے۔

تیسرا : اس آدمی کی زبان چوسنے کے قابل ہے۔

چوتھا : بھائی، یہ سب انیم کے دم کا ظہور ہے۔

خوبی : بہت ٹھیک۔ جس نے۔ یہ بات کہی، ہم اسے اپنا استاد مانتے ہیں۔ یہ میری خاندانی صفت ہے۔ ایک نقل سینے۔ ایک دن بازار میں کسی نے چڑی مار سے ایک آلو کے دام پوچھے اس نے کہا، آٹھ آنے۔ اسی کے بغل میں ایک اور چھوٹا آلو بھی تھا۔ پوچھا، اس کی کیا قیمت ہے؟ کہا، ایک روپیہ۔ تب تو گاہک نے کان کھڑے کیے اور کہا۔ اتنے بڑے آلو کے دام آٹھ آنے اور ذرا سے جانور کا مول ایک روپیہ؟ چڑی مار نے کہا۔ آپ تو ہیں آلو۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اس بڑے آلو میں صرف یہ صفت ہے کہ یہ آلو ہے اور اس چھوٹے میں دو صفتیں ہیں، ایک یہ کہ خود آلو ہے، دوسرے آلو کا پٹھا ہے۔ تو بھائیوں! آپ کا یہ غلام صرف آلو نہیں، بلکہ آلو کا پٹھا ہے۔

ایک : ہم آج سے اپنے کو آلو کی دم فاختہ لکھا کریں گے۔

دوسرا : ہم تو جاہل آدمی ہیں، مگر اب اپنا نام لکھیں گے تو گدھے کا نام بڑھا دیں گے۔

آج سے ہم عاجزی سیکھ گئے۔

خوبی : سینے، اس آلو کے پٹھے نے جو جو کام کیا، کوئی کرے تو جانے، اس کی ٹانگ کی

راہ کل جائے۔ پہاڑوں کو ہم سے کاٹا اور بڑے بڑے پتھر اٹھا کر دشمن پر پھینکے۔ ایک دن 44 من کا ایک پتھر کا ایک ہاتھ سے اٹھا کر روسیوں پر مارا تو دو لاکھ پچیس ہزار سات سو انسٹھ آدمی کچل کے مرے گئے۔

ایک : اوہ! ان دہلے ہاتھ پاؤں پر یہ طاقت!
 خوجی : کیا کہا؟ دہلے پتلے ہاتھ پاؤں! یہ ہاتھ پاؤں دہلے پتلے نہیں۔ مگر بدن چور ہیں۔ دیکھنے میں تو معلوم ہوتا ہے کہ مارا ہوا آدمی ہے، مگر کپڑے اتارے اور دیو معلوم ہونے لگا۔ اسی طرح میرے قد کا حال ہے۔ گنوار آدمی دیکھے تو کہے کہ بونا ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا قد کتنا اونچا ہے۔ روم میں جب دو ایک گنواروں نے مجھے بونا کہا، تو بے اختیار ہنسی آگئی۔ یہ خدا کی دین ہے کہ ہوں تو میں اتنا اونچا، مگر کوئی کھل جیگ کی کھوٹی کہتا ہے، کوئی بونا بناتا ہے۔ ہوں تو شریف زادہ، مگر دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ کوئی پاجی ہے۔ عقل اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ اگر افلاطون زندہ ہوتا، تو شاگردی کرتا۔ مگر جو دیکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ گدھا ہے۔ یہ درجہ انیم کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی آدمی میرے سر کو جوتوں سے پینے، تواف نہ کروں۔ اگر کسی نے کہا کہ خولجہ گدھا ہے، تو ہنس کر جواب دیا کہ میں ہی نہیں، میرے باپ اور میرے دادا بھی ایسے ہی تھے۔
 ایک : دنیا میں ایسے ایسے اولیا پڑے ہوئے ہیں۔

خوجی : مگر اس عاجزی کے ساتھ دلیر بھی ایسا ہوں کہ کسی نے بات کہی اور میں نے چائنا جزا۔ مصر کے نامی پہلوان کو مارا۔ یہ بات کسی انجی میں نہیں دیکھی۔ میرے والد بھی تولوں انیم پیتے تھے اور دن بھر دکانوں پر چلیں بھرا کرتے تھے۔ مگر یہ بات ان میں بھی نہ تھی۔

لوگ : آپ نے اپنے باپ کا نام روشن کر دیا۔
 خوجی : اب میں آپ لوگوں سے چنڈو کی صفت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بغیرے چنڈو پیے آدمی میں انسانیت آ نہیں سکتی۔ آپ لوگ شاید اس کی دلیل چاہتے ہوں گے۔ سنئے۔
 بغیرے لیٹے ہوئے کوئی چنڈو پی نہیں سکتا اور لیٹنا اپنے کو خاک ملانا ہے۔ بابا سعدی نے کہا ہے۔
 خاک شو پیش ازاں کہ خاک شیں
 (مرنے سے پہلے خاک ہو جائیں)۔

چندو کی دوسری صفت یہ ہے کہ ہر دم لوگی رہتی ہے۔ اس سے آدمی کا دل روشن ہو جاتا ہے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ پنک میں فکر قریب نہیں آنے پاتی۔ چسکی لگائی اور غوطے میں آئے۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ اچھی کو رات بھر نیند نہیں آتی۔ اور یہ بات پہنچے ہوئے فقیر ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ پانچویں صفت یہ ہے کہ اچھی تڑکے ہی اٹھ بیٹھتا ہے۔ سویرا ہوا اور آگ لینے دوڑے۔ اور زمانہ جانتا ہے کہ سویرے اٹھنے سے بیماری نہیں آتی۔

اس پر ایک پرانے خرافات اچھی نے کہا۔ حضرت، یہاں مجھے ایک شک ہے۔ جو لوگ چھین گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہاں ہمیں برس سے زیادہ عمر کا آدمی ہی نہیں۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ افسیوں کی عمر کم ہوتی ہے۔

خوجی: یہ آپ سے کس نے کہا؟ چھین والے کسی کو اپنے ملک میں نہیں جانے دیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ چھین میں تیس برس کے بعد لڑکا پیدا ہوا ہے۔

لوگ: کیا، تیس برس کے بعد لڑکا پیدا ہوتا ہے! اس کا تو یقین نہیں آتا۔

ایک: ہاں، ہاں، ہوگا۔ اس میں یقین نہ آنے کی کون بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت تیس برس کی ہو جاتی ہے، تب کہیں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔

خوجی: نہیں نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لڑکا تیس برس تک حمل میں رہتا ہے۔

لوگ: بالکل جھوٹ! خدا کی مار اس جھوٹ پر۔

خوجی: کیا کہا؟ یہ آواز کدھر سے آئی؟ ارے، یہ کون بولا تھا؟ یہ کس نے کہا کہ جھوٹ ہے؟

ایک: حضور، اس کو نے سے آواز آئی۔

دوسرا: حضور، یہ غلط کہتے ہیں۔ انھی کی طرف سے آواز آئی تھی۔

خوجی: ان بد معاشوں کو قتل کر ڈالو۔ آگ لگا دو۔ ہم، اور جھوٹ! مگر نہیں، ہمیں چوکے۔ مجھے اتنا غصہ نہ چاہیے۔ اچھا صاحب، ہم جھوٹے، ہم گبی، بلکہ ہمارے باپ بے ایمان، جال ساز اور زمانے بھر کے دغا باز۔ آپ لوگ بتلائیں، میری کیا عمر ہوگی؟

ایک: آپ کوئی پچاس کے پیٹ میں ہوں گے۔

دوسرا: نہیں نہیں، آپ ستر کے ہوں گے۔

خوبی : ایک ہوئی، یاد رکھیے حضرت۔ ہمارا سن نہ پچاس کا نہ ساٹھ کا۔ ہم دو اوپر سو برس کے ہیں۔ جس کو یقین نہ آئے وہ کافر۔

لوگ : افو، دو اوپر سو کا سن ہے۔ ۱

خوبی : جی ہاں، دو اوپر سو برس کا سن ہے۔

ایک : اگر یہ سچی ہے تو یہ اعتراض اٹھ گیا کہ انیموں کی عمر کم ہوتی۔ اب اگر کوئی انیم

نہ ہے، تو بد نصیب ہے۔

خوبی : دو اوپر سو برس کا سن ہوا اور اب تک وہی خم دم۔ کہو، ہزار سے لڑیں، کہو، لاکھ

سے۔ اچھا اب آپ لوگ بھی اپنے اپنے تجربے بیان کریں۔ میری تو بہت سن چکے، اب کچھ اپنی بھی کیے۔

اس پر گٹو نام کا ایک انچی اٹھ کر بولا۔ بھائی بچو، میں کلوار ہوں۔ مول شراب ہمارے

یہاں نہیں بکتی۔ ہم جب لڑکے سے تھے، تب سے ہم انیم پیتے ہیں۔ ایک بار ہولی کے دن ہم

گھر سے نکلے۔ اے بس، ایک جگہ پچاس ہوں، پینتالیس ہوں، اتنے آدمی کھڑے تھے۔ کسی

کے ہاتھ میں لوٹا، کسی کے ہاتھ میں پککاری۔ ہم ادھر سے جو چلے، تو ایک آدمی نے پیچھے سے

جوتا دیا، تو کھوپڑی بھٹا گئی۔ اگر چاہتا تو ان سب کو ڈپٹ لیتا مگر چپ ہو رہا۔

خوبی : شاباش ہم تم سے بہت خوش ہوئے مگو۔

مٹکو : حضور کی دعا سے یہ سب ہے۔

اس کے بعد نور خاں نام کا ایک انچی اٹھا۔ کہا۔ بچو! ہم ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ ہم

نے کئی سال سے انیم، چندو پینا شروع کیا ہے۔ ایک دن ہم ایک چنے کے کھیت میں بیٹھے

بوٹ کھا رہے تھے۔ کسان تھا دل گلی باز۔ آیا اور میرا ہاتھ ہاتھ پکڑ کر کافی حوض لے چلا۔

میں کان دبائے ہوئے اس کے ساتھ چلا آیا۔

اس کے بعد کئی انچیوں نے اپنے اپنے حال بیان کیے۔ آخر میں ایک بوڑھے جو غادری

انیمی نے کھڑے ہو کر کہا۔ بھائیوں۔ آج تک انیموں میں سے کسی نے ایسا کام نہیں کیا

تھا۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے سردار کو کوئی خطاب دیں۔ اس پر سب لوگوں نے مل کا

تالیاں بجائیں اور خوبی کو گیدی کا خطاب دیا۔ خوبی نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور مجلس

برخواست ہوئی۔

(111)

آج بڑی بیگم کا مکان پرستان بنا ہوا ہے۔ جدھر دیکھیے، سہاوت کی بہار ہے۔ بیگمیں دھما چوڑی چارے ہیں۔

جانی: دلہا کے یہاں تو آج میرا سنوں کی دھوم ہے۔ کہاں تو میاں آزاد کو تاج گانے سے اتنی چڑھ تھی کہ مجال کیا، کوئی ڈومنی گھر کے اندر قدم رکھنے پائے۔ اور آج سختی ہوں کہ طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہے اور غزلیں، ٹھمریاں، بچے گائے جاتے ہیں۔

نازک: سنا ہے، آج رثیا بیگم بھی آنے والی ہیں۔

بہار: اس مال زادی کا ہمارے سامنے ذکر نہ کیا کرو۔

نازک: (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ایسا نہ کہو، بہن۔

جانی: ایسی پاک دامن عورت ہے کہ اس کا سا ہونا مشکل ہے۔

نازک: یہ لوگ خدا جانے، کیا سمجھتے ہیں رثیا بیگم کو۔

بہار: اے ہے! سچ کہنا، ستر چوہے کھا کے بلی جج کو چلی۔

اتنے میں ایک پالکی سے ایک بیگم صاحب اتریں۔ جانی بیگم نازک ادا میں اشارے

ہونے لگے۔ یہ رثیا بیگم تھیں۔

رثیا: ہم نے کہا، چل کے ذری دہلن کو دیکھ آئیں۔

روح افزا: اچھی طرح آرام سے بیٹھیے۔

رثیا: میں بہت اچھی بیٹھی ہوں۔ تکلف کیا ہے۔

نازک: یہاں تو آپ کو ہمارے اور جانی بیک کے سوا کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔

رثیا: میں تو ایک بار حسن آرا سے مل چکی ہوں۔

سپہر آرا: اور ہم سے بھی؟

رثیا: ہاں، تم سے بھی ملے تھے، مگر بتائیں گے نہیں۔

سپہر آرا: کب ملے تھے اللہ! کس مکان میں تھے؟

رثیا: اجی، میں حراق کرتی تھی۔ حسن آرا بیگم کو دیکھ کر دل شاد ہو گیا۔

نازک: کیا ہم سے زیادہ خوبصورت ہیں؟

ثریا: تمہارا تو دنیا کے پردے پر جواب نہیں ہیں۔
 نازک: بھلا دلہا سے آپ سے بات چیت ہوئی تھی؟
 ثریا: بات چیت آپ سے ہوئی ہوگی۔ میں نے تو ایک دفعہ راہ میں دیکھا تھا۔
 نازک: بھلا دوسرا نکاح بھی منظور کرتے ہیں وہ۔
 ثریا: یہ تو ان سے کوئی جا کے پوچھے۔
 نازک: جنہیں پوچھ لو بہن، خدا کے واسطے۔
 ثریا: اگر منظور ہو دوسرا نکاح، تو پھر کیا؟
 نازک: پھر کیا، تم کو اس سے کیا مطلب؟
 روح افزا: آخر دوسرے سے نکاح کے لیے کسے تذبذب ہے؟
 نازک: ہم خود اپنا پیغام کریں گے۔
 روح افزا: بس، حد ہوگئی نازک ادا بہن! انوہ ہو۔
 نازک: (آہستہ سے) ثریا بیگم، تم نے غلطی کی۔ دھیرج نہ رکھ سکیں۔
 ثریا:

ہم جان فدا کرتے، گر وعدہ وفا ہوتا،
 مرنا ہی مقدر تھا، وہ آتے تو کیا ہوتا!
 نازک ہاں، ہے تو یہی بات۔ خیر، جو ہوا، اچھا ہی ہوا، مصلحت بھی یہی تھی۔
 حسن آرانے یہ شعر سنا اور نازک بیگم کی باتوں کو تولا، تو سمجھ گئیں کہ ہو نہ ہو، ثریا بیگم
 یہی ہیں۔ شکھیوں سے دیکھا اور گردن پھیر کر اشارے سے پہر آرا کو بلا کر کہا۔ ان کو پہچانا؟
 سوچو تو، یہ کون ہیں؟

پہر آرا: اے باجی، تم تو پہیلیاں بھڑھاتی ہو۔
 حسن آرا: تم ایسی طبیعت دار، اور اب تک نہ سمجھ سکیں؟
 پہر آرا: تو کوئی اڑتی چڑیا تو نہیں پکڑ سکتا۔
 حسن آرا: اس شعر پر غور کرو۔
 پہر آرا: اخواہ، (ثریا بیگم کی طرف دیکھ کر) اب سمجھ گئی۔
 حسن آرا: ہے عورت حسین۔

پہر آرا: ہاں ہے، مگر تم سے کیا مقابلہ۔

حسن آرا: سچ کہنا، کتنی جلد سمجھ گئی ہوں۔

پہر آرا: اس میں کیا شک ہے، مگر یہ تم سے کب ملیں گے؟ مجھے تو یاد نہیں آتا۔

حسن آرا: خدا جانے۔ اللہ رکھی بن کے آنے نہ پاتی، جو گن کے ہمیں میں کوئی پھٹنے

نہ دیتا۔ شبو جان کا یہاں کیا کام؟

پہر آرا: شاید مہری دہری بن کے گزر رہا ہو۔

حسن آرا: سچ تو یہ ہے کہ ہم کو ان کا آنا بہت کھٹکتا ہے۔ انہیں تو یہ چاہیے تھا کہ جہاں

آزاد کا نام سنتیں، وہاں سے ہٹ جاتیں، نہ کہ ایسی جگہ آنا۔

پہر آرا: ان سے یہاں تک آیا کیونکر گیا؟

حسن آرا: ایسا نہ ہو کہ یہاں کوئی گل کھلے۔

پہر آرا نے جاکر بہار بیگم سے کہا۔ جو بیگم ابھی آئی ہیں، ان کو تم نے پہچانا؟ ٹیٹا بیگم

نہی ہیں۔ جب تو بہار بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔ غور سے دیکھ کر بولیں۔ ماشا اللہ! کتنی حسین

عورت ہے! ایسی ننکین بھی کم دیکھنے میں آئی۔

پہر آرا: باجی کو خوف ہے کہ کوئی گل نہ کھلائیں۔

بہار: گل کیا کھلائیں گی۔ اب تو ان کا نکاح ہو گیا۔

پہر آرا: اے ہے، باجی! نکاح پر نہ جانا۔ یہ وہ کھلاڑ ہے کہ گھونگھٹ کے آڑ میں شکار

کھیلیں۔

بہار: اے نہیں، کیوں بے چاری کو بدنام کرتی ہو۔

پہر آرا: واہ! بدنامی کی ایک سی کمی۔ کوئی پیشہ، کوئی کرم ان سے چھوٹا؟ لگاوت بازی

میں ان کی دھوم ہے۔

بہار: ہم جب اس ڈھب پر آنے بھی دیں۔

ادھر نازک ادا بیگم نے باتوں باتوں میں ٹیٹا بیگم سے پوچھا۔ بہن، یہ بات اب تک

کھلی کہ تم پادری کے یہاں سے کیوں نکل آئی۔ ٹیٹا بیگم نے کہا۔ بہن، اس ذکر سے رنج

دوتا ہے۔ جو ہوا، وہ ہوا، اب اس کا گھڑی گھڑی ذکر کرنا فضول ہے۔ لیکن جب نازک ادا

الہم نے بہت ضد کی تو انہوں نے کہا۔ بات یہ ہوئی کہ بے چارے پادری نے مجھ پر ترس

کھا کر اپنے گھر میں رکھا اور اس طرح کوئی خاص اپنی بیٹیوں سے پیش آتا ہے، اسی طرح مجھ سے پیش آتے۔ مجھے پڑھایا لکھایا، مجھ سے روز کہتے کہ تم عیسائی ہو جاؤ، لیکن میں ہنس کے ٹال دیا کرتی تھی۔ ایک دن پادری صاحب تو چلے گئے تھے کسی کام کو، ان کا بھتیجا، جو فوج میں نوکر ہے، ان سے ملنے آیا۔ پوچھا۔ کہاں گئے ہیں؟ میں نے کہا۔ کہیں باہر گئے ہیں۔ اتنا سنا تھا کہ وہ گاڑی سے اتر آیا اور اپنی جیب سے بوتل نکال کر شراب پی۔ جب نشہ ہوا تو مجھے سے کہنے لگا، تم بھی پیو۔ اس نے سمجھا میں راضی ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ مگر وہ مرد، میں عورت! پھر فوجی جوان، کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتی تھی۔ آخر بولی۔ صاحب، تم فوج کے جوان ہو۔ میں بھلا تم سے کیا جیت پاؤں گی؟ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ اس پر ہنس کر بولا۔ ہم بنا پلائے نہ مانیں گے۔ میرا تو خون سوکھ گیا۔ اب کروں تو کیا کروں۔ اگر کسی کو پکارتی ہوں، تو یہ اس وقت ماری ڈالے گا۔ اور بے عزت کرنے پر تو تلا ہی ہوا ہے۔ چاہا کہ جھپٹ کے نکل جاؤں، پر اس نے مجھے گود میں اٹھالیا اور بولا۔ ہم سے شادی کیوں نہیں کر لیتی؟ میرا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا کہ یا خدا، آج کیسے عزت بچے گی، اور کیا ہوگا۔ مگر آبرو کا بچانے والا اللہ ہے۔ اسی وقت پادری صاحب آہنچے۔ بس، اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ چپکے سے کھسک گیا۔ پادری صاحب اس کو تو کیا کہتے۔ جب برابر کا لڑکا یا بھتیجا کھاتا دھماتا ہو، تو بڑا بوڑھا اس کا لحاظ کرتا ہی ہے۔ جب وہ بھاگ گیا، تو میرے پاس آکر بولا۔ مس پالین، اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔

میں: پادری صاحب، اس میں میرا ذرا قصور نہیں۔

پادری: میں نے خود دیکھا کہ تم اور وہ ہاتھ پائی کرتے تھے۔

میں: وہ مجھے زبردستی شراب پلانا چاہتے تھے۔

پادری: اجی، میں خوب جانتا ہوں۔ میں تم کو بہت نیک سمجھتا تھا۔

میں: پوری بات تو سن لیجیے۔

پادری: اب تم میری آنکھوں سے گر گئی۔ بس، اب تمہارا نباہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ کل

نیک تم اپنا بندوبست کر لو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے یہ ڈھنگ ہیں۔

اسی دن رات کو میں وہاں سے بھاگی۔

ادھر بڑی بیگم صاحب کا انتظام کرتے میں لگی ہوئی تھیں۔ بات بات پر کہتی جاتی تھیں

کہ اللہ! آج تو بہت تھکی۔ اب میرا سن تھوڑا ہے کہ اتنے چکر لگاؤں۔ استانی جی ہاں میں ہاں ملائی جاتیں تھیں۔

بڑی بیگم: استانی جی، اللہ گواہ ہے، آج بہت شل ہو گئی۔

استانی: ارے تو حضور دوڑتی بھی نکلتی ہیں! ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر۔

مہری: دوسرا ہو تو بیٹھ جائے۔

استانی: اس سن میں اتنی دوڑ دھوپ مشکل ہے۔

مہری: ایسا نہ ہو، دشمنوں کی طبیعت خراب ہو جائے۔ آخر ہم لوگ کس لیے ہیں؟

بڑی بیگم: ابھی دو تین دن تو نہ بولو، پھر دیکھا جائے گا۔ اس کے بعد کرتا ہی کیا ہے؟

استانی: یہ کیوں؟ خدا سلامت رکھے، پوتے پوتیاں نہ ہوں گے؟

بڑی بیگم: بہن، زندگانی کا کون ٹھکانہ ہے۔

اب برات کا حال سنئے۔ کوئی پہر رات گئے دھوم دھام سے برات روانہ ہوئی۔ سب

کے آگے نشان کا ہاتھی جھومتا ہوا جاتا تھا۔ ہاتھی کے سامنے قدم قدم پر انار چھوٹتے تھے۔

مہتاب کی روشنی سے چاند کا رنگ فق تھا۔ چرنی کی آن بان سے آسمان کا کلیجہ شق تھا۔

تماشائیوں کی بھیڑ سے دونوں طرف کے کمرے پھٹے پڑتے تھے۔ جس وقت گوروں کا باجا

چوک میں پہنچا اور انھوں نے بینڈ بجایا تو لوگ سمجھے کہ آسمان کے فرشتے باجا بجاتے اتر آئے

ہیں۔

اتنے میں میاں خوبی ادھر ادھر پھدکتے ہوئے آئے۔

خوبی: ادشہنائی والو! منہ نہ پھیلاؤ بہت۔

لوگ: آئیے، آئیے، بس آپ ہی کی کسر تھی۔

خوبی: ارے، ہم کیا کہتے ہیں؟ منہ نہ پھیلاؤ بہت۔

لوگ: کوئی آپ کی سنتا ہی نہیں۔

خوبی: یہ تو نوںیکھیے ہیں۔ میری باتیں کیا سمجھیں گے۔

لوگ: ان سے کچھ فرمائش کیجیے۔

خوبی: اچھا، واللہ! وہ سماں باندھوں کہ دنگ ہو جائیے! یہ چیز چھینرنا بھائی۔

کربجوا میں درد اٹھی

- کاسے کہوں نندی مورے رام
 سوتی تھی میں اپنے مندل میں
 اچانک چونک پڑی مورے رام
 (کربجوا میں درد انھی)

لوگ: سبحان اللہ! آپ اس فن کے استاد ہیں۔ مگر شہنائی والے اب تک آپ کا حکم نہیں مانتے۔

خوبی: جنہیں بھی، حکم تو مانیں دوڑتے ہوئے اور نہ مانیں تو میں نکال دوں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اناڑی ہیں۔ بس، ذرا مجھے آنے میں دیر ہوئی اور سارا کام بگڑ گیا۔ اتنے میں ایک دوسرے آدمی نے خوبی کے نزدیک جا کر ذرا کندھے کا اشارہ کیا تو خوبی لڑکھڑائے اور ان کے چیلے انہی بھائیوں نے بگاڑنا شروع کیا۔

ایک: ارے میاں! کیا آنکھوں کے اندھے ہو؟

دوسرا: اینٹ کی عینک لگاؤ میاں۔

تیسرا: اور خواجہ صاحب بھی دھکا دیتے تو کیسی ہوتی؟

چوتھا: منہ کے بل گرے ہوتے اور کیا۔

پانچواں: اجی، یوں کہو کہ ناک سلپٹ ہو جاتی۔

خوبی: ارے بھائی، اب اس سے کیا واسطہ۔ ہم کسی سے لڑتے جھگڑتے تھوڑے ہی ہیں۔ مگر ہاں، اگر کوئی گیدی ہم سے بولے تو اتنی کرولیاں بھونگی ہوں کہ یاد کرے۔

جب برات دہن کے گھر پہنچی تو دو دلہے کو دروازے کے سامنے لائے اور دہن کا نہایا ہوا پانی گھوڑے کے سوموں سے نیچے ڈالا۔ اس کے بعد کھی اور شکر ملا کر گھوڑے کے پاؤں میں لگایا۔ دولہا محل میں آیا۔ دولہا کی بہنیں اس پر دوپٹے کا آنچل ڈالے ہوئے تھیں۔ دہن کی طرف سے عورتیں بیڑا ہر قدم پر ڈالتی جاتی تھیں۔ اس طرح دولہا مزوے کے نیچے پہنچا۔ اسی وقت ایک عورت انہی اور رومال سے آنکھیں پوچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ یہ ریتا بیگم تھیں۔

آزاد مزوے کے نیچے اس چوکی پر کھڑے کیے گئے جس پر دہن نہائی تھی۔ میراٹھوں نے دہن کے اٹن کا، جو ماتھے کے دن سے رکھا ہوا تھا، ایک بھیڑ اور ایک شیر بنایا اور دولہا سے کہا۔ کہیے، دولہا بھیڑ، دہن شیر۔

آزاد: اچھا صاحب، ہم شیر، وہ بھیڑ، بس؟
 ڈومنی: اے واہ، یہ تو اچھے دولہا آئے۔ آپ بھیڑ، وہ شیر۔
 آزاد: صاحب، یوں سہی۔ آپ بھیڑ، وہ شیر۔
 ڈومنی: اے حضور، کہیے، یہ شیر، میں بھیڑ۔
 آزاد: اچھا صاحب، میں بھیڑ، وہ شیر۔

اس پر خوب قہقہہ پڑا۔ اسی طرح اور بھی کئی رسمیں ادا ہوئیں، اور تب دولہا محفل میں گیا۔ یہاں ناچ گانا ہو رہا تھا۔ ایک نازنین سچ میں بیٹھی تھی، مزاق ہو رہا تھا۔ ایک نواب صاحب نے یہ فخرہ کسا۔ بی صاحب، آپ نے غضب کا گلا پایا ہے۔ اس کی تعریف کرنا فضول ہے۔

نازنین: کوئی سمجھدار تعریف کرے تو خیر، عطائی اناڑی نے تعریف کی تو کیا؟
 نواب: اے صاحب، ہم تو خود تعریف کرتے ہیں۔

نازنین: تو آپ اپنا شمار بھی سمجھداروں میں کرتے ہیں؟ بتلائیے، یہ بہاگ کا وقت ہے یا دھنا کھری کا۔

نواب: یہ کسی داڑھی بچے سے پوچھو جا کے۔

نازنین: اے لو! جو اس فن کے نکتے سمجھے، وہ داڑھی بچا کہلائے۔ واہ ری عقل، وہ امیر نہیں، گنوار ہے، جو دو باتیں نہ جانتا ہو۔ گانا اور پکانا۔ آپ کے سے دو ایک گھامڑ رئیس شہر میں اور ہوں تو سارا شہر بس جائے۔
 نازنین نے یہ غزل گائی۔

لگا نہ رہنے دے جھکڑے کو یار تو باقی
 رکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلُو باقی
 جو ایک رات بھی سویا وہ گل گلے مل کر
 تو بھینی بھینی مہینوں رہی ہے بو باقی
 ہمارے پھول اٹھا کے وہ بولا سچ دہن
 ابھی تلک ہے محبت کی اس میں بو باقی
 فاسب کے لیے مجھ پر کچھ نہیں موقوف

یہ رنج ہے کہ اکیلا رہے گا تو باقی

جو اس زمانے میں رہ جائے آبرو باقی

نواب: ہاں یہ مب سے زیادہ مقدم چیز ہے۔

نازنین: مگر حیاداروں کے لیے۔ بگڑ بازوں کو کیا؟

اس پر اس زور سے قہقہہ پڑا کہ نواب صاحب جھینپ گئے۔

نازنین: اب کچھ اور فرمائیے حضور! چہرے کا رنگ کیوں فق ہو گیا؟

مرزا: آپ سے نواب صاحب بہت ڈرتے ہیں۔

نواب: جی ہاں، حرم زادے سے سبھی ڈرتے ہیں۔

نازنین: اے ہے، جیسی آپ اپنے ابا جان سے اتنا ڈرتے ہیں۔

اس پر پھر قہقہہ پڑا اور نواب صاحب کی زبان بند ہو گئی۔

ادھر دلہن کو سات سہاگنوں نے مل کر اس طرح سنوارا کہ حسن کی آب اور بھی بھڑک

اٹھی۔ نکاح کی رسم شروع ہوئی۔ قاضی صاحب اندر آئے اور دو گواہوں کو ساتھ لائے۔ اس

کے بعد دلہن سے پوچھا گیا کہ آزاد پاشا کے ساتھ نکاح منظور ہے؟ دلہن نے شرم سے سر جھکا

لیا۔

بڑی بیگم: اے بیٹا، کہہ دو۔

روح افزا: حسن آراء، بولو بہن۔ دیر کیوں کرتی ہو؟

نازک: بس، تم ہاں کہہ دو۔

جانی: (آہستہ سے) بجرے پر سیر کر چکیں، ہوا کھا چکیں اور اب اس وقت نخرے

بکھارتی ہیں۔

آخر بڑی کوشش کے بعد حسن آراء نے دھیرے سے 'ہوں' کہا۔

بڑی بیگم: لیجیے، دلہن نے ہوں کاری بھری۔

قاضی: ہم نے تو آواز سنی نہیں۔

بڑی بیگم: ہم نے سن لیا، بہت سے گواہ ہیں۔

قاضی صاحب نے باہر آکر دوہرا سے بھی یہ یہی سوال کیا۔

آزاد: جی ہاں، بالکل قبول ہے۔

قاضی صاحب چلے گئے اور محفل میں طوائفوں نے مل کر مبارکباد گائی اس کے بعد ایک پری نے یہ غزل گائی۔

ترپ رہے ہیں شب انتظار سونے دے
نہ چھیڑ ہم کو دل بے قرار سونے دے
قفس میں آنکھ لگی ہے ابھی اسیروں کی
گرچ نہ باغ میں اب بہار سونے دے
ابھی تو سوئے ہیں یادِ چمن میں اہل قفس
جگا نہ ان کو نسیم بہار سونے دے
ترپ رہے ہیں دل بے قرار سونے دے

شریت پلائی کے بعد دولہا اور دلہن ایک ہی پلنگ پر بیٹھائے گئے۔ گیتی آرا نے کہا۔
بہن، جوتی تو چھلاؤ۔

جانی: واہ! یہ تو کسٹی سنائی بیٹھی ہیں۔

بہار: آخر حیا بھی تو کوئی چیز ہے!

نازک: ارے، جوتی کندھے پر جھلا دو بہن، واہ!

استانی: اگلے وقتوں میں تو سر پر پڑتی تھیں۔

نازک: اس جوتی کا مزہ کوئی مردوں کے دل سے پوچھے۔

جب دلہن نے ذرا بھی جنبش نہ کی تو بہاریگم نے دلہن کے داسنے پیر کی جوتی دلہا کے کندھے پر چھلا دی۔

نازک: کہیے، آپ کی ڈولی کے ساتھ چلوں۔

روح افزا: اور جوتیا بھار کے دھروں گا۔

جانی: اور سراپی ہاتھ میں لے چلوں گا۔

آزاد: اے! کیوں نہیں، ضرور کہوں گا۔

نازک: اے واہ! اچھا رنگ لائے۔

جانی: رٹٹیوں نے نخرے بہت سیکھے ہیں۔

اس فخرے پر ایسا قہقہہ پڑا کہ میاں آزاد شرما گئے۔ جانی بیگم اکیس پان کا بیڑا لائیں

اور اسے کئی بار آزاد نے منہ تک لا لاکر ہٹانے کے بعد کھلا دیا۔
 سپہر آرا سہاگ لائیں اور دولہا کے کان میں کہہ۔ کہو، سونے میں سہاگ، موتیوں میں
 دھاگہ اور بنے کا جی بنی سے لاگا۔

اس کے بعد آرسی کی رسم ادا ہوئی۔

جانی : بنو، جلدی آنکھ نہ کھولنا۔

نازک : جب تک اپنے منہ سے غلام نہ بنیں۔

حیدری : کیسے، بیوی، میں آپ کا غلام ہوں۔

آزاد : بیوی، میں آپ کا بن دامن غلام ہوں۔

بڑی بیگم : بیٹا، اب تو کہوا لیا، اب آنکھیں کھول دو۔

جانی : ایک ہی بار تو کہا۔

حیدری : اے حضور، خوشامد تو کیجیے۔

آزاد : یہ خوشامد سے نہ مانے گی۔

حیدری : جو کہا ہے، اس کا خیال رہے۔ بیوی کے غلام بنے رہے گا۔

آخری بڑی مشکوں سے دہن نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ بے اختیار
 رونے لگیں۔ لوگ سمجھاتے سمجھاتے جاری ہو گئے، مگر آنسو نہ تھے۔ تب آزاد نے سر جھکا کر
 کان میں کہا۔ یہ کیا کرتی ہو، دل کو مضبوط رکھو۔

روح افزا : بہن، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ اس کا کون سا موقع ہے؟

بہار : اماں جان، آپ ہی سمجھائیں۔ ناحق اپنے کو ہلکان کرتی ہیں حسن آرا۔

استانی : تر کپڑے سے منہ پوچھو۔

جب حسن آرا کا جی بہال ہوا تو آزاد نے سہاگ پڑے سے سالہ نکال کر دہن کی
 مانگ بھری۔ تب دہن کو گود میں اٹھا کر سوکھ پال پر بیٹھا دیا۔ وہاں جتنی عورتیں تھیں، سب کی
 آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڑی بیگم تو پچھاڑے کھانے لگیں۔ جب برات رخصت ہو
 گئی تو باتیں ہونے لگیں۔

روح افزا : اللہ کرے، آزاد نے جتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں، اتنا ہی آرام بھی پائیں۔

عباسی : اللہ ایسی ہی کرے گا۔

جانی: مگر آزاد کا سا دوہلا بھی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔

نازک: لاکھوں کوڑوں کا پانی پی چکے ہیں۔

بہار: بڑے خوش حراج آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

جانی: اس وقت حسن آرا کے دل کا کیا حال ہوگا؟

نازک: چوتھی کے دن ہم تاک تاک نشانے لگائیں گے۔

روح افزا: آزاد سے کوئی نہ جیت پائے گا۔

جانی: کون! دیکھ لینا بہن، اگر ہاری نہ بولیں جیسی کہنا۔ وہ اگر تیز ہیں، تو ہم بھی کم

نہیں۔

انت

بڑے پانٹھک، شاستر انوسار نازک اور نازک کے سنیوگ کے ساتھ ہی کتھا کا انت ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم بھی اب لکھنئی کو وٹرام دیتے ہیں۔ پر کداجت کچھ پانٹھکوں کو یہ جاننے کی اچھا ہوگی کہ خواجہ صاحب کا کیا حال ہوا اور مس معیذا اور مس کلاریا پر کیا جتی۔ ان تینوں پاتروں کے سوا ہمارے دچار میں تو اور کوئی ایسا پاتر نہیں ہے جس کے دشنے میں کچھ کہنا باقی رہ گیا ہو۔ اچھا سنئے۔ میاں خوبی مرتے دم تک آزاد کے وفادار دوست بنے رہے۔ انیم کی ڈیما اور کرولی کی دھن نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ مس معیذا اور مس کلاریا نے اردو اور ہندی پڑھی اور دونوں تھیاسوفٹ ہو گئیں۔ دونوں ہی نے استریوں کی سیدھا کرنی ہی اپنے جیون کا اُڑھیہ بنا لیا۔ کلاریا تو کلکتہ کی طرف چلی گئیں، معیذا بمبئی سے لوٹ کر آزاد سے ملنے آئی تو آزاد نے ہنس کر کہا۔ اب تو تھیاسوفٹ ہیں آپ؟

معیذا: جی ہاں، خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس نے ہدایت کی۔

آزاد: تو یہ کہے کہ اب آپ پر خدا کا نور نازل ہوا۔ اس مذہب میں کون کون عالم

شریک ہیں؟

معیذا: افسوس ہے آزاد، کہ تم تھیاسونی سے بالکل واقف نہیں ہو اس میں بڑے بڑے نامی عالم اور فلاسفر شریک ہیں، جن کے نام کے اس وقت دنیا میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ یورپ کے اکثر عالموں کا جھکاؤ اسی طرف ہے۔

آزاد: ہم نے سنا ہے کہ تھیاسوفیس والے روح سے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ شوبدے بازی معلوم ہوتی ہے۔

میڈا: تم اسے شوبدے بازی سمجھتے ہو؟

آزاد: شوبدانہیں تو اور کیا ہے، مداریوں کا کھیل؟

میڈا: اگر اسی کا نام شوبدا ہے تو نیوٹن اور ہرشل بھی بڑے شوبدے باز تھے؟

آزاد: واہ، کہاں نیوٹن اور کہاں تھیاسوفی! ہم نے سنا ہے کہ تھیاسوفسٹ لوگ غیب کا حال بتا دیتے ہیں۔ بھئی میں بیٹھے ہوئے امریکہ والوں سے بنا کسی وسیلے کے باتیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صاحب جو تھیاسوفسٹوں میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں وہ ڈاک سے خط نہ بھیج کر جادو سے بھیجتے ہیں۔ وہ خط لکھ کر میز پر رکھ دیتے ہیں اور جن لوگ اٹھا کر پہنچا دیتے ہیں۔

میڈا: تو اس میں تعجب کی کون بات ہے؟ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے وہ دو آدمیوں کے حرفوں سے باتیں کرتے دیکھ کر ضرور دل میں سوچیں گے کہ جادوگر ہیں۔ جس طرح آپ کو تعجب ہوتا ہے کہ میز پر رکھا ہوا خط کیسے پہنچ گیا اسی طرح ان جنگلی آدمیوں کو بھی حیرت ہوتی ہے کہ دو آدمی چپ چاپ کھڑے ہیں نہ بولتے ہیں، نہ چالتے ہیں، اور لکھروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ افریقہ کے چشمیوں سے کہا جائے کہ ایک منٹ میں ہم لاکھوں میل بیٹھے ہوئے آدمیوں کے پاس خبریں بھیج سکتے ہیں تو وہ کبھی نہ مانیں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ تار کے کھٹکانے سے کیسے اتنی دور خبریں پہنچ جاتی ہیں۔ اسی طرح تم لوگ تھیاسوفی کی کرامات کو شوبدا سمجھتے ہو۔

آزاد: تم بسرزم کو مانتی ہو؟

میڈا: میں سمجھتی ہوں، جسے ذرا بھی سمجھ ہوگی وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

آزاد: خدا تم کو سیدھے راستے پر لائے، بس اور کیا کہوں۔

میڈا: مجھے تو سیدھے راستے پر لایا۔ اب میری دعا ہے کہ خدا تم کو بھی سیدھے ڈھلے پر لگائے۔

آزاد: آخر اس مذہب میں نئی کون سی بات ہے؟

میڈا: سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی، مگر تم نے مذہب کہنا نہ چھوڑا۔

آزاد : خطا ہوئی، معاف کرنا، لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ بلا کسی وسیلے کے ایک دوسرے کے دل کا حال کیونکر معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ میڈم جے وٹسکی خطوں کو بغیر کھولے پڑھ لیتی ہیں۔

میڈا : ہاں ہاں، پڑھ لیتی ہیں، ایک نہیں، ہزاروں بار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور خدا نے چاہا تو کچھ دنوں میں میں بھی وہی کر کے دکھا دوں گی۔

آزاد : خدا کرے، وہ دن جلد آئے۔ میں برابر دعا کروں گا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ بیرا نے اندر آکر ایک کارڈ دیا۔ آزاد نے کارڈ دیکھ کر بیرا سے کہا۔ نواب صاحب کو دیوان خانے میں بیٹھاؤ، ہم ابھی آتے ہیں۔

میڈا نے پوچھا۔ کون نواب صاحب ہیں،

آزاد : مرزا ہمایوں فر کے چھوٹے بھائی ہیں، جن کے ساتھ سپہرآرا کی شادی ہوئی

ہے۔

میڈا : تو یوں کہیے کہ آپ کے سازو ہیں۔ تو پھر جائیے۔ میں بھی ان سے ملوں گی۔

آزاد : میں انھیں یہیں لاؤں گا۔

یہ کہتے ہوئے آزاد دیوان خانے کی طرف چلے گئے۔

